نوٹ

اندلس کے اسلامی دور کی ایک مستند تاریخ "اخبار مجموعہ"

شائع کیا ہے۔ یہ اس کا ترجمہ ہے جو باقساط "جامعہ" میں شائع ہ

اور تمہ الگ چھاپ کر قارئین کرام کی خدمت میں بھیجا جائے گا تا

میں جمع کئے جاسکیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۶	بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۱ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپئے

صلی اللہ علی سیدنا محمد و آل محمد وسلم

اندلس میں اسلامی فتوحات کا درخشاں عہد

عبدالملک کا عہد اور ملک کی عام حالت ہمارے مضمون کا آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے جب کہ لوگ چاروں طرف مصائب و فتن میں مبتلا تھے اور عبدالملک ابن مروان کی توجہ عبداللہ ابن زبیر، ابن الاشعث و ازارقہ وغیرہ کی مدافعت پر مبذول تھی۔ اہل روم اور کردوں کے معاملات کی حالت نہایت نازک ہو گئی تھی فارس کے باقی لوگوں کی حالت بھی تشویش سے خالی نہ تھی وہاں کے لوگوں نے اپنے بہت سے شہر جو شامیوں نے فتح کرلئے تھے، فاتحین سے پھر چھین لئے اور اہل شام کو نکال دیا۔

ولید کا عہد جیسے جیسے موقع ملا عبدالملک نے سعی و کوشش سے کئی شہر پھر فتح کئے مگر جب سب پر قبضہ نہ ملا تو اس کے بعد ولید نے اپنے عہد میں اس مہم پر فوجیں روانہ کیں اور غنیم پر حملے کر کے روم کے مفتوحہ شہر جو دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے تھے دوبارہ اپنے تصرف میں لئے بلکہ ان شہروں کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی قبضہ کرلیا۔ پھر خراسان کے نکلے ہوئے شہر بھی دوبارہ قبضہ میں لے کر اپنا تسلط قائم کیا۔ اور ملک کی حد بندی کی اور اپنے فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع کرلیا کہ ایران کے تمام ملک اس کے تصرف میں آگئے اور کردوں کے علاقے کے سوا جو نہایت محفوظ تھا کوئی حصہ ملک فتح ہونے سے باقی نہ رہا۔

عقبہ ابن نافع اس زمانے میں افریقیہ کی سرحد کا معاملہ دوسری سرحدوں کے مقابلے میں ولید کے لئے بہت زیادہ اہم اور جاذب توجہ تھا۔ عقبہ ابن نافع حارثی الفہری، افریقیہ میں قیروان کی بنا ڈال کر وہاں ایک قلعہ تعمیر کر چکے تھے۔ عقبہ ابن نافع حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں عبداللہ ابن سعد ابن سرح عامری کے عامل تھے۔

سرحدوں کا انتظام کرنے کے بعد عقبہ نے فتوحات کے لئے قدم بڑھائے اور جس طرف

سے گزرے فتح و نصرت نے ان کے قدم چومے۔ یہاں تک کہ عقبہ ٹیونس اور سبرہ تک پہنچ گئے۔

ان واقعات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ملک میں بہت سے فساد پیدا ہوگئے۔ اس زمانے میں افریقہ میں موسم گرما میں افواج کی واپسی منقطع ہوگئی تھی۔ اہل بربر کے معاملات بھی زیادہ سخت ہوگئے تھے۔ بڑی دشواریوں کے بعد کہیں ان فتنوں سے نجات ملی اور موسم گرما کے افواج متعینہ افریقہ حضرت معاویہ کے عہد میں واپس ہوسکیں۔ افریقہ کی حالت درست ہوگئی اور اس وقت تک پر امن رہی جب حضرت عقبہ ابن نافع نے سنہ ۶۲ھ میں پھر جنگ کا آغاز کیا عقبہ اس زمانے میں یزید ابن معاویہ کے حکم سے جزیرے کے گورنر تھے اور طنجہ ان کا صدر مقام تھا۔

عقبہ کا مدمقابل بربر کا ایک قبیلہ تھا جس کو اوربہ کہتے تھے اس قبیلے نے بہت سختی سے مقابلہ کیا۔ عقبہ ان سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگئے اور ان کی فوجیں شکست کھاکر پسپا ہوئیں۔ اس کے بعد ہی حضرت ابن زبیر کا قضیہ اور دوسرے فسادات اٹھ کھڑے ہوئے اور عبدالملک ابن مروان بھی مرگیا

موسیٰ ابن نصیر جب ولید کو تخت اور اس نے افریقیہ کی سرحدی اہمیت پر نظر کی تو موسے ابن نصیر کو بلایا جو بنی آمیہ کا مولیٰ (غلام) اور ان غیر مسلم زنگیوں کی اولاد سے تھا جو خالد ابن ولید کے ہاتھوں عین التمر میں اسیر ہوئے تھے اور بیان کرتے تھے کہ ہم تاوان جنگ کے مطالبے میں رہن ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہم بکر ابن وائل کے قبیلے سے ہیں۔

موسیٰ، عبدالعزیز ابن مروان کی خدام میں داخل تھے اور عبدالعزیز سے آزادی حاصل کرکے ان کی طرف سے سنہ ۸۹ھ میں افریقہ وغیرہ کی مہم پر مامور ہو رہے تھے۔ ولید نے موسیٰ ابن نصیر کو چند ایسے لوگوں کی معیت میں افریقہ روانہ کیا جو بلا جبر و اکراہ اپنی خوشی سے اس مہم کے لئے تیار تھے۔ شام کا لشکر ان کے ساتھ نہ کیا مصر و افریقہ کے لشکر اور مسلمان مجاہدوں کے گروہ ان کے لئے کافی سمجھے۔

موسیٰ کی فتوحات موسیٰ ابن نصیر خلیفہ سے رخصت ہوکر مصر آئے، وہاں کی فوج ساتھ لے کر افریقہ پہنچے وہاں سے بھی بہادروں کی ایک جماعت ساتھ لی۔ اب موسیٰ کا لشکر نہایت مہذب و باقاعدہ تھا۔ انھوں نے اپنا مقدمۃ الجیش طارق ابن زیاد کے سپرد کر دیا تھا۔ ان تیاریوں کے بعد موسیٰ بربریوں

سے برابر جنگ کرتے اور اُن کے شہروں پر پیہم قبضہ کرتے ہوئے طنجہ تک پہنچ گئے جو بلاد بربر کا ایک مرکزی مستقر تھا۔

موسیٰ نے طنجہ اور اس کے بعض مواضعات فتح کرلئے جو اس سے پہلے فتح نہ ہوئے تھے۔ یا بقول بعض فتح ہوکر ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ غرض ان فتوحات کے بعد اہل طنجہ نے موسیٰ کی اطاعت قبول کی اور موسیٰ نے طنجہ کو اپنا مستقر بناکر مسلمانوں کو وہاں آباد کیا اور اس کی حیثیت قیروان کی سی بنادی پھر ۹۰ھ میں ولید کو تمام واقعات کی اطلاع دی۔

اس کے بعد موسیٰ نے اور قدم بڑھائے اور ساحل بحر کے شہر فتح کرنا چاہے جن میں شاہ اندلس کے گورنر مقرر تھے اور ان شہروں اور ان ملحقات پر انھی گورنروں کا تصرف تھا۔ ان تمام شہروں کی ناک شہر سبتہ تھا۔ سبتہ اور اس کے ملحقات پر ایک اندلسی سردار یلیان کی حکومت تھی۔ موسیٰ ابن نصیر نے یلیان سے جنگ کی تو انھیں یلیان کی طاقت اور دلیری اور کثرت افواج کا اندازہ ہوا۔ اتنی بے شمار فوج اب تک موسیٰ نے نہ دیکھی تھی۔ موسیٰ مجبوراً مقابلے کی طاقت نہ دیکھ کر طنجہ واپس ہوئے اور حریف کے آس پاس کے مواضعات لوٹ مار سے غارت کرتے رہے۔

سبتہ والوں کی امداد کے لئے اندلس کی کشتیاں برابر چکر لگاتی اور ذخائر رسد مہیا کرتی رہتی تھیں۔ اندلس کے لوگ اپنے شہروں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی مدافعت اپنے شہروں اور ناموس کے لئے بہت سخت ہوتی تھی۔ ان کی اس حالت میں غیطشہ شاہ اندلس کی وفات تک کوئی تغیر نہ ہوا اور سب متفق ومتحد رہے۔

رذریق کی تخت نشینی غیطشہ نے اپنی جو اولاد چھوڑی ان میں ثنبرت اور ابتہ بھی ہیں جن کو اہل ملک نے پسند نہ کیا اور انھیں کی بدولت تفرقہ کی بنا پڑگئی۔ اندلس کا شیرازۂ نظم پراگندہ ہوگیا اور سب نے اپنی خوشی سے ایک بہادر وجنگجو سردار رذریق کو بادشاہ بنالیا۔ رذریق کو اندلس کے شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا البتہ وہ وہاں کا مشہور شہسوار اور ایک بڑا جنرل تھا۔ رذریق کی اسی ناموری کی وجہ سے زمام ملک اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔

عمال اندلس کا ملکی رواج | اندلس کے تمام عمال کا دستور تھا کہ وہ اپنی اولاد ذکور و اناث کو پایہ تخت طلیطلہ میں اپنے بادشاہ کے پاس بھیج دیتے تھے۔ بادشاہ کی خدمت سوائے ان کے کوئی دوسرا نہ کرسکتا یہ لوگ زمانہ بلوغ تک یہیں رہتے اور آداب سلطنت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے بالغ ہونے پر بادشاہ انھیں میں ایک کو دوسرے کے ساتھ بیاہ دیتا تھا اور تمام مصارف کا خود کفیل ہوتا تھا۔

دختر بلیان کا اہم واقعہ اور بلیان کی مسلمانوں سے سازش | رذریق کی بادشاہی میں بلیان کی لڑکی بھی اسی رواج کے مطابق حضور میں آئی۔ رذریق نے اس پر فریفتہ ہوکر زبردستی ناجائز تصرف کرلیا یہ بات اہل ملک کو اچھی نہ معلوم ہوئی اور کسی نے اس واقعہ کا حال بلیان کو لکھ دیا۔ بلیان پر اس کا بہت اثر ہوا اور اُس نے غضبناک ہوکر دین مسیح کی قسم کھائی کہ جب تک رذریق کے ملک کو تباہ کرکے رذریق کو دفن نہ کردوں گا چین نہ لوں گا۔ اس کے بعد ہی وہ موسیٰ کی اطاعت قبول کرکے موسیٰ کو اندلس کے شہروں میں لے آیا اور اپنے متعلق اطمینانی معاہدات کرکے موسیٰ کو تسخیر اندلس پر توجہ دلائی اور اندلس کی بے حد تعریفیں کرکے موسیٰ کو مشتاق بنا دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۹۰ھ کے بعد کا ہے۔

ان فتوحات اور اندلس کی مہم کا حال موسیٰ نے ولید کو لکھ بھیجا۔ ولید نے جواب میں لکھا کہ "بہتر ہے۔ مگر ابتداءً معمولی فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہو اور مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں ڈال کر دھوکہ نہ دو" موسیٰ نے پھر لکھا کہ "جس دریا سے ہم کو واسطہ ہے وہ سمندر نہیں ہے بلکہ ایک خوشنما خلیج ہے" ولید نے جواب دیا کہ اگر یہ صحیح ہے تو بھی تھوڑی تھوڑی فوج کے ساتھ داخل ہو"

طریف اور اندلس کی پہلی مہم | چنانچہ موسیٰ نے اپنے موالی میں سے ایک شخص طریف کو بھیجا جس کی کنیت ابوزرعہ تھی۔ چار سو پیادہ اور سو سوار اس کے ساتھ گئے یہ سب چار کشتیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور اس جزیرے میں پہنچے جسے جزیرۂ اندلس کہتے تھے۔ یہ جزیرہ اہل اندلس کا کشتی گھر اور کشتی سازی کا کارخانہ تھا۔ طریف کے یہاں پہنچنے کے بعد اس جزیرہ کو اس کے نام سے منسوب کرکے جزیرۂ طریف کہنے لگے۔

جب تک سب ساتھی نہ آگئے طریف اسی جزیرے میں ایک جانب ٹھہرا رہا پھر اکٹھا ہوکر جزیرے

والوں پر حملہ آور ہوا اور قیدی اور بہت سا مال غنیمت لے کر صحیح سلامت واپس ہوا۔ یہ مال اس قدر زائد اور گراں قدر تھا کہ موسیٰ نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ واقعہ ماہ رمضان ۹۱ھ کا ہے۔

طارق ابن زیاد | اس فتح سے موسیٰ کے حوصلے بڑھ گئے اور اب ان لوگوں نے فتح اندلس کے لئے عجلت کی موسیٰ نے اپنے مولی (غلام) طارق ابن زیاد کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا۔ طارق ملک فارس کے ایک ہمدانی سپاہی تھے بعض کا قول ہے کہ وہ موسیٰ کے آزاد کئے ہوئے نہ تھے بلکہ قبیلہ صدف کے موالی سے تعلق رکھتے تھے۔ غرض موسیٰ نے طارق کو سات ہزار مسلمانوں کے ہمراہ جزیرۂ اندلس پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیجا۔ اس تعداد میں زیادہ تر بربری اور موالی تھے۔ عرب برائے نام تھے۔ اس لوگوں کے پاس صرف چار کشتیاں تھیں۔ انھی کشتیوں میں یہ لوگ سوار ہو کر کئی دفعہ میں آئے اور اس حکمت سے اپنی شان و شوکت کا بھرم قائم رکھا۔ پھر اس نواح میں ایک بلند پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر سب اکٹھے ہو گئے۔ یہ داخلہ ۹۲ھ میں ہوا۔

رذریق کی جنگی تیاریاں | شاہ اندلس کو جب طریف کی غارتگری کا علم ہوا تو وہ اس وقت بنبلونہ کی جنگ میں مشغول تھا اس لئے وہ طریف کے حملے سے متاثر ہو کر واپس ہو گیا پھر جب طارق کے اندلس میں داخلے کا حال معلوم ہوا تو اس کی توجہ اور زیادہ بڑھ گئی اور اس نے پوری تیاری کے ساتھ فوجیں جمع کیں جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ نفر یا کچھ کم و بیش تھی۔ طارق نے یہ خبر سن کر موسیٰ کو فتح جزیرہ کی اطلاع دیتے ہوئے مزید اہتمام کے لئے توجہ دلائی اور لکھا کہ جزیرہ اور بحیرہ پر پورا قبضہ ہو چکا ہے مگر اب شاہ اندلس نے اتنی زبردست تیاری کی ہے کہ ہم میں مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔

موسیٰ نے جس وقت طارق کو اس طرف روانہ کیا تھا اسی وقت سے کشتیاں تیار کرانا شروع کر دی تھیں۔ طارق کے کمک مانگنے تک کثرت سے کشتیاں بن چکی تھیں جس وقت طارق کا خط پہنچا موسیٰ نے اسی وقت پانچ ہزار سپاہی بھیج دئے اس طرح اندلس میں طارق کے پاس مسلمانوں کی کل تعداد بارہ ہزار نفر ہو گئی۔ اس وقت ان کے پاس کافی سے زیادہ لونڈی غلام جمع ہو چکے تھے۔ یلیان بھی اہل بلد کی ایک جماعت کے ساتھ مسلمانوں کے پاس آ گیا تھا وہ ان کو مخفی مقامات کی رہبری کرتا جاتا تھا اور

مسلمانوں کے لئے خبریں حاصل کرتا تھا۔

روذریق کے خلاف سازش جس وقت روذریق بلاد اندلس کے سرداروں اور وہاں کے شہزادوں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے میں صف آرا ہوا اور مسلمانوں کی تعداد اور ان کی باخبری معلوم ہوئی تو روذریق کے لوگوں نے آپس میں مشورہ کرکے کہا کہ "روذریق خبیث ہماری ملک پر مسلط ہوگیا حالانکہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ مسلمانوں کو تو ہمارے وطن میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو صرف مٹھیاں بھرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مطلب پورا ہوجائے گا تو چلے جائیں گے۔ اس لئے اس موقع پر اس خبیث کو دفع کردینا چاہئے یعنی مقابلے کے وقت ایسی صورت نکالنا چاہئے کہ ہمیں اس کے ساتھ شکست ہوجائے" باہم یہ منصوبہ باندھ ان لوگوں نے عین وقت پر روذریق سے دغا کرنے کی ٹھان لی اور اس پر سب متفق ہوگئے۔ روذریق نے ششبرت کو میمنہ اور اَبَہ کو میسرہ پر مقرر کیا تھا اور یہ دونوں شاہ غیطشہ سابق شاہ اندلس کے بیٹے تھے اور شکست کی سازش کرنے والوں کے یہی سرگروہ تھے۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جبکہ اندلس ۸۸ھ سے ۹۰ھ تک تین سال سخت قحط میں مبتلا رہا اور وبائی امراض سے اندلس کی نصف آبادی مرچکی تھی۔ مقابلے کا سال ۹۱ھ ہے جس کو سنہ طریف و خلف کہتے تھے۔

جنگ اور روذریق کی شکست و انجام غرض روذریق و طارق کی جنگ جزیرے میں اس جگہ ہوئی جس کو بحیرہ کہتے تھے۔ یہ جنگ نہایت سخت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روذریق کے میمنہ و میسرہ دونوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ جن پر وہی ششبرت و اَبَہ مقرر تھے۔ اب قلب سے مقابلہ ہوا۔

روذریق نے قلب لشکر پر کچھ دیر تک مسلمانوں سے مقابلہ کیا مگر اس کے قدم جمنے نہ پائے اور ہزیمت کھا کر بھاگا۔ مسلمانوں نے اس جنگ میں خوب بازوؤں کے جوہر دکھائے اور اپنی تیزدستی اور قتل و غارت سے فوج غنیم کو بے حواس کردیا۔

روذریق جو لشکر سے غائب ہوا تو اس کا پتہ کسی کو نہ چلا مگر مسلمان اس کی تلاش میں تھے ایک جگہ

ایک سفید گھوڑا دلدل میں پھنسا ہوا ملا جس پر یاقوت و زبرجد کی مرصع زین کسی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے اس کو نکالا۔ اس کے بعد ایک جڑاؤ لباس بھی ملا۔ ان وجوہ سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ رذریق دلدل میں پھنس کر غرق ہو گیا۔ ورنہ سوائے خدا کے کوئی اس کے حال سے باخبر نہیں ہے۔ نہ وہ زندہ ہاتھ آیا اور نہ کہیں اس کی لاش دیکھی گئی۔

طارق کی مزید فتوحات | اس فتح کے بعد طارق جزیرے کے تنگ راستے سے گزرا اور وہاں سے شہر استجہ میں داخل ہوا۔ استجہ کے لوگوں نے مقابلہ کیا اور ان کی مدد میں وہ لوگ بھی شریک ہو گئے جو رذریق کی جنگ میں شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ مقابلہ بہت اہم تھا اس میں مسلمانوں کے سپاہی کثرت سے کام آئے اور زخمی ہوئے۔ مسلمانوں کو جنگ میں ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا لیکن نتیجے میں اللہ نے ان کی مدد کی، دشمنوں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ گئے۔

اب طارق نے شہر استجہ کے ایک چشمے پر پڑاؤ ڈالا جو نہر کے متصل تھا اور شہر سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت سے اس چشمے کو عین طارق کہتے ہیں۔ طارق کی جرأت اور شہر میں داخلے کے حالات سن کر دشمنوں کے سرداروں پر رعب چھا گیا۔ اور وہ طلیطلہ کی طرف بھاگ گئے کیونکہ پہلے ان کا خیال تھا کہ طارق بھی طریف کی طرح لوٹ مار کر کے چلا جائے گا شہر پر قبضہ نہ رکھے گا۔ طلیطلہ پہنچ کر ان لوگوں نے وہاں کے شہروں پر فوجیں قائم کر دیں۔ اور قلعوں کے دروازے بند کر لئے۔

مغیث رومی اور قرطبہ کی مہم | اب یلیان نے طارق سے کہا کہ اندلس کی بڑی جنگ سے تو فرصت مل گئی ہے۔ میرے آدمی رہبری کے لئے تیار ہیں۔ اب آپ ان کے ساتھ اپنی فوجیں روانہ کر کے طلیطلہ پر قبضہ کیجئے۔ چنانچہ طارق نے ولید ابن عبدالملک کے غلام مغیث رومی کو استجہ سے قرطبہ روانہ کیا اور سات سو سواروں کی فوج ساتھ کی پیادہ سپاہی بالکل نہ دیے کیونکہ مسلمانوں میں سب کو سواری میسر آجانے کی وجہ سے پیدل فوج ہی نہ رہی تھی۔ قرطبہ ان لوگوں کا سب سے بڑا شہر تھا اور آج کل اندلس کا دارالسلطنت اور وہاں کا قیروان ہے۔

پھر قرطبہ فوجیں بھیج کر طارق نے ایک لشکر شہر ریہ کی طرف روانہ کیا اور ایک غرناطہ کی جانب

جوالبیرہ کا ایک مشہور شہر تھا۔ اور خود بڑے بڑے سرداروں کے ساتھ طلیطلہ کے قصد سے روانہ ہوا۔

قبضہ قرطبہ کی مفصل کیفیت

مغیث طارق سے رخصت ہو کر قرطبہ کے حدود میں داخل ہوا اور موضع شقندہ کے چاولوں کے ایک کھیت کو کمینگاہ قرار دے کر اپنی تدابیر میں مصروف ہوا۔ یہ کھیت شقندہ اور طرسل کے درمیان واقع تھا یہاں سے مغیث نے اپنے ساتھ کے جاسوس خبر رسانی کے لئے بھیجے جو کسی کھیت سے ایک چرواہے کو پکڑ لائے۔ مغیث نے اس سے قرطبہ کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ وہاں کے بڑے سردار طلیطلہ چلے گئے ہیں اور والئ قرطبہ کو صرف چار سو محافظوں کے ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ ان لوگوں میں قرطبہ کے ضعیف و کمزور باشندے بھی ہیں۔ پھر مغیث نے فصیلوں کی مضبوطی کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ فصیل بہت مضبوط ہے۔ مگر فصیل کے دروازے پر ایک رخنہ بھی ہے۔ اور یہ دروازہ وہی ہے جو پل کا دروازہ ہے۔

ان حالات سے مغیث کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔ وہ رات کے وقت جب خوب تاریکی پھیل گئی چند لوگوں کے ساتھ تیار ہو کر نہر قرطبہ پر آیا۔ خدا کی قدرت ہے فتح مقدر تھی اس لئے اسباب بھی ویسے ہی پیدا ہو گئے۔ یعنی اس رات کو آسمان سے بارش اور اولہ باری خوب ہوئی۔ فصیل کے چوکیدار بارش و سردی کے ڈر سے پاسبانی سے غافل ہو گئے۔ اس وقت فضا کی یہ کیفیت تھی کہ ہوا کی دھیمی سنسناہٹ کے سوا کچھ نہ سنائی دیتا تھا۔ مغیث اور اس کے ہمراہی نہر کو عبور کر کے فصیل کے پاس آئے۔ نہر سے فصیل تک تیس (۳۰) ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے فصیل پر چڑھنا چاہا مگر کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس کی مدد سے اوپر پہنچ سکتے۔ مجبوراً واپس ہوئے اور اس چرواہے کو لائے اس نے رہبری کی تو ایک رخنہ نظر آیا جو قدرے بلندی پر تھا اور اس کے نیچے ایک انجیر کا درخت تھا۔ ان لوگوں نے رخنہ پر پہنچنا چاہا تو ناکام رہے۔ آخر ایک جری شخص اس درخت پر چڑھا۔ مغیث نے اپنا عمامہ اس کو اتار کر دے دیا۔ عمامے کی مدد سے وہ فصیل پر چڑھ گیا اور اس کے ساتھ بہت سے آدمی اور بھی فصیل پر چڑھ گئے۔ اب مغیث سوار ہو کر شہر کے دروازے پر اپنی فوج کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور جو لوگ فصیل پر پہنچ چکے تھے ان کو حکم دیا کہ دروازے پر پہنچ کر یکایک دربانوں پر

زغہ کردیں۔ یہی دروازہ پل کا بھی تھا اور ان دنوں پل منہدم ہوچکا تھا۔ قرطبہ میں کوئی اور پل نہ تھا اس لئے اس دروازے کو باب الجزیرہ بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے مغیث کے حکم سے ایسا ہی کیا اور ان پر دفعتہً ٹوٹ کر گرے اور انھیں قتل کرکے دروازے کے قفل توڑ کر دروازے کھول دیے۔ مغیث اپنی فوج اور جاسوسوں کو ساتھ لے کر شہر میں داخل ہوگیا۔ اور ایوان حکومت کا قصد کیا جب والی قرطبہ کو یہ خبر پہنچی تو وہ اپنے چار پانچ سو ساتھیوں کے ہمراہ شہر کے مغربی دروازے سے نکلا اس دروازے کو باب اشبیلیہ کہتے تھے اور ایک کنیسہ میں پناہ لی جو شہر کی جانب مغرب واقع تھا۔ یہ کنیسہ بہت مضبوط اور محفوظ تھا اور سینٹ اجلج کے نام سے مشہور تھا۔ گویا یہ کنیسہ ایک چھوٹے سے قلعے کا کام دیتا تھا۔ جس میں والی قرطبہ قلعہ بند ہوگیا تھا۔

فتح ریہ | غرض مغیث نے ایوان حکومت پر قابض ہوکر اس کی حفاظت کا انتظام کیا دوسرے دن کنیسہ کا محاصرہ کرکے طارق کو فتح کی اطلاع دی۔ ادھر جو لشکر فتح ریہ کے لئے روانہ ہوا تھا اس نے ریہ فتح کرلیا۔ ریہ کے مفرور سردار وہاں کے دشوار گزار پہاڑوں میں روپوش ہوگئے اس کے بعد یہ لشکر اس فوج سے جا ملا جو علاقہ البیرہ کی مہم پر مقرر تھی۔

فتح غرناطہ اور مسلمان فاتحوں کا یہودیوں کے متعلق ایک پسندیدہ قانون | (غرناطہ) کا محاصرہ کرکے اُسے بھی فتح کرلیا۔ ان دنوں مسلمان فاتحوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جس نئے شہر کو فتح کرتے اور اس میں ان کو یہودی ملتے تو یہودیوں کو محفوظ حصۂ شہر میں بسا دیتے تھے اور مسلمانوں کی معمولی جماعت حفاظت کے لئے چھوڑ کر خود بڑے بڑے سرداروں کے ساتھ آگے بڑھ جاتے تھے۔ یہی انھوں نے غرناطہ میں کیا۔ مگر علاقہ مالقہ کے شہر ریّہ میں یہ صورت نہیں ہوئی کیونکہ انھیں وہاں یہودی نہ ملے اور نہ ایسی آبادی نظر آئی۔ مسلمانوں نے ریّہ کو صرف جائے پناہ کے طور پر رکھا تھا جب ضرورت ہوتی یہاں محفوظ ہوجاتے تھے۔

فتح تدمیر شاہ تدمیر سے مقابلہ اور اس کی عجیب چال | اب مسلمان ریّہ سے علاقہ تدمیر کو روانہ ہوئے یہ علاقہ اپنے فرمانروا کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے مستقر کا نام

اور یولہ تھا۔ شاہ تدمیر نے بہت سا لشکر مہیا کر کے مقابلہ کیا مگر مقابلہ کمزور رہا اور شاہ تدمیر کو شکست فاش ہوئی۔ مسلمانوں نے اپنی خون آشام تلوار سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو چند نفوس بچ رہے تھے انھوں نے اوریولہ میں پناہ لی۔ انھیں میں ان کا بادشاہ بھی تھا مگر اس حالت میں کہ نہ اُس کے پاس مدافعت کا کوئی سامان تھا نہ کچھ فوج ہی باقی بچی تھی لیکن چونکہ وہ نہایت تجربہ کار اور تیز عقل تھا اس لئے اُس نے اپنے یہاں کی عورتوں کے بال کھلوا کر اُن کے ہاتھوں میں بھالے دے اور انھیں مردوں کی وضع میں مسلح کر کے شہر کی فصیل پر کھڑا کر دیا۔ ان عورتوں کے ساتھ وہ مرد بھی کھڑے ہو گئے جو میدان جنگ سے بچ آئے تھے۔ شاہ تدمیر کو اس لشکری نمائش سے بڑی کامیابی ہوئی مسلمان ان کی ظاہری حالت سے مرعوب ہوگئے اور سمجھے کہ یہ لوگ ہر طرح تیار ہیں پھر شاہ تدمیر خود ایلچی کی وضع بنا کر صلح کی گفتگو کرنے آیا۔ مسلمانوں نے اس کو امان دی اس طرح شاہ تدمیر ایلچی کی وضع میں مسلمانوں میں آتا جاتا رہا اور شرائط طے کر کے صلح کر لی۔

اس تدبیر سے علاقہ تدمیر کو بلا جنگ وجدال کامل امن حاصل ہوگیا اور مسلمان حالت صلح میں اس پر قابض ہوگئے۔

عہدنامہ صلح کی تکمیل کے بعد شاہ تدمیر نے اپنا نام ظاہر کر دیا اور مسلمانوں کو اپنے شہر میں لے گیا۔ جب یہ لوگ شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کی حالت دیکھ کر بہت نادم ہوئے مگر وعدہ پر قائم رہے۔ پھر اس فتح کی اطلاع طارق کو دے کر تھوڑی فوج تدمیر کے پاس چھوڑی اور طلیطلہ کی طرف بڑھے تاکہ طارق سے مل جائیں۔

والی قرطبہ کی گرفتاری
واقعہ کنیسۃ الاسرای

مغیث نے قرطبہ کے کنیسہ کا جو محاصرہ کر رکھا تھا وہ تین ماہ تک قائم رہا محصورین شدت محاصرے کی تاب نہ لا سکے۔ اسی حالت میں ایک دن مغیث نے والی قرطبہ کو صبح کے وقت تنہا بھاگتے ہوئے دیکھا کہ جبل قرطبہ کی طرف بھاگا ہوا جا رہا ہے۔ تاکہ طلیطلہ میں اپنے ساتھیوں سے مل جائے۔ یہ دیکھ کر مغیث نے بھی اس کا تن تنہا تعاقب کیا۔ والی قرطبہ نے اس کو پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تو قسطلیرہ کی طرف بھاگا۔ وہ اس وقت ایک زرد گھوڑے پر سوار تھا۔ جب

مغیث نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس نے دیکھا کہ اب مغیث سر پر آیا ہی چاہتا ہے تو گھبرا گیا اور راستہ کاٹ کر ایک خندق میں جا پڑا جس میں پھنس جانے کی وجہ سے اُس کے گھوڑے کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ گھوڑے سے اتر کر اپنی ڈھال پر بیٹھ گیا۔ اسی عالم میں مغیث نے آ کر اس کو گرفتار کر لیا۔ ملوک اندلس میں اُس کے سوا کوئی شخص گرفتار نہیں ہوا اور ملوک یا مسلمانوں کی امان میں آ گئے۔ یا جلیقیہ کی طرف بھاگ گئے۔ اس سے فارغ ہو کر مغیث بقیہ سرداران قرطبہ اور محصورین کنیسہ کے پاس پہنچا اور ان سب کو قید کر کے قتل کر دیا۔ اس تاریخ سے اس کنیسہ کو کنیسۃ الاسراء (قیدیوں کا گرجا کہنے لگے) صرف والی قرطبہ مغیث کی قید میں رہا اس غرض سے قتل نہ کیا گیا کہ اس کو امیرالمومنین کے پاس زندہ پہنچا دیا جائے۔ بعد ازاں مغیث نے قرطبہ کے یہودیوں کو جمع کر کے شہر میں آباد کیا اور قرطبہ کا ایوان حکومت اپنے لئے مخصوص کر کے شہر اپنے ساتھیوں کے لئے چھوڑ دیا

طلیطلہ کی مہم ۔ شہر پر قبضہ اور مائدہ سلیمان کی دستیابی

طارق جب اپنی فوجوں کو لئے ہوئے طلیطلہ پہنچے تو شہر خالی پایا۔ اپنے تھوڑے ساتھی انتظام کے لئے چھوڑے اور خود مع لشکر کے دریائے وادی الحجارہ سے گزر کر غنیم کا تعاقب کرتے ہوئے ایک درے میں پہنچے جو بعد میں فج طارق کے نام سے مشہور ہوا اس درے سے گزر کر اُس شہر میں پہنچے جو پہاڑ کے عقب میں واقع تھا۔ اس شہر کا نام مائدہ تھا۔ اس کا نام ہونے کی وجہ تھی کہ اس میں سیدنا سلیمان علیہ السلام کا مائدہ دستیاب ہوا تھا یہ مائدہ سبز زبرجد کا بنا ہوا تھا۔ اس میں پائے لگے ہوئے تھے جن کی تعداد تین سو پچہتر تھی۔ شہر اور مائدہ پر قبضہ کر کے طارق نے سامنے کے ایک اور شہر کو فتح کیا اس میں بھی بہت سے زیورات اور دولت غنیمت ملی۔ اس کے بعد طارق آگے نہیں بڑھے اور ۹۳ھ میں یہیں سے طلیطلہ کی طرف واپس ہو گئے۔

اندلس میں موسیٰ کی افواج کا داخلہ

اس کے بعد رمضان ۹۳ھ میں موسیٰ کی افواج قاہرہ حرکت میں آئیں جن کی تعداد اٹھارہ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ چونکہ موسیٰ کو طارق کی فتوحات کی خبر پہنچ چکی تھی اور وہ طارق پر حسد کرنے لگے تھے اس لئے جب وہ اسی سال جزیرۂ اندلس میں داخل ہوئے اور ان سے اسی راستے پر آگے بڑھنے کو کہا گیا جس سے طارق گئے تھے تو انھوں نے ازراہ حسد یہ راستہ اختیار کرنے سے انکار

کر دیا۔ پھر ایلیان کے ساتھ کئے ہوئے غیر مسلم رہبروں نے اس سے کہا کہ اگر یہ خیال ہو تو ہم آپ کو اس راستے سے لیجائیں گے جو پہلے سے بہتر ہے اور ایسے شہروں تک پہنچائیں گے جو طارق کے مفتوحہ شہروں سے زیادہ شاندار ہیں اور آج تک کسی سے فتح نہیں ہوئے۔ اللہ کو منظور ہے تو وہ آپ کے ہاتھوں فتح ہوں گے موسیٰ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی سے بہت خوش ہوئے ورنہ طارق کی فتوحات اور ان کے طرز عمل سے بہت رنجیدہ تھے۔

فتح شذونہ و قرمونہ اب ایلیان کے لوگ موسیٰ کو مدینہ شذونہ لے گئے جس کو انھوں نے لڑ کر فتح کیا۔ پھر شہر قرمونہ پہنچے۔ یہ شہر نہایت مضبوط تھا اندلس بھر میں اس سے زیادہ محفوظ و مضبوط قلعہ تھا اور نہ محصورین کے لئے اس سے بہتر کوئی جائے پناہ تھی۔ ساتھ کے امان یافتہ غیر مسلموں نے موسیٰ سے کہا کہ اس شہر پر لڑنے کی ضرورت نہیں ہے یہ صرف حیلہ و تدبیر اور نرمی سے سر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایلیان یا اس کے آدمی شکست خوردہ لشکر کی وضع بنا کر پناہ لینے کے بہانے سے بابِ فصیل پر پہنچے قلعے والوں نے دھوکے میں آکے ان کو اندر بلا لیا۔ ان لوگوں نے رات کے وقت مسلمانوں کے پاس اپنے سوار بھیج کر اپنی کامیابی کی اطلاع دی اور باب قرطبہ کھول دیا۔ مسلمانوں کا لشکر دفعتہً دریائوں پر حملہ آور ہو کر قرمونہ میں داخل ہو گیا۔ اور شہر پر قبضہ کر لیا۔

فتح اشبیلیہ اس طرح قرمونہ کو فتح کر کے موسیٰ اشبیلیہ پہنچے۔ یہ شہر اندلس کے شہروں میں اپنی شان و عمارات اور مضبوطی کے لحاظ سے بہت بڑا شہر تھا اور قرطیوں کے غلبے سے پہلے اندلس کا دارالملک تھا۔ اس میں قدیم عمارات کے آثار بہت تھے۔ جب قوم قرط کا غلبہ ہوا تو انھوں نے بجائے اشبیلیہ کے طلیطلہ کو پایۂ تخت قرار دیا اور رومانیوں کا شرف اور مذہبی تفقہ اور انکی امارت اشبیلیہ تک محدود رہ گئی۔ غرض موسیٰ نے اس شہر پر کئی ماہ تک محاصرہ قائم رکھا تب خدا کی مدد سے یہ فتح ہوا اور اشبیلیہ کے رؤسا بھاگ کر شہر باجہ چلے گئے۔ اشبیلیہ میں بھی موسیٰ نے یہودیوں کو بلا کر آباد کیا یہاں سے موسیٰ شہر ماردہ پہنچے۔

شہر ماردہ کی مہم۔ واقعہ برج شہدا یہ شہر بھی بعض ملوک اندلس کا پایۂ تخت تھا۔ اور اس میں بھی آثار قدیمہ

پل اور محلات اور گرجے تھے جن کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ موسیٰ نے اس شہر کا بھی محاصرہ کر لیا۔ مگر محصورین مقابلے پر تیار تھے موسیٰ نے یکبارگی حملہ کیا تو انھوں نے فصیلوں پر سے سختی کے ساتھ حملے کا جواب دیا یہ فصیلیں موسیٰ کی افواج سے ایک میل یا کچھ زیادہ فاصلے پر تھیں۔ جب موسیٰ نے دیکھا کہ ان کا زور کم نہیں ہوتا اور یہ لوگ رہ رہ کے مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں تو انھوں نے فصیل کے ایک نقب کا پتہ لگایا جو چٹانوں کے درمیان واقع تھی۔ اس میں رات کے وقت سواروں اور پیادوں کو پوشیدہ کر دیا صبح کے وقت دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ دشمن جس طرح ایک دن پہلے لڑے تھے اسی طرح پوری طاقت کے ساتھ لڑنے کے لئے نکلے ان کے نکلتے ہی کمینگاہ کے لوگ بھی تلواریں سنبھالے ہوئے ٹوٹ پڑے نہایت کامیاب مقابلہ رہا دشمن بری طرح مارے گئے۔ چند نفوس جو بچ رہے تھے بھاگ کر شہر کے اندر چلے گئے۔ اس شہر کی فصیلیں بہت مضبوط تھیں اس سے قبل ایسی عمارات کا پتہ نہیں ملتا اس کی مضبوطی کی وجہ سے مسلمانوں کو ان پر آسانی سے قابو نہ ملا۔ کئی مہینے گزر گئے آخر فصیل کے ایک برج میں بذریعہ دبابہ سرنگ لگانا شروع کی۔ مگر جیسے ہی پتھر اکھڑے اندر کے ایک غار کا راستہ نکل آیا۔ اس غار کا نام اہل اندلس کی زبان میں لاشنہ ماشہ تھا۔ اس غار میں پہنچے تو مسلمانوں کے کدالیوں اور پھاوڑوں نے کام نہیں دیا۔ وہ اسی کوشش میں تھے کہ دشمنوں کی فوج آپڑی جتنے مسلمان اندر تھے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ اس واقعے کی بنا پر اس برج کا نام برج شہدا ہو گیا۔ جو اب تک مشہور ہے مگر اس نام کی تاریخ سے کم لوگ واقف ہوں گے۔

فتح ماردہ کا عجیب عنوان

یہ واقعات رمضان ۹۴ھ کے ہیں۔ عید الفطر کے دن موسیٰ کو فتح ہوئی جس کی دلچسپ کیفیت یہ ہے کہ شہدا کے واقعے کے بعد محصورین کی ہمت بہت بڑھ گئی اور انھوں نے فخریہ کہا کہ ہم نے موسیٰ کو شکست دی اگر وہ صلح منظور کرتے ہوں تو آج ہی کر لیں چنانچہ جلد تصفیہ کرنے کی غرض سے اپنے سردار موسیٰ کے یہاں بھیجے۔ پہلے دن جب یہ لوگ موسیٰ سے ملے تو انھوں نے موسیٰ کی داڑھی سفید دیکھی گفتگو کر کے چلے آئے کیونکہ کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ پھر دوبارہ عید سے ایک دن قبل ملے تو انھوں نے موسیٰ کی داڑھی سرخ دیکھی۔ اُس دن موسیٰ نے مہندی لگائی تھی۔ یہ دیکھ کر

انھیں بڑا تعجب ہوا اور آپس میں کہنے لگے کہ شاید یہ آدم خور ہیں ورنہ داڑھی کا رنگ سرخ ہونے کی کیا وجہ ہے حالانکہ کل تک سفید تھی۔ پھر سہ بارہ عید کے دن ملنے آئے اب کے موسیٰ کی داڑھی سیاہ پائی نہایت حیران ہوئے اور اہل شہر سے آکر کہا کہ "اے احمقو" تم تو انبیاء سے جنگ کر رہے ہو جو اپنے آپ کو جس رنگ کا چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں دیکھو ان کا بادشاہ بوڑھے سے جوان ہو گیا۔ جاؤ جو کچھ وہ مانگے وے دو اور اس پر راضی ہو کر صلح کر لو کہ کینگاہ والی لڑائی میں جو لوگ مارے گئے ہیں ان کا تمام مال۔ اور جلیقیہ کی طرف بھاگنے والوں کی دولت مسلمانوں کے لئے اور گرجوں کے اموال و زیورات موسیٰ کے لئے دینا منظور ہے چنانچہ اس پر سب متفق ہو گئے اور انھوں نے عید الفطر کے دن سنہ ۹۴ھ میں مسلمان فاتحوں کے لئے شہر کے دروازے کھول دئے۔

مسلمانوں کے داخلے کے بعد اہل اشبیلیہ نے مسلمانوں کے ساتھ فریب کیا اور نقض عہد کر کے باجہ ولبلہ کے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر بیٹھے۔ ان کے اس اچانک حملے سے اسی مسلمانوں کی جانیں ضائع ہو گئیں جو لوگ اس جنگ سے بچے انھوں نے ماردہ پہنچ کر موسیٰ کو خبر دی جب موسیٰ ماردہ کو فتح کر چکے تو اپنے بیٹے عبد العزیز کو لشکر دے کر اشبیلیہ روانہ کیا۔ عبد العزیز اشبیلیہ فتح کر کے پھر موسیٰ کے پاس گئے

طارق و موسیٰ کی ناگوار ملاقات | ختم شوال سنہ ۹۴ھ کے بعد موسیٰ نے طلیطلہ کے قصد سے کوچ کیا تو راستہ میں طارق نے استقبال کیا۔ اور نہایت عقیدت و احترام ظاہر کر کے موضع طلبیرہ میں ملاقات کی ۔ موسیٰ نے جب طارق کو دیکھا کہ تو کوڑا اسنبھالا اور اس کے سر پر کئی چابک رسید کئے اور اپنی رائے کے خلاف عمل کرنے پر تنبیہ کے پھر طارق کو ساتھ لے کر طلیطلہ گئے اور طارق کو مال غنیمت اور مائدہ پیش کرنے کا حکم دیا انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی مگر مائدے کا ایک پایہ اکھاڑ کر رکھ لیا۔ جب موسیٰ نے پوچھا کہ یہ پایہ کہاں ہے تو کہہ دیا مجھے نہیں معلوم میں نے تو ایسا ہی پایا ہے۔ مجبوراً موسیٰ نے دوسرا پایہ سونے کا تیار کرایا اور مائدے کے لئے غلاف بنوا کر اس میں رکھا۔ پھر یہاں سے بڑھ کر موسیٰ نے سرقسطہ اور اس کے ملحقات اور شہر فتح کئے۔

دربارِ خلافت سے موسیٰ طارق اور مغیث کی طلبی

۹۵ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا ایلچی آیا اور وہ موسیٰ کو طارق اور مغیث کے ساتھ اندلس سے اپنے ہمراہ لے گیا۔ اندلس پر موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کو مقرر کیا اور اشبیلیہ کو اس کا دارالحکومت قرار دیا۔ چونکہ یہ شہر ایک زبردست دریا کے کنارے واقع تھا جس کا عبور کرنا بہت دشوار تھا اس لئے یہ کوشش کی گئی کہ اشبیلیہ میں مسلمانوں کے جہاز رہیں۔ اور وہ "باب الاندلس" مقرر ہو جائے۔

غرض یہاں کے انتظامات عبدالعزیز پر چھوڑے گئے، موسیٰ، طارق، مغیث اور ان کے ساتھ والیٔ قرطبہ جس کو مغیث نے گرفتار کیا تھا دارالخلافت دمشق کو روانہ ہوئے۔ راستے میں مغیث نے دربارِ خلافت سے اپنے خصوصیات و تقرب کا اظہار کیا۔ اس پر موسیٰ نے والیٔ قرطبہ کو مغیث سے لے لینا چاہا تاکہ خود اس قیدی کو دربار میں پیش کرے۔ مگر مغیث نے دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس کو خود خلافت پناہ کے حضور میں پیش کروں گا۔ موسیٰ نہ مانے اور ان کو اس معاملے میں ایسی کد ہو گئی کہ انھوں نے مغیث سے زبردستی چھین لیا۔ پھر لوگوں نے موسیٰ سے کہا کہ اگر تم اس کو زندہ لے جاؤ گے تو مغیث یہ کہیں گے کہ میں نے اس کو گرفتار کیا ہے۔ اس لئے اس کو قتل کر ڈالنا بہتر ہے۔ چنانچہ موسیٰ نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد دارالخلافت پہنچے۔ اس وقت ولید کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے بجائے سلیمان خلیفہ تھے۔

اندلس میں عبدالعزیز ابن موسیٰ کی امارت اور شہادت کا افسوسناک واقعہ

اندلس میں یہ رنگ تھا کہ عبدالعزیز ابن موسیٰ نے اپنے زمانہ امارت میں رزوریق کی بیوی ام عاصم سے نکاح کر لیا تھا اور اس سے بہت محبت کرنے لگے تھے ایک دن اس نے عبدالعزیز سے کہا کہ بادشاہ جب تک تاج نہ لگائیں ان پر بادشاہی زیب نہیں دیتی۔ اگر تم کہو تو میں اپنے پاس کے سونے اور جواہرات سے تمھارے لئے تاج تیار کر دوں عبدالعزیز نے عذر کیا کہ ہمارے مذہب میں ایسا نہیں ہے۔ ام عاصم نے اصرار کیا اور کہا کہ جو کام تم خلوت میں کرو گے اس کو تمھارے مذہب والے کیسے جان جائیں گے۔ سب کے سامنے تاج لگانے کی ضرورت نہیں صرف میری خوشی کے لئے گھر میں لگا لیا کرنا۔ غرض عبدالعزیز اس کے اصرار سے مجبور ہو گئے اور خلوت میں تاج استعمال کرنے لگے۔ ایک دن ام عاصم کے پاس سر پر تاج رکھے ہوئے بیٹھے تھے کہ

قرآن مجید کے ترجمے

(مشرقی زبانوں میں)

تبلیغ کے سلسلے میں مسلمانوں کی کوششیں بہت محدود رہی ہیں کہ ابتدا ہی سے ان کا کوئی تبلیغی مرکز نہیں ہے، نہ آج تک اس کام کے لئے کوئی منظم اور باقاعدہ طریق کار ان کی طرف سے عمل میں لایا گیا۔ سوائے اس کے کہ علماء، صوفیاء اور واعظین کے طبقے میں سے بعض برگزیدہ نفوس اعلائے کلمۃ اللہ کے اس مقدس مگر صبر آزما فرض کو انجام دیتے رہے اور وہ بھی نہایت بے سروسامانی کی حالت میں۔ اس کے برعکس مسیحی مبلغین نے، جن کو تمام عیسائی دنیا اور دول مسیحیہ کی طرف سے بے اندازہ امداد و اعانت حاصل ہے، اپنے مشن کا جال دنیا کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں پھیلا رکھا ہے، اور گو مسلمانوں کی خاموش، غیر منظم اور شخصی تبلیغ کے مقابلے میں ان کی مساعی غیر مشکور رہی ہوں، مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں بائبل کا ترجمہ نہ ہوا ہو، باایں ہمہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے تراجم کا دائرہ بھی وسعت میں بائبل سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ چنانچہ مغرب میں، یونانی، لاطینی، اطالوی، پرتگالی، سویڈی، سروی، پولونی، اسپینی جرمنی، فرنچ، روسی، انگریزی حتیٰ کہ اسپرانٹو تک میں، اور مشرق میں قریب قریب تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، میری رائے ناقص میں تو یہ بھی "کلام الٰہی" کا ایک معجزہ ہے کہ اس نے مشرق اور مغرب کی مختلف زبانوں میں جلوہ فرما ہو کر ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف عربی دنیا بلکہ کافۃ الناس کے لئے نازل ہوا ہے!

رحمت حق بن کے آیا ساری دنیا کے لئے!

فرقان مجید کے ان مشرقی اور مغربی تراجم پر ایک فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر شوویں V. Chauvin

نے، جو لیج (یا لیژ) (Leige) یونیورسٹی کا پروفیسر ہے، فرانسیسی زبان میں ایک خاص کتاب لکھی ہے اس میں سے اخذ کر کے ہم بالفعل مشرقی تراجم کا ذکر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ مشرق کی کتنی زبانوں میں کتاب سماوی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر موصوف کی یہ کتاب دراصل اس سلسلے کی دسویں جلد ہے جس میں اس نے ہر فن سے متعلق ایک جلد میں ان مختلف علوم و فنون کے ماتحت اُن تمام عربی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو یورپ میں سنہ ۱۸۱۰ء سے لے کر سنہ ۱۸۸۵ء تک ۷۵ برس میں (اصل یا ترجمہ) شائع ہوئی ہیں چنانچہ اس دسویں جلد میں اس نے قرآن کے متون مخطوطہ و مطبوعہ تفاسیر اور یورپی تراجم کے جتنے اڈیشن مشرق اور مغرب میں نکلے ہیں ان سب کو بیان کیا ہے۔ اور ضمناً بعض مفید ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کے تراجم مغربی و مشرقی وغیرہ۔

یہ کتاب سنہ ۱۹۰۷ء میں لیپزگ (جرمنی) سے شائع ہوئی ہے، اور اس لحاظ سے گذشتہ ۲۳ برسوں میں جتنے تراجم قرآن السنۂ مختلفہ میں ہو چکے ہیں ان کا ذکر اس میں نہیں آیا۔ البتہ ہم نے کہیں کہیں حواشی میں حسب معلومات ان تراجم مابعد کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے جن مشرقی زبانوں میں تراجم قرآن کا ذکر کیا ہے ان کے علاوہ بھی اور مشرقی زبانوں مثلاً چینی، ملیالم، تیلگو، ہندی، مرہٹی وغیرہ میں بھی قرآن مجید کے ترجے ہو چکے ہیں۔

اختر

مرہٹی | حسب ذیل تراجم اس زبان میں موجود ہیں :-

(۱) سلیمان بن جیرول اور مشیل ابن خصدانی یہودی کا قرون وسطیٰ میں کیا ہوا ترجمہ۔ سنہ ۱۸۵۵ء سنہ ۱۸۵۵ء سنہ ۱۸۷۳ء، سنہ ۱۸۸۶ء اور سنہ ۱۸۹۵ء۔

(۲) جیکب لیوی کا ترجمہ (المتوفی سنہ ۱۹۳۶ء)

Bibliographie des Ouvrages Arabes ou Relatifs Aux Arabes.

(۳) ریکنڈورف (A. Reckendorf.) کا ترجمہ، لائپزگ ۱۸۵۷ء

(۴) " " (" ") مطبوعہ ہالے و لائپزگ ۱۸۵۶ء تا ۱۸۵۹ء

فارسی | فارسی تراجم[1] میں ۱۲ ترجموں کا ذکر ہے، جو ایران اور ہندوستان کے مطبوعہ یا قلمی ہیں۔ اور ان کے نسخے یورپ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، تراجم فارسی کی فہرست میں صادق خوانساری کے ایک مطبوعہ لیتھوگراف نسخہ طہران ۱۲۸۵ھ کا ذکر ہے جس کا ایک نسخہ عجائب خانہ لندن میں موجود ہے۔ انھی تراجم میں ایک وہ قلمی نسخہ بھی ہے جو ٹیپو سلطان کا بتایا گیا ہے۔ غالباً یہ ٹیپو کے کتب خانہ کا کوئی نسخہ ہوگا۔ یا اس کے مطالعہ خاص کا۔

ترکی | اس زبان میں حسب ذیل تراجم کا ذکر ہے۔

(۱) مخطوطات مختلفہ جو یورپ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

(۲) اسمٰعیل فرخ آفندی کا ترجمہ مع تفسیر طبع قسطنطنیہ ۱۲۸۲ھ، ۱۸۶۵ء، طبع جدید ۱۲۸۶ھ

(۳) محمد خیر الدین کا ترجمہ ۴ جلدوں میں طبع بولاق ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء)

آرمینی | ترجمہ جو ۱۸۳۰ء میں کیا گیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برلن کے کتب خانے میں موجود ہے۔

جاوی | اس میں تین تراجم ہیں :-

(۱) ترجمہ جاوی جس کا ذکر جرنل ایشیاٹک ۱۸۳۲ء جلد ۱ صفحہ ۲۵۰-۲۵۸ میں ہے۔

(۲) ترجمہ ایس۔ کیزر (S. Keyzer) در زبان جاوا مطبوعہ ۱۸۶۳ء

(۳) ترجمہ جاوی، مطبوعہ بٹیویا، لینگ کمپنی، ۱۸۵۹ء

مکاسری | جاوا کے قریب جزیرۂ مکاسر (Macassare) کی زبان۔ اس میں ۲ ترجمے ہیں :-

---

(۱) فارسی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ شیخ سعدی شیرازی کا ہے اس کے بعد کئی ترجمے ہوئے۔ ہندوستان میں سب سے پہلا فارسی ترجمہ شاہ ولی اللہ کا ہے جو فتح الرحمٰن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔
اختر

(۱) ڈونسیلارد (W. M. Donselaar.) کا ترجمہ مطبوعہ روٹرڈام ۱۸۶۱ء
(۲) میتھس (B. F. Mathes) کا ترجمہ، اس کا مقدمہ ملیئس H. C. Millies نے لکھا ہے۔

ملائی | زبان جاوی کے علاوہ یہ ایک اور زبان ہے جو ملک جاوا میں بولی جاتی ہے اس کے لئے حروف عربی استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس زبان کا ایک ترجمہ مدت ہوئی ہماری نظر سے گزرا تھا۔ اس میں ۳ تراجم ہیں:-

(۱) ترجمہ قرآن بزبان ملائی از ورنڈلی (Werndly) مطبوعہ ۱۸۴۰ء۔
(۲) میتھس کا ترجمۂ قرآن بزبان ملائی
(۳) مخطوطہ لیڈن نمبر ۱۶۹۶

سنسکرت | "قرآن شریف" مطبوعہ رزاقی پریس، فلسکیپ سائز، صفحات ۶۱۴ بزبان سنسکرت، مطبوعہ لیتھو گراف کانپور ۱۸۹۷ء۔ اس کا ذکر لندن کے مشہور مشرقی کتابوں کے تاجر لوزیک کی فہرست (Luzac's Oriental List.) بابۃ جولائی۔ اگست ۱۸۹۸ء میں ۱۹۳ نمبر پر ہے۔ اور قیمت دو شلنگ بتائی ہے۔

تامل | حبیب محمد القاکیری کا ترجمۂ قرآن مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۶ھ ۱۳۰۰ھ صفحات ۶۲۲ لنکاشائر کے انڈپنڈنٹ کالج کے کتب خانے میں قرآن مجید کا ایک حصہ تامل حروف میں پتوں پر لکھا ہوا موجود ہے۔ ایک مدراسی اہل قلم دنیکٹ رمن نے بھی حال ہی میں تامل زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے۔

اروی | اروی اور تامل زبان میں ترجمۂ قرآن بخط عربی

بنگالی | (۱) ترجمۂ قرآن از گریس چندرسین ۳ جلدوں میں، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ء۔ ۱۸۸۶ء
(۲) ترجمۂ بنگالی از نعیم الدین و غلام سرور، کرایتہ ۱۸۹۱ء

پشتو | بعض سورتوں کا ترجمہ بزبان پشتو۔ اس زبان میں زیادہ تراجم نہ ہونے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ افغانستان کے لوگ عموماً عربی فارسی کے عالم ہوتے ہیں۔ اور اس لئے پشتو ترجمے کی ضرورت نہ پڑتی ہوگی۔

پنجابی ترجمۂ قرآن بزبان پنجابی لیتھو ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) و ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) مع ترجمہ فارسی۔ اس ترجمے کا ایک نسخہ عجائب خانہ لندن کے کتب خانے میں موجود ہے۔

سندھی (۱) ترجمہ عزیز اللہ متعلوی، طبع بمبئی ۱۲۹۳ھ

(۲) ترجمہ محمد صدیق طبع بمبئی ۱۹۰۱ء

گجراتی(۱) (۱) عبد القادر کا ترجمہ طبع بمبئی ۱۲۹۵-۹۶ھ (۱۸۷۹ء)

اردو تراجم قرآن

اُردو میں متعدد تراجم شائع ہو چکے ہیں(۲)۔ پروفیسر شودرن نے حسب ذیل تراجم کا ذکر کیا ہے:۔

---

(۱) گجراتی میں یہ دو بہترین ترجمے بعد کو شائع ہوئے ہیں: (۱) پروفیسر اصفہانی (الفنسٹن کالج بمبئی) کا گجراتی ترجمۂ قرآن ۲ جلدوں میں بمبئی سے شائع ہوا ہے۔ ایک کالم میں اصل متن اور دوسرے کالم میں ترجمہ ہے، حواشی میں تفسیری نوٹ ہیں۔ زبان اور صحت کے لحاظ سے بہترین ترجمہ ہے۔ (۲) ترجمہ حضرت مولانا صوفی میر محمد یعقوب شاہ صاحب چشتی صابری دو جلدوں میں، صفحات ۱۵۴۰ طبع بمبئی ۱۹۳۰ء

(۲) موجودہ زمانے کے تراجم اردو میں اصحاب ذیل کے ترجمے اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم
۲۔ مولانا اشرف علی تھانوی
۳۔ مولوی ابو الفضل احسان اللہ عباسی
۴۔ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی
۵۔ مولانا محمود الحسن مرحوم شیخ الہند
۶۔ مولوی مقبول احمد شیعی
۷۔ مولوی فتح محمد جالندھری

مزید تراجم اردو کے لئے دیکھو الفہرست مرتبہ محمد سجاد مرزا بیگ صفحہ ۲ و ۴

اختر

جامعہ۔ اردو میں قرآن کے ترجموں کی تعداد ۴۰ سے زیادہ ہو چکی ہے۔

(۱) ترجمہ قرآن بزبان اردو مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۰۳ء (بحوالہ تاریخ ادب الہند از گارسن دتاسی ج ۳ صفحہ ۳۸۰)

(۲) ترجمہ مرزا کاظم علی جوان مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۰۴ء (دتاسی ج ۲ صفحہ ۹۳)

(۳) موضح القرآن از مولانا شاہ عبدالقادر (ابن شاہ ولی اللہ) دہلوی مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۲۴۵ھ (سنہ ۱۸۲۹ء) دو جلد - اس کے مختلف اڈیشنوں کا ذکر کیا ہے -

(۴) ترجمہ شاہ رفیع الدین طبع کلکتہ سنہ ۱۲۵۴ھ (سنہ ۱۸۳۸ء، سنہ ۱۰۳۵ء) ؛ مختلف اڈیشن)

(۵) ترجمہ گمنام مطبوعہ لکھنؤ لیتھو سنہ ۱۸۴۰ء

(۶) سید احمد خاں کا ترجمہ طبع علیگڑھ سنہ ۱۸۸۰ء (غالباً تفسیر کو ترجمہ سمجھ لیا ہے -

(۷) ترجمہ ابراہیم بن عبدالعلی مطبوعہ آرہ سنہ ۱۸۸۵ء

(۸) ترجمہ محمد فیروز الدین، سیالکوٹ سنہ ۱۸۹۰ء

(۹) ترجمہ غیر معروف طبع دہلی سنہ ۱۸۹۲ء

(۱۰) ترجمہ علی بہادر (گارسن دتاسی ج ۱ صفحہ ۱۰۷)

(۱۱) ترجمہ امانت اللہ شید اقلمی موجودہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ (دتاسی ج ۳ صفحہ ۱۰۲)

چینی قومیت و جمہوریت

ڈاکٹر سن یٹ سین کے تین اصول (۱)

۲۔ جمہوریت

جمہوریت کا مفہوم

ایک جمعیت — ایک منظم جمعیت کے افراد کو عوام کہتے ہیں یا جمہور۔ جمہوریت کے اندر جو خصوصیت ہو وہ کیا ہو؟ وہ ایک قوت ہو یا طاقت، احکام کو نافذ کرنے اور جمہور کو منسلک کرنے کی قوت، بس یہی اس کی تعریف ہو۔ جمہوریت وہ قوت ہے جس سے عوام حکومت کی نگرانی کرتے ہیں، اور حکومت ان کے کام چلاتی ہے .... نگرانی عوام کے ہاتھ کا کام ہو، عوام کے کام چلانا انتظام سے مراد ہے۔ وہ قوت جس پر عوام کے کام کے ربط وضبط، حل و عقد کا انحصار ہے جمہور کی سیاسی قوت ہو۔ جمہور کی سیاسی قوت سے جس جمعیت کو چلایا جاتا ہو، اس کو جمہوریت کہتے ہیں۔

جمہوریت کا وظیفہ

جمہوریت کا وظیفہ کیا ہے؟ حال پر نظر ڈالنے اور ماضی پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ جمہوریت کا وظیفہ جو ہے اس کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہو کہ جنس انسان کی زندگی کا محفوظ اور قائم رکھنا۔ انسان کی زندگی کا قائم رکھنا دو اہم باتوں پر منحصر ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان کی حفاظت ہو، دوسرے یہ کہ پرورش ہو۔ انسان کو روزانہ حفاظت اور پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ حفاظت سے مراد مدافعت کرنا ہے، خواہ انفرادی خواہ اجتماعی، مدافعت کی قوت کافی ہو تب انسان کی زندگی باقی رہ سکتی ہو۔ پرورش کا مطلب روزی تلاش کرنا ہے، یہ حفاظت اور پرورش جنس انسان کے لئے ایسی دو اہم باتیں ہیں جن سے انسان کا بے نیاز ہونا محال ہو مگر چونکہ انسان اپنی زندگی باقی رکھنا چاہتے ہیں، اور جانور بھی۔ اور چونکہ انسان اپنی مدافعت

کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے حیوان بھی، اور چونکہ اولادِ آدم کو کھانے کی ضرورت ہے اور جانور کو بھی۔ اس لئے ان میں تصادم اور تنازع پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ بشر کو تنازع للبقار کے لئے جنگ کرنا پڑتی ہے اور غیر ذی عقول کو بھی اس لئے جنگ ایک ایسی چیز ہے جس سے بچنا محال ہے، اور برابر جاری رکھنا پڑتا ہے۔ ان وجوہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جمہوریت بھی ایک آلۂ حرب ہے جس کے ساتھ انسان اپنی بقا کے لئے جنگ کرتے ہیں۔

تنازع کی تدریج

زمانے کے لحاظ سے تنازع کو کئی درجے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ . . . . چونکہ ہم جمہوریت کی اصلیت دریافت کرنا چاہتے ہیں لہٰذا ہم زمانے کے اعتبار سے تنازع کے درجات مرتب کرتے ہیں . . . . سب سے پہلا وہ زمانہ تھا جس میں انسان اور جانور کے درمیان جنگ ہوتی تھی۔ اس وقت حقوق جیسی چیز استعمال کرنے کی گنجائش نہ تھی بلکہ صرف قوت سے کام لیا جاتا تھا۔ دوسرا عہد وہ تھا جس میں انسان اور دیوتاؤں کے مابین نزاع ہوتی تھی، خوشی غم، آفت، برکت یہ سب چیزیں دیوتاؤں کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ نذر نیاز اور قربانی سے ان کی خوشامد کی جاتی تھی۔ تیسرا وہ وقت تھا جس میں انسان انسان سے لڑتا تھا ملک کی ملک کے ساتھ جنگ ہوتی تھی۔ ایک قوم دوسری قوم سے لڑ بیٹھتی تھی۔ یہ شہنشاہیت کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ گویا کہ وہ تنازع کا چوتھا عہد ہے جس میں ایک قوم اور ایک ملک کے اندر جنگ ہوتی ہے۔ رعایا بادشاہ سے لڑتی ہے۔ یہی زمانہ ہے کہ نیک بد سے۔ انصاف طاقت سے مظلوم جابر سے نزاعات کرتے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں عوام اپنے حقوق کے لئے ہتھیار اٹھاتے ہیں لہٰذا اس کو عہدِ جمہوریت کہیں گے۔

چین میں جمہوریت کا تخیل

دو ہزار برس پہلے کانفوشش اور مانشش دونوں کے دونوں جمہوری حکومت کے قائل تھے۔ کانفوشش کہتے ہیں، عالمگیر قانون اس لئے قائم رہ سکتا ہے کہ دنیا جمہوری ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانفوشش ایک ایسی عالمگیر حکومت کے قائل تھے جس کے تمام انتظامات عوام کے ہاتھ میں ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یو اور شون کو مانتے تھے اس لئے کہ یو اور شون کا اصول حکومت یہ تھا کہ وہ حکومت کو اپنی ذاتی جائداد نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے طرزِ حکومت گو بظاہر شہنشاہیت معلوم ہوتے تھے مگر حقیقت میں حکومت کی

زح جہوری حکومت کی روح تھی۔ اس وجہ سے کانفوشس ان کے نام عزت سے لیتے تھے۔ مانشس کہتے ہیں کہ "رعایا افضل ہے۔ تخت شاہی حقیر چیز ہے۔ اور پادشاہ اسفل ہے" دوسری جگہہ کہتے ہیں کہ "پادشاہ رعایا کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان کے کانوں سے سنتا ہے"، پھر کہتے ہیں کہ "میں نے ایک بدمعاش جیو کا قتل سنا ہے نہ کہ ایک پادشاہ کا"، اس زمانے میں مانشس کو یہ یقین ہو گیا کہ دنیا میں پادشاہ کی ضرورت نہیں ہے اور انھوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ شہنشاہیت کوئی ابدی چیز نہیں ہے۔ اس وجہ سے وہ اس زمانے کے اُن پادشاہوں کو جو عدل و انصاف سے حکومت کرتے تھے۔ اور عوام کو فائدہ پہنچاتے تھے دانشمند حکمراں کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور ان ظالم اور جابر پادشاہوں کو جو کہ جمہور کا لحاظ مطلقاً نہیں کرتے تھے، بدمعاش اور حقیر ذات کے نام سے پکارتے ہیں، ان کے نزدیک ایسے ظالم پادشاہوں کی خلاف ورزی کرنا گویا ہر فرد کے لئے لازم اور واجب ہے۔ مندرجہ بالا باتوں سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ جمہوریت کا تخیل دو ہزار برس سے قبل چینیوں کے دماغوں میں موجود تھا، ہاں فرق ضرور تھا کیونکہ اس وقت جمہوریت کا تخیل خواب ہی رہ گیا تھا۔ اور اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ یہ تخیل بالکل یورپ میں یوتاپیہ (utopia) کے تخیل سے مشابہ تھا جس پر فوراً عمل کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ تمدن اور تہذیب کے اعتبار سے چین یورپ سے آگے تھا اور جمہوریت کا خیال بھی دو ہزار برس پہلے پیدا ہوا۔ مگر یہ خیال اُس وقت صرف اقوال پر محدود رہا، اور عملی شکل میں ظاہر نہیں ہو سکا۔

عوام کے فطری حقوق

روسو یورپ میں جمہوری حقوق کا ایک زبردست مبلغ اور حامی تھا۔ اس کی کتاب سوشیل کانٹرکٹ کا موضوع بحث یہ ہے کہ مساوات اور آزادی انسان کا پیدائشی حق ہیں۔ ہر شخص کو فطرةً یہ حق حاصل ہے کہ اُن میں ذات پات کے درجات نہ ہوں اور ایک دوسرے کے مساوی ہوں، مگر رفتہ رفتہ لوگوں نے اپنے پیدائشی حق سے غفلت کی اور اپنے فطری حقوق کو فراموش کر دیا۔ لیکن اگر ارتقاء کے نقطۂ نظر سے ہم

---

(۱) یہ ایک ظالم اور جابر حکمراں تھا جو اپنے ماتحت کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔

انسان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مساوات[1] انسان کا پیدائشی حق نہیں ہے، بلکہ سیاسی کشمکش اور تمدنی عناصر سے رونما ہوا ہے۔ کیونکہ جب ہم ارتقا کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو اس قسم کے فطری یا پیدائشی حق کا نمونہ کہیں نہیں ملتا۔ اس بنا پر روسو کا نظریہ غلط تھا اور وہ کسی بنیاد پر مبنی نہیں تھا ۔ ۔ ۔ ۔ مگر جب روسو مساوات کا حامی بن بیٹھا اور اس کی روح عوام کی رگوں میں پھونکنے لگا تو اس وقت کی سیاسی حالت اس قسم کی تھی کہ اس کا نظریہ قبول کر سکتی تھی۔ اور اس کا خیال جذب کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس کا کلام کسی بنیاد پر مبنی نہ تھا، پھر بھی مقبول عام ہوا۔ جہاں تک روسو کے اس نظریہ کی اصلی غرض و غایت کا تعلق ہے یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک غیر فانی کارنامہ دنیا میں چھوڑا ہے۔

جمہوری تحریک کی کیفیت

دو سو سال پہلے انگلینڈ میں عوام اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے لئے اٹھے، سو سال کے بعد امریکہ میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی جس کی وجہ سے وہ برطانیہ کے ہاتھ سے نکل کر خود مختار ہو گیا، اور وہاں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ اس تحریک کے بعد دس سال بھی نہیں گذرا کہ فرانس میں انقلاب پیدا ہوا۔

ہر نقطہ سے جب ہم دنیا کی رفتار کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل عوام کی طبعیت جمہوریت کی طرف مائل ہے۔ آئندہ چل کر خواہ کتنی ہی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اور خواہ کتنی ہی ناکامیاں نظر آئیں، پھر بھی جمہوریت دنیا سے مٹ نہیں سکتی، بلکہ وہ باقی رہے گی۔ اس زمانے میں عوام کا رجحان جو کہ جمہوریت کی طرف منتقل ہو گیا ہے اس کی کیفیت بالکل بہتے ہوئے پانی کے مانند ہے۔ چاہے اس میں کتنا ہی گرد و غبار پڑ جائے وہ بہا تا ہوا ان کو لے جائے گا۔ اور وہ اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پیدا کر سکیں گے۔ عالم میں حکومت کی شکل تو خدائیت تھی۔ خدائیت سے شہنشاہیت کی صورت اختیار کر لی۔ پھر شہنشاہیت سے جمہوریت پیدا ہو گئی۔ جمہوریت کے بعد اور کوئی ایسی صورت نہیں

---

(۱) مساوات کے بارے میں ذکر آئے گا۔

ہو سکتی جو اس کے خلاف ہو۔ اگر اس کے بعد کوئی مخالف عنصر پیدا بھی ہو اور اس کی قوت ایسی زبردست ہو جیسی یان شِنگ کائی[1] کی یا ایسی مضبوط جیسی چاینگ شونگ کے لشکر کی تو وہ بھی آخر چل کر ناکام ہوگی۔

چین کو کیوں جمہوریت کی ضرورت ہے

انقلاب کے زمانے میں چین کو اس لئے جمہوریت کی ضرورت ہے کہ عوام کا رجحان اس کی طرف مائل ہے، اور اس لئے ضرورت ہے کہ خانہ جنگی جلد سے جلد ختم ہو جائے . . . . . جب ہم جمہوریت کا لفظ بولتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس کا مطلب اور مفہوم اچھی طرح سے جانیں۔ اگر ہم اس کے مفہوم سے ناواقف رہیں تو شہنشاہیت کا خیال ہرگز ہمارے دماغ سے نہیں نکل سکتا اور اگر یہ خیال باقی رہ گیا تو ہم جماعت کے ہم جماعت سے لڑنے کا اندیشہ ہے اور ہم وطنوں میں باہم دشمنی کا شعلہ بھڑکنے کا ڈر ہے۔ اس طرح ملک میں خانہ جنگی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور جنگ ہی جنگ ہوتی رہے گی جس سے یہاں کے تمام باشندے خاک میں مل کر رہ جائیں گے۔ اس وجہ سے ہم کو جمہوری حقوق کی بنا پر ایک جمہوری حکومت قائم کرنے کی ضرورت ہے . . . . جس کے بادشاہ چالیس کروڑ آدمی ہوں گے . . . . جس سے آپس کی جنگ ختم ہونے کی امید ہے اور چین کی تمام مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں۔

خود مختاری کا مطلب

جمہوری حکومت کا مفہوم بڑے بڑے علما خود مختاری بتلاتے ہیں کیونکہ اہل یورپ و امریکہ جس چیز کے لئے جنگ کرتے ہیں اور اپنی جان پر کھیلتے ہیں وہ خود مختاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کا چرچا دن بدن پھیلتا جاتا ہے چونکہ اہل یورپ اور امریکہ برابر تین سو سال سے خود مختاری کے لئے جنگ کرتے رہتے ہیں، اس لئے خود مختاری یوروپین اور امریکن علماء کی نگاہ میں ایک گراں اور قابل قدر چیز ہے اور ان کے باشندے بھی اس کی حقیقت سے زیادہ آشنا ہیں، مگر جب یہ اصطلاح چین میں آئی

---

(۱) یان شِنگ کائی چینی جمہوریت کا دوسرا صدر تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اس نے شہنشاہیت کا دعویٰ کیا۔ چاینگ شونگ یان شِنگ کائی کا دست پاروہ اور زبردست فوجی جنرل تھا۔

تو صرف بعض علما جو کہ جمہوریت کے معنی کا مطالعہ کر چکے ہیں خودمختاری کو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ مگر عوام سو بازاری لوگوں سے یا دیہاتی لوگوں سے اگر یہ بات کہیں تو ہرگز ان کی سمجھ میں نہ آئے گی اور وہ تعجب کی نگاہ سے ہمیں دیکھیں گے۔ نہ صرف یہ لوگ بلکہ بعضے نوجوان اور طلبہ یا وہ لوگ جو کہ یورپ اور امریکہ کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کو اکثر کتابوں میں یہ لفظ نظر آتا ہے۔ پھر بھی اگر ان سے اس کی حقیقت پوچھیے تو وہ ہرگز نہیں بتا سکتے۔ خودمختاری کا مفہوم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک جمعیت کے افراد اپنی جمعیت میں آزادی سے نقل و حرکت کر سکیں، اور بغیر روک ٹوک کے آجا سکیں۔ بس یہی خودمختاری ہے۔ ایک انگریز عالم نے کہا ہے کہ ”فرد کی خودمختاری یہ ہے کہ وہ دوسرے کی آزادی میں خلل نہ ڈالے۔ اور یہی حقیقی خودمختاری ہے اور اگر اس نے دوسرے کی آزادی میں خلل یا رکاوٹ پیدا کر دی تو یہ خودمختاری نہیں ہے۔

انقلاب چین اور خودمختاری

اس سے قبل اہل یورپ عدم آزادی کے آلام و تکالیف کافی محسوس کرتے تھے۔ اور چونکہ ان میں آلام و تکالیف کو برداشت کرنے کی تاب نہ تھی، اس لئے وہ مجبور ہو کر آپس میں متحد ہونے اور یک دلی کے ساتھ آزادی کے واسطے جان تک دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب ان کو آزادی مل گئی تو جمہوری حقوق کا سوال پیدا ہو گیا۔ آج یورپ اور امریکہ کا انقلابی سیلاب جب چین کی سرزمین پر پہنچا تو چین کے اکثر نئے تعلیم یافتہ اور محبان وطن سب کے سب خودمختاری کے لئے اٹھے، ان نئے تعلیم یافتہ اور محبان وطن نے چاہا کہ جس طرح اہل یورپ نے خودمختاری کے لئے فرانس میں ہولناک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اسی طرح اپنے ملک میں انقلاب پیدا کر دیں تاکہ چین یورپ اور امریکہ کی طرح آزاد ہو۔ ان کے اس رجحان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بندر کی طرح ہیں جو انسان کے ہر کام کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ دوسرے شخص کا طرز عمل دیکھتے ہیں، اس کے نقل کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، خواہ وہ جمہوری حقوق کا مفہوم سمجھیں یا نہ سمجھیں، خواہ انھوں نے غور و فکر سے ان کا مطالعہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ہماری جماعت کا اصول ثلثہ سے ملک میں انقلاب پیدا کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم انقلاب کے ذریعے سے خودمختاری حاصل کرنے کی کوشش کریں، بلکہ ہمارے انقلاب میں نہایت عمیق معنی مستور ہے، جس کی سمجھ اور واقفیت ہونے کے

لئے غور وفکر درکار ہے۔ اس سے قبل انقلاب فرانس کا واچ ورڈ (Watchword) آزادی اور امریکہ کا واچ ورڈ استقلال تھا۔ اس وقت ہمارا واچ وارڈ اصول ثلثہ ہے۔ اس اصول ثلثہ کے لئے ہم نے بہت سا وقت اور دماغ صرف کیا ہے۔ بہت کاٹ چھانٹ، تخلیص اور نچوڑ کے بعد تب ہم نے ان کو اپنا واچ وارڈ بنایا ہے یہ نہیں کہ دوسروں کے شور و غل پر ہم بھی چلا اٹھتے ہیں . . . . . چین میں اس وقت اگر کوئی آزادی کے لئے تحریک پیدا کرنی چاہتا ہے تو جب تک چین کے باشندے کسی قسم کے اہم تکلیف کو نہیں محسوس کرتے ہیں، یہ تحریک بالکل بیکار بلکہ مضر ہوگی کیونکہ کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرے گا۔ البتہ اگر کوئی شخص دولت حاصل کرنے کی کوئی تحریک کرے تو چشم زدن میں سارے باشندے اس کے اردگرد جمع ہو جائیں گے اور اس کی مدد کرنے کو تیار ہوں گے۔ ہم اصول ثلثہ سے کیا تحریک پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ دولت کمانے کی تحریک . . . . . ہم کیوں نہ سیدھے سادے الفاظ میں کہہ دیں کہ یہ تحریک تحصیل دولت کی ہے؟ یہ اس لئے ہے کہ دولت کمانے کی تحریک اور اصول ثلثہ کے درمیان عام وخاص کا فرق ہے۔ دولت کمانے کی تحریک اصول ثلثہ کو شامل نہیں کر سکتی۔ لیکن اصول ثلثہ میں دولت کمانے کی تحریک شامل ہے . . . . . چین میں زمانۂ قدیم سے آج تک اگرچہ آزادی کا نام نہ تھا، مگر اس کی روح موجود تھی۔ وہ بھی ضرورت سے زیادہ تھی۔ صرف وہ آزادی ہم کو مل جانی کافی ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی قسم کی آزادی کے ہم محتاج نہیں۔

یورپ میں اس لئے انقلاب پیدا ہوا کہ ان میں آزادی نہ تھی۔ لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے انقلاب پیدا کیا۔ ہم کو بہت کافی آزادی ملی تھی، ایسی آزادی کہ افراد نے اپنی جماعت کو بھی چھوڑ دیا جماعت کا وجود جب نہ رہا تو مدافعت کی قوت بھی کم ہوگئی۔ اس بنا پر اہل یورپ ہم کو منتشر ریت کہتے ہیں . . . . . اگر چین غیر ممالک کے جبر و استبداد کی مدافعت کرنا چاہتا ہے تو چینی باشندے کو اپنی انفرادی آزادی توڑنا پڑے گی۔ اس کو توڑ کر ایک قوی اور مضبوط جمعیت قائم کرنی ہوگی جس

---

(۱) (نوٹ صفحہ) جو کہ ڈاکٹر سن یٹ سین کے اصول ثلثہ کو مانتے ہیں اور ان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

طرح ریت پر سمنٹ بنانے سے وہ پتھر کی سی مضبوط ہوتی ہے اور جس طرح سمنٹ کو انسان اور جانور کے ٹھوکر مارنے اور پاؤں کے دبانے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اسی طرح غیر ممالک کے ظلم و ستم چین کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ . . . . . انقلاب چین کو تحریک آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ایسا ہوگا تو یہاں کے باشندے ہمیشہ کے لئے ریت کی طرح منتشر رہیں گے اور کبھی بھی اُن میں ایک مضبوط جماعت تیار نہ ہو سکے گی اور ہم بھی اپنی تحریک کی اصل منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکیں گے۔

ہمارا انقلابی نعرہ قومیت، جمہوریت اور معیشت ہے۔ جب ہم اپنی قومیت کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے کوشش کریں۔ اس زمانے میں آزادی کا لفظ ہرگز افراد کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کو ملک کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ جب ہمارا ملک آزادی اور خود مختاری سے نقل و حرکت کر سکے تو وہ ضرور ایک طاقتور ملک بن جائے گا . . . . طلبہ کا اپنی ذاتی آزادی کو قربان کرنے سے مطلب یہ ہے کہ روزانہ کاموں میں لگے رہیں، علوم و فنون کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ جب علوم و فنون سے واقفیت ہو گئی، غور و فکر کی قوت بڑھ گئی، لیاقت و قابلیت پیدا کر لی تو اس وقت وفاداری سے اپنے ملک کی خدمت کریں۔ سپاہی جب اپنی ذاتی آزادی کو قربان کرے گا تو وہ ایک نظام اور ڈسپلن کے ماتحت جان و دل سے اپنے ملک اور ہموطنوں کی ذلت اور رسوائی دور کرے گا۔ اس طریقے سے چین کو حقیقی آزادی مل سکتی ہے . . . . . چین اب تو دس ملکوں سے زیادہ کا غلام بنا بیٹھا ہے۔ اس کو مطلقاً آزادی نہیں ہے ہم کو اپنے ملک آزاد کرانے کے لئے بجز انقلابی تحریک کے کوئی عمل کارآمد نظر نہیں آتا۔ ہمارا انقلابی اصول جو ہے وہ فطرت اور انسانیت کا ایک نچوڑ ہے۔ ہم ان اصول سے چالیس کروڑ انسانوں کو ملا کر ایک وسیع مگر مضبوط جمعیت قائم کر سکتے ہیں۔ جب اس جمعیت کو آزادی مل گئی تو چین اور اس کے باشندوں کو بھی ضرور آزادی مل جائے گی۔ اس وقت چینی قوم حقیقی آزادی کا لطف اٹھا سکے گی۔ اگر ہمارے نعرہ اصول ثلثہ کا فرانس کے انقلاب پسندوں کے نعرے سے مقابلہ کیا جائے تو فرانس کا نعرہ آزادی ہمارے نعرہ قومیت سے مشابہ ملے گا۔ کیونکہ یہی اصول ہیں جو کہ چین کو آزادی دلانے والے ہیں۔ فرانس کی مساوات ہماری جمہوریت سے مشابہ ہے: کیونکہ ہماری

جمہوریت عوام کو سیاسی میدان میں مساوی درجے پر پہنچاتی ہے ۔ جس سے شہنشاہیت مٹ جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس محبت جنس انسان کا نعرہ ہے جس کی اصلیت اخوت ہے ۔ اخوت سے مراد یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان بھائی بھائی ہیں ۔ ہمارا اس کو محبت جنس انسان سے تعبیر کرنا بالکل درست اور بجا ہے ۔ جن وجوہ پر محبت جنس انسان مبنی ہے ان پر ہماری معیشت بھی مبنی ہے کیونکہ ہمارے معیشت کے اصول سے چالیس کروڑ انسانوں کی راحت و آسائش، نعمت و برکت مہیا ہو سکتی ہے ۔ چالیس کروڑ انسانوں کو آرام پہنچانا بغیر محبت کے ناممکن ہے ۔

انقلاب کی ابتدا

استبدادیت اور شخصیت کے زمانے میں بادشاہوں نے اپنی غیر معمولی اور زبردست قوت سے انسانوں میں طرح طرح کے درجات پیدا کر دئے ۔ انسان کی عدم مساوات نے (نقشہ نمبر ۱) اہل دولت و ثروت کے بے حد جور و تعدی ، شدت و جبر کی وجہ سے مظلوم اور دبے ہوئے طبقے کو کہیں جانے کا راستہ نہ ملنے کی وجہ سے انقلاب کا آتش فشاں پہاڑ بنا دیا اور عوام مجبور ہو کر عدم مساوات کو مٹانے کے لئے اٹھے ، شروع شروع میں انقلاب سے مطلب یہ تھا کہ انسان میں جو غیر مساوی طبقے و درجے قائم ہوئے ہیں ان کو برابر کر دیا جائے اور عدم مساوات کے جو حدود ہیں ان کو ایک قلم توڑ دیا جائے ۔

۱ ۔ عدم مساوات
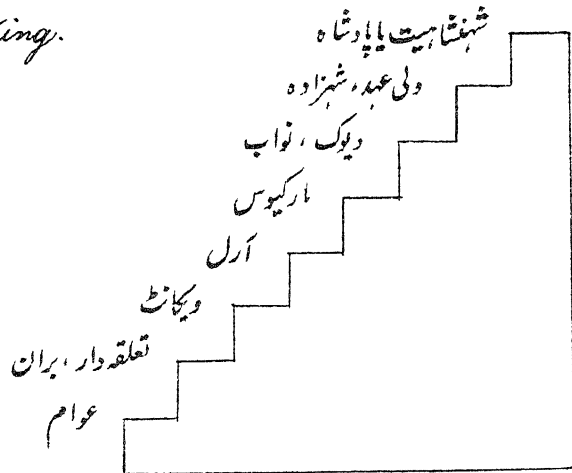
مساوات حقیقی اور غیر حقیقی

ہر شخص کا ایک دوسرے کے برابر ہونا غیر ممکن ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ فطرت نے کوئی فطری مساوات انسان میں نہیں رکھی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان میں فطری مساوات ہے، اور وہ ایک حد تک اپنے خیال کو عملی جامہ پہناتا ہے تو وہ دراصل ایک مساوات غیر حقیقی ہو گی (نقشہ نمبر ۲) ایک طرف سے تو برابر معلوم ہوتا ہے، مگر دوسری طرف سے نیچا اونچا نظر آتا ہے۔

جہاں تک سوشیل مساوات کا تعلق ہے انسان کا پہلا قدم ایک ہموار اور عام پلیٹ فارم پر ہونا چاہئے پھر آہستہ آہستہ حسب لیاقت اور فطانت ہر ایک کو اپنی حیثیت کے کام انجام دینا چاہئے، چونکہ انسان کی فطانت و ذہانت فطرۃً مختلف ہے، لہٰذا اس سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ بھی مختلف ہے۔ اس واسطے انسان میں فطری مساوات کہاں سے ہو سکتی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص کو لیاقت اور ذہانت کے مطابق اپنی حیثیت پر قائم رہنا چاہئے تاکہ حقیقی مساوات ہو سکے۔ اگر لیاقت اور ذہانت کا لحاظ کیا جائے تو جب کوئی شخص بڑی حیثیت اور اونچے مقام پر پہنچ گیا تو لوگ (اس سے نیچے کے لوگ) جبراً و قہراً ہم حیثیت کرنے کی غرض سے، اس کو نیچے کی طرف کھینچ لائیں گے۔ اگر دنیا میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو ترقی کیسی ہو سکتی ہے، بلکہ وہ پستی کی طرف چلی جائے گی۔ اس وجہ سے جب ہم جمہوری مساوات پر بحث کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا میں ترقی بھی ہو، تو ہم کو یہ طرز عمل اختیار کرنا چاہئے کہ تمام جنس انسان سیاسی میدان میں ایک عام مقام پر کھڑی رہے کیونکہ مساوات تو انسان کی ایجاد کردہ چیز ہے نہ کہ قدرت کی۔ پس انسان کی ایجاد کردہ مساوات صرف سیاسی معاملے میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس واسطے چین کے اس انقلاب کے بعد جب ہر شخص کا مقام سیاسی میدان میں برابر ہو جائے (نقشہ نمبر ۲) تو یہی حقیقی مساوات ہے۔
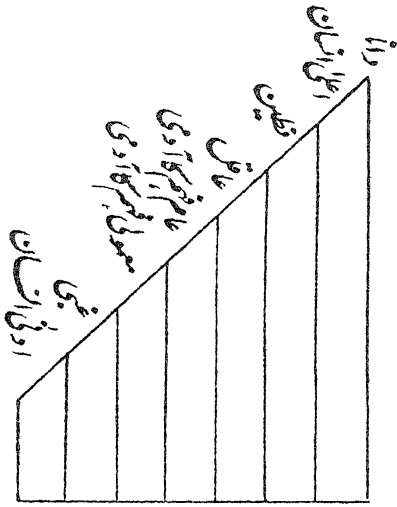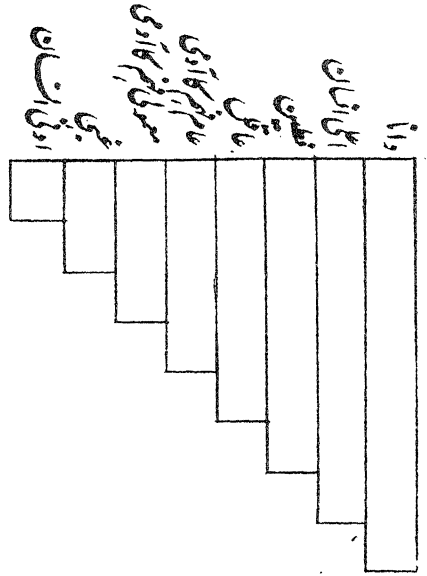
انقلاب چین اور مساوات

چین کے اہل انقلاب مساوات اور آزادی کو مقدم نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ وہ سب سے پہلے عوام کے تین اصول کو پسند کرتے ہیں اس لئے کہ جب ان اصول ثلثہ کو عملی جامہ پہنایا جائے گا تو مساوات اور آزادی خود بخود آجائے گی۔ چین میں کبھی مساوات یا آزادی کے لئے کوئی جنگ نہیں پیدا ہوئی، یہاں ہزاروں سال سے تخت شاہی اور شہنشاہیت کا خیال جو کہ لوگوں کے دماغوں میں اب تک باقی رہا ہے چین کے غیر مکمل انقلاب کا باعث ہوا۔ چونکہ ہم ان خیالات کو مٹانا چاہتے ہیں اور لوگوں کے دماغوں سے انہیں جڑ سے اکھاڑنا چاہتے ہیں لہذا ہمیں مجبوراً انقلاب کی تحریک اختیار کرنی پڑتی ہے۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ حقیقی مساوات اور آزادی کا قدم کسی جگہ پر قائم اور کسی چیز کے ساتھ وابستہ ہونا چاہئے۔ حقیقی مساوات اور آزادی کی بنیاد جمہور کے سیاسی حقوق پر کھڑی ہونی چاہئے۔ اور صرف اسی سے وابستہ ہونی چاہئے۔ جب جمہور کے سیاسی حقوق کی بنیاد نہ ہو تو مساوات اور آزادی کیونکر حاصل اور محفوظ ہوسکتی ہے۔ اس واسطے چین میں انقلاب پسندوں نے تحریک پیدا کر دی۔ ان کی غرض وغایت

اگرچہ مساوات اور آزادی (ملکی آزادی نہ کہ انفرادی) ہو۔ مگر جمہوریت اُن کے اصول اور انقلابی نعرے سے خارج نہیں کیجا سکتی کیونکہ حقیقی جمہوریت حاصل کرنے پر ہی تو عوام کو مساوات اور آزادی مل سکتی ہے اور اسی وقت وہ ان چیزوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے مساوات اور آزادی جمہوریت میں شامل ہیں۔ اہل یورپ اور امریکہ اب تک جمہوریت کے لئے جہاد کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ مساوات کی خرابیاں جو یورپ اور امریکہ میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اس لئے ہیں کہ انھوں نے مساوات کو ایک ناگزیر اور لابدی شے سمجھ رکھا ہے۔۔۔۔۔ مساوات اگر کسی زمانے میں مفید ثابت ہو تو ضرور اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، ورنہ اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ جمہوریت کو اس وقت ترقی اور وسعت دیجا سکتی ہے، جب کہ مساوات اور آزادی عوام اور حکومت دونوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو۔

لیاقت اور ذہانت میں فطری عدم مساوات

دنیا میں جتنے انسان ہیں فطری فطانت و ذہانت کے لحاظ سے عموماً تین طبقوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ (یعنی جاننے والا اور سمجھنے والا، نہ جاننے اور نہ سمجھنے والا۔ اور نہ جاننے اور نہ سمجھنے والا) اعلیٰ وہ لوگ ہیں جو مفکرین، موجدین، مخترعین اور مرشدین ہیں اوسط وہ لوگ ہیں جو مبلغین، مخبرین، منبہین اور مبشرین ہیں اور ادنیٰ وہ لوگ ہیں جو کہ لوگوں کے ارشاد و ہدایت پر عمل کرتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔ دنیا میں یہ تین قسم کے آدمی موجود ہیں۔ ایک دوسرے کے معاون اور مددگار رہیں اور سب کی ہم آہنگی سے دنیا کی تہذیب اور شائستگی میں ترقی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ انسان میں فطانت اور ذہانت کے لحاظ سے، عدم مساوات پیدا کر رکھا ہے، مگر انسان یہ چاہتے ہیں کہ ان میں مساوات ہو، گویا کہ یہ انسان کی ایک اعلیٰ اخلاقی غایت ہے جس کے لئے وہ کوشش کر سکتے ہیں، اور کوشش بھی کرنا چاہئے۔

مساوات کی حقیقت

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ دنیا میں تین مختلف قسم کے آدمی موجود ہیں۔ اُن میں مساوات ہونا ناممکن ہے۔ اگر انسان ان میں مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس مساوات کی غرض و غایت

صرف انسانی خدمت ہونا چاہیے، نہ کہ غصب وغارتگری۔ فطین اور ذہین لوگوں کی لیاقت وقابلیت ضرور اوسط درجے کے لوگ سے بالاتر ہے، وہ اپنی لیاقت اور قابلیت سے ہزار ہا انسان کی خدمت کر سکتے ہیں، اور ان کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں، اوسط درجے کے لوگ حسب لیاقت وقابلیت سو سو آدمی کی خدمت کر سکتے ہیں، اور ان کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں، معمولی آدمی اپنی لیاقت و قابلیت کے مطابق دس دس شخصوں کی خدمت کر سکتے ہیں اور ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں۔ اس سے بھی کم لیاقت کے لوگ ایک ایک فرد کی خدمت کر سکتے ہیں اور اس کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ الغرض جس شخص میں جتنی لیاقت اور قابلیت ہے اس شخص کو اتنے کام کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ اگر اس طریقہ سے لوگ اپنے اپنے کام کرتے رہیں اور ذاتی اور شخصی خیال چھوڑ کر بنی نوع انسان کا لحاظ رکھیں تو اگرچہ فطری فطانت و ذہانت میں عدم مساوات ہے، مگر انسان اپنے اخلاقی نقطہ نظر سے مساوات پیدا کر سکتے ہیں، پس یہی مساوات کی حقیقت ہے۔

مغرب میں جمہوریت کی تاریخ

دنیا کی جمہوری حکومت کے نشوونما کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اس کی تحریک امریکہ میں ہوئی۔ اس زمانے میں جمہوریت پسندوں کے درمیان دو فریق تھے، ایک تو ہیملٹن کی پارٹی تھی کہ حاکمانہ قوت عوام کے ہاتھ میں رہنا چاہیے خود ہیملٹن اس کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حاکمانہ قوت حکومت کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ آخر موخرالذکر کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ حقیقی جمہوریت کی پہلی رکاوٹ تھی دوسرا انقلاب فرانس تھا جس سے عوام کو ضرورت سے زیادہ حقوق حاصل ہو گئے۔ ان حقوق کو غیر مناسب طور پر استعمال کرنے سے وہاں مفسد اور فتنہ انگیز لوگوں کی حکومت ہو گئی۔ یہ جمہوریت کی دوسری رکاوٹ تھی۔ تیسری مرتبہ بسمارک نے (جرمن سیاست داں) اپنی غیر معمولی چالاکی اور حکمت عملی سے جمہوریت کے مٹانے کی کوشش کی۔ یہ تیسری رکاوٹ ثابت ہوئی۔ یہی جمہوریت کے نشوونما کی مختصر تاریخی حالات ہیں جو کہ ممالک مغرب میں گذرے۔ غرض یہ ہے کہ اہل یورپ و امریکہ جب مساوات اور آزادی کے لئے اٹھے تو ان کو سیاسی حقوق ملے۔ مگر جب ان حقوق میں ترقی اور وسعت ہوتی گئی تو ان

میں طرح طرح کی خرابیاں اور پیچیدگیاں رونما ہوئیں۔ جمہوریت کے جڑ پکڑنے سے پہلے لوگوں نے اس کو دبانا شروع کیا۔ شخصیت اور استبدادیت کے ہتھیارے توڑنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں جب شہنشاہیت کو گرا دیا گیا تو جمہوریت پسند لوگوں نے حقیقی جمہوریت میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اور جب اس کو عملی جامہ پہنانے لگے تو طرح طرح کی خرابیاں ظاہر ہوئیں۔ ان خرابیوں کی وجہ سے جمہوریت اپنے حقیقی جوہر نہیں دکھا سکی اور عوام کے لئے فائدہ مند ثابت نہ ہوئی۔ آخر جب بسمارک نے دیکھا کہ جمہوریت کو جو کہ عوام کے رجحان کے مطابق ہے، نہیں دبایا جا سکتا تو اس نے بجائے جمہوری قوت کے حکومت کی قوت استعمال کرنی شروع کی تاکہ ملک میں ایک قومی اشتراکیت کا نظام قائم ہو۔ یہ طرز عمل بھی جمہوریت کے لئے رکاوٹ ثابت ہوا۔ جمہوریت کی تحریک اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لے سب سے پہلی کوشش تو امریکہ ہی میں ہوئی مگر اس وقت جمہوری حکومت سے عوام کو جو حقوق ملے وہ صرف حقوق انتخاب تھے۔ اس زمانے میں ممالک مغرب کے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ جمہوری حقوق صرف انتخاب پر محدود ہیں، جب ہر شخص کو، خواہ وہ شریف ہو یا حقیر، غنی ہو یا فقیر، دانشمند ہو یا نادان، انتخاب کا حق مل گیا تو یہ سمجھ لیجئے کہ ان کے جمہوری حقوق کافی ترقی اور وسعت پا چکے۔ مگر گردش ایام کا تماشا دیکھئے جنگ عظیم کے بعد ہوا کا رُخ بدل گیا، حالت اور ہو گئی۔ اس اثنا میں اگرچہ بعید رکاوٹیں جمہوریت کے درمیان آکر حائل ہوئیں مگر جمہوری حقوق کا چرچا دن بدن زور پکڑتا جاتا ہے۔ اور ان میں کوئی رکاوٹ موثر نہیں ہو سکتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اہل سوئزرلینڈ کو حقوق انتخاب کے علاوہ استشراع[1] (Initative) اور حقوق ترمیم یا تصحیح شرع (Referendum) بھی حاصل ہیں یعنی عوام کو افسران کے متعلق انتخاب کے حقوق دارالعوام میں کسی قانون بنانے کے لئے مسودہ پیش کرنے کے حقوق، اور کسی پرانے قانون میں ترمیم یا تصحیح کرنے کے حقوق حاصل ہیں۔ اگر اکثریت ایک بات اچھی سمجھتی ہے تو ان کو حق ہے کہ دارالعوام میں اس کے قانون بنانے کے لئے تجویز پیش کرے، یا دارالعوام سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اس کے لئے قانون

(۱) مجموعہ اصطلاحات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں لکھا ہے کہ Initiative ہدایت اور Referendum مراجعت ہے۔

بنائے۔ اس کو حق استشراع کہتے ہیں۔ اور اگر اکثریت کسی پرانے قانون کے متعلق خیال کرے کہ وہ رفتار زمانہ کے مطابق نہیں ہو، ملک و قوم کے لئے غیر مفید ہے تو اس کو حق ہے کہ اس میں کوئی ترمیم یا تصحیح کی تجویز پیش کرے اس کو حق اصلاح یا تصحیح کہتے ہیں۔ لہٰذا اہل سوئٹزرلینڈ کو غیر ممالک کے لوگوں سے دو حقوق زیادہ حاصل ہیں، اس طرح پران کو تین حقوق حاصل ہیں۔ امریکہ کے مغربی شمالی حصوں میں جہاں کثرت سے نئی آبادی ہو وہاں کے باشندوں کو بہ نسبت اہل سوئٹزرلینڈ کے اور ایک حق زیادہ حاصل ہو یعنی حق استرجاع (Recal) —— کسی افسر کو واپس بلانا یا اس کی ملازمت سے ہٹاکر اور جگہ پر مقرر کرنا یا اس کو کسی وجہ کی بنا پر ملازمت سے بالکل محروم رکھنا —— امریکہ کے تمام حصوں میں یہ حقوق اگرچہ عام طور پر نہیں پھیلے ہیں، مگر اکثر حصے اس پر عمل کرتے ہیں، اس واسطے امریکہ والوں کو چار حقوق حاصل ہیں، یعنی حق انتخاب، حق استشراع، حق تصحیح اور حق استرجاع یہ چار حقوق مغربی شمالی امریکہ میں کافی طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ آئندہ چل کر تمام امریکہ میں پھیلنے کی امید ہے بلکہ یوں کہئے کہ تمام دنیا میں پھیلنے کی امید ہے آنیوالے زمانے میں اگر جمہور کو کافی حقوق ملنے کی توقع ہے تو ضرور امریکہ کے ان چار حقوق پر عمل کرنا پڑے گا۔

چین کے اہل انقلاب و جمہوریت

ہماری جماعت اصول ثلثہ سے چین کو ترقی یافتہ اور خوشحال بناسکتی ہو، ہماری نظر میں جو جمہوریت ہو وہ یورپ اور امریکہ کی جمہوریت سے بالکل مختلف ہو۔ ہم صرف ان کی تاریخ سے کچھ مواد اخذ کرسکتے ہیں نہ یہ کہ مکمل طور پر انکی تقلید کریں اور قدم بقدم ان کے پیچھے چلیں، ہم جمہوری حقوق کے اصول سے ملک چین میں عوام کی ایک مکمل حکومت قائم کرسکتے ہیں اور یہ جمہوریت یورپ اور امریکہ کی جمہوریت سے بھی بالاتر ہوگی۔

اہل چین میں حس خود اعتمادی کا فقدان

۱۹۰۳ء میں چین کے رضاکاروں کی جو جماعت تھی وہ اہل چین کے اعتماد خودی اور قوت خودی کا آخری مظاہرہ تھا جو یورپ اور امریکہ کی نئی تہذیب کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ . . . یہ چین کے بعض

مفکرین کی رائے ہے کہ چین کو ترقی اور قوت حاصل کرنے کے لئے غیر ممالک کی تقلید کرنی ضروری ہے۔ نہ صرف مادیات اور سائنس میں بلکہ سوشیل اور سیاسی تعمیری کاموں میں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اہل چین میں اعتماد خودی کا حس بالکل معدوم ہو گیا اور بجائے اپنے اوپر بھروسا کرنے کے تقلید کا خیال دن بدن ان کے دماغوں کے اندر گھستا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ غیر ممالک کے ان خیالات کو جن پر اب تک اہل یورپ خود بھی کاربند نہیں ہو سکتے ہیں، ہمارے بعض ہموطن عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ غیر ممالک کی تقلید کرنے کی وجہ سے اہل چین اپنی ذاتی چیزوں کو چھوڑنا پسند کرتے ہیں اور ہر کام میں ان کی چال اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، جب کبھی غیر ممالک کی کوئی نئی بات سنائی دیتی ہے تو فوراً ہمارے نوجوان اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ۔

مغرب کی مادی ترقی اور سیاسی فلسفہ

مغرب میں سیاسی فلسفے کی رفتار اتنی تیز نہیں ہے جتنی کہ مادی ترقی کی۔ ان کے موجودہ سیاسی تخیل اور ہزار سال پہلے کے سیاسی فلسفے میں اصولاً کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ اگر ہم سیاسی میدان میں ان کے پیچھے اس طریقے سے چلیں جس طرح ہم مادی میدان میں ان کی تقلید کرتے ہیں تو یہ ایک بڑی غلطی ہو گی۔ ان کی مادی ترقی دن بدن مختلف رنگ اختیار کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے سیکھنے میں ہمیں اچھی طرح ان کے ساتھ قدم بقدم چلنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مگر برخلاف اس کے ان کی سیاسی رفتار بہت ہی سست اور بیجان سی ہے۔ مثلاً انقلاب امریکہ کے بعد جمہوریت نے جو صورت اختیار کر لی تھی اور عوام کے حقوق میں جس قدر وسعت ہوئی اس میں اور موجودہ جمہوری حالت میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً وہی ہے جو تھی۔ اب فرانس میں جس جمہوریت پر عمل کیا جاتا ہے، وہ زمانہ انقلاب کی جمہوریت سے کہیں پست ہے۔ ہم کو غیر ممالک کی تقلید میں ضرور ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے اور ان میں تمیز کرنا چاہئے۔ غیر ممالک میں جمہوری حقوق کے زیادہ تیزی کے ساتھ نہ پھیلنے کی وجہ جو ہوئی وہ یہ ہے کہ ان کو اصولاً جمہوری حقوق کا کوئی حل نہ ملا۔

تشکیل جمہوریت میں چین کو غیر ممالک کی تقلید نہ کرنا چاہئے

مغرب کے رسم و رواج جو چین سے مختلف ہیں، وہ بہت ہیں اگر چین نے اپنے رسم و رواج کا لحاظ نہ کیا

اور غیروں کو سوشیل اور سیاسی حقوق میں اس طریقے سے تقلید کی جس طرح ہم مشین چلا سکتے ہیں تو اس بڑی کوئی حماقت نہیں ہو سکتی مجسم مشین تو مادے سے بنائی جاتی ہے مگر غیر مجسم سیاسی مشین نفسیات کے اوپر تعمیر کی جاتی ہے۔ موجودہ صدیوں کے اندر مشین سازی میں بے شمار اختراعات ہوئیں مگر نفسیات میں اس بیس تیس برس کے عرصہ میں کچھ ترقی ہوئی وہ بھی پورے طور پر نہیں۔ اس لئے اس نفسیاتی مشین کے تیار کرنے میں، جو قوم کی ترقی کے لئے بنائی جاتی ہے سراسر دوسروں کی تقلید نہ کرنی چاہیے ... ... جہاں تک اہل مغرب کی سیاست کا تعلق ہے ان کے طرز عمل اور طریقے زیادہ معقول نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے تمام انتظامات اصولاً اب تک لاینحل رہے ہیں۔ چین جو اس وقت جمہوریت پر کاربند ہو کر سیاسی دشواریوں اور پیچیدگیوں کو حل کرنا چاہتا ہے تو اسے اصول انتظامات سارے کے سارے ممالک مغرب سے اخذ نہ کرنا چاہئیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم خود ایک نئی قوت فکر سے کام لیں جس سے ہماری تمام مشکلات کا عقدہ حل ہو جائے۔ اگر اس وقت ہم اندھوں کی طرح دوسروں کے سہارے سے قدم اٹھائیں گے تو آئندہ چل کر ہماری قومی زندگی بالکل تلخ ہو جائے گی۔

حقوق اور قوت

سوئٹزرلینڈ کے ایک عالم کہتے ہیں کہ جس ملک میں عوام کو سیاسی حقوق مل گئے، حکومت کی قوت گر گئی اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عوام کو ڈر تھا کہ حکومت اپنی قوت پر جمی رہ جائے گی اور جمہور اس پر قابو نہ پا سکیں گے اس واسطے لوگ حکومت کی قوت کو محدود کر دیتے ہیں۔ تاکہ جمہور طاقتور بن جائیں یہی وجہ ہے کہ جس ملک میں جمہور کے سیاسی حقوق وسیع ہو گئے تو اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جدید صورتیں نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے عوام کو چاہیے کہ وہ اپنے رویہ کو حکومت کے متعلق بدلیں شروع شروع میں عوام برابر حکومت کے متعلق مخالفانہ رائے ظاہر کرتے رہتے تھے۔ انقلاب کے بعد جب ان کو آزادی اور مساوات مل گئی اور دن بدن ترقی ہونے لگی تو بعض لوگوں نے آزادی اور مساوات کو غیر محدود سی چیز سمجھ لیا۔ اس تجاوز اور تعدی کی وجہ سے حکومت کچھ انتظامی کام نہیں کر سکی اور جب حکومت بیکار ہو گئی تو ملک میں اگرچہ اس کا نام موجود ہے۔ مگر درحقیقت وہ عدم حکومت کے برابر ہے۔

موجودہ زمانے میں عوام نے حکومت کے متعلق جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کو بالکل بدلنا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کی صورت کیا ہو؟ مغرب کے علماء نے اگرچہ اس بات کو محسوس کیا ہے۔ مگر اب تک کوئی نئی ترکیب ان کے ذہن میں نہیں آئی۔ ہم جو انقلاب کا جھنڈا بلند کر کے جمہوری حقوق کے حامی بن بیٹھے ہیں، ہمارے ذہن میں ایک معقول ترکیب آئی ہے۔ ہماری یہ ترکیب دنیا کی ایک نئی ایجاد ہے۔ جو ترکیب ہم نے سوچ رکھی ہے وہ اس مسئلے کے اصول کو حل کرتی ہے۔ ہماری یہ ترکیب سوئٹزرلینڈ کے موجودہ علماء کی رائے سے ملتی جلتی ہے۔ انھوں نے بھی یہی سوچا ہے کہ عوام کے رویہ کو حکومت کے متعلق بدلنا چاہیے، جب کہ اور لوگ بھی ہمارے ہم خیال ہیں تو یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ہمارا خیال جو کہ عرصے سے ذہن میں گردش کر رہا ہے کسی مغالطے پر مبنی نہیں ہے۔ ہماری نئی ترکیب کیا ہے؟ وہ یہ کہ عوام کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت میں فرق کرنا چاہیے۔ ان میں فرق کرنے کا خیال ہماری نوایجاد ہے جو یوروپین یا امریکن علما کے ذہن میں نہیں گزرا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں جمہور کے سیاسی حقوق پر جو عمل درآمد ہوا ہے اس کے متعلق عوام کا ذہن مخالفت سے خالی نہیں اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ عوام کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ چین کو یورپ اور امریکہ کے اس عمل پر ہو بہو نہ چلنا چاہیے۔ بلکہ ہماری بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق قدم اٹھانا چاہیے یعنی حقوق اور قوت میں ایک نمایاں حد قائم رکھنا ہوگی جس سے لوگ معلوم نہ کرسکیں کون کونسے عوام کی سیاسی حقوق ہیں اور کون کون سی حکومت کی انتظامی قوت ہے۔ جب عوام حقوق اور قوت کے درمیان تمیز کریں گے تو ان کا وہ رویہ جو انھوں نے حکومت کے متعلق اختیار کر رکھا ہے، خود بخود تبدیل ہو جائے گا اور حکومت بھی پورے طور پر اپنے انتظامی کاموں میں ترقی اور استواری پیدا کر سکے گی۔ چین میں عوام کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت میں حد قائم کرنا نہایت آسان ہے اس لیے کہ چین کی تاریخ میں آطو[1] اور چوکولانگ کی مثال موجود ہے۔

---

(۱) آطو چین کا ایک حکمراں تھا۔ چوکولانگ اس کا وفادار وزیر تھا۔ ملک کے تمام انتظامات۔ حکومت کے سارے نظم و نسق اسی کے ہاتھ میں اور اس کے اختیار میں تھے۔

اگر حکومت اچھی ہے تو چالیس کروڑ آدمیوں کو چاہئے کہ اس کو چوکو لائنگ سمجھیں اور ملک میں جتنی انتظامی قوتیں ہیں سب کی سب اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ اگر حکومت اچھی نہیں ہے تو عوام کو اختیار ہے کہ وہ تمام قوتیں واپس لے لیں اور اپنے کام آپ چلائیں، یورپ اور امریکہ کے لوگ حقوق اور قوت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں، اس لئے آج تک تقریباً تین سو برس سے ان میں جمہوری حقوق کا سلسلہ لاینحل چلا جا رہا ہے۔

ہم جب عوام کے سیاسی قوت اور جمہوریت کے اصول پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو ہرگز مغرب کی تقلید نہ کرنا چاہئے، بلکہ سب سے پہلے ہم حقوق اور قوت میں حدود قائم کریں، مگر اکثر لوگ اس بات سے بے خبر ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ جو لوگ صاحب عقل و فہم ہیں ان کو ہدایت کر کے سیدھے راستے پر لائیں، اور نیک راہ پر ان کو چلائیں تاکہ ہم ان پریشانیوں سے بچے رہیں جو کہ یورپ اور امریکہ میں رونما ہوئیں۔ اور ان غلطیوں میں گرفتار نہ ہوں جن میں وہ مبتلا ہوئے، یورپین اور امریکن علماء نے اب عوام کے مخالفانہ رویہ کو محسوس کیا ہے۔ اور اس پر غور کر رہے ہیں کہ اس کو دور کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ترکیب نکالیں۔ مگر کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اب تک وہ نہیں بتا سکے۔ ہم نے تو اس ترکیب کو نہایت صاف اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے یعنی حقوق اور قوت کی تفریق جس کا مزید ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک ملک کے سیاسی معاملے کا تعلق ہے عوام کو اصولاً سیاسی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ جہاں تک امور جمہور کو چلانے کا تعلق ہے حکومت کو انتظامی قوت حاصل ہونا چاہئے اور تمام انتظامات قوم کے خاص خاص مگر لائق و فائق ماہرین کے ہاتھ میں سپرد کر دینا چاہئے۔ عوام حکومت کے افسران کو اس نقطہ نظر سے نہ دیکھیں کہ وہ محترم معزز نامور اور مشہور صدر ہے یا وزیر بلکہ اس نقطہ نظر سے دیکھیں کہ مکان کی حفاظت کرنے والا دربان، کھانا پکانے والا باورچی، علاج کرنے والا طبیب، گھر بنانے والا معمار، موٹر چلانے والا ڈرائیور اور کپڑے سینے والا درزی ہے ـــــ اس قسم کے نام جو چاہے رکھئے۔ جب عوام حکومت اور افسران کے متعلق یہ رویہ اختیار کر لیں گے تو ملک کے معاملے سدھر جائیں گے اور حکومت و قوم کو ترقی مل سکے گی۔

جمہور کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت

چونکہ ہم نے عوام کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت کے درمیان حدود قائم کر رکھی ہیں

اس لئے اس سے جو سیاسی کل بنتی ہے وہ بالکل مادی مشین کے مانند ہے۔ اس کا ہر ہر پرزہ، ہر ہر جوڑ اپنی طاقت اور قوت کے مطابق اپنا اپنا کام کرتا ہے۔ پرزے کی قوت اور ہے اور مشین کو چلانے کی قوت اور ہے۔ اس نو ایجاد سیاسی کل سے ایک جدید نظام حکومت تعمیر ہوتا ہے۔ جدید نظام حکومت بغیر ان دونوں قوتوں کے مل جل کر کام کرنے کے ناممکن ہے بلکہ بغیر ان کے حدود معلوم کرنے کے بھی ناممکن ہے کیا کسی طریقے سے ہم ان کے حدود اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں؟ اس کے لئے ضرورت یہ ہے کہ ہم اصولی طور پر سیاسی حقوق اور انتظامی قوت پر نظر ڈالیں۔ حقوق تو عوام کے ہیں سیاسی حقوق ان قوتوں کو کہتے ہیں جو اجتماعی زندگی میں ربط و ضبط اور نظم و نسق پیدا کرتی ہیں اور انتظام عوام کے کاموں کو چلانے کا دوسرا نام ہے۔ وہ قوت جو کہ جمہور کے امور کو ہم آہنگی کے ساتھ چلاتی ہے، حکومت کی انتظامی قوت ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس کے انتظامی حقوق ہیں، ایک حکومت میں دو مختلف قوتیں موجود ہیں، ایک تو عوام کے سیاسی حقوق، دوسری حکومت کی انتظامی قوت۔ ان میں سے ایک حکومت کی نگرانی کرنے کی قوت ہے دوسری حکومت کی ذاتی قوت ہے جس سے وہ لوگوں کے بتائے ہوئے فرائض کو انجام دیتی ہے۔ چونکہ ہم نے ایک نظام حکومت کے عناصر دو بڑی قوتوں میں تقسیم کر دیے ہیں، اس لئے سیاسی قوت پوری کی پوری عوام کے ہاتھ میں رہنا چاہئے، جب انھوں نے قبضہ کر لیا تو بلا واسطہ حکومت کی نگرانی کر سکتے ہیں اور بلا واسطہ امور سیاست میں رائے دے سکتے ہیں۔ دوسری انتظامی قوت ہے یہ قوت مکمل طور پر حکومت کے قبضے میں رہنا چاہئے جبکہ حکومت نے اس قوت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، تو وہ اچھی طرح سے اپنے ملک کا انتظام کر سکتی ہے۔ اور امور جمہور کو بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ اور اپنی قوم کے لئے خوش حالی اور فارغ البالی پیدا کر سکتی ہے۔ یہی انتظامی قوت یا انتظامی حقوق ہیں۔

جمہور کے سیاسی حقوق

جمہوری حقوق کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا گیا ہے۔ کیا ان میں کوئی نئی ترکیب نہیں نکالی گئی ہے؟ جمہور کا پہلا حق، حق انتخاب ہے۔ موجودہ زمانے میں جو جمہوریت کے ترقی یافتہ ملک ہیں، ان کے عوام کو صرف ایک حق انتخاب ملا ہے۔ کیا صرف اس ایک ہی حق پر کاربند ہو جانا دنیا کی سیاست کے لئے کافی

ہے؟ [illegible] صرف اس ایک [illegible] حق پر عمل کرتا، گویا پرانے زمانے کی ایجاد شدہ مشین کو استعمال کرنا ہو جس میں صرف مشین کو آگے کی طرف چلایا جاسکتا ہو۔ اور پیچھے کی طرف نہیں ہٹایا جاسکتا! نئی ترکیب ہم نے جو نکالی ہے وہ یہ ہو کہ حق انتخاب کے علاوہ حق استرجاع بھی ہو (Recall) جب عوام ان حقوق کے پرنے کو دبائیں گے تو جو چیز واپس طلب کرنا ہو، خود بخود واپس آجائے گی۔ یہ دونوں حقوق افسران کی نگرانی کرنے کے ہیں، عوام ان دونوں حقوق سے کسی کو افسر بنا کے باہر بھجوا سکتے ہیں، اور اس کو واپس طلب کر سکتے ہیں۔ افسران کا آنا جانا عوام کی مرضی سے ہو سکے گا، گویا کہ یہ ایک نو ایجاد مشین ہو۔ جس کا آگے کی طرف چلنا اور پیچھے کی طرف ہٹنا اس کے انجن کی حرکت سے ہوتا ہو۔ کسی ملک میں افسران کے علاوہ اور کون سی چیز اہم ہوتی ہے؟ اُن کے علاوہ، قانون کی ضرورت ہو۔ یعنی عوام کے امور کے انصرام کے لئے قواعد انتظامی کی ضرورت ہو۔ اس کے متعلق عوام کو کیا حقوق حاصل ہونے چاہئیں کہ وہ قانون کی نگرانی کر سکیں؟ اگر جمہور کسی بات کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کے لئے مفید ہو تو وہ اس کے قانون بنانے کے لئے تحریک کریں، تجویز پیش کریں، یا دار العوام سے مطالبہ کریں کہ وہ اس کے لئے ایک قانون بنا دے۔ اس قسم کے حق کو حق استشراع[1] کہتے ہیں۔ یہ ان کا تیسرا حق ہے۔ اگر جمہور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ قانون جو کہ عرصہ سے ملک میں جاری ہو، اور ملک کی حالت اور زمانے کی رفتار کے لحاظ سے اس کا بجنسہ باقی رہنا عوام کے لئے غیر مفید بلکہ مضر ہے۔ تو اس کے لئے بھی عوام کو ایک حق ہونا چاہئے جس سے وہ اس غیر مفید قانون میں کچھ تبدیل اور ترمیم کر سکیں۔ ترمیم و تصحیح کے بعد عوام کو حق ہے کہ وہ حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ اس ترمیم شدہ قانون کو نافذ کرے اور اصلی قانون کو منسوخ کر دے۔ اس حق کا نام حق ترمیم یا تصحیح ہے۔ یہ عوام کا چوتھا حق ہو۔ عوام یہ چار حقوق اپنے ہاتھ میں رکھنے کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ انکو کافی حقوق مل گئے ہیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بلا واسطہ جمہوری حقوق کے حق دار ہو گئے ہیں، اس سے پہلے تو عوام کو کافی حقوق نہیں ملتے تھے عوام صرف اپنے نمائندوں کے انتخاب کر سکتے تھے۔ مگر ان کے انتخاب کے بعد ان کو کوئی حق نہ تھا کہ وہ اور چیزوں کے متعلق کچھ دریافت کر سکیں، اس قسم کے حقوق بلا واسطہ جمہوری حقوق کہلاتے ہیں۔ بلا واسطہ جمہوری حقوق سے مطلب حکومت سندوبین ہے۔ سندوبین کے توسط سے عوام حکومت

---

(۱) یعنی قانون بنانے کی تحریک عوام کی طرف سے

کی نگرانی کرتے ہیں ۔ اور بلا توسط ان کو کوئی حق نہیں کہ وہ ان کی نگرانی کریں۔ جب ان چار حقوق پر پورے طور پر عمل درآمد ہو جائے جن کے ذریعے سے عوام حکومت کی نگرانی کر سکیں تو اپنی حکومت کو حکومت جمہوری کہہ سکتے ہیں ۔

حکومت کے لازمی انتظامی حقوق

حکومت کے دفتری حقوق ، آجر کے حقوق کی طرح ہیں ، یعنی وہ حقوق جن سے حکومت عوام کے کاموں کو انجام دیتی ہے ...... حکومت جس قسم کا کام کرے عوام کی مرضی سے ہونا چاہئے مگر حکومت کو اپنے کام کرنے کے حقوق بھی تو ملنا چاہئیں ۔ کام کرنے کے حقوق ملنے کے بعد حکومت ان حقوق کے مطابق اور ان کے حدود کے اندر جو چاہے کر سکتی ہے ۔ اگر عوام دیکھیں کہ حکومت کا قدم اپنے جائز حدود سے باہر نکلا ہے تو اس کو روک سکتے ہیں ۔

حکومت کے مکمل نظام اور بخوبی کام کو انجام دینے کے لئے پانچ حقوق اساسی کی ضرورت ہے ۔ ان پانچ انتظامی حقوق کی بنیاد پر حکومت کا مکمل نظام قائم کیا جا سکتا ہے ۔ اور انھی سے حکومت امور عامہ کو بخیر و خوبی انجام دے سکتی ہے ۔

مکمل جمہوری حکومت کا نظام ۔

جب حکومت اور عوام دونوں حقوق اور قوت رکھتے ہوں تب دونوں کا توازن قائم ہو سکتا ہے ۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کو چار بڑے بڑے حقوق تو مل گئے یعنی حق انتخاب ، حق استرجاع ، حق استشراع اور حق ترمیم یا تنسیخ ۔ مگر اب تک حکومت کو ایک حق بھی نہیں ملا ! ــــ نہیں ، نہیں حکومت کے لئے پانچ حقوق محفوظ ہیں یعنی حق عاملہ ، حق شارع یا قانون سازی حق عدالت ، حق معائنہ اور حق مواخذہ ۔ عوام اپنے چار سیاسی قوتوں سے ، حکومت کی پانچ انتظامی قوتوں کی نگرانی کرتے ہیں ۔ اور حکومت اپنی پانچ انتظامی قوتوں سے امور عوام کو چلاتی ہے اور باہم منسلک کرتی ہے یہی سب سے اچھی صورت ہے جس سے جمہور کا مکمل نظام حکومت قائم ہو سکتا ہے ۔ اب ہم نقشے کے ذریعے سے ان بڑی قوتوں کے تعلقات ظاہر کرتے ہیں تاکہ لوگ اس کو ذہن نشین کر لیں اور ان کے بین اور

واضح فرق کو معلوم کر سکیں۔ پہلا نقشہ جمہور کی سیاسی قوتوں کو بتاتا ہے اور دوسرا نقشہ حکومت کی انتظامی قوتوں کو۔ اول الذکر حکومت کی نگرانی اور اس کی بندش کرتی ہیں اور آخر الذکر عوام کے کاموں کو چلاتی ہیں۔ ان دونوں حقوق کے ذریعے سے عوام اور حکومت کے درمیان توازن قائم رہ سکتا ہے اور ان سے جمہوری حقوق اور حکومت جمہوری کا سوال اصولاً صحیح طور پر حل ہو جاتا ہے اور عوام اور حکومت دونوں تسکین اور اطمینان پاتے ہیں
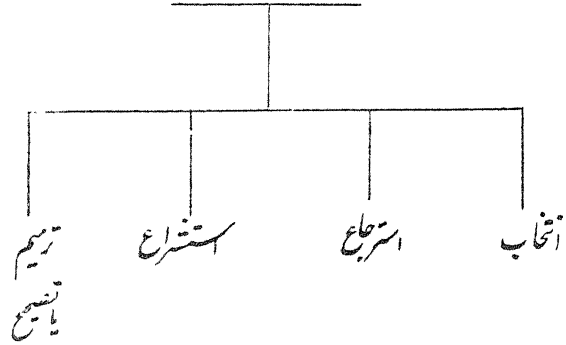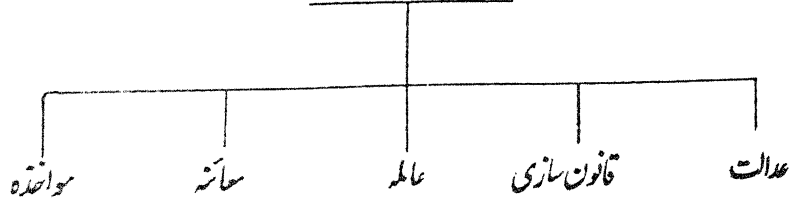
(باقی)

عمر طوسوں کے خیالات

پرنس عمر طوسوں کا نام اہل مشرق کے لئے محتاج تعارف نہیں ہے۔ اصلاح مشرق کے سلسلے میں جن جلیل القدر ہستیوں کا نام لیا جاسکتا ہے ان میں عمر طوسوں کا نام ایک امتیازی حیثیت سے شمار کرنا پڑے گا۔ موصوف نے مشرق کی اصلاح اور اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر رکھا ہے اور اس معاملے میں ان کی مساعی جمیلہ مستحق صد تحسین قرار دی جاسکتی ہیں۔

علاوہ ازیں آپ ایک وسیع النظر، صاحب رائے اور روشن خیال ماہر سیاسیات کی حیثیت سے بھی غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ کے سیاسی نظریات اکثر سیاسی رہنماؤں کے لئے چراغ ہدایت بن چکے ہیں اور موجودہ سیاسیات کی گتھیوں کے سلجھانے میں آپ کے ناخن تدبیر نے اکثر مشرق کی امداد کی ہے۔ آپ کے اکثر مقولے ضرب المثل کی طرح زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں۔ چنانچہ سوڈان کے مسئلہ میں یہ فقرہ (جو اہل مصر کو مخاطب کرکے کہا گیا تھا) آپ کی وسعت نظر کا ثبوت ہے:-

"اگر ہم سوڈان پر حکومت کریں گے تو سوڈان ہم پر حکومت کرے گا!"

علمی حیثیت سے آپ کو ایک "فاضل شہزادہ" کہہ سکتے ہیں۔ عربی اور فرانسیسی زبانوں میں آپ کی متعدد معرکۃ الآرا تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

ان تمام محاسن کے ساتھ اگر آپ کی وہ عدیم المثال تواضع اور منکسر المزاجی شامل کر لی جائے جو اس قابل رشک جاہ و منزلت کے لحاظ سے تعجب خیز معلوم ہوتی ہے، تو حیرت ہوگی کہ قدرت نے اس جلیل القدر ہستی کو کس فیاضی اور بے بخلی کے ساتھ خوبیاں عطا فرمائی ہیں۔ اور غالباً یہی وہ بڑا سبب ہے جس نے جمہور کے قلوب کو آپ سے وابستہ کر رکھا ہے اور لوگ آپ کو نہ صرف ایک "مصری" محب وطن کی حیثیت سے محبوب رکھتے ہیں بلکہ ایک ایسے "محب مشرق" کی حیثیت سے آپ کی عزت کی جاتی ہے جو دل سے ان کی رفعت و فارغ البالی کا خواہاں ہے اور ہمیشہ ان کی مسرت و مصیبت میں ہر طرح شرکت کے لئے آمادہ

رہتا ہے۔

مشرق کا فرض اولین | میں نے شہزادۂ موصوف سے سوال کیا :۔

"کیا آنجناب یہ دریافت کرنے کی اجازت دیں گے کہ مشرقی اقوام کو اپنی حیات عامہ میں سب سے پہلے کس امر کی جانب توجہ کرنا لازمی ہے ؟"

آپ نے فرمایا :۔

"اس سوال اور اس قسم کے دوسرے سوالوں کا جواب مسئول کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس پر غور کرتے وقت جواب دینے والے کے دل میں جس قسم کے خیالات گزر رہے ہوں ان کا بھی جواب پر بہت کچھ اثر ہوتا ہے۔ مشرقی اقوام کی حیات عامہ میں جن امور کی کمی ہے وہ چند در چند ہیں۔ ضروریات اور اکثر افادے کے لحاظ سے بعض امور کو بعض پر مقدم کر دینا اگر ایک نقطہ نگاہ سے درست ہو سکتا ہو تو دوسرے نقطہ نظر سے اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہو۔ اس لئے اس قسم کے سوالوں کے جوابات تمام تر اعتباری اور نسبتی ہوتے ہیں۔ طریق غور و فکر اور قیاس اہمیت امور کے اعتبار سے ہر انسان ایک خاص ذہنیت رکھتا ہو اور اس قسم کی رایوں کی قدر و قیمت صرف اس وقت معلوم ہو سکتی ہے جب ان کا عملی تجربہ کر کے ان کے فوائد و محاسن کا کلی اطمینان کر لیا جائے۔

"میں نے اپنے جواب کو اس مختصر تمہید سے اس لئے شروع کیا کہ اس معاملے میں میرے مسلک کی توضیح ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ اعتبارات پر مبنی ہے جس طرح یہ ممکن ہو کہ وہ واقعات کے مطابق ثابت ہو اور حقیقت سے منطبق ہو جائے اسی طرح یہ بھی ممکن ہو کہ ایسا نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مشرقی اقوام کو اپنی حیات عامہ میں جس امر پر سب سے زیادہ توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہو اس کا تعین جس طرح اجتماعی نقطہ نظر سے ہو سکتا ہو اسی طرح سیاسی، اقتصادی وغیرہ دوسرے مختلف نقطہ ہائے خیال سے بھی ممکن ہے۔ لیکن یہ مختلف اعتبارات کچھ اس طرح باہم مخلوط و متداخل ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے میں اثر انداز ہوتا ہے اور بغیر قصد اور ارادے کے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی تیسری

حیثیت اس سے متاثر ہوجاتی ہے۔ آپ یقیناً ان تمام حیثیات سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ان میں سے کوئی ایک آپکے پیش نظر ہے اس لئے میری رائے میں آپ کے سوال کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ :۔

" اقوام مشرق میں ہر ایک قوم پر جو سب سے پہلا فرض عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ من حیث القوم اپنی تکوین و تنظیم پر نظر ثانی کرکے قومیت کا قصر جدید مستحکم بنیادوں پر تعمیر کریں اور اپنی نطرت میں ان عناصر کو شامل کریں جو قوم کو فیضان حیات سے آشنا کرکے اس کی رگوں میں عمل کی روح پھونک دیں۔ ساتھ ہی ان اسباب پر بھی نظر ڈالیں جنھوں نے پہلی عمارت کو آفات و مصائب کا نشانہ بنا دیا تھا۔ اور اپنی پوری قوت سے ان کے تدارک و استیصال کی کوشش میں مصروف ہوجائیں۔ مذہب اور اختلاف عقائد کو کسی حالت میں بھی اس عمارت کے انہدام اور اس کی بنیادوں کے کھوکھلا کرنے کا بہانہ نہ بنایا جائے جہاں تک ممکن مذہبی تعصب کو کم کیا جائے اور رواداری و وسیع المشربی کو اپنا شعار بنا کے مذہب کو صرف اس حد تک محدود کردیا جائے جہاں تک اس کی حدود ہیں۔ مذاہب کا مقصد عموماً انسانیت کی خدمت اور مفاد عامہ کی نگہداشت ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ انھیں اسی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے نہ جیسا کہ آج کل انھیں افتراق و انقسام اور کینہ پروری و تنگ خیالی کے لئے آلۂ کار بنا لیا گیا ہے۔ مذہب کے اس غلط طریق استعمال نے ہی مشرقی اقوام کو ضعیف کردیا ہے اور ان پر ہر طرف سے مصائب و آفات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔

" جب ہر قوم کے رہنما سمجھ لیں گے کہ ان کے ذاتی اور وطنی مصائب کی بنیاد محض وہ اختلافات ہیں جو انھیں آبا و اجداد سے ورثے میں ملے ہیں، جنھوں نے بغض و عداوت ان کی گھٹی میں ڈال دی ہے، جنھوں نے ان میں افتراق کا بیج بوکر انھیں فرقہ بندی کی لعنت میں مبتلا کردیا ہے اور جنھوں نے ان کی قوت کو ضعف سے اور کثرت کو قلت سے بدل دیا ہے، جب وہ خلوص قلب سے اس کے قائل ہوجائیں گے اور ان کے دل میں اس بدقسمتی کا صحیح احساس ہوجائے گا تو یہ احساس بلا توقف انھیں عمل کی جانب متوجہ کردے گا۔ افتراق کو بھلا دیا جائے گا، اختلاف کو پس پشت ڈال دیا جائے گا یا کم از کم ان میں اتنی نرمی پیدا کردی جائے گی اور انھیں اتنے تنگ حلقوں میں محدود کردیا جائے گا کہ ایک وطن

کے فرزندوں کی اخوت میں حارج نہ ہو سکیں اور باہمی تعاون واشتراک عمل کی راہ میں روڑا نہ اٹکا سکیں تاکہ شفیق مادر وطن اور مشترکہ روایات و مراسم کے درمیان رابطہ بن سکیں اور ان کے قلوب کو ایک دوسرے سے مانوس کر سکیں۔ اس وقت وہ سخت اختلافات اور وہ آتش بار جذبات سرد ہو کر ختم ہو جائیں گے امن و سکون کا دور دورہ ہو گا اور مصالح عامہ اور قومی منفعت کے مقابلہ میں کوئی ان اختلافات کو پیدا کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کرے گا۔

" مختصر یہ کہ مشرق کی بیماری " نفاق " اور اس کا علاج " اتفاق " ہے۔ حکیم مشرق سید جمال الدین افغانی نے اس نکتہ کو پورے طور پر معلوم کر لیا تھا اپنے ایک غیر فانی مقولہ میں کہتے ہیں:

" مصریوں نے اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ متفق نہ ہوں گے! "

اہل مغرب نے بھی اس راز کو سمجھ لیا ہے اسی لئے انھوں نے مشرق میں اپنی سیاست کی بنیاد " پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو! " کے نظریہ پر قائم کی ہے۔ ایک وطن کے باشندوں میں اختلاف قدم ہو ضعف اور ذلت کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایران کی طوائف الملوکی میں اور سکندر کی بقاے سلطنت کے انتظام کے مشہور مشورے میں اہل نظر کے لئے بہترین سامان عبرت و بصیرت موجود ہے۔

مہاتما گاندھی کو جب معلوم ہوا کہ بعض مسلمان نادانی اور غلط فہمی کی وجہ سے آمادہ نزاع ہیں تو وہ بکمال دانشمندی یہ اعلان کر دینے پر آمادہ ہو گئے کہ:-

" باہمی افتراق و اختلاف کی بہ نسبت ہمیں یہ زیادہ پسند ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی اقلیت کی حکومت میں رہیں! "

مولانا محمد علیؒ نے گول میز کانفرنس میں اپنی تاریخی اور یادگار تقریر کے دوران میں فرمایا:-

" برطانیہ نے ہندوستانیوں کو تاریخ کی غلط تعلیم دی اور یہی فرقہ وارانہ نزاعات کا سرچشمہ ہے اس وقت ہندوستانیوں کی عنان حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہے اور میں اقلیت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اکثریت کی حکومت تسلیم کرتا ہوں . . . . جس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم اپنے درمیان تفریق نہ ہونے دیں گے جیسا کہ

ہم نے کرلیا ہے) اسی وقت برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہوجائے گا!،،

"میری رائے میں مشرقی اقوام کو جس چیز کی طرف فوراً متوجہ ہوجانا چاہئے میں نے اس کی تفصیل بیان کردی ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے بلکہ یہ رائے صرف دوسرے مدبرین کے اقوال کی صدائے بازگشت کہی جاسکتی ہے کیونکہ ہم سب کی رائے میں اس سے زیادہ کوئی اہم اور ضروری مقصد نہیں ہوسکتا۔"

جمعیت اقوام مشرقیہ | میں نے عرض کیا:۔

"کیا ایک "جمعیت اقوام مشرقیہ" کا قیام ممکن ہے، وہ کیونکر تشکل ہوسکتی ہے اور اس کا مرکز کہاں قائم کیا جاسکتا ہے؟"

ہزہائنس نے فرمایا:۔

"جب ہر ایک مشرقی قوم اُن تمام امور پر عامل ہوجائے گی جن کی ایک ایسی حقیقی قوم کی تشکیل میں ضرورت پیش آتی ہے جو منظم، متحد اور اپنی قومیت و وطنیت کی فدائی ہو، تو اس مرحلے پر یعنی جمعیت اقوام مشرقیہ" کے قیام پر غور کرنا آسان ہوگا۔ یہ جمعیت مشترک فیہ امور عامہ پر نظر ڈال سکے گی۔ اس کی آواز مؤثر اور اس کے نتائج شاندار ہوں گے۔

لیکن بحالات موجودہ اگرچہ اس قسم کی جمعیت کا قیام ممکن ہے تاہم اول تو وہ خود ضعیف اور غیر اہم ہوگی پھر جن ارکان سے اُس کی تالیف ہوگی اُن کا ضعف اس میں اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اس لئے فی الحال انجمن سے کسی خاص فائدے اور معتد بہ نفع کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اُس کی تشکیل اور تعین مرکز کا سوال ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور ابھی سے اس کے متعلق غور وخوض کرنا جلد بازی ہے۔

مشرق کی بیداری | میں نے کہا:۔

"مشرق کی موجودہ بیداری کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے: کیا وہ ہماری آرزوؤں کے مطابق ہے یا اس میں ایسے عناصر کی کمی ہے جن کی وہ محتاج ہے اگر اس میں کچھ عیوب ہیں تو اُن کا تدارک کیونکر ہوسکتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا :-

"مشرق کی بیداری ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ جنگ عظیم اور اس کے مصائب و آفات نے بڑی حد تک اس میں اثر کیا ہے لیکن ہنوز آرزوؤں کی تکمیل نہیں ہو سکتی ہے۔ تاہم امید قوی ہے کہ وہ جلد یا بدیر ضرور اس مرتبہ تک پہنچ کر رہے گا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اسے ابھی تک بعض عناصر کی احتیاج باقی ہے۔ جن میں سب سے اہم ان مختلف فنون کی جانب متوجہ ہونا ہے جو قوموں کو اپنی ضروریات کے حصول میں اغیار سے مستغنی کر دیں۔ اُن کے کثیر التعداد مفلس افراد کی شکم پری کر سکیں، اور دولت وثروت اور استقلال و آزادی کی بنیاد بن سکیں۔ تاکہ مشرق — آج کل کی طرح — مغرب کا دست نگر نہ رہے۔

اس کے عام عیوب میں جو سب پر حاوی ہیں مذہبی، سیاسی اور فرقہ وارانہ اختلافات وانقسامات کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ مختلف اقوام مشرق میں دوسرے خاص خاص عیوب بھی پائے جاتے ہیں جو زیادہ تر مختص المقام ہیں۔ مثلاً ٹرکی اور مصر کی ترقی میں یہ مخصوص عیب ہے کہ وہ ہر اچھے برے معاملے میں حرف بہ حرف یورپ کی "کھوکھلی نقالی" پر زور دیتے ہیں اور مغربی تمدن کی اندھا دھند تقلید میں مصروف ہیں۔ یہ ایک غیر مستقل بیداری ہے جس میں ہمارے اور اہل مغرب کے طبائع، عادات، اخلاق، اور مذہب کے اختلافات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں ہمارے قدیم تمدن کی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے باوجودیکہ اس سے اخذ کرنا لازمی تھا بلکہ اُسے تو اپنی موجودہ ترقی کی بنیاد بنانا چاہیئے۔ البتہ جو امور "روح عصریہ" سے متفق نہ ہوں انھیں یا تو ترک کر دینا چاہیئے یا معتدل بنالینا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری اقوام کے تمدنوں سے (جن میں مغربی تمدن بھی شامل ہیں) ضروری اور مفید باتیں منتخب کر لینا چاہیئے اور انھیں اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہیئے تاکہ ہماری ممتاز قومیت اور مخصوص زندگی کا بقا و قیام ممکن ہو۔"

مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب! | میں نے کہا :-

"ایسی صورت میں کیا آنجناب کا خیال ہے کہ مشرق مغرب میں بنیادی اور ناقابل تصفیہ اختلاف

موجود ہیں ؟"

آپ نے فرمایا :-

"ہاں ، "مشرق ، مشرق ہے اور مغرب ، مغرب ! " یہ ایک سچا مقولہ ہے جس کی تاریخ و واقعات اور ماضی وحال سے تائید ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا بظاہر غیر ممکن معلوم ہوتا ہے ۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انسانیت اپنی موجودہ سطح سے بلند تر ہو جائے اور تمام انسانوں کو ایک رشتہ اخوت میں منسلک کر دے لیکن اس کا بہت ہی کم احتمال ہے اور اس کی امید باندھنا "خیالی پلاؤ پکانا" ہے۔"

سماجی اصلاح کے وسائل | میں نے کہا :-

" کیا آپ یہ سوال کرنے کی اجازت دیں گے کہ موجودہ زمانے میں سماجی اصلاح کے لئے کن وسائل کا اختیار کرنا ضروری ہے ؟"

موصوف نے فرمایا :-

"موجودہ زمانے میں سماجی اصلاح کے لئے جو ذرائع استعمال کئے جا سکتے ہیں وہ چند در چند ہیں ان میں سے صرف اہم امور کے تذکرے پر کفایت کرتا ہوں غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر کے انھیں مجملاً مختصر طور پر ذکر کروں گا تاکہ گفتگو طویل نہ ہو جائے ۔ ان وسائل کے منجملہ مندرجہ ذیل زیادہ اہم ہیں :-

(۱) سیاسی اور مذہبی اختلافات ، تنازعات اور خصومات کے خلاف جد و جہد۔

(۲) تعلیم کی عمومیت جو قوم کے لڑکوں اور لڑکیوں سے جہالت کی بیخ کنی کرنے اور تعلیم کے تمام مدارج میں تعلیمی حالات و معاملات میں ایک ہمہ گیر اور عام اصلاح جو اپنے جوہر اور مبدا اصول میں ثبات و استحکام پر مشتمل ہو ۔ ساتھ ہی انقلاب زمانہ اور مرور ایام جن تغیرات کی ضرورت پیدا کرتے جائیں اُن کے لئے کافی گنجائش اور لوچ موجود ہو اس اصلاح میں دوسرے تمام امور سے پہلے "علمی پہلو" کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے تاکہ آئندہ نسل میں تمام آزاد پیشے اور ذرائع معاش اختیار کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور اس کا منتہائے نظر صرف سرکاری ملازمت تک محدود نہ ہو۔

(۳) مفید صنعت و حرفت کی مختلف شاخوں کی جانب اسی نسبت سے متوجہ ہو جانا جتنی سخت ہمیں ان

کی ضرورت ہے۔ اس کی اور زراعتی ترقی کی راہ میں جو مشکلات حائل ہیں ان پر پانی کی موجوں سے رقی رو پیدا کر کے غالب آنا، اس عظیم الشان مقصد کے اجرا کے لئے جس کا تعلق براہ راست ہماری روزمرہ زندگی سے ہے، مردانہ وار مستعدی سے آمادہ ہوجانا۔ موجودہ طرز عمل جو سراسر تساہل اور ٹال مٹول پر مبنی ہے قطعاً کارآمد نہیں ہوسکتا جب الوالعزمی اور خلوص سے کام لیا جائے گا تو تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی منزل مقصود قریب آجائے گی اور غیر معمولی مفید نتائج رونما ہونے لگیں گے۔ اس صورت سے ہم کثیر التعداد کارخانے جاری کرسکیں گے، خصوصاً پارچہ بافی اور سوت کاتنے کے کارخانے۔ اس وقت ہم اپنے ملک کی روئی کا بڑا حصہ اپنے ملک ہی میں صرف کرسکیں گے، اور وہ آج کل کی طرح برائے نام قیمت پر ضائع نہیں ہوا کرے گی۔ میں نے اس تجویز کو بھی اجتماعی اصلاح کی ذیل میں شمار کیا ہے حالانکہ اس کا تعلق زیادہ "اقتصادیات" سے ہے اور اسے آسانی سے "اقتصادی اصلاح" کا ایک شعبہ کہا جاسکتا ہے "قومی تکول" کا اجرا بھی اسی نوعیت میں داخل ہے، جو صنعت وحرفت، زراعت، تجارت، اور انجمن ہائے امداد باہمی (کوآپریٹو سوسائٹیز) کے لئے لابدی ہیں۔

(۴) صحت عامہ کے معاملات سے دلچسپی لینا، جن امراض نے ہمارے ممالک کو اپنا "مستقل وطن" بنا لیا ہے۔ ان کے مقابلے کی جدوجہد کو المضاعف کر دینا، ایسے اسباب زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا کرنا جو صفائی اور پاکیزگی کی ترقی میں معاون ہوں، مزدوروں، دیہات کے باشندوں اور خصوصاً کاشتکاروں سے "برہنہ پائی" کی عادت چھڑانا جو کثرت سے ان میں مروج ہے، ورزشی کھیلوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کا دائرہ وسیع کرنا، منشیات و مسکرات کا استیصال کرنا، اور علانیہ و خفیہ بدکاری کا انسداد کرنا۔

(۵) ہر قسم کی تبلیغ وارشاد کا وسیع اور بہتر پیمانے پر انتظام کرنا اور اس مقصد کے لئے ایسے خوش بیان مقررین اور مہذب و تربیت یافتہ خطیبوں کا پیدا کرنا جو قابل اعتماد طریقہ پر قوم کے اندر فضائل اور تربیت عامہ کی نشر و اشاعت میں کوشش کریں اور مذہبی روح کو اس طرح پھیلائیں کہ اُسے افتراق و انتشار کا ذریعہ نہ بنایا جاسکے بلکہ وہ منشائے الٰہی کے مطابق خیر وسعادت کا سبب اور

"رحمت عامہ" بن جائے۔ . . . . ہمارے خیال میں ایک ایسی قوم کے لئے جس میں جہالت کا دور دورہ ہو اصلاح کا یہ طریقہ تعلیم عامہ کا آسان ترین ذریعہ ہے اور اس طرح تہذیب و علمیت کی تعمیم، قیام امن و اطمینان اور مقاومت منکرات میں جلدتر اور غیر معمولی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

(۶) منظم جماعتوں کا اس امر پر اتفاق کر لینا کہ "آئین" کا کامل احترام کیا جائے گا اور اس کی ترقی و اشاعت میں امداد دی جائے گی تاکہ جمہوری نظام تمام شعبوں میں عام ہو جائے اور خاندان کی تعمیر میں بنیادی کام دے۔ اور لوگوں کے باہمی تعلقات و معاملات میں حاکمانہ اثر انداز ہو"

عورت کے حقوق و فرائض | میں نے کہا :-

"مشرقی عورت کے حقوق و فرائض کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے ؟"

صاحب موصوف نے جواب دیا :-

"عورت کا حق ہے کہ اُسے طفولت کے زمانے میں تہذیب، تربیت اور تعلیم سے بہرہ اندوز کیا جائے ایک بیوی کی حیثیت سے اُس کا حق ہے کہ اُس کے ساتھ انصاف، خلوص، اور حسن اخلاق کا برتاؤ ہو تاکہ وہ اپنے معاشرتی اور اجتماعی فرائض ادا کر سکے اور ایک اچھی بیوی اور مدبّر گھر کی ملکہ" بن سکے جو اپنے شوہر کے ساتھ نتیجہ خیز اشتراک عمل کرے"

"اُس کی تعلیم سے میری یہ مراد ہے کہ وہ اس قدر علم حاصل کرے کہ اُس کے شوہر، اس کے گھر، اور اس کے بچوں کی جانب سے جو فرائض اُس کے ذمے عائد ہوتے ہیں انھیں بخوبی ادا کر سکے۔ بہتر ہے کہ بعض خواتین ایسی بھی ہوں جو مخصوص نسوانی ضروریات کی ماہر ہوں۔ بعض صنائع سے واقف ہوں اور اسراف و فضول خرچی سے بچتے ہوئے "جمالیات" کا بھی کسی قدر ذوق رکھتی ہوں"

"پہلی شق میں اس کا معلمہ، طبیبہ، قابلہ (دائی) نرس، یا خادمہ ہونا شامل ہے۔ دوسری شق میں اسے خیاطی یا موزے اور گلوبند وغیرہ بننے یا کاڑھنے سے واقف ہونا چاہئے۔ تیسری شق میں اُس کے لئے ضروری ہے کہ بعض فنون لطیفہ مثلاً تصویر کشی، موسیقی، نقاشی، کتابت اور شعر میں مہارت پیدا کرے۔ "لیکن وکالت، انجنیری، تمثیل اور کونسلوں کی ممبری وغیرہ اس قسم کے پیشے اختیار کرنا جن

میں خطرناک اختلاط اور غیر پسندیدہ نمائش لازمی ہے، میری رائے میں اول تو عورت کو ان میں شرکت کی ضرورت ہی نہیں ہے پھر ان کی وجہ سے عورت کو اور سوسائٹی کو جو عظیم الشان نقصان برداشت کرنا پڑے گا وہ نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض مغربی خواتین ان امور میں حصہ لیتی یا اُس کا مطالبہ کرتی ہیں، لیکن اس کے باوجود میری رائے اپنی جگہ پر قائم ہے کیونکہ ان کی حالت ہمارے یہاں کی خواتین کی حالت سے قطعاً مختلف ہے۔

"بنات وطن" کو ہماری سب سے بڑی نصیحت یہ ہے کہ وہ ظاہری آرائش سے زیادہ حیا عفت اور فضائل سے مزین ہونے کی کوشش کریں اور نمائش، نافرمانی، بیباکی، اسراف اور رذائل سے نفرت کریں۔ نیز اُن میں سے جو عورتیں ان نازیبا صفات سے متصف ہوں۔ اُن سے بھی نفرت کریں۔ اپنی شرافت، خودداری اور آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے جائز آزادی سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح وہ ضروری احترام کی مستحق اور اکرام و اعزاز کی اہل ثابت ہوں گی۔

چینی جمہوریت پسندوں کا گیت

۱۔ ہم نشینو! ہم نشینو! آؤ ہمت باندھ کر آؤ، سب مل کے انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو

مٹاؤ، مٹاؤ، مٹاؤ اہل شہنشاہیت کے ظلم و جبر

مٹاؤ، مٹاؤ، مٹاؤ اہل عسکریت کے غلبہ و قہر

مٹاؤ، مٹاؤ، مٹاؤ، اہل سرمایہ کے حرص و مکر

ہیں دوست ہمارے انقلاب کے موافقین، دشمن ہیں ہمارے اس کے مخالفین۔

روح ہماری، ہے جد و جہد، استقلال، ایثار و ایمان۔

۲۔ ہم نشینو! ہم نشینو! آؤ ہمت باندھ کر آؤ، سب مل کے انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو

گراؤ، گراؤ، گراؤ ذات پات کی حدود و درجات،

گراؤ، گراؤ، گراؤ بے کار اور پامال عقائد و خیالات،

گراؤ، گراؤ، گراؤ وحشیانہ رسوم و عادات۔

ہوگئے جو پرانے ان کو توڑ و تخریب سے، ہیں جو نئے ان کو جوڑ و تعمیر سے

مطالبات ہمارے، ہیں مساوات، خود مختاری اور محبت نوع انسان۔

۳۔ ہم نشینو، ہم نشینو! آؤ ہمت باندھ کر آؤ۔ سب مل کے انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو

واپس لے لو۔ واپس لے لو، واپس لے لو قوم کی مساوی حیثیت،

واپس لے لو۔ واپس لے لو، واپس لے لو جمہوری حکومت کے حقوق و طاقت،

واپس لے لو، واپس لے لو، واپس لے لو مزدوروں کی زندگی کی نعمت،

انقلاب مبارک خیال ہے، انقلاب جائز اور فطری کام ہے۔

اصول ہمارے، ہیں عوام کے حقوق، عوام کی حکومت، اور عوام میں امن و امان

خفقان

(سید دہاج الدین صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے روس کے مشہور افسانہ نگار چیخوف کے چند افسانوں کو اس طرح اپنایا ہے کہ بالکل اپنا کرلیا ہے انھیں اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ ان میں سے ہم پہلا افسانہ ذیل میں شائع کرتے ہیں۔)

مرزا منعم بخت، تیمور کے گھرانے کے چشم و چراغ، دلی کے رو رجے محکمۂ نہر کے مشہور انجنیر رات کو ۹ بجے اپنے دوستوں سے ملتے ملاتے گھر واپس آئے۔ گھر سنسان تھا، اس لئے کہ اس کی "رونق" مع بڑے بچے اور گود کی لڑکی کے اپنی بڑی بہن کے یہاں بڑے پیر کے کونڈوں میں گئی ہوئی تھیں، اور زنانے مکان میں سوائے بچھلے لڑکے اور اس کی آیا کے اور کوئی نہ تھا۔

مرزا منعم بخت نے اکیلے بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر جلدی سے کپڑے بدل اپنے اکیلے اور سنسان کمرے میں جاکر پڑ رہے۔ لیٹے تو ایک ایک کرکے دن بھر کی باتیں یاد آنا شروع ہوئیں، لیکن اس فانوس خیال میں ایک تصویر ایسی تھی جو ان کے دماغ پر ایسی مسلط ہوئی کہ ہزار اسے ہٹاتے ہیں، دل بہلاتے ہیں، گنگناتے ہیں کروٹیں لیتے ہیں، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتی۔ واقعہ یہ تھا کہ شام کو جب مرزا صاحب اپنے والد مرحوم کے ملاقاتی مولوی زین العابدین چشتی القادری کے یہاں بیٹھے تھے تو جیسا کہ مولوی صاحب قبلہ کا دستور تھا، رویائے صادقہ، القا، الہام، غیب دانی وغیرہ کا ذکر چھڑا اور خدا معلوم کس طرح ہوتے ہوتے سلسلۂ سخن ارواح خبیثہ، اجنہ، عفریت، بھوت وغیرہ تک پہنچا۔ کئی سن رسیدہ بزرگوں نے سر ہلا ہلا کر اپنے "چشم دید" بھوتوں کے واقعات بیان کئے۔ ایک صاحب نے کسی اور صاحب کی معرفت، جنھوں نے ایک صاحب کے حوالے سے کسی اور کے متعلق سنا تھا، بیان کیا کہ راوی اول کے ماموں کی روح عین شب برات کے روز ظاہر ہوئی اور اپنے حصے کا حلوا کھا گئی۔ اب حلوا چاہے بلی نے کھایا ہو یا ماما کے لڑکے نے، لیکن واقعہ یہ تھا کہ ان مرحوم کے نام کی مٹی کی رکابی خالی پائی گئی تھی۔ جب یہ سب باتیں ہو چکیں تو مرزا صاحب

نے بھی ولایتی روحانیت کے کرشمے مثلاً سلیٹ یا کاغذ پر ارواح کی تحریروں کا آنا، کنڈی کھٹ کھٹانا۔ میز الٹنا وغیرہ بیان کئے، اور ان سب باتوں کا اچھا خاصہ اثر دل پر لئے ہوئے وہاں سے اٹھے۔

اب جو رات کو مرزا صاحب لیٹے تو ہزار چاہتے ہیں کہ ان کی نظریں ان کے چچا مرحوم کی تصویر سے جو پائنتی کی طرف دیوار پر لگی ہوئی تھی، ہٹیں، لیکن نہیں ہٹتیں۔ ہزار خیال کو ہٹاتے ہیں لیکن نہیں ہٹتا۔ ارادہ کر لیا کہ نہ تصویر کو دیکھیں گے نہ اس کا خیال کریں گے، لیکن تھوڑی دیر بعد خیال کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ دل ہی دل میں چچا کی برسی کی تاریخ کا حساب لگا رہے تھے۔ اس کشمکش میں ۱۲ بج گئے، زور سے کئی مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھی، کھانسے، کھنکارے، کچھ شعر یاد تھے وہ پڑھے کہ اور کچھ نہیں تو اپنی ہی آواز سن کر ہمت بندھے، لیکن توبہ کیجئے، تخیل کا رہوار، برق رفتار کس کے روکے رکتا ہے جو ان سے رکتا۔ لیمپ کی ہلکی نیلی روشنی چچا جان مرحوم کی تصویر پڑ رہی تھی۔ سرہانے گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی اور مرزا صاحب کا دل اس کی ٹک ٹک پر بلیوں اچھل رہا تھا۔

اب مرزا صاحب کے دل میں خیال گزرا کہ کہیں "چچا جان کی روح اس وقت کمرے میں داخل ہو جائے تو"! پھر خود ہی اس خیال پر لاحول پڑھی۔ دل کو سمجھایا کہ بھوت پریت، ارواح وغیرہ کے سب قصے محض توہم پرست لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں لیکن احتیاطاً تصویر کی طرف سے کروٹ بدل کر اپنا سر زور سے دُلائی کے اندر لپیٹ لیا، اور دلائی کو چاروں طرف سے سمیٹ کر بدن کے نیچے دبا لیا، غرض کہ ہر طرح سے اس کا انتظام کر لیا کہ چچا جان کی روح دلائی کے اندر داخل نہ ہو سکے۔ ذرا ایک جھپکی آئی کہ تھوڑی دیر بعد جھٹکے سے آنکھ کھل گئی، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دھم سے پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار تھے، دل اچھل رہا تھا، مرزا صاحب کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی ان کی مسہری کے اوپر جھکا ہوا زور سے سانس لے رہا ہے۔ بس سمجھے کہ چچا جان مرحوم کی روح برسی کا تقاضا کرنے آئی ہے۔ مرزا صاحب نے دانت بھینچ لئے، خوف کے مارے اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔

خدا معلوم اس کش مکش کا انجام کب اور کیا ہوتا لیکن اتنے میں ایک شامت کا مارا بھونرا کہیں سے کمرے کے اندر داخل ہو گیا اور لگا بھنبھنانے۔ مرزا صاحب نے اب تک عنان صبر ہاتھ سے نہ دی تھی لیکن جب وہ اپنی عادت کے موافق سیدھا ان کے لیمپ کی چمنی پر گرا اور جھن سے آواز آئی تو مرزا صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ سمجھے کہ ہو نہ ہو تصویر کا شیشہ ٹوٹ کر گرا ہے اور اب کوئی دم میں روح آیا ہی چاہتی ہے، انھوں نے ولائی کے اندر ہی سے کئی مرتبہ زور سے تالی بجائی اور بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔" آیا۔ آیا"

ذرا دیر بعد ان کے کمرے کے باہر سے آیا کی آواز سنائی دی، "حضور نے ہمیں بلایا ہے کیا حکم ہے؟"

مرزا جی کی جان میں جان آئی۔ دل ہاتھ بھر کا ہو گیا خوش ہو کر بولے "کون! آیا جی تم نے کیوں تکلیف کی غفور کو بھیج دیتیں" آیا جی تنک کر بولیں "غفور کو تو حضور نے خود رضا دی۔ بیرا بھی گھر گیا بنگلے میں کوئی بھی نہیں ہے۔ کیا حکم ہے"

مرزا صاحب رک کر بولے "حکم .... نہیں کوئی ایسا کام — ہاں مگر ذرا اندر چلی آؤ، اندھیرا ضرور ہے، کوئی ہرج کی بات نہیں ہے"

آیا جی اپنی سفید ساری پہنے کمرے کے اندر داخل ہو گئیں اور دروازے سے لگ کر حکم کی منتظر کھڑی رہیں، مرزا صاحب نے کہا "ذرا بیٹھ جاؤ آیا جی، دیکھو ہاں میں کیا کہتا تھا، بات یہ ہے کہ ...."

پھر دل ہی دل میں کہنے لگے "لاحول ولا قوۃ اب میں اس وقت اس کمبخت سے کیا کہوں کہ کس کام کے لئے بلایا ہے" لیکن کنکھیوں سے چچا جان کی تصویر کو برابر دیکھتے جاتے تھے۔ پھر ہمت کر کے بولے "ہاں آیا جی، دیکھو، صبح جب آدمی بازار جائے تو اس سے کہنا کہ وہ، دیکھو، کیا نام ہے اس کا .... سگرٹ لیتا آئے"

آیا جی نے حکم سنا۔ بولیں "اچھا حضور سگرٹ، اور کوئی کام"، مرزا صاحب نے جواب دیا "ہاں کام ہے مگر تم ذرا کی ذرا بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی ایک منٹ میں یاد کر کے بتائے دیتا ہوں

اب تو آپا جی کی خود داری کو بہت صدمہ پہنچا، صاحب لوگوں کے یہاں نوکری کر چکی تھیں۔ کئی بابا لوگ ان کے ڈوپٹے کے سایۂ عاطفت میں بڑھ کر پروان چڑھے تھے اور امروز فردا میں مجسٹریٹ بن کر کالے آدمیوں پر حکومت کرنے والے تھے۔ بپھر کر بولیں "واہ حضور واہ، آپ غریب جان کر دلگی کرتے ہیں۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ رات کو ایک بجے کوئی سگرٹ کے لئے نہیں جگاتا، ہم سب جانتے ہیں" یہ کہہ کر آپا جی فوراً گھوم کر سیدھی دروازے کے باہر یہ جا وہ جا۔

کچھ تو باتیں کرنے کی وجہ سے اور کچھ اپنی کج دلی کے احساس کی وجہ سے مرزا صاحب کو ذرا اطمینان ہو گیا تھا۔ اٹھے لیمپ بجھایا، کروٹ پھیر کر اچھی طرح سے دُلائی لپیٹ کر منہ چھپا کر لیٹ رہے۔ تھوڑی دیر تو سکون رہا۔ لیکن پھر وہی خرافات، بھوت پریت، شب برات، چچا جان کی روح وغیرہ کا خیال دماغ میں چکر لگانے لگا۔ مرزا صاحب نے کئی مرتبہ اپنے اوپر لعنت بھیجی، عربی زبان میں شیطان کو بھگایا، آخر کو تکیہ کے نیچے سے دیا سلائی نکالی۔ بغیر آنکھ کھولے پاس میز پر سے موم بتی اٹھائی اور اس طرح آنکھیں بند کئے ہوئے اسے روشن کیا۔ لیکن اس روشنی سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا، ہر کونے کوئی جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور تو اور غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چچا جان کی آنکھیں تصویر کے اندر سے حرکت کر رہی ہیں اور غضب ہوا۔

مرزا صاحب کو بے اختیار اپنی بیوی یاد آ گئیں "آج ہی انھیں بھی جانا تھا اور اس آیا کم بخت کو دیکھو، ذرا دیر بھی تو نہیں ٹھہری، میں اسے پھر بلاتا ہوں، کہہ دوں گا کہ دورہ ہو رہا ہے جلدی سے ٹھنڈے پانی میں انار کا شربت بنا لائے"

یہ تصفیہ کر کے پھر زور سے دستک دی لیکن جواب ندارد، دوبارہ اس سے بھی زور سے مسلسل کئی مرتبہ تالیاں بجائیں، پکارا، لیکن صدائے برنخاست۔ گھڑی نے گویا ان کی دستک کے جواب میں ٹن ٹن!! دو بجائے۔ آندھی کا جھونکا زور سے آیا، دیوار پر تصویر ہلی اور کھڑکھڑائی۔ مرزا صاحب مارے خوف کے بے حال ہو گئے، پسینے چھوٹ گئے، بے تحاشا پلنگ سے کود پڑے اور ننگے پاؤں دعائیں پڑھتے، اپنی کم ہمتی پر لاحول بھیجتے، لڑکھڑاتے، ہانپتے ہوئے بھاگے تو سیدھے آپا جی کے کمرے کے سامنے پہنچ کر دم

لیا۔ دروازہ دھم دھمایا۔ بھرائی ہوئی آواز میں پکارا "آپاجی۔ آپاجی کیا سوگئیں، آپاجی۔ مجھے دورہ .... طبیعت خراب .... شربت انار ...."

لیکن کوئی جواب نہ ملا، مکان میں ہُو کا عالم تھا، دور سے پہرے دار کی آواز مکانوں اور درختوں سے ٹکراتی ہوئی آرہی تھی "جاگتے رہو!"، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے عالم ارواح سے کوئی کسی کو پکار رہا ہے پھر دروازے کے باہر سے لگے منت سماجت کرنے۔ "آپاجی، دیکھو خدا کے واسطے، بھلا یہ بھی کوئی شرم اور تکلف کا موقع ہے، یہاں جان پر بنی ہوئی ہے۔ تم خدا معلوم کیا سمجھے ہوئے ہو۔ کجا تم کجا میں"

اندر سے آپاجی کی آواز آئی، آواز میں رقت اور غصہ دونوں تھے "واہ حضور واہ ہم بیگم صاحب سے کہیں گے۔ غریب عورتوں کی نیند حرام کردی ہے، اس سے پہلے ہم جن ڈاکٹر صاحب کے یہاں تھے وہ بھی آدھی رات گئے پانی مانگنے آتے تھے۔ ہم نے ان کی بیگم صاحب سے کہدیا، اور نوکری چھوڑ کر چلے آئے۔ غریبوں کی بھی آخر عزت آبرو ہوتی ہے، واہ حضور"

اب مرزا جی کو اپنی انتہائی بے چارگی کی وجہ سے واقعی طیش آگیا کہنے لگے "خدا کی مار تمھاری عزت آبرو پر، یہاں جان پر بنی ہوئی ہے، روح پرواز کرنے کو ہے"، روح کا لفظ منہ سے نکلتے ہی جھجک پڑے۔ نرمی سے کہا "ارے بھائی میں سخت بیمار ہوں"

اندر سے پھر آواز آئی "بیگم صاحب خدا رکھے بہت اچھی آدمی ہیں ہمارا رونگٹا رونگٹا دعائیں دیتا ہے۔ لو صاحب ہم ان کے لئے ان سے برے بنیں" مرزا صاحب نے پھر طیش سے کہا "اس عورت کی تو جیسے عقل سلب ہوگئی ہے۔ بالکل بیوقوفوں کی سی باتیں کررہی ہے کم بخت"

پھر سناٹا چھا گیا۔ مرزا صاحب نے مایوس ہوکر آپاجی کے دروازے سے سہارا لگا لیا، دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے، آنکھیں بند کرلیں اور کھوئے ہوئے حواسوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ اپنے کمرے میں واپس جانے کی، جہاں موم بتی کی روشنی میں چچا جان مرحوم کی آنکھیں حرکت کررہی تھیں ـــ تو ان کی ہمت پڑ ہی نہ سکتی تھی۔ پھر کرتہ پہنے، تہمد باندھے، ننگے پاؤں، آپاجی کے کمرے کے سامنے کھڑا رہنا بھی کوئی ایسا مستحسن فعل نہ تھا لیکن کریں کیا رات بھیگتی جارہی تھی، کہیں روشنی کا نام نہ تھا، ہر کونے

سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی لال لال آنکھوں والا جھانک رہا ہے۔ مرزا جی نے دروازے کی طرف منہ کر لیا، لیکن ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے ان کا کرتا پکڑ کر جھٹکا، اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، مرزا جی گلا پھاڑ کر چیخ اٹھے۔

"ارے توبہ! یا الٰہی!! آپا جی، آپا جی!!" لیکن کوئی جواب نہ ملا، آخر کو رکتے رکتے انھوں نے کمرے کا دروازہ کھولا، اور جھانک کر دیکھا۔ لالٹین کی بتی کم تھی، اس کی ہلکی روشنی آپا جی کے آبنوسی خدوخال پر پڑ رہی تھی۔ ان کی ناک کی چاندی کی کیل چمک رہی تھی اور وہ سو رہی تھیں، قریب ہی منجھلا لڑکا اپنے کھٹولے پر معصومیت کی نیند میں غافل تھا۔ مرزا جی کمرے میں داخل ہوئے، دبے پاؤں چلے اور آہستہ سے بچے کے کھٹولے پر بیٹھ گئے۔ ایک چھوڑ دو دو جانداروں کی موجودگی سے ہمت بندھی، دل کو اطمینان ہوا۔ ایسی حالت میں تو ایک آدمی کا سہارا بہت ہوتا ہے، دل میں فیصلہ کیا کہ "اس آپا کم بخت کو تو سونے دو، بندہ یہیں رت جگا کرتا ہے، کوئی دم میں سویرا ہوا چاہتا ہے، اس وقت اپنے کمرے میں چلا جاؤں گا۔" ساتھ ہی اپنی حماقت پر غصہ آیا۔ "یہ خفقان بھی بہت برا مرض ہے، بھلا ایک سمجھ دار، لکھا پڑھا شخص تین تین بچوں کا باپ اور ارواح پر یقین، لا حول ولا قوۃ" تھوڑی دیر میں اچھی طرح سے حواس بجا ہو گئے۔

⁘ ⁘ ⁘

صبح کے چھ بجے ہیں، مرزا صاحب کی بیوی اپنی بڑی بہن کے یہاں سے ابھی واپس آئی ہیں۔ بہن نے بہت روکا، لیکن انھوں نے عذر کیا کہ "آپا ان کے ناشتے کا انتظام کرنا ہو" گھر پہنچیں تو دیکھا کہ موم بتی جل رہی ہے اور مرزا صاحب کا بستر خالی ہے، سوچیں کہ آپا کو جگا کر ڈولی کا کرایہ دلوا دیں، اور "ان" کا حال بھی پوچھیں کہ کیوں نہیں آئے۔ دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہوئیں تو دیکھا کہ آپا جی تو اپنے پلنگ پر دراز ہیں، پاس ہی "منجھلے" کے کھٹولے پر سکڑے سکڑائے، مرزا جی کرتہ پہنے، تہمد باندھے پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

اس کے بعد کیا گزری ، اور مرزا صاحب کے ناشتے اور دفتر کی حاضری کا اس روز کیا حشر ہوا ، یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن ان کے ایک معتبر دوست کی زبانی ، بلاشبہ یہ شک معلوم ہوا کہ اس روز شام کے وقت مرزا جی اپنے ایک دوست کے یہاں جو حکیم بھی ہیں بیٹھے خفقان کا نسخہ لکھوا رہے تھے اور ساتھ ہی یہ کہتے جاتے تھے کہ اگر یہ مرض اچھا نہ ہوا تو سنکھیا کھا لوں گا۔

حشرِ جذبات

وہ ترا حسن کہ خود بیں و خود آرا کرنا
وہ مرا بیخودیٔ شوق میں دیکھا کرنا

دار پر چڑھ کے ترے حسن کو رسوا کرنا
خام تھا عشق میں منصور کا دعویٰ کرنا

کتنا بے سود ہے یہ خوفِ مکافاتِ عمل
عیش امروز میں اندیشۂ فردا کرنا

کہیں مٹ جائے نہ اس دہر سے تقلیدِ وفا
دل سے تم شکوہ نہ اربابِ وفا کا کرنا

اسی صورت سے ہے ممکن کہ ہو تکمیلِ حیات
خونِ دل خونِ جگر صرفِ تمنا کرنا

آؤ سن لو مری بربادیٔ دل کی روداد
مجھے منظور ہے اب شرحِ تمنا کرنا

عجب افسانۂ عبرت ہے یہ سعیٔ ناکام
مرے جذبات کا خود ہی مجھے رسوا کرنا

اللہ اللہ یہ مجبوریٔ پاسِ الفت
حشر میں بھی نہ مرا خون کا دعویٰ کرنا

ہو مبارک تمھیں اس موسمِ گل میں ثاقبؔ
دل کے ہر ذرے کو ہم وسعتِ صحرا کرنا

کوپرا اور انتخاب پارلیمنٹ

جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو اس کا پانی اچھل کر کنارے کی چٹانوں کے درمیان کے سوراخوں اور غاروں تک میں آجاتا ہے لیکن سمندر جب ساکن رہتا ہے تو یہ مقامات بالکل خشک رہتے ہیں - اسی طرح جب سیاسی فضا میں طوفان اٹھتا ہے تو میرے گوشۂ عافیت تک بھی اس کے حلقے پہنچ جاتے ہیں حالانکہ ہم تو دنیا سے دور ایک غار میں اس طرح رہتے ہیں جس طرح چھوٹی مچھلیاں اور مینڈک آبادی سے دور گڑھوں میں رہتے ہیں -

کل کھانا کھاکر ہم اور ہمارے گھر کی دو لیڈیاں بڑی عافیت سے اپنے کنج تنہائی کے صحن میں بیٹھے ہوئی تھیں - ایک لیڈی کاڑھ رہی تھی اور دوسری کپڑا بن رہی تھی اور میں اپنے افکار میں غرق تھا - ہم لوگوں کو گمان بھی نہ تھا کہ ہمارے امن وسکون میں کوئی خلل پڑنے والا ہے اتنے میں ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے گھر کے سامنے سے آدمیوں کی بھیڑ چلی آرہی ہے - اس کو دیکھ کر ہماری پریشانی کی انتہا نہیں رہی کیونکہ ہمیں بھیڑ سے کیا واسطہ ہم تو دنیا سے دور ایک گوشۂ عافیت میں مسکن گزین تھے -

دروازے کو کسی نے زور سے کھٹکھٹایا - پھر دروازے پر لونڈوں نے غل مچایا - ہماری دایہ نے آکر کہا کہ مسٹر گرینوائل تشریف لائے ہیں - لونڈوں کے غل غپاڑے سے ہماری بڑی بلی اپنے مسکن سے اٹھ کر بھاگی اور دروازے پر کھڑی ہو کر غرانے لگی - نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر گرینوائل امیدوار نشست پارلیمنٹ مع اپنی جماعت (مددگاروں کی جماعت) سامنے کے دروازے سے ہمارے مکان میں داخل نہ ہو سکے اور ان کو پیچھے کے دروازے سے ہمارے کمرے میں داخل ہونا پڑا کیونکہ ہمارے مکان میں دو ہی دروازے تھے -

امیدواران انتخاب میرے خیال میں توہین اور تذلیل کی بالکل پروا نہیں کرتے - اگر ان کو مکان کے دروازے سے نہ آنے دیجئے تو کھڑکی اور دیوار پھاند کر آپ کے مکان میں داخل ہو جائیں گے -

اور آپ سے بات کئے اور وعدہ لئے بغیر ہرگز آپ کے مکان سے نہیں ٹلیں گے۔ ایک منٹ میں ہمارے مکان کا آنگن صحن اور باورچی خانہ، مختصر یہ کہ کل مکان آدمیوں سے بھر گیا۔ یہ امیدواران انتخاب کی تہذیب ہے۔

مسٹر گرینوائل ہماری طرف بڑھے اور انھوں نے مسٹر گرینوائل محبت کے ساتھ بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا! ان کے ساتھیوں میں سے جس کو جو کرسی ملی اس پر وہ بغیر ہماری اجازت کے کھینچ کر بیٹھ گئے اور مسٹر گرینوائل بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور بیٹھنے کے ساتھ ہی آپ نے اپنی تشریف آوری کی غرض سے اس خاکسار کو آگاہ فرمایا۔ آپنے ارشاد فرمایا کہ میں اس مرتبہ آپ کے حلقے سے پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے امیدوار کھڑا ہوا ہوں امید ہے کہ آپ از راہ عنایت۔ کرم و نوازش و غریب پروری اور قوم پرستی مجھے اپنا ووٹ دے کر زندگی بھر کے لئے مشکور فرمائیں گے۔ میں نے ان کے سوال کے جواب میں ان سے کہا کہ جناب والا میں ووٹر ہی نہیں اس کو سن کر وہ حیران ہو گئے اور خیریت یہ ہوئی کہ انھوں نے ہمارے اس بیان کو سچ سمجھ لیا اور اس مسئلہ پر زیادہ گفتگو نہیں کی۔

لیکن اس کے بعد بھی گفتگو ختم نہیں ہوئی بلکہ انھوں نے سلسلۂ کلام کو اور دراز کیا اور فرمایا کہ خیر اگر آپ کا ووٹ نہیں ہے تو آپ اپنے اثر سے ووٹ دلوانے کا وعدہ فرمائیں میں نے کہا کہ بھائی میرا کوئی اثر بھی اس علاقے میں نہیں کیونکہ میں دنیا سے الگ تھلگ ایک گوشہ عافیت میں اپنی زندگی کے دن کاٹتا ہوں لیکن اس بیان کو انھوں نے بالکل صحیح تسلیم نہیں کیا کیونکہ ان کے ذاتی خیال کے علاوہ مسٹر اشبر نے اسی وقت مجھے مخاطب کر کے کہا کہ آپ کا اس علاقے میں بہت اثر ہے اور چونکہ میری اس علاقے میں پارچہ فروشی کی دوکان ہے لہذا میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ اس علاقے لوگوں پر آپ کا بہت اثر ہے۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ میرا اثر بالکل نہیں اور اگر ہے تو میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کہاں ہے۔

اس کے بعد مسٹر گرینوائل نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور گفتگو ختم ہو گئی۔

مسٹر گرینوائل نے چلتے وقت بڑی شفقت سے ہمارا ہاتھ دبایا۔ انھوں نے ہماری لیڈیوں کا محبت کے ساتھ بوسہ لیا اور چلدئے جب وہ باورچیخانہ کی طرف سے گزرے تو انھوں نے ہماری دایہ کا بھی اسی محبت

کے ساتھ بوسہ لیا جس محبت کے ساتھ ہماری لیڈیوں کو چوا تھا۔

مسٹر گرینوائل مجھ کو بہت محبت کرنیوالے، ملنسار، نیک دل خلیق اور بوسہ لینے والے امیدوار معلوم ہوئے۔ وہ ابھی بالکل نوجوان ہیں، مہذب ہیں اور خوبصورت بھی ہیں۔ ان کی دونوں آنکھیں بھی بہت خوبصورت ہیں لیکن ابھی ان کی آنکھوں سے ممبر پارلیمنٹ کی متانت نہیں ظاہر ہوتی ہے۔ متانت پیدا کرنے کے لئے وہ چشمہ لگاتے ہیں جو ان کے کوٹ کے سامنے کے بٹن میں لٹکا ہوا تھا۔

جب وہ ہمارے مکان سے واپس جانے لگے تو پھر لونڈوں نے غل مچایا۔ کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔ اس بھیڑ کو دیکھ کر ہماری بلی تڑپ کر بھاگی اور یہ امیدوار صاحب ہمارے یہاں سے روانہ ہوگئے اور مجھ پر رحم کر کے ہماری جان ہم کو بخش گئے۔

ہم لوگوں نے اس جلوس بدتمیزی پر بہت دیر تک مضحکہ کیا اور اس کے بعد سابق سکون اور امن ہم لوگوں کے گوشہ عافیت کی فضا پر طاری ہوگیا۔ میں یہ سمجھ کر بہت خوش ہوا کہ میں نے امیدوار صاحب کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اس علاقے میں میرا کوئی اثر نہیں اور اگر واقعی میرا اثر بھی ہوتا تو میں ان کو ہرگز اپنے اثر سے فائدہ نہیں ہونے دیتا کیونکہ بادشاہ اور جمہور کے درمیان جو اصلاحی مسائل ملک اور پارلیمنٹ میں چھیڑے ہوئے تھے اس میں میرے خیالات جمہور کے ساتھ تھے اور امیدوار صاحب جو میرے یہاں تشریف لائے تھے وہ بادشاہ کے حامیوں میں تھے۔

بعض وقت کسی اثر اور کسی طاقت کا نہ رکھنا بھی بڑا مفید ہوتا ہے جیسا کہ اس مصیبت کے وقت میرے لئے ثابت ہوا۔ کیونکہ انسان جب اثر اور طاقت رکھتا ہے تو اس کو ایک جماعت کو خوش اور دوسری کو ناخوش کر کے دشمن بنانا ہوتا ہے۔ لہٰذا دشمنی خریدنے کے بدلے بہتر یہی ہے کہ اس شے سے محروم رہو جس سے انسان کو دشمن دنیا کے بازار میں زبردستی خریدنے پڑتے ہیں۔ میں بہت خوش ہوا کہ اس وقت نہ میرے پاس ووٹ تھا اور نہ اثر۔

تنقید و تبصرہ

افادات مہدی - یہ کتاب نامور انشا پرداز، ایم مہدی حسن مرحوم "افادی الاقتصادی" کا مجموعۂ مضامین ہے جس کو مہدی بیگم نے اُن کے انتقال کے بعد ترتیب دیا ہے۔ سرورق عمدہ ہے اگرچہ جدت سے خالی ہے۔ فہرست مضامین نے صرف دو صفحے پُر کئے ہیں اور مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے چھ صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے۔ پھر "ان کی یاد" کے عنوان سے "مہدی بیگم" نے اٹھائیس صفحوں پر مضمون نگار کے سوانح حیات تحریر کئے ہیں۔ اس کے بعد مرحوم کے مضامین شروع ہو جاتے ہیں جو صفحہ ۲۹۸ پر جاکر ختم ہوتے ہیں۔ آخر میں "اُردو کے ایک نامور ادیب کی وفات" کے تحت میں مولوی عبدالماجد صاحب موصوف کا مضمون درج ہے جو روزنامۂ ہمدم لکھنؤ سے منقول ہے، بعد ازاں قطعات تاریخ رحلت اور قطعات تاریخ طبع کتاب ہذا درج ہیں اور اس طرح کتاب زیر تنقید ۳۰۸ صفحات پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپی ہے جس کی لکھائی اور چھپائی خود عمدگی کی ضامن ہے۔ کاغذ سفید اور دبیز لگایا گیا ہے۔ قیمت صرف ؏ ہے۔ دوسری بار باضافۂ مضامین جدید طبع ہوئی ہے اور دفتر دارالمصنفین اعظم گڑھ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے اپنے دیباچے میں مرحوم کی تحریر کی خوبیاں بلند آہنگی کے ساتھ اور کمزوریاں دبی آواز سے بیان کی ہیں۔ ایک جگہ یہاں تک سفارش کی ہے کہ "جب شاعر کے لئے برہنہ رقاصی کا جواز بڑے بڑے ثقات نے تسلیم کر لیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نثر کے شاعر پر انشائے عریاں حرام رہے" اگر "سودا کی ہجو گوئی" کا جواب "ولایتی کی گالیاں"[1] ہو سکتا ہے تو شاعر کی "برہنہ رقاصی کا جواز" تو ثقات ہی نے تسلیم کیا ہے، یہ نثر کی شاعری خود فطرت جائز قرار دیتی ہے جو ثقات

(۱) آبحیات میں لکھا ہے کہ ایک ولایتی نے کہ زمرۂ اہل سیف میں معزز ملازم تھا عجب تماشا کیا یعنی سودا نے (بقیہ)

پر بھی حکمراں ہے اور اس لئے جناب مہدی مرحوم جو بقول عبدالماجد صاحب نثر کے شاعر تھے "انشائے عریاں" لکھنے پر کیونکر ملزم قرار دیئے جا سکتے۔ مگر آج بیسویں صدی میں ہزل گوئی یا وہ اشعار جو اخلاقی نقطۂ نظر سے گرے ہوئے ہیں ہرگز مقبول نہیں بلکہ مردود ہیں۔ جناب مہدی مرحوم کی ثقاہت اور خودداری خود سفارش کرتی ہیں کہ اُن کا دامن "انشائے عریاں" سے پاک رہنا چاہئے تھا۔

سوگوار مہدی بیگم نے مرحوم کے جو حالاتِ زندگی لکھے ہیں ان میں ایک قسم کا درد ہے جس کی چوٹ دل پر لگتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ مرحوم کی بیوہ کی تحریر واقعی دردانگیز ہونی چاہئے تھی۔

جناب مہدی مرحوم نے ۱۸۹۰ء سے لکھنا شروع کیا اور وفات سے دو سال قبل تک یعنی ۱۹۱۹ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ مدت جو تیس سال پر حاوی ہے ظاہر کرتی ہے کہ مہدی مرحوم کو اردو زبان کے ساتھ نہایت شغف تھا اور ان کو "ادب العالیہ" اور "انشا پردازی" کا بیحد شوق تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک وہ محض "سخن فہم" تھے "سخن گو" نہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے بقول اُن کے "تنقیدات" میں داخل ہونے کے لائق ہے لیکن انھوں نے تنقید کے دائرہ سے نکل کر "تصنیف" میں قدم نہیں رکھا۔ اگر شاعری کے لحاظ سے یہ مقولہ "سخن گوئی سے سخن فہمی زیادہ مشکل ہے" تسلیم کر لیا جائے تو بے شک مہدی مرحوم نے بھی بڑا کام کیا ہے مگر ہمارے نزدیک عمارت کا تیار کرنا مشکل کام ہے اور اس کے نقائص بیان کر دینا بہت آسان ہے۔

جناب مہدی اُردو کے عمدہ انشا پرداز ہیں اور اردو کا صحیح اور اعلیٰ مذاق بھی رکھتے ہیں۔ آپ کے مضامین زیادہ تر تنقیدی ہیں اور بہ لحاظ جدت اپنی آپ نظیر ہیں۔ لیکن آپ کا دماغ عرشِ معلیٰ پر

(بقیہ) اس کی ہجو کہی اور ایک محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنی شروع کر دی۔ ولایتی بیٹھا سنا گیا۔ جب ہجو ختم ہوئی تو اٹھ کر سامنے آ بیٹھا اور اُن کی کمر پکڑ کر مسلسل و متواتر گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا۔ انھیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا حیران ہو کر کہا کہ خیر باشد! جناب آغا اقسام ایں مقالات شایانِ شان شمانیست ولایتی نے بیش قبض کر کے کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا۔ قطعہ "خ" گفتی۔ حالا ایں نثر را گوش کن۔ ہر چہ تو گفتی نظم بود۔ نظم از ما نمی آید ابنثر ادا کردیم۔ صفحہ ۱۷۱ آبحیات

ہے۔ اگر کوئی آپ پر معترض ہوتا ہے تو اس کو "دوم درجہ کی خلقت" تصور کرتے ہیں تعلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے مگر آپ کے یہاں تعلی اور غرور و تکبر میں کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ غالب نے بھی اپنے معترضین کو "سخنوران کامل" کہا تھا اور ان کو ادنیٰ درجے کی مخلوق تصور نہیں کیا تھا۔ آپ سے بھی شائستگی کی توقع کی جا سکتی تھی مگر ناکامی ہوئی۔

رسالہ الناظر میں احسن صاحب مارہروی نے رسالہ نقاد آگرہ کے ایک مضمون پر جس کو خود حضرت نے ترجمہ کیا ہے اور غالباً کچھ اس میں اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا ہے۔ اعتراضات وارد کئے ہیں، اس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں :-

"حضرت مارہروی نے "فلسفۂ حسن و عشق" کا بھی خاکہ اڑایا ہے اور اسی پر سارا زور ہے۔ ان کا علوم مشرقی و مغربی دونوں سے "امی محض" ہونا ان کی کافی سفارش تھی کہ میں ان کے مقابلے میں تضیعِ اوقات پسند نہ کرتا "

"لیکن ہندوستان اپنی مفروضہ دماغی ترقیات کے ساتھ بھی ان باریکیوں کو سمجھ نہیں سکتا" "اس ہیر پھیر میں اچھے خاصے شاعر ہو گئے کچھ اور ترقی کی تو کسی اگلے پچھلے شاعر کے خواہ مخواہ جانشین بن بیٹھے"

"حضرت مارہروی کو یہ بھی خلش ہے کہ دوپٹہ، آنچل، محرم اور چوڑیاں، صاحب فلسفہ کے اختراعات ہیں، یونانیوں میں یہ چیزیں کہاں ؟ ان کی سمجھ پر کسی کو رونا آئے تو میری خطا نہیں! لیکن میں اپنے امی دوست کو بتانا چاہتا ہوں . . . "

"افسوس یہ ہے کہ وہ اپنے چھچھورے اور ذلیل اظہار خیال اور بے باکانہ اظہار رائے سے جس کو غیر سے آپ تنقید سمجھتے ہیں، صرف اپنا جہل مرکب ثابت کر سکے"

"سچ یہ ہے کہ جن صاحبوں کی ابتدائی تربیت "چوک کے کوٹھوں" پر ہوئی ہو وہ ان نکتوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں جو فلسفۂ حسن کا مایۂ خمیر ہیں"

"حجروں کی تاریکی میں اگر آپ شریرانہ کچھ دیکھ بھی سکے تو آپ کی قاصر النظری، رازہائے سربستہ فطرت کو پھر بھی آپ کے لئے سربمہر رکھے گی"

"جناب مارہروی کی اس فریب کاری کو دیکھیے کہ جہاں عورت کی ادبیت پر آپ جامہ سے باہر ہوگئے اس کی اخلاقی اور جذباتی کیفیات سے جو فلسفے کی جان ہیں دانستہ آنکھیں پھوڑ لی ہیں"

"جہل مرکب اتنا تو ہو"

"ان کے ناقابل التفات خیالات و مقالات کی گندگی کا ایک جامع ثبوت ہے جس سے ان کے اصلی خصائل اور مذاق طبع کی پوری غمازی ہوتی ہے" "شرم شرم"

"ایڈیٹر صاحب الناظر کی روانیٔ قلم کی بھی داد دینا چاہتا ہوں۔ آپ کا تنقیدی نوٹ تمام تر جناب مارہروی کے جہل مرکب کا کورانہ تتبع ہے یا یوں سمجھیے کہ حضرت مارہروی کے دل کی سیاہی جو ان کے قلم سے ٹپکتی تھی حضرت نے اسی کو لے کر پھیلایا ہے"

"اسی میں "خادم الملک" (یہ اپنے منہ میاں مٹھو ظفر الملک کا قافیہ ہے) حضرت دلگیر کا نقاد بھی آگیا، جس کا وجود اس کے دشمنوں کی چھاتی کا پتھر ہو رہا ہے"

"لیکن مجتہدانہ ایک حرف نہیں، اندھے کی لاٹھی! جناب مارہروی کے ساتھ کبھی غار میں! کبھی دلدل میں!"

"تاہم لائق شرم غلط بیانی سے آپ نہیں چوکے اور جناب مارہروی کے ساتھ جیوڑا ٹینے آپ کی خبر لینی پڑی"

"مصری رائے ہے کہ دونوں درجے کے انتہا خیال کی بہترین داد یہ ہے کہ وہ ایک دم سے نظر انداز کیا جائے"

"لیکن ہنگ خیال؛ ورلے ورد مارہروی اور ان کے یاران طریقت کے نتائج کہ جو نک انشا پردازی ہیں، بھٹیاریوں کی "تو تو میں میں" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے"

"میں ان کی تمام مزخرفات کا استقصا نہ کر سکا"

کیا یہ الفاظ اور ذاتی حملے کسی نقاد کی تحریر کے لئے موزوں خیال کیے جا سکتے ہیں؟ ان میں سنجیدگی کا پہلو نظر انداز کیا گیا ہے؟ معترض کو گالیاں دینا اعتراض کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ لائق مضمون نگار نے دلائل کے ساتھ بھی کہیں کہیں بعض اعتراضات کی تردید کی ہے لیکن ذاتی حملوں اور الفاظ نا ملائم نے

اس کا لطف کھو دیا ہے۔ آپ نے اسی مضمون میں اپنے مخالفین کے لئے جو بعض خیالات ظاہر کئے ہیں وہ خود آپ پر بھی منطبق ہوتے معلوم ہوتے ہیں مثلاً "اپنے منہ میاں مٹھو، ظفر الملک کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ "افادی الاقتصادی" جو آپ کے نام کا جزو لاینفک ہے کیا خود ساختہ نہیں ہے؟ ظفر الملک تو غریب اڈیٹر الناظر کا تاریخی نام ہے۔ یہ "افادی الاقتصادی" تو تاریخی نام بھی نہیں ہو سکتا۔ دوسری جگہ آپ نے لکھا ہے۔ "آپ کا غیر ضروری اظہار خیال بے معنی فصاحت کا دھوکا ہے۔ جو شخص احسن، ارہروی اور ظفر الملک کو جانتا ہے وہ ہرگز یہ تسلیم نہ کرے گا کہ ان کے نتائج فکر ننگ انشا پردازی ہیں یا وہ جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ ایک جگہ آپ مخالفین کا فقرہ نقل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

"بڑی نرمی سے فرماتے ہیں "جنس لطیف کے عضو عضو کی تشریح اور اس پر سرجری کا عمل کیا گیا ہے۔" فقرہ تو اچھا ہے، لیکن دیکھئے پھر وہی بے معنی فصاحت کا دھوکا" میں دیکھتا ہوں کہ آپ بھی زیادہ تر گرم گرم فقرے لکھنے کے عادی ہیں۔ ان کے مفہوم اور حقیقت حال میں باہمی تطبیق اکثر نہیں ہوتی۔ لہٰذا شیش محل میں رہنا اور دوسروں پر پتھر پھینکنا کہاں تک مقتضائے عقل کہا جا سکتا ہے۔

"شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر" کے عنوان سے جو آپ نے مضمون لکھا ہے اس میں مولانا اسلم کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ لیکن اسلم صاحب کے متعلق جو ذاتی حملے اور رکیک الفاظ استعمال کئے ہیں ان کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ "تنقید عالیہ" کا لکھنے والا جو اپنے آپ کو اول درجے کی مخلوق سمجھتا ہے ابھی تک اس ابجد سے بھی ناواقف ہے کہ تنقید میں ذاتیات کو مطلق دخل نہ دینا چاہئے اور تنقید صرف وہیں تک محدود رہنا چاہئے جہاں تک تحریر زیر تنقید اجازت دیتی ہو۔ ذاتیات کو قطعی بھلا دینا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ "کیا لکھا ہے،" نہ یہ کہ "کس نے لکھا ہے،"

مرد باید کہ گیرد اندر گوش　　　　در نوشت است پند بر دیوار

گالیاں دینا کبھی تعریف کے لائق نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ملک کا مذاق بگڑا ہوا ہو اور لوگوں کو اس میں لطف آتا ہو کہ ایک مضمون نگار دوسرے کی تضحیک کرے اور وہ اسے برا کہے اور یہ اُسے۔

جناب مہدی رقمطراز ہیں ملک میں اچھے لکھنے والے دو چار سے زیادہ نہیں ہیں، ان میں بھی تھوڑے

ہی ایسے ہیں جو کسی موضوع پر "تنقید عالیہ" کی صلاحیت رکھتے ہوں"
"اس لئے بے محل جنبش لب سے خاموشی اچھی، آپ خیر سے گونگے ہوں تو اعتراض کی بات نہیں!
لیکن بولئے اور آدمی کی طرح نہ بولئے تو مجھے ضرور شکایت ہوگی، اس خلوص اور ہیچ کا کیا ٹھکانا ہے کہ شعرالعجم
کے جزئی عیوب بھی ریویو نگار کے خیال میں اتنے ہیں کہ اگر وہ ابھار کر دکھائے جائیں تو ایک دوسری کتاب
تیار ہو سکتی ہے"

رسالہ اردو اورنگ آباد میں شعرالعجم پر جناب محمود شیرانی کے اعتراضات دو تین نمبر میں نکل چکے
ہیں۔ اگر صرف ان کو طبع کرایا جائے تو وہ بھی ایک کتاب بن سکتے ہیں۔ مرحوم اگر زندہ ہوتے تو دیکھتے
کہ ان کے طنزیہ الفاظ "خلوص اور ہیچ" بیجا استعمال ہوئے ہیں۔

آگے چل کر مرحوم لکھتے ہیں "یہ میرا قصور نہیں! خود اُن کے دل کا کھوٹ ہے جو بگڑی ہوئی زبان
پر آہی گیا، اور جس سے ایک کافی حد تک ان کی پاک طینتی کی غمازی ہوتی ہے"

"اسلم کی یہ شیرانہ چشم پوشی ہے کہ وہ چار آنکھیں رکھ کر بھی دیکھ نہیں سکتے"

"اسلم کی غیر سعادتمندانہ اسپیچ میں سب سے زیادہ مجھے جس بات پر لطف آیا "حکمت بلقمان آموختن"
کی جدت بے محل ہے"

"جن مغربی تصنیفات کی طرف اسلم نے اشارہ کیا ہے وہ ایک ایک کر کے شبلی کے ناخنوں میں ہیں۔
اسلم نے علی گڑھ کے صدقے میں ایک آدھ کتاب کا صرف نام سن پایا"

"اسلم اگر اپنی تنگ نظری کے ساتھ . . . . ."

"جو کچھ شکایت ہے یہ ہے کہ " وہ نہیں جانتے کہ کچھ نہیں جانتے"

"خود اسلم کہہ اٹھے کہ گو لڑکا ہنگامہ فضائے وہر پر معترض ہو یا بر سائی کیڑا زمانے کے حدوث و قدم پر
رائے زنی کرے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا"

"میرے معصوم دوست نے جو کچھ خامہ فرسائی کی وہ محض تصور استعداد ہے"

"شبلی کی مسلم الثبوت فارسیت کا اعتراف نہ کرنا، مولانا حالی کے ساتھ حسن ظن کے افراط کو صرف تحسین

ناشناس ثابت کرتا ہے ،،

"اسلم اور اُن کے یارانِ طریقت کو یہ ناچ ناچنا (افعال صوفیانہ) مبارک !"

" یہ اسلم کے بھونڈے مذاق کا پھوہڑ پن ہے "

" ایک رخی تصویر جو اسلم دکھانا چاہتے ہیں وہ اُن کے لائق رحم دوم درجے کے معلومات کا نتیجہ ہے "

" اسلم نے ساری عمر میں لے دے کر حیات حافظ لکھی اور اس وقت لکھی جب شعر العجم کے اجزا متعلق علی گڑھ پریس میں ان کے پیش نظر تھے ۔ وہ تصنیف کی اہم ذمہ داریوں سے ناآشنا ہیں ورنہ یوں شبلی کے منہ نہ آتے "

" یہ چند سطریں مجھے امید ہے ایک "بے ادب" کے لئے جو مذہبی مذاق رکھتا ہو محتسب کے درّے ہیں "

" اچھا ہوتا اگر اسلم میری خاطر سے آئندہ اس فقرے کو عنوانِ زندگی بناتے "ایاز قدر خود بشناس"

مرحوم اگر زندہ ہوتے تو اُن سے دریافت کیا جا سکتا تھا کہ اگر آپ متذکرہ بالا فقرے اپنے مضمون میں نہ لکھتے تو کیا ہرج واقع ہوتا ؟ شاید یہی کہ پھر رونق دکان کہاں ؟ الغرض مولانا شبلی کی حمایت میں مرحوم کو جو کچھ لکھنا تھا بے تامل لکھتے لیکن فقرے بازی سے احتراز کرتے اور مدلل جواب دیتے تو بہتر ہوتا ۔ آپ نے اس مضمون میں صرف لفاظی سے کام لیا ہے دلائل کو مطلق جگہ نہیں دی ۔

آپ کا ایک مضمون "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" ہے اور یہ آخری مضمون ہے جو اُن کے قلم سے نکلا ۔ مجھ کو بذات خود یہ عنوان دیکھ کر تعجب ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مولانا حالی مرحوم ایسے پاک طینت تھے کہ وہ ہرگز کسی پر حملہ کرنا گوارا نہیں کر سکتے تھے ۔ مضمون پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے مضمون کا عنوان غلط قائم کیا ہے ۔ صحیح عنوان "شبلی کی معاصرانہ چشمک" ہونا چاہئے تھا کیونکہ جس قدر مثالیں لائق مضمون نگار نے پیش کی ہیں وہ سب کی سب مولانا شبلی کی معاصرانہ چشمک کی ہیں یا دوسرے اشخاص کی ہیں ۔ لیکن مولانا حالی کی کوئی مثال ایسی نہیں جو مولانا شبلی کے ساتھ ان کے ضرر انگیز برتاؤ کو یا ذاتی ہو ۔ صرف ایک مثال ہے جس پر لائق مضمون نگار کو غالباً چشمک کا دھوکا ہوا ہے یا انھیں کوئی مثال اس

کے سوا نہیں ملی اور کھینچ تان کر اسی مثال کو چشمک قرار دینا پڑا تاکہ عنوان غلط نہ ہو۔ چنانچہ حالی کے اظہار خلوص کی مثالیں دے کر جناب مہدی مرحوم خود ارشاد فرماتے ہیں۔

"آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصود اصلی یعنی "چشمک" کا اب بھی پتہ نہیں . . . . . بہر حال اظہار خلوص کی حد ہو چکی، کچھ اصل موضوع یعنی چشمک کی مثالیں لیجئے۔"

"حیات جاوید میں ایک موقع پر حالی فرماتے ہیں "اعلیٰ تعلیم کی حمایت کے جوش میں "سر سید" کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی غلطی تسلیم کرتے تھے، اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" میں اس غلطی کا جس کو سر سید ۲۰ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے ذکر کیا ہے، اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سر سید کی ایک غلطی قرار دیا ہے، اور اپنے اس دعوے پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیل جو سر سید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں"

"حالی کہتے ہیں کہ اگر مولانا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ انھوں نے خود سر سید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے، اس لئے ہم کو سر سید کے خیالات کا اصل منشا ظاہر کرنا ہے، حالی نے ایک ایک کر کے اعتراضات کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ شبلی کے اعتراضات کا زیادہ تر حصہ خود سر سید کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ "چشمک" کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت نستبی اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے اور جس میں ناقدانہ اظہار خیال کے سوا در پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے"

ہم تو خاک نہ سمجھے کہ یہ مثال "چشمک" کے تحت میں کیونکر آسکتی ہے۔ مولانا حالی نے سر سید کے بیانات کی تردید کی ہے اور وہی ان کا اصلی منشا تھا۔ خود جناب مہدی کو تسلیم ہے کہ "ناقدانہ اظہار خیال کے سوا در پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے" پھر یہاں "چشمک" کا لفظ بالکل غیر ضروری اور بے معنی ہے۔

اسی مضمون میں آپ مولوی عبدالحق صاحب کی نسبت تحریر فرماتے ہیں :۔

"مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے۔ جس طرح ناممکن ہو کہ کسی ٹکسالی (اسٹینڈرڈ) کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو، یہ بھی ناممکن ہو کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاسداری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں ...... لیکن میں اگر غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں، یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی"، یہی حال خود لائق مضمون نگار کا ہے کہ شبلی کی مدح میں اُن کا قلم کبھی نہیں رکتا۔ ہر جگہ ضرورت سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ اس آخری مضمون میں تو کسی قدر ان کے خیالات "حدود کے اندر" ہیں ورنہ دیگر مضامین میں تو جہاں کہیں مولانا شبلی کا ذکر آیا ہے، نثر کا بالکل قصیدہ مدحیہ پیش کیا گیا ہے یعنی تشبیب بھی ہے، گریز بھی اور مدح بھی۔ آپ "علامہ شبلی کا ماہوار رسالہ"، "آدھ گھنٹے علامہ شبلی کے ساتھ" اور "ملک میں تاریخ کا معلم اول یعنی شمس العلما علامہ شبلی نعمانی" یہ مضامین پڑھ جایئے۔ ناممکن ہے آپ بھی میری طرح اسی نتیجہ پر نہ پہنچیں۔ پس جناب مہدی مرحوم کو اگر "نقیب شبلی" کہا جائے تو بیجا نہیں ہے اور اگر مولانا شبلی مرحوم کے وہ الفاظ جو انھوں نے مہدی مرحوم کی نسبت ارشاد فرمائے ہیں کہ "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے، دائرہ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو، یقین کرنے کی بات نہیں" ذہن میں رکھے جائیں تو یہ مصرع موزوں ہو جاتا ہے "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"

جناب مہدی مرحوم کے مضامین میں ایک ہی خیال کو بار بار بیان کرنے کا نقص بھی پایا جاتا ہے مثلاً صفحہ ۱۰۳ پر جو عبارت ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے کہ "یورپ کو شکایت ہو کہ مسلمانوں میں متقدمین بلکہ متاخرین میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہوا"، اور صفحہ ۱۰۵ پر ان الفاظ کے ساتھ ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچتے"، ختم ہوتی ہے بعینہ یہی عبارت دوسرے مضمون میں صفحہ ۲۲۵ سے شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۲۲۶ پر ختم ہو جاتی ہے۔ قریب قریب وہی خاص الفاظ ہر مضمون میں پائے جاتے ہیں۔ اور بعض فقرے تو ایسے اُن کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں کہ اُن کو مرحوم کا تکیہ کلام کہلا جا سکتا ہے مثلاً "گول خانہ میں چوکھٹی چیز"، "لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا اور کچھ ابرے سے اور دونوں کا جھول جھال لے کر برابر کر دیا"، وغیرہ

آپ کے یہاں زبان کی بعض غلطیاں بھی موجود ہیں مثلاً "ساری کتاب میں کہیں سے پیچیدگی نہیں (صفحہ ۳۹) کہیں سے، کی بجائے صرف کہیں ہونا چاہئے، سے بالکل زائد اور خلاف محاورہ ہے صفحہ ۹۳ پر "لٹریچر میں سب سے اعلیٰ اور انگیز کرنے کے لائق ہے"، یہاں صرف "انگیز" کا استعمال غلط ہے۔ صفحہ ۷۵ پر جہاں بالائی طور پر لکھا گیا ہے، اگر سطحی طور پر لکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ ہندوستانیوں کے لئے لفظ "دیسی" استعمال کرنا صاحبان ذیشان کی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں چنانچہ صفحہ ۷۶ پر "ہمارے دیسی رئیسوں کو دیکھیے" لکھا ہوا ہے اس سے بھی احتراز لازم تھا۔ صفحہ ۱۹ پر "ان کی طبع آزمائی کا جولانگاہ ہوگا" کی جگہ طبع آزمائی کی جولانگاہ ہوگی" ہونا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے یہاں بعض انگریزی الفاظ ہی نہیں بلکہ جملے تک تحریر میں آگئے ہیں مثلاً ٹو دی پوائنٹ اگرچہ اب مجبوری کے سوا انگریزی الفاظ کا استعمال بھی جائز نہیں سمجھا جاتا تاہم جملوں کے استعمال کی پہلے اجازت تھی اور نہ اب ہے۔ بعض جرمن الفاظ کا غلط تلفظ لکھا ہے حالانکہ آج کل اردو داں بھی ان ناموں سے بخوبی واقف ہیں اور ان کا صحیح تلفظ جانتا ہے گوئیتھہ (صفحہ ۶۴) کی جگہ مشہور جرمن شاعر گوئٹے لکھنا چاہئے۔ افادات وان کریمر (صفحہ ۱۳۶) کی جگہ افادات فان کریمر ہونا چاہئے۔ ایک جگہ (صفحہ ۷۱) کریم آف دی سوسائٹی لکھا ہے مارشل اسپرٹ (صفحہ ۷۷)۔ ریٹائرڈ لسٹ (صفحہ ۸۰)۔ ٹرکش لائف (صفحہ) لٹریری ڈائری (صفحہ ۱۰۱)۔ ان سب انگریزی الفاظ کی بجائے اردو میں الفاظ موجود ہیں یا گھڑے جا سکتے تھے۔

محاورات کی تحریف کسی طرح جائز نہیں ہے۔ آپ کے یہاں صفحہ ۸۸ پر تحریر ہے "لیکن یہ کھینچا تانی صرف ایک طرح کی من سمجھوتی ہے"، "سمجھوتی" کیا بلا ہے۔ سمجھوتہ کا مونث۔ خوب! اصل محاورہ قائم رہنا چاہئے تھا یعنی ایک طرح کا من سمجھوتہ ہے۔

صفحہ ۱۹۶ پر لکھا ہے "لیکن اگر وہ گھر کی مرغی کو ساگ کے برابر" نہ سمجھے۔ یہ کوئی ضرب المثل نہیں بلکہ اصل "گھر کی مرغی دال برابر" ہے آپ نے ضرب المثل میں بھی تحریف فرمادی جو کسی طرح جائز نہیں۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے آپ کی انشا پردازی سے اپنے دیباچہ میں چند اقتباسات

کئے ہیں۔ دیگر اقتباسات سے مجھے کوئی تعرض نہیں لیکن پہلا اقتباس کم از کم مجھکو پسند نہیں جناب مہدی نے ہماری اردو زبان کو نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری اور فاحشہ عورت سے مثال دی ہے جو کبھی کسی کے تصرف میں ہو اور کبھی کسی کے تصرف میں۔ اور آخر کار اس کو اپنے ممدوح شبلی کی کنیز بنا دیا ہے۔ بلکہ اسی تعلق کا ایک ثمر بیش رس "الندوہ" کو قرار دیا ہے۔ اگر کارٹون کے طور پر آپ کی اس انشا پردازی کا خاکہ کھینچا جائے تو یقیناً نفرت انگیز ہوگا کہ بوڑھے شبلی نوجوان کنیز کو بغل میں لئے ہوئے ہیں اور اُن کے اس تعلق سے ایک بچہ "الندوہ" پیدا ہو رہا ہو۔ آخر اس مثال سے اور کیا تصور پیش نظر ہو سکتا ہو؟

افسوس اور صد افسوس کہ اُردو زبان کی تمثیل کے لئے بھی ہمارے انشا پرداز کو نہایت قبیح مثال ملی۔ اس سے بڑھ کر افسوس یہ ہو کہ عبدالماجد صاحب نے اس کا اقتباس کیا اور لطف یہ کہ موصوف آخر میں دریافت کرتے ہیں کہ اگر یہ عبارتیں حسن انشا کا بہترین نمونہ نہیں تو مجھے نہیں معلوم انشا پردازی کا اطلاق کس شے پر ہوگا؟ پرستاران شبلی کو کم از کم "نادان دوست" نہ ہونا چاہئے۔ مولانا شبلی مرحوم کی مدح سرائی اور الفاظ میں بھی ہو سکتی تھی اور اس سے زیادہ دلکش پیرایہ، زوردار الفاظ کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا تھا۔

لیکن جہاں ہم نے جناب مہدی مرحوم کے نقائص بیان کئے ہیں، ہمیں صاف صاف اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ خامیاں ایسی نہیں جو ان کے کمال انشا پردازی پر پردہ ڈال سکیں۔ دل چاہتا ہے کہ ان کی انشا پردازی میں یہ معمولی عیوب بھی نہ ہوتے۔ مگر وہ بقول مہدی بیگم "مجسم جذبات تھے" لہٰذا وہ جذبات سے مغلوب ہوکر لغزش قلم کو روک نہ سکے۔

حقیقت یہ ہو کہ مرحوم نے تیس سال کے عرصے میں بہت کم لکھا اور جو کچھ لکھا وہ بھی وقتی مسائل پر لکھا۔ کاش وہ کوئی مستقل تصنیف چھوڑ جاتے جو "ادب العالیہ" میں شمار ہوتی۔ ان کا سرمایۂ حیات یہی مجموعۂ مضامین ہو جو فی الواقع ادبِ اردو میں ایک بہا بیش بہا اضافہ ہو۔ جو لوگ ادبی مذاق رکھتے ہیں ان کے لئے افاداتِ مہدی کا مطالعہ ناگزیر ہو اور کوئی اُردو کا ادبی کتب خانہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں افادات مہدی نہ ہو۔ خدا مرحوم کو جزائے خیر دے اور ان کی مغفرت کرے۔

محمد یحییٰ تنہاؔ

رسائل :-

دستکاری - یہ رسالہ زیر ادارت ڈاکٹر محمد شفیع پی ایچ۔ ڈی - بلیماران دہلی سے ماہانہ شائع ہوتا ہے
حجم کم و بیش تین جزو۔ قیمت سالانہ ۲؎ ر

ہندوستان میں دستکاری کی جس قدر ضرورت ہے اس قدر کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ رسالہ اُن دستکاریوں کو جو اس وقت دنیا میں رائج ہیں بہت آسان طریقے سے لکھ دیتا ہے جس کو اردو خواں طبقہ سمجھ سکتا ہے اور اس پر عمل بھی کر سکتا ہے۔ ایسے ہی رسائل کی ضرورت ہے جو کاروباری آدمی پیدا کر سکیں۔ کاش اس قسم کے اور بھی رسالے ہمارے ملک میں نکلتے۔

تسنیم - جدید ماہانہ رسالہ آگرہ سے ہونا شروع ہوا ہے۔ بدایوں کے مشہور شاعر شوکت علیخاں فانی کی نگرانی اور مانی جائسی اور مخمور اکبرآبادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ مقاصد ادبی۔ تاریخی اور علمی ہیں۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ حجم ساڑھے چار جزو قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔ مضامین سب کے سب اچھے ہیں خاص کر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ۔

رسالہ کی ادارت ان ہاتھوں میں ہے جو اس وقت ادب اردو کے علمبرداروں میں ہیں اس لئے ہم کو امید رکھنی چاہئے کہ یہ رسالہ اردو ادب کی اچھی خدمت کرے گا۔ کیا عجب ہے کہ شہر آگرہ قدیم دالخلافہ جو ادبی تحریک کے فقدان سے آج ملک میں گمنام ہو رہا ہے اس رسالے کی بدولت شہرت پا جائے اگر مدیران رسالہ نے توجہ سے کام کیا تو یہ امر کچھ بعید نہیں۔

چمنستان - اکثر رسائل اپنے اپنے خاص نمبر نکالتے ہیں۔ چمنستان امرت سر کا بھی سالنامہ ۱۹۳۱ء نہایت آب و تاب کے ساتھ نکلا۔ اس میں متعدد تصاویر کے علاوہ ادب عالیہ کے نظم و نثر کے اچھے نمونے فراہم کئے گئے ہیں۔ چھپائی۔ لکھائی بھی نہایت دیدہ زیب ہے۔ اس نمبر کی قیمت عہ ہے۔ ہم چمنستان کے جوشیلے نوجوان مدیر محمد افضل خاں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کوشش میں کامیابی حاصل

کی اور نہایت دلچسپ سالنامہ نکالا۔

ہندوستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ ۔ یہ سہ ماہی رسالہ صوبہ متحدہ الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈیمی کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کا پہلا نمبر ریویو کے لئے موصول ہوا ہے۔ حجم ۲۰×۲۶/۸ تقطیع پر ۱۷۰ صفحے ہے اور اچھے صاف ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔

اکیڈیمی کی طرف سے جیسے رسالہ کی ہم توقع رکھتے تھے حقیقت میں یہ رسالہ اس سے بھی بہتر نکلا ہے۔ اس کے کل مضامین عالمانہ اور محققانہ ہیں۔ اور اداریہ نہایت متانت اور معقولیت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

مجلس مدیران میں جن حضرات کے اسمار گرامی لکھے گئے ہیں ان سے امید ہوتی ہے کہ یہ رسالہ اور بھی بہتر ہوتا جائے گا۔ قیمت سالانہ آٹھ روپئے ہے۔ ((ا - ج)

شذرات

ابھی پچھلے مہینے ہم مولانا محمد علی کا ماتم کر چکے تھے کہ اس مہینے کے شروع میں ایک اور جانگداز حادثہ گذرا یعنی فخر ہندوستان پنڈت موتی لال نہرو ہمیں داغ جدائی دے گئے۔ خدا ہی جانے کہ ایسے نازک وقت میں ان رہنماؤں کو دنیا سے اٹھا لینے میں اس کی کیا مصلحت ہے۔ ہمارے لئے سوائے تسلیم و رضا کے کوئی چارہ نہیں۔

پنڈت جی وہ شخص تھے جن کے تدبر، دانشمندی خلوص اور جرأت پر ہندوستان کو ناز تھا۔ جن کی ذات سے اسمبلی کے قوم پسند ممبروں کو ہمیشہ تقویت رہتی تھی اور سرکاری ممبروں کے دل میں رعب بیٹھا رہتا تھا۔ اس شان اور دبدبے کے لوگ بھی اب مشکل سے پیدا ہوں گے۔ اس کے علاوہ پنڈت جی کا طرز معاشرت ہندو مسلم تہذیب کے امتزاج کا بہترین نمونہ تھا اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ ان دونوں فرقوں کے اتحاد کی کوشش میں گذرا۔ کاش وہ اتنے دن زندہ رہتے کہ اپنی سعی کو مشکور ہوتے دیکھ لیتے۔

ہم پنڈت جواہر لال سے اس ولدوز صدمے میں دلی ہمدردی رکھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ملک اور قوم کے لئے اپنے والد کے نعم البدل ثابت ہوں گے

خدا کا شکر ہے کہ ہماری کشتی کے ناخدا ڈاکٹر انصاری صاحب قید محن سے رہا ہو کر آ گئے مگر ابھی تک مولانا شوکت علی صاحب دہلی نہیں پہنچے ہیں اس لئے مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا۔ ہمیں امید ہے کہ مارچ کے شروع میں یہ تصفیہ ہو جائے گا کہ ملت اسلامی کو اپنا یہ اہم فرض کس صورت میں ادا کرنا چاہئے۔

ابھی تک ہم "جامعہ" کا جوہر نمبر نکالنے کا انتظام بھی نہیں کر سکے ہیں مگر امید ہے کہ مئی تک یہ کام انجام پا سکے گا۔

صحت کی تیر بہدف گولیاں

OKASA

جرمنی کی جادو اثر طبی ایجاد

کون ہے جس نے بجدیہ کی شہرہ آفاق، ہر پروفیسران درناف ادر اشتکاہ کی حیرت انگیز تدابیر جراحی کا حال نہ سنا ہو۔ صرف بعض غدودوں کے بدل دینے سے (بوڑھے سے بوڑھا آدمی تندرست جوان بن جاتا ہے) ان تدابیر پر دنیا ہنوز انگشت بدنداں تھی کہ جرمنی کے نامور ماہر طبیعات ڈاکٹر لاہوسین (ایم۔ ڈی) پروفیسر برلن یونیورسٹی نے اپنی اس دوا کے انکشاف سے ہل چل پیدا کر دی ہے۔ جو کثیر المصارف عمل جراحی کے عذاب اور خطرہ میں ڈالے بغیر از سر نو صحت کو بحال کر دیتی ہے۔

اس عظیم الشان انکشاف پر اوکاسا کمپنی (برلین) کو بین الاقوامی نمائش پیرس اور اطالوی نمائش (فلورنس) میں گرینڈ پرکس طلائی تمغے اور مشہور و معروف "کراس آف آنر" بطور سند ملی ہیں۔ اسناد کی نقلیں ہمارے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔ جھریاں اور سپید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اضمحلال چڑچڑا پن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے۔ اس سے پہلے، کہ بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے۔ یہ دوا ہر دوا فروش کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں

Sole Agency **OKASA** Co; Ltd; (Berlin)
22, Apollo Street, P.O. Box No. 396,
Bombay.

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۶	بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپیے

مثنوی مخزن الاسرار

فارسی زبان کے ادب عالیہ میں جو رتبہ شیخ نظامی کی مثنویوں کو حاصل ہوا وہ کسی دوسرے کے کلام کو نصیب نہ ہوسکا۔ زبان کی شستگی۔ بندش کی پختگی۔ خیالات کی بلندی اور شاعرانہ لطافت میں وہ جملہ ادبیات ایران سے فائق تر ہیں۔ متاخرین میں سے اکثر نے ان کی پیروی بھی کی لیکن بالعموم ناکامیاب رہے۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ ان کی مثنوی مخزن الاسرار پر ایک نگاہ ڈالیں۔

ان کی پانچ مثنویاں ہیں۔ مخزن الاسرار[1]۔ شیریں و خسرو[2]۔ لیلیٰ و مجنوں[3]۔ ہفت پیکر[4] اور سکندر نامہ[5]۔ یہی خمسہ یا پنج گنج کہلاتی ہیں۔ نظامی کے بعد سے آج تک جملہ مثنوی گو شعرا مثلاً امیر خسرو۔ مولانا جامی۔ ہاتفی اور فیضی وغیرہ نے اسی خمسہ کو پیش نظر رکھ کر جواب لکھنے یا چربہ کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔

مخزن الاسرار خمسہ نظامی کی اولین مثنوی ہے۔ انھوں نے سکندر نامے میں اپنی مثنویوں کی ترتیب کو لکھ دیا ہے

سوئے مخزن آوردم اول بسیچ — کہ سستی نکردم دراں کار ہیچ
از و چرب و شیریں برانگیختم — بہ شیرین و خسرو در آویختم
وزانجا سرا پردہ بیروں زدم — در عشق لیلےٰ و مجنوں زدم
چو از عشق مجنوں بپرداختم — سوئے ہفت پیکر فرس تاختم
کنوں بر بساطِ سخن گستری — زنم کوس اقبال اسکندری

مخزن الاسرار ۵۷۲ھ میں جب کہ نظامی کی عمر[1] ۴۰ سال کی تھی فخرالدین بہرام شاہ رومی والی

---

(۱) نظامی کی ولادت کا صحیح سن اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا ہے لیکن چونکہ انھوں نے ۶۴ سال کی عمر میں انتقال کیا ہے اور ان کا سن وفات معتبر بیانات کے مطابق ۵۹۹ھ ہے اس لئے ان کی ولادت ۵۳۵ھ میں سمجھنی چاہئے۔ سکندر نامہ بحری کے خاتمے میں وہ لکھتے ہیں۔ (ص: ۱۷)

ارزنجان کی فرمائش سے لکھی گئی تھی ۔ ہاشمی کرمانی اپنی مثنوی مظہر الآثار میں جو اس نے مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی ہے اس کی وجہ تالیف اس طرح بیان کرتا ہے ۔

دادگرے بود ہمایوں خصال　　عادل و دریا دل و صاحب کمال
شاہِ فلک مسند و انجم سپاہ　　خسرو جم کوکبہ بہرام شاہ
بسکہ نکو طبع و خردمند بود　　در طلب موعظت و پند بود
داشت وزیرے بہ قسب نامدار　　عارفِ موزوں و فضائل شعار
طرفہ شبے آں شہ روشن ضمیر　　روئے سخن داشت بسوئے وزیر
گفت چہ سازم کہ در ایامِ من　　زندۂ جاوید شود نام من
گفت وزیر از رہِ تدبیر و رائے　　کائے ہمہ گم شدگاں رہنمائے
آنکہ ازو زندہ بود نام کس　　در دو جہاں نام نکوئیست و بس
یا خلفے بعدِ تو در روزگار　　از تو و نام تو بود یادگار
شاہ ازیں نکتہ چو گل بشگفت　　برگ گل از غنچہ برآورد و گفت
آنچہ تو گفتی ہمہ سنجیدہ است　　دلکش و مطبوع و پسندیدہ است
زیں دو سخن آنچہ مرا آرزوست　　شہرت و آوازۂ نام نکوست
بوئے خلف در گل ایام نیست　　گر خلفے ہست بجز نام نیست
حمدِ خدا را کہ دریں روزگار　　شیخ نظامیست زمردان کار
بہ کہ باخلاص روم سوئے او　　دیدہ منور کنم از روئے او
چوں بسوئے پیر سخن رو کنم　　روئے سخن را بسوئے او کنم

قزوں بود سنش مہ زشصت و سہ سال　　کہ بعزم رہ بردل زد و دال

اور اسی کے بعد ان کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے ۔

کاے سخنت در ہمہ عالم سند   نظم خوشت گوہر بحر ابد
لطف کن و بہر دل چوں منے   ساز کن از گنج ہنر مخزنے
تا بود از نظم تو نامی شوم   در ہمہ آفاق گرامی شوم
بر سر پا خاست وزیر از نشاط   گفت بسلطاں ز رہ انبساط
خضر رہت ہادی توفیق باد   جلوہ گہت وادی تحقیق باد
شاہ بتجمیل و سپہ تا مدار   شد ز رہ صدق و کرامت سوار
رفت سوے شیخ ز بہر طواف   با نظر بخشش و مرآۃ صاف
بہر ہدایا بطریق جمیل   زر بہ شتر بد و جواہر بہ پیل
سادہ غلاماں کہ بحسن و جمال   یافتہ بود از ہمہ جاہا خیال
مشک سرشتان سواد جمال   مردمک دیدۂ ارباب حال
چوں بکھنو آمد و ممتاز شد   محترم زاویۂ راز شد
مکرمت شیخ دو اندازہ شد   عہد قدیم از سر نو تازہ شد
چوں سخن از ہر طرفے گفتہ شد   گرد تکلف ز میاں رفتہ شد
شاہ سخنداں سخن آغاز کرد   قصۂ پوشیدہ خود باز کرد
کرد پس از مکرمت بے قیاس   از کرم حضرت شیخ التماس
تا رقم نسخۂ مخزن کشد   گنج نہاں بر ہمہ روشن کند

---

(۱) نظامی نے سلسلۂ طریقت میں شیخ اخی فرج زنجانی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ صاحب علم تھے اور درویش اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ خوش کلام شاعر جس کی وجہ سے اطراف و دیار میں ان کی شہرت پھیل گئی تھی۔ اور ان کی غزلوں اور قصیدوں نے ان کا نام اچھال دیا تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

ملک الملوک فضلم بفضیلت معانی   زمی و زماں گرفتہ بہ مثال آسمانی

وہ گوشہ نشین تھے اور دوسرے شعرا کی طرح غلبۂ حرص و ہوا سے ملوک و امرا کے پاس نہیں جاتے تھے بلکہ سلاطین خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

شیخ مدد خواست ز فیاضِ جود　　　ملتمسِ شاہ اجابت نمود

از پئے ایں فرزدہ شہِ نامدار　　　کرد پے نقد گرامی نثار

ساخت یکے منظرِ فیروزہ فام　　　تا بکند شیخ درانجا مقام

بود مہیا ہمہ اسباب او　　　منعم و خوش دل ہمہ احباب او

با ہمہ قدر و عدم احتیاج　　　یافتے از گنجہ دو دہ خراج

چوں دلش از قیدِ جہاں سادہ شد　　　خاطرِ او از ہمہ آزادہ شد

خیمہ بروں زد ز گل و آبِ تن　　　رفت بہ معراج بیان سخن

ساخت کتابے کہ ز اوج بریں　　　نعرہ برآمد کہ ہزار آفریں

نامہ خود بر ہمہ فرخندہ ساخت　　　نام خود و نام ہمہ زندہ ساخت

نسخۂ او معدنِ امید شد　　　مخزنِ گنجینۂ جاوید شد

اسی زمانے میں حکیم سنائی نے بہرام شاہ بن مسعود شاہ غزنوی کے نام پر اپنی مثنوی حدیقہ لکھی تھی نظامی کہتے ہیں -

نامہ دو آمد ز دو ناموسگاہ　　　ہر دو مسجل بدو بہرام شاہ

آں زرے از کانِ کہن ریختہ　　　ویں درے از بحر نو انگیختہ

یعنی حدیقہ حکیم سنائی کے اشعار مثل زر کے ہیں اور پرانی زبان اور پرانے طرز میں ہیں اور مخزن کے اشعار مثل گوہر کے ہیں جو جدید بحر میں نئے طرز پر لکھی گئی ہے۔

آں بدر آورد ز غزنیں علم　　　ویں زدہ بر سکۂ رومی رقم

گرچہ دراں سکہ سخن چوں زر است　　　سکۂ نظم من ازاں بہتر است

یہ فیصلہ کوئی تعلی نہ تھی بلکہ حقیقت تھی جس کو انھوں نے بے جھجک ظاہر کر دیا۔

مخزن کے اشعار کی تعداد ۲۲ اور ۲۳ سو کے درمیان ہے۔ نظامی نے اس کو صرف چند روز میں لکھ ڈالا تھا۔ چنانچہ کہا ہے۔

انچہ دریں حجلۂ خرگاہی است　　　جلوہ گر چند سحر گاہی است

آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　ہست کلید در گنج حکیم

ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ "واللہ تحت العرش کنز مفاتحہ السنتہ الشعراء" یعنی اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے ایک خزانہ ہے جس کی کنجیاں شعراء کی زبانیں ہیں۔

صاحب مخزن الفوائد نے اس کے متعلق یہ دلچسپ قصہ لکھا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے تو عرش کے نیچے ایک مقفل مکان دیکھا۔ جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ یہ کیسا مکان ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ معانی کا خزانہ ہے جس کی کنجی آپ کی امت کے شعراء کی زبانیں ہیں۔ فرمایا کہ اس میں سے کچھ مجھے بھی ہدیہ کرو۔ جبریل نے دو شعر نکال کر پیش کئے۔ آپ اس کو اپنے دل میں رکھتے تھے۔ ایک روز حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو دربار نبوی کے شاعر تھے آپ نے ایک سادہ قرطاس عطا فرمایا اور کہا کہ اس پر ایک قصیدہ حمد و نعت میں لکھ کر جمعہ کے دن سناؤ۔ انھوں نے آپ کے دست مبارک سے وہ قرطاس لے کر جیب میں رکھ لیا۔ اور قصیدہ لکھنا بھول گئے جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ آپ نے حکم دیا کہ حسان قصیدہ سناؤ۔ اب ان کو یاد آیا۔ قصیدہ تو لکھا نہیں تھا مگر پاس ادب سے منبر پر کھڑے ہوگئے اور وہی سادہ قرطاس ہاتھ میں لے کر فی البدیہہ حمد و نعت میں اشعار پڑھنے شروع کر دئے۔ اتفاقاً وہ دونوں شعر بھی جو حضرت جبریل نے ہدیہ میں دئے تھے اور سوائے آنحضرت صلعم کے اور کسی کو ان کا علم نہ تھا اس وقت حسان کی زبان سے نکلے۔ آپ نے فرمایا کہ ان شعروں کو سوا میرے کوئی جانتا نہ تھا تم جو اس وقت تعمیل فرمان کے خیال سے فی البدیہہ قصیدہ پڑھنے لگے تو جبریل نے تمھارے دل پر القا کر دئے۔ پھر حضور نے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ "اللہم ایدہ بروح القدس"

اس شاعرانہ قصہ کو نظامی نے آغاز مثنوی میں ان اشعار میں ادا کیا ہے۔

قافیہ سنجان کہ علم بر کشند　　　گنج دو عالم بہ سخن در کشند

زآتش فکرت چو پریشاں شوند   با ملک از جملۂ خویشاں شوند

اس دلچسپ تلمیح کی وجہ سے نظامی کے بعد ان کی مثنوی کے جواب لکھنے والے شعراء نے بسم اللہ پر مصرع لگانے شروع کیے اور یہ طبع آزمائی کا میدان بن گیا۔ ہم اس جگہ چند مصرعے درج کرتے ہیں۔

امیر خسرو	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم			خطبۂ قدس است بملک قدیم
مولانا جامی	〃	〃	〃	ہست صلائے سرِ خوانِ کریم
ہاشمی کرمانی	〃	〃	〃	فاتحہ آرائے کلامِ قدیم
غزالی مشہدی	〃	〃	〃	ہست شہاب از پئے دیو رجیم
فیضی	〃	〃	〃	گنجِ ازل راست طلسمِ قدیم
عرفی	〃	〃	〃	موج نخست است ز بحرِ قدیم
شفائی	〃	〃	〃	تیغِ الٰہی ست بدستِ حکیم
ملا شیدا	〃	〃	〃	آمدہ سرچشمۂ فیضِ عمیم
زلالی	〃	〃	〃	مطلعِ دیباچۂ نظمِ قدیم
آزاد بلگرامی	〃	〃	〃	تیغِ سیہ تاب رسولِ کریم
میر الٰہی	〃	〃	〃	قافلہ سالار کلامِ حکیم
صفا	〃	〃	〃	ہست عصائے رہِ امید و بیم
وحید	〃	〃	〃	کعبۂ جان و دلِ اہلِ نعیم
تمنا	〃	〃	〃	ہست علاج از پئے قلبِ سقیم
عاصم	〃	〃	〃	خالِ رخ آرائے عروسِ قدیم
کامی	〃	〃	〃	مطلعِ انوارِ کلامِ قدیم
وحدت	〃	〃	〃	مصرعِ برجستۂ نظمِ قدیم
معنی	〃	〃	〃	حاصلِ ہر چار کتابِ قدیم

آزاد   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   آیتِ الطاف خدائے کریم

لیکن جوابات نظامی کے مصرعہ ”ہست کلید درِ گنج حکیم“ میں ہے وہ ایک میں بھی نہیں پیدا ہوئی۔

نظامی نے مثنوی کے دیباچہ کے واسطے چند چیزیں لازمی کر دی ہیں۔ توحید۔ مناجات۔ نعت
معراج۔ مدح سلطان وقت۔ تعریف سخن و سخنوراں اور سببِ تصنیف مثنوی۔ امیر خسرو نے ان
کے اوپر پیر کی مدح اور شیخ نظامی کی استادی کا اقرار بھی اضافہ کر لیا جس کی تقلید ان کے بعد کے مثنوی
نگاروں، ہاتفی اور جامی وغیرہ نے بھی کی۔

مثنوی مخزن الاسرار میں نہ حسن و عشق کی داستان ہے نہ رزم و بزم کا افسانہ اور نہ سلسلہ دار کوئی
قصہ۔ صرف مذہبی اور روحانی جذبات کو ابھارنے والے چند مضامین شاعرانہ تخیل کے قالب میں ڈھالے
گئے ہیں۔ تین خلوتیں ہیں اور بیس مقالے جن میں مختلف نصائح اور صوفیانہ باتیں ہیں۔ آخر میں خاتمہ
ہے جس پر مثنوی تمام ہو جاتی ہے۔

اس مثنوی سے ادبیات ایران کا ایک نیا باب شروع ہوا ہے۔ اس وجہ سے اس کی اہمیت
نہایت عظیم الشان ہے۔ پچاسوں جوابات لکھے جانے کے بعد بھی وہ اب تک لاجواب ہے۔ اور بعض اساتذہ
سخن نے تو اس کو شاعری کا معجزہ قرار دیا ہے جس کا مقابلہ ناممکن ہے۔

اس جگہ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مخزن اور اس کے پہلے جواب مطلع الانوار سے بعض بعض عنوانات کے
ہم مضمون اشعار بالمقابل نقل کر دیں تاکہ ناظرین اصل اور جواب دونوں کا کچھ اندازہ کر سکیں۔

نظامی نے مخزن الاسرار میں جوانی کی غفلت سے تنبیہ کی ہے۔ خسرو نے بھی اس مضمون کو سترھویں
مقالے میں لیا ہے

نظامی	خسرو
عہد جوانی بسر آمد مخسپ	راہ گذشت مخسپ اے جواں
شب شدہ اینک سحر آمد مخسپ	خیز کہ بگذشت ز پل کارواں
صبح برآمد چہ شوی مست خواب	خواب تو بسیار شب اندر گریز

کز سر دیوار گزشت آفتاب   تانت سپیده نه دمید است خبر

رفت جوانی بتماشا بسر   آه که ایام جوانی گزشت

جاستند و رنج است دریغی بخور   عمر بدانگونه که دانی گزشت

چشمهٔ مهتاب تو سردی گرفت   سینه بپرید طرب را امید

لالهٔ سیراب تو زردی گرفت   لاله کبود م شد و سبزه سفید

شیفته شد عقل و تبه گشت رائے   ماند ز رفتن قدم رہ گرائے

آبله شد دست و درم گشت پائے   تک بتنگ پائے برون شد ز پائے

غافلی از قدر جوانی که چیست   پیر شناسد که جوانی چه بود

تا نشوی پیر ندانی که چیست   تا نشوی پیر ندانی چه بود

نظامی نے ایک باغ کا بیان لکھا ہو۔ خسرو نے بھی خلوت دوم میں ان کی تقلید کی ہے۔ میں دونوں کا منظر دکھاتا ہوں۔

نظامی   خسرو

قافله زن یاسمن و گل بهم   خندهٔ گلهائے چمن روبرو

قافیه گو قمری و بلبل بهم   نغمهٔ مرغان هوا سو بسو

فاخته فریاد کنان صبح گاه   فاخته شبخانه دم از حق زده

فاخته گون کرده فلک را ز آه   گرد گریبان زهِ ازرق زده

چنگل دراج بخون تدرو   زاغ که با کبک نموده خرام

سلسله آویخته بر پائے سرو   خنده فرو خورده شگوفه به کام

چشمه درخشنده تر از چشم حور   آب ز مهتاب زمین گرد تر

بر دو سر چشمهٔ خورشید نور   چشمه ز خورشید جوان مرد تر

لالہ بہ آتش گہ راز آمدہ　　لالہ کہ شد باد دہن بوس او

چوں مغ ہندو بہ نماز آمدہ　　دیدۂ نرگس شدہ جاسوس او

خواب گہے بود سمن زار او　　رفتہ ازیں روضہ بفردوس بوے

خواب کناں نرگس بیمار او　　غالیہ نو زدہ حوراں بہ موے

خواست پریدن چمن از جابکی　　تازہ شد از ابر بہاری چمن

خواست چکیدن سمن از نازکی　　خندہ زد از بوے ریاحین سمن

اس قسم کی بہت سی مثالیں نقل کی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ بالعموم ان مضامین کو جن کو نظامی نے لکھا ہو جواب نگاروں نے بھی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ امیر خسرو یہ جانتے تھے کہ میں نظامی کا مدمقابل نہیں ہوسکتا۔ اس کا انھوں نے جابجا اپنی مثنویوں میں اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کا دعوے صرف یہ تھا کہ میں نظامی کی چربہ کشی کرسکتا ہوں اور بس۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

آں نمط آرم کہ ہمہ ناقداں　　فرق نداشند ازیں تا بداں

لیلیٰ و مجنوں میں اس کو اور واضح طور سے کہا ہو۔

زاں سکہ کہ حرف بہ ہنر داشت　　بہ زیں نتواں نمونہ برداشت

مثنوی مخزن الاسرار ایشیا اور یورپ میں مختلف مطابع میں چھپ چکی ہو۔ اس کی تین شرحیں قلمی دہلی کے کتب خانہ میں ہیں۔ ایک محمد بن رستم بن احمد بن محمود یزدی کی۔ دوسری ابراہیم تتوی کی۔ اور تیسری امان اللہ کی۔ ایک شرح مولوی ظہور الحسن کی لکھنؤ میں سنہ ۱۸۶۹ء میں چھپ چکی ہے۔

انگریزی زبان میں اس مثنوی کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک ہنڈلے نے کیا ہے جو برٹش میوزیم میں قلمی رکھا ہوا ہے۔ دوسرا بلینڈ کا ہے جو سنہ ۱۸۴۴ء میں لندن میں چھپا تھا۔

مثنوی | مثنوی کا لفظ اصل میں مثنےٰ تھا جس کے معنی ہیں دو۔ دو۔ مولوی کے قاعدے کے مطابق یائے نسبتی لگا کر مثنوی بنا لیا گیا۔ چونکہ اس کے ہر ہر شعر میں دو دو قافیے ہوتے ہیں اس لئے اس کا نام مثنوی رکھا گیا۔

اصناف شاعری میں سے قصص حکایات اور تواریخ وغیرہ کے لئے مثنوی کا شعبہ مخصوص کرلیا گیا۔ اس لئے کہ طویل واقعہ یا افسانے کو قصیدہ یا غزل کی طرح ایک ہی قافیہ کی پابندی کے ساتھ منظوم کرنا سخت مشکل ہے۔ نیز آسانی کے لئے مثنوی چھوٹی بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ بڑی بحریں مثلاً رجز۔ رمل ہزج تام وغیرہ اس میں نہیں استعمال کی جاتیں۔

عربی زبان میں مثنوی نہیں تھی۔ صرف متاخرین شعرا نے بہ تتبع عجم مثنویاں لکھی ہیں جو بالعموم غیر متداول ہیں۔

اساتذہ فن کا قول ہے کہ شاعری کی جملہ اقسام میں مثنوی گوئی زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس میں ہر شعر کے لئے وہی الفاظ لانے پڑتے ہیں جو معین معنی کے تابع ہوتے ہیں تاکہ قصہ یا مضمون کا تسلسل قائم رہے۔ بخلاف قصیدہ یا غزل کے کہ ان میں یہ پابندی نہیں ہے

فارسی زبان کا پہلا مشہور شاعر حافظ ابوالحسن رودکی ہے۔ اسی کے عہد سے جہاں قصیدہ اور غزل گوئی شروع ہوئی وہاں مثنوی کا بھی آغاز ہوا۔ اس نے امیر نصر بن احمد سامانی کے حکم سے سنہ ۳۲۰ھ میں کلیلہ ودمنہ کا قصہ عربی زبان سے لے کر فارسی میں منظوم کیا اور چالیس ہزار درم انعام پایا۔ عنصری نے یہ جمیل تذکرہ لکھا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش — عطا گرفت بنظم کلیلہ ودمنہ

رودکی سے نظامی کے زمانے تک حسب ذیل مثنویاں لکھی گئیں۔

نام مثنوی	نام مصنف	سنہ وفات ہجری
گشتاسپ نامہ	دقیقی منصور بن احمد	۰
گرشاسپ نامہ	اسدی طوسی	۴۰۹
شاہنامہ و یوسف زلیخا	فردوسی طوسی	۴۱۱
ویس ورامیں	فخرالدین اسعد گورگانی	۴۲۹
وامق وعذرا	عنصری	۴۳۱

روشنائی نامہ وسعادت نامہ	ناصر خسرو علوی	۴۳۱
توس نامہ	حکیم قطران بن منصور	۴۸۵
حدیقۃ الحقیقہ وغیرہ	حکیم سنائی غزنوی	۵۲۵
قصہ یوسف ع	عمعق بخاری	۵۴۳
وامق وعذرا	فصیحی جرجانی	

ان کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں نظامی عروضی سمرقندی اور بعض دوسرے شعرا نے لکھی تھیں۔

ان مثنویوں کا عام انداز یہ تھا کہ قصہ یا واقعہ منظوم کر دیا جاتا تھا مگر کلام کی فصاحت، شوکت، ترکیب کی چستی اور شاعرانہ لطافت اور نزاکت پیدا کرنے کا خیال کم کیا جاتا تھا۔

جب نظامی گنجوی کا زمانہ آیا تو ان کی دوربین نگاہ نے ان نقائص کو تاڑ لیا۔ انھوں نے شاعری کے تمام اصناف سے منہ موڑ کر زیادہ تر اسی شعبہ مثنوی کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ اور اس میں بہت سی اصلاحیں کیں۔

قدما کی مثنویوں میں جو نامانوس اور غیر فصیح الفاظ مستعمل تھے ان سے زبان کو پاک کیا۔ اور رائج الوقت زبان جو عربی الفاظ کے اختلاط سے نہایت لطیف ہو گئی تھی استعمال کی۔ بندشوں اور ترکیبوں میں چستی کا خیال رکھا۔ کلام کو بلند اور شاندار بنایا اور استعاروں اور تشبیہوں کے زیوروں سے اس کو آراستہ کر کے ایک نئی شکل وصورت میں جلوہ گر کیا۔ ناپسندیدہ قوافی چھوڑ دئے۔ اور نامطبوع اوزان کو خارج کر کے صرف پانچ بحریں اس کے لئے مخصوص کیں[۲]۔ مخزن الاسرار اور ہفت پیکر کی بحروں میں سب سے پہلے

---

(۱) پنج گنج کے علاوہ نظامی نے قصیدہ اور غزل کا بھی ایک دیوان چھوڑا ہے۔ دہلی میں باوجود تلاش اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ مگر ایک مدت ہوئی کہ میری نظر سے ایک مختصر مجموعہ نظامی کے قصائد اور غزلیات کا جو تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل تھا گزرا ہے۔

(۲) متاخرین نے ان پر دو وزن اور اضافہ کر کے مثنوی کے سات اوزان قرار دئے۔ امیر خسرو نے جدت پسندی سے ان پر دو وزن اور بڑھا کر ایک مثنوی نو بحروں میں لکھی اور اس کا نام نہ سپہر رکھا۔ لیکن محققین نے سات ہی اوزان باقی رہنے دئے چنانچہ مولانا جامی نے سات مثنویاں لکھ کر ان کا نام ہفت اورنگ رکھا۔

انھیں نے مثنوی لکھی۔ ان سے پیشتر کسی نے ان بحروں میں قدم نہیں رکھا تھا۔

قدما کی شاعری میں عشق مجازی تھا اور شاہد دمی کا راگ گایا جاتا تھا۔ انھوں نے ان چیزوں کو نکال کر تصوف اور فلسفے کو شامل کیا[۱]۔ اگرچہ ان سے پہلے حکیم سنائی نے حدیقہ وغیرہ کئی مثنویاں تصوف میں لکھی تھیں لیکن ان کا انداز صوفیانہ اور واعظانہ تھا۔ شاعرانہ روش پر نظامی ہی نے ان مضامین کو ڈالا۔

الغرض شیخ نظامی نے مثنوی کا نہ صرف نیا قالب تیار کیا بلکہ نئی روح بھی اس میں پھونکی۔ وہ اپنے اس کارنامہ کو کس مستانہ انداز میں مخزن الاسرار میں لکھتے ہیں۔

منکہ دریں شیوہ مصیب آمدم　　دیدم ارزد کہ غریب آمدم

شعر بمن صومعہ بنیاد شد　　شاعری از مصطبہ آزاد شد

زاہد و راہب سوئے من تاختند　　خرقہ ؤ زنار در انداختند

اپنی تجدید فن کو سراہتے ہیں کہ میں صرف اپنی ہی تیار کی ہوئی شاہراہ پر چلا ہوں۔ کسی کی تقلید نہیں کی ہے۔

عاریت کس نہ پذیرفتہ ام　　انچہ دلم گفت۔ بگو۔ گفتہ ام

شعبدۂ تازہ برانگیختم　　ہیکلے از قالب نو ریختم

صنعت من بردز جادو شکیب　　سحر من افسونِ ملائک فریب

یہی وجوہ ہیں جن سے وہ فن مثنوی کے امام تسلیم کئے گئے۔ اور کہا گیا ع

امام مثنوی گویاں نظامیست

مخزن الاسرار کے جوابات | یہ مثنوی بحر سریع مطوی موقوف "مفتعلن مفتعلن فاعلات" میں سب سے پہلی ہے جس کو نظامی نے ۵۸۲ھ میں لکھا۔ اس وقت سے امیر خسرو کے عہد تک جہاں تک ہمارا علم ہے کسی نے اس کا جواب یا اس بحر میں کوئی دوسری مثنوی فارسی زبان میں نہیں لکھی۔ ایک صدی سے زائد گزر جانے کے بعد ۶۹۸ھ میں امیر خسرو نے اس کے جواب میں اپنی مثنوی مطلع الانوار تصنیف کی خسرو نے نہ صرف

---

(۱) نظامی فن نجوم کے ماہر تھے اس لئے لازمی طور پر ان کے کلام میں جا بجا اس کا بھی اثر آگیا ہے۔

مخزن الاسرار بلکہ پورے خمسہ نظامی کا جواب لکھا۔ ان کے بعد سے مثنوی گو شعرا نے خمسہ نظامی کو اپنے پیش نظر رکھ لیا اور ان کی تقلید شروع کی۔ بعض شعرا مثلاً نویدی شیرازی نے خمسہ کے دو جواب لکھ ڈالے۔

لیکن مثنوی مخزن الاسرار خود نظامی کی مثنویوں میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے۔ صاحب ہفت اقلیم نے تو اس کو شاعری کا معجزہ قرار دیا ہے اور بعض بعض اساتذہ مثلاً ہاتفی اور ہلالی وغیرہ نے بھی جنھوں نے خمسہ نظامی کے جواب لکھے ہیں اس کا جواب ناممکن سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے جتنے جواب لکھے گئے سب اس سے فروتر رہے۔

اب تک مشہور شعرا فارس نے مخزن کے جواب میں جو مثنویاں لکھی ہیں ان کی فہرست بہ ترتیب زمانہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

نام مثنوی	مثنوی نگار	سنہ وفات ہجری
مطلع الانوار	امیر خسرو	۷۲۵
روضۃ الانوار	خواجو کرمانی	۷۵۳
مونس الابرار	خواجہ عماد فقیہ کرمانی	۷۷۳
گلشن ابرار	مولانا کاتبی نیشاپوری	۸۳۹
تحفۃ الاحرار	مولانا جامی	۸۹۹
منظر الابصار	قاضی سنجانی	۰
مظہر الآثار	امیر ہاشمی کرمانی	۹۴۸
مشہد انوار و ندرت آثار	غزالی مشہدی	۹۸۰
منظور انظار	رہائی مروزی	۹۸۳
مظہر الآثار	حکیم ابوالفتح دوائی	۰
مجمع الابکار	عرفی شیرازی	۹۹۹
زبدۃ الافکار	نکی اصفہانی	۱۰۰۰

مرصد الاسرار	ابو اسحاق گازرونی	۔
مرکز ادوار	شیخ فیضی فیاضی	۱۰۰۴
مثنوی نامی	میر محمد معصوم نامی	۔
مثنوی شانی تکلو	آقا شانی تکلو	۱۰۲۳
منبع الانہار	ملک قمی و مولانا ظہوری	۱۰۲۴
دیدۂ بیدار	حکیم شفائی اصفہانی	۱۰۳۷
حسن گلوسوز	زلالی خوانساری	۔
مظہر الانوار	ہاشمی بخاری	۔
مثنوی طاہر وحید	مرزا طاہر وحید قزوینی	۔
مخزن والہ	درویش حسین والہ ہروی	۔
مطلع الانوار	میر محمد باقر داماد اشراق	۱۰۶۴
دولت بیدار	ملا شیدا	۱۰۸۰
مشرق الانوار	مولوی عبدالرحیم دہری	۱۲۷۳

ان کے علاوہ اور مثنویاں جو اسی بحر میں لکھی گئی ہیں مثلاً جلال اسیر۔ مولانا وحشی شیخ علی حزیں یا قاآنی وغیرہ کی اگر ان سب کو ہم شمار کریں تو یہ فہرست ۷۷ تک پہنچتی ہے جن کو صاحب ہفت آسمان نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔

جوابوں پر ایک نظر مخزن الاسرار کے جواب میں جس قدر مثنویاں لکھی گئیں بالاتفاق اساتذہ کے نزدیک کوئی بھی اس کے درجہ کو نہ پہنچ سکی۔ خلد بریں میں مولانا وحشی کہتے ہیں۔

بانیِ مخزن کہ نہاد ایں اساس   پایۂ او بود بروں از قیاس
خانہ پر از گنج خدا داد داشت   عالمے از گنج خود آباد داشت
ہر کہ بہمسائگی او شتافت   غیرتِ شاہی جگرش را شگافت

لیکن عام طور پر امیر خسرو کی مطلع الانوار ان جوابوں میں سب سے بہتر تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے بعد مولانا جامی کی تحفۃ الاحرار۔ عاصم کہتا ہے۔

بود نظامی بسریر سخن　　بادشہ طرز جدید و کہن
ملک سخن ملک نظامی بود　　تشنگی از خسرو و جامی بود

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ بعض ان جوابوں کی نسبت جو بڑے بڑے استادوں کے ہیں نقادان فن کی رائیں درج کریں۔ عرفی شیرازی جو قصیدہ اور غزل کا نامور استاد ہے اس کی مثنوی مجمع الابکار کی نسبت آذر اصفہانی لکھتا ہے۔

"عرفی در باب استعارہ اصرار دارد، بحدیکہ مستمع از معنی مقصود غافل می شود۔ از انجملہ مثنوی کہ در برابر مخزن الاسرار گفتہ شاید بر بوقوف مشتبہ باشد۔ اما استاد ماہر می داند کہ بیایہ بد گفتہ"

حکیم ہمام کی رائے بھی اس مثنوی کی بابت یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

عرفی کہ در غزل استاد بود　　خانہ خراب و دہش آباد بود
مثنویش طرز فصاحت نداشت　　کان نمک بود و ملاحت نداشت

ملک قمی اور مولانا ظہوری نے جو دربار دکن سے ملک الشعرائی کا خطاب پائے ہوئے تھے۔ جب مخزن کے جواب میں منبع الانہار لکھ کر پیش کی تو ابراہیم عادل شاہ نے ایک شتر بار زر ان کو انعام دیا۔ ذہنی کاشی اس عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس سے بھی اس قسم کی مثنوی لکھنے کا اشارہ ہوا اس نے یہ رباعی لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

در مدح و ثنایت اے شہنشاہ دکن　　معذورم دار اگر نگویم مخزن
پسند کہ بہر یک شتر زر گیرم　　خون دو ہزار بیت بدور گردن

مرزا جلال اسیر خیال بندی کا موجد ہے۔ اس کی مثنوی کی بابت والہ داغستانی لکھتا ہے کہ

اکثر ابیاتش از لباس معنی عور ماندہ

مولانا زلالی خوانساری کی مثنوی حسن گلوسوز کے متعلق داغستانی کی رائے یہ ہے

" زلال افکارش اکثر درد آمیز ست "

حکیم ابوالفتح دوائی کی مثنوی مظہر الاسرار پر تنقید کرتے ہوئے محمد طاہر نصر آبادی یہ لطیف جملہ لکھتا ہے۔

" مثنوی کہ در بحر مخزن گفتہ اسرار خفیہ دراں درجست۔ چوں فقیر قابلیت فہم آں معانی ندارم اکثر نا فہمیدہ ماند "

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ زاہد نے جب مخزن کی بحر میں مثنوی لکھی تو میر مرتضیٰ علی کے پاس جو مشاہیر شعراء اکبری میں سے تھے سنانے کے لئے گیا۔ بسم اللہ کی تعریف میں یہ شعر پڑھا۔

کنگرۂ سین چو خنداں شدہ خندۂ او از بن دنداں شدہ

میر موصوف نے کہا کہ "کنگرۂ سین چیست۔ بر شعر تو در و دیوار خندہ می زند"

شیخ فیضی فیاضی نے مخزن کے جواب میں مرکز ادوار لکھی۔ اس میں اپنی عادت کے مطابق ایجاد معانی کے بڑے بڑے دعوے کئے۔ چنانچہ اپنے کو خطاب کرتے ہیں

تازہ آراستہ گرد سخن معنی نو باید و لفظ کہن

تصفیۂ باطن مرتاض کن روبروئے مبدء فیاض کن

دز دسخن راہ بجائے نبرد کز کف او بازقفائے نخورد

چند خیال دگر اندوختن کیسہ پئے نقد دگر دوختن

قطع نظر کن ز خیال دگر زانکہ پسر خواندہ نہ گردد پسر

ہر چہ خدا داد بہ آں شاد باش طالب معنی خدا داد باش

لیکن اسی مثنوی کی بابت مولانا نشانی نے جو فیضی کے ہمعصر ہیں لکھا ہے۔

چند زنی لاف کہ در ساحری سامریم سامریم سامری

دعوئے ایجاد معانی مکن شمع نہ چرب زبانی مکن

طبع تو ہر چند دم ہوش زد یک سخن تازہ نہ شد گوش زد

انچہ تو گفتی دگر آں گفتہ اند   در کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند

خانہ کہ از نظم بیاراستی   آب و گلش از دگراں خواستی

سقفِ منقش کہ دراں خانہ است   نقش وے از خامۂ بیگانہ است

طبع تو دارد روش باغباں   ساختہ باغے ز نہالِ کساں

سبزۂ آں باغ ز راغ دگر   ہر گلِ رعناش ز باغ دگر

غنچۂ آں گرچہ رواں پرورست   لیک ز خونِ جگر دیگراست

یہاں تک کہ آخر میں کہتے ہیں۔

یک سخن از نظم تو نبود درست   مضحکۂ اہل سخن نظم تست

گرچہ بروے تو نگوید کسے   عیب تو پیش تو نجوید کسے

لیک بعیبِ تو ملامت گراں   انجمن آرائے سخن پروراں

شعر ترا گر بمیاں آورند   عیب تو یک یک بزباں آورند

شعر ترا پیش تو تحسیں کنند   در پس تو لعنت و نفریں کنند

اگرچہ مولانا نشانی کی رائے میں کسی قدر معاصرانہ عداوت شامل ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ فیضی دوسروں کے مضامین عمداً اخذ کرتا ہے۔

ملا شیدا شاہجہانی عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی مثنوی دولت بیدار کی نسبت ریاض الشعرا میں لکھا ہے کہ

"اکثر اشعارش ماخوذ از دیگرانست نہ اینکہ بعنوان توارد بلکہ دریں امر عامد و مصر بود"

غزالی مشہدی کا اگرچہ یہ وتیرہ نہیں تھا لیکن بعض بعض اشعار اس کی مثنوی میں بھی ایسے ہیں جن سے یہ شبہ ہوتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے۔

نام تو و نام پدر زندہ کن   مردۂ خود را بہنر زندہ کن

از پدر مردہ مگو ہرزماں   گرنہ سگی دم مزن از استخواں

بعینہ یہی مضمون امیر خسرو کی مطلع الانوار میں موجود ہے۔

زندہ بہ مردہ مشولے ناتمام   زندہ تو کن مردۂ خود را بنام

از پدر مردہ ملاف اے جواں   گرنہ سگی چوں خوشی از استخواں

ایک تذکرہ نویس نے تو یہاں تک جرأت کی ہے کہ خسرو اور مولانا جامی کے بعض اشعار جو نظامی سے لڑ گئے ہیں یا ہم مضمون ہیں اس کی وجہ سے لکھا ہے کہ

"خانہ شعر و شاعری نظامی گنجوی تاراج کردہ مولوی جامی و امیر خسرو دہلوی ست"

اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں کی مثنویوں میں کوئی عنوان ایسا نہیں جس میں نظامی کا ایک آدہ شعر یا مصرعہ نہ آگیا ہو مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ نظامی کا کلام ان کی مزاولت میں کثرت سے رہتا تھا اور اس کی ترکیبیں اور جملے ان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ علاوہ بریں ناسخین نے بھی ان بزرگوں کے کلام کو بیجا بجا خلط ملط کر دیا ہے۔

ان سب رایوں کے پڑھنے کے بعد صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مخزن الاسرار کا میدان نہایت سنگلاخ اور دشوار گزار تھا۔ اور سوائے امیر خسرو اور مولانا جامی کے کوئی بھی نظامی کا تتبع نہیں کر سکا۔

امیر ہاشمی کرمانی نے اس بات کو اپنی مثنوی مظہر الآثار کے دیباچہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے ہم اس جگہ مختصراً اس کو درج کرتے ہیں۔

نقش کنم بر ورقِ روزگار   وصف ہنر سندیِ مردان کار

ہم نفسانِ دم روح الامیں   نکتہ سرایانِ سخن آفریں

خاصہ حکیمے کہ بسحر حلال   بست زبان ہمہ اہل کمال

---

(۱) غالباً کسی حاسد نے مولانا جامی ہی کو جب وہ حج کو جا رہے تھے ان اشعار میں مخاطب کیا ہے۔

اے دزد سخنوران نامی   غارت گر خسرو و نظامی

اکنوں کہ رہِ حرم گرفتی   می گیر از انچہ کم گرفتی

دیوان ظہیر فاریابی   در کعبہ بدزد اگر بیابی

شیخ نظامی در دریائے جود | گوہر شہوارِ محیط وجود
چہرہ کشائے صورِ معنوی | مخترع خال و خط مثنوی
نکتہ سرائے کہ بحسن کلام | ملک سخن یافت ز نظمش نظام
ساخت طلسمے بہزاراں خیال | سر بسر از صنعت شعب کمال
گشت چو آں درج لآلی تمام | کرد ورا مخزن الاسرار نام
ملکِ سخن گشت مسلم برو | کرد ثنا جملۂ عالم برو
ہر زد از خاتم و ختم الکتاب | بست بروئے ہمہ راہِ جواب

لیک درِ فیض ازل بستہ نیست | ہیچ درے بستۂ پیوستہ نیست
چوں ز قضا لائحہ نور رسید | کوکبۂ نوبت خسرو رسید
خامۂ خسرو چو گہر بار شد | نامۂ او مطلع الانوار شد
کرد دراں نامہ تکلف بسے | گفت جوابے کہ چگوید کسے
گفتۂ او در نظرِ نکتہ داں | می دہد از علمِ لدنی نشاں

چوں سخن خسرو بہ تمامی رسید | دورِ مےِ عشق بہ جامی رسید
قلزم طبعش چو گہر بار شد | نامۂ او تحفۃ الاحرار شد
ختم سخن گشت بنامش درست | گفت جوابے ہمہ شیرین و چست

بعد دو قرن از کرم ذوالمنن | عشق بمن داد کلید سخن
باہمہ محتاجی و عجز و نیاز | ساختم از بسملہ مفتاح راز
درج ہر گنج کہ بشگافتم | چون کفِ آزادہ تہی یافتم

پیشتر از مرتبۂ اہل فکر — مصطبۂ گنج سخن بود بکر
چوں درِ آں مصطبہ مفتوح شد — گنج معانی ہمہ مشروح شد
انچہ تواں گفت نظامی ربود — باقی آں خسرو و جامی ربود
از گہر و گنج دراں سرزمیں — ماند ہمیں جائے تہی بر زمیں
من بچنیں خشک زمیں کردہ جا — بستہ دلِ خویش بفضلِ خدا

اس فضلِ خدا پر بھروسہ کرنے کا یہ انجام ہوا کہ مولانا جامی کی مثنوی کے بعد کا درجہ مبصرین فن نے اس مثنوی کو دے دیا۔

الغرض فن مثنوی کا آغاز اور اس کا خاتمہ دونوں نظامی ہی کے اوپر ہوگیا اور بعد کے شعرا قطعاً ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود نظامی کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مثنوی میں کئی جگہ اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ مخزن میں کہتے ہیں۔

راہ روانے کہ دریں رہ روند — گر سخن از سرِ سخن بشنوند
پیش نظامی بحساب ایستند — او دگر است ایں دگراں کیستند
منکہ دریں منزل شاں ماندہ ام — مرحلۂ پیشترک راندہ ام
تیغ ز الماسِ زباں ساختم — ہر کہ پس آمد سرش انداختم

یعنی الماس زباں سے میں نے تیغ بیان تیز کی ہے کہ جو کوئی شیوہ سخنوری و مثنوی گوئی میں میرا تتبع کرے اس کا سر اڑا دوں۔

نظامی و خسرو | دولت شاہ لکھتا ہے کہ امیرزادہ بایسنغر خمسۂ خسروی کو خمسۂ نظامی پر ترجیح دیتا تھا اور خاقان الغ بیگ خمسۂ نظامی کا معتقد تھا۔ ان دونوں بادشاہوں میں اس اختلاف کی وجہ سے کئی بار مخالفت بھی پیدا ہوگئی۔

افسوس یہ ہے کہ دولت شاہ نے وہ وجوہات نہ لکھے جو خمسۂ خسروی کی ترجیح کو ثابت کرتے۔

خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے بعض شعرا نے محض اس ایک شعر کی وجہ سے جو خسرو

نے مطلع الانوار میں لکھا ہے -

قطرۂ آبے نہ خورد ماکیاں　　تا نہ کند رو بسوئے آسماں

خمسۂ خسروی کو خمسۂ نظامی سے بہتر قرار دیا ہے ؎

اس میں شک نہیں کہ یہ شعر توحید میں نادر ہے لیکن صرف اس ایک شعر کی وجہ سے پورے خمسہ کو ترجیح دینا عجیب بات ہے - قوسی ایرانی لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے سخن فہموں پر تعجب ہے کہ خمسۂ نظامی کے ۲۸ ہزار اشعار میں سے کہ ہر ایک عقد ثریا سے برابری کا دعویٰ رکھتا ہے اس پایہ کا ایک شعر بھی ان کو نہ مل سکا" حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون بھی خسرو کا نہیں ہے بلکہ ان سے پہلے خاقانی شروانی نے اس کو اپنے رنگ میں کئی جگہ باندھا ہے ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

مرغ کہ آبی خورد - سر سوئے آسماں برد　　گوئی اشارتیست ایں - بہر دعا شاہ راہ

برخلاف دولت شاہ کے جملہ آشنایان فن کی بالاتفاق یہ رائے ہے کہ جتنے خمسے نظامی کے جواب میں لکھے گئے کوئی بھی اس کے درجہ کا نہ ہوا - یہ مشہور ہے ۔ ع

خمسۂ او ہست ہمیں پنج گنج

خود امیر خسرو کے متعلق انھیں کے زمانہ کے ایک شاعر تبید نے کہا تھا ؎

غلط افتاد خسرو را ز خامی　　کہ سکبائیت در دیگ نظامی

ایک دوسرے شاعر نے بھی کہا ہے اور امیر کے لفظ سے امیر خسرو کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

گر دیگراں امیر بسیم و زر ند لیک　　ایں سکہ را بنام نظامی زدند و بس

مولانا جامی کے بعض معتقدوں نے ان کے خمسہ کو خسرو کے خمسہ سے بہتر قرار دیا ہے - لیکن خود جامی نے بہارستان میں لکھا ہے کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا - مگر خسرو کے خمسہ کو وہ زر خالص قرار دیتے ہیں اور نظامی کے خمسہ کو جواہر - اور ان دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے - وہ کہتے ہیں -

نظامی کہ استاد ایں فن ویست　　دریں بزمگہ شمع روشن ویست

زد برانہ گنجہ شد گنج سنج ‏ ‏ ‏ ‏ رسانید گنج سخن را بہ پنج
چو خسرو بداں پنج ہم پنجہ شد ‏ ‏ ‏ ‏ ازاں بازوئے فکرتش رنجہ شد
کفش بود زانگونہ گوہر تہی ‏ ‏ ‏ ‏ زرش ساخت لیکن زر دہ دہی
زر از سیم اگرچند برتر بود ‏ ‏ ‏ ‏ بسے کمتر از درد گوہر بود

تمام نقادانِ فن اس فیصلے کے ساتھ متفق ہیں۔

عاشقانہ مثنویاں مثلاً شیریں و خسرو یا لیلیٰ و مجنوں پھر بھی خسرو نے اچھی لکھی ہیں لیکن مطلع الانوار کو مخزن سے نسبت دینا مشکل ہے۔ استادوں کی یہی رائے ہے کہ اس میں خامی ہے خود امیر خسرو نے قران السعدین میں اپنا اور نظامی کا مقابلہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ہم مختصراً اس کو درج کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

ار ہوس مثنویت در دلست ‏ ‏ ‏ ‏ حل کنم ایں بر تو کہ بس مشکلست
در روشی کز تو نیاید مرو ‏ ‏ ‏ ‏ گفت بدم مشنو و نیکو شنو
نظم نظامی بہ لطافت چو در ‏ ‏ ‏ ‏ وز در او سر بسر آفاق پر
پختہ از و شد چو معانی تمام ‏ ‏ ‏ ‏ خام بود پختن سودائے خام
زیں دو خیالے کہ ترا کز شراست ‏ ‏ ‏ ‏ جستن آنا بہ خیال کژ است
بگزر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست ‏ ‏ ‏ ‏ ویں رہِ باریک بپائے تو نیست
تا بود ایں سکہ بہ عالم درست ‏ ‏ ‏ ‏ برتن تو کے بود ایں شقہ چست
ہر کہ دریں جنبش طبع آزمائے ‏ ‏ ‏ ‏ سر بنہی اول و آں گاہ پائے
گفتہ او را شنو و گوش باش ‏ ‏ ‏ ‏ گفتہ من بشنو و خاموش باش
سحر ورائے کہ درو دیدہ اند ‏ ‏ ‏ ‏ خامشی خویش پسندیدہ اند
مثنوی او راست ثنائے بگو ‏ ‏ ‏ ‏ بشنو و از دور دعائے بگو

ایں ہمہ ز انصاف نگر زور نیست　　　گر تو نہ بینی و گرے کور نیست

گر نہ بدے ایں نمط جاں نواز　　　بوکہ و لم را بتو بودے نیاز

لیک چو سرہا ہمہ زاں بوخوشست　　　عود تو آنجا علف آتشست

تا بود آوازۂ قمری بباغ　　　کس نہ ہد گوش بر آواز زاغ

در ہوست می نگزارد عناں　　　می کشدت دل بخیالِ جناں

کوششِ آں کن کہ دریں راہ تنگ　　　زاں گلِ تر بوے دہندت نہ رنگ

از پے بخشش بخدا آر روے　　　لیک عنایت ز بزرگاں بجوے

سوز سخن را نہ بخامی طلب　　　پختگیش ہم ز نظامی طلب

لیک اگر پند من آری بگوش　　　مصلحت آنست کہ مانی خموش

ان باتوں کے جان لینے کے بعد اب ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ انھوں نے مطلع الانوار میں جو یہ شعر لکھا ہے۔

دبدبۂ خسرویم شد بلند　　　زلزلہ در گورِ نظامی فگند

محض ایک سخن گسترانہ تعلی اور شاعرانہ شوخی ہے۔ نظامی کی تحقیر ہرگز اس سے منظور نہیں۔ حاشیہ چڑھانے والوں نے اس پر عجیب و غریب حاشیہ چڑھایا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ امیر خسرو شعرا متقدمین پر جرح کیا کرتے۔ ان کے پیر حضرت نظام الدین اولیا رح اس بات سے ان کو منع فرماتے لیکن وہ کہتے کہ جب میں آپ کے سایۂ حمایت میں ہوں تو مجھے کسی کا خوف نہیں۔ جب نظامی کی شان میں انھوں نے یہ شعر کہا تو غیب سے ایک برہنہ تلوار نکلی اور ان کی طرف بجلی کی طرح لپکی۔ اسی وقت غیب سے ایک ہاتھ پیدا ہو گیا جس نے اس تلوار کو اپنی آستین پر روک لیا۔ امیر خسرو اس واقعے سے خوف زدہ ہو کر دوڑے ہوئے اپنے پیر کے پاس گئے مگر قبل اس کے کہ کچھ کہیں پیر نے اپنی پھٹی ہوئی آستین دکھلائی۔ اسی وقت انھوں نے سر نیاز زمیں پر رکھ کر آئندہ بزرگوں کی جناب میں بے ادبی کرنے سے توبہ کی۔ اس واقعہ کو ایک شاعر نے نظم کر دیا۔

تیغ نظامی کہ برآمد چو برق　　　از سرِ خسرو سرِ مو بود فرق

ماہ رخش راست دو پیکر شدے　　　گر نہ شدے پنجۂ پیرش چو ورق

اس موقع پر خسرو کی مطلع الانوار اور ان کے مذکورہ بالا شعر کی شاعرانہ توجیہ پر راقم الحروف بھی ایک نظم لکھتا ہے۔

اسلم شیدائے طراز سخن　　　خیز و بہیں جلوۂ ناز سخن

بیں کہ چو حوریست بر آراستہ　　　جاں پئے نذر قدمش خواستہ

نور رخش بیں کہ بزیر نقاب　　　روشنیش خیرہ کند آفتاب

مطلع الانوار کہ نامش بود　　　چشمۂ خورشید بجامش بود

معنیِ او در تہ حرف سیہ　　　چوں بشبِ تار مہ چار دہ

روشنیش تنگ زوائے ولست　　　نے کہ پئے گلخن آب گلست

گلشن معنی است کہ جاں پرور است　　　نکہتِ او روح وروان پرور است

مطلع الانوار خدائیست ایں

شیوۂ اعجاز نمائیست ایں

خسرو سرمست زجام سخن　　　آنکہ بکف داشت زمام سخن

آنکہ بسر پنجگیِ کلکِ خویش　　　ملک سخن ساختہ در ملک خویش

کرد نوآئیں ہمہ ساز سخن　　　پردہ بر انداخت ز راز سخن

رسم نظامی ز سر آغاز کرد　　　مخزنِ اسرارِ سخن باز کرد

کرد بزیر قلمش پنج گنج　　　گشت باقلیم سخن گنج سنج

مہر زبر گنج نظامی شکست　　　سکہ خود را بسرش نقش بست

ملک سخن کردہ بزیر قلم　　　میزند از خسرویِ خود علم

”دبدبۂ خسرویم شد بلند

زلزلہ در گورِ نظامی فگند“

معنیش آں نیست کہ از رشک و تاب　　　سوخت نظامی چو بر آتش کباب

شد ز اعجاز دم خسروی — زندہ شدش رسم درہ مثنوی
دید چو شاگردِ عقیدت سرشت — کرد زو جدا و حرکت در بہشت
زلزلہ از ہیبت و از خوف نیست — ز انکہ بگرد حرمش طوف نیست
کس نتوانست ز اہل سخن — تا بنہد پائے دراں انجمن
نیست کسے محرم آں بارگاہ — خسرو اگر ہست دگر بادشاہ
ہر کہ نگہ کرد بسویش ز دور — خیرہ شدش دیدہ ز انبوہِ نور

بارگہ اوست بغایت بلند
زلزلہ کس می نتواند فگند

بادشہ نظم نظامیست و بس — خام بود از دگراں ایں ہوس
لیک کسانیکہ دریں تنگنائے — گام نہادند بفرہنگ و رائے
خسرو از آنجملہ دریں داوری — برد فضیلت بزباں آوری
گرچہ نہ ہم سنگِ نظامیست او — لیک بہ از فیضی و جامیست او
مطلع الانوار ز آیاتِ اوست — معجزہ گر نیست کراماتِ اوست
دیدہ ورانیکہ دریں رہ روند — جملہ بزیر علم خسرو اند
یافت ز سرا زقلم خسروی — قاعدۂ نظم نظامی نوی

بر قلمش باد ہزاراں درود
از من و از جملۂ یاراں درود

نظامی کا رتبہ تذکرہ نویسوں اور شعراء نے جس قدر نظامی کے کلام کی مدح سرائی کی ہے اتنی کسی اور کے کلام کی نہیں کی۔ شیخ آذری اسفرائنی نظامی کے متعلق لکھتے ہیں۔

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار — ز یک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں — خمار چشم ساقی نیز پیوست

مبیں یکساں کہ در اشعار ایں ہم ... ورائے شاعری چیزے دگر ہست

مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں۔

"گنجہ کے شعراء میں سے شیخ نظامی ہیں جن کے فضائل اور کمالات اس قدر روشن ہیں کہ ان کی تشریح کی حاجت نہیں جس قدر لطائف۔ دقائق اور حقائق انھوں نے پنج گنج میں درج کئے ہیں اس قدر کسی دوسرے کو میسر نہ ہوئے۔ بلکہ انسان کی قدرت سے بالاتر ہیں۔"

صاحب مراۃ الخیال نے لکھا ہے۔

"شیخ نظامی کے فضل و کمال بیان کرنے کی جو قیامت تک زبانوں پر جاری رہیں گے ان اوراق میں گنجائش کہاں! "

آذر اصفہانی کا قول ہے۔

"جو کچھ بھی میں لکھ سکوں شیخ نظامی کا رتبۂ شاعری اس سے بلند ہے۔ فقیر کے نزدیک چار ارکان سخن میں سے ایک وہ ہیں۔"

صاحب سلم السموات کہتا ہے۔

"شیخ نظامی گنجوی شہرۂ عالم اور شعراء عجم کے لئے نمونہ ہیں۔ ان کو لوگوں نے امیر خسرو پر فضیلت دی ہے اور ان کے خمسہ کو خمسۂ خسروی پر مرجح مانا ہے۔"

علی قلی خاں داغستانی قول فیصل میں لکھتا ہے۔

"شیخ نظامی شعراء زمان اور بلغائے دوران میں فائق تر ہیں۔ حق یہ ہے کہ آغاز آفرینش سے تا حال ایسا کوئی سخنور پیدا نہیں ہوا۔ وہ آدم فصاحت اور نوح بلاغت ہیں۔ گو عرب اور عجم میں بہت سے بلند مرتبہ شعراء گزرے ہیں جو ملک سخن میں صاحب تاج و علم تھے لیکن مثنوی گوئی میں شیخ نظامی سب سے فائق اور بالاتر ہیں۔"

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں۔

"شیخ نظامی استاد آفاق اور مثنوی گویوں میں بالاتفاق سب سے بڑھ کر ہیں۔"

مخزن الفوائد میں ہے۔

"اساتذہ کے نزدیک مثنوی گوئی تمام اقسام سخن میں مشکل ہے اس میں فردوسی اور نظامی کمال رکھتے تھے۔ دوسرے مثنوی گو شعرا مثلاً خسرو۔ جامی اور ہاتفی وغیرہ ان کے پیرو ہیں"

شرح الشعرا کا مصنف کہتا ہے۔

"شیخ نظامی پختہ کلامی میں بے بدل اور مثنوی گوئی میں بے مثال ہیں۔ شعرا متقدمین و متاخرین متفق ہیں کہ ایسا پختہ گو آجتک عالم ظہور میں نہیں آیا"

شیخ احمد جام ژندہ پیل مدح سرائی کرتے ہیں۔

نقشی سخن کان خرد خواجۂ نظامی — کو خیمۂ گفتار بہ بستان ارم زد
سلطان سخنداں، دُرِ سخنگوے و سخنور — کو سکہ خود را ہمہ بر ملک عجم زد

شیخ فیضی فیاضی لکھتے ہیں۔

ز سحر کاری گنجور گنجہ خیز مپرس — کہ داشت کلکش بر گنج غیب نقابی
بہ نظم او برسد نظم غیر اگر برسد — تخیل متنبی بہ نقض قرآنی

مولانا عصار شیرازی کا قطعہ ہے۔

ولیکن شیخ عیسیٰ دم نظامی — کہ بر وے ختم شد شیرین کلامی
بہ فکر بکر داد مثنوی داد — کہ ہم صاحب ہنر بود و ہم استاد
دریں صنعت سخن گر ہست آنست — دگر ہا جملہ لعب کودکانست

ہاتفی نے کہا ہے۔

توانم کرد از معجز کلامی — سخن با ہر کہ باشد جز نظامی
خدنگش را پر پیغمبری نیست — ولے دانم ز شست شاعری نیست

یہ قطعہ مشہور ہے۔

در شعر سہ کس پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی

فردوسی و انوری و سعدی　　اوصاف و قصیدہ و غزل را

معیار البلاغت کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کسی نے اس کے قائل سے کہا کہ تم نے صرف تین شاعروں کے نام لیے اور استاد نظامی کا جو بے بدل ہیں ذکر نہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو پیغمبران سخن کا ذکر کیا ہے اور نظامی تو خدائے سخن ہیں۔

صاحب شرفنامہ نے یہ رباعی کہی ہے۔

سلطان سخن بجز نظامی نبود　　مثل تخلص در گرامی نبود

پیش سخن بے تخلص عرش سخن　　از پختہ سخن بروں زنامی نبود

صاحب ہفت آسمان لکھتے ہیں۔

"نظامی کا شیوہ سخن گزاری فردوسی سے پسندیدہ تر ہے۔ بلکہ شعرا متوسطین و متاخرین نے نظامی ہی کی پیروی کی ہے نہ کہ فردوسی کی۔ انصاف یہ ہے کہ فردوسی صرف رزمیہ کلام اچھا لکھتا ہے اور اس میدان میں سوائے نظامی کے کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہیں ہے۔ لیکن عشقیہ وغیرہ میں فردوسی ہیچ ہے۔ چنانچہ اس کی یوسف زلیخا حد درجہ بے مزہ ہے۔ اس طرز میں وہ نظامی کے شاگردوں خسرو اور جامی کی بھی برابری نہیں کرسکتا۔ جمہور اہل سخن نظامی کو فردوسی پر ترجیح دیتے ہیں۔"

آشوب تورانی صاحب صولت فاروقی، فردوسی اور نظامی پر محاکمہ کرتے ہوئے فردوسی کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

نظامی بہ شعر از تو بس برتر است　　کہ شعر تو شعر است و او ساحر است

چہ سحرے بہر دین و مذہب حلال　　نہ سحرے کہ بر ساحر آرد وبال

مضامیں رنگیں عبارات ہیں　　ہاں شوخی استعارات ہیں

زیک رنگ صد نقش انگیختن　　بیک لفظ صد معنی آمیختن

بہ تعریف آں ناظم نکتہ سنج   زگفتار او شاہدم پنج گنج
غرض ہرچہ او گفت کار تو نیست   چنیں شاعری باشعار تو نیست

واقعہ یہ ہو کہ فردوسی کے استعمال کئے ہوئے ہزاروں الفاظ اور سیکڑوں محاورے بعد میں متروک ہوگئے۔ لیکن نظامی نے جس رنگ اور زبان کو اختیار کیا اس میں فرق نہ آسکا۔ یہ ان کے کمال دیدہ وری کی دلیل ہے۔ انھوں نے خود سکندر نامے میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

منم سرو پیرائے باغ سخن   بخدمت کمربستہ چوں سرو بن
سخن چوں گرفت استقامت بمن   اقامت کند تا قیامت بمن
ہمہ خوشہ چین اند و من دانہ کار   ہمہ خانہ پرداز و من خانہ دار

کیا اردو شاعری محض نقالی ہے؟

سرچارلس لائل نے "برطانوی دائرۃ المعارف" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) کے لیے "ہندوستانی ادبیات" پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ "اردو شاعری فارسی شاعری کا کامل اتباع کرتی ہے اور انھی مضمونوں کو بار بار دہراتی ہے جو ایرانی شعرا کے زیر مشق رہ کر ابتذال کی حد تک پہنچ چکے ہیں مضامین و الفاظ دونوں ابتدا سے آج تک ایک ہی طرح بندھتے چلے آتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی جدت پائی جاتی ہے اور نہ اصلیت۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے انھیں ایک عظیم الشان اور مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنی پڑی۔ کیونکہ جو بات ہزاروں شعرا پہلے کہہ چکے ہوں اسی کو پھر ادا کرنے کے لئے ایک خاص اسلوب بیان مقرر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ پس یہی اسلوب یا بہ الفاظ دیگر علم معنی و بیان اردو شاعری کا مایۂ ناز بن گیا۔"

"اردو ادبیات پر انگریزی ادبیات کے اثرات" اور "تاریخ ادبیات اردو" کے مؤلفین نے بھی سرچارلس لائل کی ہمنوائی کی ہے اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے تحقیق ناآشنا معترضین اردو شاعری کو محض تقلیدی، رسمی اور مصنوعی قرار دیتے گئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اردو شاعری میں صحیفۂ فطرت کے مشاہدہ کا کہیں پتہ نہیں۔ جدت و ندرت کا کہیں نام نہیں۔ مضامین میں تازگی و شگفتگی مفقود ہے اور کوئی نیا پیغام معدوم وجہ یہ ہے کہ اردو کے شاعروں نے جزئیات تک میں صرف فارسی شاعری کی کورانہ تقلید کی ہے۔ انھوں نے نہ کوئی اپنے جداگانہ اصول و قواعد منضبط کئے اور نہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی کی بلکہ فارسی علم عروض کو جو دراصل عربوں کی ایجاد تھا اپنا رہبر بنایا بغیر اس امر کا لحاظ کئے ہوئے کہ اردو زبان کی اصل کیا ہے اور اس میں استعداد کس قدر ہے۔ انھوں نے وہی تشبیہیں، وہی استعارے وہی مضامین۔ وہی تلمیحات، وہی خیالات، وہی جذبات اخذ کر لئے جو فارسی شاعری میں بہ کثرت پائے جاتے تھے اور جن کو ہندوستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فارسی ہی بندشیں۔ ترکیبیں اور صنعتیں بھی اردو

شاعری کی روح رواں بن گئیں۔ اگر اردو شعرا بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی سے بھی لذت اندوز ہوتے اور ملکی پیداوار سے تشبیہیں اور استعارے اخذ کرتے تو اردو شاعری میں کچھ نہ کچھ اصلیت و واقعیت ضرور پائی جاتی۔ لیکن بدیسی سرمایہ کی کثرت کی وجہ سے اردو شاعری اپنی اصلیت کو بھول گئی۔ اور وطن کی حسین سے حسین چیزوں کی قدر کرنے کا احساس بھی کھو بیٹھی۔ اردو شاعری بحالت موجودہ محض رسمی تقلیدی، مصنوعی اور لکیر کی فقیر ہے۔ اس کے مضامین اور الفاظ بھی مقرر ہیں۔ پرانے شعرا جو کچھ لکھ گئے ہیں انھیں کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس تکرار و اعادہ نے اردو شاعری کو بالکل بے لطف و بے مزہ بنا دیا ہے۔

اگرچہ یہ خیال ملک کے سطح آشنا حلقہ میں وبا کی طرح پھیل گیا ہے لیکن فی الحقیقت وہ تاریخی اتفاقات ارتقائے لسانی کے اصول اور ملک کے سیاسی و معاشرتی حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے لفظ "نقالی" پر غور کرنا چاہئے۔ "نقالی" میں ہمیشہ غیریت کا عنصر و مفہوم شامل رہتا ہے۔ نقالی کسی غیر یا بیگانہ چیز کی ہوتی ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے شخص کے عادات و خصائل کی تقلید کر سکتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی تہذیب و معاشرت کا اتباع کر سکتی ہے۔ ایک انشا پرداز دوسرے انشا پرداز کے طرز بیان کی پیروی کر سکتا ہے۔ ایک شاعر دوسرے شاعر کے رنگ و انداز کا چربہ اتار سکتا ہے۔ لیکن کسی فرد کسی قوم، کسی ادیب کسی شاعر پر خود اپنے ہی شعار یا طرز و روش کی نقالی کا الزام عاید نہیں ہو سکتا۔ ابتداءً وہی شعرا جو فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے کبھی کبھی محض تفنن طبع کی غرض سے ریختہ کے چند اشعار بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ غرض کہ اردو اور فارسی شعرا کی شخصیتیں واحد تھیں۔ دونوں قسم کی شاعریاں ایک ہی دماغ کی پیداوار تھیں اس لئے ناقل و منقول کی تفریق ہی نہ تھی۔ ایسی صورت میں نقالی کا سوال ہی بالکل لغو و مہمل معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اس کی تشریح و توضیح کے لئے اردو زبان اور اردو شاعری کی پیدائش اور اٹھان پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

ماہرین لسانیات نے دنیا کی تمام قدیم و جدید مہذب زبانوں کو تین مجموعوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول مذہبی، دوم حربی، سوم بزمی۔ مذہبی زبانوں کے حلقے میں وہ تمام السنہ داخل ہیں جن کا تعلق قدیم تہذیب

وتمدن سے ہے۔ ان کی ہیئت تمام تر مذہبی ہے۔ زمانہ قدیم میں مذہب نے زندگی کے ہر شعبہ کو بال بال جکڑ رکھا تھا۔ سیاست و معاشرت۔ صلح و جنگ۔ تجارت و زراعت۔ رسم و رواج اور شادی و غم کے معاملات میں سے کوئی شے ایسی نہ تھی جو مذہبی تصرف سے آزاد ہو۔ اس لئے زبان کی ہیئت بھی بالکل مذہبی تھی جب تک مذہبی تعلیم کا زور شور قائم رہا۔ مذہبی زبانیں عروج پر رہیں لیکن جب کسی مذہب میں کمزوری رونما ہوئی تو اس سے متعلقہ زبان بھی گمنامی میں پڑ گئی چنانچہ سریانی۔ عبرانی۔ قدیم یونانی۔ مصری۔ قدیم ایرانی زبانیں بالکل مذہبی تھیں لیکن جب قدیم مذاہب جو ان السنۂ قدیمہ کی پشت پناہ تھے مغلوب یا فنا ہو گئے تو یہ زبانیں بھی مردہ و متروک ہو گئیں۔ عربی اور سنسکرت السنہ کا شمار بھی مذہبی زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہندو مذہب ابھی تک زندہ ہے اس لئے سنسکرت زبان باوجود متروک ہونے کے بالکل معدوم و فنا نہیں ہوئی۔ اگر مذہب کو سنسکرت سے کوئی تعلق نہ ہوتا یعنی اگر ہندوؤں کی مذہبی کتابیں اس زبان میں نہ ہوتیں تو باوجود اپنے تمام علمی و فنی خزانوں کے یہ زبان کب کی فنا ہو گئی ہوتی۔ عربی زبان کی قدر و منزلت بھی بڑی حد تک اس کی مذہبی ہیئت و حیثیت کی رہین منت ہے۔ اسلام کے قرون اولیٰ میں عربی کو مذہبی و سیاسی دونوں قسموں کے اقتدار حاصل تھے۔ لیکن اب کئی صدیوں سے اس کو شاہان با جبروت کا سایۂ عاطفت نصیب نہیں ہے اور نہ اس کو کسی عظیم المرتبت کی درباری زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اگر وہ مذہب اسلام کی متبرک زبان نہ ہوتی اور اس میں وہ مقدس کلام الٰہی نازل نہ ہوتا جو دنیا کی چالیس کروڑ آبادی کے لئے مشعل ہدایت ہے تو اس زبان کی عزت و وقعت بھی کبھی کی رخصت ہو گئی ہوتی۔

دوسرا مجموعہ حربی زبانوں کا ہے جن سے زیادہ تر سیاسی ضروریات۔ ملکی انتظامات اور تجارتی و اقتصادی کاروبار انجام پاتے ہیں۔ ان زبانوں کو مذہب سے اگر کوئی لگاؤ ہے تو محض ضمنی حیثیت سے کیونکہ موجودہ زمانۂ مادیت میں قومیت کی بنیاد صرف مذہب پر قائم نہیں ہے بلکہ جن مختلف و متعدد عناصر سے قومیت تشکیل پاتی ہے ان میں سے مذہب بھی بعض حالتوں میں ایک معمولی عنصر شمار کیا جاتا ہے بعض قومیتیں ایسی بھی ہیں جن کی تشکیل میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہے۔ السنۂ حربیہ کی بنیاد روحۃ الکبریٰ

کے ہیجان عسکریت اور استیلائے بری وبحری سے پڑی تھی۔ آج کل انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی۔ روسی
اطالوی۔ ترکی اور جاپانی زبانیں السنۂ حربیہ کی بہترین مثالیں ہیں۔ شاہی زبان ہونے کی وجہ سے مذکورہ
بالا السنۂ حربیہ کا ستارۂ اقبال اوجِ کمال پر ہے۔ ان کے سرپرست موجود ہیں جو انھیں ہر طرح کے
علمی و فنی خزانوں سے مالا مال کرنے میں سرگرم کار ہیں۔ السنۂ حربیہ بالعموم اپنی سیاسی طاقت۔ حاکمانہ
اقتدار اور حربی استیلا کے باعث دوسری مفتوحہ زبانوں پر تفوق حاصل کر لیتی ہیں۔

تیسری قسم بزمی زبانوں کی ہے جب مختلف قوموں کا باہمی تصادم ہوتا ہے تو آپس میں لین دین
جاری رکھنے اور ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے میں آدھی
اپنی اور آدھی دوسروں کی زبان ملا جلا کر بولتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے باہمی کاروبار۔ آپس کا میل جول
اور معاشرتی معاملات بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان کی مخلوط زبان میں استقلال و استحکام پیدا ہوتا
ہے۔ اس قسم کی زبان کو اصطلاحاً بزمی زبان کہتے ہیں۔ اردو بھی ایک بزمی زبان ہے جو ظہور شعار
سلاطین اسلامی کے ہندوستان پر حملوں کے دوران میں حربی چل چل اور عسکری ہیجان کے نتیجے کے طور پر ظہور
پذیر ہوئی تھی۔ مدت دراز تک یہ زبان صرف آپس کے لین دین اور تجارتی کاروبار میں استعمال ہوتی رہی
اور اس کا دامن علم و ادب کے جواہر پاروں سے خالی رہا۔ یہ زبان عربی۔ فارسی۔ ترکی اور ہندوستان
کی مختلف پراکرتوں کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔ ابتدا ًاردو لشکر کے بازاروں میں بولی جاتی
تھی اسی لئے اس کا نام اردو رکھا گیا جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ اس کو علمی و ادبی زبان ہونے کا شرف
کئی صدیوں کے بعد حاصل ہوا۔

واضح رہے کہ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہندوستان میں ایک
مخلوط و مشترکہ بول چال کا خاکہ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے تیار ہونے لگا تھا جب کہ محمد قاسم
نے سندھ پر حملہ کیا تھا۔ اسی وقت سے عربی الفاظ ہندی زبانوں میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس کے
بعد دسویں صدی عیسوی میں سبکتگین نے ہندوستان پر یورش کر کے پنجاب کو اپنا باجگذار صوبہ بنا لیا۔ اس
وقت سے فارسی زبان نے بھی ہندی زبانوں پر حاکمانہ اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ بعد ازاں محمود غزنوی اور

سلطان محمد غوری کے پے درپے حملوں اور کامیابیوں نے فارسی کے عز و وقار کو اور ترقی دی۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک مستقل و مستحکم حکومت قائم کی جس کا دارالسلطنت دہلی قرار پائی۔ اب مسلمانوں نے ہندوستان میں بود و باش اختیار کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں کے ساتھ دن رات کے تعلقات نے ان کی مخلوط زبان کو خوب تقویت پہنچائی۔ رفتہ رفتہ چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس بولی نے ایک مستقل ہیئت اختیار کر لی جیسا کہ امیر خسرو کے ہندی کلام سے واضح ہے۔ غرض کہ اردو بولی کی ابتدا آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی اور تیرھویں صدی کے آخر تک اس میں ہر قسم کی کاروباری ضروریات کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ لیکن اردو شاعری کی تاریخ اس مخلوط بولی کی تاریخ سے بالکل جداگانہ ہے۔ اردو شاعری کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اور دکن کا ملک اس کا مولد و منشا قرار پایا۔ یہ شاعری گولکنڈہ اور بیجاپور کے حکمرانوں کی علم دوستی و معارف پروری کی شرمندۂ احسان ہے۔ دہلی میں دو صدیوں کے بعد یعنی اٹھارھویں صدی عیسوی میں اردو شاعری معرض وجود میں آئی۔ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں تمیز نہ کرنے کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اردو بولی مختلف قسم کی دیسی اور بدیسی زبانوں کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوئی تھی لیکن اردو شاعری براہ راست فارسی شاعری سے نکلی ہے لہٰذا اس کے عروضی اصول اور شاعرانہ خصوصیات میں ہندی عناصر کا فقدان ایک فطری امر ہے۔ اردو شاعری میں ہندی تشبیہوں۔ استعاروں یا تلمیحوں کا پیوند اسی وقت لگ سکتا تھا جب فارسی شاعری ہندی عناصر سے متاثر ہوتی۔ لیکن کئی اسباب نے فارسی شاعری پر ہندی رنگ چڑھنے نہ دیا۔

جب دو قوموں کا تصادم ہوتا ہے اور ایک قوم دوسری پر غالب آتی ہے تو بالعموم قوم مفتوحہ کے افراد فاتح قوم کے خیالات و افکار۔ وضع قطع۔ رسم و رواج۔ لباس و پوشاک اور تہذیب و معاشرت وغیرہ کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح فتحمند قوم نہ صرف حربی و سیاسی حیثیت سے بلکہ تمدنی و معاشرتی لحاظ سے بھی محکوم قوم پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی زبانوں پر بھی اثر

و تاثر کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں السنہ میں اتحاد لسانی کے لوازمات مثلاً مخارج کی ہم آہنگی۔ اسلوب بیان کی یکسانی۔ نظام ہجائی کی یک رنگی۔ ترکیب نحوی کی یکجہتی وغیرہ موجود ہوں تو مفتوحہ زبان کی ہیئت فاتح زبان کی ہیئت میں بالکل مدغم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایران پر جب عربوں کو سیاسی۔ حربی اور مذہبی برتری حاصل ہوئی تو عربی زبان بھی اپنے تمام حاکمانہ اقتدارات اور فاتحانہ اختیارات کے ساتھ اس ملک میں داخل ہوئی۔ فارسی کو ایک محکوم زبان ہونے کی حیثیت سے اپنا دامن بہت کشادہ کرنا پڑا جس میں عربی الفاظ بھرنے لگے۔ چونکہ دونوں زبانوں میں اتحاد لسانی کے لوازمات موجود تھے اس لئے ایرانی زبان پر عربی رنگ چڑھتا گیا یہاں تک کہ اس کی ہیئت لسانی عربی میں مدغم ہو گئی۔ چنانچہ فارسی زبان کے حروف تہجی۔ نظام ہجائی۔ رسم خط۔ طرز تحریر۔ اسلوب بیان۔ نحوی و عروضی اصول معنی و بیان سب کے سب عربی کے متبع بن گئے۔ اس جدید فارسی کو ساسانیوں کے زمانے کی قدیم ایرانی زبان سے کوئی تعلق نہ رہا۔ جدید فارسی ایک اسلامی زبان ہے جو عربی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بہرحال بہت عرصے کے بعد اس عربی آمیز فارسی کے عروج کا زمانہ بھی آیا اور اس نے اپنی پوری عسکری طاقت سے دوسرے السنہ کو مغلوب کرنا شروع کیا۔

اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ فاتح قوم محض اکھڑ اور وحشی ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنی جسمانی قوت کی بنا پر شائستہ و مہذب ملکوں کو فتح کر لیتی ہے لیکن آگے چل کر اسے مفتوحہ قوم کی علمی و فنی برتری کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب گاتھ کی جاہل اور وحشی قوموں نے سلطنت روما کے پرخچے اڑا دیے تو اپنی فاتحانہ حیثیت کے باوجود انھیں مفتوح رومیوں کے اعلیٰ تہذیب و تمدن سے روشنی حاصل کرنی پڑی۔ اسی طرح وحشی تاتاریوں کو بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے بعد مفتوحہ قوم کی مذہبی برتری اور علمی و ادبی تفوق کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا پڑا۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان حملہ آور گاتھی یا تاتاری قوموں کی طرح وحشی و جاہل نہ تھے بلکہ وہ نہایت اعلیٰ تہذیب و تمدن کے سرمایہ دار تھے۔ وہ ہندی اقوام پر سیاسی۔ حربی۔ علمی۔ ادبی اور تمدنی ہر قسم کی فوقیت رکھتے تھے۔ ان کی علمی ادبی اور درباری زبان فارسی تھی جس کی شستگی۔ لطافت۔ پاکیزگی۔ حلاوت اور روانی کا کوئی ہندی زبان مقابلہ

نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے ان مسلمان حملہ آوروں کا سر نیاز کسی حیثیت سے محکوم و مفتوحہ اقوام کے آگے خم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی سیاسی۔ حربی۔ علمی۔ ادبی اور تمدنی برتری کے لحاظ سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ محکوم ہندی زبان حاکم فارسی زبان میں اسی طرح پیوست ہو جائے گی جیسے قدیم ایرانی زبان فاتح عربی زبان میں مدغم ہو گئی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندی اور فارسی زبانوں میں اتحاد لسانی کے لوازمات مفقود تھے۔ دونوں میں انتہا درجے کی اجنبیت و مغائرت تھی۔ ہندی یا برج بھاشا حروف تہجی۔ نظام ہجائی ترکیب و بندش۔ خصائص نحوی۔ اصوات و مخارج۔ اسلوب بیان۔ امثال و محاورات وغیرہ کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہیئت رکھتی تھی۔ جب فارسی نے اپنے حاکمانہ اقتدار اور حربی استیلا سے ہندی کو مغلوب کرنا چاہا تو اس نے اپنی مجلسی کثرت۔ قدامت پرستانہ جذبے اور معاشری قوت سے مزاحمت پیش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی سپر انداز ہو کر فارسی میں مدغم نہ ہوئی بلکہ اس نے اپنی آزادانہ ہیئت برقرار رکھی۔

اگرچہ پراکرت زبانوں نے اپنی ہیئت قائم رکھی لیکن فاتح زبان کی حاکمانہ اثر اندازیوں سے وہ محفوظ نہ رہ سکیں۔ محکوم ہونے کی حیثیت سے انھیں مجبوراً عربی و فارسی الفاظ قبول کرنے پڑے۔ قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۶ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم کی۔ لیکن اس سے بہت قبل ہی محمد قاسم سبکتگین۔ محمود غزنوی اور محمد غوری کے کامیاب حملوں نے دیسی زبانوں کو متاثر کر دیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک مشہور ان پڑھ شاعر نرپت لال نے ۱۱۵۵ء میں نظم کی ایک کتاب "دیسل دیو راسو" لکھی تھی جس میں عربی و فارسی کے حسب ذیل الفاظ بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہیں کلا (کلاہ)۔ جرہ (ذرہ)۔ نیجا (نیزہ)۔ لواجوا (لوازمہ)۔ تاجی (تازی)۔ پائگا (پائگاہ)۔ کنگ (قسمت) باجا باجا (بعض بعض)۔ چابکو (چابک)۔ تاجنو (تازیانہ)۔ کھرسانڑ (خراسان) وغیرہ۔ اس کے بعد جب ۱۱۹۱ء میں شہاب الدین محمد غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی تو چاند کوی نے "پرتھوی راج راسا" تصنیف کی۔ مولانا آزاد نے "آبحیات" میں اس کتاب سے چند سطریں نقل کی ہیں جن میں محل پروردگار۔ پیغام۔ کریم۔ سلطان۔ بادشاہ۔ دیوان۔ خلق۔ عالم۔ حضرت۔ ملک۔ فرمان وغیرہ فارسی و عربی

الفاظ موجود ہیں۔ مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر ٹرمپ کے بیان کے مطابق کبیر داس ، انت داس اور بابا نانک بھی بارھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہندی کے زبردست شاعر گزرے ہیں لیکن ان کے کلام میں اسلامی اثرات کے بہ کثرت شواہد پائے جاتے ہیں۔ جب تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی مستقل و مستحکم اسلامی حکومت کا دارالسلطنت بنی تو مسلمان جوق جوق ہندوستان میں آکر بودوباش اختیار کرنے لگے۔ یہ نووارد مسلمان سکندر اعظم کے ساتھیوں یا موجودہ انگریزوں کی طرح ہندوستان کے باشندوں سے بالکل الگ تھلگ نہیں رہتے تھے بلکہ ان میں گھل مل کر شیر و شکر بن گئے۔ آپس کے گہرے تعلقات اور ہر وقت کے میل جول کی وجہ سے ہندوؤں کی زبان پر کثرت سے عربی و فارسی کے الفاظ چڑھتے گئے۔

علاوہ بریں تمام مسلمان فرمانروا اور خصوصاً سلاطین مغلیہ بڑے علم دوست، معارف نواز اور شعرا پرور تھے۔ انکا دربار بڑے بڑے علما فضلا حکما اور شعرا کا ماویٰ و ملجا تھا۔ ان کو اپنی قومی و درباری زبان کے علاوہ دیسی زبانوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ہندی زبان و ادب کی ترقی بھی ان کی سیاسی حکمت عملی میں داخل تھی۔ وہ ہندی شاعروں کو بھی انعام و اکرام سے مالامال کرتے تھے اور کوی راج (ملک الشعرا) کے خطاب سے انھیں سرفراز فرماتے تھے۔ انکی دیکھا دیکھی تمام امرا، شرفا، رؤسا اور حکام عالی مقام نے بھی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنے اپنے درباروں میں ہندی کے شاعر مقرر کر رکھے تھے جو اپنے سرپرستوں کی تعریف میں اشعار کہتے تھے۔ چنانچہ جو ہندی شعرا مغل دربار سے وابستہ تھے ان میں راجہ بیربل، تان سین گنگا پرشاد، سندر اور رتن پاٹھی برادران خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ شعرا اپنے سرپرستوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے مذاق و پسند کا لحاظ رکھتے تھے اور اپنے کلام میں کثرت سے ایسے الفاظ، اسالیب بیان، تشبیہات و تلمیحات اور خیالات و افکار استعمال کرتے تھے جو فارسی شاعری کی خصوصیات میں شامل تھے تاکہ ان کے سرپرست انھیں آسانی سے سمجھیں اور ان سے محظوظ ہوں۔ اس زمانے میں ہندو اور مسلمانوں میں اس قدر اتحاد و اتفاق تھا اور ایک دوسرے کے ادب و شاعری سے اتنی دلچسپی رکھتے تھے کہ بعض مسلمان شعرا نے بھی اپنے اشہب قلم کی جولانی کے لئے ہندی شاعری کا میدان انتخاب کر لیا

تھا۔ ڈاکٹر ونٹرنتس نے اپنی کتاب "ہندوستانی لٹریچر" میں مسعود۔ اکرام فیض اور قطب علی کا ذکر کیا ہے جو ہندی کے زبردست شاعر تھے اور بارھویں صدی عیسوی میں وہ ہندو راجاؤں کے دربار سے وابستہ تھے۔ لیکن سولھویں اور سترھویں صدی میں کثرت سے ہندی کے مسلمان شاعر پیدا ہوئے جن میں قاضی محمود۔ ملک محمد جائسی۔ شیخ دانیال چشتی۔ شیخ عثمان۔ طاہر۔ شیخ پیر محمد اور شیخ جنید سوہانی وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان شاعروں کے ذریعے سے ہندی شاعری فطری طور پر نہ صرف عربی و فارسی الفاظ سے بلکہ اسلامی خیالات و افکار۔ جذبات و احساسات اور مزعومات و معتقدات سے بھی روشناس ہوئی۔ بہرکیف درباری شعراء نے توقصداً و مصلحتہً اور اسلامی شعراء نے فطرۃً و اضطراراً ہندی شاعری پر فارسی رنگ چڑھایا لیکن جن ہندی شاعروں کو کسی دربار سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو اُن مذہبی تشنہ کاموں کو سیراب کرنا چاہتے تھے جن کی رسائی سنسکرت کے سرچشمے تک ممکن نہ تھی۔ ان کے کلام کا دامن بھی عربی و فارسی کے لفظوں اور فقروں سے گرانبار پایا جاتا ہے۔ یہ محض حاکم قوم کے راست اور بالواسطہ دونوں قسم کے اثر واقتدار کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کا لسانی ماحول اور ادبی فضا بالکل فارسی آمیز بن گئی تھی۔ چنانچہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے چند مذہبی شعراء شلاً کبیر داس۔ نانک۔ تلسی داس۔ سورداس اور جیپ جی کے کلام کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

کبیر داس۔

دین گنوایو دنی سے دنی نہ آیو ہاتھ	پیر کلھاڑی ماریو گاپھل اپنے ہاتھ (غافل)
پوتھی کتابیں باچتا اوروں کونت سمجھاؤ تا	کوٹھی محل کھوجے نہیں بک بک مراتو کیا ہوا
کبیر سرپر سراے ہے کیوں سوئے سکھ چین	کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین (نقارہ)

نانک

سانس ماس جیب جیو تمھارا۔ تو ہے کھرا پیارا	نانک شاعر ایوکہت ہے۔ سچے پروردگارا

تلسی داس۔

گنی گریب گرام نر ناگر	پنڈت موڑھ ملیں اجاگر (غنی غریب)

رام انیک گریب نواسجے ۔۔۔ لوک بید بربر دبر اسجے

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ ۔۔۔ تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات (غریب)

سنکٹ کاٹے سیوک سکل چلے سوامی رکھ پالے ۔۔۔ گھر ترو تڑین و باگ برڈ یرا دیو لگالے (باغ)

گھر سیوا اس بچن ہٹ بولے ۔۔۔ کتنی بھنگ کلہ بھی کھوے (کلاہ)

سورداس :-

مایا دھام دھن دھنتا ۔۔۔ باندھوں ہوں اس ساج (ساز)

سنت سبھی جانت ہوں ۔۔۔ تو نہ آیا باج (باز)

دیونہ جات پار اتر آئے ۔۔۔ چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)

کھیت بہت کاہے تم تلنے ۔۔۔ سین سنی آواج (آواز)

نہیں کرت کہت پربھو تم سوں ۔۔۔ سدا گریب نواج (غریب نواز)

جپ جی :-

وارن جاؤں ان ایک بار ۔۔۔ تو سدا سلامت جی نرنکار

جب درباری نہیں بلکہ مذہبی شاعروں کے کلام کا یہ رنگ ہو اور اس میں عربی و فارسی الفاظ کی ایسی کثرت ہو تو معلوم ہوا کہ عوام کی زبان پر کتنے فارسی کے لفظ، فقرے، محاورے اور اصطلاحیں جاری ہوں گی۔ اگرچہ اتحادِ لسانی کے لوازمات کے فقدان اور مذاق و پسند کی مغائرت و بیگانگی کے باعث ہندی زبان اپنی ہیئت کھو کر فارسی میں مدغم نہ ہوئی۔ اگرچہ اپنی مجلسی کثرت، قدامت پرستانہ جذبات کی شدت اور معاشرتی طاقت کی بنا پر ہندی نے اپنا وجود قائم رکھا تاہم ایک مفتوح و مغلوب زبان ہونے کی حیثیت سے اُسے فارسی کے حاکمانہ اقتدار کے آگے سپر انداز ہونا پڑا۔ وہ اپنے دامن میں فارسی الفاظ و اصطلاحات بھرنے اور غالب و فاتح زبان کا اندازِ بیان اور طرزِ ادا قبول کرنے پر مجبور ہوئی اور فطری اصول اسی کے متقاضی بھی تھے۔

اس کے برعکس فارسی زبان ہندی آمیزش سے بالکل پاک رہی جس کے متعدد اسباب تھے۔

مسلمان حملہ آور گاتھی یا تاتاری قوموں کی طرح جاہل اور وحشی نہ تھے کہ وہ مفتوحہ قوم کی علمی و فنی برتری کے آگے سر تسلیم خم کرتے۔ وہ نہ صرف جسمانی قوت۔ حربی مہارت اور انتظامی قابلیت کے لحاظ سے ہندی قوموں پر فوقیت رکھتے تھے بلکہ ذہنی۔ اخلاقی۔ معاشرتی۔ تمدنی علمی۔ ادبی۔ فنی غرض کہ ہر اعتبار سے ان کو مفتوحہ قوم پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔ اگرچہ نووارد مسلمان مختلف تورانی نسلوں کے تھے اور ان کی بول چال کی زبانیں بھی متفرق تھیں لیکن سب کی علمی۔ ادبی اور درباری زبان فارسی تھی۔ اس وقت تک یہ زبان نہایت شستہ، ترقی یافتہ اور پختہ بن چکی تھی۔ اس کے نحوی و صرفی اصول و ضوابط نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکے تھے۔ اس کی انشا و شاعری معراج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ ہندوستان کی کوئی زبان علمی و ادبی حیثیت سے اس کی حریف نہیں بن سکتی تھی۔ اگر کوئی دیسی زبان فارسی کی مدمقابل ہوتی بھی تو مفتوح و مغلوب ہونے کی حیثیت سے وہ اپنا دامن کشادہ کرکے فاتح کے الفاظ و اسالیب قبول کرنے پر مجبور ہوتی۔ لیکن اس وقت تمام پراکرتیں ارتقا کے ابتدائی منازل میں تھیں۔ ان میں اتنی قوت کہاں تھی کہ فارسی جیسی پختہ، شستہ، ترقی یافتہ اور حاکم زبان پر اپنا اثر ڈالتیں۔ ہندوستان کا سارا علمی خزانہ سنسکرت کی تجوری میں مقفل تھا جس کے واحد کلید بردار برہمن پنڈت تھے لیکن یہ قدیم مہذب زبان مدت سے مردہ و متروک ہو چکی تھی۔ چنانچہ چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گوتم بدھ اور مہابیر جیسے مصلحین کو اپنے مذہبی اصول کی نشر و اشاعت کے لئے پالی زبان کا توسط اختیار کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ گپتا عہد میں اس کی نشاۃ ثانیہ نے ہر قسم کے علمی و فنی جواہر پاروں سے اس کا دامن بھرا لیکن سوائے برہمنوں کے اور کسی کو اس کی حریم ناز میں باریابی حاصل نہ ہو سکی۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت تو سنسکرت کے علمی دفینوں پر امتداد زمانہ کا ایسا گہرا اور تاریک پردہ پڑا ہوا تھا کہ خود ہندوستان کی عامہ خلائق ان سے بالکل ناآشنا تھی ایسی حالت میں نوواردوں کو استفادہ کا موقع کہاں تھا؟

ایک ننھا پودا تربیت قبول کر سکتا ہے۔ اس کی ٹیڑھی شاخیں سیدھی کی جا سکتی ہیں۔ اس پر کاٹ چھانٹ کا عمل جاری ہو سکتا ہے لیکن تناور درخت اپنی صورت شکل نہیں بدل سکتا۔ اس کی خمیدہ شاخ کو سیدھا کرنا ممکن نہیں۔ وہ رد و بدل قبول نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کوئی زبان اپنے ارتقا کی ابتدائی

منزلوں میں خارجی اثرات سے متاثر ہو سکتی ہے لیکن پوری طرح نشوونما پا لینے کے بعد اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی قوم کسی ترقی یافتہ اجنبی زبان کو سیکھنا چاہے تو اس زبان کے مسلمہ اصول و ضوابط کی پیروی اس پر لازم آ جائے گی۔ آج کل ہندوستان میں انگریزی کا دور دورہ ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی انگریزی زبان میں ہندی محاورات ٹھونسنا چاہے یا ہندی اسلوب بیان اختیار کرے تو اس کا یہ فعل مضحکہ انگیز متصور ہوگا۔ آج کل اسی شخص کی انگریزی قابل ستائش سمجھی جاتی ہے جس کی انشا و تحریر اہل زبان سے ملتی جلتی ہو۔ اسی پر سے فارسی زبان کا قیاس کر لینا چاہئے۔ جب اول اول مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو کر یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ اس وقت فارسی زبان اپنے تمام ارتقائی مدارج طے کر کے ترقی کی معراج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے ادب و شاعری کے سارے اصول و قواعد منضبط ہو چکے تھے۔ غرض کہ اس نے مستقل و مستحکم ہیئت اختیار کر لی تھی جس میں کسی قسم کی رد و بدل یا ترمیم و اصلاح کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ جو شخص فارسی سیکھنا چاہتا تھا اس کو مسلمہ اصول و ضوابط اور مقررہ زبان و محاورہ کی پیروی کرنی پڑتی تھی۔ اگر کسی ہندوستانی سے زبان و محاورہ کی کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تھی تو اس پر "لالہ جی ہنوز بوئے کچوری می آید" کے آوازے کسے جاتے تھے۔ اس لئے اجنبیوں کو بھی بڑی احتیاط کے ساتھ اتباع کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات کے مدنظر فارسی پر ہندی رنگ کا چڑھنا ناممکن تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ہندوستان کی علمی زبان سنسکرت تھی جو مدت سے مردہ و متروک ہو چکی تھی اور ملک کی مختلف پراکرتیں محض بول چال کی زبانیں تھیں جو صرف روزمرہ زندگی کے پورا کرنے اور آپس میں لین دین جاری رکھنے کے لئے بولی جاتی تھیں۔ دیسی زبانوں کو ادبی زبان بننے کا فخر مسلمانوں کے عہد حکومت میں حاصل ہوا۔ مسلمان حکمرانوں کی علمی و ادبی سرپرستی صرف عربی و فارسی زبانوں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ وہ دیسی زبانوں کی ترقی کے لئے بھی کوشاں تھے۔ مسلم فرمانرواؤں کی دیکھا دیکھی ہندو راجاؤں، صوبے کے حکمرانوں اور دونوں قوم کے امراء و رؤساء نے دیسی زبانوں کی حمایت کرنی شروع کی۔ ہندی شعراء مختلف درباروں سے وابستہ تھے اور شاہانہ فیاضیوں سے بہرہ ور ہوتے

تھے۔ اگر فارسی شعرا کو ملک الشعرا کا خطاب ملتا تھا تو ہندی کے سربرآوردہ شاعر بھی کوی راج کے خطاب سے سرفراز کئے جاتے تھے۔ دونوں پر انعام واکرام کی بارش ہوتی تھی۔ اگر مسلمان فرمانرواؤں کی توجہ دیسی زبانوں کی طرف مبذول نہ ہوتی تو انھیں علمی وادبی زبان بننے کا کبھی شرف حاصل نہ ہوتا۔ غرض کہ ہندی زبانوں میں ادب و شاعری کی ترقی علم دوست و معارف نواز مسلمان فرمانرواؤں ہی کی سرپرستی و سایہ عاطفت کی شرمندہ احسان ہے۔ ایسی حالت میں فارسی شعرا کی غیرت وحمیت کب گوارا کرتی کہ وہ ان نیم مہذب پراکرتوں کے اسالیب بیان اور طرز و انداز اختیار کرتے جو خود انھیں کے ظل عاطفت میں نشوونما پا رہی تھیں۔ دیسی زبانوں سے استمداد کرنا فارسی کی شان خودداری کے منافی تھا۔

ان کے علاوہ ایک اور وجہ تھی جس نے فارسی شاعری کو ہندی آمیزش سے پاک رکھا۔ ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں کی علم دوستی، معارف پروری اور شعرا نوازی کی شہرت تمام اقطاع عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ شعرا کبھی سونے میں تولے جاتے تھے کبھی جواہرات سے ان کا منہ بھرا جاتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی غیر معمولی داد و دہش دور دور ملکوں کے علما و شعرا کی دامن کش تھی۔ ان کی بے نظیر فیاضیوں نے بے شمار ایرانی شعرا کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ صرف یہی نہیں کہ جن شاعروں کی اپنے ملک میں قدر نہ ہوتی تھی وہ ہندوستان کا رخ کرتے تھے اور یہاں انعام واکرام سے مالا مال ہو جاتے تھے بلکہ اکثر شعرا ایرانی درباروں سے قطع تعلق کرکے ہندوستان آتے تھے اور یہاں کی بے نظیر قدردانیوں اور فیاضیوں سے بہرہ ور ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو، فیضی، غنی کشمیری، مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی کے سوا اور تمام سربرآوردہ شعرا ایرانی الاصل تھے۔ الغرض دہلی میں ایرانی شعرا برابر آتے رہے۔ نو وارد ہونے کی وجہ سے وہ یہاں کی ملکی زبانوں سے بالکل ناواقف تھے۔ لیکن فارسی شاعری کا چمن زار انھی کی آبیاریوں سے سرسبز و شاداب تھا۔ فارسی چمن سخن کے کسی تختہ میں ہندی پھول پودے لگانے سے ان مالیوں کی اجنبیت وناواقفیت مانع تھی۔ اس لئے فارسی شاعری کی کسی شاخ میں ہندی تشبیہوں یا استعاروں کا

پیوند نہ لگ سکا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوؤں نے کس بنا پر اور کس حد تک فارسی زبان میں مہارت پیدا کی تھی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب دونوں قوموں کا تصادم ہوتا ہے اور ایک قوم دوسری پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے، تو محکوم قوم حاکم قوم کے خیالات و جذبات۔ وضع قطع۔ لباس و پوشاک۔ رسم و رواج۔ تہذیب و معاشرت اور آداب و مراسم کی تقلید کرنے لگتی ہے۔ حکام سے ملنا جلنا باعث فخر سمجھتی ہے۔ ان کی سوسائٹی میں رسوخ پیدا کرنے کے لئے ان کی زبان سیکھتی ہے۔ چنانچہ آج کل بھی زندگی کے ہر شعبے میں حاکم قوم کی تقلید موجب افتخار خیال کی جاتی ہے۔ اگرچہ ابتدا ہی سے انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کم آمیزی کی روش اختیار کی ہے۔ وہ ان سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور اپنی سوسائٹی میں انھیں شریک نہیں کرتے۔ تاہم تحریک ترک موالات کے قبل تک انگریزی میں بات چیت کرنے والا انگریزی لباس پہننے والا اور انگریزی طرز رہائش قبول کرنے والا ہندوستانی اپنی سماج میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن مسلمان فاتحین انگریزوں کی طرح کم آمیز نہ تھے۔ مسلمانوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا لیا اور وہ ہندوؤں کے ساتھ آزادی سے ملنے جلنے لگے۔ اس لئے پہلے ہندو امرا و شرفا نے فارسی زبان سیکھی اور رفتہ رفتہ عوام بھی فارسی سے آشنا ہونے لگے۔ میل جول کے بڑھنے سے عامیوں کی زبان پر بھی عربی و فارسی کے بے شمار الفاظ چڑھ گئے۔ اور بقولے اَلنَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِہِم ہندوؤں نے تمام معاشری معاملات میں حاکم قوم کا اتباع شروع کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد فارسی کو بہ سہولت سمجھنے کے لئے لغت و فرہنگ کی ضرورت محسوس ہونے لگی جسے امیر خسرو نے چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں "خالق باری" لکھ کر پورا کیا۔ اور بچوں سے بوڑھوں تک کے لئے عربی و فارسی الفاظ کے معنی سمجھنے میں سہولت پیدا کر دی۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب سکندر لودی تخت نشین ہوا تو اس نے عام طور پر ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی ترغیب دی تاکہ وہ دفتری کاروبار انجام دے سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر کایستھ فارسی کی تعلیم پا پا کر شاہی دفتروں میں داخل ہوئے۔ ہر وقت کے کام کاج کی وجہ سے عربی و فارسی الفاظ و اصطلاحات ان کی زبان پر کثرت سے جاری ہوئے اور ملک کے ہر

حصہ میں پھیل گئے۔ اس کے بعد سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اکبر اعظم کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈر مل نے فارسی کو عام دفتری زبان قرار دیا اور تمام سرکاری حسابات فارسی ہی میں رکھنے کے لئے حکم نافذ کیا۔ اس وقت سے فارسی کا چرچا گھر گھر پھیل گیا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کے بچوں کی ابتدائی تعلیم بھی فارسی ہی میں ہونے لگی۔ ایسا شاید ہی کوئی خوش حال ہندو ہوگا جو اپنے دروازے پر ایک مولوی صاحب کو مقرر کرکے اپنے اور اپنے ہمسایہ کے بچوں کو فارسی کی تعلیم نہ دلاتا ہو۔ پہلے تو ہندوؤں نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے فارسی تعلیم شروع کی تھی لیکن بعد میں فارسی دانی اعلیٰ تہذیب و شائستگی کی علامت خیال کی جانے لگی۔ اس وقت ہندوستان آج کل کی طرح نفاقستان نہ تھا بلکہ فی الحقیقت جنت نشان تھا۔ اس کی فضا فرقہ واری جھگڑوں۔ مذہبی کشیدگیوں اور ہر قسم کے تعصب و کدورت سے پاک تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اتحاد و ارتباط اور سلسلۂ اخوت و مودت نہایت مستحکم و مستقل بنیادوں پر قائم تھا۔ ہندو امرا اور رؤسا بھی فارسی کے ویسے ہی زبردست حامی تھے جیسے مسلمان حکام۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی فارسی کے بڑے بڑے ادیب۔ انشا پرداز اور شاعر پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں فارسی کو جو قبول عام حاصل تھا اس کا عشر عشیر بھی آج تک انگریزی کو باوجود عظیم الشان یونیورسٹیوں۔ کالجوں اور اسکولوں کے نصیب نہ ہوسکا۔ آج کل یونیورسٹیاں منشی اور کلرک پیدا کرنے کی مشین ہیں۔ اہل ہند میں سے ایک شخص بھی انگریزی کا زبردست شاعر یا ادیب نہ بن سکا لیکن فارسی کے بیسیوں عظیم المرتبت ہندو شاعر گذرے ہیں۔ نہ صرف مسلمانوں کے عہد حکومت میں بلکہ سلطنت انگلشیہ کے قیام کے بعد بھی ۱۸۳۷ء تک فارسی دفتری زبان بنی رہی اور اس کا ملک میں اس قدر چرچا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں کے نزدیک اسے اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ نہ صرف سنجیدہ علمی و فنی تصنیفات کے لئے یہ زبان استعمال کی جاتی تھی بلکہ ریختہ کے تذکرے۔ تمسکات۔ رسیدیں۔ طبی نسخے۔ دعوتی رقعے۔ دستاویز۔ ہنڈی۔ کرایہ نامے تجارتی و کاروباری مراسلے۔ معمولی نامہ و پیام اور خانگی خطوط بھی فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ حروف شناسی کے بعد ہی بچے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان کریما و مقیما شروع کرتے تھے۔ بچپن ہی سے فارسی ادب و شاعری کی تمام خصوصیات تشبیہات۔ استعارات۔ تلمیحات۔ اسالیب بیان اور محاورات وغیرہ

کانوں میں رچ جاتے تھے جس کے باعث آئندہ فارسی اشعار کے سمجھنے اور ان سے حظ اندوز ہونے میں بڑی سہولت ہوتی تھی۔

اقلیم سخن میں سودیشی اور بدیسی کی بحث ایک لایعنی سی چیز ہے۔ ادب و شاعری کی دنیا جغرافیائی حدود بندیوں سے بالا تر ہے۔ شاعری کو تخیل سے سروکار ہے۔ تخیل کسی معمل میں سائنس کی طرح بند ہو کر اشیا کا تجربہ نہیں کرتا بلکہ وہ ملکی و جغرافیائی حدود بندیوں کو توڑتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ کبھی وہ ملک چین میں نگار خانہ مانی کا نظارہ کرتا ہے۔ اور کبھی مصر پہنچ کر دریائے نیل میں لشکر فرعون کی غرقابی کا تماشہ دیکھتا ہے۔ کبھی وہ وادی ایمن میں انوار ربانی کی تجلی ریزیاں ملاحظہ کرتا ہے اور کبھی دشت نجد میں مجنوں کی بادیہ پیمائیوں اور بادیہ پیمائیوں پر اشک بہاتا ہے۔ کبھی ایران میں رستم و سہراب کو مصروف ستیز پاتا ہے اور کبھی کوہ قاف میں پریوں کے رقص سے محظوظ ہوتا ہے۔ کبھی اس کی پرواز بلندی میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ جاتی ہے اور کبھی نیچے اترتا ہے تو مفلس ماہی کو شمع شبستاں کی طرح روشن پاتا ہے۔ غرض کہ کبھی وہ مشرق میں ہے تو کبھی مغرب میں۔ کبھی اعلیٰ علیین اس کا مسکن ہے تو کبھی اسفل السافلین۔ شاعرانہ تخیل ان لوگوں کی تنگ نظری پر ہر وقت ہنستا رہتا ہے۔ جو ادبی تشبیہات و استعارات کو محض ہندی پیداوار تک اور تلمیحات و اشارات کو صرف اپنی ہی دیو مالا کے قصص و روایات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ادب و شاعری میں ملکی و غیر ملکی کی بحث کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ البتہ یہاں مانوس اور غیر مانوس کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غیر مانوس تشبیہوں، استعاروں یا تلمیحوں کا استعمال معایب شعری میں داخل ہے۔ انگریزی ادب و شاعری میں یونانی و رومی صنمیات کے ابطال و رجال اور واقعات و مقامات کے بیشمار حوالے زینت کلام کے لئے دئے جاتے ہیں جن کو کسی انگریز متعلم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے اور نہ وہ اس کے وطن یعنی انگلستان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چونکہ یہ تمام صنمیاتی واقعات انگریزی شاعری کا جزو بدن بن چکے ہیں اور ہر انگریز متعلم ان سے مانوس ہے اس لئے وہ ان سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ اسی طرح لیلیٰ مجنوں کا عشق۔ شیریں و فرہاد کی محبت۔ رستم و اسفندیار کی بہادری۔ مانی و بہزاد کی مصوری۔ دجلہ و فرات کی طغیانی۔ الوند و بیستون کی بلندی۔ گل و بلبل کا تعلق۔ یوسف کی

خوبصورتی اور معشوق کی قامت ۔ چشم ۔ دہن ۔ زلف و زنخداں وغیرہ کی شمشاد ۔ نرگس ۔ غنچہ ۔ سنبل
اور سیب وغیرہ سے تشبیہہ یہ تمام چیزیں فارسی شاعری کا سرمایہ تھیں اور اس کے خمیر میں داخل ہو گئی
تھیں ۔ اگرچہ ان چیزوں کو ہندوستان کی سرزمین سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے
ہیں اس وقت فارسی زبان کی وسعت و ہمہ گیری ۔ حاکمانہ عز و شرف اور عام شہرت و مقبولیت نے
ہندوستان کے بچے بچے کو ان تمام تشبیہات و تلمیحات سے روشناس کر دیا تھا ۔ ادبی سرمایہ کو جسمانی آنکھوں
سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف چشم تخیل سے دیکھنا اور ذہن میں ان کا مناسب تصور قائم
کر لینا کافی ہے ۔ ایک متعلم ادبیات کے لئے بلبل کے متعلق ان تمام معلومات سے واقف ہونے کی
ضرورت نہیں جو علم حیوانات یا علم طیور کا ماہر بہم پہنچا سکتا ہے ۔ اسے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ
بلبل ایک خوشنما و خوش الحان پرندہ ہے ۔ اور شعرا اسے گل کا عاشق خیال کرتے ہیں ۔ اسی
طرح ایک شاعر کو سکندر اعظم کے تمام تاریخی کارناموں اور کشور کشائیوں سے کوئی غرض نہیں بلکہ صرف یہ
جاننے کی ضرورت ہے کہ اس نے دارا کو شکست دی ۔ آئینہ کا موجد تھا اور سد سکندری کا قائم کرنے والا ۔
اسی پر دوسری تلمیحات و تشبیہات کا قیاس کر لینا چاہئے ۔ آنکھوں سے دیکھنے کی شرط تو ملکی چیزوں
سے بھی پوری نہیں ہو سکتی ۔ اگر آنکھوں نے لیلیٰ و مجنوں کو نہیں دیکھا ہے تو نل اور دمینتی یا دشینت
اور شکنتلا کو کس نے دیکھا ہے ۔ ملک دکن کے طالب علم کے لئے کوہ ہمالیہ یا رود گنگ ویسی ہی ان دیکھی
چیزیں ہیں جیسے کوہ الوندیا دریائے فرات ۔ بہرحال شاعری میں جسمانی آنکھ سے چشم تخیل کہیں زیادہ
اہمیت رکھتی ہے اور غیر مانوس ملکی اشیا سے مانوس بدیسی چیزیں زیادہ دلچسپ و مسرت بخش ہوتی
ہیں ۔ جن باتوں کو ہم بچپن سے بار بار سنتے آئے ہیں ان کا ہمارے ذہن میں ایسا صاف تصور قائم
ہو جاتا ہے اور ان سے اس قدر دلچسپیاں وابستہ ہو جاتی ہیں کہ ان سے گوش آشنا ہوتے ہی تمام تلازمات
و تلمیحات حافظہ کی نیم شعوری سطح سے ابھر ابھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں ۔ یہ ایک
نفسیاتی واقعہ ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ۔ فارسی شاعری کی گرم بازاری نے ہر ہندوستانی
بچہ کو تمام تشبیہات و تلمیحات سے مانوس بنا دیا تھا ۔ آگے چل کر یہی بچے فارسی شاعری سے صرف حظ

اندوز ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں سے اکثر میدان سخن کے شہسوار بھی بنتے تھے۔ اگر ہندوؤں کی نظر آج کل کی طرح اس وقت بھی ملکی تقسیم وجغرافیائی حدود وبندیوں کی پابند ہوتی اور فارسی شاعری کی خصوصیات انھیں اجنبی ونامانوس معلوم ہوتیں تو ان کے ہاں فارسی کے زبردست ادیب وشاعر پیدا نہ ہوتے۔ بہرکیف یہ حقیقت واقعہ ہے کہ عہد مغلیہ میں ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی فارسی ادب و شاعری کی تمام خصوصیات۔ ادبی نکات وکنہیات۔ نحوی وعروضی اصول وضوابط۔ شاعرانہ تشبیہات واستعارات۔ اشارات وکنایات۔ تخیلات وتلمیحات اور امثال ومحاورات سے اچھی طرح واقف تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنی اجنبیت ومغایرت نہ تھی جتنی موجودہ دور تہذیب میں پائی جاتی ہے۔ وہ شیر وشکر کی طرح گھل مل کر رہتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ تہذیب معاشرت۔ وضع قطع۔ لباس وپوشاک۔ خیالات وافکار۔ تعلیم وتربیت مجلسی آداب ومراسم وغیرہ کے لحاظ سے یکساں تھے۔ فرق تھا تو صرف مذہب کا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے انتہا درجے کی رواداری کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ادب وشاعری میں دونوں قدیم اصول ووضع کے پابند تھے چنانچہ ہندو مصنفین کی نظمی یا نثری کتابیں بھی حمد، نعت اور منقبت سے شروع ہوتی تھیں۔ آج یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ اکثر قدیم شعرا نے نعت ومنقبت میں ایسے پرجوش اور گرم شعر نکالے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی عاشق رسول یا جاں نثار اہل بیت کا کلام ہے۔ کئی ہندو شعرا نے اعلیٰ درجے کے معراج نامے اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ایک مخلوط زبان پیدا ہوئی جو آگے چل کر اردو کہلائی۔ بہت دنوں تک وہ صرف بول چال کی زبان بنی رہی جس سے صرف آپس کے لین دین اور تبادلۂ خیالات کا کام چلتا رہا۔ اس میں انشا پردازی اور شاعری تو کجا معمولی خط وکتابت کرنا بھی معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیسی زبانوں کی علمی وادبی ترقی مسلمانوں کی حمایت وسرپرستی کی رہین منت ہے۔ ان میں اتنی قوت وصلاحیت نہ تھی کہ وہ فارسی زبان پر اثر انداز ہوتیں۔ اس کے برعکس وہ مفتوح ومغلوب اور مسلمانوں کی

دست پروردہ ہونے کی حیثیت سے اپنا دامن کشادہ کرکے فارسی علم وفن کے خوش آب موتی حاصل
کرتی رہیں۔ تیسرا قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ فارسی نہایت شستہ، پختہ، ترقی یافتہ اور حاکم زبان تھی۔ ہندو
اور مسلمان دونوں اس کے دلدادہ تھے۔ فارسی دانی تہذیب و شائستگی کی علامت اور عزت و وقعت
کا ذریعہ تھی۔ ہندوؤں کا خوش باش طبقہ فارسی علوم وفنون کی تحصیل میں منہمک و مشغول تھا جس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی فارسی کے زبردست انشاپرداز اور شاعر پیدا ہوئے۔ فارسی شاعری
کی تشبیہات و تلمیحات سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف تھا۔ ادبی دنیا میں اس وقت ملکی وغیر ملکی
عناصر کا جھگڑا نہ تھا۔ ہر شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان فارسی ادب و شاعری کی تمام خصوصیات سے
واقف و مانوس تھا اور فارسی شاعری سے لطف گیر و حظ اندوز ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔
اب غور طلب امر یہ ہے کہ اردو شاعری کس طرح معرض وجود میں آئی۔ کس فضا میں اس کی نشو و نما ہوئی
اور کون کون سے ارتقائی مدارج طے کرکے یہ معراج کمال کو پہنچی۔ پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی
چاہئے کہ اردو بولی اور اردو شاعری کی ہیئت و نوعیت یکساں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اردو بولی کی زمین
ہندی ہو اور اس پر صرف عربی و فارسی کے بیل بوٹے بنائے گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ اردو بولی
برج بھاشا یا دہلی بھاشا سے نکلی ہو اور اسی کی دختر کہلاتی ہو لیکن یہ حقیقت واقعہ ہے کہ اردو شاعری
راست فارسی شاعری سے نکلی ہے۔ اس کو ہندی بھاشاؤں کی شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔ اردو
شاعری فارسی شاعری کے نہال بالا آوری کی ایک شاخ ہے۔ یہ شاخ اپنے مادری تنے سے کس
طرح پھوٹی۔ اس سے کیسے غذا اور تقویت حاصل کرتی رہی اور کیسے نشو و نما پاکر پھولی پھلی۔ ان تمام مراحل
و مدارج کا استقصا نہایت دلچسپ ہے۔

جدید علمی اصولِ تحقیق کا تقاضا ہے کہ کسی مسئلے کی توضیح و تشریح کے لئے پہلے اس کے تمام
عناصر کی تحلیل یا تجزیہ کیا جائے۔ اردو شاعری کے ارتقائی مدارج کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا
پہلا زینہ فارسی اشعار میں کہیں کہیں ہندی الفاظ کا ادخال ہے۔ مسلمان حملہ آوروں اور ہندوستان کے
باشندوں کے میل جول سے جو مخلوط زبان تشکیل پذیر ہوئی تھی اور جس نے آگے چل کر اردو کا نام پایا

تھا وہ ابتدا ً صرف بازاروں میں بولی جاتی تھی لیکن بمرور زمانہ امرا و شرفا کے گھروں میں بھی جگہ پانے لگی۔ اگرچہ یہ محض بول چال کی زبان تھی اور ادبی و درباری زبان فارسی تھی تاہم فارسی شعرا غیر ارادی طور پر اپنے کلام میں کہیں کہیں اس مخلوط زبان کے ایک آدھ لفظ بھی استعمال کرنے لگے جیسا کہ حسب ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

امیر خسرو۔

اے دہلی و اے بتان سادہ ۔ پگ بستہ و پیرہ کج نہادہ

سر آں دو چشم گردم کہ چو ہندوان رہزن ۔ ہمہ را بنوک مژگاں زدہ برچھکٹارہ

عرفی۔

در چاشت گر از شبنم گل گردفشاں است ۔ آں باد کہ در ہند اگر آید جھکڑ آید (جھکڑ)

اشرف۔

چو کھنڈی شکوہش اگر سایہ افگند ۔ فیل سپہر شانہ بدوزد بزیر پا

محسن کشمیری۔

در چمن ہر صبح مینا میکند راگ بسنت ۔ نیست طوطی را بجز کلیاں چو بلبل بر زباں

ملغرا۔

شوخ سوسن را بگو دل می ربا ید تنقہ ات ۔ ذات رجپوتست ترسم دست بر جمدھر کند

جعفر زٹلی۔

نخستیں کلاں ترکہ بر کھنڈ کرد ۔ ہمہ کار و بار پدر بھنڈ کرد

کبھی فارسی شعرا ایک لفظ کے بجائے اردو کا پورا فقرہ اپنے شعر میں داخل کر دیتے تھے۔ اسے ارتقاء کا دوسرا زینہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

امیر خسرو۔

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی ۔ آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی

از ہر دو بیت قند و شکر می ریزد   ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیو دہی

شیخ جنید۔

چو وزد اندر کمیں باشد کرے جو نیند نجارا   نباشد سود اک جیبل گنوائے سود بھی سارا

احمد گجراتی۔

گر طفلکے بازیگرے خوانندہ و عالم شود   اصلیکہ وارد کے رود آخر زنبورا ہے پر

سعدی دکنی۔

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ   شیر و شکر ہم ریختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

میر معز۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے   در خانۂ آئینہ گتا جوم پڑی ہے

حامد۔

عزم سفر چوں کردی ساجن نینوں نیند نہ آئے جی   قدر وصالت ندانستم تم بن برہ ستائے جی

بعض وقت شعرا ایک مصرع فارسی کا اور دوسرا مصرع اردو کا کہتے تھے۔ اسے اردو شاعری کے ارتقا کا تیسرا زینہ تصور کرنا چاہئے۔ اس کی دو تین مثالیں درج ذیل ہیں:۔

امیر خسرو۔

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں

کسے پڑی ہے جو جا سنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چوں شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر

نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

نوری۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد　　　　بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

سید اثل یار نولی۔

رخسار تو بہار ہے جن رونق چمن　　　　یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن

کسی نے خواجہ حافظ شیرازی کی ایک مشہور غزل کی تضمین کہی ہے جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

انکھیاں نے جھڑ لگایا رسوا کریں گی آخر　　　　دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

دو دن کی زندگانی مت کر جفا کسی پر　　　　نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

اس سے جو آگے قدم بڑھا تو فارسی کے اچھے اچھے اشعار کا اردو میں ترجمہ ہونے لگا۔ ترجمہ کرنے والے بھی فارسی کے پرگو شاعر تھے۔ مشق سخن کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اساتذہ کے اعلیٰ کلام کو پیش نظر رکھ کر شعر کہا جائے۔ اور اس میں کوئی نئی بات یا مزید لطافت و دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شعرا اساتذۂ ماسبق کا بہتر سے بہتر کلام لیتے تھے اگر فارسی میں اسی خیال کو زیادہ پر لطف و موثر طریقے سے ادا کرنا ممکن نہ ہوتا تو وہ اسے اردو شعر میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کو اردو شاعری کی ترقی کا چوتھا زینہ سمجھنا چاہئے۔ ترجمے کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

(۱) حافظ۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو　　　　کہ کس نگشود و نگشاید بحکمت ایں معمہ را

سلطان محمد قلی۔

دنیا کی حکمت نا بوجھیں ہرگز حکیمان علم سوں　　　　کا دو نرانا عیش کا بس دن پیالے کام پر

(۲) نظیری۔

بجاں گرفتہ جا بمیان جان شیریں　　　　نتواں ترا و جاں را ز ہم امتیاز کردن

ولی دکنی۔

ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں　　　　مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

(۳) فغانی۔

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست — اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

میر تقی میر۔

پایا نہ یوں کہ کرے اس کی طرف اشارہ — یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا

(۴) قدسی۔

آلودہ قطرات عرق دیدہ جبیں را — اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

سودا۔

آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو — اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

(۵) نظیری

دیدہ ام دفتر پیمان وفا حرف بہ حرف — نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

قائم۔

فہرست میں خوبان وفادار کے پیارے — دیکھا تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا

اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ اگرچہ فارسی کو علمی۔ ادبی۔ درباری اور دفتری زبان ہونے کا فخر باقی تھا لیکن ہندوستان میں مدت سے قیام ہونے کی وجہ سے مسلمان عوام ہی کی نہیں بلکہ امرا اور شرفا کی بھی مادری زبان اردو ہوگئی۔ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ گھرانوں کا بھی یہی حال تھا۔ دارالسلطنت کے باشندے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان گھروں میں اردو بولتے تھے لیکن تصنیف و تالیف فارسی میں ہوا کرتی تھی۔ شعرا کا عظیم الشان کارنامہ ان کا فارسی کلام ہی سمجھا جاتا تھا لیکن چونکہ اس میں دماغ پر بار زیادہ پڑتا تھا اس لئے فارسی شعرا کبھی کبھی محض تفنن طبع کی غرض سے یا کسی کی فرمائش پر اردو شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ اسے اردو شاعری کی ترقی و ارتقا کا پانچواں زینہ تصور کرنا چاہئے۔ علمی قابلیت۔ شاعرانہ لیاقت اور فنی مہارت کا معیار و ذریعۂ اظہار ابھی تک فارسی شاعری تھی۔ اردو شاعری یا ریختہ گوئی محض ایک ضمنی شے اور تفریحی مشغلہ شمار کی جاتی تھی۔ بعضوں کے دماغ میں یہ خیال بہت زمانے بعد تک قائم رہا۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے اواسط تک جو تاریخ ادبیات اردو کا "دور متوسطین" کہلاتا ہے بعض شعرا اپنی

فارسی شاعری پرنازاں تھے۔ مرزا غالب اسی دور کے شاعر ہیں اور ریختہ کو محض تفنن طبع کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ وہ منشی نبی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "بھائی صاحب تم میری اردو غزلوں کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا۔ اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی اردو غزل کہہ کر لیجاتا ہوں"۔ ایک طویل فارسی قطعہ میں بھی وہ اس خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

فارسی بیں تا ببینی نکتہ ہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

لیکن عام طور پر اردو شاعری نے یہ ارتقائی مرحلہ میر و مرزا کے زمانے سے پیشتر ہی طے کر لیا تھا۔ تاہم یہ حقیقت واقعہ ہے کہ پانچویں ارتقائی دور تک کسی شاعر نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا بلکہ اظہار قابلیت کا اصل ذریعہ فارسی شاعری تھی۔ فارسی کے شعرا محض تفریح طبع کے طور پر یا اپنے دل کی امنگ سے یا دوستوں کی فرمائش سے یا بادشاہ۔ ولی عہد۔ حاکم یا کسی امیر کے حکم سے ایک آدھ ریختہ کی غزل کہہ لیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شاعر ریختہ گوئی کو اپنا فن سمجھتا تو منفرد فارسی شاعر اس پر ایسے الفاظ اپنی فوقیت و برتری جتاتا تھا۔

راست میگویم من واز راست سرنتواں کشید   ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

سرورِ کائنات کی حکومت

اس کا قیام اور انتظام

(ایک مقالہ جو بزم تاریخ کلیۂ جامعہ عثمانیہ کے خصوصی جلسے میں سنایا گیا اور جس پر میلادی انعام فنڈ نے ایک اشرفی کا "سعیدیہ انعام" عطا کیا۔)

مندرجہ عنوان بحث پر روشنی ڈالنے سے پہلے چند امور صاف کرنے ضروری ہیں:۔

کیا آنحضرت صلعم کی حکومت قائم کرنی چاہتے تھے یا اس سے بھی کسی بڑے مطمحِ نظر کے حصول کے لئے حکومت کا قیام ایک ناگزیر چیز تھا؟ عام طور پر حکومت کے قیام کے ذرائع کیا سمجھے جاتے ہیں؟ آنحضرت صلعم کا ماحول جس میں حکومت قائم کی گئی کیا تھا؟

آنحضرت صلعم کا ماحول چودہ سو برس پہلے عرب کی سیاسی حالت کا عام نقشہ یہ تھا کہ گو عرب طبعاً ایک ہی ملک تھا۔ جغرافی، لسانی، نسلی یکجہتی موجود تھی۔ رسم و رواج یکساں تھے مگر کوئی متحد کرنے والی مرکزی قوت موجود نہ تھی۔ ڈاکہ، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، جوا، زنا، شراب نوشی ہر قسم کی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ (تفصیل صبح الاعشیٰ از قلقشندی وغیرہ میں دیکھئے) خانہ جنگیاں عام تھیں جن کے باعث ساحلی و سرحدی مقامات پر طاقتور ہمسایہ حکومتوں کی حمایتیں (Protectorates.) قائم ہو گئی تھیں[1]۔ ایک حصہ پر رومن اثر تھا تو دوسری طرف ایرانی گرفت بھی تھی[1] اور یہ اجنبی تسلط و نفوذ ہر قسم کے اثرات ڈال رہا تھا۔ چنانچہ ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ عربی زیرِ حمایت حکومتوں میں شاہانہ طمطراق اور کر و فر پیدا ہو گئے تھے۔ مگر گورنر یمن ابرہہ حبشی کی تباہی کے بعد؛ جو عربوں کے روایات اور قومی معبد کو تباہ کرنے آیا تھا[2] "یوم ذی وقار" میں اجنبی استعمار کو ایک زبردست دھکا لگا تھا جس سے عربوں کے ولولوں میں ایک

---

(۱) جملہ حوالے نمبروں کی ترتیب سے مضمون کے آخر میں دیے گئے ہیں۔ (م۔ ح۔ ا)

مملکت اسلامیہ

بعہد نبوی

شمال

مشرق — مغرب

جنوب
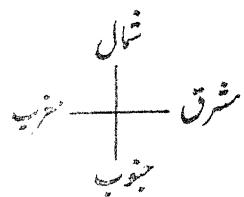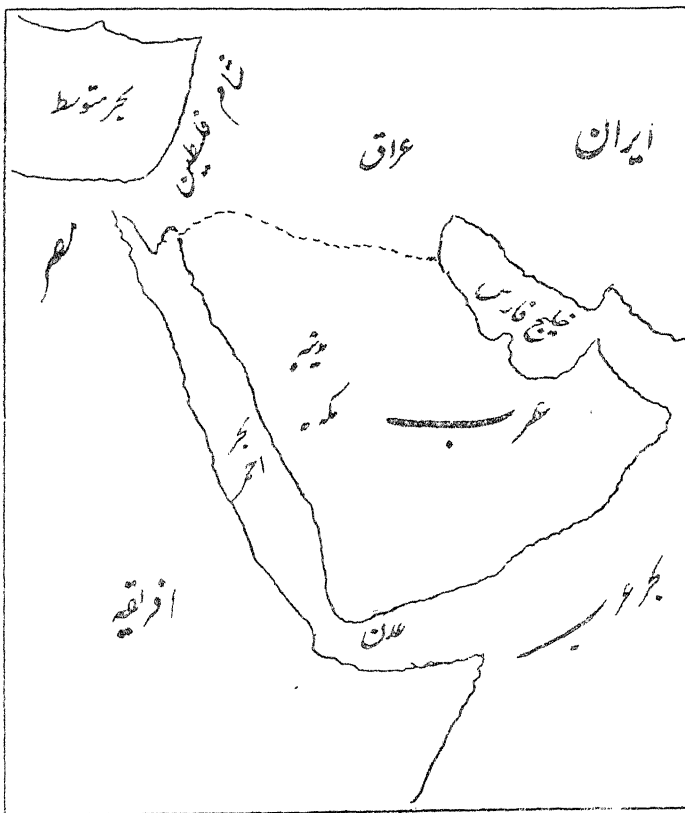
خاموش محرک پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی برتر قابلیتوں کو محسوس کرنا شروع کر چکے تھے قسمت آزما استعماری قوتوں (روم وایران) میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں جس سے دونوں کمزور ہو گئے۔ قبیلہ واری حکومت تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے اثر سے ملک میں ایک طرح کی مرکزیت بھی تھی۔ چنانچہ سب عرب حج کو مکہ معظمہ آتے تھے۔ جہاں قریش اور قریش میں بھی عبد مناف کا خاندان سب سے با اقتدار تھا۔ حج اور دیگر میلے وحدت لسانی وخیالی میں بہت مددگار تھے۔ ان میں ایک طرح کی جمہوریت موجود تھی دار الندوہ میں وقت ضرورت ان کی "پارلیمان" کا اجلاس ہوتا تھا۔[۲] ان کے خطیب، سفیر، حکم یا ثالث خزانہ دار وغیرہ بھی منتخب ہوتے تھے[۱]۔ ملک میں چپکے ہی چپکے ذہنیت ترقی کر رہی تھی اور بیرونی ممالک کے سفر وغیرہ سے ان کے چند اعلیٰ تر دماغوں میں تلاش حق پیدا ہو گئی تھی۔ بعض لوگ شراب چھوڑ چکے تھے۔ متعدد لوگ بت پرستی سے خود بخود نفور ہو گئے تھے۔ موحدین بھی غیر موجود نہ تھے۔ انسانی قربانی بند ہو چکی تھی اور ایسی منت کا معاوضہ سو اونٹ مقرر ہو چکے[۲] تھے۔ انسانیت پروری کا خیال پیدا ہو چکا تھا اور متعدد قبائل نے معاہدہ "حلف الفضول" کے ذریعے ایک انجمن مظلوموں کی مدد کے لئے قائم کی تھی۔ غرض اس قسم کی قابلیت ملک میں پیدا ہو چکی تھی کہ انہیں ایک متمدن اور منضبط قوم بنا کر ان کی عملی قوتوں سے کام لیا جائے اور ساتھ ہی ہمسایہ اجنبی حکومتیں اوج کمال کو پہنچنے کے بعد تیزی سے رو بہ انحطاط تھیں۔

ظہور قدسی | ان حالات میں ۹ ربیع الاول ۵۳ قبل ہجرت (۲۰ اپریل ۵۷۱ء) کو مولانا شبلی کے الفاظ میں "شاہ حرم، حکمران عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت واجلال ہوا اللھم صل علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم"[۱]

سرور کائنات صلعم کا مقصد رسالت | عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے ــــ اور اس کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ــــ کہ آنحضرت صلعم کی پوری کوشش اور جد وجہد کا منشا فقط یہ تھا کہ "خدائے واحد کا بول بالا ہو"[۲] اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آئے جس میں ظلم معدوم ہو۔ ہر شخص اعتقاد کی کامل آزادی سے بہرہ ور ہو، دنیا سے بدامنی وفساد دور ہو، تاکہ ہر شخص کو اپنی قابلیت کے مطابق خدا کی پیدا

کردہ چیزوں سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع ملے۔ اور نیز محتاجوں کو ممکنہ حد تک حکومت کی جانب سے امداد دی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلعم کا مشن اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ تمام انسان ایک مذہبی وسیاسی معاشرے یعنی حکومت کے تحت لائے جائیں جس کے بغیر امن، انتظام اور خودداری ممکن نہیں۔ آپ کی مشن کے خالص مذہبی اغراض سے یہاں ہمیں بحث نہیں ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ابتدائی دور رسالت میں اہل مکہ نے آنحضرت صلعم کو مال و دولت کی، حسین عورتوں کے ساتھ عقد کی اور امارت وحکومت کی چاٹ دی تاکہ آپ نبوت کے دعوے سے باز آجائیں۔ مگر آنحضرت صلعم نے اسے ٹھکرادیا اور کہا کہ اگر چاند سورج بھی مجھے توڑ کر لادے جائیں تو میں تبلیغ حق سے باز نہیں آسکتا۔" اس واقعے سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوجاتا ہے کہ چالیس پچاس برس کی عمر تک آنحضرت صلعم کو دنیا کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اس کے بعد بھی آپ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اور بقیہ چند سالہ زندگی گو سیاسی واقعات سے پر ہے لیکن آنحضرت صلعم آخر تک یہی فرماتے رہے کہ "میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں اور بس۔"

حکمرانی کی تربیت | پیدائش سے چند ماہ قبل باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا۔ بچپن کا قبیلہ بنی سعد کے پہاڑوں میں گزارنا، چند ہی سال کے اندر ماں اور دادا کا بھی دنیا سے کوچ کر جانا۔ ایک جنگ (حرب فجار) میں بعض بزرگ رشتہ داروں کے تیر بردار کی حیثیت سے شریک ہونا، ایک تجارتی سفر شام کے اختیار کرنا، ایک معمر بیوہ سے شادی کرنے کے بعد غریب پروری اور نکوکاری کرتے کرتے بلند تر جذبات کے اثر سے خلوت گزینی پر مائل رہنا"(۲۱) یہی وہ چند باتیں ہیں جو اس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ آپ کے دادا قبیلہ قریش کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ مکہ معظمہ میں آباد تھا جو قدیم سے ملک عرب کا مرکز تھا۔ آپ کے دادا کے انتقال پر سرداری دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ آپ کے متعدد چچا بھی زندہ تھے۔ اس لئے آپ کو سرداری حاصل کرنے کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے بظاہر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سلطنت کے قیام کی تحریک اس زمانے میں دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

حکومتیں کس طرح قائم ہوتی ہیں؟
آنحضرت صلعم کی حکومت

قیام حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانوں سے قبائل اور قبائل سے شاہی پھر شہنشاہی بنتی ہے۔ قبائلی دور تک ارتقاء طبعی ہوتی ہے اور بلا مخالفت، لیکن قبائل کے شیوخ کو کسی مرکز (بادشاہ) کی اطاعت پر جمع کرلینا آسان نہیں۔ شاہی سے شہنشاہی مملکت مختلف طور سے بن سکتی ہے۔ اور جدید اضافہ ملک یا تو ایسے ممالک کا ہوتا ہے جس میں کوئی حکومت اور انتظام پہلے سے موجود ہوتے ہیں یا محض خود سر قبائل کے مقبوضات ہوتے ہیں۔

خود سر قبائل کے ملک کا الحاق دو طور سے ہو سکتا ہے یا تو بزور شمشیر یا بذریعہ تدبیر۔ یہ تو ظاہر ہے کہ موروثی طور سے کسی کو تاج شہریاری حاصل ہو جائے تو اس کو محفوظ رکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا بزور بازو کوئی مملکت قائم کرنا۔ اسی طرح جدید مملکت ذلیل ذرائع سے نہیں بلکہ راست بازی اور پاک ضمیری سے قائم کرنا، مملکت قائم کرکے اسے مستحکم اور پائدار کرنا۔ حکومت عدل و انصاف سے کرنا اور نیک نام چھوڑ جانا بہرحال ان کے برعکس امور سے بہتر ہیں اور مشکل تر بھی۔

محض حسن ظن سے نہیں بلکہ استقراء و تفحص کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں عرب میں کسی مملکت کا قیام ایک واقعی مشکل کام تھا۔ ملک میں کوئی حکومت نہ تھی، بے شبہ بعض خطوں پر چھوٹی چھوٹی شاہی حکومتیں حکمران تھیں اور وہ بھی اجنبی استعماریت کا شکار (ان کو اپنے ماتحت بنانا، ان کی حامی و محافظ قوی استعماری شہنشاہیوں سے مقابلے کرنے کے بغیر ناممکن تھا)۔ ان حیرہ وغیرہ کی حکومتوں کے قطع نظر عرب میں عام طور سے صرف قبائلی حکومت تھی جن میں آپس میں سخت رقابتیں اور موروثی جھگڑے صدیوں سے پشت از پشت ہی ہوتے چلے آرہے تھے غرض آنحضرت صلعم کو قبائل کی ان مرکز گریز قوتوں کو یکجا کرنا، ان میں معاشرتی اور اخلاقی کایا پلٹنے والے اصلاحات کو رائج کرنا، عرب کی غیر ملکی حمایتوں (Protectorates) کو آزاد کرا کے ان کا الحاق کرنا، ایک حکومت کے جملہ ضروریات قانونی و انتظامی کو بالکل نئے سرے مہیا کرنا اور اندرون ملک کی یہودی اور نصرانی مخالفتوں سے دو چار ہونا تھا۔ (یہودی مخالفتیں، مذہبی، معاشی، سیاسی ہر قسم کی

رہیں اور بہت سخت جیسا کہ آئندہ بھی اشارۃً ذکر ہوگا) اس مہم کو سر کرنے اور مملکت عرب کو قائم کرنے کے ساتھ آنحضرت صلعم اس کو مضبوط اور گہری بنیاد پر مستحکم حالت میں چھوڑ جاتے ہیں۔ رہا آپ کا نیک نامی سے مملکت کو قائم کرنا اور نیک نامی سے حکومت کرنا اور اپنے بعد بھی نیک نام چھوڑ جانا اس سلسلے میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

ان سب کے علاوہ قیام کے دو بڑے ذریعے یعنی زر اور زور (فوج) میں سے ایک بھی آپ کے پاس نہ تھا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ حکومت کا قیام حکومت کرنے کی غرض سے نہیں چاہتے تھے آپ کا پہلا اور آخری مقصد برے رسم و رواج کو مٹانا اور مذہب اسلام کی تبلیغ کرنی۔ غرض مقصد وحید اصلاح قوم تھا۔ اسی وجہ سے لوٹ مار، ظلم، طمع، لالچ، مکر و فریب، دغا وغیرہ (جن سے اپنے گرد جتھے جمع کئے جاسکتے ہیں اور دولت جمع کی جاسکتی ہے) آپ کے طریق عمل سے خارج تھے۔ آپ کو تبلیغ دین کرکے متبعین فراہم کرنے تھے۔ اور اصولاً اور حسب معمول یہ متبع ابتداءً عموماً مفلسوں، غریبوں، مسکینوں وغیرہ پر ہی مشتمل تھے۔ جن سے معمولی امداد تو کجا خود ان کی جانی و مالی حفاظت مشکل تھی۔ ان سب امور کے باعث قیام حکومت میں آپ کے لئے بے اندازہ اور بے انتہا مشکلیں پیش آئی تھیں اور آئیں بھی۔ ان پر آپ کس طرح غالب آئے آئندہ مذکور ہوگا۔

ابتدائے کار | چالیس سال کی پختہ عمر میں عرفان سے مالامال ہوکر اور ربانی ہدایت کے ماتحت (نبوت کا دعوےٰ فرماتے ہوئے) آنحضرت صلعم نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے سخت تر کام نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا: عربوں کی سی اجڈ اور پرنفاق قوم کو خدائے واحد کی پرستش پر یکجا کرنا۔ مکارم اخلاق سکھانا اور تمام ساتھ دینے والے متبعین کو بھائی بھائی بنادینا[9] یہ آپ کا منشا تھا۔ متلاشیانِ حق دوڑ پڑے کہ چشمۂ حیات کا پتہ لگ گیا۔ غرض چند سال کی خفیہ اور پھر علانیہ کوشش اور تبلیغ سے دنیا کے چند اعلیٰ ترین دماغ مل گئے جو آپ کی تعلیم کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تن من دھن سے اس کی توسیع پر آمادہ ہوگئے۔ زبردست ہم خیالوں کا پیدا کرنا آئندہ ہونے والے کام کی مضبوط بنیاد تھی۔

جب اس کا چرچا پھیلا اور کچھ اہل مدینہ آنحضرت کے پاس حاضر ہوئے تو آنحضرت نے ان

سے عہد لیا کہ اگر آپؐ کو مدینہ آنا پڑے تو یہ لوگ پوری امداد دیں گے اور حفاظت کریں گے"(۱)

حریتِ خیال اور آزادی تبلیغ میں جب مزاحمت ہوئی تو اس کی شدت کے باعث آنحضرتؐ ترک وطن پر مجبور ہوئے اور بظاہر یہ واقعہ حکومت کے قیام کی تحریک کا پہلا باعث ہوگا یعنی دشمنوں کو شکست دے کر فاتحانہ وطن کو لوٹنا ہر ایسے جبری تارک وطن کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ غرض جو بھی ہو مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینۂ منورہ میں قیام اختیار کیا گیا جہاں سیکڑوں ہی متبعین موجود تھے۔ اور جن سے مدد کا معاہدہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کرنا قریش کی جانب سے عملاً ایک اعلان جنگ تھا۔ اس پر مستزاد انھوں نے اسلام کو تباہ کرنا اپنا قومی مقصد بنا لیا جیسا کہ بعد کے حالات سے ثابت ہوتا ہے۔

آپ کی مخالفت جو اہل مکہ کر رہے تھے اس میں بنو امیہ کا خاندان پیش پیش تھا اور یہ مخالفت پشتینی تھی کیونکہ عبد مناف کی زندگی میں ان کے فرزند اکبر عبد شمس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے فرزند اصغر اور ان کے بعد ان کی اولاد نے سرداری حاصل کی۔ لیکن عبد شمس کی اولاد کا دعویٰ باقی رہا۔ اور ہاشم سے ان کا جھگڑا عبد مناف کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا آخر عبد المطلب اور ابوطالب کی وفات پر بنو امیہ نے

عبد مناف
- عبد شمس ← امیہ ← ابوسفیان
- ہاشم ← عبد المطلب ← ابوطالب

مکمل اقتدار حاصل کر لیا۔ اب آنحضرت صلعم کی اطاعت گویا دوبارہ بنو امیہ کے لئے بنو ہاشم کی اطاعت پر مجبور ہونا تھا۔ چونکہ بنو امیہ اب قریش کے سردار تھے اس لئے ان کا مخالفت پر تلنا گویا پورے اہل مکہ کا تلنا تھا۔

آنحضرت صلعم نے مدینہ منورہ آتے ہی اس بات کی کوشش کی کہ اپنے تمام ساتھیوں میں اتحاد و اتفاق کی روح کو ترقی دیں۔ اس سے پہلے عربی قبائل میں باہم چشمک رہا کرتی تھی خصوصاً اہل مکہ تو سب کو حقیر سمجھتے تھے لیکن آنحضرت صلعم نے یہ انتظام فرمایا کہ تمام اہل مکہ کا جو مدینہ منورہ ترک وطن

کرکے آئے تھے مسلمانان مدینہ کے ساتھ بھائی چارہ (عقد مواخات) کرادیا۔[۱۱] یہ فقط برائے نام نہ تھا۔ یہ کارروائی اس جوش وخروش سے قبول کی گئی کہ اہل مدینہ نے اہل مکہ کو ہر چیز میں اپنا شریک بنا لیا اپنی دولت کا آدھا حصہ انھیں دے دیا۔ ان میں سے کوئی مرتا تو اس کا ساتھی وارث بھی ٹھہرتا۔[۱۲]

اس سے متعدد فائدے ہوئے۔ بے گھر وبے بس اہل مکہ چین سے بس گئے۔ قبائلی تعصب اور علٰحدگیوں کا یک قلم خاتمہ ہوگیا اور تمام مسلمانوں میں بلا امتیاز رنگ وزبان اخوت اور امداد باہمی کی حقیقی روح کام کرنے لگی۔

لیکن پھر بھی جو بے اطمینانی اور خوف ودہشت پھیلی ہوئی تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مسلمان مسلح سر بکف رہتے تھے۔

غرض آنحضرت صلعم نے اپنی تمام موجودہ قوتوں کو نہ صرف ایک مرکز کے تحت قائم کرلیا بلکہ ان میں اعلٰی درجے کا ضبط (ڈسپلن)، اور مل کر کام کرنے اور ابھرنے کا غیر مختتم جوش بھی پیدا کردیا۔ عرب یوں بھی ایک جنگجو قوم تھی۔ اب ان کی قابلیتوں کو ابھار کر ان سے بہتر فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی آس پاس کی اجنبی قوتوں سے (یعنی یہودی ودیگر عرب قبائل سے) معاہدے کرنے شروع کردئے۔[۱۳] ان معاہدوں کا مقصد یہ تھا کہ قریش کے منصوبوں کے خلاف حلیف پیدا کرکے قومی حفاظت کا مقصد حاصل کیا جائے۔ چنانچہ یہودیوں کے معاہدے کا متن یہ تھا:

"(۱) خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے قائم چلا آتا ہے اب بھی قائم رہے گا۔

(۲) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔

(۳) یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

(۴) یہود یا مسلمان کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کریگا۔

(۵) کوئی فریق قریش کو امداد نہ دے گا (شبلی نے امداد کی جگہ امان لکھا ہے)

(۶) مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یکدگر رہوں گے

(۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا لیکن مذہبی لڑائی

اس سے مستثنےٰ ہوگی"(۱)

بنی ضمرہ کے معاہدے کے یہ الفاظ تھے :-

"یہ محمد رسول اللہ (صلعم) کی تحریر ہے بنو ضمرہ کے لئے ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا۔ اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی۔ بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلے میں لڑیں اور پیغمبر (صلعم) ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے"(۲)

اسی زمانے میں عید رمضان کے دن فطرہ یعنی غلہ خیرات کرنے کا حکم ہوا جس پر اب تک عمل ہوتا ہے جس پر آئندہ بحث ہوگی۔

ان انتظامات کے ساتھ آنحضرت صلعم کا اصل مقصد و غرض یعنی تبلیغ اسلام کا کام بھی برابر جاری رہا اور روز بروز حلقہ بگوشوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اہل مکہ کو کچھ تو اس بات کی جلن تھی کہ آنحضرت صلعم ان کے ہاتھ سے صحیح وسلامت نکل گئے تھے اور اس سے زیادہ یہ خوف تھا کہ آپ کی روز افزوں طاقت کسی نہ کسی دن مکہ معظمہ پر حملے کا باعث ہوگی۔ اس لئے سرداران قریش مخالفت کا سامان کرنے لگے۔ ادھر بھی کوئی غفلت نہیں برتی گئی تجسس اور خبر رسانی کا کافی انتظام قائم کیا گیا۔ پتہ چلا کہ مکے والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا ہے جس کے سرداروں نے طے کر لیا تھے کہ جملہ منافع "خلاف مسلمانان مہم" کی سربراہی کے لئے مخصوص کر دیا جائے گا۔ وجہ کافی تھی۔ اس کو روکنے کی کوشش کی گئی مگر اسلامی دستہ دیر سے پہنچا۔ اس سے مکے اور مدینہ کے سیاسی تعلقات کی فضا اور بھی مکدر ہوگئی۔ وہ ایک چھوٹی مقامی جھڑپیں رہیں مگر آنحضرت صلعم جنگ کو برابر ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب مسلمانوں کے ایک خبر رساں دستے نے لوٹ مار کی اور دو ایک آدمیوں کو مار ڈالا تو آنحضرت صلعم ناراض ہوئے"(۳)

آخر جب شام سے قریش کا مذکورۂ بالا تجارتی قافلہ واپس ہونے لگا (جس کا نفع مسلمانوں کے خلاف مہم کی تیاریوں میں صرف کیا جانے والا تھا) تو خطرے کے احساس سے آنحضرت صلعم مدینہ منورہ سے چل پڑے اور چاہا کہ اسے روک لیں۔ قافلے کی مدد کو مکے سے کمک پہنچ گئی۔ قافلہ تو راستہ کترا کر نکل گیا لیکن اس کی مدد کے لئے جو فوج آئی تھی اس کی آنحضرت صلعم کے ہمراہیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی باوجود ایک اور تین کے تناسب کے اعلیٰ ترحربی انتظام اور فوجی ضبط کے باعث آنحضرت صلعم کو شاندار

فتح ہوئی۔[۱۳] اہل مکہ شکست کا بدلہ لینے کے لئے بے چین ہو گئے۔ جلدی ہی وہ مدینۂ منورہ پر چڑھ دوڑے
وہاں بھی خبر لگ گئی تھی اور گو اس مقابلے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی[۱۳] لیکن مکے والے اس سے فائدہ
نہ اٹھا سکے اور ان کے لئے فتح شکست برابر رہی۔

اس عرصے میں حلیف یہودیوں کی بدعہدی ناقابل برداشت ہو گئی اور ان کی اچھی طرح سرکوبی کی
گئی۔[۱۳] مگر اس کے بعد ایک خطرناک ترین دور شروع ہوا۔ شکست خوردہ یہودیوں نے قریش کے ساتھ
اتحاد کر لیا اور ایک انتہائی آخری کوشش مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے شروع ہوئی۔ اس واقعہ کو جنگ
احزاب یا جنگ خندق کہتے ہیں۔ اس کی شدت کا خود قرآن شاہد ہے۔[۱۴] مگر آپ کی بھی برتر فوجی قابلیت
اور سیاست دانی سے حریفوں کو محاصرہ اٹھا کر واپسی پر مجبور کر دیا گیا۔[۱۳] اور مدینہ منورہ سے غدار یہودی
عنصر کو بھی اس کے بعد ہی خارج کر دیا گیا۔[۱۳]

مگر یہودیوں کا غرور اور ان کی قوت پوری طرح نہ ٹوٹی تھی اور وہ خیبر کی نو آبادی میں آمادۂ جنگ
ہو رہے تھے۔ اس لئے ایک طرف تو ان کی قوت کا قطعی طور پر استیصال کر دیا گیا۔[۱۲] اور دوسری طرف
"صلح حدیبیہ" میں قریش سے ایک معاہدۂ امن ہو گیا۔[۱۲] لیکن چند روز میں ادھر سے بدعہدی ہوئی تو ادھر
سے ایک لشکر جرار نے جا کر مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا — ظالم مگر بے بس حریفوں کو عام معافی دے دی گئی اور
یہ آنحضرت صلعم کی تعلیم کا اثر تھا کہ فاتح لشکر نے (جسے کبھی دیس سے نکلنا اور انتہائی تکالیف و آلام کو برداشت
کرنا پڑا تھا) اپنے سابقہ دشمنوں کے قصوروں کو یک لخت نسیاً منسیاً کر دیا۔[۱۳] اس کی نظیر سے ہمارے علم میں
تاریخ عالم بھی عاری ہے۔

مکہ معظمہ کی فتح حکومت عرب کے بنیادی استحکام کا آخری مرحلہ تھا۔ اس کے بعد تھوڑے
ہی عرصے میں طوعاً و کرہاً سب عربوں کو مرکزی حکومت کا فرماں بردار بننا پڑا۔[۱۵] ہر طرف سے اطاعت کے
وفود آنے لگے اور مرکزی حکومت کی جانب سے ہر جگہ ٹیکس یا مالگزاری (زکوٰۃ) وصول کرنے والے اور
مذہبی و سیاسی فرائض انجام دینے والے افسر مقرر کیے جانے لگے۔[۱۲] اور آپ کے تدبر و انتظام کا نتیجہ تھا کہ عرب
جیسے ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلعم کا اقتدار جزیرۂ عرب پر پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے صلح حدیبیہ کے دوران میں اپنی عالمگیر تعلیم سے دنیا کو مستفید کرنے کے لئے آپ نے سفارتیں روانہ فرمائیں[11]۔ اور بین الاقوامی (یا صحیح تر اصطلاح میں بین الممالک) تعلقات کی بنا پڑی۔

اجنبی استعمار پر حملہ | عربی سلطنت پر اب اجنبی استعمار کی نظریں پڑنے لگیں۔ یہ تصادم ناگزیر تھا۔ اس کی نمایاں صورت جنگ تبوک و موتہ میں ظاہر ہوتی ہے جس کے ذریعے عرب کی آئندہ سیاست معین ہو گئی۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت اور ایک زبردست مہم کشور کشائی کے لئے فلسطین روانہ ہونے ہی کو تھی[12]۔

حقوق شہریت کا منشور اعظم | حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلعم نے جو خطبے دئے وہ تاریخ تمدن میں نہایت اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں تفصیل سے رعایا کے حقوق و فرائض کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تفصیل سیرت شبلی، تاریخ ذہبی، ابن ہشام وغیرہ میں ملے گی۔ مختصراً تمام جاہلیت کے دستور پامال ہیں۔ سب انسان برابر ہیں عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں۔ فقط پرہیز گاری وجہ کرامت ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہو۔ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاؤ وہی پہناؤ جو خود پہنو۔ موروثی جاہلانہ انتقام باطل ہیں۔ جاہلیت کے سود لغو ہیں۔ عورتوں سے برتاؤ میں خدا سے ڈرو۔ تمھارا ان (عورتوں) پر، ان کا تم پر حق ہے۔ ہر شخص کا جان و مال و آبرو محفوظ ہے۔ ضابطۂ قرآنی کو ملحوظ رکھ کر گمراہ نہ ہوگے۔ حقوق ترکہ و میراث متعین ہوگئے وارث کے لئے (مزید) وصیت نہیں۔ بچہ بستر والے کا، ہر زانی کے لئے پتھر ہیں۔ جو بچہ اپنے باپ کے سوا غیر اور جو غلام اپنے مالک کے سوا دوسرے کا ہونے کا دعوی کرے اس پر خدا کی لعنت ہے۔ عورت اپنے "شوہر کے مال" سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ نہ دے۔ قرض ادا کیا جائے عاریت واپس کی جائے۔ عطیے کا بدلہ دیا جائے۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔ باہمی خونریزی نہ کرو۔ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے، بیٹا باپ کا، باپ بیٹے کا جوابدہ نہیں۔ اپنے امیر کی اطاعت کرو چاہے وہ نکٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کی عبادت کرو۔ پانچ وقت نماز پڑھو۔ مہینہ بھر کے روزے

رکھو۔ میرے احکام کی اطاعت کرو جنت میں جاؤ گے

اسی زمانے میں قران مجید کی یہ آیت نازل ہوئی "آج تمہارا دین مکمل ہو گیا"

(باقی)

حوالے

---

(۱) شبلی۔ سیرۃ النبی جلد اول Das Leban Muhammed Noldke
سدیو کی (فرنچ تاریخ عرب باب ۸۔

(۲) ابن ہشام نیز صبح الاعشیٰ قلقشندی

(۳) عرب اور ایران کی مشہور جنگ جو عین زمانہ ولادت نبوی میں "ذی قار" نامی چشمے کے کنارے ہوئی اور جس میں عرب کامیاب رہے۔ دیکھئے سدیو۔ Sedillot کی کتاب
Historie generale des Arabes, leur Empire, leur civilisation
اور ایام عرب مؤلفہ شرر وغیرہ

(۴) شبلی وغیرہ

(۵) عرب قبل اسلام، شام، ہند، چین وغیرہ سے تجارت کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے تمدن عرب مترجمہ سید علی بلگرامی، اور مضمون حکیم شمس اللہ قادری "تجارت العرب قبل الاسلام" رسالہ ہدیۂ آصفی بابۃ رجب و شعبان ۱۳۲۳ھ

(۶) قرآن مجید: لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔

(۷) ابن ہشام۔

(۸) حدیث: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔

(۹) قرآن مجید: اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا الآیہ

(۱۰) ابن ہشام

(۱۱) تفسیر بیان القرآن از محمد علی آیت: واولوا الارحام بعضہم اولیٰ ببعض الآیہ

(۱۲) شبلی صفحہ سنہ ۱ھ میں یہودیوں سے اور سنہ ۲ھ میں بنی ضمرہ و بنی مدلج وغیرہ سے معاہدے ہوئے۔

(۱۳) ابن ہشام۔

(۱۴) قرآن مجید: اذ جاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا ہنالک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالًا شدیدًا الآیہ

(۱۵) اشارہ ہجرت کی جھوں اور جنگ حنین وغیرہ کی طرف۔ تفصیل ہر سیرت کی کتاب میں ملے گی۔

(۱۶) فوائد بدریہ از قاضی الملک بدر الدولہ۔ شبلی وغیرہ۔

امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم

گیارہ سال سمرقند میں عبدالرحمٰن خاں کا روسی اور برطانوی سیاست کا مطالعہ کرنا

اگر ہم عبدالرحمٰن خاں کی زندگی پر ہم ایک عمیق نظر ڈالیں تو بالکل صاف معلوم ہوگا کہ روسی ترکستان کے قیام نے عبدالرحمٰن خاں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا اور اسی گیارہ سال کے عرصے میں عبدالرحمٰن خاں نے خاص طور پر روسی اور انگریزی سیاست کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا۔ عبدالرحمٰن کی سوانح حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے کس قدر عمیق نظر سے اپنے دونوں ہمسایوں یعنی برطانیہ اور روس کی سیاست کا گہرا مطالعہ کیا، وہ دونوں قوموں کی ہر سیاسی چال کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ اپنی تزک کی دوسری جلد میں "روس انگلستان وافغانستان" کے عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں :-

"جو کچھ اس باب میں بیان کروں گا وہ میری تمام زندگی کے تجربے کا نتیجہ ہے اور زندگی بھی کیسی جو مشکلات و تردادت، عجیب و غریب واقعات، سیاحی اور مختلف اقسام کی ذمہ داریوں سے پر رہی ہے، ایام طفولیت سے ۱۸۸۰ء تک میری زندگی کے تقریباً چالیس سال روس میں، سرحد روس پر یا روسی چینی و ایرانی و روسی سرحد کے قریب سفر میں بسر ہوئے اور ۱۸۸۰ء سے اس وقت تک میں نے اپنا تمام وقت ان دو مضبوط ہمسایوں انگلستان اور روس کی پالیسی اور خواص کے سمجھنے اور جانچنے میں صرف کیا ہے"

ایک دوسری جگہ پر عبدالرحمٰن خاں اپنی خود نوشت سوانح حیات میں برطانوی اور روسی تعلقات کو اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"مجھے معلوم ہے کہ اس صدی میں یہ قاعدہ ہوگیا ہے کہ بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو تقسیم کرتی جاتی ہیں اور کمزور ملکوں کو لینے کے لئے مختلف طریقے اور تدبیریں اختیار کی جاتی

ہیں مثلاً پہلا طریقہ یہ ہے کہ کمزور حکومتوں کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور ہر زبردست غاصب کو اس سے حصہ ملتا ہے، جو انصاف کہ یہ زبردست سلطنتیں ناتوان قوموں کے ساتھ کرتی ہیں اس سے مجھے ایک غریب شخص کا قصہ یاد آیا جس کی گھڑی ایک چور نے لی تھی۔ وہ بیچارہ چوروں کے ایک سردار کے پاس جو کہ اپنے تئیں مجسٹریٹ کہتا تھا گیا اور داد رسی چاہی، مجسٹریٹ نے کہا "میں تمہاری گھڑی واپس نہیں دلا سکتا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ میرا حصہ کہاں ہے مجھے کیا دوگے؟" اس مظلوم نے از حد آہ و زاری کی اور کہا کہ "میں اور کچھ دینے کے لئے نہیں آیا ہوں بلکہ جو چیز جاتی رہی ہے اُسے واپس لینا چاہتا ہوں" مجسٹریٹ نے جواب دیا "لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم اپنی گھڑی مجھ سے کمزور شخص کو تو دے دو اور میں اپنے حصے سے محروم رہوں" یہ کہہ کر اس نے گھڑی کی زنجیر اپنے حصے میں طلب کی۔ اس لئے وہ بیچارہ حاکم اعلیٰ کے پاس گیا جس نے اس کی انگوٹھی چھین لی یہ دیکھ کر اس نے خیال کیا کہ اگر اب حاکم بالا کے پاس جاؤں گا تو اس کے حصے کے لئے اور تو کچھ باقی نہیں ہے یہ دستار اور پوشاک جو پہنے ہوئے ہوں یہ بھی کھو بیٹھوں گا اور تن پر کپڑا نہ رہے گا" اس لئے وہ شخص صبر کر کے مکان چلا گیا۔ مجھے یقین ہے اگر ناظرین اس قصے واقعاتِ چین کا مقابلہ کریں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ میں بہت زیادہ غلطی پر نہیں ہوں۔

دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ دول عظام آپس میں خفیہ سازشیں اور اتفاق کر لیتی ہیں جسے وہ تدبر و پالیسی کے نام سے پکارتی ہیں اور اس طرح باہم تصفیہ ہو جاتا ہے۔ کہ اگر تم فلاں ملک لوگے تو ہم اس کے مقابلے میں فلاں حصہ لیں گے اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیں گے"

اس واقعے کے ثبوت میں عبدالرحمٰن خاں نے آگے چل کر روس اور انگلستان کی پیش قدمی کے واقعات پیش کئے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اسی انداز سے گورنمنٹ روس نے اولاً حکومت بخارا اور ان صوبجات کو جو کہ سرحد افغانستان

پر دریائے جیحوں کے شمال و مغرب میں واقع ہیں اپنے اثر و حفاظت میں لیا اور آخرش انھیں ہضم کر لیا دوسری جانب گورنمنٹ ہند نے اُن تمام صوبجات پر جو کہ جنوب و شرق اور جنوب و مغرب میں واقع ہیں اور زمانہ قدیم سے حکومت افغانستان کے تھے اپنا اثر جما لیا۔"

غرض کہ قیام سمرقند میں عبدالرحمٰن خاں نے برطانوی اور روسی سیاست کا نہایت عمیق مطالعہ کیا اور آئندہ چل کر عبدالرحمٰن خاں اپنے عہد حکومت میں انگلستان اور روس کے ساتھ ہر بات میں سوچ سوچ کر معاملہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں حکومتوں کے مرض جوع الارضی کو وہ اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی اغراض شہنشاہیت سے واقف تھے۔

عبدالرحمٰن خاں کی مراجعت کابل | دوسری برطانوی افغانی جنگ میں شیر علی خاں کابل سے بھاگ کر روسی سرحد پر روسی امداد کا منتظر تھا۔ اسی انتظار میں اس کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد یعقوب خاں پسر شیر علی خاں نے دب کر انگریزوں سے صلح کر لی لیکن باشندگان افغانستان انگریزوں سے راضی نہ تھے انھوں نے انگریزی سفیر کو مع عملے کے قتل کر کے سفارت خانے کو لوٹ لیا اور یعقوب خاں نے اپنی مجبوری ظاہر کر کے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا یہ تمام واقعات روسی اخبارات کے ذریعے امیر عبدالرحمٰن خاں کے کانوں تک پہنچے اور بعض روسی اخبارات نے اپنے مقالات افتتاحیہ میں عبدالرحمٰن کی توجہ واقعات افغانستان کی طرف مبذول کرائی اور نہایت واضح الفاظ میں لکھا کہ عبدالرحمٰن خاں کو چاہئے کہ موقع کو غنیمت سمجھ کر تخت کابل کے لئے قسمت آزمائی کریں۔ علاوہ ازیں روسی مدبرین نے عبدالرحمٰن خاں کو ترغیب دی کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

غرض کہ تین دن سوچنے کے بعد عبدالرحمٰن خاں نے افغانستان لوٹنے کی تیاریاں کیں۔ اور خدا پر توکل کر کے روس سے افغانستان کو روانہ ہوئے۔ روسی گورنمنٹ نے عبدالرحمٰن کو پچیس ہزار نقد اور دو سو بندوقیں دیں، اُن کے پاس دو لاکھ روپے کی رقم پہلے سے موجود تھی جو انھوں نے کفایت شعاری سے اپنے وظیفے میں سے جمع کی تھی۔ جب عبدالرحمٰن خاں حدود افغانستان میں داخل ہوئے تو تمام افغانی سردار

عبدالرحمٰن خاں کے جھنڈے کے تلے جمع ہوگئے ۔ اب عبدالرحمٰن خاں نے افغانی ترکستان اور بدخشاں پر قبضہ کرلیا ۔

۱۴ر مارچ ۱۸۸۰ء کو لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے وزیر ہند کو اس مضمون کا ایک تار دیا کہ "عبدالرحمٰن خاں جو دوست محمد خاں کا پوتا ہے اور افغانستان کا جائز وارث ہے اس کو افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی شخص نظر نہیں آتا جو حکومت کابل کو سنبھال سکے ۔"

چنانچہ لارڈ لٹن نے سرلیپل گریفن سفیر کابل کو ہدایات بھیجیں کہ عبدالرحمٰن خاں سے خط و کتابت کرکے اس کا مافی الضمیر معلوم کرو ۔ ان ہدایات کے مطابق سرلیپل گریفن نے عبدالرحمٰن خاں کو ایک خط روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا ۔

"اب یہ ہر ایک کو معلوم ہوگیا ہے کہ آپ افغانستان میں تشریف لے آئے ہیں ۔ اس لئے خفیہ قاصد کے ہاتھ یہ خط آپ کو بھیجا جاتا ہے تاکہ آپ ہمیں اپنے مافی الضمیر اور ارادوں سے آگاہ کریں ۔"

سرلیپل گریفن کا قاصد عبدالرحمٰن خاں کا جواب لے کر واپس آیا اور تمام کیفیت عبدالرحمٰن خاں کی برطانوی سفیر کو بتائی ۔ اب برطانوی سفیر نے عبدالرحمٰن خاں کو ایک اور تاکیدی خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ "جلد سے جلد آکر تخت کابل سنبھالو" اس کے جواب میں عبدالرحمٰن خاں نے برطانوی سفیر سے مندرجہ ذیل سوالات دریافت کئے ۔

۱۔ افغانی عملداری کے حدود کیا ہوں گے ؟

۲۔ قندھار بھی افغانی حکومت میں شامل کیا جائے گا یا نہیں ؟

۳۔ کیا کوئی یورپین سفیر یا انگریزی فوج افغانستان میں رہے گی ؟

۴۔ کیا سلطنت برطانیہ کے کسی دشمن کی مدافعت اور اس سے مقابلہ کرنے کی حکومت کابل سے امید کی جائے گی ؟

۵۔ سلطنت برطانیہ شاہ افغانستان اور اس کے وطن کو کیا کیا فائدہ پہنچانے کا وعدہ کرتی ہے ؟

۶۔ ان فوائد کی عوض حکومت برطانیہ شاہ افغانستان سے کیا چاہتی ہے؟
سر گریفن نے عبدالرحمٰن کے سوالات کا جو جواب لکھا تھا وہ یہ تھا۔

"چونکہ برٹش گورنمنٹ کے نزدیک بیرونی سلطنتوں کو حق نہیں ہے کہ افغانستان میں مداخلت کریں مزید برآں روس و ایران نے اقرار کیا ہے کہ افغانستان کی معاملات میں ہر قسم کی سیاسی دست اندازی سے باز رہیں گے اس لئے ظاہر ہے کہ فرمانروائے کابل سوائے انگریزوں کے اور کسی طاقت سے سیاسی تعلقات نہیں رکھ سکتا ہے۔

باقی افغانی حکومت کے حدود کے متعلق مجھے یہ کہنے کہ ہدایت ہوئی ہے کہ کل صوبہ قندھار ایک علیحدہ حاکم کے ماتحت کیا گیا ہے ہرات اور بقیہ افغانستان پر آپ اپنی سلطنت قائم کر سکتے ہیں حکومت برطانیہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرے گی۔

حکومت برطانیہ اور حکومت افغانستان دونوں متعلق سلطنتوں میں معمولی اور دوستانہ ربط و ضبط کی آسانی کے لئے دونوں حکومتوں کے اتفاق سے ایک مسلمان ایجنٹ کا سلطنت برطانیہ کی طرف سے کابل میں رہنا مناسب سمجھا جائے گا۔

۲۲ جون ۱۸۸۰ء کو عبدالرحمٰن خاں نے سر لیپل گریفن کو ایک مختصر جواب تحریر کیا۔ اس میں صاف اور واضح الفاظ میں قندھار کی علیحدگی پر ناراضگی ظاہر کی۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن خاں نے کابل کی طرف پیش قدمی کی اور چارہ کار میں داخل ہوا عبدالرحمٰن خاں کی کثیر التعداد فوج دیکھ کر انگریز پریشان ہوئے اور کابل میں ایک دربار منعقد کر کے تخت کابل عبدالرحمٰن خاں کے سپرد کیا اور اس موقع پر سر لیپل گریفن نے مندرجہ ذیل تقریر کی۔

چونکہ واقعات کی رفتار سے سردار عبدالرحمٰن خاں کے لئے ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے جو گورنمنٹ کی خواہشات اور امیدوں کے مطابق ہو اس لئے گورنمنٹ برطانیہ وندوائسرائے ہند خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے سردار عبدالرحمٰن خاں نبیرہ امیر دوست محمد خاں والا مرتبت کو امیر کابل تسلیم کیا۔ گورنمنٹ کے لئے یہ ایک بڑا خوشی اور اطمینان

کا موقع ہے کہ تمام سرداروں قبیلوں نے خاندان بارکزئی کے ایک ایسے نامور رکن کو پسند کیا جو مشہور سپاہی اور دانا تجربہ کار شخص ہے ان کے خیالات حکومت برطانیہ کی طرف نہایت ہی دوستانہ ہیں اور جب تک کی اُن کی حکومت سے یہ ظاہر ہوتا رہیگا کہ اس قسم کے خیالات ان کے دل میں جاگزیں ہیں حکومت برطانیہ ان کی ضرور امداد کریگی"

۲۹ جولائی ۱۸۸۰ء کو وائسرائے ہند کا برطانوی فوجی افسروں کو کابل میں ایک مراسلہ اس مضمون کا ملا کہ انگریزی فوج نے بمقام میوند ایوب خاں سے شکست کھائی ہے اس لئے وہاں کمک بھیجنی چاہئے۔ میوند کے معرکے کے بعد عبدالرحمن اور سر لیپل گریفن کی باقاعدہ کانفرنس ہوئی جس میں امیر عبدالرحمن خاں نے سفیر موصوف سے حکومت برطانیہ کی باضابطہ تحریری دستاویز مانگی کہ حکومت برطانیہ عبدالرحمن خاں کی امارت کو تسلیم کرتی ہے چنانچہ چند روز بعد سر لیپل گریفن نے وائسرائے کا ایک مراسلہ اس مضمون کا پیش کیا تھا۔

وائسرائے اور گورنر جنرل با جلاس کونسل کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ حکومت برطانیہ کے بلانے پر آپ کابل کی طرف روانہ ہوئے، اس لئے آپ کے دوستانہ خیالات اور ان فوائد کا لحاظ کرکے جو آپ کو مستقل سلطنت قائم ہونے سے سرداروں اور رعایا کو حاصل ہوں گے، حکومت برطانیہ آپ کو امیر کابل تسلیم کرتی ہے۔

غرضیکہ چند روز کے بعد عبدالرحمن خاں نے انگریزی فوجوں کی واپسی کا مکمل انتظام کر دیا۔ اور فوجی افسروں کو رخصت کیا۔

عبدالرحمن خاں کی تخت نشینی کے وقت افغانستان کی حالت

عبدالرحمن خاں جس وقت تخت کابل پر بیٹھے اس وقت افغانستان کی حالت ہر پہلو سے گری ہوئی تھی ایک طرف دعویداران حکومت کی کثرت تھی، دوسری طرف فوج کی حالت بہت ہی بری تھی تیسری طرف خزانہ خالی تھا اس پر مستزاد یہ کہ تمام افغانستان ملاؤں اور سیدوں کے اشاروں پر چلتا تھا، یا بالفاظ دیگر تمام افغانستان پر ملاؤں اور سیدوں کی حکومت تھی، ان حالات میں عبدالرحمن خاں کو تخت کابل پیش کیا گیا تھا۔ عبدالرحمن خاں اپنی تزک میں ان دشواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لوگوں کو خیال ہوگا کہ جس روز سے مجھے تخت ملا اسی دن سے میرے آرام و خوشی کا زمانہ شروع ہوا لیکن یہ صحیح نہیں برخلاف اس کے اسی دم سے میری آزادی رخصت ہوئی اور دقت و دشواری و تردد ات و تفکرات اور رنج و الم میں زیادتی ہوگئی۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ اپنے والد اور چچا امیر اعظم کے زمانۂ حکومت میں بھی میں معاملات حکومت میں دخیل تھا اور ان میں حصہ لیتا تھا لیکن تمام ذمہ داری ان کے سر تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جتنی انسان ترقی کرتا ہے۔ اتنی ہی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور تفکرات زیادہ ہوتے ہیں۔ ہمارا مذہب سکھاتا ہے کہ روز قیامت خداوند کریم کے روبرو ہر شخص اپنے افعال کا ذمہ دار ہوگا۔ لیکن بادشاہ صرف اپنے ہی افعال کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ وہ اپنی رعایا کے امن و آسائش کے بھی جواب دہ ہوں گے، جسے کہ خداوند تعالے نے ان کے سپرد کیا ہے یہ سوچ کر کہ قیامت کے دن اپنی رعایا کی حفظ وامان کے لئے جوابدہ ہونا پڑیگا اور یہ خیال کرکے کی میرے ملک کی حالت کس قدر ابتر تھی میں نہایت افسردہ و غمگین ہوا۔

تمام واقعات اور ملک کی حالت دیکھکر مجھے خیال ہوتا تھا کہ تمام انتظام درست کرنا اور قبضہ کرنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اور اس کا تو خواب و خیال نہ تھا کہ اس رحمن الرحیم کی امداد سے افغانستان میری حکومت کے زمانے میں اتنے تھوڑے عرصے میں ایسی عجیب غریب ترقی کریگا جیسی کہ اس نے اب کی ہے .... میں نے ہمت نہ ہاری اور اس وعدے پر بھروسہ کیا جو کہ خدا اپنے کلام پاک میں اپنے رسول سے فرماتا ہے۔ والصابرين في البأساء والضراء وحين البأس اولٰئك الذين صدقوا واولٰئك هم المتقون۔ غرضکہ اگر میں اس مصیبت اور بدبختی کا ذکر کروں جو ملک پر طاری تھی تو اس کے بیان کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ اس لئے صرف اختصار کے ساتھ بیان کروں گا۔ کہ میری تخت نشینی کے وقت ملک کی کیا حالت تھی۔

اس کے بعد عبدالرحمٰن خاں نے اپنی تزک میں سلسلہ وار ان تمام خرابیوں کا ذکر کیا ہے کہ جنکا تخت نشینی

کے وقت۔ ان کو مقابلہ کرنا پڑا۔

۱۔شاہی عمارات اور دفاتر حکومت کا نہ ہونا۔

۲۔سرکاری خزانے کا خالی ہونا۔

۳۔اسلحہ وسامانِ حرب کا فقدان۔

۴۔طوائف الملوکی۔یعنی ہرات میں ایوب خاں کی حکومت تھی اور قندھار پر شیر علیخاں نامی ایک سردار قابض تھا۔

۵۔عوام الناس کے دلوں میں بادشاہ کی عزت بالکل نہ رہی تھی مقدمات اورعدالت میں دستور کے مطابق ہر شخص شاہ کے سامنے عرض دمعروض کرسکتا تھا۔اس سہل طریقے سے بعض وقت درخواست کرنے والا شاہ کی ڈاڑھی اور دستار پکڑ لیتا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ اس دستار وریش کی قسم میری فریاد سنو۔

۶۔امراء اور درباری تہذیب وآداب مجلس سے بالکل عاری تھے۔جب کسی جشن کے موقع پر شیرینی دربار میں تقسیم ہونے کیلئے آئی،توسب درباری اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔اور اس چھینا جھپٹی میں بعض لوگوں کے کپڑے بھی پھٹ جاتے تھے۔

۷۔جہالت تمام ملک میں چھائی ہوئی تھی امورِ سلطنت میں مفید مشورہ دینے والے مشیروں کا فقدان تھا بعض وقت مشیرانِ حکومت کا مشورہ مضحکہ انگیز ہوتا تھا۔عبدالرحمٰن خاں اپنی تزک میں ایک جگہ اپنے صلاح کاروں کا ایک مشورہ نمونے کے طور پر لکھ کر دکھاتے ہیں۔

"ایک مرتبہ روٹی وغلہ بازار میں نہایت گراں فروخت ہونے لگا اور قحط کا خوف پیدا ہوا میرے مشیر کاروں نے جن سے کہ میں نے اس وقت رائے لی نہایت زور سے صلاح دی کہ غلہ فروشوں کے کان ان کی دکانوں کے دروازوں پر کیلوں سے جڑ دئے جائیں وہ ڈر کر ضرور غلہ کا نرخ ارزاں کردیں گے۔اس روز سے آج تک میں نے کسی معاملہ میں ان مشیروں سے مشورہ نہیں لیا ہے۔

۴۔ ہمسایہ سلطنتوں کی طرف سے مجھے ہر وقت خطرہ رہتا تھا وہ اس لئے کہ یہ سلطنتیں خود سر سرداران، قبائل کو بغاوت پر آمادہ کرتی رہتی تھیں۔ غرضکہ مشکلات و تردد ات کے موقع پر کسی ملک کی محض حفاظت کرنا ہی مشکل ہو جاتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ ملک ترقی کرے لیکن میرے دور میں افغانستان نے وہ ترقی کی ہے جس کا مجھ کو خود خیال و گمان تک نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ذمہ داری کے احساس نے مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ایک طرف تو میں نہایت الحاح وزاری کے ساتھ خدا کی درگاہ میں دعا مانگتا ہوں، اور دوسری طرف نہایت خلوص کے ساتھ امور سلطنت کی تدبیریں کرتا ہوں۔ خدا کا فضل تھا کہ اس نے ملک کو تباہی سے محفوظ رکھا۔ ورنہ ملک تباہی کے اعلیٰ ترین اسباب صرف موجود ہی نہ تھے بلکہ ترقی کے تمام ذریعے تنزل کی سب سے نیچی سطح پر پہونچ گئے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے وجود میں ہی شک تھا۔ لیکن قادر مطلق نے میری دردمندانہ دعاؤں کو سن لیا اور میں افغانستان میں امن وامان قائم رکھنے میں کامیاب ہوا۔

حکومتِ افغانستان کی تنظیم

عبدالرحمن خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد ان مشکلات کے باوجود جو افغانستان کی شاہراہ ترقی میں حائل تھیں سر توڑ کوششیں کر کے ملک کی حکومت کی از سر نو تنظیم کی وہ اس طریقہ پر کہ تمام ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر صوبہ کو حکومتی اعلاے کے نام سے موسوم کیا۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حکومتیٔ اعلائے سمت مشرقی
۲۔ حکومتیٔ اعلائے سمت جنوبی
۳۔ حکومتیٔ اعلائے سمت فراہ
۴۔ حکومتیٔ اعلائے سمت میمنہ

انتظامی سہولیت کے خیال سے عبدالرحمن خاں نے ان صوبوں کے علاوہ افغانستان کے بڑے بڑے شہروں اور ان کے مضافات کا انتظام اس طرح سے کیا کہ ہر ایک شہر کو مع اس کے ملحقات کے ولایت کے نام سے موسوم کیا۔ اور چار حکومتی اعلائے کے علاوہ پانچ ولایتیں قائم کیں جن کے

نام یہ ہیں -

۱- ولایت کابل

۲- ولایت قندھار

۳- ولایت ہرات

۴- ولایت بلخ

۵- ولایت قتاغان

حکومتی اعلائے پر گورنر اور ولایتوں پر نائب گورنر متعین کیے - علاوہ ازیں ہر صوبے میں عدالتی اور فوجی محکمے نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیے ہر صوبہ میں از سر نو مندرجہ ذیل عہدہ دار روانہ کیے - ان کی تفصیل حسب ذیل ہے

۱- گورنر مع عملہ خود

۲- قاضی مع کوتوال عملہ ضروری

۳- سپہ سالار افواج مع فوجی سکرٹری اور اراکین محکمہ پاسپورٹ

۴- قافلہ باشی یعنی وہ حاکم جو مسافروں کے باربرداری وغیرہ کے جانوروں کا انتظام کرتا ہے -

۵- افسر مال جو تمام صوبہ کی مالیات کا منتظم ہوتا تھا -

غرضکہ ان نئے انتظامات کے بعد عبدالرحمن خاں نے تمام سرداران قبائل اور عام رعایا کے نام احکام بھیجے جن میں ان لوگوں سے استدعا کی گئی کہ آپس میں محبت کا برتاؤ رکھیں اور امن وامان کے ساتھ رہیں - اور آخر میں عبدالرحمن خاں نے سرداران قبائل کو یقین دلایا کہ اگر یہ لوگ حکومت کے احکامات کی پوری پوری تعمیل کریں گے تو ان کو حکومت کی طرف سے انعام واکرام دیا جائیگا -

ان تمام انتظامات کے بعد عبدالرحمن خاں نے محکمہ مخبری " قائم کیا - جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ تمام سرداران قبائل عمال حکومت اور شورش پسند ملاؤں اور پیروں کی روزانہ کارروائی سے مطلع رہے - یہ محکمہ اس قدر باقاعدہ اور منظم شکل میں تھا کہ عبدالرحمن کو ہر سردار اور ملا کی نقل وحرکت اور ارادوں سے مکمل واقفیت تھی -

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ عبدالرحمن خان کی تخت نشینی کے وقت حکومت کا خزانہ بالکل خالی تھا۔ اب عبدالرحمن خاں نے محکمۂ مال کی درستی کی طرف توجہ کی، وہ اس طریقے پر کہ سرکاری ٹکسال قائم کراکے افغانی سکہ ڈھلوایا۔ مزید برآں عبدالرحمن خاں نے اپنے اہل کاروں احکامات بھیجے کہ جس قدر ملک میں سونا چاندی ملے اس کو حکومت کے لئے خریدیں، اور جن لوگوں پر گذشتہ حکومت کا قرضہ ہے وہ وصول کریں، جب محکمۂ مال کی اصلاح اس حد تک پہونچا دی کہ حکومت کا انتظام اچھی طرح چل سکے تو اس کے بعد عبدالرحمن خاں نے محکمہ فوج کی اصلاح کی۔ سب سے پہلے جبریہ فوجی خدمت کا دستور جو گذشتہ امیرانِ کابل کے عہد میں جاری تھا، اس کو منسوخ کردیا۔ اب فوجی خدمت کے لئے صرف وہ آدمی لیا جانے لگا۔ جو اپنی مرضی سے یہ خدمت اختیار کرے، اور اس کے ساتھ اس چیز کا لحاظ کیا جانے لگا کہ آیا امیدوار جسمانی قویٰ کے اعتبار سے تنومند اور چست ہے کہ نہیں؟ پھر پرانی چھاؤنیوں کی اصلاح کرکے بعض اہم مقامات پر نئی چھاؤنیاں قائم کیں اور ان میں سپاہیوں کے لئے شفاخانے اور مدرسے قائم کئے۔

محکمہ فوج کی اصلاح کے بعد عبدالرحمن خاں نے ملک کی تمام سڑکیں درست کرائیں اور مسافروں کی حفاظت کے لئے محافظین مقرر کئے۔ تاکہ بلاخوف خطر لوگ سفر کرسکیں، الغرض ان کے انتظامات کی وجہ سے ملک میں ایک اچھی فضا ہوگئی اور لوگ ایک حد تک امن و امان سے رہنے لگے۔ لیکن ابھی تک بعض قبائل اپنی شورش پسندی کو نہ چھوڑتے تھے، موقع پاکر بغاوت کردیا کرتے تھے۔

بغاوتیں اور ان کا انسداد

عبدالرحمن خاں کے زمانے میں جو بغاوتیں ہوئیں ان میں سے بعض معمولی تھیں اور بعض بہت ہی خطرناک تھیں جو دو تین سال تک جاری رہیں۔ ان بغاوتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ ۱۸۸۱ء میں جاہل ملاؤں نے قندھار کے عام لوگوں کو بہکایا اور مذہبی رنگ دے کر عبدالرحمن خاں کے خلاف بغاوت کرائی کیونکہ ملا لوگ سردار ایوب خاں کے حامی تھے اور ایوب خاں ہرات اور قندھار میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا لیکن باغی لوگوں کو سخت ناکامی ہوئی

۲- غلزئی بغاوت جو تقریباً دو سال تک جاری رہی۔
۳- ۱۸۸۸ء کی بغاوت جو محمد اسحٰق خاں والئی ترکستان نے کی تھی۔
۴- ہزارہ جات کی بغاوت جو ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۳ء تک رہی۔

ان بغاوتوں کے اسباب وعلل کیا تھے؟ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱- پہلا سبب ملاؤں اور سرداران قبائل کی مطلق العنانی تھی اول الذکر اپنے آپ کو پیغمبر اور آخر الذکر شہزادے تصور کرتے تھے۔ غلزئی ملا اور خوانین اس بارے میں سب قبائل سے سبقت لے گئے تھے۔

۲- عبدالرحمٰن خاں نے غلزئی باغیوں کے سردار کو گرفتار کرکے قید کردیا تھا جس کی وجہ سے اس کے احباب حکومت سے ناخوش تھے۔

۳- ملا مشک عالم کی گرفتاری بھی بغاوتوں کی باعث بنی۔ یہ وہ شخص تھا جو لوگوں سے جبراً مال وصول کرتا تھا اس جرم میں عبدالرحمٰن خاں نے اس کو گرفتار کیا۔ جس کی وجہ سے اس کے پیرووں نے علم بغاوت بلند کیا۔

۴- پیر اور ملا جو تقریباً حکومت کی آمدنی کا نصف وصول کرتے تھے۔ اب عبدالرحمٰن خاں نے ان کے وظائف بند کردئے جس کی وجہ سے وہ لوگ مشتعل ہوئے اور انھوں نے عوام الناس کو بھڑکا دیا۔

لڑائیاں | جب عبدالرحمٰن خاں تخت نشین ہوا۔ اس وقت تمام ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ وہ اپنی فوجی قابلیت سے اس طوائف الملوکی کو دور کرکے تمام افغانستان کو ایک جھنڈے کے ماتحت لایا۔ ان لڑائیوں میں حسب ذیل معرکے مشہور ہیں۔

۱- سردار ایوب خاں جو اپنے آپ کو ہرات اور اس کے مضافات کا حاکم خود مختار سمجھتا تھا۔ اور متعدد بار عبدالرحمٰن خاں کی فوجوں سے لڑا۔ آخر شکست کھا کر ایراں میں جا کر پناہ گزیں ہوا اور وہاں سے اُسے انگریزوں نے لاکر ہندوستان میں بمقام راولپنڈی ٹھہرایا۔

۲۔ سید محمود باشندہ علاقہ کنسرہ سے بھی عبدالرحمن خاں کو لڑنا پڑا کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو شاہی خاندان میں سے شمار کرتا تھا۔ اس نے علاقہ کنسرہ میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا تھا۔ اور لوگوں کو عبدالرحمن خاں کے خلاف بھڑکا کر شاہی فوجوں پر حملہ کیا اور بری طرح شکست کھائی۔ آخرش مجبور ہو کر ہندوستان بھاگ آیا

۳۔ میر یوسف علی سردار روشن وشغنان نے روسیوں سے ساز باز شروع کیا۔ وہ خفیہ طور پر روسی گورنمنٹ سے معاملات طے کر کے اس کی ماتحتی میں جانا چاہتا تھا اس سلسلہ میں روسی سیاحوں کی دعوت کی۔ جس میں یہ خیال ظاہر کیا۔ کہ "میں چاہتا ہوں کہ زیر سیادت حکومت روس رہوں" اس خفیہ سازش کی خبر مخبروں نے عبدالرحمن خاں کو دی۔ عبدالرحمانی فوجوں نے روشن شغنان پر حملہ کیا۔ تھوڑی سی لڑائی کے بعد یوسف علی خاں مع اپنے اہل وعیال کے گرفتار ہو کر کابل لایا گیا۔ عبدالرحمن خاں نے وہاں اپنا گورنر مقرر کر کے اس علاقہ کا تسلی بخش انتظام کیا۔

۴۔ شنواری قبائل جو جلال آباد کے قریب دو پہاڑیوں میں رہتے ہیں عبدالرحمن کا پیشہ ہمیشہ سے قافلوں کی لوٹ مار تھا۔ اور جو امیر ان کابل کے لئے ہمیشہ باعث تکلیف بنے رہے وہ علاقہ کے باشندوں کا مال ومتاع لوٹتے تھے۔ اور وہاں امن وامان کسی طرح قائم نہ ہوتا تھا۔ خود عبدالرحمن خاں نے شنواری سرداروں کو طلب کر کے گفتگو کی اور سمجھایا کہ خدا اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف ہے کہ تم دوسرے مسلمانوں کا مال لوٹو۔ باوجود اس دوستانہ گفتگو کے بھی انہوں نے اپنی روش کو نہ چھوڑا بقول شاعر ؎

گر دو صد سال کسی رنج دہی زحمت کوشش
مار و شنواری و عقرب نہ شود دوست تر

ان لوگوں کی فہمائش کے لئے ۱۳۰۳ھ میں عبدالرحمن خاں نے شنواری قبائل پر حملہ کیا اور ہمیشہ کے لئے ان شورش پسندوں کا خاتمہ کر دیا۔

۵۔ دلاور خاں والی میمنہ نے خود امیر کی سند حاصل کی ہوئی تھی اور اپنی خود مختاری کا اعلان

کیا۔ اور لوگوں کو بغاوت کے لئے آمادہ کر کے شاہی افواج پر حملہ کیا اس کے سر کچلنے کے لئے عبدالرحمن خاں نے اس پر فوج کشی کی۔ اور دلاور خاں کو شکست فاش دی اور اُسے گرفتار کر کے کابل لایا۔ اور والیٔ میمنہ اپنے ایک معتمد علیہ کو مقرر کیا۔

۶۔ حکومت برطانیہ اور افغانستان نے حکومت روس کے ساتھ ایک سرحدی کمیشن ۱۸۸۵ء میں مقرر کیا تھا، اس مقصد کے لئے کہ روسی اور افغانی سرحد کا فیصلہ کرے برطانوی سفارت کا افسر اعلیٰ سر پیٹر لمسڈن تھا، مندرجۂ ذیل وجوہ کی بنا پر روسی عبدالرحمن خاں سے ناخوش تھے۔

۱۔ روسی حکومت افغانوں کے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات دیکھ کر عبدالرحمن خاں سے ناخوش تھی،،

۲۔ روسیوں کو بُرا معلوم ہوا کہ افغانوں کو حد بندی کی جرأت کیوں ہوئی۔

۳۔ روسی چاہتے تھے کہ تصفیہ حدود صرف روسی و افغانی نمایندے بل کر آپس میں کرتے انگریزوں کو دخل دینے کی کیا ضرورت تھی۔

۴۔ عبدالرحمن خاں کی وائسرائے ہند کے ساتھ ملاقات نے روسیوں کو عبدالرحمن خاں سے اور ناخوش کر دیا۔

غرضکہ ان وجوہ کی بنا پر اور مزید بر آں روسی پالیسی کی وجہ سے جس کے مطابق روسی مشرق میں پیش قدمی کر رہے ہیں روسی فوج کا ایک دستہ علاقہ پنجدہ کی طرف بڑھا، اور افغانی علاقے پر قابض ہو گیا۔ انگریز آخر وقت تک عبدالرحمن خاں کو یقین دلاتے رہے کہ روسی ایسی جرأت ہی نہیں کر سکتے اور اگر روسی پنجدہ پر قابض ہو گئے تو انگریز افغانوں کی مدد کے لیے تیار ہیں۔

لیکن باوجود ان مواعید و میثاق کے جب روسیوں نے پنجدہ پر قبضہ کر لیا تو انگریزوں نے کوئی مدد نہ کی۔ انگریزی سفارت کے لوگ روسی دستے کے حملہ کے وقت بھاگے اور افغانی مقابلہ پر ڈٹے رہے لیکن انگریزوں کے جھوٹے وعدوں کی بنا پر افغانی فوجوں کو شکست ہوئی اور روسی پنجدہ پر ہمیشہ کے لئے قابض ہو گئے۔

۷۔ کافرستان جو افغانستان کے شمال مغرب میں واقع ہے یہاں کے لوگ جہالت کی وجہ سے بہت ہی پست حالت میں تھے۔ ان میں بہت بُری رسمیں تھیں جن میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ اپنے ہمسایہ افغانوں سے گائیں لیکر مبادلے میں اپنی بیویاں دیتے تھے انہیں۔ بری رسوم کو زائل کرنے کیلئے عبدالرحمن خاں نے یہ کوشش کی کہ ان کو زبانی سمجھائیں۔ چنانچہ وہاں کے سرداروں کو طلب کیا۔ اور سمجھایا لیکن واپس جانے کے بعد ان کی عادت میں کوئی فرق نہ آیا۔ مزید برآں عبدالرحمن خاں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کیونکہ روسی پامیر کے قریبی علاقہ کو فتح کر چکے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کافرستان پر قبضہ جما کر اپنی پیش قدمی کا رخ افغانستان طرف کر دیں انھیں وجوہ کی بنا پر عبدالرحمن خاں نے موسم خزاں میں اس ملک پر حملہ کیا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں کافرستان میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اور لوگ گھروں میں بند رہتے ہیں۔

عبدالرحمن خاں کی فوجوں نے تمام کافرستان پر قبضہ کر لیا اور آہستہ آہستہ وہاں کے سب لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اس کے بعد عبدالرحمن خاں نے کافرستان کے باشندوں کو علاقہ نیمان میں منتقل کر دیا۔ اور افغانستان کے بعض قبائل کو کافرستان میں بسایا تاکہ پامیر کی طرف سے افغانستان کی اچھی طرح حفاظت ہو سکے۔

اگرچہ انگریزوں کو عبدالرحمن خاں کا کافرستان پر قبضہ ناپسند تھا لیکن عبدالرحمن خاں کی مدبرانہ پالیسی نے اس گتھی کو اچھی طرح سلجھا دیا۔

افغانستان کی حدود کا تصفیہ

افغانستان کے اندرونی انتظامات کے بعد سب سے مشکل مسئلہ عبدالرحمن خاں کے سامنے تصفیہ حدود افغانستان و روس و انگلستان تھا ۱۸۸۵ء میں انگریزی اور افغانی سفارتیں روسیوں سے افغانی اور روسی حدود کا مسئلہ طے کرنے گئیں لیکن روسیوں نے تصفیہ حدود سے انکار کر کے علاقہ پنج دہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دوسری بار اس مسئلہ کو سلجھانے کے لیے انگریزی افغانی اور روسی نمائندے جمع ہوئے افغانی اور روسی حدود کا تصفیہ اس طریقہ پر ہوا کہ روسیوں نے ذو الفقار خالی کر دیا۔ اور مرو چک دی اور افغانی سرحد متعین ہوئی عبدالرحمن خاں نے بھی اس

فیصلہ کو منظور کر لیا لیکن افغانوں اور روسیوں کے درمیان تیسری بار پھر تنازع ہوا آخر کار ۱۸۹۳ء میں سفارت ڈیورینڈ نے حدود کا ہمیشہ کے لئے تصفیہ کر دیا۔

دوسری طرف ہندوستان اور افغانستان کی حدود کا معاملہ ابھی تک طے نہ ہوا تھا اور انگریز آہستہ آہستہ افغانی علاقوں پر تصرف جماتے جاتے تھے چنانچہ عبدالرحمن خاں اس زیادتی کو دیکھکر چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ہو سکے حدود افغانستان و ہندوستان کا تصفیہ ہو جائے وائسرائے ہند نے جنرل رابرٹس کو اس خدمت کے لئے منتخب کیا۔ جنرل رابرٹس کی طرف سے افغانستان کے باشندوں کے جذبات بہت ہی مشتعل تھے۔ کیونکہ دوسری جنگ افغانستان کے بعد اس نے افغانوں پر وہ مظالم کئے تھے۔ کہ اس کا نام سن کر افغانستان کے لوگ اس پر لعنت بھیجتے تھے۔ اس لئے عبدالرحمن خاں کو یہ انتخاب پسند نہ تھا۔ آخر میں سر مارٹیمر ڈیورینڈ کی قیادت میں سفارت انگریزی تصفیہ حدود کے لئے آئی۔ سر مارٹیمر ڈیورینڈ انگلستان کے محکمہ خارجیہ کے سکرٹری تھے وہ معاملات افغانستان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور فارسی بھی بول سکتے تھے۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۳ء کو ڈیورینڈ سرحد افغانستان میں داخل ہوئے۔ اور نہایت شاندار طریق پر ان کا استقبال کیا گیا۔ کابل پہونچ کر افغانستان و ہندوستان کی حدود کا تصفیہ ہو گیا۔ اور مندرجہ ذیل سرحدی خط قرار پایا۔ چترال درہ بارو غل سے پشاور تک اور وہاں سے کوہ سیاہ تک، واخان، کافرستان اسمار مہمند، لالپورہ، وزیرستان کا ایک حصہ عبدالرحمن خاں کے قبضہ میں آیا اور اپنے باقی تمام حقوق یعنی بقیہ وزیرستان، باجور، بلند خیل، کرم آفریدی، سوات بنیر، دیر، چلاس چیائی، اور نوشین سے عبدالرحمن خاں کو دست بردار ہونا پڑا۔

اسی طرح بخیر و خوبی حدود افغانستان و ہندوستان کا فیصلہ ہو گیا۔ اور دونوں حکومتوں میں معاہدہ دوستی ہوا دونوں حکومتوں کے نمایندوں نے دستخط کرکے اس معاملہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا

عبدالرحمن خاں کی وائسرائے ہند سے راولپنڈی میں ملاقات	لارڈ ڈفرن ہی کے عہد میں عبدالرحمن خاں کا ارادہ تھا کہ وائسرائے ہند سے ملیں اور بالمشافہ گفتگو کرکے انگریزی و افغانی [illegible]

معاملات طے کریں۔ کیونکہ لارڈ ڈفرن کے عہد میں بعض انگریزی مدبرین کا خیال تھا کہ عبدالرحمن خاں کی دوستی پر یقین کرنا فضول ہے کیونکہ عبدالرحمن خاں نے ان لوگوں سے نہایت سختی کا برتاؤ کیا تھا۔ جنھوں نے جنگ ہائے افغانستان میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ ان شکوک کو رفع کرنے کے لئے عبدالرحمن خاں نے بہ نفس نفیس لارڈ ڈفرن سے بمقام راولپنڈی ملاقات کی۔ حکومت ہند نے نہایت شاہانہ طریقے پر بمقام راولپنڈی دربار منعقد کر کے عبدالرحمن خاں کا شاندار استقبال کیا۔ جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے راجہ نواب اور روالیان ریاست موجود تھے عبدالرحمن خاں نے اس دربار میں جو تقریر کی تھی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"میں اس نوازش اور توجہ کا نہایت مشکور ہوں جو وائسرائے اور ملکہ وکٹوریا نے میرے حال پر کی ہے اور اس نوازش کے عوض میں اپنی فوج اور لوگوں کے ساتھ جو خدمت سرکار دولتمدار چاہے کرنے کے لئے تیار ہوں اور چونکہ سرکار نے وعدہ کیا ہے۔ کہ اگر کوئی غنیم افغانستان پر چڑھے تو اس کے دفع کرنے میں مدد کرے گی۔ اس لئے ہمارا بھی فرض ہے۔ کہ استقلال کے ساتھ ہمیشہ سرکار عالی وقار کے ساتھ وفاداری کریں۔

اس دربار کے بعد وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ" بارہ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ جو عبدالرحمن خاں کو دیا جاتا ہے۔ حکومت ہند کی خواہش ہے۔ کہ اسکو بڑھا کر اٹھارہ لاکھ سالانہ کر دیا جائے۔

(باقی آئندہ)

مقرر

بادشاہ پور کی تحصیل میں آج صبح سے عجیب گھماگھمی کے آثار نظر آرہے ہیں، قصباتی "عمائدین" اور "معززین" اپنے اپنے گھروں سے نکل کر پانچ پانچ چھہ چھہ کی ٹولیوں میں آجارہے ہیں۔ دکاندار اور راہ گیر دوکانوں کے سامنے یا بیچ سڑک پر کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ لالہ رگھونندن سہائے انسپکٹر ڈاک خانہ نے آج صبح اس دنیا سے سفر کیا، یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کے اس کوچ کی فوری وجہ کیا ہوئی۔ لیکن قیاس یہی چاہتا ہے کہ وہ ان دو وباؤں میں سے ایک کا شکار ہوئے ہیں جو ہمارے ملک میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، یعنی ایک تو بد مزاج بیوی اور دوسرے ناقدر دان افسر۔

سُرگباشی لالہ جی کی ارتھی قصبہ کے باہر مکان میں لاکر رکھ دی گئی۔ کریا کرم ہوا، برہمنوں نے اشلوک پڑھے، دان پن کی آس لگائی۔ لڑکے نے آگ دی۔ پڑوسیوں نے اشاروں ہی اشاروں میں لالہ جی کی دولت اور اندوختے کی باتیں کی اور اب سب لوگ مع لالہ جی کے بڑے بیٹے کے تعزیت کے جلسے میں شرکت کرنے کے لئے چلے۔

لالہ جی کے ایک ماتحت بابو ماتا پرشاد متصدی صبح ہی سے منشی کریم الدین کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں۔ منشی جی خاص صفات کے آدمی ہیں۔ انگریزی میں مڈل تک پڑھے ہوئے ہیں۔ اردو فارسی میں پنجاب کے "منشی" تک تعلیم پائی ہے۔ بچپن میں کہانیاں شوق سے سنا کرتے تھے۔ شروع جوانی میں داستان گوئی کا شوق بھی رہ چکا ہے۔ غرض کہ ان سب صفات نے انھیں بادشاہ پور کا بہترین مقرر بنا دیا ہے۔ کیسا ہی موقع کیوں نہ ہو، کسی موضوع پر گفتگو کیوں نہ ہو رہی ہو کھدر کے پرچار سے لے کر صاحب کلکٹر بہادر کو ایڈریس دینے کی تجویز تک وہ ہر چیز پر بلا اطلاع اور بغیر جھجکے ہوئے تقریر کر سکتے ہیں۔ فن تقریر میں سوائے اس کے اور سے بھی کیا۔ ایک شعر شروع میں پڑھ دیا، ایک درمیان میں اور ایک خاتمے پر

اور بے کھٹکے جو باتیں ذہن میں آئیں یا دوسروں کی تقریروں سے مل سکیں، کہہ ڈالیں، چلو چھٹی ہوئی،
اس کے علاوہ دوسری حیثیتوں سے بھی اہلِ قصبہ کی علمی و ادبی خدمت بجا لاتے ہیں۔ کسی کے یہاں
ولادت کی خبر پائی اور چھٹی سے پہلے ہی مادہ تاریخ ڈھونڈھ نکالا، کوئی بیمار پڑا اور حالت مایوس کن ہوئی
اور انھوں نے مریض کے سرہانے بیٹھے بیٹھے "شغفر لہ"، "مغفور بادا"، "داخلِ خلد" وغیرہ وغیرہ
کے اعداد جوڑنے اور ملانے شروع کر دیے، ان کا یہ شوق اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اب انھوں نے
انسان کے متعلق ایک خاص نظریہ قائم کر لیا ہے، جس طرح درزی راہ چلتوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ
اس پر کون سا لباس سجے گا، یا انگریز بھرتی کرنے والا افسر ہر شخص کو فوج کی قابلیت کے نقطۂ نظر سے
دیکھتا ہے، اسی طرح ہمارے منشی جی ہر شخص کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کی کیا علمی خدمت کی جا سکتی ہے
ان کے نزدیک ہر شخص یا پیدا ہوا ہے، یا مرنے والا ہے، یا شادی کرنے والا ہے، یا اس کا تبادلہ ہونے
والا ہے اور ہر موقع کے لئے ان کے پاس تقریریں، تاریخی مادے، تہنیت کے اشعار، الوداعی ایڈریس
وغیرہ پہلے سے تیار رہتے ہیں۔ غرض کہ جلسہ ہائے تعزیت، جلسہ ہائے احتجاج، جلسہ ہائے خیر مقدم
سب میں ان کی بڑی مانگ ہے۔

جب بابو ماتا پرشاد پہنچے ہیں تو کریم الدین صاحب سو کر اٹھے ہی تھے۔ بابو جی نے ان کو دور ہی
سے للکارا، انھوں نے ادھر سے تو اشع کی، پوچھا "کیوں خیریت تو ہے؟" بابو جی نے کہا "ارے
منشی جی، انسپکٹر صاحب رحلت فرما گئے ہیں، مڈل اسکول میں جلسۂ تعزیت مقرر ہے۔ کوئی اہلکار یا
محرر مرتا تو ایسی بات نہ تھی لیکن یہ تو انسپکٹر کا معاملہ ہے، دو چار جملے کہہ کر ان کی ارواح کو ثواب پہنچا دو
بس تمھارا ہی انتظار ہے۔"

بھلا منشی کریم الدین جیسے حاضر دماغ، فی البدیہہ مقرر کو مزید تفتیشِ حالات کی کیا ضرورت تھی،
انھوں نے بس ایک مرتبہ اتنا کہا "ارے انسپکٹر صاحب مر گئے" اور وہ بھی اس انداز سے گویا ان کے
آج مرنے کا انھیں پہلے ہی سے یقین تھا اور مادۂ تاریخی یا تعزیتی تقریر ان کے پاس پہلے سے تیار موجود

تھی، منہ ابھی وہ دھویا نہ تھا، اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی، اس لئے کہ تعزیت کے جلسے میں مقرر کی صورت سے جتنی وحشت، اور افسردگی ظاہر ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ شیروانی پہنی اور پہلے ہی سے رونی صورت بنائے بابو جی کے ساتھ ہو لئے۔

راستے میں کہنے لگے "ارے یار ماتا! وہ انسپکٹر تو کچھ اچھا آدمی نہ تھا"، ماتا پرشاد نے جواب دیا "ارے منشی جی، اب ہم کو تم کو اس سے کیا مطلب، تم تو بس دو بول بھلائی کے کہہ دینا، باقی بھگوان جانے اور مرنے والے کا کرم۔"

مڈل اسکول پہنچے تو جلسہ جما ہوا تھا، صاحب منصف بہادر کرسی صدارت پر بیٹھ چکے تھے صف اول میں انسپکٹر پولیس، تحصیلدار، معزز زمینداران قصبہ اور لالہ جی مرحوم کے بڑے فرزند غم کی صورت بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔

منصف صاحب بہادر نے مختصر سی تقریر کی۔ منشی جی کو اشارے سے بلایا، یہ فوراً چبوترے پر جا کھڑے ہوئے، مجمع پر ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالی، دو ایک ٹھنڈی سانسیں بھریں اور داد فصاحت دینے لگے:۔

"صاحبان معزز!

گر بر نود سالہ بمیرد عجب نیست   ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

(اس شعر پر لالہ جی مرحوم کے فرزند و وارث جائز نے منشی جی کو گھور کر دیکھا لیکن وہ سمجھے نہیں)

"یہ آج کیسی اداسی چھائی ہے"، "آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمیں"، الٰہی یہ خواب ہے یا عالم بیداری"، "انچہ من بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب"، میری آنکھوں نے یہ آج کیا دیکھا، میرے کانوں نے کیا سنا، افسوس صد افسوس کہ وہ دنیا سے اٹھ جائے جو کل تک ہمارا یار وفادار تھا، وہ نوجوان وہ مستعد وہ کارکن جو اپنی سرکار کا نمک خوار، رعایا کا شفیق، افسروں کا رفیق، ماتحتوں سے خلیق اور ہر حیثیت سے لئیق تھا (قافیوں کا اثر دوبالا کرنے کے لئے منشی جی نے عینک اتاری اور شیروانی

کے دامن سے پونچھی ! میں کیسے یقین کروں کہ آج ہم سب نے اسے سپردِ خاک (نہیں لاحول ولا قوۃ) نذرِ آتش کر دیا ہے۔ کیسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ یوں تو خدا کے فضل سے ہماری تحصیل سراپا تکمیل میں سب ہی افسر اچھے ہیں فضلنا بعدکم علی بعض لیکن خدا بخشے لالہ نسارام ان میں فرد تھے، ایسے فرض شناس، ایسے کارکن عدالت کے دو دو بجے تک کام دیکھتے تھے۔ اور ان لوگوں کے جو رشوت دے کر اپنا کام نکالنا چاہتے تھے تو وہ جانی دشمن تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لالہ نسارام آنجہانی نے تنخواہ ملتے ہی اس کی ایک ایک پائی غریبوں اور مستحقوں کو بانٹ دی، اور جن جن بیواؤں اور یتیموں کی وہ دستگیری کرتے تھے، ان کی آہ و زاری سے آج چرخِ چہارم کا سینہ پرکینہ و دیرینہ مشبک ہو رہا ہے، بمصداق

ہوا غم سے مشبک سینۂ سنگ

وہ سب آپ صاحبان سن چکے ہیں، عیاں را چہ بیاں۔ مرحوم اپنے کام کے ایسے عاشق تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا عیش سب کچھ اسی کی نذر کر دیا تھا۔

اور " موتو قبل ان تموتوا " کے بمصداق اخیر دم تک شادی نہیں کی (یہاں لالہ جی کے فرزند نے پھر گھورا) افسوس ایسا دوست اب کہاں ملے گا۔ مجھے اس وقت ان کا چہرہ منڈی ہوئی داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں یاد آ رہی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، لالہ نسارام مرحوم، "پرمیشور تمھیں بیکنٹھ میں جگہ دے"، یہ کہہ کر منشی کریم الدین نے اس انداز سے چھت کی طرف دیکھا گویا مرحوم کی روح اس اجازت کے انتظار میں اب تک وہیں منڈلا رہی تھی۔

منشی صاحب کی فصاحت کا دریا زوروں سے لہریں لے رہا تھا، لیکن حاضرین میں کچھ سرگوشیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ان کی تقریر کے بعض جملوں کا اثر اچھا ہوا مثلاً "فضلنا بعضکم علی بعض" " موتو قبل ان تموتوا " والے جملوں پر مدرسے کے ہیڈ مولوی صاحب نے بڑے زور سے "حق ہے" کہا بعض لوگوں نے آنکھیں ملیں، رومال سے ناک صاف کی، لیکن اس تقریر کی بعض باتیں حاضرین کی سمجھ میں بالکل نہیں آئیں۔ مثلاً سب سے پہلی بات تو وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ منشی جی " مرحوم "، کا نام

بار بار "لالہ منسارام" کیوں بتا رہے ہیں۔ ان کا نام تو رگھونندن سہائے تھا، دوسرے ہر شخص جانتا تھا کہ مرحوم کی ساری عمر اپنی بیوی سے لڑتے گزری، ہمیشہ کھٹ پٹ ہوا کی پھر آخر منشی جی نے یہ کیوں کہا کہ "اخیر دم تک شادی نہیں کی" اور وہ بھی ان کے فرزند کی موجودگی میں! تیسری بات یہ ہے کہ لالہ جی آنجہانی کی ریش مبارک برسوں کے ریاض اور خضاب کی وجہ سے اچھی خاصی دراز و سرخ تھی، لیکن کریم الدین صاحب نے ان کی "منڈی ہوئی داڑھی" کی یاد میں تاسف کیا۔ غرض کہ یہ چند باتیں ایسی تھیں جنھوں نے سامعین کو ذرا پریشان کر دیا تھا، منصف صاحب نے کرسی صدارت کو کھسکا کر تحصیلدار صاحب کو متوجہ کیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سے کچھ کہا، چودھری علی بخش زمیندار و رئیس کو کسی نے ٹھوکا دیا۔ اس اثنا میں منشی کریم الدین صاحب کے بحر تکلم میں برابر موجیں اٹھتی رہیں، وہ نہ جھجکے نہ رکے نہ کچھ سمجھے۔ بلکہ سلسلہ تقریر پہلے سے زیادہ زور شور سے جاری رہا۔

"لالہ منسارام آنجہانی، اگرچہ قدرت نے تمھیں حسن ظاہری نہ دیا تھا، تمھاری رنگت کالی شکل روکھی نقشہ بھونڈا اور تمھاری باتیں تلخ تھیں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ اس بدنما غلاف کے اندر کیا اعلیٰ درجہ کا دل چھپا ہوا تھا اور . . . . . . اور . . . ."

لیکن اب حاضرین نے دیکھا کہ خود منشی کریم الدین صاحب کچھ سٹ پٹائے ہوئے ہیں، کبھی سر کھجاتے ہیں، کبھی کھانستے ہیں، کبھی عینک کو ناک کی نوک پر لا کر اس کے اوپر سے دیکھتے ہیں، کبھی پھر اسے اوپر کھسکا لیتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ہیں اور پہلی صف میں ایک کرسی پر جمی ہوئی ہیں۔ آخر کو ایسے گھبرائے کہ خاتمے کا شعر تو کجا بغیر جلسہ ختم کیے ہوئے جلدی سے چبوترے سے اتر آئے۔

جلسہ برخاست ہوا تو یہ بابو ماتا پرشاد کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے بہت غصے میں بھرے ہوئے تھے برس پڑے۔

"ک . . . ک . . . کیوں بابو ماتا پرشاد یہ کیا مذاق تھا، تم نے کہہ دیا کہ منسارام مرگیا ہے حالانکہ وہ کمبخت پہلی ہی صف میں بیٹھا ہوا مجھے برے تیوروں سے گھور رہا تھا، یہ کیا شرافت تھی تمھاری جو تم نے

مجھے اس طرح دھوکا دیا! "
بابو ماتا پرشاد سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی جواب دیا " ارے منشی جی تم سے کس نے کہا کہ لالہ منسا رام مر گئے لالہ رگھو نندن سہائے مرے ہیں سنا کہ نہیں لالہ رگھو نندن سہائے " مگر منشی جی کا غصہ کم نہ ہوا کہنے لگے " تم ہی نے تو مجھ سے صبح آ کر کہا کہ انسپکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے " بابو ماتا پرشاد نے زچ ہو کر اپنا ماتھا ٹھونک لیا " ارے برادر، لالہ رگھو نندن سہائے بھی تو آخر انسپکٹر ہی تھے نہ، لالہ منسا رام پولیس کے انسپکٹر ہیں، لالہ جی مرحوم ڈاک خانے کے انسپکٹر تھے۔ سمجھے کہ نہیں! واہ منشی جی واہ تم نے تو آج لٹیا ہی ڈبو دی، تعزیت کے جلسے کو مذاق بنا دیا، تب ہی تو میں حیران تھا کہ یہ آخر ہمارے منشی جی آج کس کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ واہ واہ واہ "
منشی کریم الدین ابھی اپنی غلطی کی ندامت سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ لالہ منسا رام جن کی روح کو بیکنٹھ کا پروانہ دے چکے تھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ان کی طرف آئے، تحصیلدار صاحب ان کے ساتھ تھے، کہنے لگے " آئیے منشی جی میں آپ کا تعارف کرا دوں، آپ ہی لالہ منسا رام انسپکٹر پولیس ہیں، جنھیں آپ اپنی تقریر کے زور سے بیکنٹھ بھیج رہے تھے، وہ بان نے روک دیا تو یہ واپس چلے آئے، ہا! ہا! ہا! ہا!!! " کریم الدین صاحب نے نادم ہو کر گردن جھکا لی، کچھ کہنے کو تھے کہ خود لالہ منسا رام بول اٹھے، بہت برہم تھے۔
" منشی صاحب یہ آج کا مذاق کچھ ٹھیک بات نہیں ہے سمجھے آپ، ایک مرے ہوئے شخص کے حق میں چاہے آپ کی تقریر اچھی ہو لیکن زندوں کے متعلق ایسی باتیں کرنا گویا ان کی ہتک کرنا ہے۔ آج کل کسی پولیس والے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رشوت نہیں لیتا، اس کی ہجو ملیح ہے، آپا خیال شریف میں اور کیوں جناب یہ میری صورت شکل کے متعلق آپ سے کس نے کہا تھا کہ گل فشانی کیجئے، " کالی رنگت " " روکھی شکل " " بھونڈا نقشہ " کیا سراپا بیان کیا ہے۔ آج بھرے مجمعے میں آپ نے میری توہین کی بندہ اسے بھولے گا نہیں "
یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اور مونچھیں مروڑتے ہوئے چل دئے۔

اس واقعہ کو دو مہینے گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں ایک دفعہ کریم الدین صاحب کے گھر سے چوری کا مال برآمد ہو چکا ہے لیکن عدم ثبوت کی وجہ سے بچ گئے۔ اب سنا ہے کہ ایک دن وہ حسبِ عادت نمک بنانے کے متعلق تقریر کر رہے تھے کہ لالہ منسا رام نے وارنٹ دکھا کر انھیں گرفتار کر لیا۔ صاحب منصف بہادر نے انھیں چھ ماہ کے لیے قید کی سزا دی، منشی کریم الدین صاحب کو جیل جانے کا اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اس بات کا کہ اپنی گرفتاری کا جو تاریخی مادہ انھوں نے نکالا تھا وہ اسے اپنے دوستوں کو بھی نہ سنا سکے۔

بادشاہ پور کے جلسے آج کل بغیر ان کے سونے پڑ گئے ہیں۔ (ماخوذ از چیخوف)

معرکہ سکون و عمل

جہادِ زندگی میں کیوں تلاش ہو سکوں کی — اے تغافل آشنا! یہاں عمل کا کام ہے
خرابِ آرزو نہ ہو یہ باتیں ہیں جنوں کی — عمل کی رزم ہے، جہاں جس کا نام ہے

یہ لفظ ہے مگر نہیں وجود اس کا دہر میں — ہزار اس کو ڈھونڈیے کبھی نہ آئے گا نظر
نہ بحر میں، نہ بر میں، نہ دشت میں، نہ شہر میں — عبث نہ کھو عزیز جاں اس کے غم میں بےخبر!

امیر ہو، غریب ہو، فقیر ہو کہ شاہ ہو — ہر ایک اس کا شیفتہ ہے بزم کائنات میں
ذرا بھی عقل و ہوش ہو تو کیوں کوئی تباہ ہو — کسے میسر آئی ہے یہ نعمت اس حیات میں

فراغِ خاطر و سکونِ قلب جس کا نام ہے — یہ سامعہ فریب ہے، یہ باصرہ نواز ہے
ہر ایک اس کی جستجو میں آج تیز گام ہے — کسے خبر کہ مرحلہ یہ سخت جاں گداز ہے

ملے گی بعد مرگ ہی اگر یہ چیز مل سکی
کہ گوشۂ قبور میں ملی ہے یہ جسے ملی
پھر اس دوروزہ زندگی میں اس کی جستجو ہو کیوں
ہزار حیف کھوئی تو نے اپنی زندگی جو یوں

سکوت کہتے ہیں جسے ہو ایک نام موت کا
وہی رہا، وہی جیا کہ جس نے کام کچھ کیا
کیا نہ جس نے کچھ یہاں وہ خوار ہے تباہ ہو
یہاں سکون کی آرزو بھی ہم نفس گناہ ہو

یہ شورشیں یہ ولولے ہی زندگی کی جان ہیں
اٹھ اور کر کے کچھ دکھا جو ہمتیں جوان ہیں
سکوت اور سکون میں کہاں مزا حیات کا
نہیں تو چھوڑ معرکہ یہ بزم کائنات کا

فریبِ راحت و سکوں نہ کھا جو کامگار ہو
نہ دامِ یاس بیدلی میں آ جو ہوشیار ہو
شراب زہر دار ہے یہ آدمی کے واسطے
عذاب خوشگوار ہے یہ زندگی کے واسطے

نہ فکر بدلتے کی کر، نہ خوف مشکلات کا
ترا ثباتِ عزم خود کفیل ہو نجات کا
جو سعی و محنت و عمل ترے رفیق راہ ہیں
یہ نارسائیوں کے وہم دل میں خواہ مخواہ ہیں

بہادروں سے چھین لی ہیں اس نے ہمتیں
مبارزوں کی توڑ دی ہیں معرکوں میں قوتیں
خیالِ راحت و سکوں عدوئے عقل و ہوش ہے
جو اس کی دھن لگی تو پھر ہوش ہو نہ جوش ہے

کیا ضعیف اس نے عزمِ رستمِ نبرد کو
اسی نے دی جگہ خیالِ گرم و سرد کو
اسی نے کھوئیں عظمتیں کلاہ تاجدار کی
اسی نے ڈھائیں طاقتیں سپاہ بیشمار کی

یہ رہزنِ حیات ہو، یہ دشمنِ نشاط ہے
قوی ہو عزمِ دل! اگر تو غم کی کیا بساط ہے
سنبھل! کچھ اپنی قوتِ نہاں کو آشکار کر
بہا کے اپنا خون اس زمیں کو لالہ زار کر

شذرات

اس مہینے کے وسط میں مولانا شوکت علی صاحب جامعہ میں تشریف لائے۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے ایک تعزیتی جلسے میں مولانا کو ان کے چھوٹے بھائی اور ملت اسلامی کے خادم و مخدوم مولانا محمد علی مرحوم کا پرسا دیا۔ مولانا نے دردانگیز لہجے میں مرحوم کے آخری وقت کے حالات سنائے کہ کس طرح انھوں نے مرض کی شدت کی حالت میں ملک و قوم کی خاطر جان توڑ کر محنت کی اور اسی میں جان دے دی۔ مولانا نے اختصار کے ساتھ اس جوش عقیدت کا ذکر کیا جو مرحوم کی ذات سے تمام ممالک اسلامی کو تھا اور جس کا اب ان کی وفات کے بعد اظہار ہو رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ عالم اسلام کے مفکرین کی رائے ہے کہ بیت المقدس کو اسلام کا تمدنی اور روحانی مرکز بنائیں اور اس غرض سے وہاں ایک بہت بڑا دارالعلوم مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار کے طور پر قائم کریں۔

مولانا نے اس محبت کا ذکر کرتے ہوئے جو مرحوم جامعہ ملیہ سے رکھتے تھے۔ فرمایا کہ وہ آخری وقت میں بھی اپنی اس محبوب درسگاہ کو نہیں بھولے اور یہ وصیت کر گئے کہ میرا پورا کتب خانہ جامعہ ملیہ کو دے دیا جائے۔ آخر میں مولانا نے ایک بے بہا ہدیہ جو وہ بیت المقدس کے مسلمانوں کی طرف سے جامعہ کے لئے لائے تھے امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب کو اور انھوں نے شیخ الجامعہ صاحب کو عطا فرمایا۔ یہ ایک مصر کا چھپا ہوا کلام مجید ہے جس کی جلد پر بیت المقدس کے مشہور یتیم خانے میں ہاتھی دانت کا نہایت خوشنما کام بنایا گیا ہے۔ جب مولانا محمد علی مرحوم آخری بار بیت المقدس تشریف لے گئے تھے تو انھوں نے وہاں کے یتیم خانے میں یہ کام دیکھا تھا اور فرمائش کی تھی کہ اس نمونے کا ایک مجلد کلام مجید جامعہ ملیہ کو بھیجا جائے۔ اب ان کی وفات کے بعد یہ فرمائش پوری ہوئی اور مرحوم کی محبت اور بیت المقدس کے مسلمانوں کی اخوت کی یہ نشانی ہم تک پہنچی۔

---

۲۲ اپریل کو مولانا شفیع داؤدی صاحب کے اہتمام میں مسلمانان ہند کے نمائندوں کا ایک جلسہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر منعقد ہوا کہ مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار کے مسئلے پر غور کرے۔ جلسے کی صدارت جناب ڈاکٹر انصاری صاحب نے فرمائی۔ بہت سی تجویزیں پیش ہوئیں اور ان پر بحث کی گئی۔ آخر میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ مرحوم کی بہترین یادگار یہ ہوگی کہ جامعہ ملیہ کی تکمیل اور توسیع کی کوشش کی جائے اور اس میں علوم اسلامی اور سیاسیات کی تعلیم کا ایک خاص شعبہ کھولا جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر ڈاکٹر انصاری صاحب اور سیکریٹری ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب منتخب ہوئے۔ مولانا شوکت علی صاحب نے وعدہ فرمایا کہ اپریل اور مئی میں سارے ہندوستان کا دورہ کرکے محمد علی میموریل فنڈ کے لئے چندہ کریں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شفیع داؤدی، ڈاکٹر [illegible] اور دوسرے حضرات نے بھی پوری طرح مدد دینے کا وعدہ کیا۔

اس کے علاوہ دہلی کے اصحاب کی کمیٹی منتخب ہوئی کہ مرحوم کی مقامی یادگار کے طور پر ایک مسافرخانہ اور پبلک لکچر ہال تعمیر کرنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرے۔ اس کے صدر خان بہادر عبدالرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ اور سیکریٹری محمد جعفری صاحب ایڈیٹر ملت منتخب کئے گئے۔ دہلی کے معزز تاجر عبدالخالق صاحب نے اس کام کے لئے دو ہزار روپئے کے چندے کا اعلان فرمایا۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب نے یہ اعلان کیا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے مشورے اور امداد سے مولانا مرحوم کی سوانح عمری جامعہ ملیہ کی طرف سے لکھوائی جائے گی۔

خدا کرے یہ تمام تجویزیں خیال سے عمل میں آسکیں اور مرحوم کی ایسی یادگار قائم ہوجائے جو ان کی قابل فخر شخصیت اور ان کی ملکی اور قومی خدمات کی یاد کو تمام ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھے۔

انشاء اللہ جامعہ کا محمد علی نمبر جون کے آخر تک شائع ہوگا۔ دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نمبر کے لئے بعض چیزوں خصوصاً تصویروں کی ضرورت تھی جن کا حاصل ہونا بغیر مولانا شوکت علی کی امداد کے ناممکن تھا۔ اب مولانا کی توجہ سے یہ مشکل حل ہوجانے کی امید ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ جامعہ کے ہر دلعزیز معلمین حافظ فیاض احمد صاحب، شفیق الرحمن صاحب قدوائی اور دیوداس صاحب گاندھی قید فرنگ سے رہا ہو کر آگئے اور عنقریب اپنے خاموش تعمیری کام میں مصروف ہوجائیں گے۔ جامعہ کے چند مخلص اور پرجوش طلبہ بھی جو یہاں سے رخصت ہو کر ملک کی سیاسی خدمت کرنے کے لئے چلے گئے تھے اب واپس آگئے ہیں۔ ان حضرات کا خیر مقدم جامعہ کے لوگوں نے جس گرمجوشی سے کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ایثار اور حب وطن کی وجہ سے سب کے دلوں میں ان کی محبت اور عزت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ان حضرات کی یہ وفاداری بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ انہوں نے قید کی مصیبت جھیلنے کے بعد رہا ہوئے تو بجائے اس کے کہ پہلے اپنے گھروں کو جاتے سیدھے جامعہ پہنچے۔ سچ پوچھئے تو جامعہ والے اپنا گھر اسی طالب علموں اور استادوں کی برادری کو سمجھتے ہیں جو دین، علم اور خدمت کے رشتے میں مربوط ہے اور جس کی محبت دنیا کی ہر چیز کی محبت سے بڑھ کر دل میں گھر کر لیتی ہے۔ بظاہر جامعہ میں ابھی کچھ بھی نہیں مگر کوئی کشش ایسی ضرور ہے کہ جو ایک بار یہاں آگیا اس کا جی جانے کو نہیں چاہتا۔

ہمارے پاس الہ آباد کے مسلم ہوسٹل کا میگزین ریویو کے لئے آیا ہے۔ اس کے اردو اور انگریزی کے حصوں میں طلبہ کے مضامین دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں اب صحیح علمی اور ادبی مذاق پیدا ہو رہا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ کامیابی کے ساتھ جاری رہے۔ اگر ہوسٹل کے منتظمین پوری مدد کریں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔

کچھ دن ہوئے مسلم ہوسٹل کی مجلس امنا کی طرف سے پچاس ہزار روپے کا اپیل کیا گیا تھا۔
مسلم ہوسٹل کی اہمیت سے صوبہ متحدہ کے مسلمان خوب واقف ہیں۔ اس صوبے کی بہترین یونیورسٹی
کے مسلمان طالب علموں کا یہی ایک گھر ہے۔ اس میں مطلق مبالغہ نہیں کہ اس کی چار دیواری کے اندر
جتنے قابل اور ہونہار مسلمان نوجوان رہا کرتے ہیں۔ صوبہ متحدہ میں کیا سارے ہندوستان کے کسی
ایک دارالاقامہ میں نظر نہ آئیں گے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ قومی سرمائے سے قائم کیا
گیا ہے اور اس کا انتظام زیادہ تر ملت اسلامی کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ان معدودے چند
اداروں میں سے ہے جن میں صحیح قومی تعلیم کا مرکز بننے کی پوری صلاحیت ہے۔ اگر مسلمانوں میں تعلیم کی
سچی قدر کا مادہ ہو تو اس ہوسٹل کو ترقی دے کر آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں کا ہمسر بنا دیں۔

ہم ہوسٹل کی مجلس امنا کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہندوستان میں کسی ادارے اور خصوصاً کسی
تعلیمی ادارے کی امداد کے لئے اپیل کرنا کافی نہیں، ضرورت اس کی ہے امنا اور قدیم طلبہ میں سے کچھ
با اثر لوگ ایک وفد لے کر سارے صوبے کا دورہ کریں۔ اگر کچھ حضرات ایک مہینہ اس کام میں صرف
کر دیں تو پچاس ہزار کی رقم صرف ہوسٹل کے قدیم طلبہ سے وصول ہو سکتی ہے جن کی تعداد صوبے میں
ہزار پندرہ سو سے کم نہیں۔ اور جن میں اکثر خدا کے فضل سے خوش حال ہیں۔

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے ناآشنا تھے۔ آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں۔ پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشی مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اس کو پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گنٹھیا، ورم۔ درد۔ پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بے مثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۹ دہلی

جرمنی کے بہترین

یعنی

دنیا کے بہترین ٹائپ

Bijou

"بجو"

ہلکے سفری ٹائپ رائٹر کا جدید ترین نمونہ

جو سہولتیں اس مشین میں ہیں کسی دوسرے ٹائپ رائٹر

میں نہیں، نہایت خوبصورت پائدار وزن کل ۴ سیر

قیمت انگریزی مبلغ [illegible]

قیمت اردو مبلغ [illegible]

"آئیڈیل"

اسی کارخانے کی بڑی مشین۔ دفتر کے لئے

اسے رکھئے اور اپنے دفتر کی کارکردگی میں

۵۰ فیصدی اضافہ کر لیجئے۔

Ideal

قیمت انگریزی مبلغ [illegible]

〃 〃 اردو مبلغ [illegible]

صحت کی تیر بہدف گولیاں

OKASA

جرمنی کی جادو اثر طبی ایجاد

کون ہے جس نے بجدیہ کی شہرہ آفاق، ہر پروفیسران درناف اور اشٹنکاہ کی حیرت انگیز تدابیر جراحی کا حال نہ سنا ہو۔ صرف بعض غدودوں کے بدل دینے (بوڑھے سے بوڑھا آدمی تندرست جوان بن جاتا ہے) ان تدابیر پر دنیا ہنوز انگشت بدنداں تھی کہ جرمنی کے نامور ماہر طبیعات ڈاکٹر لاہوسین (ایم۔ ڈی) پروفیسر برلن یونیورسٹی نے اپنی اس دوا کے انکشاف سے ہلچل پیدا کر دی ہے۔ جو کثیر المصارف عمل جراحی کے عذاب اور خطرہ میں ڈالے بغیر از سر نو صحت کو بحال کر دیتی ہے۔

اس عظیم الشان انکشاف پر اوکاسا کمپنی (برلین) کو بین الاقوامی نمائش پیرس اور اطالوی نمائش (فلورنس) میں گرینڈ پرکس طلائی تمغے اور مشہور و معروف "کراس آف آنر" بطور سند ملی ہیں۔ اسناد کی نقلیں ہمارے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔ جھریاں اور سپید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اضمحلال چڑچڑا پن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے۔ اس سے پہلے، کہ بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے۔ یہ دوا ہر دوا فروش کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں

Sole Agency **OKASA** Co; Ltd; (Berlin)
22, Apollo Street, P.O. Box No. 396,
Bombay.

نمبر ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ۔ ڈی

نمبر ۱۱	بابتہ ماہ اپریل سنہ ۳۱ع	جلد ۱

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (صہ)

کیا اُردو شاعری محض نقالی ہے؟

(بسلسلہ گزشتہ)

بمرور زمانہ اردو زبان منجھتی اور صاف ہوتی گئی۔ قدما کی پیہم کوششوں اور متواتر عرق ریزیوں کی بدولت تھوڑی ہی مدت میں اردو نے ہر قسم کے نازک خیالات اور لطیف جذبات کے ادا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لی۔ فارسی کا چرچہ روز بروز کم ہوتا گیا۔ شعرائے نامدار جو پہلے ریختہ گوئی کو کسر شان سمجھتے تھے اب زیادہ تر اردو ہی میں شاعری کرنے لگے۔ ان کی غیر معمولی کوشش و توجہ نے اردو شاعری کو فارسی کا ہم مقابل بنا دیا۔ یہ اردو شاعری کی ترقی کا چھٹا زینہ تھا۔ ملک کی عام زبان اردو ہو گئی تھی۔ فارسی زبان کے نکتوں اور خوبیوں کے سمجھنے والے بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے۔ اس لئے شعرا گیسوئے اردو کے سنوارنے میں پوری توجہ صرف کرنے لگے۔ حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے پسند و مذاق کا رُخ فارسی سے ہٹ کر ریختہ کی طرف مائل ہو گیا تھا اور سرآمد شعرا اپنے ریختہ کے کلام کو فارسی کا حریف سمجھنے لگے تھے۔

قائم۔

قائم جو کہے ہیں فارسی یار   اس سے تو یہ ریختہ ہی بہتر

مصحفی۔

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ   اب ہے اشعار ہندوی کا رواج

غالب۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی   گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

الغرض اُردو شاعری کے پیچھے مختلف مدارج تھے جن کو طے کر کے وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں ریختہ کی چار قسمیں قرار دی ہیں (۱) اول یہ کہ ایک مصرع ہندی ہو

اور دوسرا فارسی۔ (۲) دوم یہ کہ نصف مصرع ہندی ہو اور نصف فارسی۔ (۳) سوم یہ کہ اس میں فارسی کا عنصر حرف و فعل کی صورت میں ہو (۴) چہارم یہ کہ اس میں فارسی کی ترکیبیں پائی جائیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ مذکورہ بالا چہار ارتقائی زینے یا میر صاحب کی قائم کردہ چار قسمیں بالترتیب زمانے کے بعد دیگرے معرض وجود میں نہیں آئی تھیں یعنی ہر زینے کے طے ہونے کے لئے علٰحدہ علٰحدہ زمانہ معین نہ تھا۔ یہ سمجھنا سخت غلطی ہوگی کہ ابتداءً کچھ مدت تک فارسی شعرا ہندی یا اردو کے منفرد الفاظ اپنے اشعار میں داخل کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک وہ اردو کے فقرے فارسی اشعار میں استعمال کرتے رہے۔ پھر ایک زمانے تک ایک مصرع فارسی کا اور دوسرا اردو کا کہتے رہے اور اسی طرح بالترتیب زمانہ بقیہ مدارج طے ہوئے۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ قدیم ریختہ کی غزلوں میں یہ تمام قسمیں مخلوط شکل میں عام طور پر ملتی ہیں۔ اوپر جو کچھ تجزیہ کیا گیا ہے وہ محض اصول ارتقا کی تشریح کے لئے ہے۔ ارتقا کے لغوی معنے تو چڑھنے اور ترقی کرنے کے ہیں لیکن اصطلاحاً یہ لفظ ڈارون کے اس مشہور و معروف نظریے کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے مطابق دنیا کی ہر شے۔ ہر مخلوق۔ ہر ایجاد۔ ہر تحریک مختلف مدارج و مراحل طے کرکے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ ڈارون کے نظریے کے مطابق ارتقا میں ترقی معکوس بھی شامل ہے۔ ارتقا کا قدم ہمیشہ آگے ہی نہیں بڑھتا بلکہ کبھی پیچھے بھی ہٹتا ہے اور کبھی ایک ہی حالت و مقام پر کچھ دنوں تک قائم رہتا ہے۔ ترقی کے مدارج ہر حال میں بالترتیب زمانہ طے نہیں ہوتے بلکہ بوقت واحد کئی مراحل طے ہو سکتے ہیں لیکن کسی مسئلے کی تحقیق و تشریح کے لئے مختلف عناصر کی تحلیل اور مختلف مدارج کا احصا ضروری امر ہے۔ نظریہ ارتقا کی ان تمام خصوصیات کے مدنظر اردو شاعری کی ابتدا۔ اٹھان اور عروج کے جو مدارج اوپر بیان ہوئے وہ ترتیب زمانی کی قید سے آزاد ہیں تاریخی لحاظ سے ایک ہی زمانے میں مختلف قسم کے اشعار کہے گئے۔ تاہم اس علمی تحلیل و تجزیہ (سائنٹفک انالیسس) سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ابتداءً اردو شعرا کی علٰحدہ کوئی جماعت نہ تھی جو فارسی شاعروں کے نقش قدم پر چلتی تھی بلکہ ریختہ کی داغ بیل انھی لوگوں کی ڈالی ہوئی ہے جو فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ اردو محض بول چال کی زبان تھی جس سے کاروباری اور آپس کے

لین دین کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ ابھی وہ ضبط تحریر کی شرمندہ احسان نہیں ہوئی تھی۔ نثر کا تو کہیں پتہ ہی نہ تھا کیونکہ وہ بہت بعد کی چیز ہے۔ اردو ادب کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ اول اول جب فارسی شعرا نے اپنے کلام میں ایک آدھ لفظ یا فقرے یا مصرعے اردو کے داخل کئے تو یہ ضرور تھا کہ وہ فارسی رسم خط میں لکھے جائیں۔ ہر شخص جو اپنے کلام یا تحریر میں کوئی غیر زبان کا لفظ داخل کرتا ہے تو اسے اپنے ہی رسم خط میں لکھتا ہے لیکن اُردو زبان کے لئے تو اس وقت تک کوئی رسم خط مقرر ہی نہیں ہوئی تھی اس لئے اردو الفاظ کا فارسی رسم خط میں لکھا جانا ایک فطری امر تھا۔ علاوہ بریں جن شعرا نے اساتذہ کے کلام کا اُردو میں ترجمہ کیا یا تفریح طبع کی غرض سے ایک آدھ ریختہ کی غزلیں لکھیں وہ بجز فارسی کے اور کسی رسم الخط سے واقف ہی نہ تھے لہذا انھوں نے اردو اشعار کے لئے وہی طرز تحریر اختیار کیا جس سے وہ مانوس تھے۔ الغرض اُردو زبان کے لئے فارسی حروف تہجی، فارسی نظام ہجائی، فارسی رسم خط اور فارسی طرز تحریر کا استعمال فطری اصول اور زمانے کی ضروریات کے تحت عمل میں آیا۔ اس پر تقلید و نقالی کا الزام معترض کی کم سوادی و کوتہ نظری کی دلیل ہے۔

سوائے اس کے جن حالات کے تحت اُردو شاعری وجود پذیر ہوئی۔ جس فضا و ماحول میں اس نے نشو و نما پائی جن واقعات کے زیر اثر وہ پروان چڑھی۔ ان تمام امور کا فطری تقاضا یہی تھا کہ وہ نحوی و عروضی اصول کے لحاظ سے فارسی شاعری کے نقش قدم پر چلے۔ اسی کے اوزان و بحور اختیار کرے اور نہ صرف تشبیہات و تلمیحات میں بلکہ خیالات و جذبات میں بھی اسی کی ہم رنگ ہو۔ اور ہندی شاعری کی خصوصیات سے بیگانہ رہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی زینے کی سراغ رسانی کے لئے ہمیں امیر خسرو کے عہد یعنی چودھویں صدی عیسوی کے اوائل تک سفر کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ طویل سفر زحمت و دشواری سے خالی نہیں ہے اس لئے اگر ہم اپنی تحقیق اس زمانے سے شروع کریں جب سے ریختہ کے دیوان اور کلام عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ اردو شاعری کی ابتدا انھیں لوگوں سے ہوئی ہے جو فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ سب سے قدیم ریختہ کا دیوان جو اب تک دستیاب ہوا ہے سلطان قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کا ہے وہ اکبر اعظم کا ہمعصر تھا اور ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک برسر حکومت رہا۔

وہ فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں کا زبردست شاعر تھا۔ فارسی میں قطبؔ شاہ اور دکھنی میں معانیؔ تخلص کرتا تھا۔ اس کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ جس نے ١٦١١ء سے ١٦٢٥ء تک حکومت کی نہ صرف علم پرور معارف نواز فرمانروا تھا بلکہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کا تخلص فارسی میں ظل اللہؔ اور دکھنی میں قطب شاہ تھا۔ اس خاندان کا تیسرا فرمانروا سلطان عبداللہ قطب بھی جو ١٦٢٥ء سے ١٦٧٢ء تک سریر آرائے سلطنت رہا اپنے پیشروؤں کی طرح فارسی اور ریختہ دونوں کا نامور شاعر تھا اور دونوں میں عبداللہؔ تخلص کرتا تھا۔

دہلی میں اردو شعرگوئی نے عالمگیر کے زمانے سے رواج پایا اور یہاں بھی اس جانب سب سے پہلے فارسی شعرا ہی نے توجہ کی۔ اس وقت موسوی خاں فطرتؔ۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ۔ مرزا عبدالغنی قبولؔ وغیرہ فارسی کے نامور شعرا تھے جو کبھی کبھی اردو میں دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ مرزا محمد رضا امیدؔ۔ میر مرتضیٰ قلی خاں فراقؔ۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ وغیرہ فارسی ہی کے سرآمد شاعر تھے جنھوں نے کبھی کبھی ریختہ میں طبع آزمائی کی علاوہ بریں شاہ نجم الدین آبروؔ۔ شیخ ظہور الدین حاتمؔ۔ محمد شاکر ناجیؔ۔ شیخ شرف الدین مضمونؔ۔ مرزا جان جاناں مظہرؔ جو ریختہ کے آبائے قدیم کہلاتے ہیں فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ ہندوؤں میں بھی رائے سرب سنگھ دیوانہؔ۔ لالہ لچھمی نراین شفیقؔ۔ مہاراجہ چندو لال شاداںؔ وغیرہ فارسی کے زبردست شاعر تھے اور اردو شاعری میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ کے متعلق مؤلف "گلشن ہند" کا بیان ہے کہ وہ وضع مغلیت پر مرتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک رائے سرب سنگھ ہی نہیں بلکہ تمام ہندو امرا۔ روسا شرفا اور تعلیم یافتہ لوگ مغلیہ وضع قطع۔ مغلیہ تہذیب و تمدن۔ مغلیہ طرز رہائش کے شیفتہ و دلدادہ تھے بہرحال جب ثابت ہو چکا کہ ابتدا اردو شعرا کی کوئی الگ جماعت نہ تھی بلکہ فارسی شعرا ہی گاہ بگاہ ریختہ کی ایک آدھ غزل لکھ لیا کرتے تھے تو یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قسم کے اشعار میں یکساں خیالات۔ جذبات اور مضامین ادا کیے جائیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب دو چشموں کا منبع ایک ہی ہو تو دونوں کے پانی کی نوعیت و خاصیت ایک طرح کی ہوگی۔ فارسی اور اردو اشعار دونوں ایک ہی دماغ کی پیداوار۔ ایک ہی ذہن کا نتیجہ فکر۔ ایک ہی قلب کے جذبات و کیفیات کا آئینہ تھے اس لیے ان کے مضامین و اسلوب

بیان کی ہم رنگی و یکسانی ایک قدرتی بات تھی اگر کوئی شخص اپنے خیالات کا اظہار ایک ایسی اجنبی زبان میں کرنا چاہے جو نمو یافتہ ہو اور جس کے نحوی و عروضی اصول و ضوابط مقرر ہو چکے ہوں تو اس کو اس زبان کے اصول و قواعد کی پیروی کرنی ہوگی۔ لیکن اردو بولی کوئی ادبی زبان نہ تھی اور نہ اس کے اصول و قوانین مرتب ہوئے تھے۔ اس لئے جب اول اول فارسی شعرا نے اسے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا آلہ بنایا تو ان کو فارسی ہی کے علم بیان و معنی کی پابندی کرنی پڑی اور انھوں نے فطری طور پر وہی وزن وہی بحریں۔ وہی ردیف۔ وہی قافئے۔ وہی تشبیہیں۔ وہی استعارے۔ وہی تلمیحیں۔ وہی تمثیلیں۔ وہی کنائے اور وہی محاورے اختیار کئے جو فارسی شاعری کے لوازمات تھے اور جن سے نہ صرف شعرا بلکہ ہندوستان کا بچہ بچہ واقف تھا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ اردو شعرا نے فارسی کی نقالی کی، ٹھیک ویسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے قلی قطب شاہ نے قلی قطب شاہ کی آرزو نے آرزو کی۔ مضمون نے مضمون کی۔ مظہر نے مظہر کی۔ لچھمی نراین نے لچھمی نراین کی اور سرب سنگھ نے سرب سنگھ کی تقلید و نقالی کی جو بالکل مہمل اور بے وقوفی کی بات ہو۔ اردو شاعری جن حالات و واقعات کے تحت معرض وجود میں آئی ہے اُن کے مدنظر اس پر تقلید یا نقالی کا الزام عاید ہو ہی نہیں سکتا۔ اردو شاعری فارسی سے پیدا ہوئی اسی کے دامن میں تربیت پائی اسی کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا۔ اسی سے تغذیہ و تقویت کا مواد حاصل کیا۔ جو شخص جس معاشری فضا اور سماجی ماحول میں تربیت پاتا ہے وہ اس کے جذبات و خیالات اور عادات و خصائل سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح اردو شاعری کے لئے جو فارسی شاعری کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاکر پروان چڑھی اپنی مادر مہربان کے خصائص اختیار کرنا ایک قدرتی فعل تھا۔

اگر بفرض محال فارسی کو اردو سے ماں بیٹی کا تعلق نہ ہوتا بلکہ دوسری دیسی زبانوں کی طرح اردو بھی فارسی سے بیگانہ ہوتی تو بھی اردو شعرا فارسی ہی کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے۔ کیونکہ فارسی ہندوستان میں سب سے مہذب۔ شستہ۔ پختہ۔ ترقی یافتہ۔ وسیع۔ حاکم و مقبول زبان تھی۔ سنسکرت زبان مدت ہوئی مردہ و متروک ہو چکی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس سے بیگانہ و ناآشنا تھے۔ اس کے حریم ناز میں صرف چند برہمن علما کو باریابی حاصل تھی۔ بھاشا کی شاعری ہندو و مسلمان امرا کی سرپرستی میں ترقی کے مدارج

طے کر رہی تھی اور اپنے سرپرستوں کے پسند و مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے محکومانہ حیثیت سے فارسی کا رنگ و اثر قبول کرنے پر مجبور تھی۔ اس کا معیار فارسی بہت ادنیٰ و پست تھا۔ اردو شعرا ادنیٰ و پست معیار ترک کرکے فارسی کے اعلیٰ و ملوکانہ معیار کو پیش نظر رکھنے میں بالکل حق بجانب تھے۔ ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی بھاشا سے ناآشنا اور فارسی کا دلدادہ تھا کیونکہ مہذب و اعلیٰ سوسائٹی میں عزت و وقعت حاصل کرنے کا ذریعہ فارسی تھی۔ یہاں ایک سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دور کے بعد کے اردو شعرا جن کی جولانی طبع کا واحد میدان ریختہ گوئی تھی اور جو فارسی شاعری میں کافی مہارت نہیں رکھتے تھے انھوں نے بھی فارسی ہی کا اتباع کیوں کیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے جس زمانے میں فارسی شعرا کبھی کبھی تفنن طبع کی غرض سے ریختہ کی چند غزلیں لکھ لیا کرتے تھے اسی وقت اردو شاعری کا پورا مال مسالہ تیار ہو گیا تھا اور عبوری دور کے ختم ہوتے ہوتے اردو شاعری نے مستحکم ہیئت اور مستقل صورت اختیار کر لی تھی جس میں تغیر و تبدل دشوار تھا۔ علاوہ بریں ارتقائی مدارج جلد سے جلد طے کرکے ترقی کی معراج کمال حاصل کرنے کے لئے کسی اعلیٰ نمونہ کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا۔ فارسی کا رواج کم ہونے پر بھی ہیئت اجتماعیہ کی دلچسپیاں بھاشاؤں سے کہیں زیادہ فارسی ہی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ فارسی کے شاعر اگرچہ کم پیدا ہونے لگے لیکن اردو کے ساتھ اگر کوئی شاعر فارسی اشعار بھی کہہ لیتا تو معاشرہ کی نگاہ میں اس کو بڑی عزت و وقعت حاصل ہوتی تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک شعرا اپنی فارسی سخن سنجی پر ناز کرتے آئے تھے چنانچہ آزردہ۔ شیفتہ اور غالب اس بنا پر بڑی وقعت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں کہ وہ کلام ریختہ کے علاوہ فارسی دواوین بھی بطور یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ جب آخر آخر وقت تک فارسی کی اتنی قدر و منزلت تھی تو اردو شعرا بجز فارسی شاعری کے اور کسے اپنا خضر راہ بناتے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ شعرائے مابعد نے فارسی شاعری کو مشعل راہ کیوں بنایا۔ وہ آزادانہ نئی نئی راہیں نکالنے میں کیوں نہ مشغول ہو گئے اور بغیر تقلید کے صرف اپنے ذاتی تجربے و مشاہدے کی بنا پر کیوں نہ مدارج ارتقائی طے کئے؟ واضح رہے کہ کسی زبان کی ترقی کسی قوم کی تمدنی ترقی کے مشابہ ہوتی ہے۔ دنیا کی متمدنہ قومیں دو قسم کی ہیں، ایک وہ جو دور توحش سے نکل کر دور حجری۔ دور فلزی۔ دور شبانی۔ دور زرعی

دور حرفتی - دور صنعتی - دور کارخانہ جاتی وغیرہ طے کرکے ہزاروں سال کے بعد تہذیب و تمدن کے اعلیٰ زینے پر پہنچی ہیں - دوسری وہ قومیں ہیں جو ممالک متمدنہ کے مہذب دستور و آئین کو پیش نظر رکھ کر تھوڑے ہی عرصے میں تمام ارتقائی مراحل طے کرکے شائستہ بن گئی ہیں - اول الذکر کی مثال انگریزی یا جاپانی قوم ہے - امریکی قوم ثانی الذکر کی بہترین مثال ہے - اس قوم نے ۱۷۷۶ء میں اپنی آزادی کا اعلان کیا - جمعیۃ ملیہ قائم کی دستور مرتب کئے - زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت میں ترقی کی اور ڈیڑھ صدی میں تمام اقوام عالم پر سبقت لے گئی - اگر یہ قوم ممالک متمدنہ کے دستور و آئین کو اپنا رہبر نہیں بناتی بلکہ ابتدا سے "ارتقا" کا ایک ایک زینہ طے کرنے لگتی تو آج وہ زیادہ سے زیادہ ایک نیم مہذب قوم ہوتی - زبان کی ترقی کا بھی یہی حال ہے بعض زبانیں تمام تمدنی مدارج کے ساتھ ساتھ اپنے ارتقا کے مراحل طے کرتی ہیں اور صدیوں بلکہ قرنوں کے بعد پختہ و شستہ بنتی ہیں - مثلاً انگریزی زبان نے کئی صدیوں کی لگاتار ترقی کے بعد اپنی موجودہ ہیئت اختیار کی ہے - بالعموم ہیئت اجتماعیہ ترقی کے جس زینے پر ہوتی ہے اسی زینے پر اس کی مادری زبان بھی رہتی ہے - اور جوں جوں معاشری معاملات ترقی کرتے ہیں اور جذبات و خیالات میں لطافت پیدا ہوتی ہے ویسے ویسے زبان بھی شستہ اور پختہ ہوتی جاتی ہے لیکن بزمی زبانیں اس قاعدے کی پابند نہیں ہوتیں - اُردو زبان جن قوموں کے تصادم سے پیدا ہوئی تھی وہ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ زینے پر پہنچ چکی تھیں ان کے خیالات میں لطافت اور جذبات میں پاکیزگی پائی جاتی تھی جن کے اظہار کے لئے زبان کا شستہ اور پاکیزہ ہونا لازمی تھا اردو بولی لین دین کی ضرورتوں کو تو پورا کرسکتی تھی لیکن نفیس و نازک خیالات لطیف و پاکیزہ جذبات اور ادق و پیچیدہ علمی مسائل کے اظہار کی اس میں صلاحیت نہ تھی اس لئے شعرائے ریختہ کو لامحالہ ایک ترقی یافتہ زبان کا سہارا ڈھونڈنا پڑا - انھوں نے فارسی کا اعلیٰ نمونہ پیش نظر رکھ کر ارتقائے لسانی کے تمام منازل حیرت انگیز سرعت کے ساتھ طے کرلئے اور دو ہی صدیوں میں اُردو کو اس اعلیٰ زینے پر پہنچا دیا جہاں تک صعود کرتے ہیں دوسری زبانوں کو ایک ایک ہزار سال لگے ہیں - ہمارے قدیم شعرا کے اس محیر العقول کارنامہ کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے - اگر شعرائے متقدمین فارسی شاعری کو خضر راہ نہیں بناتے تو اُردو زبان ابھی ارتقا کے ابتدائی مدارج طے کرتی رہتی اور زیادہ سے زیادہ اس میں

صرف قصہ کہانی بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہوتی ۔اس کی شاعری اعلیٰ امور ذہنیہ۔ واردات قلبیہ۔ کیفیات روحانی ۔جذبات لطیفہ اور خیالات پاکیزہ سے یکسر خالی ہوتی ۔

"تاریخ ادبیات اردو" کے فاضل مؤلف مسٹر سکسینہ نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں اردو شاعری پر فارسی کی نقالی کا الزام عائد کرتے ہوئے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے مضامین اور تلمیحات کو اس ملک سے کوئی تعلق نہیں اور تشبیہہ و استعارے کے لئے جن چیزوں کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ ہندوستان کی پیداوار نہیں ہیں اور ان سے یہاں کے لوگ بہت کم آشنا ہیں لیکن اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سیاسیات کی طرح ادب و شاعری ملکی و جغرافیائی حدود بندیوں کی پابند نہیں ہے ۔موجودہ مختلف یورپی ادبیات کی تلمیحات زیادہ تر یونانی و رومی صنمیات سے تعلق رکھتی ہیں ۔مذہب اور ملکی تقسیم کے لحاظ سے یہ تلمیحیں عیسائی دنیا کے لئے بیگانہ ہیں لیکن مغربی ادبیات کا وہ سرمایہ ہیں ۔ادبیات کا ہر متعلم ان سے مانوس ہے اس لئے وہ ان سے پوری طرح حظ اندوز ہوتا ہے ۔جس زمانے میں اردو شاعری معرض وجود میں آئی تھی اس وقت ہندوستان میں فارسی کا اس قدر چرچہ تھا کہ ہر ہندوستانی متعلم اس کی تمام ادبی روایات و تلمیحات سے اچھی طرح واقف تھا ۔البتہ اب حالات بدل گئے ہیں ۔ فارسی کا چرچہ ہی اٹھ گیا اور اردو کے مقابل میں سنسکرت آمیز ہندی کا اکھاڑہ قائم ہو گیا ہے ۔جن لوگوں کے باپ دادا فارسی و اردو کے زبردست شاعر اور انشا پرداز گزرے ہیں وہ بھی آج کل سیاسی و فرقہ واری جذبات کے زیر اثر اپنی اولاد کو ہندی کی تعلیم دینے لگے ہیں ۔ممکن ہو کہ اب ان لوگوں کو جو فارسی و اردو ادب و شاعری سے بالکل ناآشنا بن گئے ہیں ۔لیلیٰ و مجنوں ۔رستم و اسفند یار ۔ کوہ طور و بیستون ۔سنبل و ریحان کے نام اجنبی معلوم ہوتے ہوں لیکن پہلے یہ نام تو بچہ بچہ کی زبان پر تھے ۔کسی عہد کے لٹریچر پر تنقید کرتے وقت اس زمانے کے سیاسی و معاشری حالات ۔علمی و ادبی تحریکات اور لوگوں کے پسند و مذاق اور رجحانات و میلانات وغیرہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ۔گزشتہ واقعات کو موجودہ معیار پر جانچنا تنقید نگار کی سب سے بڑی غلطی ہے ۔اردو کی قدیم شاعری کے مخالفین کی یہی بنیادی غلطی ہے کہ وہ اُس وقت کے حالات و واقعات کو آج کل کی دھندلی عینک سے دیکھتے ہیں جس پر انجمن سازیوں ۔ فرقہ آرائیوں ۔جماعت بندیوں ۔سیاسی

تنگ نظریوں اور تعصب و عدم رواداری کی گرد جمی ہوئی ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ شاعری میں جن چیزوں سے تشبیہ و استعارے کا کام لیا جاتا ہے وہ ملک ہی کی پیداوار ہوں اور لوگوں نے انھیں جسمانی آنکھ سے دیکھا ہو۔ مثلاً کسی شاہی محل کو قصر سلیماں یا ایوان سحر سے دیوار کی صفائی کو آئینہ سکندر یا جام جم سے۔ بیل بوٹوں کو نگارخانہ مانی سے۔ کمروں کی کشادگی کو دل عارف کی فراخی سے۔ پائیں باغ کو روضہ جناں سے۔ حوض و نہر کو تسنیم و کوثر سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن کیا یہ چیزیں کسی خاص ملک کی پیداوار ہیں یا انھیں کسی شخص نے اپنی جسمانی آنکھ سے دیکھا ہے؟ شاعری سائنس کی ضد ہے۔ سائنس کا تقاضہ ہے کہ ہر شے آنکھ سے دیکھی جائے، خوردبین سے اس کا معائنہ کیا جائے اور وہ معمل میں تجربے کے لئے لائی جائے لیکن شاعری کا تعلق تخیل سے ہے۔ یہاں جسمانی آنکھ اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی چشم تخیل۔ شاعری سے محظوظ ہونے اور لطف اٹھانے کے لئے تشبیہ و استعارے کی چیزوں کو چشم تخیل سے دیکھ لینا اور ذہن میں ان کا صاف تصور قائم ہو جانا کافی ہے۔ جس زمانے میں اردو شاعری معرض وجود میں آئی اس وقت فارسی کا دور دورہ تھا اور ہندوستان کا ہر تعلیم یافتہ گھرانا اس کی تلمیحات روایات، تشبیہات و استعارات سے مانوس اور واقف تھا۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ فارسی شاعری کا سرمایہ قدرتی قانون اور فطرتی اصول کے تحت اردو میں منتقل ہوا۔ اب یہ تمام سرمایہ اردو شاعری کا جزو بدن بلکہ روح رواں بن چکا ہے جو کسی طرح جدا نہیں ہو سکتا۔ اردو شاعری اب مستقل ہیئت اختیار کر چکی ہے۔ جس طرح دنیا کی ہر پختہ و ترقی یافتہ زبان کا مخصوص سرمایہ ہوتا ہے اسی طرح اردو شاعری کی خصوصیات بھی معین و مقرر ہو چکی ہیں۔ اگر انگریزی یا سنسکرت زبان کسی اجنبی قوم کی سہولت کے لئے اپنے مقررہ اصول و ضوابط یا اساطیر و روایات سے دستکش نہیں ہو سکتی تو اردو زبان بھی ملکی سرمایہ اور ہندی تشبیہوں کے خواہشمندوں کے لئے اپنی شاعرانہ خصوصیات ترک کر کے اپنی مستقل ہیئت اور پاکیزہ صورت کو بگاڑنا گوارا نہیں کر سکتی۔

نقالی کے الزام کے ضمن میں اردو شاعری پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے مضامین اور الفاظ بھی محدود ہیں۔ وہی مضمون بار بار دہرایا جاتا ہے جسے اساتذۂ فارس اپنے اشعار میں ہزاروں بار باندھ چکے ہیں۔ نئے مضامین کے فقدان نے شعرا کو ایک عظیم الشان و مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنے

پر مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی کو ایسی بات کہنی ہو جسے قدما ہزاروں بار کہہ چکے ہوں تو اس کو پھر ادا کرنے کے لئے کوئی خاص اسلوب مقرر ہونا ضروری ہو۔ اس لئے ایک ہی بات کو نئے نئے انداز سے اور نئی نئی بندشوں اور ترکیبوں کے ساتھ بیان کرنے کے لئے علم معنی و بیان کی سختی سے پیروی ہونے لگی جس سے اردو شاعری کا بازار تصنعات و تکلفات سے بھر گیا۔ صرف یہی نہیں کہ اردو شاعری میں تکلفات و تصنعات کی کثرت ہو بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے۔ وہی استعارے وہی تشبیہیں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ آئینہ فطرت کے مشاہدے کا اس میں کہیں پتہ نہیں یعنی ذاتی تجربے و مشاہدے کی بنا پر نئی نئی تشبیہیں ایجاد نہیں کی جاتیں۔ الغرض شاعری ایک نپی تلی چیز ہو گئی جو نہ کبھی کم ہوتی ہے اور نہ زیادہ۔ اُردو شعرا صائب۔ کلیم۔ بیدل عرفی۔ قدسی وغیرہ کے مقابل کا یا ان کے رنگ میں شعر کہنا بہت بڑا کمال تصور کرتے تھے۔ خیالات کی رفعت یا وسعت کی بجائے وہ صرف زبان کی صفائی و شگفتگی کے دلدادہ تھے۔ الفاظ کی نشست۔ بندش کی چستی۔ ترکیب کی درستی وغیرہ کا انھیں بڑا خیال رہتا تھا۔ الغرض ان کی پوری توجہ صرف زبان ہی کی صحت و صفائی پر مبذول رہتی تھی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ان تمام پابندیوں کی وجہ سے حقیقی جذبات کے اظہار میں رکاوٹ پیش ہوتی ہے اس لئے تمام تکلفات و تصنعات اور مقررہ تشبیہات و استعارات کو ترک کر کے سیدھی سادی اور فطری زبان اختیار کرنی چاہئے تاکہ ہر قسم کے خیالات و جذبات کی ترجمانی میں سہولت پیدا ہو۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو شاعری پر محدودیت و رسمیت۔ تقلید و نقالی اور تکلف و تصنع کا جو الزام عاید کیا گیا ہے وہ بذات خود انگریزی خیالات کی کورانہ تقلید و نقالی اور غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواسط میں مغرب کی ادبی دنیا کلاسیت و رومانیت کی جنگ میں مشغول تھی۔ قدیم شاعری کے خلاف ہر طرف علم بغاوت بلند کیا جا رہا تھا۔ پوپ کے زمانے کی شاعری شہری زندگی۔ حیات انسانی اور معاشری معاملات کی ترجمان تھی۔ شعرا کی زبان نہایت فصیح و بلیغ تھی۔ نحوی و عروضی اصول کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اس لئے اس زمانے کے ادب و شاعری کو ادب العالیہ یعنی کلاسیکل لٹریچر کا معزز لقب دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہاں بغاوت و رومانیت کا دور آیا۔ شہری زندگی

سے بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا۔ شعرا نیچر پرستی کی طرف مائل ہو گئے اور داخلی شاعری کو چھوڑ کر سب کے سب خارجی شاعری پر پل پڑے۔ وصف نگاری اور تصویر کشی شاعری کا اعلیٰ مقصد قرار پائی۔ کلاسیکل شاعری پر یکسانیت و سمیت کا الزام عائد کیا جانے لگا۔ اصول و ضوابط کے سارے بندھن توڑ دیے گئے اور تمام شعرا بے نکیل کے اونٹ بن گئے۔ ورڈس ورتھ جیسے ملک الشعرا نے بھی مقررہ پوئٹک ڈکشن (شاعرانہ لفظیات) کو نہ صرف بے سود بلکہ مضر قرار دیا۔ فصاحت و بلاغت کو تکلفات و تصنعات کا مرادف خیال کیا جانے لگا۔ ہر شخص سادہ اور نیچرل زبان کا شیدائی بن گیا یہاں تک کہ اس بغاوت و انقلاب نے ادبی معیار کو نہایت پست بنا دیا۔ بقول الفرڈ نائس شاعری وحشت و بربریت کی جانب راجع ہو گئی۔ ادبی لطافت و پاکیزگی خاک میں مل گئی۔ رسمی و روایتی اصول و ضوابط سے منہ موڑ کر انقلابی شعرا اپنے بے قاعدہ و بے ہنگام کلام کو "آزاد شاعری" تصور کرنے لگے جس پر مسٹر چسٹرٹن کا چبھتا ہوا فقرہ قابل ذکر ہے کہ "تم گڑھے میں سور رہو اور اسے آزاد محل سمجھ لو"۔ بہر حال یہی وہ زمانہ تھا جب اہل ہند کے کان انگریزی ادب و شاعری سے "نیم آشنا" ہوئے۔ نیم آشنا اس لیے کہ اگر ابتداءً صرف چند درسی کتابوں کا انگریزی سے ترجمہ ہوا تھا۔ اور درسی کتابوں میں کٹے۔ بلی۔ کوئل۔ سمندر۔ خادر ولیم وغیرہ پر چھوٹی چھوٹی نظمیں درج تھیں جن پر ہر عہد کے بلند پایہ انگریزی کلام کی نوعیت و ماہیت کا گمان کر لیا گیا۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ناظم تعلیمات پنجاب کے مشورے سے لاہور میں اس عجیب و غریب مشاعرے کی طرح ڈالی گئی جسے جدید اردو شاعری کا سنگ بنیاد خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ صرف یہ تھا کہ شعرا بجائے کسی مصرع طرح پر طبع آزمائی کرنے کے کسی مضمون پر نظم لکھ کر لاتے تھے۔ ان نظموں کی امتیازی خصوصیت وحدت خیال اور سادگی زبان تھی۔

بہر کیف انگریزی ادب سے صورت آشنا ہوتے ہی "دانایان فرنگ" کی لغت تراشنے والوں نے گدایانہ انجذاب و غلامانہ تقلید سے کام لیا۔ رومانیوں کے خیالات کو بمنزلہ وحی کے سمجھ لیا۔ کلاسیکل شاعری پر انگلستان میں جو کچھ اعتراضات کئے جاتے تھے اور پوپ اور اس کے دبستان پر جتنے الزامات قائم ہوئے تھے وہ سب کے سب قدیم شعرائے اردو پر عائد کر دیے گئے۔ لیکن اب خود "دانایان فرنگ" نے اپنی

رائے بدل دی ہے اور انگلستان میں اب قدیم شاعری کی حمایت کی جا رہی ہے۔ سر والٹر ریلے کا بیان ہے کہ "انسانی نسل اپنے فوری پیشرووں کے ساتھ ناانصافی کرتی آئی ہے۔ وہ بچہ نہایت خوش نصیب اور سعادتمند ہے جو اپنے باپ کی خوبیوں کو پہچانے اور سمجھے کہ اس کا باپ بھی جدید نظام تمدن کے ایک نمائندے کی حیثیت سے قومی ترقی کے ہراول کے ساتھ کوچ کر رہا تھا۔ ورنہ بالعموم لڑکے باپ کی کارگذاریوں کو بھول جاتے ہیں لیکن دادا کے کارناموں کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مکانی یا زمانی قربت بے وقعتی کا باعث ہوتی ہے اور قدامت کے ساتھ احترام وابستہ ہوتا ہے۔ ادبی دنیا میں بھی انسانی ہمدردی ایک نسل اوپر اچھلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں اٹھارھویں صدی کی شاعری کے خلاف ایک ہنگامہ برپا تھا اور ہر شخص اسے برا کہتا تھا لیکن بیسویں صدی اسے وقعت کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس کی خوبیوں کو پہچاننے لگی ہے۔" بہرحال انگلستان میں کلاسیت کے خلاف علم بغاوت خواہ سیاسی و معاشری حالات و واقعات کی بنا پر اٹھایا گیا ہو خواہ سر والٹر ریلے کے بیان کردہ نظریہ ارتقا کا نتیجہ ہو لیکن ہندوستان میں قدیم شاعری سے بغاوت کی محرک محض محکوموں کی حاکم سے مرعوبیت اور غلامانہ ذہنیت تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری کے اور خصوصاً غزل کے الفاظ محدود، معین اور مخصوص ہیں لیکن یہ فارسی شاعری کی نقالی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مقتضائے شاعری یہی ہے کہ جو الفاظ مدت سے استعمال ہونے کی وجہ سے کانوں میں رچ گئے ہیں اور زبانوں پر بار بار آنے سے شیریں اور خوشگوار ہوتے ہیں ان کی جگہ غریب و اجنبی الفاظ نہ لائے جائیں۔ ورنہ شعر کی لطافت، دلچسپی، مزہ اور تاثیر میں فرق آجائے گا۔ ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کی شاعری میں فصیح و بلیغ اور لطیف و پاکیزہ الفاظ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے انگریزی میں بھی نظم کے الفاظ بہ مقابلہ نثر کے زیادہ شاندار و شیریں ہوتے ہیں۔ اسی لئے شاعری کی مخصوص زبان کو وہاں اصطلاحاً پوئٹک ڈکشن (الفاظ بندی) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں غزل چونکہ سب سے لطیف، رنگین، دلکش اور پر اثر صنف سخن ہے اس لئے یہاں غیر شاعرانہ الفاظ کا استعمال بدرجہ غایت ناگوار سمجھا جاتا ہے غزل میں کسی نامانوس، ثقیل، کرخت، مبتذل، علمی، اصطلاحی، ادق یا

مغلق لفظ کا استعمال لطافت شعری کو زائل کر دیتا ہے خواہ وہ لفظ اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے کتنا ہی موزوں و مناسب کیوں نہ ہو اس لئے اہل مذاق و ماہرین فن نے ایسے الفاظ کے استعمال کو معائب سخن میں شمار کیا ہے۔ یہ عیب زیادہ تر ان خشک شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے جن کا ذوق جمالیات بالکل بودا اور پست ہوتا ہے اور جن کی شاعری کو سوز و گداز سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس قماش کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

رشک۔

فتراک یار پر نہ پڑے میرے دھڑ کا بوجھ — جب ہو چکا شکار یہ دھڑ کا لگا رہا

ناسخ۔

عارفوں کو ہر در و دیوار ادب آموز ہے — مانع گردن کشی ہے انحنا دیوار کا

عرش۔

ہم جو مکاں میں آئیں گے اے یار — غیر ہیں کیا ان کے پدر جائیں گے

اختر۔

حلقۂ چشم کو پابوسی کی حسرت ہے بہت — آنکھ میں بھی مع پاپوش سماو صاحب

بیخود۔

حشر تک کیوں بات جائے کیوں پڑی غیروں کے منہ — گھر میں سمجھوتا ہمارا آپ کا ہو جائے گا

نہ دبا غیر سے باتوں میں بڑی بات رہی — گو وہ نازک ہے مگر دل کا کرارا نکلا

عارف۔

عطا کر لذت درد جگر پھر اک دفعہ یارب — دل ناشاد کو میرے کہیں پھر مبتلا کر دے

حالی۔

کاوش میں ہے الٰہی دگدا میں ہے طبیعی — جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا

یہاں خط کشیدہ الفاظ یعنی دھڑ۔ انحنا۔ پدر۔ مع۔ سمجھوتا۔ کرارا۔ اک دفعہ۔ دگدا اگرچہ معنی

کے لحاظ سے صحیح ہیں اور جس خیال کے اظہار کے لئے وہ استعمال کئے گئے ہیں اسے پورا پورا ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ الفاظ بقول مولانا حسرت موہانی غیر شاعرانہ ہیں اس لئے ان کی وجہ سے غزل کی لطافت حلاوت، خوشگواری و دلپذیری کا خون ہو گیا۔ ایسے الفاظ شاعر کی بدمذاقی یا غفلت ولاپروائی پر دلالت کرتے ہیں۔ جو لوگ ثقہ وصاحب مذاق ہیں وہ اپنے کلام کا دامن غیر شاعرانہ الفاظ کے لوث سے پاک رکھتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت شاعرانہ اور غیر شاعرانہ الفاظ کی فہرست مرتب نہیں ہو سکتی۔ فی نفسہ کوئی لفظ غیر شاعرانہ نہیں ہوتا البتہ اس کا غلط استعمال غیر شاعرانہ ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا الفاظ جس موقع ومحل پر استعمال ہوئے وہاں وہ ضرور ناموزوں ہیں اور مذاق سلیم پر گراں گزرتے ہیں لیکن ایک باکمال شاعر جو موقع ومحل پہچانتا ہے انھیں الفاظ کو ایسے انداز سے باندھ سکتا ہے کہ یہ فصیح معلوم ہوں گے اور ان کے مرادف وہاں رکھے جائیں تو کانوں کو کھٹکنے لگیں گے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت الفاظ کے محدود ومخصوص ہونے کی وجہ سے اظہار خیال میں رکاوٹ پیش ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ جو خیال اپنے اظہار کے لئے جن الفاظ کا متقاضی ہو انھیں کے ذریعے اسے ادا کر دینا نثر کا کام ہے نہ کہ شاعری کا۔ شاعر ہمیشہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو ذوق جمالیات پر بار نہ گزریں اور حسن کاری کے منافی نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض موقعوں پر کسی خاص معنی ومفہوم کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی خوشگوار ونفیس شاعرانہ لفظ نہ ملے۔ لیکن ایسی صورت میں بھی شاعرانہ مذاق سلیم غیر شاعرانہ لفظ کے استعمال سے اجتناب کرتا ہے اور کسی قریب المطلب شاعرانہ لفظ کے مرادی معنی سے اظہار مدعا کرتا ہے۔ مثلاً مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

دل وجگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

مطلب یہ ہے کہ ہم جسے پہلے دم یعنی سانس سمجھے ہوئے تھے وہ ایک موج خون کی پرافشانی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خیر دل میں تو موجۂ خون پیدا ہوتا ہے لیکن دل وجگر کو سانس سے کیا تعلق ؟ یہاں بجائے دل وجگر کے دل اور پھیپھڑا کہنا چاہئے تھا پھیپھڑے کو عربی میں "ریہ" اور فارسی میں "شش" کہتے ہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جب اردو کا کوئی لفظ غیر فصیح معلوم ہو تو شاعر اس کا عربی یا فارسی

مرادف استعمال کرتا ہے مگر یہاں تینوں لفظ غیر شاعرانہ ہیں لہٰذا نکتہ فہم و بلاغت شناس شاعر نے "جگر" کا فصیح و شاعرانہ لفظ استعمال کرکے اس سے پھیپھڑا مراد لیا۔ الغرض شاعر کبھی ایسا لفظ استعمال نہیں کرتا جو مذاق سلیم پر گراں گزرے۔ شاعری تمام فنون لطیفہ کی سرتاج ہے۔ یہاں ذوق جمالیات و شوق نفاست پسندی کی مقتضیات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ شاعر کا مقصد صرف ما فی الضمیر کو سیدھے سادے یا مناسب الفاظ میں ظاہر کردینا نہیں ہے۔ یہ کام تو نثر نگار کا ہے۔ اپنے خیالات و جذبات کی ہو بہو تصویر کھینچ دینا بھی شاعری کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ افسانہ نگار کا فریضہ ہے۔ شاعر نہایت موزوں و منتخب الفاظ کے ذریعے سے مختلف ذہنی کیفیتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے انگریزی میں "سجشن" (Suggestion) کہتے ہیں۔ الفاظ کے لغوی معنی کچھ ہوں لیکن اگر وہ اپنی اشارتی و ایمائی قوت سے شاعر کے مفہوم کو ادا کردیں اور سامع کے ذہن میں وہ کیفیت پیدا کردیں جو شاعر کا مقصود ہے تو وہ کامیاب شاعر کہلائے گا۔ شاعری کی زبان نثری زبان کی طرح کسی جذبہ۔ خیال۔ منظر یا واقعہ کی عکسی تصویر نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص کیفیت کی علامت ہوتی ہے خواہ وہ سرور و انبساط کی کیفیت ہو یا رنج و انقباض کی۔ حیرت و استعجاب کی ہو یا غیظ و غضب کی۔ حسرت و یاس کی ہو یا امید و نشاط کی۔ ہر چند شاعر کے الفاظ و کلمات لغت نحو اور منطق کے ترازو میں پورے نہ اترتے ہوں تاہم اگر وہ ان کے ذریعے سے سامع کے دل پر مطلوبہ کیفیت طاری کردے تو اس کی شاعری کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ الغرض شاعری میں کمی الفاظ کی تلافی ان کی ایمائی قوت سے ہو جاتی ہے۔ اگر شاعری کے الفاظ محدود و مخصوص ہیں تو شاعر کو اس کی پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ ایک لفظ سے سامع کے ذہن کو بیسیوں معنی و مفہوم اور تلازمات و ایتلافات کی جانب منتقل کر سکتا ہے۔ مذکورہ بالا شعر میں مرزا غالب نے جگر کے لفظ سے پھیپھڑے کی طرف اشارہ کرکے اپنا مطلب اچھی طرح ادا کردیا ہے۔

بعض اوقات بالکل بے ربط الفاظ کے اجتماع اور بے معنی جملے سے شاعر کسی خاص کیفیت کا نقشہ پیش کردیتا ہے۔ پروفیسر ابر کرامبی نے اپنی کتاب "نظریہ شاعری" میں انگریزی شعرا کے کلام سے

اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ چنانچہ ایک مثال ولیم موریس کے اُس نظم کی ہے جس میں ایک مسحور لڑکی کا قصہ درج ہے جب لوگ اس کو دیکھنے کے لئے جاتے تھے اور اس کی حالت پر افسوس کرتے تھے تو وہ کہتی تھی کہ ؎

میرے لئے تم کیوں ہو ملول　　چاند ہیں دیکھو سوسن کے پھول

معترضین کہتے ہیں کہ یہ شعر بالکل طفلانہ اور مہمل ہے بھلا چاند کو سوسن کے پھول سے کیا تعلق ؟ مسٹر کالورلی اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لڑکی یہ گانا بھی گا سکتی تھی کہ "مکھن ملائی انڈا پنیر"۔ لیکن مسٹر ابرکرامبی کا خیال ہے کہ اگرچہ یہ مصرع یعنی "چاند ہیں دیکھو سوسن کے پھول" نحوی اور منطقی لحاظ سے بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے تاہم شاعر اس مسحور لڑکی کے دماغی اختلال کی کیفیت دکھانے میں پوری طرح کامیاب ہوا ہے موقع و محل کا تقاضا یہی تھا کہ لڑکی کی زبان سے بے ربط و بے معنی جملہ ادا کرایا جائے تاکہ قارئین کو معلوم ہو کہ وہ جادو کے اثر سے مخبوط الحواس بن گئی ہے اور چاند کے سیاہ داغ اسے سوسن کے پھول معلوم ہوتے ہیں۔

چونکہ شاعر کا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ کسی شے کے متعلق مناسب الفاظ کے ذریعے سے وافر معلومات بہم پہنچائے بلکہ اس کا مقصد کسی خاص حالت یا کیفیت کی طرف محض اشارہ کر دینا ہے اس لئے شاعر بسا اوقات تمام واقعات کو سلسلے کے ساتھ بیان نہیں کرتا اور نہ تفصیلات و جزئیات میں الجھنا پسند کرتا ہے بلکہ صرف اہم و امتیازی امور کو لے کر انہیں باہم متناسب و مربوط کر دیتا ہے اور درمیانی کڑیوں کو ملانے اور کھانچوں کو پر کر لینے کی خدمت سامعین پر چھوڑ دیتا ہے اگر سننے والے کا ذہن فوراً محذوفات کی طرف منتقل نہ ہو اور چھوٹی ہوئی کڑیوں کو دریافت کرنے میں دقت پیش آئے تو سمجھنا چاہئے کہ شاعر نومشق ہے اور اپنے مقصد میں ناکامیاب رہا لیکن بلاغت شناس ماہرین فن کا کلام اس قسم کی لفظی و معنوی تعقیدوں سے پاک ہوتا ہے۔ ان کا شعر سنتے ہی ہمارا ذہن آسانی کے ساتھ خلا کو پر کر کے اصل معنی و مفہوم تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ مومن کا ایک شعر ہے کہ ؎

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا　　مجھ کو خیال [illegible] کی قسم نہ تھا

ممکن ہے کہ منطقی دماغ کو دونوں مصرعوں میں کوئی تعلق نظر نہ آئے اور وہ اس شعر کی گتھی سلجھانے سے قاصر رہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ باکمال شاعر نے صرف چند الفاظ میں معاملۂ عشق کی ایک پوری داستان بیان کر دی ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے پاس بیٹھا ہوا نیاز عشق پیش کر رہا ہے۔ معشوق نے ایک رقیب کو بے قصور اور بلا وجہ پامال کر دیا ہے جس کی خبر عاشق کو ہو چکی ہے۔ معشوق عاشق کی طرف مائل تو ہے لیکن اس کو رہ رہ کے خیال ہوتا ہے کہ عدو کی بے وجہ و بے جرم پامالی کی وجہ سے ممکن ہے کہ عاشق میرے التفات کی قدر نہ کرے یا مجھ سے بدظن ہو جائے یا سمجھ لے کہ اس کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو عدو کا ہوا۔ ان خیالات کے آنے سے معشوق عاشق سے رک رک کے مل رہا ہے۔ عاشق اپنے معشوق کی دلی کیفیتوں کا اندازہ کر لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ یہ خیال معشوق کے دل سے نکل جائے۔ وہ معشوق سے کہتا ہے کہ میں وفادار عاشق ہوں۔ تم میرے ساتھ کیسا ہی سلوک کرو میں کبھی عشق و محبت سے منہ موڑنے والا نہیں۔ اگر مجھے بھی عدو کی طرح بے جرم پامال کر دو تو اس کی مجھے مطلق پروا نہ ہوگی۔ اس لئے تم التفات کئے جاؤ۔ تمہارے سر کی قسم مجھے نتیجے کا کچھ خیال نہیں۔ اتنی طویل داستان کو صرف دو مصرعوں میں بیان کر دینا کمال شاعری کی دلیل ہے۔ یہاں قابل لحاظ بات یہ ہے کہ الفاظ کی کمی سے شاعر کے اظہار خیال میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں ہوئی۔ جتنی کڑیاں چھوٹ گئی تھیں انہیں سامع کے ذہن نے دریافت کر کے پورے مفہوم پر عبور حاصل کر لیا۔ ایسا ہی مرزا غالب کا ایک شعر

ملاحظہ ہو صفحہ

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی

محذوفات کے باوجود اس شعر کے پڑھتے ہی ایک خاص حالت کی مکمل تصویر چشم تخیل کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ عاشق کا شیفتہ دل عشق سے لبریز ہے۔ اس کو اپنی بھلائی برائی یا نیک نامی و بدنامی کا کچھ خیال نہیں ہے۔ اس کو اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں کہ معشوق باوفا ہے یا بے وفا۔ دوست احباب ناصح مشفق بن کر عاشق دلگیر کو سمجھانے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے جس سے دل لگایا ہے اور جس کی محبت میں دین و دنیا سب کچھ بھلا بیٹھے ہو وہ بالکل بے وفا ہے۔ اس کو تمہاری نیاز آگینیوں اور

جان نثاریوں کی مطلق قدر نہیں۔ ایسے ظالم۔ سفاک۔ اور بیوفا معشوق سے دل لگانا کسی طرح مناسب نہیں عاشق کو یہ نصیحت نہایت تلخ اور ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ وہ جھلا کر کہتا ہے کہ جو شخص اپنے دل و جان کو عزیز رکھتا ہے اس کو میدان عشق میں قدم رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں تب عاشق بنا ہوں۔ میرا عشق وفا کا پابند نہیں۔ معشوق "قہر ہو بلا ہو جو کچھ ہو"، میں اس سے محبت ضرور رکھوں گا۔ شاعر نے شعر میں کہیں یہ بیان نہیں کیا ہے کہ لوگ اسے ترک محبت کا مشورہ دیتے ہیں اور نہ یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ عشق کے لئے معشوق کی قدر دانی وہ وفاداری کی شرط نہیں ہے تاہم شعر سن کر ذہن خود بخود ان کھانچوں کو پر کر لیتا ہے۔

شاد لکھنوی کا ایک شعر بطور آخری مثال پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

پس معشوق مرنا عشق کو بدنام کرنا ہے ‏ ‏ ‏ خدا مجنوں کو بخشے مرگیا اور ہم کو مرنا ہے

نحو اور منطق کی نگاہ ظاہر بیں میں یہ شعر تین بے ربط و بے تعلق جملوں پر مشتمل نظر آتا ہے۔ پہلے مصرعے میں مذہب عشق کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اول تو مجنوں کے لئے مغفرت کی دعا کی گئی ہے اور پھر شاعر کہتا ہے کہ "مجھ کو ابھی مرنا باقی ہے"، بظاہر تینوں باتیں بے تعلق معلوم ہوتی ہیں لیکن جو لوگ شاعرانہ طرز بیان کے رموز آشنا ہیں وہ انھی دو مصرعوں میں ایک طویل معاملۂ عشق کا مکمل نقشہ اور فصاحت و بلاغت کے بیسیوں نکات مضمر پاتے ہیں۔ شاعر نے پہلے دنیائے عشق کا ایک قانون بیان کیا ہے کہ عاشق کو معشوق سے پہلے یا اس کے ساتھ مر جانا چاہئے جو شخص عشق کا مدعی ہو کر اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اور سب لوگ اسے مورد الزام و نشانۂ ملامت بنائیں گے۔ دوسرے مصرعے میں مجنوں کی مغفرت کے لئے جو دعا مانگی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ضرور کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ یہاں سامع کا ذہن فوراً اس واقعے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ مجنوں نے لیلیٰ کے بعد وفات پائی تھی۔ معشوق کی موت کے بعد عاشق کا زندہ رہنا مذہب عشق میں جائز نہیں ہے۔ اس فقرے میں کہ "خدا مجنوں کو بخشے"، فصاحت و بلاغت کے کئی نکتے پنہاں ہیں۔ یہ عام معاشری تہذیب میں داخل ہے کہ جب کسی مرے ہوئے آدمی کا ذکر کیا

جاتا ہے یا نام لیا جاتا ہے تو بولتے ہیں کہ "حق مغفرت کرے۔ یا خدا بخشے یا غفر اللہ تعالیٰ" وغیرہ۔ اس طرح کلام میں فطرت و اصلیت کی مطابقت کا عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مذہب عشق کے ایک قانون کی خلاف ورزی سے مجنوں پر جو گناہ لازم آیا اس کی بخشائش کے لئے دعا بھی ہو گئی تیسرے یہ کہ مجنوں کا دنیائے عشق میں بہت بڑا درجہ ہے اسی لئے اس کو سید العاشقین کا معزز لقب ملا ہے۔ شاعر نے مجنوں کے ادب و احترام کا پاس رکھا ہے اور صاف لفظوں میں اس پر کوئی الزام عائد کرنے کے بجائے ایک لطیف پیرایہ میں اس کی لغزش کی طرف صرف اشارہ کر دیا ہے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے یہ فقرہ کہ "خدا مجنوں کو بخشے" معنی خیزی و بلاغت کا مخزن بن گیا ہے۔ دوسرا فقرہ کہ "ہم کو مرنا ہے" ظاہر کرتا ہے کہ کہنے والا ابھی کسی کو دل دے چکا ہے۔ اس کو ابھی عشق کی گوناگوں سختیاں اور صعوبتیں جھیلنی ہیں۔ وہ ڈرتا ہے کہ جب مجنوں جیسے عاشق کامل سے بھی غلطی سرزد ہو گئی تو میری کیا حقیقت ہے؟ کہیں مجھ سے بھی مذہب عشق کا کوئی اہم فریضہ ترک نہ ہو جائے۔ مجنوں تو خوش نصیب ہے کہ مر کر تمام آفتوں سے نجات پا چکا۔ لیکن مجھے ابھی نہ معلوم کتنی آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ شعر اشارہ کاری (سجشن Suggestion) کی بہترین مثال ہے۔

ان تمام مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کو اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی کے لئے الفاظ کے بہت بڑے ذخیرے کی ضرورت نہیں ہے۔ اشعار کے الفاظ تو نہایت مختصر ہوتے ہیں لیکن ہر لفظ اپنے اندر گنجینۂ معنی پوشیدہ رکھتا ہے۔ شاعری میں الفاظ کے لغوی معنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے کیونکہ ایک ایک لفظ بیسیوں حالات و کیفیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غزل کے الفاظ معین محدود اور مخصوص ہیں تو کیا ہوا جب کہ ہر لفظ معنی خیزی، اثر انگیزی، کیفیت آفرینی کی لا انتہا قوت کا سرمایہ دار ہے۔ کوئی نیا لفظ سامع کے ذہن میں صرف وہی مفہوم پیدا کر سکتا ہے جو اس کے لغوی معنی سے مترشح ہوتا ہے لیکن جن الفاظ کو رسمی اور قدیم کہا جاتا ہے ان کے گرد صدیوں کے استعمال کی وجہ سے بے شمار خیالات و تصورات اور تلازمات و انسلاکات جمع ہو گئے ہیں۔ جس طرح جریب کی ایک کڑی کو کھینچنے سے تمام کڑیاں متحرک ہو جاتی ہیں اسی طرح ایک لفظ کے سننے سے ذہن اس کے تمام تلازم خیالات و

تصورات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور بہت سی بھولی بسری چیزیں یاد آجاتی ہیں صحت وصفائی کے لحاظ سے بھی جدید الفاظ قدیم الفاظ کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ثانی الذکر الفاظ مدت دراز سے منجھتے اور رچلائے جاتے آرہے ہیں اور زمانے کی کسوٹی پر وہ کھرے ثابت ہو چکے ہیں۔ غالب اسی بنا پر اپنے الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

پروفیسر لیموزن کا بیان ہے کہ ایسے الفاظ کا انتخاب واستعمال جو بہت سے معنی ومفہوم پر مشتمل ہوں اہل کمال ہی سے انجام پا سکتا ہے۔ شاعری کا کمال یہ ہو کہ طویل واقعے کو چند الفاظ میں ادا کر دیا جائے۔ بڑے بڑے شعرا جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ ارتعاش حیات۔ رنگ۔ حرکت گرمی اور تڑپ سے لبریز ہوتے ہیں۔ ان کے سنتے ہی ہمارے تمام حواس میں سنسنی پھیل جاتی ہے۔ کوئی باکمال شاعر الفاظ کے ذریعے سے جو کچھ کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ کیفیتیں وہ ہم پر اشارہ وکنایہ کے ذریعے سے طاری کرتا ہے۔ کسی منظر کی تصویر کشی کے لئے جہاں معمولی آدمی کو سیکڑوں الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں شاعر کی چشم حقیقت بیں صرف امتیازی خصوصیات کا انتخاب کر لیتی ہے۔ ان خصوصیات کو شاعر کی مہارت فنی صرف دو تین لفظوں میں ظاہر کر دیتی ہے لیکن یہ الفاظ منتخب روزگار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ایمائی وارشاقی قوتوں سے منظر کی تمام ظاہری وباطنی پہلوؤں کو ہمارے پیش نظر کر دیتے ہیں۔ مثلاً شاعر پہاڑ کی چوٹی پر سمندر کے کنارے کھڑا ہے۔ وہ نیچے سمندر پر نظر ڈالتا ہے۔ سمندر متلاطم ہے۔ زور زور سے گرج رہا ہے لیکن پہاڑ کی چوٹی اس قدر بلند ہے کہ وہاں گرج کی آواز بالکل دھیمی پڑ جاتی ہے۔ سماعت کام نہیں دیتی مگر آنکھیں دیکھتی ہیں کہ سمندر گھٹتا بڑھتا ہے۔ موجیں مارتا ہے۔ چمکتا ہے۔ تھرتھراتا ہے۔ کنارے سے ٹکراتا ہے۔ یہ سمندر کے مظاہر ہیں جو نظر آتے ہیں۔ ان کو کن الفاظ میں اظہار کیا جائے۔ ٹینی سن کی قادر الکلامی ہو۔ وہ صرف دو لفظوں اس کی مرقع کشی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

پرشکن سمندر نیچے رینگ رہا ہے

یہ آخری اور اعجاز نما اختصار ہے جب تک زبان قائم ہے اور انسان آنکھ کی نعمت سے بہرہ ور ہے وہ منظر

کی اس تصویر کو ہمیشہ سراہتا رہے گا۔ آبرے بیرڈسلی (Aubrey Beardsley) کی نسبت مشہور ہے کہ وہ پنسل کی صرف چند حرکتوں سے معجز نما تصویریں کھینچ دیتا تھا لیکن ٹینی سن کی طرح صرف دو لفظوں میں سمندر کی متلاطم تصویر پیش کر دینا معجزے سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہی شاعر دوسرے وقت ایک جھیل کے کنارے کھڑا ہے یہاں کا پانی سمندر کے پانی کی طرح متحرک متلاطم اور چمکدار نہیں ہے جھیل نہایت تاریک۔ عمیق۔ خاموش اور پر اسرار ہے۔ پانی ٹھہرا ہوا ہے اور شام کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اس کی تصویر وہ حسب ذیل الفاظ میں دکھاتا ہے۔

"جھیل اپنے سیاہی مائل پانی کے ساتھ محوِ خواب ہے"

لفظ سیاہی مائل اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے تو صرف پانی کا رنگ ظاہر کرتا ہے لیکن یہ ایسا منتخب لفظ ہے جو جھیل کی گہرائی۔ تاریکی۔ اسرار اور خوفناک اداسی کا بھی مظہر ہے۔ غرض کہ شاعر نے ایک لفظ سے جھیل کی مختلف کیفیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سکون ٹھہراؤ اور خاموشی کا مفہوم لفظ "محوِ خواب" میں مضمر ہے۔ ہمارے احساسات پر اس تصویر کا جو اثر پڑتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ نقاشی کی اصطلاح میں اسے "فضا" (Atmosphere) کہتے ہیں جو محسوس ہونے کی چیز ہے۔ الفاظ اس احساس کے اظہار سے قاصر ہیں۔ لفظ "محوِ خواب" میں تمام علمی دیویوں (Muses) کی دلفریبیاں بھی پنہاں ہیں۔ ایسے الفاظ درجہ کمال کو پہنچے ہوتے ہیں جن میں مزید ترقی یا تبدیلی کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔ ایک بار استعمال ہونے پر وہ آخری اور عین فطری معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں بغور مشاہدہ یا وافر ذخیرۂ الفاظ کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ واقعات روزمرہ کے ہیں جن کو ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے اور اور شاعر کے استعمال کردہ الفاظ بھی معمولی ہیں جن سے ہر شخص واقف و مانوس ہے۔ اہل کمال کا کمال تمام واقعات میں سے اہم و امتیازی خصوصیات کے انتخاب اور تمام ذخیرۂ الفاظ میں سے موزوں و مناسب الفاظ کے استعمال میں مضمر ہے۔ ان کو ہم الہامی الفاظ کہہ سکتے ہیں۔

ایک باکمال شاعر معمولی الفاظ میں جو کثرت استعمال سے ابتذال کی حد تک پہنچ گئے ہوں نئی

روح ۔ نئی تازگی ۔ نئی شگفتگی اور نئی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے ۔ الفاظ کے معنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اہم چیز ان کا محل استعمال ہے ۔ شاعر کی طلسم کاری ادنیٰ الفاظ سے معجز نما تصویر تیار کر دیتی ہے چنانچہ معمولی الفاظ میں موسم خزاں کی عریانی اور اداسی کا منظر ملاحظہ ہو ۔

"آخری سرخ پتی جھڑ گئی"

تصویر کی خوبی کا انحصار فقرے کی چست بندش یا معنی کی باریکی پر نہیں بلکہ الفاظ کے فن کارانہ محل استعمال پر ہے ۔ شاعر کی نظر انتخاب موسم کی نمایاں خصوصیت پر پڑی اور الفاظ کی ایمائی قوت نے مختلف کیفیتوں کو صور متحرکہ کی طرح چشم تخیل کے سامنے یکے بعد دیگرے پیش کر دیا ۔ "آخری" کے لفظ نے ایک ٹھوٹھ ۔ بے برگ و بار اور ویران درخت کی تصویر کھڑی کر دی ۔ سب پتیاں گر چکی ہیں ۔ آشیانے اجڑ گئے ہیں ۔ طائران خوش الحان کی نوا سنجی موقوف ہو گئی ہے ۔ ایک ہو کا عالم ہے ۔ ہر طرف اداسی چھائی ہوئی ہے ۔ البتہ سرخ کا لفظ تاریک پر دۂ تصویر پر چوکھے رنگ کی ایک چھینٹ ڈال دیتا ہے جس سے بعض وقت پر اسرار طور پر پوری تصویر کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے اور جھڑنے کا لفظ منظر کو جاندار و متحرک بنا دیتا ہے ۔ شاخیں ہلنے لگتی ہیں ۔ اور شوخ و رنگین داغ تصویر کے چہرہ پر سے گزر جاتا ہے ۔ شاعر نے قدیم ٹکسال کے معمولی سکوں ہی سے کام لیا ہے ۔ باکمال شاعر کو نئے الفاظ گھڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ فن تعمیر اور فن شاعری دونوں میں قدیم طرز کی پابندی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے ۔ کلاسل اسٹائل (قدیم طرز) سے روگردانی بار بار بربادی کی موجب ثابت ہو چکی ہے اسی روگردانی نے رومیوں کے ہاتھوں یونانی فن کو تباہ کرایا اور گوتھی فن کی تباہی بھی اسی سے عمل میں آئی ۔ شکسپیر دیوتا تھا ۔ وہ اپنے خاص قوانین کا پابند تھا ۔ وہ ٹکسال کا مالک تھا ۔ اس نے نئے سکے مسکوک کئے اس کی دیکھا دیکھی ہر کس و ناکس کو تکلیک الفاظ کا شوق چرایا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وفات کے بعد انگریزی شاعری ایسی پستی و حضیض میں گر گئی کہ ابتدائے تاریخ سے وہ کبھی ایسے ادنیٰ درجہ کو نہیں پہنچی تھی ۔ کیونکہ بے آئینی کا پھول تو خوشنما ہوتا ہے لیکن پھل نہایت تلخ ہوتا ہے ۔ ہر شے کی زیادتی بری ہوتی ہے یہی حال شاعرانہ تصرف کا ہے جسے غلطی سے آزادی سمجھا جاتا ہے ۔ یہ تصرف و آزادی زبان کو وسیع بنانے کے بجائے اپنے کھوٹے

سکوں سے بازار کا نرخ بگاڑ دیتی ہے۔ شاعری میں قدیم الفاظ کو ہر حال میں جدید الفاظ پر ترجیح دینی چاہیے
نئے الفاظ کی جانچ کے وقت ان کی قدر دانی۔ موزونیت اور شیرینی کی بجائے ان کی ضرورت پر نظر کرنی
چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کیا شاعر کا مطلب قدیم الفاظ سے ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ واضح رہے کہ تصرف
شعری اور الفاظ تراشی کی ضرورت اکثر کمزور اور نومشق شاعروں کو پیش آیا کرتی ہے۔ باکمال شعرا زبان
کا دامن نئے الفاظ کی تشکیل سے وسیع نہیں کرتے بلکہ وہ قدیم الفاظ ہی کی قوتوں کو بڑھانے اور ان
کے معنی و مفہوم کو وسیع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹینس کے تمام کھلاڑی ایک ہی گیند سے کھیلتے
ہیں لیکن بعض کا طریقہ داشت ( ) حیرت انگیز ہوتا ہے۔ اساتذۂ سخن معمولی الفاظ سے
کام لیتے ہیں لیکن ان کا طریقہ استعمال محیر العقول ہوتا ہے۔ باکمال شعرا مبتذل الفاظ کو بھی معنی
خیز بنا دیتے ہیں اور ان کی مدد سے بہترین تصویریں تیار کرتے ہیں لیکن معنی خیزی سے زیادہ اہم چیز
الفاظ کا ماہرانہ و فن کارانہ استعمال ہے۔ راہب اپنے عبادت خانے میں اور زاہد اپنے صومعہ میں
جنت کا لطف اٹھاتا ہے۔ اسی میں وہ دو عالم کی پہنائی پاتا ہے اور راہ سلوک کے تمام مدارج
طے کر کے ملاء اعلیٰ کی قربت حاصل کر لیتا ہے لیکن مگس بے حیا تمام اچھی بری چیزوں پر اڑتی پھرتی
ہے۔ اسی کو آزادی سمجھتی ہے۔ ایک پھول پر قناعت سے بیٹھ رہنا اس کے لئے پابہ زنجیر ہونے
کے مرادف ہے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ خلاصہ ہے ایک مشہور انگریز نقاد مسٹر گریننگ لیمبورن کے خیالات کا۔ اس
اقتباس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جس مغربی آزادی کی ہوا سے متاثر و مرعوب ہو کر ہندوستانی
معترضین اپنے اسلاف کے لطیف ذوقِ جمالیات پر حملہ کر رہے تھے خود وہاں کی فضا اب بدل گئی۔ یورپی
نقاد بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ شاعرانہ خوبیوں کا انحصار قدیم و رسمی الفاظ ہی پر ہے۔ بات یہ ہے کہ جو الفاظ
صدیوں سے حسن قبول کی سند حاصل کرتے آئے ہیں ان کے مقابل میں نئے الفاظ ضرور اجنبی و ناگوار
معلوم ہوں گے۔ جب قدیم الفاظ سے کام چلتا ہی ہے اور اساتذہ کو اظہار خیال میں کوئی
دشواری پیش نہیں آتی تو خواہ مخواہ غیر مانوس و ثقیل الفاظ کے استعمال سے لطافت شعری کا خون

کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ فی الحقیقت کم بضاعت اور ادنیٰ درجے کے شاعروں کو نئے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجے کے شاعر جو الفاظ کے محل استعمال۔ مترادفات کے نازک فرق۔ فصاحت کے رموز۔ بلاغت کے نکتوں اور اظہار خیالات کے مختلف طریقوں سے واقف ہوتے ہیں وہ کبھی غیر شاعرانہ الفاظ کے استعمال سے غزل کی لطافت۔ پاکیزگی۔ رنگینی اور دل آویزی کا خون نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ فصیح۔ شگفتہ اور معنی خیز الفاظ ہی سے اپنے کلام کو زینت دیتے ہیں اور وہ انھیں قدیم الفاظ کی مدد سے ہر قسم کے خیال۔ جذبے۔ منظر یا واقعے کی معجز نما تصویریں پیش کرتے ہیں۔

سرورِ کائنات کی حکومت

اس کا قیام اور انتظام

(بسلسلہ گزشتہ)

حکومت کے ادارے | حکومت اگر باقی نہ رہ سکے تو اس کے حصول سے کیا فائدہ۔ یہ بتایا جاچکا ہے کہ آنحضرت صلعم نے حکومت کس طرح اوامرِ الٰہیہ کے تحت عدالت و صداقت کے ذریعے قائم فرمائی اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کی استواری اور پائداری کے متعلق کیا ادارے قائم کئے گئے۔ اس بارے میں آنحضرت صلعم کی تعلیم پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

استقراء سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت کی تعلیم "دنیا و آخرت" دونوں کی بھلائی پر مشتمل ہے اور اس کے ذرائع (۱) علم (۲) جسم (۳) اخلاق قرار دئے گئے ہیں۔ علم سے مراد اپنے حقوق و فرائض کا علم ہے یعنی ہر چیز تو (فقط میری نہیں) ہماری ہے۔ لیکن ہم (اور میں بھی) خدا کے۔

چنانچہ اسلام کے ارکان (ایمان کے بعد) پانچ ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ جہاد۔ ان میں آخر الذکر فرض کفایہ ہے۔ یعنی اگر کافی تعداد اس میں حصہ لے تو باقی سے ساقط ہو جاتا ہے۔ باقی چار فرض عین ہیں۔

ان پر غور کرنے سے اس دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ دین و دنیا کی بھلائی ان سے حاصل ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمومی فرائض ہر مسلمان پر واجب ہیں۔ ان کے علاوہ جو خصوصی فرائض حاکم وقت کے ہیں وہ علیحدہ بیان ہوں گے۔

چونکہ ایک حکومت کے لئے افسر و رعایا کے غالب حصے کا متحد ہونا ضروری ہے اس لئے اس اتحاد کی روح کو ابھارنے کا لحاظ ہر حکم میں شامل رہا اور مذہبی احکام میں بھی اسی چیز کی آبیاری کی گئی۔

چنانچہ عمومی فرائض سے (سوائے بچوں اور دیوانوں کے جو مرفوع القلم طبقہ ہے) کوئی مستثنیٰ نہیں۔ اعلیٰ بادشاہ اور ادنیٰ مزدور، سب کو ایک ہی قسم کے فرض کی ادائی کا حکم دیا گیا۔ ہر روز پانچ مرتبہ محلے والوں کو، ہر ہفتے شہر والوں کو، اور ہر سال دو مرتبے شہر و مضافات کے باشندوں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ ایک حربیاتی نے غالباً صحیح لکھا ہے کہ اسلامی نماز ایک طرح کی فوجی پریڈ اور عسکری تربیت ہے۔ صف بندی، قائد (امام) کے احکام پر متفقہ حرکت، وقت کی پابندی، صفائی و طہارت، صبح سویرے اٹھنے کی عادت، یہ سب نماز کے جز ہیں۔ ایک حدیث میں (غالباً ابو داؤد میں) ہے کہ آنحضرت صلعم جہاد کو نکلتے تو بلندی پر چڑھتے وقت اللہ اکبر کہتے۔ نشیب آتا تو سبحان اللہ فرماتے۔ اسی پر نماز کے قیام و قعود اور رکوع و سجود کے اوراد مقرر کئے گئے"۔ نماز ایک ورزش اور کسرت بھی ہے۔ کیوں نہ ہو عماد الدین یعنی دین کا ستون ہے۔

جنگی ضروریات میں سفر کی عادت بہت ضروری ہے۔ حج اسی کا موقعہ بہم پہنچاتا ہے، اس میں ہر سال مکہ معظمہ میں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ یہ عالمگیر اخوت اور انسانی برادری (یا دوسرے الفاظ میں تمام رعایا کی یگانگی) کی یاد تازہ کرنے کا بھی بہترین وسیلہ ہے۔ جملہ صوبہ جات مملکت اور اقطاع عالم کے مسلمانوں کی ایک سالانہ موتمر بھی ہے۔ خلیفۂ اسلام کا ایک دربار عام بھی ہے جس میں ہر حصے کی بہترین نمائندگی کی گئی ہے۔ زکوٰۃ کو لیجئے۔ حکومت بغیر مالئے کے عضو معطل ہے۔ زکوٰۃ اور عشر زراعت حکومت اسلامیہ ہی نہیں ہر حکومت کے لئے لابدی اور ضروری ہیں۔ مگر تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت کی آمدنی کو بادشاہ کے صرف خاص کی جگہ ملکیت عامہ (Public Property) قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا مصرف یوں معین کیا گیا کہ صدقات (یعنی زکاۃ عشر خمس غنیمت وغیرہ۔) فقرا و مساکین کی امداد، عہدہ داران متعلقہ کی تنخواہ۔ غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کو قرض سے نجات دلانے اور فی سبیل اللہ یعنی فوجی تیاری، رفاہ عام، سڑکوں، پلوں کی تعمیر وغیرہ میں اور رہگزروں کی امداد میں صرف ہوں"[۱۷]۔ انفرادیت و اجتماعیت کا بین بین، محنت اور سرمائے اور زمین کی صلح، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا بہترین محافظ ملک سے افلاس کو دور کرنے اور معاشی حالت کو سدھارنے کا علاج، اگر کوئی اسلامی ادارہ کرتا ہے تو یہی ادارہ (زکوٰۃ و صدقات) ہے

اور برنارڈ شا کے الفاظ میں اس سے بہتر کوئی امر ممکن نہیں[18]۔"

جہاں دنیاوی کاروبار کی تکمیل کے بہت سے ادارے قائم کئے گئے اور رہبانیت کو مردود ٹھہرایا گیا وہیں متعدد احادیث و آیات کے ذریعے خیرات کی انتہائی تاکید کرکے روحانی و مادی جذبات میں توازن قائم کیا گیا اور " فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ " " دین و دنیا کی بھلائی " عام طور پر ہر فرد کا مطمح نظر قرار دیا گیا اور اسی سلسلے میں ہر سال مہینہ بھر روزے رکھنے کا حکم دیا گیا جس میں خود ضبطی، ایثار، امیروں اور مفلسوں میں یکسانیت غرض بہت سے مصالح پوشیدہ ہیں۔ اور یہ سب امور شہریت کی تربیت کے لئے واجب قرار دئے گئے۔

فرائض و مقاصد حکومت کی انجام دہی | جدید اصول قانون[19] میں حکومت کے اعلیٰ ترین فرائض صرف دو قرار دئے ہیں: جنگ اور عدل گستری۔ یہ دونوں دراصل حفاظت حقوق ہی کے دو ذریعے ہیں جنگ غیر عدالتی ذریعہ ہے اور عدل گستری عدالتی جنگ کے متعلق آنحضرت صلعم نے فوجی خدمات ہر مسلمان پر اسی طرح لازم کردئے جس طرح اب بھی Conscription کے نام سے اکثر یورپی ممالک میں ہے جسے معمول طبیعت میں راسخ کردینے کے لئے اسے بھی مذہبی رنگ دے دیا گیا۔ ورنہ جنگی تیاریوں کے لئے قوم کو عام رغبت دلانا[20] کوئی آزاد و خود مختار قوم بے جا نہیں ٹھہرا سکتی۔ الفاروق میں شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عام جبری فوجی خدمت کا طریقہ نہ تھا اس کی ابتدا آنحضرت صلعم ہی سے ہوئی۔ اس کا مزید تذکرہ آگے آئے گا۔ یہ یاد رہے کہ تبدیل مذہب کے لئے جنگ یا جبر کرنا اسلام میں جائز نہیں لیکن حکومت الٰہیہ (سلطنت اسلامیہ) کے قیام کو مذہب سے (اس کے محدود معنوں میں) کوئی تعلق نہیں۔

حکومت کا دوسرا بڑا فریضہ عدل گستری ہے تاکہ " امن، انتظام اور تمدن کا دور دورہ ہو اور خوشحالی اور ترفہ کا زمانہ آئے۔ عدل گستری کے معنی یہ ہیں کہ " جماعت قوم اور اس کے افراد کے صحیح حقوق کی نگہداشت "، آنحضرت صلعم نے عدالت کا جو مستحکم اور ترقی یافتہ ادارہ قائم کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر و غریب سب کا قانون ایک رکھا گیا جس کے اصول غیر متبدل تھے۔ قاضی وقت کے روبرو خود بادشاہ اسلام پر مقدمہ دائر ہوسکتا تھا۔ تاریخ یہ واقعہ محفوظ رکھتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنی آخری

عمر میں مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ جس کسی کا آپ پر حق ہو وہ طلب کرے۔ اور جس کسی کو آپ سے تکلیف پہنچی ہو وہ انتقام لے۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کا مطالبہ کیا جس کی آپ نے فوری ادائی کر دی۔ شاید حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا اپنے دور خلافت میں قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنا یہاں ایک تذکرۂ بے محل ہو گا۔ یہاں صرف اسلامی عدلیہ کے خدوخال بیان کرتے ہیں کہ وہ عاملہ یا تنفیذیت سے مکمل اور قطعاً آزاد تھا۔ یہاں تک کہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہونے سے بادشاہ اسلام بھی نہیں روک سکتا تا وقتیکہ قاضی کا فیصلہ شرع و قانون کے صریح خلاف نہ ہو قرآن مجید میں ہے کہ "خدا تم کو عدل کرنے کا حکم دیتا ہے"[۲۱] نیز "اور جب تم لوگوں میں فصل مقدمات کرو تو عدل سے فیصلہ کرو" ایسی احادیث بے شمار ہیں جن میں عدل و انصاف کی تاکید اور ظلم و ستم پر دھمکی دارد ہے۔ غرض اسلام میں امیر و غریب، آقا و غلام، مسلم و غیر مسلم سب عدالتی نقطۂ نظر سے برابر کے حقوق اور واجبات رکھتے ہیں۔

جس حکومت میں حقوق کی حفاظت اور انصاف ہو اور وہاں کی رعایا کے کلیاتِ خمس[۲۲] (یعنی دین، عقل، نفس، نسب، مال) کی آزادانہ اور مکمل نگہداشت ہو تو ان کی وفاداری اور امداد میں کیا شبہ رہتا ہے؟!

عدلیہ کے لازمی جزو "شرع اور تشریع" (قانون و قانون سازی) ہیں۔ اسلامی قانون "شخصی قانون" ہے یعنی مسلمان جہاں بھی ہو اسی کا پابند ہے۔ سالمنڈ "اصولِ قانون" میں لکھتا ہے کہ "مقامی قانون روز بروز بے وقعت بنتا اور کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور شخصی قانون بڑھتا جاتا ہے۔"

قانون کے استحکام اور تبدل پذیری کے متعلق ابھی تک بڑی بحث ہے۔ سالمنڈ کی رائے یہ ہے کہ قانون کا کچھ اصولی حصہ غیر تبدل پذیر ہونا چاہئے جس سے ذیلی قواعد حسب ضرورت بنائے اور بدلے جا سکیں تاکہ قانون ضروریات زمانہ کا ساتھ دے کر تمدن کی ترقی میں معاون ہو نہ کہ خارج۔ اسلامی قانون آنحضرت صلعم نے اسی قسم کا مقرر فرمایا۔ قرآن مجید میں غیر متبدل اصولی احکام ہیں۔ احادیث میں قطعی اور متواتر بہت ہی کم ہیں۔ اس لئے کتاب و سنت سے مسائل قیاس و اجتہاد کی پوری اجازت

دی گئی۔ مگر واضح رہے کہ متعدد قوانین وضوابط کی آنحضرت صلعم ہی کے زمانے میں تدوین ہو چکی تھی چنانچہ تعزیرات، ٹارٹ (ہرجے اور دیتیں) تحریری صورت پا چکی تھیں[۲۳]۔ انھیں چیزوں کو بعد میں ترقی دی گئی اور اس میں استنباطی ترقی کی پوری اجازت دی گئی۔ اسلامی ضابطۂ قانون و تشریع کی ابتدا اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جس میں معاذ ابن جبلؓ کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجتے وقت آنحضرت صلعم نے ان سے پوچھا کہ وہ بطور قاضی کس طرح فیصلے صادر کریں گے تو انھوں نے کہا کہ قرآن کے مطابق اور اگر اس میں نہ ہو تو سنت نبوی کے موافق اور اس میں بھی پتہ نہ چلے تو "اجتہد برائی" (یعنی، میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آنحضرت صلعم نے اس کو صحیح قرار دیا اور ان کی تعریف کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آپؐ کی امت میں ایسے صائب دماغ پیدا ہوتے ہیں (ترمذی) ظاہر ہے کہ مختلف حکام عدالت کا اجتہاد مختلف ہوگا اور ایک مسئلے کے متعلق متضاد احکام بھی ہو سکیں گے۔ اور غالباً اسی وجہ سے آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ اختلاف امتی رحمۃ (یعنی، میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اور الدین یسر۔ دین آسان چیز ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون میں ہر ملک اور ہر زمانے میں کارآمد ہونے کی صلاحیت ہے اور مسلمانوں کو آنحضرت صلعم نے شریعت کے ہر زمانے کا ساتھ دے سکنے کے متعلق یہ صریح خوشخبری بھی دی ہے کہ ہر سو برس کے بعد ایک مجدد پیدا ہوگا جو اس امت کے دین کی تجدید کرے گا[۲۴]۔ اور واقعۃً ایسا ہوتا رہا ہے۔

مزید برآں قانون کا تبدل پذیر ہونا گو نظریے کی حد تک اچھا ہو لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ عملاً قانون اسلامی کے اصول میں کسی ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہی اب تک نہیں پائی گئی۔ بلکہ دنیا اسی کی طرف کھنچی چلی آرہی ہے[۲۵]۔ اور مسئلہ توریث، ازدواج و طلاق اور ترک مسکرات میں خاص کر یورپ و امریکہ کا میلان طبع قابل ذکر ہے۔

قانون اور انصاف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی ترقی دی تھی اور یہ امر کہ جوابدہ صرف خاطی اور مجرم ہی ہو سب سے پہلے توریت میں اس کا حکم ہوا[۲۶]۔ قدیم تر زمانے میں ملزم کے اہل خاندان بلکہ اہل قوم بھی جوابدہ ہوتے تھے۔ اسلام نے ایک اور زبردست نظریہ قانون میں پیدا کر کے کروڑوں

بے گناہوں کو محفوظ کر دیا اور وہ نیت کا مسئلہ تھا۔ حدیث کی کتابوں میں سب سے مشہور یہی حدیث مروی ہوتی ہے کہ اِنَّمَا الاعمالُ بالنِّیّاتِ یعنی "کام نیت کے مطابق ہیں" آنحضرت صلعم نے وقف، توریث، طلاق وغیرہ متعدد نئی چیزوں کو قانونی حیثیت عطا فرمائی اور "جائداد" یا "دولت" کے متعلق ایسا انتظام فرمایا کہ دولت کی تقسیم میں توازن ہو کے لایکون دولۃً بین الاغنیاءِ منکم الایۃ (تاکہ مالداروں ہی میں نہ پھرتا رہے) زکوٰۃ، مالگذاری، توریث، تحدید وصیت اس کے خاص اجزا ہیں۔

آنحضرت صلعم نے فصل مقدمات کا نہ صرف مستقل اور باقاعدہ انتظام فرمایا تھا اور نہ صرف قاضیوں کا تقرر اور ان کے لئے شہادت وقضا کے دستور العمل مرتب کئے گئے تھے بلکہ ساتھ ہی افتاء (یعنی پبلک کو قانونی احکام دریافت کرنے پر مستند معلومات بہم پہنچانے) اور اصلاح بین الناس (یعنی بیرون عدالت جھگڑے رفع کرنے) کے انتظامات شروع فرمائے تھے۔ (سیرۃ النبی شبلی صفحہ)

عدالتوں کے ساتھ سزا دہندہ عملہ (جلاد وغیرہ) اور پولیس اور احتساب یعنی تجارتی وغیر تجارتی ہر قسم کے کاروبار کی نگرانی اور انسپکشن کی طرح بھی پڑ چکی تھی (ایضاً)

اسی سلسلے میں قانون شہریت اور رعایا کے باہمی برتاؤ پر روشنی ڈالنی چاہیے، جو حکومت کے استحکام میں بہت اہم حصہ رکھتا ہے۔

آنحضرت صلعم نے رعایا میں مسلمان اور ذمی (امان دادہ غیر مسلم) دو حصے قرار دیے۔ حفاظت حقوق کی حد تک سب برابر تھے۔ البتہ مسلمانوں پر جنگی خدمات فرض تھیں اور ذمیوں کو اس سے نیز دیگر بہت سے مسائل سے مستثنیٰ کیا گیا۔ صرف ان سے ایک حفاظتی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اسے جزیہ کہتے تھے۔ مسلمان رعایا کو اپنی قومیت کی فلاح وبقا کے لئے یہ تعلیم دی گئی کہ "غیروں پر سخت اور باہم رقیق القلب" نیز "مومنوں پر نرم اور غیروں پر سخت"[۲۷] سیاسیات کے اس عام اصول پر مزید بحث غیر ضروری ہے۔ اسلام چونکہ محض خدا کا بول بالا کرنے کے لئے آیا تھا اس لئے اکثر فقہاء کا یہ خیال ہے کہ صرف خدا کے قائل یعنی اہل کتاب کو اسلامی عملداری میں جزیہ دے کر رہنے کی اجازت ہے (مثلاً یہود، نصاریٰ مجوس) بت پرستوں کو اجازت سکونت نہیں۔ مگر اس پر عملدرآمد عرب کے باہر کبھی نہیں رہا۔ یہاں تک

کہ ہندوؤں تک کو مشابہ اہل کتاب قرار دے لیا گیا۔

رعایا کے فرائض "امداد، وفاداری و اطاعت حکومت ہیں"۔ آنحضرت صلعم نے نہایت احتیاط سے نہ صرف اس کے احکام اور ترغیبات دیئے بلکہ مسلمانوں کا ماحول ہی ایسا پیدا کر دیا کہ جس میں خود بخود ان فرائض کی تعمیل پر اُبھارنے والے جذبات کی آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ جو ارکان مذہب ہیں اس سے عملاً خود بخود امداد، وفاداری اور اطاعت کی تربیت ہوتی ہے نیز ایک جگہ قرآن میں ہے "اور نزاع نہ کرو ورنہ فشل پیدا ہو جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی"۔[۲۹] اس کی فوجی اور ملکی یعنی سول، ضبط یا "ڈزیپلائن"، میں جیسی اہمیت ہے ظاہر ہے۔ ان کے علاوہ تمدنی فرائض بھی ہیں۔ مثلاً حلال و حرام غذائیں۔ درست و غلط معاملات وغیرہ۔ ان کی تفصیل یہاں بے محل ہے۔ صرف اتنا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ ان کی سائنٹفک تقسیم کی گئی ہے یعنی حلال و حرام، مکروہ و مستحب اور مباح اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ انسان ملکی قانون سے زیادہ مذہبی اور ضمیری قانون کی تعمیل کرتا ہے اس لئے فرائض شہریت کو مذہبی رنگ دے کر ذہنیت میں رچا دیا گیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی تعمیل حسب دلخواہ ہوئی ورنہ امریکا کا صرف قانوناً شراب حرام کر دینا عملاً بے اثر ثابت ہوا ہے۔ اسلام میں جس طرح شراب بند کی گئی اس نظر سے امریکا اور دنیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی حال ہر قسم کے اصلاحات کا ہے جس میں تدریج اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

حکومت کے لئے دستور لازمی چیز ہے آنحضرت صلعم نے ایک "منتخبہ ذمہ دار ملوکیت" "Elected responsible monorchy." قائم فرمائی جو ایک بالکل نیا لیکن مسلمہ طور سے بہترین نظریہ ہے۔ کیونکہ موروثی کی جگہ منتخبہ ہونے سے بہترین صلاحیت و قابلیت کا فرد حاکم اعلیٰ بنے گا۔ اسی طرح ہر فرد رعایا کے روبرو بالراست ہو یا بالواسطہ جواب دہ ہونے کے فوائد ظاہر ہیں۔[۳۰] ملوکیت بالاتفاق اس طرز حکومت پر بہ لحاظ افادہ مرجح ہے جو ایک جماعت پر مشتمل ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ فرد مستبد" بھی خواہ وہ بےغرض ہو"۔ ذمہ دار شاہی جو مشورے لینے کی پابند ہو وہ پروفیسر لاسکی کے الفاظ میں اس مقصد کو بہترین طور سے پورا کراتی ہے۔[۳۱] آنحضرت صلعم چونکہ عالمگیر

حکومت قائم کرنی چاہتے تھے اس لئے ایک زبان بولنے یا ایک ملک میں رہنے یا ایک قوم سے ہونے کو عصبی حصے میں ڈال دیا اور ہر رنگ اور ہر ملک کے مسلمانوں میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی یا نسلی یا لسانی یا ملکی رشتوں سے کہیں مستحکم اور دیرپا تھا اور بتایا گیا کہ یہی حبل اللہ ہے اسی کو تھامے رہنے میں مسلمانوں کی فلاح دیتا ہے۔

آنحضرت صلعم نے سوائے (شرعی) قانون اور خارجہ سیاست کے جو مرکزی حکومت سے متعلق تھے اور امور میں بڑی حد تک صوبہ داری خودمختاری رکھی۔ اور عامل یعنی گورنر کی ذات (جو بعد میں آنحضرت صلعم کی زندگی ہی میں فرائض کی کثرت کے باعث عامل، قاضی، تحصیلدار مال، تین افراد میں منقسم ہوگئی) صوبے میں بالکل خودمختار تھی۔

آنحضرت صلعم نے نیابت اور منصرمی کا طریقہ بھی ڈال دیا تھا جب کبھی آپؐ مستقر سے باہر جاتے کسی کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ جاتے(۵) تاکہ کاروبار عادی میں ابتری نہ پیدا ہو۔ مختلف انتظامی ادارے مثلاً خفیہ پولیس کا انتظام بھی قائم ہوگیا تھا چنانچہ فتح مکہ سے قبل حضرت عباسؓ مکہ معظمہ میں خفیہ پرچہ نویس مقرر(۵۱) تھے۔ دیگر اداروں کی بھی داغ بیل پڑ چکی تھی چنانچہ اسی سلسلے میں اور متعدد صیغوں کا تذکرہ ہو چکا ہے جن میں سے عدالت، احتساب، پولیس، افتاء وغیرہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ان کے سوا تبلیغ تعلیم، سیول وملٹری سروس اور قوانین منضبطہ متعلقہ معاملات وغیرہ، فوج صیغہ خارجہ (دارالانشاء وغیرہ) اور صیغہ داخلہ (تھانہ داری، عدالت، احتساب وغیرہ) اور صیغہ مالیہ کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔

تبلیغ و تعلیم | اسلام کے سب سے مقدم ادارے رہے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کی مذہبی اور عام تعلیم کے لئے خاص ذرائع اختیار فرمائے چنانچہ علاوہ ترغیب و تشویق کے خود معلم جابجا بھجوائے۔ تعلیم یافتہ جنگی قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں (تشویق کے سلسلے میں اطلب العلم ولو کان بالصین، طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ۔ والذین اوتوا العلم درجات۔ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔)

غیر مسلموں میں تبلیغ کے وسیع انتظامات مستقل طور سے قائم فرمائے چنانچہ سرکاری آمدنی کی ایک اہم مد اس کے لئے مختص تھی قرآن) وقت بے وقت جو غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی اس سے بھی تالیف قلبی کی جاتی تھی۔ بے شبہ جبری اسلام پر کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا گیا اور نہ قرآن اس کی اجازت دیتا ہے البتہ مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا کہ ہر شخص تبلیغ دین کرے اور اعلائے کلمۃ اللہ میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کرے۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلعم نے نہ صرف عرب کے مختلف حصوں اور مصر و شام وغیرہ بلکہ کہتے ہیں کہ دور دراز ممالک مثلاً چین وغیرہ تک بھی تبلیغ کے لئے خاص خاص صحابہ کو روانہ فرمایا۔

مساجد مسلمانوں کی بزم گاہیں ہیں اور ان کی ہر قسم کی دینی و دنیوی سرگرمیوں کا مرکز اور جزو غیر منفک۔ ان کی تعمیر و ترمیم، ائمہ و موذنین کے تقرر، وغیرہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی اور خاص احکام دئے۔

سیویل سروس | ان سب کے ساتھ سیویل سروس کا ادارہ بھی قائم ہوگیا، جہاں گورنروں، قاضیوں اماموں، مبلغوں، معلموں وغیرہ کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی اور ان کا امتحان لیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کا کسی عہدے پر تقرر ہوتا تھا انھیں زبانی اور تحریری دستور العمل اور ہدایات دئے جاتے تھے۔ عہدیداران مال کو ہر قسم کے مداخل (زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ وغیرہ) کی شرحیں تحریری طور سے لکھ کر دی جاتی تھیں۔ مخارج کا بھی ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ چنانچہ ایک رجسٹر میں سرکاری وظیفہ یا تنخواہ پانے والوں کے نام تحریر تھے۔ مجرد و متاہل کی شرح میں ایک و دو کا تناسب تھا۔ بندوبست و مالگذاری کی طرح پڑ چکی تھی اور جاگیرات نو آبادی بسانے کے لئے ملنے لگے تھے۔ اس میں اصول یہ تھا کہ چشمے وغیرہ مفاد عامہ کی چیزیں شخصی ملک نہ ہوجائیں۔ (شبلی صفحہ ۲) قاضیوں کو خاص کر فوجداری (تعزیری) اور دیوانی ضابطے مہیا کئے جاتے تھے۔ اور ٹارٹ (ہرجے اور دیت) کے متعلق معلومات بہم پہنچائے جاتے تھے جن امور میں متضرر قصاص معاف کرے وہاں متضرر کو کیا معاوضہ دلایا جائے۔ معاملات و معاہدات (خرید و فروخت سود وغیرہ) اور سماجی تعلقات (مثلاً نکاح طلاق وغیرہ) کے متعلق بھی آپ نے اصولی طور سے قوانین و قواعد مرتب فرمادئے تھے۔ جن کی ضروری تفصیل و تشریح و ترمیم بھی وقت بوقت ہوتی گئی — ان تمام

کی تدوین مسلمانوں نے بعد میں مکمل کی۔

فوج | حکومت کی بقا اور ترقی کے لئے فوج ناگزیر ہے۔ آنحضرت صلعم نے عام فوجی تعلیم اور مستعدی اور تیار باشی کے زبردست احکام دئے۔ وقت بوقت تیر اندازی، گھوڑدوڑ، نیزہ بازی وغیرہ میں حصہ لے کر شوق بڑھایا۔

سپہ سالاروں کو بھی آگاہ کیا جاتا تھا کہ غیر جانبداری جنگ اور اس سے پہلے، اور اس کے بعد کیا امور ملحوظ رہیں۔ مثلاً آداب سفر و قیام، مختلف طبقوں کی مختلف پلٹنیں، صف آرائی، دشمن کو پہلے اطاعت کی دعوت دینا، غیر جنگی عنصر کو قتل نہ کرنا۔ نہ زراعت و عمارات وغیرہ کو تباہ کرنا۔ تقسیم غنائم، تبادلۂ قیدیان، قیدیوں سے سلوک زخمیوں کے لئے دواخانے اور مقتولین سے برتاؤ وغیرہ وغیرہ۔

دارالانشاء | میں فرامین و توقیعات، معاہدے، مراسلتیں، احکام وغیرہ لکھائے جاتے تھے اور قرآن مجید مدون کرایا جاتا تھا (قرآن موجودہ خود آنحضرت صلعم کے زمانے میں پوری طرح مدون ہو چکا تھا۔ تاریخ القرآن۔ پروفیسر مفتی عبد اللطیف جامعہ عثمانیہ)

صیغۂ داخلہ | مہمانداری، مریضوں کی عیادت پر توجہ کی جاتی تھی۔ عدالت و قانون و خفیہ کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔ یہ ہے حکومت اسلامیہ کے قیام اور اس کی تنظیم و تشکیل کا خلاصہ۔

حوالے

(۱۷) قرآن مجید: انما الصدقاتُ للفقراء والمساکین والعاملینَ علیہا والمؤلفۃِ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل الآیۃ

(۱۸) مضمون انگلستان کا مذہب آئندہ صدی میں حسب بیان برنارڈ شا بحوالہ رسالہ اشاعت الاسلام لاہور

(۱۹) سامنڈ کی کتاب "Jurisprudence"، حصہ اول

(۲۰) قرآن مجید (الف) ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم واموالہم الایہ (ب) واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ الایہ (ج) لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا الایۃ وغیرہ وغیرہ

حدیث کی کتابوں میں انگنت تشویقیں، ثواب، احکام وغیرہ ملتے ہیں۔ صحاح ستہ وغیرہ کا کتاب الجہاد ملاحظہ ہو۔ مثال کے طور پر آنحضرت صلعم نے فرمایا اگر ممکن ہوتا تو آپ اس بات کو پسند کرتے کہ بار بار راہ خدا میں شہید ہوں۔ آپ نے فرمایا موت پر ہر شخص کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن شہید کا عمل قیامت تک جاری سمجھا جاتا ہے۔

(۲۱) قرآن مجید (الف) ان اللہ یامر بالعدل الایہ (ب) واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل الایۃ

(۲۲) مسلم الثبوت (اصول فقہ) از محب اللہ بہاری مسئلہ تقریر (سنت نبوی)

(۲۳) بدایۃ المجتہد از ابن رشد صفحہ ۲ کتاب الدیات

(۲۴) ان اللہ عز وجل یبعث لہذہ الامۃ علیٰ راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا (حدیث) (ک۔ د ق کتب حدیث)

(۲۵) امریکا میں مناقت شریف برنارڈ کی تصنیف انگلستان کا مذہب آئندہ صدی میں، رجحانات سیاسی میں مجلس اقوام کے ذریعے اتحاد و تعاون عالم اور نیز اشتراکیت، حج و زکوٰۃ اور اخوت اسلامی کی جانب مائل ہیں۔ روحانیات سے روز افزوں دلچسپی، مغرب کی عیسائیت سے بیزاری دنیا میں بت پرستی اور شرک سے عام نفرت، ہندی ذات پات اور چھوت چھات سے کراہت ملوکیت کی جگہ ذمہ دار جمہوریت اور پارلیمانی مشاورت وغیرہ وغیرہ

(۲۶) ایب ہاوز کی کتاب ارٹس ان ایوالیوشن یا ب قانون اور انصاف

(۲۷) قرآن مجید (الف) ہوالذی ارسل رسولہ بالہدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ وکفی باللہ شہیدا۔ محمد الرسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم تریہم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماہم فی وجوہہم من اثر السجود ذلک مثلہم فی التوراۃ ومثلہم فی الانجیل کزرع اخرج شطاہ فازرہ فاستغلظ فاستویٰ علیٰ سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بہم الکفار وعد اللہ الذین آمنوا

وعملوا الصلحات منهم مغفرۃً واجراً عظیما (ترجمہ: خدا نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے۔ خدا کی گواہی کافی ہے۔ محمد رسول اللہ اور آپ کے ساتھی کفار پر سخت اور باہم نرم، راکع وساجد اور خدا کا فضل اور رضامندی کے طلبگار ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر سجدے کے نشان ہیں۔ توریت وانجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ ایک پودا ہے جس کی شاخ نکلتی ہے جو رفتہ رفتہ مضبوط اور سخت بن کر اپنی ساق پر استوا قائم ہوجاتی اور بونے والے کو باغ باغ کر دیتی ہے تاکہ کفار خفا رہوں۔ خدا نے ان میں سے مومنوں اور نیکوکاروں سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے) اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین الایۃ یعنی مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت

(۲۸) قرآن مجید: واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول الایۃ

(۲۹) قرآن مجید: ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم الایہ

(۳۰) حدیث: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

(۳۱) "....The nation of leaving the government of the State to decide and compelling it only to consult, seems preferable..."

Grammer of politics by H. Laski. P. 82, ch, Sovereignty

ایچ لاسکی کی کتاب گرامر آف پالٹکس باب ساورنٹی یعنی اقتدار اعلیٰ "... یہ خیال بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کو فیصلے کا اختیار دیدیں اور اسے صرف مشورے لینے پر مجبور کیا جائے ..."

امیر عبدالرحمن خاں مرحوم

(سلسلہ گزشتہ نمبر ۳)

باشندگان افغانستان کا عبدالرحمن خاں کے ساتھ اظہار وفاداری

جب ۱۸۹۶ء میں عبدالرحمن خاں نے تمام اندرونی انتظامات حکومت سے فراغت حاصل کی اور سارے افغانستان پر ان کا قبضہ ہوگیا تو تمام ملک کے سرداروں، ملاؤں اور تاجروں نے متفقہ طور پر ان کے لئے ایک تمغہ مکلل بجواہر تیار کرایا جس پر "ضیاء الملت والدین امیر عبدالرحمن خاں والی افغانستان" کندہ تھا اور مزید برآں تمام سرداران قبائل اور علمائے افغانستان نے عید الضحیٰ کے دن دربار عام میں عبدالرحمن خاں کے سامنے اپنی جان نثاری اور وفاداری کا اقرار کیا اور متفقہ طور پر سب وکلائے قوم نے یہ تجویز پاس کی کہ چونکہ حدود افغانستان کا تصفیہ ہو چکا ہے۔ اس لئے افغان قوم کا فرض ہے کہ ہر آٹھ آدمیوں میں سے ایک آدمی حفاظت ملک کے لئے وقف کرے۔ اس موقعہ پر جو معاہدہ وکلائے قوم اور عبدالرحمن خاں کے درمیان ہوا تھا اس کی شرطیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عبدالرحمن خاں کو قوم ہمیشہ ضیاء الملت والدین کے خطاب سے مخاطب کرے گی۔

۲۔ عبدالرحمن خاں شریعت کے مطابق جو حکم صادر کریں گے قوم اس کی اطاعت کرے گی۔

۳۔ ہندوستان یا روس کی طرف سے افغانستان پر اگر حملہ ہوا تو افغانی قوم کا فرض ہوگا کہ ملک کی حفاظت کرے۔

۴۔ افغانی قوم کا فرض ہوگا کہ ہمیشہ پائندہ خاں بارکزئی (جد اعلیٰ عبدالرحمن خاں) کی نسل میں سے اپنا بادشاہ مقرر کرے گی اور کسی دوسرے شخص کی اطاعت نہ کرے گی۔

یہ معاہدہ نہایت اہتمام کے ساتھ چھاپ کر تمام ملک میں تقسیم کیا گیا اور تمام افغانی قوم نے اس معاہدے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

عبدالرحمٰن خاں افغانستان کو کس حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔

عبدالرحمٰن خاں کی ہمیشہ سے یہ تمنا تھی کہ افغانستان خود مختار رہے اور اس کے اندرونی اور بیرونی معاملات میں کوئی طاقت مداخلت نہ کرے اور ملک تدریجاً ترقی کرتا جائے۔ عبدالرحمٰن خاں افغانستان کو متمدن ممالک کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے انھوں نے ملک سے طوائف الملوکی کو نیست و نابود کیا اور اس کے بعد حدود افغانستان کا معاملہ روس اور انگلستان سے مل کر طے کیا۔ عبدالرحمٰن خاں کا انگلستان سے بالواسطہ تعلق نہ تھا بلکہ جو معاملے طے کرنا ہوتا تھا وہ وائسرائے ہند کے ذریعے طے کیا جاتا تھا اور اس میں بڑی دقتیں اور دشواریاں تھیں۔ ان دشواریوں کو دور کرنے کے لئے عبدالرحمٰن نے اپنے منجھلے بیٹے سردار نصراللہ خاں کو انگلستان بھیجا کہ جا کر خود ملکہ وکٹوریہ کے روبرو یہ مسئلہ پیش کرے اور اپنی تکالیف دکھا کر درخواست کرے کہ حکومت افغانستان کو ایک سفیر انگلستان میں رکھنے کی اجازت مرحمت ہو تا کہ براہ راست انگلستان اور افغانستان کے معاملات طے ہوتے رہیں۔ نصراللہ خاں کے شاہانہ استقبال کے باوجود ملکہ وکٹوریہ نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا۔ اس واقعہ نے عبدالرحمٰن خاں کے دل کو دکھ پہنچایا ایک مدبر ہونے کی وجہ سے اس رنج کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ بلکہ صبر اختیار کر لیا۔

عبدالرحمٰن خاں کی یہ دلی آرزو تھی کہ افغانستان جاپان کی طرح جلد سے جلد عروج حاصل کرلے۔ عبدالرحمٰن کی زیادہ تر کوشش یہ تھی کہ افغان قوم کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک رشتۂ اتحاد میں پروئیں۔ ان کی زیادہ تر جدوجہد افغانی قوم کی تہذیب و تربیت کے لئے مخصوص تھی۔ وہ اپنے ملک کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح کرنا چاہتے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ افغانستان طاقتور اور متمدن قوت ہو جائے جس کو نہ روسی اپنا آلۂ کار بنا سکیں اور نہ انگریز اس کو اپنے مقصد براری کے لئے اپنی قیادت میں لا سکیں۔

اصلاحات

عبدالرحمٰن خاں کی تخت نشینی سے پیشتر سرکاری محکمے باہدگر ایسے مخلوط تھے کہ ان میں تمیز کرنا دشوار تھا۔ وزیر اعظم کے ہاتھ میں تمام انتظام تھا وہی بیک وقت وزیر اعظم بھی تھا اور محاسب بھی تھا۔ اس کے سونے کے کمرے میں تمام انتظامات حکومت ہوتے۔ مختصر یہ کہ بے قاعدگی اور بے ضابطگی کا دور

دورہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سلطنت کابل کے تمام انتظامات عبدالرحمن خاں کو از سر نو کرنے پڑے اُن کی پیہم محنت سے افغانستان چند ہی سال میں منظم ہو گیا۔ حکومت کے دفاتر اور محکمے مناسب طریقے پر آراستہ و پیراستہ نظر آنے لگے۔

عبدالرحمن خاں نے سلطنت کے محکموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

۱۔ جنگی یعنی نظامی

۲۔ ملکی۔

محکمہ جنگی امیر دوست محمد خاں کے زمانے میں افغانی فوج بالکل غیر منظم تھی یعنی وہ ایک جماعت کثیر لڑنے والوں کی تھی جس میں سوار، پیدل دونوں ملے جلے ہوئے تھے اور کوئی باقاعدہ رجمنٹ اور پلٹنیں نہ تھیں سب سے پہلے افغانی فوج کو درست کرنے کی کوشش عبدالرحمن خاں کے والد امیر افضل خاں نے کی تھی۔ انھیں کے حکم سے فوجی قواعد کی چند کتابیں انگریزی سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں اور فوج کو باڑیوں، رسالوں اور رجمنٹ میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ تمام انتظامات ایک نومسلم انگریز شیر محمد خاں نامی کی ماتحتی میں ہوئے تھے یہ نومسلم جنرل عبدالرحمن خاں کا اتالیق تھا اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے لیکن سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے ان کو اطمینان نہ تھا اور حکومت کی طرف سے ان کو چند ایسے حقوق حاصل تھے کہ رعایا سے جبراً روپیہ وصول کرتے تھے علاوہ ازیں سستی، کاہلی اور طرح طرح کی برائیاں ان میں موجود تھیں۔

لیکن عبدالرحمن خاں نے تخت کابل پر رونق افروز ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنی توجہ فوج کی طرف منعطف کی اور اس کو باقاعدہ منظم کرکے جدید آلات سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ فوج کا پورا انتظام محکمہ جنگی کے سپرد تھا جو ملک کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ عبدالرحمن خاں نے اپنی فوج کی ترتیب جدید یورپین انداز پر کی تھی اور سپاہیوں کی تنخواہیں دو مہینے کے بعد وقت معینہ پر برابر نقد دی جاتی تھیں۔ سواروں کو ہر رجمنٹ اور پیدلوں کی ہر پلٹن بالکل مکمل تھی۔ اس میں سفر مینا مورچہ بندی اور خندق کھودنے کے لیے انجینیر، باجا، خیمے، حکیم، جراح، ملا، حجام، سقا اور محکمہ کمسریٹ وغیرہ سب

موجود تھے۔ افغانی فوج کے پاس جدید ترین وضع کی بریچ لوڈنگ ، نورڈنفلٹ ، ہوچکس اور کرپ طرز کی نیز انگریزی کوہی باتری خچر باتری سکیم ۔ گارڈنز اور گیٹلنگ توپیں تھیں ۔ امیر موصوف اپنے فوجی انتظامات پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اپنی تزک میں لکھتے ہیں ۔

"اگر ضرورت ہو تو تین لاکھ سپاہیوں کے لئے اس وقت ساز و سامان و اسلحہ جنگ وغیرہ مع گولوں کارتوسوں کے تیار ہے ۔ سامان رسد اور بار برداری کے جانور بھی سب موجود ہیں اور چشم زدن میں کام میں لائے جا سکتے ہیں ۔ میں حتی الامکان اس امر کی کوشش کر رہا ہوں کہ دس لاکھ فوج اعلیٰ قسم کے جدید ترین ساز و سامان سے مسلح مع رسد وغیرہ اور دو سال کی تنخواہ کے تیار رکھوں جو کہ جنگ دو سال کے لئے کافی ہو ۔ یہ اتنی بڑی تعداد آدمیوں کی افغانستان میں پندرہ دن کے عرصے میں بہم ہو سکتی ہے لیکن ہر شخص جو ذرا بھی جنگی معاملات سے واقف ہے سمجھ سکتا ہے کہ اتنی بڑی فوج کے لئے سامان بار برداری و رسد تنخواہ و دیگر ضروریات کا مہیا کرنا کس قدر دشوار کام ہے مگر ایک امر میرے لئے بہت موافق ہے وہ یہ کہ ملک اسلحہ جنگ سے پر ہے ہر مرد و زن کے پاس ایک بندوق و تلوار ضرور رہے اور بعض افغانی قبائل میں عروس کو جہیز میں مہیا کر دئے جاتے ہیں بار برداری کے لئے اونٹ ہاتھی ، گھوڑے ، ٹٹو ، خچر اور گدھوں کی کافی تعداد ملک میں ہے اور ملک اس قدر زرخیز ہے کہ ہے کہ بلا کسی خارجی امداد کے رسد کا سامان مہیا ہو سکتا ہے ۔ ہاں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو روپئے کی ہے جس کے جمع کرنے میں شب و روز کوشاں ہوں ۔"

ملکی محکمے | عبدالرحمٰن خاں نے تمام دفاتر اور محکمے کابل کے قلعے میں رکھے تھے اس قلعہ کو لوگ "ارک" کہتے ہیں ۔ ان تمام دفاتر کی چاروں طرف ایک وسیع باغ تھا جس کو عبدالرحمٰن خاں نے اپنے عہد میں تیار کرایا تھا ۔

محکمۂ خزانہ | جس میں تمام ملک کی آمدنی جمع ہوتی ، خزانے کی پھر دو شاخیں تھیں ، خزانہ خاص اور خزانہ عامرہ ۔ خزانہ خاص امیر کی ذاتی ملکیت تھی اور خزانہ عامرہ بیت المال تھا ۔ جس سے ملک کے تمام

اخراجات چلتے تھے اور یہ تمام خزانہ محاسب اعلیٰ کے ماتحت تھا عبدالرحمٰن خاں یا ولیعہد کی مہر کے بغیر روپیہ نہیں نکل سکتا تھا۔ اس خزانے کی شاخیں تمام ملک میں تھیں۔ جہاں کے اخراجات منہا ہونے کے بعد باقی رقم سال میں ایک مرتبہ صدر خزانے میں جمع کی جاتی تھی۔

محکمہ عدالت اس محکمے کا کام یہ تھا کہ تمام مقدمات تحقیق و تفتیش کے بعد فیصل ہوں۔ عبدالرحمٰن خاں سے پیشتر اس محکمے کا نام تک نہ تھا عجیب و غریب طریقے پر امیر افغانستان مقدمات کے فیصلے کرتا تھا۔ مثلاً شیر علی خاں کے زمانے میں یہ قانون تھا کہ جو شخص تین روپے سرکاری خزانے میں جمع کر دیتا وہ جس کو چاہتا قتل کر سکتا تھا۔ لیکن عبدالرحمٰن خاں نے فوراً اس قانون کو منسوخ کر دیا۔ اور تمام مقدمات شرع اسلامی کی رو سے فیصل ہونے لگے۔ مدعا علیہ کو اپنی صفائی کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اپیل بھی ہو سکتی تھی جس پر ولیعہد غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتا تھا۔ محکمہ عدالت کا پورا انتظام ایک قاضی القضاۃ کے تحت تھا جو عدالت العالیہ کا قاضی ہوتا تھا۔ تمام صوبوں کے قاضی اس کے ماتحت تھے۔

محکمہ تعمیرات تمام ملک میں سرکاری عمارات اور راستوں کی تعمیر اسی محکمے کے سپرد تھی۔ عبدالرحمٰن خاں سے پیشتر امیران کابل نے کوئی قابل ذکر عمارت نہیں تعمیر کرائی۔ عبدالرحمٰن خاں نے اس محکمہ کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر قائم کیا تھا اور تمام ملک میں سرکاری عمارتوں کی تعمیر اسی محکمے کے ذمے تھی۔ اس محکمے نے تمام بڑے بڑے شہروں کو سڑکوں کے ذریعے سے ملا دیا تھا۔

محکمہ حفظان صحت عبدالرحمانی عہد سے پیشتر حفظان صحت کا انتظام بالکل نہ تھا۔ بقول عبدالرحمٰن خاں "تمام ملک نیم حکیم خطرہ جان کے پنجوں میں پھنسا ہوا تھا" طبابت کا کام زیادہ تر معمولی پنساری کرتے تھے۔ لیکن عبدالرحمٰن خاں نے اس محکمے کو باقاعدہ قائم کیا۔ اس محکمے کی دو شاخیں تھیں ایک شاخ یونانی تھی اور دوسری ڈاکٹری۔ عبدالرحمٰن خاں نے اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں ہندوستانی مسلمان ڈاکٹروں کی بڑی تعریف کی ہے جن میں ڈاکٹر محمد دائم اور ڈاکٹر عبدالرحیم خاں کا نام خاص طور پر مذکور ہے جنھوں نے افغانستان کے طبی محکمے کو اپنی پیہم محنتوں سے اعلیٰ درجے پر پہنچا پایا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں اور چھاونیوں میں شفا خانے کھولے گئے تھے۔

محکمۂ معدنیات | افغانستان میں اس قدر کانیں ہیں کہ اگر ان کو کھودا جائے تو یہ ملک دنیا میں سب سے زیادہ متمول ملک ہو سکتا ہے لیکن بقول عبدالرحمٰن "جو شخص جوہری نہ ہو اسکے نزدیک ہیرا بلور دونوں یکساں ہیں"، یہی وجہ ہے کہ اہل افغانستان یا ان کے فرمانروا ان بیش بہا معادن سے فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن عبدالرحمٰن خاں نے معدنیات کا کام ایک محکمے کے ماتحت جاری کرایا تھا جس کا افسرِ اعلیٰ ایک ماہرِ معدنیات یورپین تھا جس نے نہایت جانفشانی سے جلال آباد اور غور بند میں یاقوت اور سیسے کی کانوں کی کھدائی کا کام شروع کرایا تھا جو نہایت کامیاب رہا۔

محکمۂ صنعت و حرفت | جس زمانے میں عبدالرحمٰن خاں وائسرائے ہند کی ملاقات کے لئے راولپنڈی میں آئے تھے وہاں ایک دخانی انجن کو دیکھ کر امیر کو شوق ہوا کہ اپنے ملک میں اس قسم کے انجن کو رواج دیں۔ چنانچہ عبدالرحمٰن خاں نے ایک یورپین مسٹر سالٹر پائن نامی انجنیر کو اس مقصد کے لئے ملازم رکھا جس نے ۱۸۸۶ء میں ایک ورکشاپ قائم کیا۔ اس کارخانے نے دن بدن ترقی کی چنانچہ چند ہی سال بعد اس کارخانے میں بندوقیں اور توپیں ڈھلنے لگیں۔ عبدالرحمٰن خاں کی آخری عمر میں اس کارخانے میں سات ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ جس میں روزانہ دس ہزار مارٹینی کارتوس اور دس ہزار سائیڈ کارتوس تیار ہوتے تھے۔ مزید براں یہاں سکے بھی مضروب ہوتے تھے۔ یومیہ ایک لاکھ بیس ہزار سکے مسکوک ہوکر نکلتے تھے۔ علاوہ ازیں چمڑے، دیاسلائی، صابون سازی اور گلٹ سازی وغیرہ کا کام ہوتا تھا۔ یہ کارخانہ نصف میل لمبا تھا۔

الغرض عبدالرحمٰن خاں نے اپنی قوم کے عشق میں وہ وہ کارنامے کئے کہ افغانستان کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہیں حقیقت یہ ہے کہ عبدالرحمٰن خاں نے اپنی قوم کے لئے وہ کام کئے تھے جو پیٹر اعظم نے روس کے لئے کیا تھا۔

محکمۂ تعلیم | عبدالرحمٰن خاں نے ابتدائی تعلیم کے لئے بہت زبردست کوشش کی تھی چنانچہ محکمۂ تعلیم کے ماتحت انھوں نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ابتدائی مدارس کا جال بچھا دیا تھا جس میں امراء روسا اور فوجیوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے اس کے علاوہ خود باشندگان ملک کی طرف سے بھی

مذہبی مدارس کا انتظام تھا۔ عبدالرحمٰن خاں کے زمانے میں حکومت کے عہدے کے لئے ایک خاص امتحان پاس کرنا پڑتا تھا۔ مولویوں کے لئے ایک امتحان تھا جس کے پاس کرنے کے بعد ان کو ملازمت ملتی تھی۔

محکمہ رسل و رسائل | عبدالرحمٰن خاں سے پیشتر یہ محکمہ برائے نام تھا پشاور سے کابل تک ڈاک جاتی تھی لیکن اس کا بھی کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ عبدالرحمٰن خاں نے اس محکمہ کو از سر نو قائم کیا اور اس کا جال تمام ملک میں پھیلا دیا۔ ہر بڑے شہر میں ایک ڈاکخانہ بنوایا گیا ہندوستان، چین، روس، ایران جاپان، یورپ اور امریکہ سے خطوط آنے جانے لگے۔ افغانی خطوط پر دولت افغانیہ کے اسٹامپ لگائے جاتے تھے۔ اس طریقہ پر اس محکمے کا خرچ اس کی آمد سے ہوتا تھا۔

محکمہ کمسریٹ | عبدالرحمٰن خاں نے گھوڑوں کی پرورش کے لئے ایک باقاعدہ محکمہ قائم کیا تھا۔ جس میں چوبیس ہزار گھوڑے تھے جن کی پرورش احتیاط اور جدید طریقے پر ہوتی تھی۔ عبدالرحمٰن خاں نے ان گھوڑوں کو عرب، ایران، ٹرکی، اسٹریلیا اور انگلستان سے منگایا تھا۔ اس محکمہ کا افسر اعلیٰ بھی ایک انگریز تھا جس کے ماتحت افغانی اور ہندوستانی نوجوان کام کرتے تھے۔

روزانہ مشاغل | عبدالرحمٰن خاں کی زندگی اپنے ہمعصر ایشیائی فرمارواؤں میں ممتاز نظر آتی ہے عبدالرحمٰن کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے جسم اور دماغ کو بیکار رکھے اور ان سے کوئی مفید کام نہ لے۔ عبدالرحمٰن کی زندگی میں ایک سپاہیانہ زندگی نظر آتی ہے وہ خود اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں تحریر کرتے ہیں۔

> "میں اپنی تمام زندگی میں پورا سپاہی ہی نہیں بلکہ ایک مزدور اور کام کرنے والے سے بھی زیادہ محنتی اور جفاکش رہا ہوں۔ میری پوشاک اور بود و باش ہمیشہ سادہ اور سپاہیانہ رہی ہے مجھے ہمیشہ یہ پسند رہا ہے کہ شب و روز کسی نہ کسی کام میں مشغول رہوں اور محنت کرتا رہوں اور صرف چند گھنٹے آرام کروں۔ چونکہ عادت طبیعت ثانی ہے اس لئے میری عادت ہو گئی ہے کہ باوجود علالت کے بھی اپنا کام پورا کئے بغیر

دم نہیں لیتا ہوں۔ میرے ڈاکٹر اور حکیم کہتے ہیں کہ ہر وقت محنت میرے لئے تمام امراض
کا باعث ہے۔ چونکہ ضرورت سے زیادہ جانفشانی کرتا ہوں اور کھانا وقت پر نہیں کھاتا میرا
جواب یہ ہے کہ عشق و منطق میں کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

عشق چوں در سینہ آمد عقل را اول ربود　　　دزد دانا می کشد اول چراغ خانہ را

چونکہ مجھے اپنی قوم کی بہبودی کا عشق ہے مجھے اپنی تکلیفیں مطلق محسوس نہیں ہوتی ہیں سوائے
اپنی رعایا کی مصیبتوں اور عیوب کے جو مجھ سے دیکھے نہیں جاتے جو لوگ مرض عشق میں
کبھی گرفتار نہیں ہوئے ہیں وہ ہرگز نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ عاشقوں کو کیسی دشواریاں اور
دقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

افغانستان کی فلاح و بہبودی کی جس قدر علامتیں کامیابی اور ترقی کی دیکھتا ہوں اسی
قدر اور زیادہ عرق ریزی کرتا ہوں جیسے کہ کوئی عاشق اپنے دلبر کا نقش پا دیکھ کر اس کی
طرف جاتا اور وہ نقش اسے راہ سے ادھر ادھر نہیں جانے دیتا۔ میری حالت بھی بالکل
اسی وارفتہ عاشق کی سی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا مجھے حکومت کے فرائض ادا کرنے کی
توفیق دے جس کے لئے اس نے اتنے لوگوں میں سے مجھے منتخب کیا ہے۔"

آگے چل کر عبدالرحمن خاں اپنی تزک میں اپنے روزانہ مشاغل اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"شب و روز چوبیس گھنٹے جو میں کام کرتا ہوں اس کے لئے کوئی وقت مقررہ یا کوئی
خاص انتظام نہیں ہے۔ بس صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ایک معمولی مزدور
کی طرح محنت کرتا رہتا ہوں جب بھوک معلوم ہوتی ہے تو کھانا کھاتا ہوں اور بعض
دن تو یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ میں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں مجھے اس کا خیال نہیں
رہتا اور کام سے سر اٹھا کر یک بارگی اپنے درباریوں سے دریافت کرتا ہوں کہ آج
میں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔ اسی طرح جب میں تھک جاتا ہوں اور نیند غلبہ کرتی
ہے تو اسی پلنگ پر سو جاتا ہوں جس پر کہ بیٹھ کر کام کرتا ہوں۔ مجھے کسی علیحدہ کمرے

یا سونے کے کمرے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ کسی خلوت گاہ یا بڑے دربار کا کمرا
درکار ہے۔ میرے محلوں میں اس قسم کے کمرے بہت ہیں لیکن مجھے اتنی فرصت کہاں کہ
ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھی جا سکوں"۔

عبدالرحمٰن خاں کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ "عبدالرحمٰن خاں اپنے ہمعصر مشرقی حکمرانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والا تھا۔ عبدالرحمٰن خاں عام طور پر صبح نو بجے اٹھتا تھا غسل اور ناشتے کے بعد دربار میں کام شروع کرتا تھا۔ دو بجے کا کھانا دربار ہی میں تناول کرتا تھا۔ شام کو دربار سے اٹھ کر پرائیویٹ مکان میں چارپائی پر بیٹھ جاتا تھا اور تمام احکامات وہاں سے صادر کرتا۔ غرض کہ ایک بجے رات تک امیر کا یہ معمول تھا اور اگر کام نہ ہوتا تو امیر گانا سنتا تھا اور اسی طرح اپنے دماغ کی تھکان دور کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن خاں کے مغنی ایرانی اور ہندوستانی تھے۔

عبدالرحمٰن خاں نے تمام دفاتر حکومت کو ایک مکان میں مرتب کرایا تھا اور خود ان سب دفاتر کا منتظم اور سپرنٹنڈنٹ تھا۔ نہ صرف ایک ایک پرزۂ کاغذ کا حال جانتا تھا بلکہ ایک ایک پائی خرچ حکومت کا اس کی منظوری کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ مزید براں امیر کے خاص کاموں کے لئے خاص دن مقرر تھے چنانچہ دوشنبہ کا دن قندھار اور ہرات کے معاملات کے لئے مقرر تھا۔ سہ شنبہ کا دن فوجی دربار کے لئے مخصوص تھا اور تمام فوجی افسروں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ چہارشنبہ کا دن دربار عام کے لئے معین تھا جس میں ہر امیر و غریب اپنی فریاد یا عرض و معروض کرسکتا تھا۔ پنجشنبہ کے دن حکومت برطانیہ کے ساتھ خط و کتابت کرتا تھا۔ شنبہ کا دن اپنے خانگی معاملات کے لئے وقف تھا اور جمعہ کا دن عبدالرحمٰن خاں کے آرام کا دن تھا۔

وفات اور اس کا جانشین اکیس سال تک افغانستان پر کامیاب حکومت کرکے تمام افغانستان کو متحد کرکے سنہ ۱۹۰۱ء میں اس دنیا سے رحلت کی۔ حد سے زیادہ محنت و مشقت کرنے کی وجہ سے نقرس کا عارضہ ہوگیا تھا۔ آخرالامر یہی عارضہ عبدالرحمٰن خاں کی وفات کا سبب بنا۔

سردار حبیب اللہ خاں جو عبدالرحمٰن خاں کا بڑا بیٹا تھا۔ جس کو عبدالرحمٰن خاں نے اپنی

زندگی میں آہستہ آہستہ تمام حکومت کے شعبوں کا نگراں بنایا تھا باتفاق سرداران قبائل امیر افغانستان مقرر ہوا۔ لیکن حبیب اللہ خاں اپنے عہد حکومت میں اپنے آپ کو ویسا ثابت نہ کرسکا جیسا کہ عبدالرحمٰن خاں کے تربیت یافتہ شہزادہ کو ہونا چاہئے تھا۔

اولاد عبدالرحمٰن خاں نے اپنی جلاوطنی سے پیشتر پہلی شادی کی تھی اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام عبداللہ خاں تھا جلاوطنی کے زمانے میں شیر علی خاں نے اس کو مع اسکی والدہ کے قندھار میں قید کردیا تھا اور یہ غریب شہزادہ انیس برس کی عمر میں اسی قید و مشقت میں مرگیا۔ دوسری شادی عبدالرحمٰن خاں نے سمرقند میں جلاوطنی کے زمانے میں جہاندار شاہ میر بدخشاں کی دختر سے کی تھی۔ اس خانم سے عبدالرحمٰن خاں کے کوئی اولاد نہ ہوئی لیکن اس خاتون کی ایک کنیز گلریز نامی تھی جس سے عبدالرحمٰن خاں کے دو بیٹے ہوئے جن کے نام حبیب اللہ خاں اور نصراللہ خاں تھے تیسری شادی تخت نشینی کے بعد کی جس سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام محمد عمر خاں تھا عبدالرحمٰن خاں کے مزاج پر اس آخری بیگم کو سب سے زیادہ قابو تھا۔ معاملہ فہمی، دانائی اور سخا میں یہ خاتون مشہور تھی۔ افغانستان میں سلطانہ کے نام سے مشہور تھی۔

جانشینوں کے لئے چند وصیتیں عبدالرحمٰن خاں نے اپنی تزک دو حصوں میں تحریر کی ہے حصہ اول میں اس نے وہ واقعات تحریر کئے ہیں جو زندگی میں پیش آئے تھے ان واقعات سے نتائج نکال کر اپنے جانشینوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ اچھی چیزوں کو اختیار کریں اور بری چیزوں سے بچیں اور دوسرا حصہ خاص طور پر ان وصیتوں اور تدابیر پر مشتمل ہے کہ افغانستان کو ملک کی ترقی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ بیرونی اور اندرونی پالیسی امیر کابل کی کیا ہونی چاہئے ان دونوں چیزوں کو عبدالرحمٰن خاں نے نہایت شرح و بسط سے تحریر کیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند وصیتیں

۱۔ سب سے مقدم اور مفید ترین صلاح جو اپنے جانشینوں اور قوم کو افغانستان کو عظیم الشان سلطنت بنانے کے لئے دے سکتا ہوں وہ اتفاق ہے۔ ہر افغانی کا فرض ہے کہ اتفاق کے فوائد کو مدنظر رکھے۔ اتفاق اور صرف اتفاق ہی افغانستان کو ایک عظیم الشان قوت بنا سکتا ہے اپنے وطن کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ تمام خاندان شاہی، شرفاء اور عوام الناس متفق ہوکر

ویک دلی قائم ہو اور سب ہم رائے بھی ہوں۔ افغانوں کو اسلام کا یہ زرین اصول مدنظر رکھنا چاہئے
" انما المؤمنون اخوۃ "

۲۔ میرے جانشین کو یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے کہ وہ قوم کو ثابت کر دکھائے کہ وہ مستقل مزاج، مضبوط طبیعت والا۔ اپنی ذات پر خود بھروسہ کرنے والا، جفاکش، ہمدرد اور وطن دوست حکمراں ہے اگر ان صفات میں سے ایک بھی کھو بیٹھے تو نہ صرف حکومت ہی کھو بیٹھے گا بلکہ خطروں میں مبتلا ہو جائے گا"

۳۔ میرے جانشینوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی فرصت کے وقت تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی کتب کا مطالعہ کرے کیونکہ یہ چیزیں ہر ایک حکمراں کے لئے ضروری اور لابدی ہیں۔ مزید براں ان تمام اخبارات اور تصانیف کا مطالعہ کرے جن میں وقتاً فوقتاً مملکت افغانستان کے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں"

۴۔ میرے جانشینوں کو چاہئے کہ میں نے جس باضابطہ حکومت کا بنیادی پتھر رکھا ہے گو ابھی تک اس نے جمہوری حکومت کی شکل نہیں اختیار کی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ میرے جانشین اگر مختلف ممالک کی حکومتوں کا طرز حکومت دیکھ کر اپنے لئے کوئی مفید طرز حکومت اختیار کریں گے تو انشاءاللہ تعالیٰ افغانستان دنیا کے متمدن ممالک کی صف میں کھڑا ہو سکے گا۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ بہترین اصول سلطنت وہی تھا جو کہ عرب کے اس عظیم الشان واضع قوانین یعنی ہمارے مقدس پیغمبر نے مقرر فرمایا تھا جس میں دو جماعتیں تھیں ایک مہاجرین اور دوسری انصار۔ ہر شخص اپنی رائے کا مجاز تھا۔ کثرت رائے پر عملدرآمد ہوتا تھا"

افغانستان کو جمہوری طرز پر چلانے کے لئے میں نے تین قسم کے وکلا دربار میں جمع کئے تھے۔ جو انتظامات حکومت کے متعلق مجھے مشورہ دیتے تھے مجھے امید ہے کہ میرے جانشین میری پیروی کریں گے۔ تدریجی طریقے سے ملک کو جمہوری نظام سے روشناس کریں گے اس کے بعد تمام ملک سے نمائندوں کا انتخاب کریں گے اور ایک مضبوط مجلس شوریٰ قائم کریں گے جو ملک کا تمام انتظام اپنے

مشورے سے کر سکے"

۵۔ "میرے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ جو اصلاحی تحریک ملک میں جاری کرنا چاہیں وہ سوچ سمجھ کر جاری کریں ایسا نہ ہو کہ رعایا کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ مغربی تعلیم کے دائرۃ العلوم اور جمہوری طرز حکومت کے قوانین بتدریج اختیار کریں"

۶۔ "میرے جانشینوں کے لئے ضروری ہے کہ فوجی نظام جدید اصولوں پر رکھیں۔ فوجی افسروں کی تعلیم و تربیت اور جدید اسلحہ جنگ کی بہم رسانی اور تیاری پر خاص طور پر توجہ کریں۔ کسی پڑوسی سلطنت کو اپنے سپاہی عاریۃً نہ دیں کیونکہ اس سے بُرے نتائج نکلیں گے۔ فوج کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ ان کو مقررہ وقت پر تنخواہیں دی جائیں تاکہ وفاداری کے ساتھ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کر سکیں۔ اسلحہ کے کارخانے جو میں نے قائم کئے ہیں ان کو ترقی دیں۔ معادن سے دھاتیں نکال کر جنگی سامان کی تیاری میں صرف کریں میرے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ ہر وقت تین لاکھ فوج مسلح تیار رکھیں تاکہ بوقت ضرورت ملک کی حفاظت ہو سکے"

عبدالرحمٰن خاں نے جو وصیتیں اپنے جانشینوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنی تزک میں تحریر کی ہیں ان سب کا اگر یہاں ذکر کیا جائے تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا اس لئے مندرجہ بالا وصیتوں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

عبدالرحمٰن خاں اور اتحاد اسلامی

عبدالرحمٰن خاں روسی اور برطانوی سیاسی پیش قدمی کو دیکھ کر اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں تحریر کرتا ہے کہ ایران، ٹرکی اور افغانستان تینوں اسلامی سلطنتیں متحد ہو کر اس مغربی پیش قدمی کو روکیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر سہ اسلامی سلطنتیں بذریعہ تار اور ریل ملائی جائیں تاکہ تجارتی، معاشی اور معاشرتی فائدہ ہو۔ لیکن افسوس مسلمان مدبرین نے اس مفید تجویز کی ناقدری کی جس کا نتیجہ بالآخر ظاہر ہو کر رہا۔

ایک دوسری جگہ عبدالرحمٰن خاں اپنی تزک میں مسلمانوں کی نااتفاقی اور انتشار پر افسوس کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

"اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اسلامی سلطنتوں کا زوال صرف باہمی عناد و نا اتفاقی اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے ہوا ہے اہل اسلام کو کامل عروج صرف اس مبارک و پاک قول پر عمل درآمد کرنے سے ہوا ہے جس کی اس عالیشان ترکیب دہندہ و اصلاح کنندہ عرب علیہ السلام نے تلقین فرمائی ہے اور وہ قول یہ ہے " انما المومنون اخوۃ " یعنی مسلمان سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور باہمی اور باہمی نفاق اور تفرقہ اور اس عمدہ اصول اور اتفاق کی پابندی نہ کرنے کے سبب سے اہل اسلام تباہ و برباد ہو گئے اور یکے بعد دیگرے ان کی عظیم الشان مملکتیں ان کے ہاتھوں سے جاتی رہیں۔

علمی قابلیت گو عبدالرحمٰن خاں کی تعلیم معمولی تھی لیکن انقلابات زمانہ اور تجربات نے اس کے اندر وہ قابلیت پیدا کر دی تھی کہ بڑے بڑے تعلیمیافتہ انسان بھی اس قابلیت سے محروم تھے عبدالرحمٰن خاں کی تصانیف میں سے مشہورتر تصنیف " تزک عبدالرحمانی " ہے جس میں عبدالرحمٰن خاں نے وہ تمام واقعات درج کئے ہیں جو اس کو اپنی زندگی میں پیش آئے تھے۔ یہ کتاب نہایت شستہ فارسی میں اس نے تحریر کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عبدالرحمٰن خاں کا طرز تحریر نہایت اعلیٰ اور دلفریب ہے۔ عبدالرحمٰن خاں کی نثر بالکل موتیوں کی لڑیوں کی طرح مسلسل ہے۔

عبدالرحمٰن خاں اپنے زمانہ کا نہایت اعلیٰ درجہ کا خطیب تھا ایک مشرقی اخبار نویس عبدالرحمٰن خاں کو قوت خطیبانہ پر رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

"عبدالرحمٰن خاں اپنے زمانہ کا ایک زبردست خطیب ہے اس کی عام تقریریں سننے میں ایک دلچسپی پائی جاتی ہے یہ تقریریں فی الواقع فصیح و بلیغ علم منطق کی چاشنی سے پر ہوتی ہے تقریر کے وقت سامعین پیکر دیوار کی طرح اُن کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں عبدالرحمٰن خاں اپنی تقریر میں گزشتہ تاریخی واقعات کا حوالہ دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تاریخ کا مطالعہ بہت ہی عمیق نظر سے کیا ہے"

عبدالرحمٰن خاں کی شخصیت | عبدالرحمٰن خاں کا میر منشی سلطان محمد خاں بارایٹ لا مترجم تزک عبدالرحمانی اپنی کتاب کے دیباچے میں عبدالرحمٰن خاں کی زندگی پر رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

"عبدالرحمٰن خاں اپنے زمانے کا بزرگ و لائق ترین شخص تھا ان تمام مدبروں نے جو اس سے ملے ہیں یہی رائے قائم کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ عجیب و غریب نادر کامیابی جو انھیں ایک ایسے ملک کو جوان کے زمانے سے بیشتر ایک ویران خطہ زمین وحشی توموں سے آباد تھا ایک مضبوط اور متحد اسلامی سلطنت بنانے اور صنعت و حرفت اور زمانہ حال کی نئی معلومات کا مرکز بنانے میں ہوئی ہے آپ اپنی نظیر ہے اور انکی غیر معمولی قدرتی فہم و ذکا کے لئے کافی شہادت ہے۔"

عبدالرحمٰن خاں کا وہی میر منشی عبدالرحمٰن خاں کی زندگی کی نیرنگیاں گناتے ہوئے اپنی کتاب کے دیباچہ میں آگے ایک دوسری جگہ یہ تحریر کرتا ہے۔

"عبدالرحمٰن خاں ایک وقت ہم کو قید و بند نظر آتا ہے دوسرے وقت اپنا کھانا آپ پکاتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ کبھی وائسرائے ہند کے پاس پناہ مانگتا ہے اور کبھی بحیثیت امیر کابل کے اس سے ملاقات کرتا ہے کسی وقت خود جنرل ہے اور دوسرے وقت کسی جنرل کے ماتحت کام کرتے ہوئے نظر آتا ہے کبھی کسی انجنیر اور آہنگر کی شکل میں ہے تو دوسرے وقت فرمانروائی کے لباس میں دکھائی دیتا ہے ایک جگہ وہ باغبانی کرتے ہوئے تو دوسری جگہ روسی اور برطانوی عالیشان درباروں میں ممتاز جگہ پر جلوہ افروز نظر آتا ہے کبھی بادشاہ ہے اور کبھی خشک ٹکڑے کے لئے محتاج ہے۔ غرض کہ یہ خوبیاں اور نیرنگیاں کسی اور ایشائی فرمانروا میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔"

سر لیپل گریفن جس نے افغانی سرداروں اور افغانی معاملات کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا

وہ عبدالرحمٰن خاں کی لیاقت و تدبر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"میری رائیں وہ تمام بارکزئی سرداروں میں جو آج تک مجھے ملے ہیں لیاقت میں سب سے بڑھ کر تھا۔ اس کی گفتگو سے دانائی و فہم و فراست ظاہر ہوتی تھی گفتگو میں وہ امر بحث طلب پر نہایت قابلیت سے نکتہ چینی کرتا تھا۔ اس کی رائے لیاقت و ذہانت سے پر تھی"

ایک امریکی سیاح جو عبدالرحمٰن خاں سے ۱۸۷۳ء میں سمرقند میں ملا تھا وہ عبدالرحمٰن خاں کی شخصیت پر رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

"وہ ایک جوان رعنا اور بارعب مضبوط آدمی ہے۔ وہ نہایت رعب و داب سے چلتا ہے اور اس کی حرکات و سکنات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات کا پکا اور حکمرانی کا عادی ہے"

---

(۱)

منگولیا ایک لق و دق، ہولناک صحرا ہے، اُس کا پتھر ہولناک اور اُس کا پانی ہولناک ہے۔ اِس کی تیتری تک ڈنک مارنے کا موقعہ تاکتی رہتی ہے۔

منگولیا والے کے دل کا حال کوئی نہیں جانتا۔ وہ پوستین پہنتا ہے اور چینی معلوم ہوتا ہے اور روسیوں سے بہت دور، نارکاٹے صحرا کے پاس پہنچ کر بس گیا ہے، کہتے ہیں کہ وہ چین سے گزر کر ہندوستان اور سات ساحلوں کے کنارے گمنام ہرے بھرے ملکوں میں پھیل جائے گا . . . . .

بہت سے کرغیزوں نے جو روسی لڑائی کے زمانے میں اپنا مال اسباب گاڑیوں پر لاد کر ارتیش سے منگولیا پہنچے تھے اپنے ڈیرے روسیوں کے قریب ڈال لئے تھے، اُن کے دل کا حال سب پر روشن ہے۔ پھرتے پھراتے وہ وہاں پہنچے اور اپنے جانوروں، بال بچوں اور بیماروں تک ساتھ لیتے گئے۔

روسی بے دردی سے اس طرف دھکیلے جا رہے تھے، مگر وہ ہٹے کٹے کسان تھے۔ اپنے نکمے ضعیفوں کو وہ پہاڑوں کے پتھروں پر چھوڑ آئے: ایک آدمی یہاں مرا، دوسرا وہاں مار مار کے ہلاک کر دیا گیا، بال بچے اور اوزار اور مویشی گوروں کے رحم پر چھوڑ دیئے گئے۔ بہار کے زمانے میں کسان بھیڑیوں کی طرح کینہ ور ہو جاتے تھے اپنے خیموں میں لیٹے لیٹے اسٹیپی کا ارتیش کا خیال کرتے رہتے تھے . . .

وہ پچاس کے قریب تھے۔ سرجائی سیلی دانوف اُن کا سردار تھا۔ اُن کی پلٹن کا نام "رفیق سیلی دانوف کی سرخ فوج کا دستہ" تھا۔

اُن کے دل اچاٹ تھے۔

جب وہ پہاڑوں پر سے دھکیلے جا رہے تھے تو کمائی پتھریلی زمین جس پر سے انھیں گزرنا پڑتا تھا

کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ وہ اسٹیپی میں پہنچے۔ وہاں اُنکا دل نہ لگا کیونکہ یہ کھلے میدان اُن کے ارتیش والے میدانوں کے سے تھے: وہی ریت، سخت گھاس، لوہے کی طرح تپتا ہوا آسمان، سب باتیں انوکھی اور پرائی تھیں اور زمین

عورتوں کے بغیر زندگی دوبھر تھی۔

رات کے وقت وہ حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے تھے اور عورتوں کی بابت سیاہیانہ کہانیاں کہتے تھے اور جب حالت برداشت سے باہر ہو جاتی تو گھوڑوں پر زین کس کے اسٹیپی میں کرغی عورتوں کو پکڑتے تھے۔

کرغی عورتیں اپنے تئیں ان کے قبضے میں دے دیتی تھیں

اُن کے ساتھ ہم بستر ہونے سے گھن آتی تھی، کیونکہ وہ بے حس ہو کر لیٹ جاتی تھیں اور آنکھیں زور سے میچ لیتی تھیں۔ یہ ایسا ہوا جیسے گھر کے مویشیوں کے ساتھ گناہ کیا۔

کرغی کسانوں سے ڈرتے تھے اور اسٹیپی کے قلب میں گھس جاتے تھے۔ کسی روسی کو دیکھتے تو اُسے بندوق یا کمان سے ڈراتے، کڑک کر للکارتے، مگر نہ تیر چلاتے نہ بندوق۔ شاید چلا نہیں سکتے تھے؟

(۳)

وستے کا خزانچی افاناسی پیترووچ دودھ پیتے بچے کی طرح بسورتا رہتا تھا۔ اُس کا چہرا بھی شیرخوار بچوں کا سا تھا، چھوٹا، صاف، سرخ و سفید۔ مگر اس کی ٹانگیں اونٹ کی طرح لمبی اور مضبوط تھیں۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کے تن جاتا تھا۔ اس کا چہرا چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا مگر شکل سے عتاب اور جلال ٹپکتا تھا۔

تثلیث کے دن تین آدمیوں کو حکم دیا گیا کہ اسٹیپی میں جا کر اچھی چراگاہیں تلاش کریں۔ یہ تین سلی دانوف خود، خزانچی افاناسی پیترووچ اور معتمد دریوزمیشن تھے۔

ریت دھوپ میں دھوئیں کے بادل کی طرح اٹھتا تھا۔

اوپر سے ہوا چل رہی تھی، زمین میں سے تھرتھراتے ہوئے آسمان کی طرف بخارات اٹھتے تھے

آدمیوں اور جانوروں کے جسم پتھر کی طرح سخت اور بھاری تھے۔ ہر چیز سے وحشت برستی تھی۔
سیلی وانوف نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا:
"نہ معلوم اُس طرف چراگاہوں کی کیا حالت ہوگی؟"
اُس کے ساتھی سمجھ گئے۔ اُس کی مراد ارتیش سے تھی مگر صاف چہروں والے چپ تھے۔ ایسا تھا گویا سورج نے اُن کے بال جلا دیے، جیسے وہ اسٹیپی کی گھاس کو جھلس دیتا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں انگارے کی طرح سرخ تھیں، جیسے مچھلی پکڑنے کے کانٹے سے زخم پڑ جاتے ہیں۔ شدت کی گرمی تھی۔
آخر کار افاناسی پتیر وچ نے پر درد لہجے میں کہا۔
"کہیں اُس طرف بھی سب کچھ نہ سوکھ گیا ہو؟"
اُس کی مہین آواز نم ناک تھی، مگر آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ البتہ اُس کی ران کے نیچے تھکے ہوئے اور ہانپتے ہوئے گھوڑے کی بڑی لمبی آنکھوں میں قطرے جھلک رہے تھے۔
اس طرح ایک کے پیچھے ایک جنگلی بکریوں کے بنائے ہوئے ڈگر پر دستے والے اسٹیپی کے رُخ چلے جا رہے تھے۔۔۔
ریت آگ کی طرح تپ رہا تھا، جہاں تک نظر کام کرتی تھی پھیلا ہوا تھا۔ ایسی ہوا تھی جس سے دم گھٹتا تھا۔ پسینہ جسم کے اندر ابل رہا تھا، مگر خشک جلد کے باہر نہیں پھوٹتا تھا۔ ۔ ۔
شام کے قریب جب وہ ایک وادی میں سے نکل رہے تھے، سیلی وانوف نے مغرب کی طرف اشارہ کرکے کہا:
"وہ دیکھو! اُس طرف سوار نظر آتے ہیں۔"
اس کا خیال ٹھیک تھا: حدِ نظر پر ریت کے گلابی بادل دکھائی دیتے تھے۔
"کرغی ہوں گے۔"
آپس میں بحث ہوئی۔ دریوبزینن نے کہا کہ کرغی سیلی وانوف کے کیمپ سے دور دور رہتے

ہیں، اُن میں اتنی ہمت نہیں کہ پاس آئیں۔ افاناسی تیبروسچ نے کہا، نہیں، کرغی ہی ہیں۔ ایسی بھاری گرد عموماً وہی اڑاتے ہیں۔

مگر جب وہ غبار کے قریب پہنچے تو سب کی رائے ہوئی:

'باہر والے . . . خبر نہیں کون . . .'

اپنے سواروں کی آواز سے گھوڑے سمجھ گئے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ انھوں نے کان کھڑے کئے اور اشارے سے بہت پہلے ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ خاکی اور زرد رنگ کے گھوڑے، لاشوں کی طرح گڑھوں میں دبک گئے، اُن کی بانس کی سی لمبی لمبی ٹانگوں سے بےبسی ظاہر ہوتی تھی۔ انھیں دیکھ کر ہنسی آتی تھی، کیا یہ شرم کا اثر تھا کہ انھوں نے اپنی بڑی بڑی سہمی ہوئی آنکھیں بند کرلیں اور ہانپنے لگے؟

سیلی وانوف اور خزانچی افاناسی تیبرووچ اپنے گھوڑوں کے برابر لیٹے ہوئے تھے۔ خزانچی ناک چڑھاکر بسور رہا تھا۔ اُس کی ڈھارس بندھانے کے لئے سیلی وانوف اُسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اس بچوں کے سے بسورنے سے اس بھاری ڈیل ڈول کے کسان کے دل کو ٹھنڈک پہنچی اور اسے شرارت سوجھی۔

پگڈنڈی غبار میں چھپ گئی تھی۔ پہیوں کی آواز آتی تھی، گھوڑوں کی لمبی لمبی کالی ایال گرد میں لہراتی ہوئی نظر آتی تھی۔

سیلی وانوف نے یقین کے لہجے میں کہا:

'روسی . . . افسر . . .'

نئی بنی ہوئی گاڑی میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ اُن کی ٹوپیوں کے گرد لال پٹیاں تھیں۔ گرد سے اُن کے چہرے چھپ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لال لال پٹیاں پیلے بادلوں میں جھلک رہی ہیں ایک ہاتھ جس میں چابک تھا جب گرد کے اوپر اٹھتا تھا تو اُس کے ساتھ ایک بندوق کی نال بھی اٹھتی تھی۔

دریویزمینن نے کچھ سوچ کر کہا:

'افسر کسی کام سے جا رہے ہیں۔ چڑھائی کی تیاری ہے . . . صاف معلوم ہوتا ہے۔'

پھر بے ادبی سے آنکھ مار کر بولا:

"سیلی وانچک، ہم ان کا قصہ پاک کر دیں گے نا؟

گاڑی اپنے مسافروں سمیت آگے بڑھ رہی ہے، اُن کے پاس اچھے گھوڑے ہیں۔ وہ خوش خوش چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے پیچھے گاڑی کے جو نشان بنتے ہیں وہ منگولیا کے گرد و غبار سے اس طرح مٹتے جا رہے ہیں جیسے کسی نے لومڑی کی دم سے اُن پر جھاڑو پھیر دی۔

افاناسی تیریوویچ نے اپنی رقت آمیز آواز سے کہا:

'بھائیو اس کی ضرورت نہیں ... بہتر ہے انھیں قید کر دو ... مارنے سے پہلے ذرا سوچو!'

'اپنے سر کی خیر مناؤ ... مار کھانے کو جی چاہتا ہے؟'

سیلی وانوف لال پیلا ہو گیا۔ جھڑک کر کہنے لگا:

'خزانچی یہاں رونے کی ضرورت نہیں ہے!'

سب سے زیادہ انھیں اس بات کا غصہ تھا کہ افسروں نے گارڈ کے بغیر اکیلے آنے کی ہمت کی گویا یہ خیال کیا کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، گویا کسانوں کو موت کا گھاٹ اتارنا معمولی بات ہے

اسی وقت ایک افسر گاڑی میں سر و قد کھڑا ہو کر اسٹیپی کے چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ کیا خاک نظر آتا؟ گرد تھی، جلی ہوئی سرخ گھاس پر شام کی ہوا تھی۔ دو گڑھوں کے پاس جو گھوڑوں کی لاشیں معلوم ہوتی تھیں، دو پتھر تھے ... کس قسم کے پتھر تھے؟ کیا لاشیں تھیں؟ ...

گاڑی، پہیے، سواریاں، اُن کے خیالات ... وہ تپتے ہوئے ریت پر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔

کمیں گاہ کے آدمیوں نے گولیاں چلائیں للکارا۔ پھر گولی چلائی

ایک ساتھ وہ دونوں ٹوپیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کے گاڑی میں گریں۔

باگیں دفعتہً ڈھیلی پڑ گئیں ...

گھوڑے طرارہ بھر کے سرپٹ بھاگے ... گرے۔ ایال پر سفید کف تھا ... رگ رگ پھڑک

رہی تھی۔ گھوڑے سر جھکا کر اٹھے۔

افاناسی پتیرووچ بولا:

ٹھنڈے ہو گئے ۔ ۔ ۔'

کسان اس طرف گئے۔ اندر جھانک کے دیکھا۔

سرخ پٹی کی ٹوپیوں والے دونوں مسافر مر چکے تھے۔ وہ دونوں کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے تھے سر پیچھے کی طرف کو جھکے ہوئے تھے۔ مُردوں میں سے ایک عورت تھی۔ اُس کے بال بکھر گئے تھے، فوجی وردی میں سے عورت کی اونچی چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

دریویز مینن نے کہا، عجب بات ہے۔ قصور اسی کا ہے۔ اسے یہ ٹوپی پہننے کا کوئی حق نہیں تھا۔ عورت کو کون مارنا چاہتا ہے؟ ۔ ۔ عورتوں کی سماج کو ضرورت ہے'۔

افاناسی پتیرووچ نے تھوکا۔

تم بھی نرے بن مانس اور بورژوا[1] ہو ۔ ۔ ۔ تمھاری کھوپڑی میں کچھ نہیں ہے ۔ ۔ کوڑا ہی کوڑا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔'

سیلی وانوف نے انھیں روکا۔ اتنی زبان مت چلاؤ، ہم لٹیرے نہیں ہیں، سامان کی فہرست بنانی چاہئے۔ یہ اب قوم کی ملکیت ہے۔ کاغذ لاؤ۔'

قومی ملکیت کی چیزوں میں سب سے پہلے ان کی نظر ایک ہلکے رنگ کی آنکھوں اور بھورے بالوں والے بچے پر پڑی جو ایک بنی ہوئی چینی ٹوکری میں لیٹا تھا۔ اپنے چھوٹے سے ہاتھ میں وہ خاکی کمبل کا کنارا بھینچ کر پکڑے ہوئے تھا، شیر خوار تھا، ننھا منا تھا، اور مہین آواز سے روں روں کر رہا تھا۔

افاناپتیرووچ نے رقت سے کہا:

دیکھا ۔ ۔ ۔ اس کی بھی سنو یہ کیا کہتا ہے ۔ ۔ ۔'

---

(۱) متوسط طبقے کے شریف آدمی کو کہتے ہیں۔ اشتراکیوں کے نزدیک گویا یہ گالی ہے۔

عورت پر انھوں نے رحم کھایا اور اس کے کپڑے نہیں اتارے، مرد کو ننگا ریت میں گاڑ دیا۔

(۳)

افاناسی پتیر ووچ پکڑی ہوئی گاڑی میں واپس روانہ ہوا، بچے کو گود میں لے لیا اور اُسے ہلا ہلا کر دھیمی آواز سے گانے لگا:

بلبل درد بھرا گیت گاتی ہے . . . بیٹا بھی . . . میرے دل پر کیسی چوٹ لگتی ہے! . . .

اُسے اپنا گاؤں لیبیاجائی، مویشیوں کے گلے، اپنا کنبہ، چھوٹے چھوٹے بچے یاد آئے۔ اور وہ دبی ہوئی آواز سے رونے لگا۔

بچہ بھی رویا۔

تپتا ہوا، بھربھرا، خشک ریت بھی، جب گاڑی اس پر سے گزرتی ہے، دبی آواز سے روتا نظر آتا تھا۔

دستے والے اپنے پستہ قد، مضبوط کھال کے منگولی گھوڑوں پر سوار تھے۔ اُن کے چہرے تپ رہے تھے، اُن کی روحیں تپ رہی تھیں۔

پگڈنڈیوں کے قریب دھوپ سے جھلسے ہوئے خنظل کے قطعے تھے جن کے کانٹے ریت کی طرح نوک دار تھے۔

ریت خنظل سے، باریک اور چبھتا ہوا۔

آہ، پگڈنڈیاں، بکریوں کی پگڈنڈیاں! آہ، ریت، چبھتا ہوا ریت! منگولیا ایک لق ودق، ہولناک صحرا ہے! . . . .

× × × × × × ×

انھوں نے افسر کے سامان کا جائزہ لیا، کتابیں تھیں، ایک ڈبے میں تمباکو، اور فولاد کے چمکتے ہوئے آلات تھے۔ ان میں سے ایک پیتل کا چوکور ڈبہ تھا جو تین لمبی ٹانگوں پر کھڑا تھا، اُس کے کئی حصے تھے۔

دستے والوں نے مختلف چیزوں کو ٹٹولا، انھیں ہاتھ سے چھوا، بار بار اٹھا کر دیکھا کہ ان میں کتنا بوجھ ہے۔

کسانوں میں سے بھیڑ کی چربی کی بو آتی تھی کچھ اور کرنے کو نہ تھا وہ بہت سا کھا گئے۔ چکنائی ان کے کپڑوں پر گر گئی۔ بڑی بڑی گال کی ہڈیاں، پتلے پتلے ہونٹ، وہ ڈان کے کنارے قفقاز کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ لمبے لمبے کالے بال، سنولائے ہوئے چہرے۔ وہ چونے کی کانوں میں کام کر چکے تھے۔

ان سب کی ٹانگیں بھدی تھیں۔ ان کی آوازیں اسٹیپی والوں کی طرح حلق سے نکلتی تھیں

افاناسی پتیرووچ نے چیلی آئے کو ٹانگ سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنی آنکھوں سکیڑ لیں:

'یہ دُوربین ہے ... اچھی دوربین ہے، لاکھوں میں آئی ہوگی۔ یار دانھیں اس میں چاند دکھائی دیا ... چاند میں ریت ... اسے دھونے کی ضرورت نہیں ... آٹے کی طرح گرتا ہے خالص سونا ہے، بس بوری میں بھرنے کی دیر ہے ...'

ان میں سے ایک جو شہر میں رہ چکا تھا قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

'زیٹ'

افاناسی پتیرووچ کو تاؤ آگیا۔

'پلید مُردار، یہ زیٹ ہے؟ ... ذرا ٹھہر جا؛ کس کے لئے ٹھہروں؟'

افاناسی پتیرووچ نے پستول سنبھالی۔

سیلی وانوف نے اُن کا غصہ دھیما کیا۔

تبا کو انھوں نے آپس میں بانٹ لیا اور آلات خزانچی کے حوالے کر دئے، وہ موقع پا کر کسی چیز کے بدلے میں کرغیزوں کو دے دے گا۔

اس نے آلات بچے کے آگے رکھ دے۔

ان سے کھیل ...،

بچے نے اس نذرانے پر توجہ نہیں کی، روے گیا۔ افاناسی پتیرووِچ نے اُسے بہلانے کی بہت کوشش کی، پسینے پسینے ہوگیا مگر بچہ نہ بہلا، برابر روتا رہا۔

باورچی کھانا لائے مکھن، دلیے اور شوربے کی بھبک آئی جوتوں میں سے کاٹ کے بڑے بڑے چمچے نکالے گئے۔ شیشے والوں نے گھاس پاؤں سے روند ڈالی تھی۔ چوٹی کے اوپر سے سنتری نے پکار کر کہا:

جلدی کرو! ... بھوک لگ رہی ہے... یہاں کسی اور کو بھیج دو!،

کھانا کھا چکے تو خیال آیا: بچے کے کھانے کا کیا ہوگا؟ اس نے رونا موقوف نہیں کیا تھا۔

افاناسی پتیرووِچ نے روٹی کا نوالا چبایا۔ گیلی روٹی کا ٹکڑا بچے کے ننھے سے کھلے ہوئے منہ میں رکھ کر چمکار کر کہا:

ننھے ... اسے حلق سے اتارلے، ننھے ... مزے کا ہے،

مگر بچے نے منہ پھیر لیا اور ہونٹ بند کر لئے، ناک ہی ناک میں بلکتا رہا، اس کی دبی ہوئی چیخوں سے دل ہلا جاتا تھا۔

کسان آئے اور اُس کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے، ایک کے پیچھے ایک کھڑا ہو کر بچے کو دیکھنے لگا۔ سب چپ تھے۔

شدت کی گرمی تھی۔ اُن کے کلے اور ہونٹ گوشت سے چکنے ہو گئے تھے۔ کرتوں کے گلے کھلے تھے، پاؤں ننگے اور منگولیا کی زمین کی طرح زرد تھے۔

ایک کسان نے تجویز پیش کی:

،شوربا پلا کے دیکھو،

انھوں نے شوربہ ٹھنڈا کیا۔ افاناسی پتیرووِچ نے اس میں انگلی ڈبو کر بچے کے منہ میں ٹھونس دی۔ چکنا گاڑھا شوربہ ہونٹوں پر سے بہتا ہوا اس کے چھوٹے گلابی کرتے اور موٹی بانات کے کمبل پر گر گیا۔

اس نے نہیں پیا، روئے گیا۔

'کتے کا پلا زیادہ سمجھدار ہوتا ہے ... تمھاری انگلی چبا جاتا ...'

'ایک کتا ہے، دوسرا انسان ....'

'سوچنے سے کام نہیں چلے گا!'

کیمپ میں گائے کا دودھ نہیں تھا۔ انھوں نے سوچا کہ گھوڑی کا دودھ پلائیں۔ پھر خیال آیا کہ کہیں بچہ مر نہ جائے۔

کسان اپنی گاڑیوں کے پاس چلے گئے، حیران پریشان ٹکریوں میں بٹ کر سوچنے لگے۔ افاناسی پتیروچ ایک پھٹا بنیان کندھے پر ڈالے کبھی اس گاڑی کے پاس جاتا تھا، کبھی اس کے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی پھٹی پڑتی تھیں۔ اس کی مہین آواز بچے کی طرح مضطرب تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچہ بسورتا ہوا ادھر سے ادھر پھر رہا ہے

'اب کیا ہوگا؟ ... کسانو کیا کیا جائے؟ ... کوئی تدبیر تو ہوگی، کیوں؟ ... کتے کے بچو، تمھارے بھیجے میں کچھ نہیں آتا؟ ...'

چوڑے چکلے شانوں والے، قوی ہیکل جوان بے بس کھڑے تھے۔

'یہ عورت کا کام ہے ...'

'کہتے تو ٹھیک ہو ...'

'عورت کے ہاتھ سے پوری بھیڑ کھا جاتا ...'

'یہی بات ہے ...'

'سیلی وانوف نے لوگوں کو جمع کرکے کہا:

'یہ نہیں ہو سکتا کہ اس عیسائی بچے کو جانوروں کی موت مرنے دیا جائے مانا کہ اس کا باپ بورژوا تھا۔ مگر بچے کی بات کیا کہتے ہو؟ وہ خود بے قصور ہے'

کسانوں نے اتفاق کیا۔

وریویز مینن نے ایک قہقہہ مارا۔
بچے کو بڑا ہونے دو! یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اور سنہری ریت جمع کرنے چاند تک اڑ کر پہنچے گا . . . "
کسانوں کو ہنسی نہیں آئی۔ افاناسی پتیر ووچ نے گھونسا تان کر زور سے کہا:
تم جاہل ہو۔ یہ ہے تمہاری کایا! ایک تمہیں مذاق اڑاتے ہو!
اُس نے زمین پر پاؤں مارا، اپنے شانے ہلائے۔ یکایک پکار کر بولا:
'گائے . . . اس کے لئے گائے چاہئے!'
سب نے ایک زبان ہو کر کہا:
"گائے کے بغیر نہیں جی سکتا . . . "
'گائے ہونی چاہئے . . . '
'گائے کے بغیر مر جائے گا!"
افاناسی پتیر ووچ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا:
یارو گائے میں جا کر لاؤں گا . . . '
وریویز مینن نے بدتمیزی سے بات کاٹ کر کہا:
'کیا ارتیش یا لیبیا جائی جا رہے ہو؟'
'کمبخت موذی، ارتیش جا کر کیا لوں گا! کرغیوں کے پاس جا رہا ہوں
دوربین کے بدلے گائے لانے کا خیال ہے! جائیے سرکار!'
افاناسی پتیر ووچ آگ بگولا ہو گیا:
مُردار! میرے گھونسے کا مزا چکھے گا؟'
پنچایت کے چودھری سیسلی وانوف نے کہا:
'بس اب چپ رہو!'

رائے لی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ دریوزینین، افاناسی پتیرووچ اور تین اور گھوڑوں پر سوار ہوکر اسٹیپی میں کرغیزوں کے کسی گاؤں میں جائیں اور ایک گائے کو گھیر کر اپنے ساتھ لیتے آئیں، موقعہ چلا تو ممکن ہے دو یا پانچ گائیں ہاتھ لگ جائیں۔ باورچی کہہ رہے تھے کہ گوشت کا ذخیرہ ختم ہونے والا ہے۔ انھوں نے بندوقیں زین سے باندھیں اور لومڑی کی کھال کی ٹوپیاں پہنیں تاکہ دور سے کرغیزی معلوم ہوں۔

بچے کو کمبل میں لپیٹ کر گاڑی میں لٹا دیا۔ ایک جوان کسان اس کے پاس بیٹھ گیا اور رانیا اور بچے کا دل بہلانے کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفے سے خنظل کی جھاڑیوں میں گولیاں چلاتا رہا۔

(۴)

آہ منگولیا کا سنسان ریت! آہ کمبخت نیلے پتھر!

روسی ریت پر چلے جا رہے ہیں۔ رات ہے۔
ریت میں سے گرم گرم بھبکے، خنظل کی بو اٹھتی ہے۔
کرغیزوں کے گاؤں کے کتے بھیڑیئے پر، اندھیرے پر بھونکتے ہیں،
بھیڑیئے اندھیرے میں بھوک پر موت پر دہاڑتے ہیں۔
کرغیزی جان بچا کر بھاگے۔
کیا مویشیوں کے گلّے صحیح سلامت رہ جائیں گے؟

کرغیزوں کے گاؤں میں سے کھٹے دودھ کی بو آتی تھی، دبلے بھوکے بچے الاؤ کے ارد گرد بیٹھے تھے ان کے پاس کتّے تیز دہانے والے کتے تھے جن کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں جیسے جھاڑ پھونس کے تودے معلوم ہوتے تھے۔ خیموں کے پار ایک جھیل اور سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں۔ دفعتہً جھاڑیوں میں سے گولیوں کی آواز آئی جو الاؤ پر چلائی گئی تھیں۔ بھگدڑ مچ گئی۔
کرغیزی گھبرا کر اپنی ٹاٹ کی جھونپڑیوں میں سے نکل نکل کر بھاگے، دہشت کے مارے چیخنے لگے

اچک اچک کر گھوڑوں پر چڑھ گئے۔ گھوڑے دن رات زین کسے کسائے کھڑے رہتے تھے۔ اپنے خیموں کو روند ڈالا، اسٹیپی کو روند ڈالا، سرکنڈوں میں سے وحشیانہ صدائیں آرہی تھیں:

'خبردار، خبردار، لال فوج، گوری فوج، روسی۔ خبردار، خبردار...'

ایک سفید داڑھی والا آدمی گھوڑے پر سے گرا۔ اس کا سر ایک پکتی ہوئی دیگ سے ٹکرایا۔ دیگ الٹ گئی۔ وہ جل گیا اور دبی ہوئی آواز میں کراہنے لگا۔ ایک بھوکا جھبرا کتا ٹانگوں میں دم دبائے پہنچا، احتیاط سے جلتے ہوئے دودھ میں منہ ڈالا۔

گھوڑیاں زور سے ہنہنانے لگیں۔ گلے میں بھیڑیں سہم کر ادھر ادھر بھاگنے لگیں جیسے ان پر بھیڑیے آگرے۔ گائیں ہانپنے لگیں۔

کرغیز عورتوں نے روسیوں کو دیکھ کر بے بسی اور عاجزی سے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔

دریویز مینن ہوس ناک انداز سے ہنسا۔

'تو گویا ہم ساتھ ہوتے، کیوں؟ ہم سے ہمیشہ یہ نہیں ہوگا...'

اپنی چپٹی بوتل دودھ سے بھر کر، چابک کھینچتا ہوا، کچھ گائیں اور بچھڑے گھیر کر وہ ایک خیمے کی طرف لے گیا۔

بچھڑے رسی سے چھوٹ کر تھنوں کی طرف جھپٹے اور ہمک کر تھن اپنے بڑے بڑے نرم ہونٹوں میں لے لئے۔

'بہت بھوکے معلوم ہوتے ہیں...'

دریویز مینن نے بچھڑوں پر بندوق چلائی۔

افاناسی تیبرودچ گاؤں کا چکر لگا کر دریویز مینن کے ساتھ اپنے گھوڑے پر چڑھ رہا تھا کہ اسے خیال آیا:

'ارے کمبخت دودھ پلانے کی بوتل لینی ہے، بھول ہی گیا تھا!'

بوتل کی تلاش میں کبھی خیموں کے اندر جاتا تھا، کبھی باہر نکلتا تھا۔ خیموں کی آگ بجھنے کو تھی۔

افاناسی پتیرووچ نے ایک سلگتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور بوتل ڈھونڈنے لگا۔ لکڑی کو اس طرح اٹھایا کہ اس میں سے چنگاریاں اڑنے لگیں اور وہ دھوئیں سے کھانسنے لگا۔ ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لکڑی چٹخ رہی تھی، دوسرے ہاتھ میں بندوق تھی، بوتل نہیں ملی۔ مسکین کرغی عورتیں اپنے بچھونوں پر پھیلی ہوئی لیٹی تھیں بچے چلا رہے تھے۔

افاناسی پتیرووچ کو جلال آگیا۔ ایک خیمے میں اس نے ایک کرغی عورت کو ڈانٹ کر کہا:

"نابکار، بوتل چاہئے، بوتل!"

کرغی عورت رو رو کر اپنا ریشمی خفتان کھولنے لگی . . . اس کے پہلو میں ایک بچہ گدڑی میں رو رہا تھا۔

افاناسی پتیرووچ نے جھپٹ کر اس کی چھاتیاں ہاتھ میں لیں اور انھیں دبایا۔ اس نے سیٹی بجائی اور خوشی سے بے قابو ہو کر چیخنے لگا۔

واہ وا، دودھ پلانے کی بوتل! خوب ملی! . . . آتاغل کیوں مچاتی؟ بہت اچھی بوتل ہے!

اندھیرے میں اس عورت کو زین پر بٹھایا اور بار بار اس کی چھاتی پر ہاتھ ڈالتا رہا، یہاں تک کہ اسے یلی وانوف کے کیمپ میں لے آیا۔

خوشی کے جوش میں کہنے لگا، جو چیز چاہتا تھا وہ مل گئی۔ جب میں کہتا ہوں کہ فلاں چیز کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ لاؤں گا تو ڈھونڈھ لاتا ہوں، خواہ اس کے لئے زمین ہی کیوں نہ کھودنی پڑے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

(۶)

کیمپ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کرغی عورت اندھیرے میں اپنے بچے کو بھی ساتھ لے آئی ہے۔ کسانوں نے کہا خیر دودھ دونوں کے لئے کافی ہو جائے گا۔ گائیں ہیں اور عورت بھی خوب تیار ہے۔

کرغی عورت گم صم تھی، اس کے چہرے پر سختی تھی جب کوئی آس پاس نہ ہوتا تو بچوں کو دودھ

پلاتی تھی۔ دونوں خیمے میں ٹاٹ کے بچھونے پر لیٹ جاتے۔ ایک بالکل سفید، دوسرا زرد، اور دونوں ایک سی آواز میں روتے تھے۔

ہفتہ بھر بعد پنچایت میں افاناسی پتیروویچ نے شکایت کی:

"رفیقو، مجھے یہ آنکھ مچولی پسند نہیں۔ کرغی عورت ہمیں دھوکا دے رہی ہے، سارا دودھ اپنے بچے کو پلادیتی ہے۔ کبھی کبھار ایک آدھ بوند ہمارے بچے کو پلادیتی ہے۔ بھائیو، میں اپنی آنکھ سے جھانک دیکھ چکا ہوں۔ تم خود بھی چل کر دیکھ لو . . . "

کسان گئے اور انھوں نے دیکھا بچے، بچوں کی طرح تھے۔ ایک گورا چٹا تھا، دوسرا پکے ہوئے خربوزے کی طرح زرد۔ صاف نظر آتا تھا کہ کرغی کے مقابلے میں روسی بچہ بہت ناتوان ہے۔

افاناسی پتیروویچ نے ادھر اُدھر ہاتھ پھینک کر کہا:

میں نے اس کا نام سوچ لیا ہے واسکا . . . مگر ذرا اس کی حالت تو دیکھو . . . یہ دھوکا نہیں تو کیا ہے!"

دریویز ینیفن بولا مگر اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ رہا کرتی اس کا کہیں پتہ نہ تھا:

"ارے میرے واسکا تو تو معلوم ہوتا ہے کہ اب چلا"

انھوں نے ایک لکڑی لی اور گاڑی کے بم پر اس طرح رکھی کہ ایک رخ دوسرے سے زیادہ جھکنے پائے، یہ دیکھنے کو کون زیادہ بھاری ہے، ایک بچے کو اس طرف اور دوسرے کو اس طرف بٹھا دیا۔ پھٹی پرانی گدڑی میں لپٹے ہوئے بچے رونے لگے، اُن میں سے بچوں کی ہلکی ہلکی بو آتی تھی۔ کرغی عورت گاڑی کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

کسان چپ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔

سیلی وانوف نے کہا "اب چھوڑ دو! دیکھیں ترازو کیا کہتی ہے!"

افاناسی پتیروویچ نے لکڑی پر سے ہاتھ اٹھا لئے۔ روسی بچہ فوراً اوپر اٹھ گیا،

افاناسی نے جھنجلا کر کہا "خدا سمجھے تجھ سے کمبخت زرد منہ والی"

اس نے ایک بھیڑ کی کھوپڑی جو زمین پر پڑی تھی اٹھائی اور روسی بچے کی طرف رکھ دی۔ دونوں کا وزن برابر ہو گیا۔

اس نے اپنے بچے کو بھیڑ کے برابر زیادہ دودھ پلا دیا تھا۔

کسانوں میں غوغا مچ گیا۔

'کسی نے دیکھ بھال نہیں کی؟'

'دیکھ بھال کے سوا اور بھی کام ہیں!'

چند زیادہ ثقہ کسانوں نے اس رائے کی تائید کی؛

'دیکھ بھال کوئی کیسے کر سکتا ہے؟'

'اس کے علاوہ وہ دوسرے بچے کی ماں ہے۔'

افاناسی تیبرووچ نے زمین پر پاؤں پٹخا اور پکار کر کہا:

'تو تم سمجھتے ہو کہ اپنے روس کے ایک جیتے جاگتے بچے کو

اس بدیسی کیڑے پر قربان کر دیں؟ اسے ایڑیاں رگڑ کے مرجانے دیں،'

سیلی وانوف نے افاناسی تیبرووچ سے کہا:

'اس کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے۔ میرا مطلب ہے اس دوسرے کا، مرجانے دو کرغی لونڈے کو۔

ایسے بہت سوں کو پار اتار چکے ہیں، ایک کم یا ایک زیادہ سے کیا فرق پڑتا ہے؟'

کسانوں نے اس پر نظر ڈالی اور چپ چاپ وہاں سے چلے گئے۔

افاناسی تیبرووچ نے کرغی بچے کو ایک پھٹی ہوئی بوری میں بند کر دیا۔

ماں رونے لگی۔ افاناسی تیبرووچ نے اس کے گلے پر ہلکا سا تھپڑ مارا اور بچے کو لے کر اسپی پہنچا۔

(۶)

دو دن بعد کسان خیمے کے قریب پنجوں کے بل کھڑے ایک دوسرے کے شانے پر سے اندر جھانک رہے تھے۔ ٹاٹ کے بچھونے پر کرغی عورت گورے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔

عورت کا چہرا سکین تھا، اس کی آنکھیں جئی کے بیجوں کی طرح چھوٹی چھوٹی تھیں۔
بچے کا منہ اس کی چھاتی سے لگا ہوا تھا اور وہ خفتان پر ہاتھ رکھے کلیلیں کر رہا تھا، اپنی ٹانگیں
اس بے ڈھنگے پن سے ادھر ادھر پھینک رہا تھا کہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی
کسان ہنسی کے مارے لوٹے جاتے تھے۔
مگر سب سے زیادہ رقت افاناسی پر تھی، ناک سکیڑ کر اس نے غمناک انداز سے کہا:
کیسا پیارا بچہ ہے!
ٹاٹ کے خیمے کے پار، کوئی نہیں کہہ سکتا کہاں تک ترچھی چٹانیں، گھاٹیاں، اسٹیپی،
کوئی نہیں جانتا کہ لق و دق، ہولناک منگولیا کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔

عرضِ امانت

"اناعرضنا الامانۃ" کی تفسیر ایک شاعر کی زبان سے

(۱)

ابھی کہ قدرت کی نکہتوں سے تمام دنیا مہک رہی تھی
ابھی کہ فطرت کے ساغروں سے شرابِ عرفاں چھلک رہی تھی

شعاعِ حسنِ ازل کا پرتو ہر ایک شے سے جھلک رہا تھا
ضیائے انوارِ سرمدی سے سوادِ عالم چمک رہا تھا

چہار سو تارہائے سازِ ہوا میں نغمے مچل رہے تھے
فضا تھی مخمور جوش میں مستیوں کے چشمے ابل رہے تھے

نظامِ عالم کے ذرے ذرے پہ ایک مستی سی چھا رہی تھی
کہ وجد میں روحِ آفرینش کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی

اٹھی ہوئی تھی عروسِ رنگیں ادا کے رخ سے نقاب گویا
وفور تھا کیفِ بےخودی کا برس رہا تھا شباب گویا

حسین تاروں میں رقص کرتی تھی لرزشِ مستیِ ترنم
لبوں پہ غنچوں کے کھیلتی تھی لطافتِ نزہتِ تبسم

گلوں کی دوشیزہ نکہتوں میں تھی ایک روحِ حیات ساری
نمو کی رعنائیوں سے یعنی جوان تھی کائنات ساری

شفق کی رنگین بارشوں سے نکھر رہا تھا جمالِ دنیا
غرض کہ تھا کمسنی کا عالم حسین تھی پیرزالِ دنیا

(۲)

کہ دفعتہً شاہدِ ازل کو "خبر نہیں" کیا خیال آیا
خفیف جنبش ہوئی لبوں میں ادائے رنگیں سے مسکرایا

اٹھیں یکایک جھکی نگاہیں، شکن لگی کھیلنے جبیں پر
رگوں میں اک موجِ خون دوڑی ابھر آئی سرخی رخِ حسیں پر

اٹھا اک انگڑائی لیکے اور مستیوں سے عطرِ حیات کھینچا
لطیف و پاکیزہ دستِ قدرت سے جوہرِ کائنات کھینچا

بیاضِ تخلیق کے ورق پر پھر ایک نقشِ حسین بنایا
ربابِ ہستی کے پردہ ہائے لطیف پر ایک راگ گایا

فضائے تقدیس میں جو گونجا تھا نغمہ سازِ آفرینش
وہ دستِ قدرت میں بن گیا آ کے اک گلِ نازِ آفرینش

حریمِ عصمت سے جلوہ آرا ہوئی عروسِ بہارِ فطرت
وہ حورِ دنیا، وہ روحِ امکاں، نشاطِ دوراں نگارِ فطرت

شباب کا شعلۂ مجسم، وہ حسن و ناز و ادا کی دیوی
وہ پیکرِ مستیِ ترنم، حجابِ شرم و حیا کی دیوی

جمیل چہرے پہ نورِ ایماں، شریر آنکھوں میں کفر عریاں لبوں میں آبِ حیات پنہاں، فسونِ رفتار حشر ساماں
صدائیں زورِ صدائے ایمن، جمال سے شمعِ طور روشن کنارِ رنگیں میں جانِ گلشن، سرورِ صد میکدہ بدامن

(۳)

ادا سے اُس نے فلک کی جانب جو مسکرا کر نگاہ ڈالی حسین تارے لرز گئے اور مسکرا کر نظر چرا لی
کرشمۂ حسن اس کو کہئے کہ زور تھا قوتِ نظر کا سفید منہ پڑ گیا فلک پر لطافتِ نزہتِ سحر کا
حریفِ رنگینیِ گلستاں جو چرخ پر غازۂ شفق تھا نظارۂ روئے دلنشیں کے اثر سے اُس کا بھی رنگ فق تھا
لائیں خورشید نے نگاہیں مگر بڑھی خیرگی نظر کی چمک اٹھی نقشِ سجدۂ پائے نازنیں سے جبیں قمر کی
یہاں سے مایوس ہو کے اُس نے شگفتہ باغوں کی سمت دیکھا بہارِ گلشن کا رُخ وہاں بھی عرق سے شرمندگی کے تر تھا
نکھار سبزہ کا منفعل تھا، ابھار پھولوں کا مضمحل تھا لبوں پہ کلیوں کے تھی خموشی، چمن میں جو نخل تھا خجل تھا
وہ زلفِ مشکیں کی مست نکہت، خرام کی شوخیاں قیامت ہوئی پریشاں گلوں کی خوشبو، صبا کی ہر چال میں ندامت
حرارتِ گرمیِ تبسم، حلاوتِ خوبیِ تکلم چھپا رہا کیف موجِ مے میں، نہاں ہوا ساز میں ترنم
غرض نہ آسودگی کے قابل مقام کا انتخاب ٹھہرا اس امتحاں میں غریب فہمی کا دل فقط کامیاب ٹھہرا

(۴)

ابھی وہ شاعر کے دل کے اندر ربابِ فطرت بجا رہی ہے خیال کے ہر عمق میں بیٹھی ہوئی وہی راگ گا رہی ہے
فضائے عالم پہ چھا رہا ہے وہی ترنم سحاب بن کر برس رہے ہیں تمام دنیا پہ مست نغمے شراب بن کر
انھیں کی رنگین بارشوں سے حسین ہے کائنات ساری شگفتگی ہے انھیں کے دم سے، جواں ہے حیات ساری

تنقید و تبصرہ

کتب :-

عطیہ پیغمبر - تقطیع چھوٹی - تعداد صفحات ۱۱۶ - لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت درج نہیں

ملنے کا پتہ - حضرت کامل جوناگڈھی - دفتر اخبار محمدی - اجمیری دروازہ - دہلی -

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت کامل جوناگڈھی نے آنحضرت صلعم کی چند اخلاقی احادیث کو اُردو کی رباعیوں میں ترجمہ کیا ہے - ایک صفحہ پر رباعی ہے اور اس کے مقابل کے دوسرے صفحہ پر اصل حدیث مع اردو ترجمہ نثر کے لکھ دی ہے - ترجمہ نثر کا بھی صاف ہے اور رباعیاں بھی خاصی ہیں - ان کا مطالعہ عام مسلمانوں کے لئے مفید اور دلچسپ ہوگا -

---

پیغام رسول - یہ کتاب مذکورۂ بالا کا دوسرا حصہ ہے جو ۱۳۱ صفحات پر تمام ہوا ہے اس میں بھی مختصر اور تعلیمی احادیث کے ترجے اردو نثر اور رباعیوں میں کئے گئے ہیں -

مظہر علم دین - یہ ۲۶ صفحوں کا رسالہ بھی حضرت کامل کی تصنیف ہے - اس میں علم کی فضیلت اور جہالت کی مذمت پر ایک مثنوی ہے - پہلے احادیث مع ترجمہ کے لکھی گئی ہیں اس کے بعد ۱۶ صفحوں میں مثنوی ہے جو مولوی روم کی مثنوی کے وزن پر ہے -

حضرت کامل کی ان تینوں کتابوں کو مذہبی حیثیت سے اگر بچوں کو پڑھایا جائے تو مفید ہوگا -

---

زہر عشق - چھوٹی تقطیع حجم مع مقدمات ۱۶۴ صفحے - چھپائی لکھائی اور کاغذ عمدہ - مجلد قیمت ۱۲/ - ملنے کا پتہ - دیوان اشاعت گورکھپور (یو - پی)

اُردو زبان کی بدنام مگر مشہور مثنوی زہر عشق جو لکھنؤ کے عہد عیش یعنی واجد علی شاہی دور کی ایک یادگار ہے اس کو حضرت مجنوں گورکھپوری نے اپنے ایک مقدمے کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ مقدمہ کے ذیل میں ایک بیان احسن صاحب کا ہے جو مثنوی مذکور کے مصنف نواب مرزا صاحب شوقؔ کے نواسے ہیں۔ یہ بیان اس مثنوی کی اصلی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے۔ حضرت نیاز فتحپوری کا بھی ایک تبصرہ شامل مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اپنے ادیبانہ انداز میں نواب مرزا کی شاعرانہ پختگی اور خامی دونوں دکھلائی ہیں۔

مجنوںؔ اور نیازؔ کے ساتھ اس جنس ادب سے لطف اندوز ہونے والے اور اس کی مدح سرائی کرنے والے صوفی صاحب دریابادی بھی ہیں۔ اس عہد میں کہ فرنگستان لارڈ بائرن کا کیوں مداح ہے ان کو اس مثنوی سے خاص الفت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مبسوط مضمون ان کا لکھا ہوا بھی شامل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس کی خوبیاں دکھلائی ہیں۔ مگر آخر اخلاقی قدور کی بھی کچھ قیمت ہے یا نہیں۔ خاص کر وہ قدور جو جملہ اقوام عالم میں مسلم ہوں۔ پھر ان کو پامال کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ بلا اس بحث کے چھیڑے ہوئے بھی اس مثنوی کی اشاعت ہوسکتی تھی اور بجائے ۱۱۲ صفحات کے غیر ضروری مقدمات کے صرف احسن صاحب کا بیان اس کی شان نزول کے متعلق کافی تھا۔ خود مثنوی اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس کی معنوی خوبیوں کو دکھلانے کے لئے کسی تبصرہ کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس کے ساتھ اگر نواب مرزا کی دوسری مثنوی بہار عشق جو ادبی لحاظ سے زہر عشق سے فائق تر ہے شامل کردی گئی ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ قیمت بھی زیادہ رکھی گئی ہے۔

دولتِ غزنویہ ۔ چھوٹی تقطیع۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔ چھپائی لکھائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۶؏
ملنے کا پتہ: منیجر صاحب کتب خانہ دارالادب۔ لاہور

اس کتاب میں مولانا محمود الرحمٰن صاحب ندوی نے سلطان محمود غزنوی اور اس

کے جانشینوں کے کارنامے اور مشرقی و مغربی مورخین کی تصانیف سے ان کے حالات جمع کئے
ہیں۔ سلطان محمود پر معاندین نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کے معقول جوابات لکھے ہیں۔
اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ سلیقۂ تحریر اور طرز بیان پسندیدہ ہے۔

اصلاح تعلیم ابتدائی۔ قاضی سید مظہر علی صاحب ایف۔ اے (علیگ) ساکن نصیر آباد ضلع مشرقی
خاندیس نے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی اصلاح کے متعلق تقریباً دو جزو کا یہ مضمون لکھ کر شائع کیا
ہے جس میں مفید مشورے دئے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم کو خصوصیت کے ساتھ
انھوں نے مسلمان طلبہ کے لئے سب سے بہتر قرار دیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں
کی تعلیم کے مسئلہ پر جو مفکرین غور کر رہے ہیں ان کی نظر میں ہمارا نصاب مقبول ہوتا جا رہا ہے۔
انھوں نے پونہ ڈویزن میں جامعہ کے نصاب تعلیم کو منظور کرانے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔ اور
بصورت دیگر یہ مشورہ دیا ہے کہ جو کمیٹی نصاب تیار کرے اس میں جامعہ کے اساتذہ میں سے
بھی دو اُستاد ضرور شریک کئے جائیں۔

دلچسپ نظمیں۔ چھوٹے بچوں کے لئے آسان اور مختصر ۲۴ نظموں کا مجموعہ۔ مصنفہ حضرت
ناظم انصاری۔ قیمت فی نسخہ ۲ر ملنے کا پتہ۔ مصنف سے انٹرنیشنل پریس۔ پرارتھنا سماج۔
بمبئی نمبر ۴

انقلاب افغانستان (جلد اول)۔ مصنفہ محمد حسین خاں بی۔ اے (علیگ) حجم ۲۸۴ صفحات
چھپائی لکھائی کاغذ اچھا۔ مع متعدد عکسی تصاویر قیمت فی نسخہ اعلیٰ ۸ر اوسط ۶ر
افغانستان کے واقعات حاضرہ کے متعلق یہ کتاب نہایت مفصل اور صداقت کے ساتھ
لکھی گئی ہے جس سے امان اللہ خاں سابق شاہ افغانستان کے ضیبت و خسران اور محمد نادر خاں

موجودہ بادشاہ کی فتوحات اور کامیابیوں کے اسباب وعلل واضح ہوجاتے ہیں
اس کے مصنف ایک مدت تک افغانستان کے صدر تعلیمات رہ چکے ہیں اور وہاں کے سرد وگرم کو چکھ چکے ہیں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے ۱۲ سالہ قیام افغانستان کے ذاتی معائنہ ومشاہدات کی بنا پر لکھا ہے۔ ہم ذاتی طور پر بھی مصنف کی حق گوئی اور نیک دلی سے واقف ہیں۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بیانات صحیح اور سچے ہیں۔ انھوں نے جن واقعات کو لکھا ہے وہ اپنی حقیقت کی شہادت خود دیتے ہیں اور ہر چند کہ وہ جزئی ہیں مگر ان سے اس پوری سرگزشت پر روشنی پڑتی ہے جو ان چند سالوں میں افغانستان میں گزری۔
جو لوگ افغانستان کے معاملے میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کو یہ کتاب ضرور مطالعہ کرنی چاہئے۔ یوں تاریخی حیثیت سے بھی یہ ہر شخص کے لئے دلچسپ ہے۔ اگرچہ مصنف کی اردو ایک عرصہ تک افغانستان میں رہنے سے بہت کچھ پشتو کے زیر اثر آگئی ہے لیکن مطلب سمجھانے سے قاصر نہیں ہے۔ دفتر پیام اسلام۔ جالندھر شہر (پنجاب) سے مل سکتی ہے۔

رسائل :۔

الہلال ۔ اس نام سے بڑی تقطیع پر واضح لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ۱۶ صفحوں کا ہفتہ وار اردو اخبار ہماری جامعہ کے تعلیم یافتوں نے نکالنا شروع کیا ہے جس کے متواتر پانچ نمبر اب تک موصول ہوچکے ہیں۔
اس کے مقاصد اور اس کی پالیسی وہی ہے جو اہل جامعہ کی ہے یعنی آزادی کا حامی، دین کا علمبردار اور ادب کا خادم۔ اب تک جس قدر نمبر اس کے نکلے ہیں ان کو دیکھ کر دل میں اس کی وقعت اور خوشی پیدا ہوتی ہے۔
برہما میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ مگر وہاں صحیح مسلک کا کوئی اخبار اس زبان میں نہ تھا۔ الہلال نے یہ کمی پوری کی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ برہما میں یہ ادب۔ دین اور

آزادی کی خدمت کرے گا۔ اور وہاں کے اُردو خواں طبقہ کو صحیح مسلک پر چلائے گا۔

اخبار نکالنا بالخصوص ایسے خطہ میں جہاں کے باشندے دوسری زبان بولتے ہوں بڑا مشکل کام ہے لیکن اس اخبار کے مدیر مولوی خلیل احمد و علی احمد خاں و اسرائیل احمد خاں نے جن کے قلم کی روانی اور جولانی سے اچھے اچھے اہل قلم لطف اندوز ہوتے ہیں عزم بالجزم کرلیا ہو کہ اس کو جاری رکھیں گے۔ انھوں نے الہلال پریس بھی قائم کرلیا ہے جو ایک حد تک اس کے بقا کی ضمانت ہو۔ ہم دل سے متمنی ہیں کہ یہ اخبار اپنی روشنی پھیلائے اور حسب منشا ترقی کرے قیمت سالانہ آٹھ روپیہ۔

ایوان ۔ ایوان اشاعت گورکھپور سے حضرت مجنوں کی ادارت میں یہ ماہوار رسالہ چار جزء کا نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ للعمر ہو اور چھپائی لکھائی اور کاغذ عمدہ ہو۔ اب تک دو نمبر نکلے ہیں۔ دونوں ادبی اور معنوی لحاظ سے دلکش ہیں۔ جس محنت سے یہ رسالہ تیار کیا جاتا ہو وہ قابل داد ہے اور وہ یہی ہو سکتی ہو کہ اہل نظر اس کو خریدیں تاکہ یہ اپنے معیار کو ترقی دے سکے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں اس وقت رسالوں کی کمی نہیں۔ لیکن ایسے رسائل جو علمی اور ادبی کہے جانے کے مستحق ہوں کم ہیں۔ ایوان اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اس صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے اور ہم کو امید ہے کہ یہ جلد مقبولیت اور ترقی حاصل کرے گا۔

اتالیق ۔ یہ ماہوار رسالہ نوعمر طلبہ کی علمی ترقی اور اخلاقی نشو و نما میں مدد دینے کے لئے مولوی محمد عبدالرب صاحب کوکب مولوی فاضل حیدرآباد دکن سے نکالتے ہیں۔ اس کا حجم دو جزء ہے اور مضامین خاصے ہیں۔ چھپائی لکھائی بھی اچھی ہے۔ قیمت کہیں درج نہیں۔

شذرات

سیاسیات حاضرہ نے مسلمانوں کو صاف صاف دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک تغیر اور نئے تجربات چاہتا ہے، مخلوط حلقۂ انتخاب اس کے مسلک کا امتیازی نشان ہے۔ دوسرا جدت سے ڈرتا اور احتیاط کو پسند کرتا ہے۔ جداگانہ حلقہ انتخاب اس کے مسلک کا طغرائے امتیاز ہے۔ ان کے اختلاف بالکل قدرتی ہیں۔ کسی نہ کسی صورت میں دنیا کی ہر متمدن قوم ایسی ہی جماعتیں رکھتی ہے۔ مخلوط اور جداگانہ حلقہ انتخاب کا حامی یہاں وہی درجہ رکھتا ہے جو ریڈیکل اور کنزرویٹو دوسرے ملکوں میں۔ ایک مستقبل کا نمائندہ ہے دوسرا ماضی کا۔ ایک کے پیش نظر تخیلات ہیں دوسرے کے تجربات۔ ایک ترقی چاہتا ہے دوسرا حفاظت۔ ایک دل کو مشعل راہ بناتا ہے دوسرا عقل کو۔ پس ہمیں ان کے اختلافات سے اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے دونوں ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والے ہیں نہ کہ ضد، مشیت الٰہی دونوں سے اپنا کام لینا چاہتی ہے۔ جہاں مسائل پر جمہور کی رائے لی جائے ایسے ناگزیر اختلافات کا نہ صرف گوارا کرنا مناسب ہے بلکہ ان کا ابھارنا اور منظر عام پر لانا ہی عین جمہوریت ہے۔ مگر جہاں پبلک کا یہ فرض ہے کہ وہ جماعتوں کے اختلافات کو اچھی طرح ظاہر ہونے کا موقع دے وہاں ہر جماعت کا یہ فرض ہے کہ اپنے مسلک کی نشر و اشاعت کا صحیح طریقہ اختیار کرے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ تعرض اصول سے رکھا جائے نہ کہ اشخاص سے اور کام دلائل سے لیا جائے نہ کہ تشدد سے۔ اختلاف کی آزادی روا اس لئے رکھی جاتی ہے کہ ہر اصول کو حسب استعداد مقبولیت حاصل کرنے کا موقع ملے اور بالآخر وہ اختیار کیا جائے جس پر زیادہ سے زیادہ لوگ متفق ہو سکیں لیکن اگر بحث اصول کی جگہ اشخاص کے حسن و قبح سے ہونے لگے اور زد و کوب و دشنام طرازی کا بازار گرم ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اصل مقصد فوت ہو جائے گا بلکہ ہر فریق بہت جلد

محسوس کرنے لگے گا کہ پبلک کی نگاہوں سے اس کا اعتبار اٹھ گیا جب سبھی جھوٹے سچے بدنام ہوجائیں تو کوئی کسے بھروسے کے قابل سمجھے ؟

ہم مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں نے افسوس کہ یہی غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔ مسائل کی اہمیت مقتضی تھی کہ ہر ایک سوچ سمجھ کر سنجیدگی سے اپنے دلائل پیش کرتا۔ مخلوط حلقۂ انتخاب کے حامی چشم تخیل سے کام لے کر آئندہ سیاست پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے۔ ملک میں سیاسی قوتوں کا توازن کیا ہوگا، کونسی نئی قوتیں پیدا ہوجائیں گی، اختلافات کی بنائیں کیا ہوں گی کونسے نئے مسائل ملک کی توجہ اپنی طرف جذب کرلیں گے، اور ان تمام باتوں کا اثر فرقہ وارانہ کشیدگی کو کس حد تک کم کرنے والا ثابت ہوگا۔ قدامت پسندوں کا خوف کہاں تک حق بجانب ثابت ہوگا۔ جو مسلمان اقلیت میں پڑ کر فی الواقع خطرے میں ہونگے ان کی کم سے کم اعداد کیا ہوگی ان کی حفاظت کے ذرائع جو سوچے گئے ہیں کیونکر کافی ہونگے۔ اسی طرح جداگانہ حلقۂ انتخاب کے حامی نظام اساسی کے مجوزہ تغیرات سے بے اطمینانی کے وجوہ ایک ایک کر کے صاف اور سلجھے طریقہ سے پیش کرتے۔ فرقہ وارانہ تعلقات کی موجودہ حالت نے انھیں بالکل ہی مایوس کیوں بنادیا ہے، وطنیت اور رواداری کی جدید تحریک پر انھیں اعتماد کس لئے نہیں ہے۔ جداگانہ حلقہ انتخاب کو مذہب اور تمدن کی حفاظت کا قطعی ضامن کیونکر مان لیا جائے اور اسے فرقہ وارانہ تعلقات کے بدسے بدتر ہوجانے کا سبب کس واسطے نہ سمجھا جائے مگر ایسے امور سے بحث کر کے پبلک کی تسکین کی جگہ تخویف سے کام لینا۔ اکابر ملت کو جن کے آگے کل تک سب کی آنکھیں فرش راہ ہوتی تھیں۔ محض اختلاف خیال کے جرم میں ذلیل ورسوا کرنا۔ ایک دوسرے کے خلاف اشتعال انگیز باتیں کہنا، گالیاں دینا، مذاق اڑانا یہ ہے وہ طریقہ جو ہم اکثر اپنے لئے پسند کرتے ہیں ہمارے ہی پہلو بہ پہلو ایک دوسرا مذہبی فرقہ بھی ہے جس کے اندرونی اختلافات ہم

سے کم اہم نہیں ہیں مگر اس کی جماعتوں میں شائستگی، رواداری، اخلاق اور تعاون کی قابلِ تقلید مثال نظر آتی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ "وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" کی پیروی کا ادعا کرنے والے آج اپنے مذہب سے اس قدر ہٹ گئے ہیں کہ نرمی اور رواداری کا دوسروں کو سبق دینے کی جگہ ان سے سبق لینے کے بھی قابل نہیں رہے! معلوم ہوتا ہے ہمیں اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے ابھی بڑی ٹھوکریں کھانی ہیں کہ صحیح راہِ عمل سے کہیں زیادہ افراد کے تعلقات کی عمدگی جماعت کو نقصان سے بچاتی ہے۔

نمبر ۵   مژدہ

دور جدید کی نئی کتابیں

عصر حاضر کی سب سے عظیم الشان جدید دینی تحریک بہائی روح کی طرح عالم کی رگ و پے میں کام کر رہی ہے۔ ہندوستان میں انگریزی اخبار دی بہائی ویکلی لاہور زیر ادارت پروفیسر پریتم سنگھ ایم اے جاری ہے۔ اردو میں اہل بہا کا مشہور و مقبول عام رسالہ کوکب ہند قرولباغ دہلی سے نکلتا ہے۔ نمونہ کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا چاہئے۔ دفتر کوکب ہند سے اردو میں اتنی بہترین بہائی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

دور بہائی ۔ حضرت بہاء اللہ حضرت عبد البہاء ۔ حضرت شوقی ربانی کے حالات ۔ تحریک بہاء کی تاریخ ۔ بہائی تعلیمات اور چند الواح مبارکہ عربی و فارسی مع اردو ترجمہ درج ہیں ۔ ہر ایک محقق کے لئے یہ کتاب بہترین رفیق ہے ۔ قیمت صرف عہ ر

لوح ابن ذئب ۔ حضرت بہاء اللہ کی کتب مقدسہ میں سے ایک مشہور کتاب ہے کتب آسمانی کے اسرار تمام دنیا کے موعود کی جلوہ گری ۔ نوع بشر کے لئے حیات جدید کا پیغام ۔ قیمت عہ

عکہ کی روشنی و سرور ۔ امریکن جولیا ایم گرانڈی نے حضرت عبد البہاء کے بیانات درج کئے ہیں جنہیں پڑھ کر روح انسانی کیف و سرور سے سرشار ہو جاتی ہے۔

کلام اللہ ۔ حضرت بہاء اللہ کی الواح مبارکہ عربی و فارسی میں سے چند الواح کا مجموعہ مع اردو ترجمہ ۔ جو لوگ تازہ کلام الٰہی کے شائق ہیں ان کے لئے یہ تحفہ نہایت بیش بہا ہے کیونکہ کلام الٰہی خواہ ایک کلمہ ہو تمام دنیا کی کتابیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں قیمت عہر

ہفت وادی ۔ عارفوں کے روحانی سفر کی سات منزلوں کا پر کیف بیان ۔ اسرار حقیقت کا جوہر گویا کوزہ میں دریا سا گیا ہے ۔ قیمت صرف ۳ ر

صحیفۂ زرتشت ۔ ایران کے مشہور پیغمبر زرتشت کی الہامی کتاب کا ترجمہ اور رسالہ "دساتیر و قرآن" جس میں پارسی مذہب اور اسلام کی مطابقت دکھائی ہے ۔ قیمت صرف چار آنے ۔

(اندلس میں اسلامی فتوحات کا درخشاں عہد)

دفعتاً ایک عورت اندر آگئی جو ملوک اندلس کی خاندان سے تھی اور زیاد بن نابغہ تمیمی نے اوس سے نکاح کر لیا تھا۔ اس عورت نے عبدالعزیز کو تاج لگائے ہوئے دیکھا تو واپس آکر زیاد سے فرمائش کی کہ میں تمھارے لئے تاج بنواؤں تم بھی لگاؤ، زیاد نے جواب دیا کہ اس کا استعمال ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے، اس نے دین مسیح کی قسم کھا کر کہا میں نے تمھارے امام کو تاج لگائے ہوئے دیکھا ہے تم اسے کیسے ناجائز بتاتے ہو، اس طرح یہ واقعہ زیاد بن نابغہ کو معلوم ہوا اور انھوں نے حبیب ابن ابی عبیدہ بن عقبہ بن نافع سے ذکر کیا پھر ان دونوں کے اور سرداران و بزرگان لشکر کو علم ہوا مجبوراً عام لشکر پر اس کا اظہار کرنا پڑا اور تحقیق کی گئی تو یہ شکایت صحیح ثابت ہوئی اور زیاد نے اپنی آنکھوں سے عبدالعزیز کو سر پر تاج رکھے ہوئے دیکھ لیا۔ اس واقعہ سے سخت شورش پیدا ہوگئی اور مسلمانوں نے کہا کہ عبدالعزیز نصرانی ہوگیا، چنانچہ اسی الزام میں یورش کر کے عبدالعزیز کو قتل کر ڈالا یہ واقعہ آخر ۹۸ھ کا ہے اس وقت سلیمان بن عبدالملک خلیفہ تھے"

ایوب ابن حبیب کی امارت

عبدالعزیز ابن موسیٰ کی عہد امارت میں بہت سے شہر فتح ہوئے، انکے بعد اہل اندلس بہت دن تک بلا امیر کے رہے اور کسی والی کو منتخب نہ کر سکے کئی سال کے بعد (ایوب) ابن حبیب پر اتفاق کیا،، ابن حبیب ایک مرد صالح تھے اور نماز میں اہل اندلس کی امامت کرتے تھے جب اہل اندلس کو بغیر کسی امیر کے ایک مدت ہوگئی تو انھوں نے اوائل ۹۹ھ میں ابن حبیب کو اپنا والی منتخب کیا اور بجائے اشبیلیہ کے قرطبہ کو دار الامارت قرار دیا۔

اس انتخاب کے بعد ایوب ابن حبیب قرطبہ آئے اور اس قصر میں مقیم ہوئے، جس کو مغیث نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا، ابن حبیب کے اس قصر میں آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب موسیٰ ابن نصیر ولید کے ایلچی کے ساتھ شام کی طرف جانے لگے، تو طارق کے مفتوحہ علاقہ در راستہ

بلاط مغیث

سے گذرے تا کہ اندلس کے بقیہ حصے بھی دیکھتے جائیں۔ اس لئے قرطبہ ہوتے گئے اور مغیث سے کہا یہ قصر تمھارے لئے مناسب نہیں ہے۔ یہ صرف والئی قرطبہ کے لئے ہی موزوں ہے، مغیث نے بجائے اس کے ایک دوسری عمارت پسند کر لی جو باب الجزیرہ پر واقع ہے، باب الجزیرہ ہی باب القنطرہ ہے (پل کا دروازہ) جو اسی ٹوٹی ہوئی فصیل کے مقابل میں ہے، جس سے فتح قرطبہ کے وقت مغیث اور اس کے ساتھی

داخل ہوئے تھے۔ یہ مکان نہایت عمدہ بارونق اور پرفضا تھا، اس میں زیتون اور ثمردار درخت کثرت سے تھے اس کا نام بیشانہ تھا اور پہلی عمارت بھی والیٔ قرطبہ کے قبضہ میں تھی،، جسے مغیث نے قید کیا تھا اسی میں ایک شاندار تخت گاہ بھی تھی،، جس کو اب اندلس میں بلاط مغیث کہتے ہیں ۔

قتل عبدالعزیز کی تحقیقات

عبدالعزیز ابن موسیٰ کے قتل کی خبر خلیفہ سلیمان کو بہت گراں گزری اور انھوں نے افریقیہ پر عبید اللہ ابن زید قریشی کو والی مقرر کیا۔ اس زمانے میں اندلس طنجہ اور تمام ماورائی افریقہ کا نظم و نسق والی افریقیہ ہی کے متعلق ہوتا تھا،، اس لئے خلیفہ نے عبید اللہ ابن زید کو حکم دیا کہ عبدالعزیز ابن موسیٰ کے معاملہ قتل میں سختی سے تحقیقات کریں اور حبیب ابن ابی عبیدہ اور زیاد ابن نابغہ کا جرم ثابت ہو جائے تو ان دونوں کو ان کے ساتھ جن لوگوں نے عبدالعزیز کے قتل میں شرکت کی ان سب کو قید کر کے دار الخلافت دمشق روانہ کریں

کچھ مدت کے بعد سلیمان کا انتقال ہوگیا۔ عبید اللہ ابن زید والی افریقہ نے اندلس پر الحر ابن عبداللہ ثقفی کو حاکم بنا کر بھیجا،، اور قتل عبدالعزیز کی تحقیقات بھی انہیں کے ذمہ کی۔ حر اندلس میں اپنے قدم جمانے

حضرت عمر ابن عبدالعزیز

نہ پائے تھے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آگیا۔ ان کے عہد میں عبید اللہ ابن زید افریقہ سے معزول ہو گئے ان کے بجائے اسماعیل بن عبداللہ مولائے بنی مخزوم افریقہ والی افریقیہ مقرر ہوئے ۔

اموال بیت المال کے متعلق احتیاطی کاروائی

اسماعیل ابن عبداللہ کے ولایت کا واقعہ یہ ہے کہ خلفاء کا دستور تھا کہ جب ان کے پاس مختلف ممالک و امصار سے خراج وغیرہ کی آمدنی آتی تھی تو ہر رقم کے ساتھ ثقہ لوگوں میں سے دس آدمی آکر ایک قبلہ کی صورت میں خلیفہ کے سامنے حلف سے بیان کرتے تھے کہ ان اموال میں سے کوئی درہم و دینار ناحق نہیں لیا گیا، اور اس میں سے مجاہدین اور اہل بلد وغیرہ کے جس کے جو حقوق تھے دے دئے گئے ہیں، یہ ان سب سے بچا ہوا خالص بیت المال کا حصہ ہے،

اسماعیل ابن عبداللہ اور سمح ابن مالک کے ولایت کے وجوہ

جب تک حلف کے ذریعہ سے ان معاملات کا اطمینان نہ ہو جاتا بیت المال میں ایک حبہ داخل نہ کیا جاتا،، اس وقت تک افریقیہ کے حدود باقاعدہ مکمل اور منضبط نہیں ہوئی تھیں،، اس لئے لشکر اور عملہ وغیرہ کی تنخواہیں ادا کرنے کے بعد آمدنی میں سے جو کچھ بچتا تھا

خلیفہ کے پاس بھیجدیا جاتا جب سلیمان کے زمانے میں لوگ افریقہ کا خراج لے کر پہنچے تو حسب دستور وفد کو حکم دیا گیا
کہ حلف سے بیان دیں وفد افریقہ کے دس آدمیوں میں سے آٹھ نے حلف کیا۔ صرف اسمٰعیل بن عبداللہ مولائے
بنی مخزوم نے اور ان کے ساتھ سمح بن مالک خولانی نے حلفیہ بیان دینے سے انکار کر دیا حضرت عمر ابن عبدالعزیز
اس موقع پر موجود تھے ان کو ان دونوں کی یہ بات بہت پسند آئی، اور انھیں اپنے پاس رکھ لیا -

انکی زمانہ مصاحبت میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو ان کے تقویٰ اور بزرگی کا کافی اندازہ ہوا، وہ ان دونوں کی دل سے
قدر کرنے لگے جب آپ خلیفہ ہوئے تو اسمٰعیل کو افریقہ کا اور سمح ابن مالک کو اندلس کا والی بنایا۔ اور سمح کو حکم دیا
کہ اندلس کی آمدنی سے خمس نکالیں ان زمینوں اور کھیتوں وغیرہ کا پانچواں حصہ خدا کی راہ میں علیحدہ کر دیں، جو
لڑ کے حاصل کی گئی ہیں اور مجاہدین کو مفتوحہ گاؤں انھیں کے قبضہ میں رہنے دیں جائیں مگر خمس ان سے بھی وصول
کر لیا جائے، اور سمح کو ہدایت کی کہ اندلس اور اس کے دریاؤں کی حالات لکھتے رہیں -

اندلس کے مسلمانوں کے متعلق حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا ارادہ	حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی نیت یہ تھی، کہ اندلس کے مسلمانوں کو وہاں سے منتقل کریں کیونکہ انھیں مسلمانوں کا کسی ایسے ملک میں رہنا پسند نہ تھا جو ممالک

اسلامیہ کے ایک طرف واقع ہو اور ان کے اور اس ملک کے درمیان کوئی سمندر واقع ہو جیسا کہ اندلس میں تھا -
علاوہ ازیں ان کا یہ بھی خیال تھا۔ کہ اس طرح علیحدہ رہنے سے مسلمانوں کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر خدا انہیں
کچھ روز اور زندہ رکھتا تو وہ ایسا ہی کرتے،،

سنہ ۱۰۰ھ میں سمح اندلس پہونچے تو انھوں نے اس کی تفتیش شروع کی کہ کون سے اقطاع جنگ سے
بعد قبضہ میں آئے ہیں تاکہ جو اقطاع صلح کے ذریعہ سے فتح ہوئے ہیں ان کی تمیز ہو سکے، پھر غزوات کے نئے نقشے بھیجے
اور قرطبہ کا پل بنایا -

قرطبہ کا پل	اس پل کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ پہلی سمح نے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو لکھا کہ شہر قرطبہ کا غربی حصہ منہدم

ہو گیا ہے اور اسی جانب جو دریا تھا، اس کا پل بھی ٹوٹ چکا ہے جاڑے کے موسم میں لوگوں کی آمد و رفت میں
سخت دشواری ہوتی ہے دریا عبور کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اگر آپ کی رائے ہو تو میں شہر کی فصیلیں تیار
کرا دوں کیونکہ لشکر کے مصارف اور نفقات نکال دینے کے بعد بھی میرے پاس خراج کا روپیہ

اتنا جمع ہے کہ میں یہ انتظام کر سکتا ہوں اور اگر آپ کی رائے ہو تو میں اس فصیل کے پتھروں سے قرطبہ کا پل بھی بنوا دوں حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے سنگین پل بنوانے کا حکم دیدیا اور فصیل کی نسبت لکھا کہ ایسا ہو کہ اگر پتھر نہ ملیں تو اینٹ سے بنوائی جائے چنانچہ اسی سلسلہ میں ۱۰۱ھ میں یہ پل تیار ہو گیا۔

یزید ابن عبدالملک کا عہد ابن صفوان کی گورنری اندلس کے عمال

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی وفات کے بعد یزید ابن عبدالملک نے حنظلہ ابن صفوان کے بھائی بشیر ابن صفوان کو افریقیہ کا والی بنایا، انھوں نے سمح ابن مالک کو اندلس سے معزول کر کے انکی جگہ عنبسہ ابن سحیم کلبی کو مقرر کیا عنبسہ کے بعد اندلس کے والی پے درپے کئی تبدیلیاں و مقرر ہوئے۔ مثلاً عنبسہ کے بعد یحییٰ ابن مسلم کلبی۔ ان کے بعد عثمان ابن ابی نسعہ سعید خثعمی اور ان کے بعد حذیفہ ابن احوص قیسی پھر ہیثم ابن عقیر کنانی پھر عبدالرحمٰن ابن عبداللہ غافقی والی ہوئے۔ انھیں عبدالرحمٰن کے زمانے میں بلاط الشہدا کی شہادت ہوئی اور یہ خود بھی ان کے ساتھ شہید ہوئے پھر عبدالملک ابن قطن محاربی فہری یہاں کا والی ہوا عبدالملک ابن قطن کو اندلس کی ولایت دوبار تفویض ہوئی لیکن اس مرتبہ ان کی حکومت ۱۰۶ھ سے زیادہ نہ رہی، ان والیوں کے جو اوصاف ہم کو معلوم ہوئے ان کا خلاصہ یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ تقریباً یہ سب دشمنوں سے جہاد کرتے، اور ملک کی توسیع میں کوشش کرتے رہے۔ اور فتوحات کو ترقی دیتے ہوئے افرنجہ، فرانس تک پہونچ گئے۔ یہاں تک کہ سارا اندلس فتح ہو گیا۔

گورنر افریقیہ کا طرز حکومت

ان تمام والیوں پر بشیر ابن صفوان حکومت کرتے تھے بشیر ابن صفوان عمال کے تقرر کے سلسلہ میں خلیفہ سے کوئی حکم نہ لیتے تھے۔ جب اہل اندلس کسی والی سے ناراض ہوتے تو بشیر کو لکھا کرتے تھے۔ بشیر اس کو معزول کر کے اہل اندلس کا پسندیدہ والی مقرر کر دیتے یہی صورت والیوں کی وفات پر بھی ہوتی۔

عبیداللہ ابن حجاب کی گورنری اور عقبہ ابن حجاج سے ملاقات

جب یزید بن عبدالملک کا دور ختم ہوا تو ہشام ابن عبدالعزیز[۱] نے اپنے زمانے میں عبیداللہ ابن حجاب ابن حارث کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔ عبیداللہ ابن حجاب بنی سلول قیسی کے غلام تھے ان کو بھی مصر کی گورنری کے ساتھ ولایت اندلس کے اختیارات بھی تفویض ہوئے

---

[۱] ہشام ابن عبدالعزیز غلط ہے: ہشام ابن عبدالملک ہونا چاہیئے۔

گورنر کی قابل تقلید رواداری

بشیر ابن صفوان کے زمانے میں عقبہ ابن حجاج اندلس کے والی مقرر ہو چکے تھے۔ جب عبید اللہ مصر کے گورنر ہوئے۔ تو عقبہ وفد لے کر ان سے ملنے آئے عقبہ کے والد حجاج نے عبید اللہ کے دادا حارث کو اپنی غلامی سے آزاد کیا تھا۔ اس لئے عبید اللہ نے ان کو اپنی جگہ اپنے پاس بٹھایا عبید اللہ کے لڑکے اور حاضرین مجلس یہ منظر دیکھ کر بہت متعجب ہوئے اور سرگوشی کرنے لگے۔ عبید اللہ کے لڑکوں کو یہ بات خصوصیت سے ناگوار گذری، اور انھوں نے اپنے باپ سے ناگواری کے لہجے میں کہا کہ "آپ نے ایک اعرابی کو اپنے پاس بٹھالیا۔ سرداران قریش و عرب کا کچھ خیال نہ کیا۔ جو آپ کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ بخدا آپ کی اس بات سے وہ سب لوگ نفرت کرنے لگیں گے بلکہ ممکن ہے کہ اس بڑھاپے میں آپ کو کسی کی عداوت سے موت کا ذائقہ چکھنا پڑے اور ہم رسوا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خوف بھی لگا ہوا ہے کہ اس کا علم امیر المومنین کو ہوگا، اور ان کے دل سے آپ کی عزت رخصت ہو جائیگی کیونکہ آپ نے قریش کی تحقیر کی ہے"۔ عبید اللہ نے جواب دیا کہ اے بیٹو تم سچ کہتے ہو، مجھے خیال نہ رہا اب ایسا نہ ہوگا دوسرے دن صبح ہوئی تو عبید اللہ نے سب لوگوں کو بلا کر بٹھایا اور عقبہ کو طلب کر کے صدر مجلس میں جگہ دی اور خود ان کے قدموں کے پاس بیٹھ گئے جب تمام مجلس بھر گئی، تو اپنے بیٹوں کو بلوایا۔ انھوں نے یہ رنگ دیکھا تو اور متعجب ہوئے اور سمجھے کہ عنقریب یہ بڈھے عقل و ہوش و حواس جواب دینے والے ہیں، کچھ عجب نہیں کہ سٹھیا جائے۔ لڑکے تو اسی تعجب میں رہے عبید اللہ اتنے میں اٹھ کر کھڑے ہوئے اور حمد و نعت کے بعد اپنے اولاد کی شکایت کر کے ان کی گفتگو نقل کی پھر کہا ۔

"اے لوگو میں اللہ اور تم کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ یہ عقبہ ابن حجاج ہے اور حجاج نے میرے دادا حارث کو آزاد کیا تھا۔ چونکہ میری اولاد کو شیطان نے دھوکے میں ڈال دیا ہے یہ لوگ خود بینی و غرور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس لئے میں نے چاہا کہ اللہ کے ساتھ کفر سے پناہ مانگوں اور جو بات حق ہے۔ اس کو خدا کے لئے ظاہر کر دوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ میرے لڑکے حق بات سے منحرف ہو جائیں، اور ان پر اللہ اور دوسرے لعنت کرنے والوں کی لعنت پڑے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی ہے ملعون من ادعی الی غیر نسبہ ملعون من انکر نعمۃ المنعم علیہ جو شخص اپنے نسب کو دوسرے کی نسب سے منسوب کرے،

یا اپنے محسن کے احسان سے انکار کرے۔ وہ ملعون ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے،
کفر باللہ تبرء من نسب وان دق وکفر باللہ ادعاء الی نسب مجہول "اپنی نسب سے بیزار ہونا، اگرچہ کم رتبہ کا ہو اور اپنے آپ کو نسب مجہول کی طرف منسوب کرنا اللہ کے ساتھ کفر کرنا ہے، پھر اپنے بیٹوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کہ اے بیٹو! ان وجوہ سے مجھے خوف ہوا کہ کہیں ہم اللہ کی لعنت و عذاب میں نہ مبتلا ہو جائیں یہ واضح رہے کہ میرا روئے سخن زیادہ تر اپنی اور تمہاری طرف ہے۔ رہی یہ بات جو تم کہتے ہو کہ اس واقعہ کے علم سے امیر المومنین ناراض ہوں گے تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، "اللہ ان کو سلامت رکھے وہ زیادہ حلیم ہیں اور اللہ کو زیادہ جاننے والے ہیں اور اللہ کے حقوق کو اس سے زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں جتنا تم گمان کرتے ہو بلکہ میری یہ بات ان کی رضامندی کا باعث ہوگی۔

ان کی اس فیاضانہ تقریر سے لوگوں پر بہت اثر ہوا۔ اور سب نے ان کا شکریہ ادا کر کے ان کے لئے دعا کی، اس صاف بیانی سے ان کے بیٹے بہت شرمندہ ہوئے۔ اور مجلس سے اٹھ کر چلے گئے پھر انھوں نے عقبہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا، اے میرے آقا آپ کا حق واجب ہے اللہ امیر المومنین کو اچھا رکھے ان کا ایما یہ ہے اور اسے آپ کی خوشی پر منحصر رکھا گیا ہے۔ کہ آپ اگر افریقیہ کی ولایت پسند کریں تو والی افریقیہ اپنی جگہ اندلس چلا جائے۔ ورنہ آپ کو اندلس ہی کے عامل رہنے دوں۔ عقبہ نے اندلس ہی پسند کیا اور کہا کہ میں جہاد کو عزیز رکھتا ہوں اور اندلس میں جہاد کا میدان وسیع ہے۔ چنانچہ عبید اللہ سے ملنے کے بعد سنہ ۱۱۱ھ میں اندلس آئے اور کئی سال تک یہاں کے والی رہے۔ شوق جہاد پورا کیا اور فتوحات کرتے ہوئے اربونہ تک پہنچ گئے۔ جلیقیہ۔ البہ۔ بنبلونہ کو فتح کیا۔ جلیقیہ میں بجز صخرہ کے کوئی موضع ایسا باقی نہ رہا جو فتح نہ کر لیا ہو۔

صخرہ کی فتح نہ ہونے کا یہ سبب ہوا کہ اس میں وہاں کا بادشاہ پناہ گزیں تھا جس کو بلائی کہتے تھے یہ بادشاہ تین سو پیادوں کے ساتھ اس موضع میں داخل ہوا مسلمان بھی تعاقب میں لگے ہوئے تھے محاصرہ کر کے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ مگر ان کے مقابلے میں بہت دشواریاں پیش آئیں حریف نے ہمت نہ ہاری برابر ڈٹا رہا اس کے بہت سے ساتھی بھوک سے مر گئے اور ان میں سے ایک جماعت ہمت ہار کر مسلمانوں میں آملی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوج میں کمی ہوتے ہوتے کل تیس مرد رہ گئے جنکے ساتھ دس عورتیں بھی نہ تھیں اور رسد وغیرہ کی حالت اتنی تباہ ہو گئی کہ صرف شہد پر زندگی کا دارومدار رہ گیا شہد آسانی ملنے کی وجہ یہ تھی

کہ ان کے پاس شہد کی مکھیاں ٹپکتی تھیں اپنے لوگ پہاڑوں اور ان کے غاروں میں چھپ گئے اور آخر اپنی مستقل مزاجی سے مسلمان حملہ آوروں کو تھکا دیا۔ اور مسلمان پریشان ہو کر ان کو وہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ان کو حقیر جانا اور کہنے لگے کہ یہ تیس کا فرہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ لیکن انہی تیس آدمیوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی اس کی تفصیل حسب موقع بیان ہوگی۔

بربریوں کی شورش | غرض عقبہ ابن حجاج بربریوں کی شورش تک اندلس کے والی رہے ۱۲۲ھ میں بربریوں نے اباضیہ وصفریہ فرقوں پر انتقام لینے کے لئے چڑھائی کی اور اپنے لشکر کا سردار میسرہ مدغری کو بنایا۔ عامل طنجہ عمر ابن عبد اللہ مرادی سے جنگ کی اور اس کو قتل کر کے طنجہ میں داخل ہوئے اس شورش میں طنجہ میں اتنا کشت و خون ہوا کہ بقول بعض اہل طنجہ کے لڑکے بچے تک مار ڈالے واللہ اعلم پھر افریقیہ کے ارادے سے بڑھے یہ شورش ایسی سخت تھی۔ کہ اس میں قوم بربر کے آس پاس کے تمام لوگ شریک ہو گئے تھے۔ مگر افریقیہ میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور یہاں ان کو مار کر بھگا دیا گیا۔

عبد الملک ابن قطن کا عقبہ ابن حجاج پر حملہ | جس زمانہ میں بشیر بن صفوان اپنے ملک یعنی افریقیہ کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے، اسی زمانے میں عبد الملک ابن قطن محاربی فہری نے عقبہ ابن حجاج پر چڑھائی کی اور ان کو معزول کر کے خود اندلس پر قابض ہو بیٹھا۔ اس کا حال نہ معلوم ہوا کہ عقبہ کو عبد الملک نے قتل کیا یا نکال دیا عبد الملک کا یہ زمانہ حکومت دو سال چند ماہ رہا یعنی آخر ۱۲۱ھ سے ۱۲۳ھ تک پھر بلج ابن بشیر قشیری اور ان کے بعد کعبی اہل شام کو لیکر اندلس میں داخل ہوئے کعبی کے آنے کے اسباب ہم نے آگے چل کر بیان کئے ہیں۔

دربار خلافت میں موسیٰ کی جوابدہی | اب پھر ہم موسیٰ ابن نصیر کا ذکر کرتے ہیں۔ موسیٰ ابن نصیر سلیمان کے عہد خلافت میں شام میں آئے ولید کا چھیالیس سال کی عمر میں ۹۶ھ میں انتقال ہو چکا تھا۔ ولید حضرت معاویہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلافت میں پیدا ہوئے تھے۔ ولید کے بعد سلیمان تخت نشین ہوئے موسیٰ ابن نصیر کے حریف وطارق ومغیث۔ سلیمان تک پہونچنے میں سبقت کی اور موسیٰ کی سخت شکایت کی اور مائدہ کے بارے میں جو کچھ طارق کے سلوک ہوا تھا۔ اور والی قرطبہ کے بارے میں مغیث پر جو کچھ گذری تھی یہ سب واقعات نہایت تشریح کے ساتھ بیان کئے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس مہم میں موسیٰ

کو ایک اتنا بڑا جوہر ملا ہے کہ خزانۂ فارس کے جوہر کے سوا کسی بادشاہ کے خزانہ میں نہ ہوگا۔ اس جوہر کو انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا جب موسیٰ آئے تو خلیفہ نے ان کو اور ان کے بیٹے کو طلب کرکے طارق و مغیث کے شکایات کے سلسلہ میں جواب طلب کیا۔ موسیٰ نے بعض عذرات پیش کیے پھر خلیفہ نے مائدہ طلب کیا موسیٰ نے کہا "یہ حاضر ہے" خلیفہ نے اسے دیکھ کر کہا یہ ایسا ہی ناقص تھا۔ موسیٰ نے کہا جی ہاں ایسا ہی تھا۔ یہ سنتے ہی طارق نے اپنی قبا میں ہاتھ ڈال کر اس کا پایہ نکالا اور خلیفہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس بات سے خلیفہ سلیمان کو موسیٰ کے جھوٹ اور ان کے متعلق ہر شکایت میں طارق کی سچائی کا یقین ہوگیا۔ اور انہوں نے فوراً موسیٰ کے قید کئے جانے کا حکم صادر کردیا اور ایک سخت تاوان عائد کیا جس کی ادائیگی سے وہ قاصر رہے۔ اور انھیں اہل عرب سے امداد مانگنی پڑی

کہا جاتا ہے کہ قبیلۂ لخم کو موسیٰ کے تاوان کے ستر ہزار اشرفیاں دینا پڑیں اور اس کا سبب یہ تھا کہ موسیٰ نے اس قبیلے کی ایک عورت سے عقد کیا تھا۔ جس کے پہلے شوہر سے ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام شریف تھا۔ موسیٰ نے اس کی کفالت کی اور پرورش کرکے اس پر بہت سے احسانات کئے اس لئے بنی لخم ان کی ممنون تھے یہ بھی کہتے ہیں کہ موسیٰ کو حبیب لخمی کی بہن بیاہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب اہل اندلس نے عبدالعزیز کو قتل کیا ہے تو اس یورش میں حبیب لخمی کو گھیر لیا تھا۔ بنی لخم کے ساتھ محبت کا یہ سب سے اہم نتیجہ تھا۔ جو لوگوں کے علم میں ہے۔

افریقیہ کی مہم پر کلثوم ابن عیاض کا تقرر

جب ہشام ابن عبدالملک خلیفہ ہوئے تو انہوں نے افریقیہ مہم کے لئے کلثوم ابن عیاض قشیری کو تیار کیا۔ لوگوں کو ان کے ساتھ جانے پر توجہ دلائی اور اپنے اطمینان کے لئے اس کے بھتیجے ابن بشیر قشیری کو اس کا قائم مقام مقرر کردیا اور یہ انتظام کردیا کہ اگر بلخ کام آجائیں تو ثعلبہ بن سلمہ عاملی اس کے جانشین ہوں پھر ثعلبہ کو اہل اردن کی لشکر پر بھیج کر فوجیں اکٹھا لیں۔

شام کی افواج کی تقسیم حسب ذیل تھی[1]

شام کے ہر لشکر میں سے چھ ہزار نفر اور قنسرین کے عساکر میں سے تین ہزار فوج جمع کی۔ اسی طرح شام سے ۲۷ ہزار فوج دے کر کلثوم ابن عیاض کو روانہ

[1] فلسطین۔ اردن۔ حمص۔ دمشق۔

(باقی)

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے نا آشنا تھے۔ آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں، پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اس کو لیجانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گٹھیا، ورم۔ درد۔ پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بےمثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۸ دہلی

صحت کی تیر بہدف گولیاں

OKASA

جرمنی کی جادو اثر طبی ایجاد

کون ہے جس نے بجدیہ کی شہرہ آفاق، ہر پروفیسران درناف اور اشٹنکاہ کی حیرت انگیز تدابیر جراحی کا حال نہ سنا ہو۔ صرف بعض غدودوں کے بدل دینے سے (بوڑھے سے بوڑھا آدمی تندرست جوان بن جاتا ہے) ان تدابیر پر دنیا ہنوز انگشت بدنداں تھی کہ جرمنی کے نامور ماہر طبیعات ڈاکٹر لاہوسین (ایم۔ ڈی) پروفیسر برلن یونیورسٹی نے اپنی اس دوا کے انکشاف سے ہلچل پیدا کر دی ہے۔ جو کثیر المصارف عمل جراحی کے عذاب اور خطرہ میں ڈالے بغیر از سر نو صحت کو بحال کر دیتی ہے۔

اس عظیم الشان انکشاف پر اوکاسا کمپنی (برلین) کو بین الاقوامی نمائش پیرس اور اطالوی نمائش (فلورنس) میں گرینڈ پرکس طلائی تمغے اور مشہور و معروف "کراس آف آنر" بطور سند ملی ہیں۔ اسناد کی نقلیں ہمارے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔ جھریاں اور سپید بال نیست نابود ہو جاتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اضمحلال چڑچڑاپن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے۔ اس سے پہلے، کہ بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے۔ یہ دوا ہر دوا فروش کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں

Sole Agency OKASA Co; Ltd; (Berlin)
22, Apollo Street, P.O. Box No. 396,
Bombay.

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔ ششماہی (۳؎)

نفسیات عرب

جامعہ ملیہ کے پرانے طالب علم مولوی غلام سرور صاحب نے جو اس وقت مصر کے جامعہ ازہر میں علوم عربیہ کی تکمیل کر رہے ہیں کسی عربی اہل قلم کا یہ مضمون اردو میں ترجمہ کر کے رسالہ جامعہ کے لئے ارسال کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اس میں عرب کی نفسیاتی کیفیت کو مختلف زاویہائے نگاہ سے دکھانے کے بعد ان پر تنقید کی ہے۔

یہ مضمون اس قدر سطحی ہے کہ میں کبھی اس کے اوپر کچھ لکھ کر اپنے قلم کو آلودہ نہ کرتا اگر بیچ میں میرے عزیز شاگرد کا قدم بحیثیت مترجم کے نہ ہوتا۔

اصلیت یہ ہے کہ کسی قوم کے امیال وعواطف اور نفسیات وجذبات پر بحث کرنے کے لئے اس کی مجموعی تاریخ سامنے رکھنی چاہئے۔ جزئی واقعات سے کلی نتائج اخذ کرنا صحیح نہیں۔

عرب اولیٰ نے جو تاریخ دنیا میں چھوڑی ہے اس میں جو چیزیں ہر جگہ اور عموم کے ساتھ نمایاں ہیں وہ ان کی شجاعت وبسالت۔ مفتوح اقوام کے ساتھ رافت ورحمت نظام امن وامان۔ بنی نوع انسان کی محبت۔ رواداری اور سلوک اور سب سے بڑھ کر اللہ کا تقویٰ اور خشیت ہے۔ وہ اپنے ان تمام کارناموں میں حق وانصاف کے وفادار خادم اور جاں نثار سپاہی نظر آتے ہیں۔ دنیا کی کسی دوسری قوم کی تاریخ میں یہ سب باتیں اس قدر اور اس ہم آہنگی کے ساتھ نہیں پائی جاتیں۔ عرب کے اس کارنامہ کو جو آفتاب نصف النہار کی طرح دنیا میں روشن ہے کون چھپا سکتا ہے۔ بے شک عرب نے اپنی جاہلی عصبیت کی بنا پر اللہ اور رسول کے فرمان کے خلاف اقوام عجم پر اپنی افضلیت کا دعویٰ کیا۔ اور افضلیت بھی تاریخی اور عملی نہیں بلکہ نسبی اور فطرتی۔ حالانکہ قرآن کریم نے جملہ بنی نوع

انسان کو صرف ایک ماں باپ بلکہ "نفس واحد" کی پیداوار قرار دیا ہے۔ اور انسانی وحدت کا سبق سکھایا ہے۔ اصول نفسیات کے لحاظ سے اس کا ردعمل بھی سخت ہونا چاہئے تھا چنانچہ شعوبیہ کی جماعت پیدا ہوئی جنھوں نے نہ صرف انکی جاہلیت اور وحشت کے افسانے پھیلائے بلکہ ان کے مکارم پر بھی خاک ڈالنی شروع کی۔ کوفہ۔ بصرہ اور قیروان کی ویرانی کو عرب کے فقدانِ حسن انتخاب کا نتیجہ قرار دینا اسی جماعت کا کام ہے۔ ورنہ تاریخوں میں ان کی تباہی کے مفصل و مشرح اسباب موجود ہیں۔

ابن خلدون ہر قسم کی رطب و یابس باتیں لکھتا ہے۔ اس کا ضخیم مقدمہ گو اولین فلسفۂ تاریخ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے قابل فخر ہے لیکن بہت سرسری فکر کے ساتھ صرف تین چار مہینوں میں لکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی عبارت خام ہے۔ ترتیب بے ڈھنگی ہے۔ لایعنی تکرار کی کثرت ہے۔ اور حشو و زوائد بہت ہیں بعض بیانات نامکمل اور بعض غیر صحیح ہیں۔ واقعات کے مقابل میں اس مقدمہ کی شہادت کوئی وزن نہیں رکھتی۔

مولوی غلام سرور کو یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ میزان عمل ہے جس پر قومیں اور شخصیتیں تولی جاتی ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اسلم

قومیں اپنے مخصوص مزاج اور نفسیات میں ایک دوسرے سے کافی اختلاف رکھتی ہیں۔ انگریزی مزاج اور ہے اور فرانسیسی اور مصری ان ہر دو سے علیحدہ ہے۔ مزاج اور طبائع کا یہ اختلاف اور ان میں باہمی تباین نتیجہ ہے مخصوص ماحول اور سماجی اثرات کا جس میں ہر قوم اپنی زندگی گزارتی ہے یہی سبب ہے کہ ایک وقت واحد میں مختلف قومیں ترقی وارتقاء کے مختلف مدارج پر گامزن نظر آتی ہیں۔ قوموں کے اس سلسلہ ارتقاء کی ہر کڑی اپنے نفسی مظاہر کے اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

قوم کے تمام افراد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ تعلیم و تربیت کے اختلاف کے علاوہ اُن کے طبعی

اور دماغی مدارج ایک دوسرے سے کافی بُعد رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُن میں ایک وحدت مشترک پائی جاتی ہے جو قوم کے ہر فرد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ جنسی اشتراک شکل وصورت اور خط وخال میں صاف دکھائی پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ بڑی آسانی سے تھوڑی سی مشق کے بعد فرانسیسی انگریز اور مصری میں تمیز کر سکتے ہیں۔ جسمانی اور خط وخال کی ہمرنگی کے علاوہ قوم کے مختلف افراد میں نفسی اشتراک بھی پایا جاتا ہے۔

عربی قوم کے وہ کونسے نفسی خصائص ہیں جو وحدتِ مشترک کا درجہ رکھتے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں اگر ہم ایک ایسے عربی فرد کا انتخاب کریں جو عرب قوم کے طبائع و نفسی کیفیات کا نمونہ ہو تو اس کے کیا اوصاف ہوں گے؟ اس موضوع کے متعلق اہل علم کی رائیں غیر معمولی اختلاف رکھتی ہیں۔ ان میں بعض یہ ہیں۔

۱۔ جماعت شعوبیہ کا ایک رکن اہل عرب کے متعلق لکھتا ہے "عربوں کے علاوہ تمام عجمی اقوام کیا خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی آباد رہی ہوں بادشاہ ہوتے چلے آئے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے شہر تھے۔ جو اُن کے مراکز کا کام دیتے تھے۔ اُن کے قوانین تھے جن کی اطاعت وفرمانبرداری ہوتی تھی۔ اُن کے طفیل فلسفہ معرض وجود میں آیا۔ اور صنعت وحرفت میں اختراعات ہوئیں دیباج وشطرنج کی ایجاد اُن کی مرہون منت ہے۔ . . . . . .

اس طرح اہل روم نے اصطرلاب، قانون اور تخلیق کے متعلق فلسفہ مرتب کیا لیکن عربوں کے اندر نہ تو کوئی بادشاہ ہوا جو اُن کے افراد کو ایک مرکز پر لاتا اور مختلف اجزا کو متحد کرتا۔ غاصب وظالم کا قلع قمع اور شریروں کو فتنہ وفساد سے روکتا۔ صنعت وحرفت میں وہ بالکل صفر۔ فلسفہ اُن کے ہاں نام کو نہیں سے دے کے ایک شاعری ہے لیکن اس میں بھی عجم برابر کا ساجھی ہے۔ بلکہ اہل روم کے یہاں عجیب وغریب اشعار ہیں جو اوزان اور عروض پر پورے اترتے ہیں۔

۲۔ شعوبیہ کا رد اور عربوں اور غیر عربوں کا موازنہ کرتے ہوئے جاحظ لکھتا ہے " اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل ہند کے یہاں علوم مدون اور مستقل کتب میں موجود ہیں اور یہ تصنیفات کسی خاص شخص یا عالم سے منسوب نہیں بلکہ اُن کا سلسلہ نسلاً بہ نسلاً بطور وراثت چلا آتا ہے۔ اور اسی طرح یہ علوم صفحہ

وہ ہر ایک زمانے سے حرکت کر رہے ہیں۔ یونان کے پاس فلسفہ اور منطق ہے لیکن منطق کے باوجود فصاحت و بلاغت سے کورا اور تقریر و خطابت سے عاجز ہے۔ اہل فارس کے ہاں خطیب و مقرر ہیں لیکن ان کا تمام زور بیان اور ندرت معانی نتیجہ ہے عمیق فکر اور محنت و اجتہاد کا۔ اس کے مقابلے میں عرب کے پاس جو کچھ ہے وہ آمد اور فی البدیہہ۔ اس کے ہاں نہ آورد اور نہ محنت تفکر، نہ خیال آرائی اور احتیاج غیر۔ اس کا یہ وصف الہام کا حکم رکھتا ہے۔ جہاں اس نے شعر گوئی کی طرف توجہ کی۔ خیالات کا سلسلہ بے روک ٹوک آ حاضر ہوا۔ اور الفاظ خود بخود آراستہ ہوتے چلے گئے۔ عرب ان پڑھ تھے اور لکھنے سے نابلد لیکن تھے اہل طبع اور تکلف سے ناآشنا۔ اعلیٰ شعر و سخن ان میں نمایاں اور وافر اور وہ اس پر قادر۔ عرب دوسروں کے علوم رٹنے والے اور ان کی لکیر پیٹنے والے نہ تھے۔ ان کے ہاں وہی محفوظ رہا جو ان کے دل کو بھا گیا اور ان کو راس آیا۔ اور ان کی عقلوں نے بغیر کسی تکلف و قصد کے اپنا لیا۔ انھوں نے بجز حفظ و اخذ کرنے کے کبھی کوشش نہ کی۔

۲- ابن خلدون کی رائے . . . . . ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے شہرہ آفاق مقدمہ میں مختلف مقامات پر عربوں کے متعلق بحث کی ہے ہم اس کی آرا کا ملخص پیش کیے دیتے ہیں۔ ابن خلدون کے نزدیک عربوں کی اجتماعی حالت عین فطری ہے۔ اس دور میں سے نشو و ارتقا کے سلسلہ کو طے کرتے وقت ہر قوم کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے الفاظ میں "عربی قوم اپنی تخلیق میں بالکل طبعی ہے وہ اپنی وحشی طبیعت کے اعتبار سے ابھی تک لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کرنے والی ہے۔ آسانی اور جان جوکھوں کے بغیر جو اس کے ہاتھ چڑھ جائے اس سے دریغ نہیں کرتی گھاس اور پانی کی تلاش میں صحرا چھان مارتی ہے۔ غالب اور قومی قبائل بلند اور محفوظ مقامات میں رہنے کی وجہ سے اس کے فتنہ و فساد سے امون رہتے ہیں لیکن جہاں میدانی قبائل کی کمزوری اور عدم مدافعت نے اسے موقع دیا۔ فوراً ان پر چڑھ دوڑی اور لقمہ تر بنا لیا۔ ان پر قتل و غارت کی یورشوں کا لامتناہی سلسلہ جاری رکھتی ہے یہاں تک کہ وہ اس کے مطیع و محکوم ہو جائیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ تھوڑے سے سیاسی ردّ و بدل اور سرکار کی تبدیلی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی عمرانی حیات کا خاتمہ

ہوجاتا ہے۔

اہل عرب جس ملک پر قابض ہوئے وہ بسرعت ویرانی و بربادی کے کنارے آلگا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ عرب وحشی قوم ہے۔ عمارتوں کو توڑ کر ان کے پتھروں سے اپنی ہانڈیوں کے لئے چولھوں کا کام لیتے ہیں۔ مکانوں کی چھت اتار کر اپنے خیمے آباد کرتے ہیں۔ ان کی میخیں خیموں کے لئے تناؤ کا کام دیتی ہیں۔ لوگوں کا مال غصب کرنے میں ان کے ہاں کوئی حد ہی نہیں جہاں وہ پہنچ کر رک جائیں۔ قوانین اور احکام کا خیال اور لوگوں کو فتنہ و فساد سے باز رکھنے کا جذبہ مفقود، ان کے نزدیک سب سے اہم چیز لوٹ مار یا جرمانہ وتاوان سے مال غیر کو ہتھیانا ہے۔ جہاں وہ قابو میں آگیا ملکی مصالح اور دوسرے امور کی اصلاح سے گردن پھیر لی۔ حکومت کے بلا کے حریص۔ شاذ ونادر ہی ایک دوسرے کی سیادت تسلیم کرنے والے اگرچہ وہ بھائی، باپ یا قبیلہ کا رئیس ہی کیوں نہ ہو۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے ہاں اکثر طوائف الملوکی رہی۔ بیک وقت ایک حاکم کی بجائے متعدد حکام اور امرا ہوتے رہے۔ اس طرح حکمرانی اور تحصیل خراج کئی ہاتھوں میں بٹ گئی۔ اور زندگی تباہ اور تمدن پامال ہوگیا۔ ذرا ان مقبوضات کو دیکھو جو ابتدائے آفرینش سے ان کے ہاتھ لگے۔ ان کا تمدن معدوم اور آبادی چٹیل میدان بن گئی۔ مثال کے طور پر یمن کو لیجئے بالکل تباہ و برباد الا چند گنتی کے شہر اور قصبے۔ یہی حال عراق عرب کا ہوا یہاں اہل فارس اور شام میں اہل شام کا جو کچھ تہذیب و تمدن تھا ان کی بھینٹ چڑھا۔

عرب اپنے اکھڑپن۔ تمرد تند مزاجی۔ عالی ہمتی اور حرص سیادت کی وجہ سے ایک دوسرے کی سیادت تسلیم کرنے میں دنیا کی سب قوموں سے سخت ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں سلطنت دینی نفوذ کے بغیر قائم نہ ہو سکی۔ یہ دینی نفوذ خواہ نبوت ہو یا ولایت یا سلطنت پر مجموعی حیثیت سے دینی اثر غالب ہو۔

وہ آبادیاں جن کا نقشہ ان لوگوں کے ہاتھوں تیار ہوا جلد ویران ہوگئیں جس کا سبب محل وقوع انتخاب کرتے وقت۔ مناسب جگہہ۔ آب و ہوا کی عمدگی پانی اور زراعت وچراگاہ کی اہمیت کی عدم رعایت ہے۔ اس کے علاوہ شہر کی عمدگی اور خرابی کا اس میں دخل ہے۔ عرب تھے شہریت سے نابلد وہ بستی بساتے

وقت خاص طور پر اپنے اونٹوں کی چراگاہوں کا خیال رکھتے تھے۔ انھیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ پانی اچھا ہے یا خراب، کم ہے یا زیادہ۔ نہ انھیں زراعت۔ آب و ہوا اور پیداوار کی جگہوں سے سروکار تھا۔ کوفہ۔ بصرہ اور قیروان کے بسانے میں ان کا زاویۂ نگاہ دیکھو۔ انھوں نے اس میں اپنے اونٹوں کی چراگاہوں اور صحرا کی قربت اور سفر و مسافت کے مواقع کے سوا دوسری کوئی رعایت نہیں رکھی۔ یہ صورت شہروں کی آبادی کی طبعی مناسبت کے اعتبار سے بیکار تھی۔ اُن کے ہاں ایسے جوہر کا فقدان تھا جو اُن کے تمدن کو اُن کے بعد مدد دیتا۔ اُن کی بستیاں اور مساکن بننے کے اعتبار سے غیر طبعی تھے۔ یہ آبادیاں دوسری قوموں کے دسترس سے دور تھیں کہ وہاں اور لوگ بھی آباد ہو سکتے۔ چنانچہ جونہی مکینوں کا شیرازہ بکھرا اور اُن کی عصبیت جو مکانوں کے لئے باڑ کا کام دیتی تھی، مفقود ہوئی۔ اُن کی آبادیاں خاک و کھنڈر میں بدل گئیں۔

اہل عرب صنعت و حرفت میں دنیا کی سب قوموں سے پیچھے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی بدویت اور شہریت سے (جو صنعت و حرفت کو وجود میں لانے کا سبب ہے) بعد ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں کی بستیاں اور وہ ممالک جو عہد اسلام میں اُن کے زیر نگیں ہونے سے بالجملہ صنعت و حرفت کی سرد بازاری میں مبتلا رہے یہاں تک کہ وہ ہمیشہ غیروں کے محتاج رہے۔

علوم و فنون میں بھی عرب دوسروں سے پیچھے رہے جس کی وجہ یہ ہے کہ علوم و فنون کے لئے تعلیم و ملکہ کی اشد ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے علوم کا شمار صنائع میں ہوتا ہے اور تعلیم و ملکہ سے پیشتر ہم لکھ چکے ہیں، عربوں کو بُعد المشرقین تھا۔ چنانچہ علوم اہل امصار تک محدود رہ گئے اور عرب اُن سے کورے ہی رہے۔ اُس عہد میں شہری آبادی عجم یا عربوں کے الفاظ میں موالیوں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ اسلامی دور میں مسلمان علما و فضلا کی بیشتر تعداد غیر عرب تھی اور علوم کی تدوین و بقا کے لئے اٹھے بھی تو عجمی یعنی غیر عرب۔

ان سب باتوں کے علاوہ عرب میں حق و ہدایت کو بسرعت قبول کرنے کی استعداد سب قوموں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ اہل عرب کی سلامت طبعی تھی۔ اُن میں وحشت جو اکھڑپن سے ملتی ہوئی ہے ضرور تھی لیکن یہ چیز اچھی بات قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔

عرب شجاع اور بہادر ہے جس کا سبب یہ ہے کہ اُسے خود اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ عرب اس
کام کو دوسرے پر نہیں ڈالتا اور نہ وہ اپنے سوا دوسرے پر بھروسا کرتا ہے۔ وہ ہر وقت مسلح رہتا ہے۔ اور
راہ چلتے وقت ہر طرف چوکنا رہتا ہے۔ عرب کے لئے شجاعت اور دلیری طبیعت بن گئی ہے۔ ہم دیکھتے
ہیں کہ وحشی اور بادیہ نشین عرب اپنے بھائی سے جو شہر کی ہوا کھا چکا ہے زیادہ دلیر اور شجاع ہے۔

عرب اقوام عالم میں اپنی فصاحت و بلاغت، زور بیان اور خطابت میں ممتاز ہیں۔ ابتدائے
آفرینش سے زور بیان اُن کے لئے باعث امتیاز چلا آتا ہے۔

۴۔ رولیری اپنی کتاب (   ) میں عربوں کا ذکر
کرتے ہوئے کہتا ہے "عرب اپنے سامنے ہمیشہ مادی نصب العین رکھتا ہے۔ وہ تمام اشیا کو مادی نظر
سے دیکھنے کا عادی ہے۔ کوئی چیز اُس وقت تک اس کی نظر میں پوری نہیں اترتی جب تک وہ اُس
سے برآمد ہونے والے منافع کا اندازہ نہ لگالے۔ طمع اس کے تمام شعور و جذبات پر حاوی ہے۔ امیال
اور عواطف کے لئے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ مذہب کی طرف وہ زیادہ مائل نہیں۔ عرب ہر
چیز کی اُس کے ٹھوس نتیجہ یا حاصل کے لحاظ سے قدر کرتا ہے۔ عزت نفس کا جذبہ اس پر یہاں تک غالب
ہے کہ وہ کسی کی سیادت کو کسی رنگ میں بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کے قبیلہ کے سردار یا قائد لشکر کو
اپنی ریاست کے روز اول ہی سے اُس کی طرف سے لڑائیوں میں حسد بغض یا خیانت کے ظہور کا اندیشہ
لگا رہتا ہے۔ جو شخص عرب پر احسان کرے اس کو اُس کے انتقام کے لئے تیار رہنا چاہئے کیونکہ محسن کا
احسان اُس کے دل میں خضوع اور ذلت کے احساس کو جوش زن کرتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ممنونیت
کے جوے کے نیچے پاتا ہے۔ لاآنس کا قول ہے کہ "عرب مساوات کا نمونہ ہے"، واقعہ یہ ہے کہ عرب
اس جذبہ مساوات میں حد سے بڑھ گیا ہے۔ ہر وہ سیادت جو اُس کی شخصی آزادی کے دائرہ کو محدود
کرنے کی کوشش کرے اور اگرچہ یہ تحدید اُس کی مصلحت کے لئے ہو عرب کو عداوت اور دشمنی کو دعوت
دیتی ہے۔ عرب کی فطرت کا یہی راز ہے جس سے اُن جرائم اور خیانتوں کے سلسلہ کا جو تاریخ عرب کے
ایک بڑے حصہ پر حاوی ہے انکشاف ہوتا ہے۔ اس راز کی عدم واقفیت کی وجہ سے اہل یورپ

ان دنوں فاحش غلطیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس بے علمی کے طفیل مسلم عرب میں انھیں بے وجہ اور بے ضرورت قربانیاں دینی پڑیں۔ اہل عرب کی سرزوری اور جذبہ سرکشی ہی ہے جو ان کے مغربی تمدن کے قبول کرنے اور اس پر عملدرآمد ہونے میں حائل ہو رہا ہے۔ ایک عرب کے لئے اپنا استقلال اور آزادی نفس اتنی عزیز ہے کہ اگر آپ اس کے حلقہ کو محدود یا اس کے اطراف میں کچھ کمی کرنے کی کوشش کریں تو وہ ایک مقید وحشی کی طرح غضب وغصہ میں آپے سے باہر ہو جائے گا۔ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جائے گی اور وہ اپنی زنجیروں کو توڑ کر وہی پہلی آزادی حاصل کرنے کی سخت ترین جدوجہد کرے گا۔

اسی کے ساتھ عرب مخلص اور اپنے قبیلہ کی روایات کا مطیع اور فرمانبردار ہے۔ سخی اور فرائض مہمان نوازی اور جنگی عہد و پیمان میں پورا اترنے والا ہے۔ . . . .

میرے خیال میں یہ اوصاف حسنہ کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں ہیں سلسلہ نشو و ارتقا میں ہر قوم کو اس دور میں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس میں مذکورہ صفات لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ہم یہ صفات عربوں کی مخصوص ملکیت نہیں گردانتے۔ چنانچہ جب عرب مستقل طور پر رہنے لگے اور بادیہ پیمائی کے بجائے کھیتی باڑی کرنی شروع کی تو ان اوصاف میں بھی فرق آ گیا۔

۵۔ ان کے علاوہ عربی ادب کی کتابوں میں کثرت سے ایسے اقوال ملیں گے جن میں دنیا کا کوئی فضل و کمال ایسا نہیں جو عربوں میں نہ پایا جاتا ہو اور کوئی برائی اور عیب نہیں جس سے اُن کی ذات منزہ قرار نہ دی گئی ہو۔ مثال کے طور پر الوسی کی بلوغ الادب، ملاحظہ فرمائیے۔ ایک طویل بیان کے بعد مصنف مذکور لکھتا ہے "حاصل کلام یہ ہے کہ عرب عقل اور سمجھ میں سب سے اعلیٰ طاقت لسانی میں سب سے بڑھے ہوئے اور فہم و ادراک میں سب سے چوٹی پر تھے۔ چنانچہ اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ وہ ہر فضل و کمال کے حامل ہوئے اور بزرگی اور عظمت نے اُن کے ہاں جنم لیا"۔ اسی طرح ابن رشیق العمدہ میں عربوں کے فضائل کے ذکر میں کہتا ہے۔ "عرب سب قوموں سے افضل و اعلیٰ بس اُن کی حکمت سب حکمتوں کی سرتاج ہے"۔

مذکورہ آرا پر انتقاد . . . .

ہم اہل عرب کے تقدس کے قائل نہیں اور نہ ہمارے نزدیک اُن اقوال کی جن میں عربوں کو ہر کمال و عظمت سے متصف اور ہر نقص سے معریٰ دکھایا گیا ہے کوئی اہمیت ہے ۔ ہمارے خیال میں یہ طریقہ کسی طرح بھی علمی نہیں کہلایا جا سکتا ۔ ہمارے نزدیک عرب اور قوموں کی طرح ایک قوم ہیں ۔ ان میں محاسن بھی ہیں اور عیوب بھی ۔ اُن کی عقلیت اور ذہنیت اُن کی تاریخ اور ادب اُسی طرح معرض بحث میں لائے جا سکتے ہیں جیسے کسی اور قوم کے ۔ اس لحاظ سے پانچویں رائے ہماری بحث یا انتقاد سے مستغنی ہے ۔ اسی طرح جماعت شعوبیہ کی غلط روی بھی صاف طور پر ظاہر ہے ۔ وہ عرب سے یونان کا فلسفہ ، رومانی قانون اور صنعت و حرفت کی مہارت اور اصطرلاب وغیرہ اختراعات کا مطالبہ کرتے ہیں وہ ان قوموں کا عربوں سے مقابلہ کرتے تو ہیں لیکن غیر متمدن ۔ بادیہ نشین عرب سے جو کسی صورت سے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ صحیح مقابلہ تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ مختلف قوموں کے ایک ہی دور تمدن کو لیا جائے ۔ نہ یہ کہ ایک قوم ابھی بدویت کے مراحل طے کر رہی ہو اور اس کو ایک مہذب و متمدن قوم کے مقابل لا کھڑا کیا جائے ۔ اس کی مثال تو ایسی ہوئی کہ ایک بچے کی عقل کا مقابلہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے کیا جائے ۔ اہل فارس اور اہل روم میں سے ہر ایک قوم کو نشو و ارتقا کے طبعی ادوار میں سے گزرنا پڑا ہے اور عہد بدویت میں اُن کے ہاں بھی فلسفہ یا اختراعات کا وجود نہ تھا ۔ اگر مقابلہ منظور ہے تو متمدن اور مہذب عرب سے کیجئے جس کے پاس قانون بھی تھا اور علوم بھی اگرچہ اتنا زیادہ نہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی ۔ مذکورہ اقوال میں ابن خلدون اور رولیبری کے بیانات ہماری خاص توجہ اور انتقاد کے مستحق ہیں ۔

ابن خلدون کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ عرب وحشی اور لٹیرا ہے ۔ کسی ملک پر اس کا تسلط اُس کی تباہی و ویرانی کا پیش خیمہ ہے ۔ کسی رئیس کے سامنے مشکل سے سر تسلیم خم کرنے والا صنعت سے نابلد اور علوم میں خام ۔ ان ہر دو میں درجہ کمال تک پہنچنے کی استعداد ندارد ۔ سلیم الطبع ۔ نیکی کے لئے مستعد ۔ بہادر اور دلیر ۔

اولیری کے نزدیک عرب مادہ پرست۔ تنگ خیال۔ جامد العواطف۔ عزت نفس و ذاتی آزادی میں حد سے زیادہ سخت۔ حکومت و سیادت کا باغی۔ سخی اور اپنے قبیلہ کی روایات کو پورے اخلاص اور دیانت سے نبھانے والا۔

ابن خلدون اور اولیری دونوں اس امر میں متفق ہیں کہ عرب مادہ پرست اور سرکش ہے عرب کی سرکشی اور سرزوری میں تو کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ اور اولیری کا یہ قول بھی حق بجانب ہے کہ اُن جرائم اور خیانتوں کو سمجھنے کے لئے جن سے تاریخ عرب بھری پڑی ہے۔ اہل عرب کی اس فطرتی سرکشی اور سرزوری کا راز بڑی مدد دیتا ہے۔ عرب کی مادیت کے متعلق مستشرقین کا ایک بڑا حصہ ابن خلدون اور اولیری کا ہمنوا ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی مشہور و معروف تصنیف لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں عربوں کے متعلق یہی رائے دی ہے۔ اہل علم کے اس گروہ کی مادیت سے یہ مراد ہے کہ عرب مادہ۔ درہم اور دینار کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ معنویات کی اُن کی نظر میں کوئی قیمت نہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ بادیہ نشین عربوں میں یہ وصف روز روشن کی طرح سے نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن ایام جاہلیت کے عرب کو مجموعی طور پر اس وصف سے مختص کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؛ اس عمومیت کو ہم بغیر شک و شبہ کے دیکھے نہیں رہ سکتے۔ اگر شرافت اور کرم و وفا کی تمام حکایتیں اور روایات قبیلہ کی خاطر بخوشی جان پر کھیلنے کے واقعات جن سے ادبی تصنیفات بھری پڑی ہیں صحیح ہے تو عرب پر مادہ پرستی اور مادیت کا الزام کیا۔ مادہ پرستی اور یہ اوصاف تو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ایک دوسرے کے منافی ہیں۔

ہمارے خیال میں ابن خلدون اور اولیری نے عربوں کے اوصاف بیان کرتے وقت اُن کی تقسیم مدنظر نہیں رکھی تھی۔ انھوں نے یہ بیان نہیں کیا کہ اُن کا موضوع کلام کس عہد کا عرب ہے۔ ہمارے نزدیک جاہلی عرب بہت سی باتوں میں اسلامی عرب سے مختلف ہے۔ بلکہ جاہلی میں بھی شہری اور بدوی دونوں الگ الگ ہیں۔ اور نیز زمانہ حال کا بادیہ نشین عرب وہ نہیں جو زمانہ قبل از اسلام نہیں تھا۔ ابن خلدون نے باوجود دقت بحث کے اپنے موضوع گفتگو کو کسی خاص عہد کے عرب تک محدود

نہیں رکھا۔ اس خلط بحث کا نتیجہ ہے کہ اس کے اقوال میں سقم صاف نمایاں ہے۔ اُس کے بیان کے بعض مقامات سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ عرب سے مراد جاہلی بادیہ نشین عرب لیتا ہے۔ مثلاً جہاں وہ لکھتا ہے کہ عرب محلات کو توڑ کر اس کے پتھروں سے چولھوں کا کام لیتے ہیں اور عمارتوں کی چھتوں سے اپنے خیمے آباد کرتے ہیں۔ مذکورہ اوصاف ٹھیٹھ بادیہ نشین اور جاہلی عرب کے ہیں۔ اموی اور عباسی عہد کے متمدن عرب کو ان سے کیا واسطہ۔ لیکن آگے چل کر ابن خلدون عربوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اُن کے حسن انتخاب کی کمی کا ذکر کرتا ہے جو شہروں کے بساتے وقت اُن کے مناسب محل وقوع کے انتخاب کرنے میں اُن سے سرزد ہوئی۔ اس کی تائید میں وہ بصرہ۔ کوفہ اور قیروان کی بستیاں پیش کرتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ محلوں کو توڑنے والے بادیہ نشین عرب ان اعمال کے جوابدہ نہیں بلکہ اس سے صدر اسلام کا عرب مراد ہے جس کے ہاتھ پر روم اور فارس فتح ہوئے۔ شہروں کو بسانے والا عرب اور ہے اور عمارتوں کے پتھروں سے چولھوں کا کام لینے والا عرب اور۔ بعد ازاں ابن خلدون عربوں کا علوم وفنون سے بحسن وخوبی عہدہ برآ نہ ہونا بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میدان میں بھی اولیت کا سہرا غیر عرب یعنی موالی کے سر رہا۔ اس لئے اس کی مراد عہد عباسی یا عہد اموی کے آخری زمانہ کے عرب سے ہے۔ اس سے آگے چل کر ابن خلدون کے خود اپنے اقوال سے اس کا تناقص ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنے مقدمہ تاریخ میں ایک اور مقام پر لکھتا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ عربوں میں تمدن اور تہذیب اخذ کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور وہ دوسرے لوگوں کے اختلاط ومعاشرت سے استفادہ کرنا جانتے تھے۔ اس خیال کی مزید توضیح کرتے ہوئے ابن خلدون لکھتا ہے

”عربوں کا یہ خاص وصف فتوحات اسلامیہ کے بعد ظاہر ہوا۔ انھوں نے فارس و روم پر قابض ہو کر وہاں کے باشندوں اور اہل ہنر سے خدمات لیں۔ اس سے قبل اہل عرب تمدن سے ناآشنا تھے چنانچہ اُن کے متعلق مشہور رہے کہ

”کسریٰ کے خزانے میں جب انھیں کافور ہاتھ لگا تو وہ نمک سمجھ کر آٹے میں استعمال کرنے لگے اس قسم کی اور بہت سی روایتیں اُن کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ جب عربوں نے اُن قوموں کو مسخر

کیا جن میں سلطنتیں تھیں اور وہاں کے باشندوں کو ان کے پیشوں میں لگایا اور اُن سے اپنی خانگی ضروریات میں مدد لی اور اُن میں سے اہل کمال و ماہرین کی سرپرستی کی۔ اُن کی اس توجہ اور سلیقہ سے صنعت و حرفت کو چار چاند لگ گئے اور اس طرح سے عرب ترقی کے مدارج طے کر کے درجہ کمال تک پہنچے۔ اہل عرب نے سامان اکل و شرب۔ لباس۔ فن تعمیر۔ اسلحہ۔ ظروف اور لوازم آرائش میں عمدہ اختراعات کیں۔،،

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ ابن خلدون نے عرب پر حکم لگاتے وقت نشوو ارتقا کے مختلف ادوار کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اور مجموعی طور پر اُن پر تبصرہ کیا ہے۔ حالانکہ ابن خلدون خود کہتا ہے کہ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ عرب بھی تبدیل ہوتے گئے۔

اس کے بعد اولیری کا بیان ملاحظہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ عرب ضعیف الخیال اور جامد العواطف ہیں۔ ضعف تخیل کا خیال تو شاید اس لئے پیدا ہوا کہ عربی شاعری قصص اور تمثیل (ڈرامہ) شعر سے قطعاً خالی ہے۔ اور اس میں ہومر کے الیڈ اور فردوسی کے شاہنامہ کی طرح طویل رزمیہ نظمیں نہیں جن میں قومی مفاخر گائے گئے ہوں۔ اور نیز عربوں کے ہاں اُن کے دورِ جدید میں بھی روایات (ناول) وغیرہ کی قسم کا ادب جس میں تخیل کی فراوانی ہو نہیں ملتا۔

ادب کی اس خاص نوع میں اہل عرب کے عجز کا ہمیں اعتراف ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے خیال میں مظاہر تخیل کے حدود صرف ادب کی اسی نوع تک محدود نہیں اور تخیل کی تمام کائنات لے دے کے صرف اسی پر بس نہیں کرتی۔ فخر۔ حماسہ۔ غزل۔ وصف تشبیہ اور مجاز وغیرہ تخیل ہی کے مظاہر ہیں۔ اور ان میں اہل عرب کی طبع آزمائیاں اس کثرت سے ہیں کہ جس سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس ضخیم ذخیرہ میں جدت و اختراع کی کمی ہے۔

اسی طرح عربی شاعری جو تغزل۔ محبوب کے آثار و منازل پر عشاق کی آہ و زاری گزرے ہوئے دنوں اور واقعات کی یاد۔ جذبات اور دلی کیفیات کے بیان اور شگفتگی اور سوز و گداز کی مصوری پر مشتمل ہے۔ کسی طرح جامد جذبات کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

جاحظ جماعت شعوبیہ کے اس قول کو تو تسلیم کرتا ہے کہ عربوں کے ہاں نہ علم تھا اور نہ فلسفہ اور نہ موروثی کتابوں کا سلسلہ۔ لیکن اس کے عوض میں جاحظ کے نزدیک عربوں کو دو مایہ ناز خصوصیات میسر تھیں۔ ایک اُن کی طلاقت لسانی اور دوسری اُن کی حاضر دماغی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں کے یہ دو وصف نمایاں اور اظہر من الشمس ہیں۔ اُن کی زبان آوری اور بدیہہ گوئی کے ثبوت میں ادب و شعر میں اُن کے آثار پر ایک نظر کافی ہے۔

سطور بالا سے عربوں کے متعلق ہماری رائے آپ پر روشن ہوگئی ہوگی۔ یعنی یہ کہ عرب ایام جاہلیت اور اسلام میں اخلاقی و دماغی لحاظ سے ایک درجہ ترقی پر نہ تھے۔ ہم جاہلی عرب کے اوصاف مختصر طور پر عرض کرتے ہیں۔

عربی مزاج عصبی، سریع الغضب۔ معمولی سی بات پر مشتعل ہونے والا ہے۔ جب اُس کی آتش غضب بھڑک اٹھے تو پھر حدود کی پابند نہیں رہتی اور خصوصاً اس وقت اُس کا جوش غضب اشد ترین ہوتا ہے جب اُس کی عزت و آبرو پر کوئی حملہ یا اُس کے قبیلہ کی حرمت پر دست درازی ہو جہاں وہ مشتعل ہوا فوراً تلوار سونت لی۔ اور وہی اس کی حکم بنتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ خانہ جنگی نے ان کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اور جنگ اُن کے ہاں روزمرہ کی زندگی اور مانوس نظام ہوگیا۔

عصبی مزاج کا فطری نتیجہ ذکاوت ہے اور واقعہ ہے کہ عرب ذکی ہے اس کی ذکاوت زبان میں صاف طور پر عیاں ہے۔ بسا اوقات وہ صرف رمز و کنایہ اور بعید اشارہ پر ہی اعتماد کرتا ہے۔ اسی سے اس کی بدیہہ گوئی اور حاضر دماغی میں اس کی ذکاوت کا پتہ چلتا ہے۔ ناگہاں ایک سوال کے لئے فوراً موزوں جواب حاضر کرے گا۔ لیکن عربی ذکاوت مخترع وجدت تراش نہیں۔ وہ ایک مطلب کو متعدد صورتوں میں ادا کرے گا۔ اُس کے اختراع معانی سے زیادہ اُس کا ادائے معانی جاذب ہوتا ہے۔ مختصر لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ عرب کی زبان اس کے دماغ سے زیادہ چلتی ہے۔

عرب کا تخیل محدود اور غیر متنوع ہے۔ بہت کم اس کا تخیل اپنے سے بہتر احول یا موجودہ زندگی سے برتر زندگی کی خیالی تشکیل کرسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عرب کا تخیل واقفیت کی

سرحد سے بہت کم آگے پرواز کرتا ہے۔ چنانچہ بلند پروازی کے اسی فقدان کا نتیجہ ہے کہ وہ (مثل اعلیٰ) کے تصور سے قاصر ہے۔ بات یہ ہے کہ نتیجہ ہے تخیل کی بلند پروازی کا۔ اسی وجہ سے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اس نے کوئی خاص لفظ بھی وضع نہیں کیا اور جہاں تک ہمیں علم ہے اس کے ادب میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ شاذ و نادر ہی اس کا طائر تخیل نئے معانی کی تلاش میں عالم جدید کی پرواز کرتا ہے۔ اور صرف ایک محدود دائرے کے اندر نت نئی راہیں نکالنا جانتا ہے۔

طبائع کے اعتبار سے اس کا شوق حریت شاذ و نادر ہی کسی حدود کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ آزادی صرف اس کے اپنے نفس تک محدود ہے۔ اجتماعی حریت سے اسے واسطہ نہیں۔ امیر یا حاکم کی اطاعت کا وہ سرے سے قائل نہیں۔ ایام جاہلیت کیا اسلامی عہد میں بھی اس کی تاریخ آپس کی خانہ جنگیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کا عہد عربی تاریخ کا زرین زمانہ ہے۔ جس میں انھوں نے عربوں کو بیرونی جنگوں میں لگا کر آپس کی خانہ جنگی سے مامون رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عربی فطرت کے بہترین نبض شناس تھے۔

عرب مساوات کا شیدا ہے۔ لیکن صرف قبیلہ کی حدود کے اندر مساوات کی شیفتگی کے ساتھ ساتھ اپنے قبیلہ اور جنس پر بڑا ناز کرنے والا بھی ہے۔ اسے اپنی برتری اور عالی نسبی پر دل و جان سے یقین ہے اہل فارس و روم کے تہذیب و تمدن اور اپنی وحشت و بدویت۔ ان کی آسودگی و ثروت اور اپنی بے خانمانی اور فقر و فاقہ کے باوجود ان کی عظمت و بزرگی کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے ممالک کو فتح کیا تو وہاں کے باشندوں کو بھی حاکمانہ نظر سے دیکھا۔

(ترجمہ از عربی)

کیا اُردو شاعری محض نقالی ہے؟

(بہ سلسلہ گزشتہ)

الفاظ کے بعد مضمون پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم اردو شاعری کے مضامین بھی محدود۔ رسمی اور تقلیدی ہیں۔ ان میں کچھ وسعت نہیں ہے۔ مضمون کی تلاش میں پرانے شعرا کی کشکولیں بار بار ڈھونڈی جاتی ہیں اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انھیں باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ شاعرانہ مضامین کو محدود صرف اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ قدیم شعرا اپنی توجہ زیادہ تر داخلی شاعری پر صرف کرتے تھے۔ اور انھوں نے قدرتی مناظر و مرایا اور وصف نگاری سے بڑی حد تک بے اعتنائی کی ہے۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کی حقیقت و ماہیت سے قدیم شعرا موجودہ معترضین کے بہ نسبت بہت زیادہ واقف تھے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول ہے کہ "شاعری حیات انسانی کی تفسیر ہے"، آج تمام مغربی ممالک اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔ ہمارے قدیم شعرا بھی اسی پر عامل تھے۔ شاعری میں نیچر بحیثیت نیچر کوئی اہمیت نہیں رکھتا دنیائے شاعری کا مرکز انسان ہے۔ نیچر کی کوئی چیز اسی حد تک شاعری کا موضوع بن سکتی ہے۔ جس حد تک اس کو روح انسانی سے تعلق ہے۔ نیچر کا سب سے بڑا پرستار ورڈس ورتھ تھا لیکن اس کا عقیدہ ہے کہ نیچر کی ہر شے میں ایک عالمگیر روح جاری و ساری ہے۔ اور اسی روح کے ذریعہ سے ساری کائنات ایک رشتہ اتحاد میں مربوط ہے۔ اسی روح کو دریافت کرنا اور اس سے لوگوں کو روشناس کرانا شاعر کا کام ہے۔ جو لوگ ورڈس ورتھ کے عقیدہ کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا بھی خیال ہے کہ تمام اشیائے عالم میں ایک زندہ روح نہیں تو کم سے کم وحدت و ہم آہنگی ضرور پائی جاتی ہے۔ شیلی کے قول کے مطابق نیچر کے خوبصورت چہرہ کی نقاب کشائی شاعر کا فریضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر بیں آنکھیں قدرتی اشیا کے صرف باہری اور نمایاں پہلو کو دیکھتی ہیں لیکن شاعر کی نظر ظاہری پردہ سے گزر کر اشیا کے درون و بطن تک پہنچتی ہے اور وہاں شاعر جو کچھ رموز و اسرار دیکھتا ہے انھیں اپنی نظم میں بیان کرتا

ہے۔ ہمارے شعرا کا بھی خیال ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ حسن ازل کا مظہر ہے۔ شاعر کو اشیاء کی ظاہری ہیئت و صورت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اسی حسن ازل کا پرستار ہے جس کے جلوے چشم حقیقت بیں کو ہر ذرہ میں نظر آتے ہیں۔ ایک معمولی مصور اور شاعر میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر کی نظر کسی شے کے ظاہری پہلو پر پڑتی ہے اور وہ اس کی عکسی تصویر اتارتا ہے لیکن شاعر کی نگاہ ظاہری پہلو سے گزر کر کسی شے کے بطن و ماہیت تک پہنچتی ہے اور وہ اپنی تصویر میں ظاہر سے زیادہ باطنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ بیانیہ شاعری میں کوئی واقعہ جس طرح وہ پیش آیا ہے یا کوئی منظر جیسا وہ چشم ظاہر میں نظر آتا ہے بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن ماہرین فن کے نزدیک اس قسم کی بیانیہ شاعری محض نظم نگاری کی مرادف ہے۔ کسی منظوم واقعہ یا کسی منظر کی عکاسی پر شاعری کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اشیائے عالم کے رموز و اسرار اور حقائق و معارف کے حریم میں باریاب ہونا اور وہاں کی تجلیات سے اہل عالم کو آگاہ کرنا شاعری کا اعلیٰ منصب ہے۔ ہمارے قدیم شعرا کا یہی خیال تھا۔ ان کی علو ہمتی اور بلند نظری نے انھیں بیانیہ شاعری اور وصف نگاری کی طرف مائل ہونے نہیں دیا۔ بگولہ پر ایک بیانیہ شاعر جب نظم لکھنے بیٹھے گا تو اس کی مختلف ظاہر کیفیتوں کو تفصیل سے بیان کرے گا لیکن ایک حقیقت شناس شاعر اس کی حرکت و تراقص کو ایسے انداز سے بیان کر دے گا کہ عرصہ تک روح وجد کرتی رہے گی۔

چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے۔ اک رقص تو ہے بیتاب سہی برباد سہی

کیا کوئی بیانیہ شاعر اپنی سو سطروں کی نظم میں بھی وہ جوش وہ حرکت۔ وہ رقص۔ وہ اہتزاز وہ گرمی وہ تڑپ پیدا کر سکتا ہے جو اس ایک شعر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے؟ ایک سطح آشنا شاعر سمندر کے کنارے جاتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ موجیں اٹھ رہی ہیں۔ ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ ساحل بہت دیر تک مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن سمندر کا تلاطم اور موجوں کی لگاتار ٹکر آخر دیوار ساحل کو توڑ دیتی ہے۔ اس شاعر کی نگاہیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ اسے تفصیل کے ساتھ نظم کر دیتا ہے۔ لیکن ایک حقیقی شاعر سمندر کے

اس نظارہ کو انسانی زندگی سے بے تعلق نہیں پاتا۔ یہاں بھی اسے دنیائے حسن وعشق کے جلوے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مرزا غالب فرماتے ہیں۔

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل

جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعوی پارسائی کا

بہرحال اگر کوئی شاعر کسی قدرتی منظر کی ہو بہو تصویر کھینچ دے اور یہ تصویر اسے مست و بیخود بھی بنا دے تو ورڈس ورتھ کے نزدیک ایک شاعر کی حیثیت ایک بچہ سے بڑھ کر نہیں ہے جو کسی ہنستی پھول سے بیحد خوش ہو کر اچھلتا ہے کودتا ہے۔ اور ناچتا ہے۔ بچہ صرف پھول کی خوشنمائی پر جان دیتا ہے لیکن اس کے رموز و اسرار سے واقف نہیں۔ ہمارے باکمال شعرا بھی واقعہ گوئی۔ منظر نگاری اور وصف بیانی وغیرہ کو طفلانہ حرکت سمجھ کر ادھر کم رُخ کرتے تھے اور حیات انسانی کی تفسیر و تعبیر کو شاعری کا اعلیٰ مقصد خیال کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ انگریزی کی درسی کتابوں میں کتے۔ بلّی۔ فاختہ۔ شاہ بلوط وغیرہ پر چھوٹی چھوٹی نظمیں دیکھ کر "دانایان فرنگ" سے مرعوب ذہنیتوں نے انھیں انگریزی شاعری کا اعلیٰ نمونہ سمجھ لیا۔ دراصل ان میں کوئی شاعرانہ خوبیاں ہوں یا نہوں لیکن وہ حاکم زبان کی شاعری سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور حاکم کی شاعری محکوم کی شاعری سے یقیناً بالا و برتر ہوگی۔ اس غلامانہ ذہنیت کے تحت یورپ زدوں کی ایک ٹولی نے اپنے اسلاف کے روشن کارناموں پر دُھول جھونکنا شروع کیا۔ انھیں پرانے لکیر کے فقیر قرار دے کر اس نئی ٹولی نے اپنے سمند سخن کی جولانی کے لئے ایک نیا میدان ڈھونڈ لیا۔ اس میدان کی ہر چھوٹی بڑی چیز پر چند موزوں و مقفیٰ سطریں لکھ دینے سے ایک نظم تیار ہو جاتی تھی۔ پھر کیا تھا یار لوگوں نے پن چکی پر۔ اسلم کی بلی پر۔ گھوڑے پر۔ کتے پر۔ ریل گاڑی پر۔ گائے پر۔ اونٹ پر۔ قادر ولیم پر۔ چھوٹی چیونٹی پر۔ بڑے ہاتھی پر۔ گدھے پر۔ شیر پر۔ ملکہ وکٹوریہ پر۔ خرگوش پر۔ بھیڑئیے پر۔ روباہ بیدم پر۔ کوے پر۔ مور پر۔ پیپل پر۔ برگد پر۔ شیخ جی کے حقہ پر یہاں تک کہ اندھرا دیس کی سندری پر نظمیں لکھی گئیں۔ اسے جدید شاعری کا لقب ملا۔ جب اینٹ پتھر۔ جھاڑ۔ بندر۔ خاک۔ دھول سب کچھ موضوع شاعری بننے کے لئے تیار ہو تو اس نئی سرزمین کی لانہایت وسعتوں کے کیا کہنے۔ پرانے شاعروں کی نسبت

مشہور ہے کہ انھوں نے اپنی بلند پروازیوں سے متاعِ سخن کو فرش سے اٹھاکر عرش پر رکھ دیا۔ لیکن جدید شاعری
کے حامیوں نے ایسے بے ہنگام سُر میں گانا شروع کیا کہ سروشِ سخن نے کان میں روئی ڈال لی اور اس
جنس کاسد کو ایسا ٹھکرایا کہ وہ آسمان سے زمین پر نہیں گری بلکہ تحت الثریٰ تک پہنچ گئی۔

بہرحال یہ سب کچھ خارجی شاعری سے متعلق ہے۔ جب ہم داخلی شاعری پر نظر کرتے ہیں جس کو
عالم خارجی سے نہیں بلکہ قلبی دنیا سے تعلق ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ایک صنف غزل کی بے پایاں
وسعت پہنائے دوعالم سے ہمدوش ہے۔ غزل کے اشعار میں حیات انسانی کی پوری تفسیر موجود
ہے۔ غزل اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے صرف حسن وعشق کے معاملات کی ترجمانی کے لئے مخصوص تھی۔
لیکن ہمارے باکمال شعرا نے اس کو محض عشقیہ مضامین تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ہر قسم کے فلسفیانہ
حکیمانہ۔ اخلاقی۔ صوفیانہ۔ عارفانہ اور نعتیہ کلام کا حامل بناکر اس میں کونین کی وسعت پیدا کر دی۔ اُردو
شاعری پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ صرف عشق ومحبت کی گرویدہ ہے۔ عشقیہ مضامین کی اس میں اس قدر کثرت
ہے کہ دوسرے مضامین کی وہاں کھپت ہی نہیں۔ نہ معلوم عشقیہ مضامین کی اہمیت کے متعلق ان کا
کیا خیال ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب سے انسان کتم عدم سے منصۂ شہود پر آیا اس وقت سے آجتک
دنیا میں عشق ومحبت کی گرم بازاری رہا کی ہے۔ اور جب تک روئے زمین پر ایک متنفس بھی باقی رہیگا
محبت کی گرمی محفل کبھی کم نہ ہوگی۔ رسم ورواج۔ معیار اخلاق خیالات وافکار۔ سیاسی ومعاشری تحریکات
یہاں تک کہ مذہبی ایقان واعتقاد بھی تبدیل ہوسکتا ہے۔ لیکن جذبۂ عشق کو بقائے دوام حاصل ہے۔
جس شاعری کی بنیاد عشق ومحبت پر ہو وہ ہر زمانہ میں قلوب انسانی کو گرماتی رہے گی۔ دوسری تحریکات
سے تعلق رکھنے والی شاعری اسی وقت تک لطف بخش ہوتی ہے جب تک وہ تحریکیں زندہ ہیں۔ ان
کے مردہ ہونے پر ان سے متعلقہ شاعری کا بازار بھی سرد پڑ جاتا ہے۔ علاوہ بریں عشق ومحبت کی دنیا اس
قدر وسیع ہے کہ ہر قدم پر ایک نیا عالم اور بیشمار جلوے نظر آتے ہیں۔ حسن کے ناز وانداز اور عشق کے راز و
نیاز لاتناہی ہیں۔ اگر غزل میں صرف حسن وعشق ہی کے معاملات کی ترجمانی ہوتی رہے تو وہ کبھی ختم ہونے
والے نہیں۔ پھر عشقیہ مضامین پر تنگی ومحدودیت کا الزام تنگ نظری کی دلیل ہے۔ غزل کے دوسرے

فلسفیانہ .حکیمانہ .صوفیانہ .اخلاقی عارفانہ اور نعتیہ مضامین بحث میں شامل کرلئے جائیں تو ان کا احصا و شمار ناممکن ہوجائے۔ روزمرہ کی زندگی کا بھی کوئی ایسا معاملہ نہیں جس پر غزل گو شعرا نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ چونکہ غزل کی زبان عاشقانہ ہوتی ہے اس لئے روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے اشعار کو بھی ناواقف لوگ عشقیہ کلام سمجھ لیتے ہیں لیکن تمثیل و کنایہ کی گفتگو سمجھنے والوں کو ہر شعر میں معاملات حیات کی تشریح ملتی ہے .غزل میں انسانی زندگی کی پوری تفسیر موجود ہے۔ اس کا بین ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ہم ہمیشہ تحریر میں تقریر میں .مضمون نویسی میں .خط و کتابت میں .گفتگو میں اکثر غزل کے اشعار نقل کرتے ہیں جن کی چول ایسی ٹھیک بیٹھتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع کے لئے وہ کہے گئے تھے .مثلاً ایک شعر ہے کہ

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند   دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

بظاہر یہ ایک عاشقانہ شعر ہے معشوق بام پر ہے۔ عاشق رات کو چوری چھپکے کمند ڈال کر چڑھتا ہے۔ جب دو چار ہاتھ لب بام باقی رہ جاتا ہے تو بدقسمتی سے کمند ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن یہ شعر زندگی کے ہر شعبے میں استعمال ہوسکتا ہے۔ کسی دینی یا دنیوی مقصد کے لئے جب انسان کوشش کرتا ہے۔ اور تمام مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرلیتا ہے لیکن اگر آخری منزل میں ایسی ناکامی ہو کہ تمام کوششیں رائگاں ہوجائیں تو اس وقت اس پر یہ شعر صادق آئے گا۔ زیادہ مثالوں کی یہاں نہ گنجایش ہے اور نہ ضرورت۔ غزل کے اشعار کثیر المعنی ہوتے ہیں۔ ہر شخص ان کی اس خصوصیت سے واقف ہے اور اپنی زندگی کے مختلف موقعوں پر مختلف اشعار استعمال کرتا ہے۔ فارسی اور اردو غزل کے اشعار کی سی لچک اور ہمہ گیری دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں نہیں پائی جاتی جس شاعری کے مضامین زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں پر حاوی ہوں۔ جو حیات انسانی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے کی ترجمانی کرتے ہوں اس کو تنگ اور محدود کہنا ڈھیٹائی نہیں تو اور کیا ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں اسی طرح اردو شاعری اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے قدیم شعرا کا خیال تھا کہ ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

وہ زندگی کے ہر واقعہ اور ہر معاملے کی تشریح تمثیل و کنایہ میں کرتے تھے تاکہ کلام کی لطافت و رنگینی قائم رہے۔ لیکن جو لوگ تمثیل و کنایہ کی گفتگو سمجھنے سے عاری ہیں ان کو ہر شعر گل و بلبل کی داستان ہی معلوم ہوتا ہے۔ طرز بیان سے دھوکا کھا کر وہ سمجھ لیتے ہیں کہ مضامینِ شاعری میں وسعت اور تنوع نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی سراسر غلط ہے کہ تمام شعرا آنکھ بند کر کے ایک ہی ڈگر پر چلتے تھے۔ ایک ہی مضمون کو بار بار دہراتے تھے۔ سب کا رنگ ایک ہی ہے۔ کہیں جدت اور تنوع کا نام نہیں جس طرح ہر قوم کے خصائص و شعائر جداگانہ ہوتے ہیں اسی طرح ہر زمانے کی سیاسی و معاشری خصوصیتیں بھی متغائر ہوتی ہیں۔ انھیں اختلافات کی بنا پر ہم ایک قوم یا ایک زمانے کے لٹریچر کو دوسری قوم یا دوسرے زمانے کے لٹریچر سے متائز کرتے ہیں کیونکہ لٹریچر قومی شعائر اور معاشری خصائص کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر یونانی لٹریچر یونانی قوم کے خیالات و جذبات کا حامل ہے تو عربی لٹریچر عرب قوم کی ذہنی و روحانی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اگر الزبتھی لٹریچر میں عہد الزبتھ کی تہذیب و معاشرت کی تصویریں نظر آتی ہیں تو وکٹوریائی لٹریچر عہد وکٹوریہ کے نتائج افکار کا سرمایہ دار ہے۔ جب ہم "یونانی لٹریچر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ تمام یونانی مصنفین ایک نہج پر سوچتے تھے۔ ایک ہی مضمون پر لکھتے تھے۔ ایک ہی طرز تحریر کی پیروی کرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ شعرائے اساطین کے کلام کیا بہ لحاظ مضمون اور کیا بہ لحاظ اسلوب بیان ایک دوسرے سے متبائن تھے۔ لیکن انفرادی اختلافات دور کرنے پر بھی ان میں بہت سے مشترکہ اوصاف پائے جاتے تھے جو یونانی قوم سے مختص تھے اور جو ان کے کلام کو دوسری قوموں کی شاعری سے ممتاز کرتے تھے۔ یہی حال ایک ہی قوم کے مختلف عہود و ادوار کے لٹریچر کا ہے۔ ایک عہد کا لٹریچر باوجود مصنفین کے انفرادی فروق کے چند مشترکہ امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے دوسرے عہد کے لٹریچر سے جداگانہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اجنبی ملک میں جائے تو وہاں کے تمام باشندے اس کو ایک ہی وضع قطع کے معلوم ہوں گے۔ ان کو وہ دوسری قوموں سے بہ آسانی تمیز کرے گا لیکن وہاں کی مختلف جماعتوں۔ مختلف گروہوں یا مختلف افراد کے عادات و خصائل میں امتیاز کرنے کے لئے اسے وہاں کچھ مدت تک قیام کر کے غور کے ساتھ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اسی طرح کسی قوم یا کسی

عہد کے لٹریچر کی نمایاں خصوصیات آسانی معلوم ہو سکتی ہیں لیکن مختلف شعرا کے کلام کو ایک دوسرے سے امتیاز کرنے کے لئے بالاستیعاب مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس تمہید کے پیش نظر اگر ہم قدیم اردو شاعری پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے شعرا اپنے زمانے کے معاشرہ کے خیالات و جذبات۔ ذہنی رجحانات۔ روحانی بلند پروازیوں اور عام تہذیب و تمدن کے ترجمان تھے۔ کوتہ اندیش معترضین جب ان کے کلام کو انگریزی کی نظموں کے مقابل میں رکھتے ہیں تو ان کو قدیم شاعری کا سارا سرمایہ یکساں معلوم ہوتا ہے۔ اور انفرادی اختلافات کا پتہ نہیں چلتا لیکن جو اہل نظر ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ میر کی شاعری میں 'آہ' ہے تو مرزا سودا 'واہ' کے دلدادہ ہیں۔ حاتم کو ایہام گوئی میں مزہ ملتا ہے تو آبرو کو رعایت لفظی مرغوب ہے۔ درد کا کلام نکات تصوف سے لبریز ہے تو انشا کو ہزل گوئی میں لطف آتا ہے۔ جرأت معاملہ بندی میں مہارت رکھتے ہیں تو ذوق محاورہ بندی کے بادشاہ ہیں۔ غالب فلسفہ کے شیدائی ہیں تو مومن رنگ تغزل کے دلدادہ ہیں۔ ظفر کا کلام صفائی زبان کے لئے مشہور ہے تو آتش کا سوز و گداز اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ امیر کی طبیعت میں اگر متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے تو داغ کا کلام شوخی اور تیکھاپن میں بے نظیر ہے۔ میر حسن زبان کی سادگی و روانی پر جان دیتے ہیں تو نسیم صناعی و مرصع کاری پر مرتے ہیں۔ اگر دبستان دہلی کو جذبات نگاری پر ناز تھا تو دبستان لکھنؤ کو کنگھی چوٹی کا مضمون زیادہ مرغوب تھا۔ الغرض کیا بہ لحاظ مضمون اور کیا بہ لحاظ اسلوب بیان شعرا کی انفرادی خصوصیتیں جداگانہ تھیں تاہم تہذیب و تمدن کی یکسانی اور اجتماعی پسند و مذاق کی ہم رنگی کی وجہ سے ان میں بہت سے مشترکہ و متحدہ اوصاف بھی پیدا ہوگئے تھے۔ جن کی بنا پر ان کی شاعری نے ایک خاص ہیئت و شکل اختیار کر لی تھی۔ قدیم شاعری کو بہ حیثیت مجموعی ایک چمنستان قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس میں رنگ برنگ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہوں۔ اگر کسی کو یہ تمام گلہائے بوقلمون ایک ہی رنگ کے نظر آئیں تو یہ اس کے نقص بصری کا قصور۔ قدیم تذکروں اور تنقیدوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ جوہریان سخن کے نزدیک مضمون کی طرفگی اور تازگی اور طرز ادا کی جدت و ندرت کی بڑی قدر تھی شعرا نہ صرف نئی نئی بندشوں اور ترکیبوں کی تلاش میں رہتے تھے بلکہ اچھوتے مضمون پیدا کرنے کی بھی انھیں

بڑی فکر رہا کرتی تھی۔ اس وقت کی سب سے بڑی علمی مجلسیں مشاعرے تھے جہاں شاعروں کو مضمون آفرینیوں کی دل کھول کر داد ملتی تھی۔ البتہ ان کے نئے اور اچھوتے مضامین بھی ہیئت اجتماعیہ کے مذاق و پسند کے مطابق ہوتے تھے اور شاعری کا اقتضا بھی یہی ہے۔ ورنہ اگر کوئی شاعر بالکل اجنبی و نامانوس مضمون باندھے تو نہ کسی کو اس سے لطف حاصل ہوگا اور نہ کہیں سے اس کی داد ملے گی معترضین کی مادہ پرستی نے صرف قدرتی مناظر و مرایا یا عالم خارجی کی اشیائے مادی کو نیا مضمون سمجھ لیا ہے۔ اور ان کی حقیقت ناآشنا نگاہ میں عالم باطنی کے لاتعداد نظارے اور روحانی دنیا کی گوناگوں کیفیتیں جو ہمارے قدیم شعرا کا خاص موضوع سخن تھیں سب ایک ہی رنگ کی نظر آتی ہیں۔

چونکہ فارسی اور اُردو شاعری کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اس لئے معترضین ثانی الذکر کو اول الذکر کی نقالی کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت مضامین کی یکجہتی نقالی کا نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کی یکسانی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری کی جو معاشری فضا تھی اسی میں اردو شاعری نے بھی نشو و نما پائی اس لئے ایک ہی فضا و ماحول کا دونوں قسم کی شاعریوں پر یکساں اثر پڑنا لازمی امر تھا۔ کسی عہد کا لٹریچر مختلف شعرا کے کلام اور متفرق ادیبوں کی تصنیفات کا بے ربط مجموعہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کی حیثیت ایک عجائب خانہ کی سی ہوگی جس میں مختلف نباتاتی و معدنی پیداواریں یا مردہ حیوانات کے کالبد یا صنعت و حرفت کے نمونے قرینہ کے ساتھ الماریوں میں یا میزوں پر سجائے گئے ہوں بلکہ ادب و شاعری ایک زندہ نامیات ہے جس کے اعضا و جوارح ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ قدیم اردو شاعری بھی ایک چھتنار درخت تھی۔ مختلف شعرا کے کلام بمنزلہ اس کی شاخ کے تھے۔ جو مادری تنہ سے مربوط تھے اور اسی سے اپنی غذا حاصل کرتے تھے۔ زندگی کا عالمگیر قانون سب پر حاوی تھا۔ جدت اور آزادی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی شاخ اپنے مادری تنہ سے علیحدہ ہو جائے۔ ایسی آزادی خودکشی کے مرادف ہوگی۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی۔ ان کے حربی استیلا، سیاسی برتری اور حاکمانہ اقتدار نے ایک خاص تہذیب و تمدن کی بنا ڈالی تھی جو انگریزی کے بعد تک قائم رہا۔ اسی تہذیب و تمدن نے اہل ہند کو فارسی ادب و شاعری کا گرویدہ بنایا تھا۔ ہم

اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جس معاشری فضا میں فارسی کو عام مقبولیت حاصل ہوئی تھی اسی فضا میں اردو شاعری نے بھی جنم لیا اور نشو و نما پائی۔ لوگوں کے خیالات و جذبات۔ تصورات و تخیلات۔ مقاصد و عزائم۔ وضع قطع رسم و رواج طرز بود و باند۔ آداب و مراسم۔ روایات و معتقدات اور توہمات و مزعومات شروع سے اخیر تک ایک ہی نہج پر قائم رہے۔ اگر ان میں تبدیلی واقع ہوئی تو اس وقت جبکہ انگریزی تسلط نے مغربی و مشرقی تمدنوں کو باہمی تصادم کا موقع دیا۔ شاعری میں انھیں معاشری حالات و کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ چونکہ معاشری حالات و کیفیات اور لوگوں کے خیالات و افکار اور پسند و مذاق ایک ہی تھے اور اردو و فارسی شاعری ان کے اظہار کے صرف دو ذریعے تھے اس لئے دونوں کے مضامین کا یکساں ہونا ایک لازمی امر تھا۔ نقالی تو ہمیشہ اجنبی چیز کی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ہندی شاعر کسی چینی شاعر کی تقلید کرے اور اپنی شاعری میں چینی خیالات و جذبات کی تصویر کھینچے تو اس کے ہموطنوں کو ایسی شاعری سے بوجہ اجنبیت و بیگانگی کوئی لطف حاصل نہوگا۔ لیکن اردو شعرا جن مضامین پر طبع آزمائی کرتے تھے وہ یہاں کے لوگوں کے پسند و مذاق کے مطابق بلکہ ایسی کے خیالات و جذبات کا آئینہ ہوتے تھے اس لئے وہ حد درجہ محظوظ ہوتے تھے اور شعرا کو باج تحسین ادا کرتے تھے۔ الغرض اردو شاعری پر کسی صورت سے نقالی کا الزام عاید نہیں ہو سکتا۔

مضمون سے قطع نظر اسلوب بیان بھی رسمیت۔ محدودیت اور نقالی کا الزام عائد کرنے کا دستور ہوگیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قدیم اردو شاعری میں روایتی و رسمی تشبیہات و استعارات کی جو عربی و فارسی کی خوشہ چینی سے حاصل ہوئے ہیں سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے اور طرح طرح کی صناعیاں استعمال کی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اردو شاعری کا دامن بیجا و بیکار تصنعات و تکلفات سے گرانبار ہوگیا۔ ان تمام باتوں سے حقیقی جذبات و خیالات کے اظہار میں رکاوٹ پیش ہوتی ہے۔ اگر شاعری کی زبان سادہ۔ فطری اور رسمی تکلفات و تصنعات سے پاک ہو ہر قسم کے خیال و جذبہ کی ترجمانی میں سہولت واقع ہوگی۔ یہ اعتراض بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ انیسویں صدی عیسوی میں انگریزی نقاد کلاسیت کی مخالفت میں جن خیالات کا اظہار کر رہے تھے انھیں کی یہ صدائے بازگشت ہے۔ یوں تو انگلستان میں ولیم بلیک ہی کے وقت سے کلاسیت (Classicism) کی مخالفت شروع ہوگئی تھی لیکن ۱۸۰۰ء میں

ورڈزورتھ نے اپنا مشہور و معروف دیباچہ شائع کیا جس میں اس نے قدیم "پوئٹک ڈکشن" (شاعرانہ زبان و اسلوب بیان) کے خلاف علی الاعلان علم بغاوت بلند کیا۔ اور نہایت سادہ اور معمولی بول چال کی زبان میں شاعری شروع کی۔ مضمون کے لحاظ سے بھی اس نے ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی کے حالات و واقعات انتخاب کئے۔ لیکن آگے چل کر وہ خود ہی اس کی خلاف ورزی کرنے لگا۔ چنانچہ ورڈزورتھ کے بلند پایہ سانٹ (Sonnets) ہر قسم کی صناعیوں اور مرصع کاریوں سے لبریز ہیں۔ بڑے بڑے نقاد مثلاً میتھیو آرنلڈ۔ والٹر پیٹر۔ لفکاڈیو ہرن اور لاول وغیرہ کا بیان ہے کہ ورڈزورتھ کا وہی کلام پرجوش موثر اور زندہ رہنے کے قابل ہے جس میں اس نے قدیم طرز بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصول کی پابندی کی ہے ورنہ اس کے کثیر التعداد اشعار جن میں اس نے سیدھی سادی بول چال کی زبان اختیار کی ہے بالکل مبتذل۔ پھسپھسے۔ بے لطف اور بے مزہ ہیں۔ بہرحال ادنیٰ طبقہ کے شاعروں کو جو ادب العالیہ کی کمان زہ کرنے سے قاصر تھے ایک اچھا موقع ہاتھ آیا۔ چونکہ فصاحت و بلاغت کے اصول کی پیروی زحمت طلب تھی اس لئے انھوں نے ورڈزورتھ کی بتائی ہوئی آسان ڈگر پر آنکھ بند کر کے چلنا شروع کیا۔ مقررہ اصول و ضوابط کی خلاف ورزی کا نام جدت رکھا گیا۔ بہت سے اہل نظر بھی اس آسان نئی راہ پر صرف اس وجہ سے گامزن ہو گئے کہ کہیں جدت پسند طبقہ ان پر دقیانوسیت کا الزام نہ عائد کر دے۔ رفتہ رفتہ ساری ادبی لطافت خاک میں مل گئی۔ بالآخر ماہرین فن نے محسوس کیا کہ قدیم روش کی خلاف ورزی اور بے آئینی نے ادبی دنیا میں ہراج اور انتشار پیدا کر دیا ہے۔ شاعری کا بازار جنس کاسد سے بھرا جاتا ہے۔ سر والٹر ریلے کا بیان ہے کہ کلاسیت کے مخالفین کا سارا کارنامہ محض تخریبی ہے۔ مسٹر الفرڈ نائیس کا خیال ہے کہ شاعری آگے بڑھنے کے بجائے الٹے پاؤں دور توحش کی طرف رجعت کر رہی ہے۔ وہ اپنے مقالہ "موجودہ ادبیات کی چند خصوصیات" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "حامیان جدید شاعری کسی باکمال اور عظیم المرتبت شاعر کے کلام کی تعریف کرنے کے وقت بھی اس سے تصنع و تکلف کا انتساب ضرور کرتے ہیں اور اس طرح مدح میں ذم کا پہلو پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنے سے زیادہ زبردست اور وسیع الخیال شاعروں کے کلام میں جب انھیں کوئی دوسرا عیب نظر نہیں آتا

تو تصنع کا حربہ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ سچی صناعی ہر زمانے میں بلند پایہ شاعری کا جز ولاینفک رہا کی ہے۔ یونان کے عظیم المرتبت شعرا بشمول ہومر صناعی کے دلدادہ تھے وہ شاعری کے لئے نحوی صحت کو جتنا اہم سمجھتے تھے اتنا ہی فصاحت و بلاغت کے اصول کو بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ رومی ادبیات بھی اپنی فصاحت و فن کاری ہی کی وجہ سے آجتک زندہ ہے۔ ملٹن کی کتاب "فردوس گم شدہ" میں بھی اعلیٰ درجہ کی صناعیاں موجود ہیں۔ شکسپیر کے کلام میں بھی تصنعات و تکلفات کی کمی نہیں۔ "ہنری پنجم" اور "جولیس سیزر" کے ڈراموں میں کہیں کہیں اس قدر صناعی و مرصع کاری صرف کی گئی ہے کہ حامیان جدید شاعری اسے دیکھ کر ہرن کے بچے کی طرح چونک پڑتے ہیں اور ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ شکسپیر اور خود ورڈس ورتھ کے بہترین سانٹ نہایت مرصع و مسجع ہیں۔ شیلی کے کلام میں تو روح شاعری اور صناعی ناقابل انفکاک ہیں۔ اس کی نظم "مغربی ہوا" میں صنائع و بدائع کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان پر کوئی شدید جذبہ طاری ہوتا ہے اور اس کے دل میں جوش اور گرمی پیدا ہوتی ہے تو اس کی زبان سے فصاحت و بلاغت کا دریا بہنے لگتا ہے۔ مگر طوطوں کو حقیقت و واقعیت سے کیا غرض۔ ان کو صرف ایک لفظ "تصنع" کی رٹ لگی ہوئی ہے۔ اسی سے وہ جارحانہ اور مدافعانہ اوزار کا کام لیتے ہیں۔ اسی سے وہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتے ہیں اسی سے وہ اپنے سے زیادہ قابل شاعروں پر حملہ کرتے ہیں۔ اسی سے وہ سادہ لوح پبلک کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ لوگ زبان کی تیز دھار کو کند بنا دیتے ہیں۔ کلام کی ساری لطافت و رنگینی کا خون کرتے ہیں۔ قدیم شعرا کی معنی آفرینیوں اور نازک خیالیوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ قدما کی جنس بیش ارز پر تصنع و تکلف کا عیب لگاتے ہیں۔ اپنی جنس کم ارز کو سادگی و آزادی کا نمونہ قرار دے کر اس کی قیمت بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو اپنی موروثی دولت کی کوئی قدر نہیں۔ وہ اپنے نامور اسلاف کی توہین کرتے ہیں۔"

ہندوستان کی حالت اس سے بھی خراب ہے۔ جب یہاں کی ایک چھوٹی سی جماعت اول اول انگریزی لٹریچر سے تھوڑی بہت آگاہ ہوئی تو اس وقت کے انگریز نقادوں کی طرح وہ بھی اپنے آبا و اجداد کی پر عظمت شاعری پر رسمیت۔ قدامت اور نقالی کا الزام عائد کرنے لگی جب ادنیٰ درجے کے

شاعر قدیم اساتذہ سخن کی طلسم کاریوں۔ نازک خیالیوں۔ مضمون آفرینیوں اور رنگین بیانیوں کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے تو ان پر تصنع و تکلف کا الزام عاید کرنے لگے اور مقررہ اصول و ضوابط کی پیروی کو اظہار خیال کی راہ کا روڑا سمجھنے لگے۔ حالانکہ اظہار خیال میں رکاوٹ کا عذر بذات خود ان کے شاعرانہ ضعف و عجز کی دلیل ہے۔ ورنہ باوجود تمام نحوی و عروضی قید و بند کے قدما کے ضیغم اندیشہ کو بیشہ سخن کے کسی حصہ میں صید معانی کے شکار سے کوئی امر مانع نہ تھا۔ بہرکیف حامیان جدید شاعری کے عجز حوصلہ اور بے بضاعتی نے جس قسم کی سادگی زبان اختیار کی اس نے ان کے کلام کو بالکل روکھا، پھیکا۔ بے مزہ و بے نمک بنادیا۔ اور اس پر "دندان تو ہمہ در دہان اند، چشمان تو زیر ابروان اند" کی مثال صادق آنے لگی چنانچہ تصنعات و تکلفات سے پاک اور بالکل سادہ زبان میں جدید شاعری کا حسب ذیل نمونہ ملاحظہ ہو۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو   اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ   ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جبکہ تم زندگی کا لطف اٹھاؤ   دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار   زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
نوکروں کی تمھارے ہے جو غذا   ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا
کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی   جن پہ بپتا ہے کیسی آن پڑی

جدید شاعری کے ایک اور زبردست نقیب فرماتے ہیں۔

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال   دال کرتی ہے عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں   ساری آفات سے بری تھی میں
تھا ہرا کھیت میرا گہوارہ   وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا
پانی پی پی کے تھی میں لہراتی   دھوپ لیتی کبھی ہوا کھاتی
مینہ برستا تھا جھونکے آتے تھے   گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے

یہی سورج زمین تھے ماں باوا   مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا
جب کیا مجھ کو پال پوس بڑا   آہ ظالم کسان آن پڑا
گئی تقدیر یک بیک جو پلٹ   کھیت کا کھیت کر دیا تلپٹ

اگر سادہ۔ فطری۔ آزاد اور تصنعات سے پاک شاعری اسی کا نام ہے تو وائے برحال شاعری۔ اس سے تو نثر ہی ہزار درجہ بہتر ہے"۔(۱) بالآخر جدید شاعری کے باکمال و بلاغت شناس شعرا نے محسوس کیا کہ اپنی زبان کی ساخت۔ بساط و امتیازی خصوصیات کو نظر انداز کر کے محض انگریزی شاعروں کو کورانہ تقلید میں اپنے کلام کو تمام زیب و زینت کے سامان سے محروم کر دینا اور عروس سخن کو عریاں بنا دینا شاعری کی ترقی نہیں ہے بلکہ اس کو حضیض و پستی میں ڈھکیلنا ہے۔ اس لئے انھوں نے نئی شراب کو بھی قدیم ابریق و مینا میں ڈھالا۔ اور جدید شاہد سخن کو اسی لطیف و رنگین لباس میں جلوہ گر کیا جس سے قدیم شعرا اپنی عروس سخن کو زینت بخشتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال مغربی و مشرقی دونوں خمکدوں کے بادہ نوش ہیں۔ ان سے بڑھ کر مغربی شاعری کا رمز شناس کون ہوگا؟ لیکن انھوں نے انگریزی اسلوب بیان کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے کلام میں گرمی۔ جوش۔ تڑپ۔ اثر۔ زور اور رنگ پیدا کرنے کے لئے قدما ہی کی لطافت۔ نزاکت۔ باریک خیالی اور رنگین بیانی اختیار کی۔ وہ فلسفیانہ شاعری کے دلدادہ ہیں۔ قومی ترانے بھی گاتے ہیں۔ وصف نگاری بھی کرتے ہیں۔ درس بھی دیتے ہیں۔ سیاسی مسائل پر بھی رائے زنی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ بھی پیش کرتے ہیں لیکن ہر جگہ وہی عشق مجازی کی اصطلاحیں۔ وہی صناعیاں۔ وہی رنگین بیانیاں۔ وہی فسوں کاریاں۔ وہی لطیف تشبیہیں وہی پاکیزہ استعارے۔ وہی تلمیحیں۔ وہی راگ۔ وہی سر استعمال کرتے ہیں جو قدیم شاعری کا طرہ امتیاز ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل قطعہ ملاحظہ ہو۔ وہ

---

(۱) یہاں مضمون نگار صاحب نے اپنے ذاتی مذاق کو معیار کلی قرار دے کر ایک جنبش قلم میں بے تکلف اور بے تصنع شاعری کو مردود قرار دے دیا ہے۔ سچ ہے جسے شراب کا چسکا لگ جائے وہ آب زلال کا لطف نہیں اٹھا سکتا ہے۔

مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے زہریلے اثرات سے بچنے اور حیات بخش شعائر اسلامی اختیار کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر ۔۔۔ بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط ۔۔۔ اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق ۔۔۔ سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو ۔۔۔ تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر ۔۔۔ قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بتکدۂ چین سے اٹھا لیں اپنا ۔۔۔ سب کو محو رخ سعدی و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار ۔۔۔ قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز ۔۔۔ جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ ۔۔۔ چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں ۔۔۔ خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہر چہ در دل گزرد وقف زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

ڈاکٹر اقبال کی طرح مولانا سلیم مرحوم بھی جدید شاعری کے ایک زبردست علمبردار تھے۔ انکا کلام بھی محض عشقیہ مضامین تک محدود نہیں ہے بلکہ اخلاق۔ تصوف۔ حب انسانی۔ درس عمل۔ فطرت نگاری رجائیت و تفاول اور فلسفہ جدید وغیرہ پر مشتمل ہے۔ لیکن کسی قسم کے خیالات کی ترجمانی میں ان کو نحوی و عروضی اصول کی پابندی اور علم معنی و بیان کی پیروی کوئی رکاوٹ پیش نہیں کرتی۔ انھوں نے بھی اپنے کلام میں زور و اثر پیدا کرنے کے لئے قدامت کی رنگین بیانی اختیار کی ہے۔ نمونۃً چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

سورج کی زد میں گرچہ فنا کا یقین ہے ۔۔۔ شبنم کو پھر بھی سینہ سپر دیکھتا ہوں

دیکھوں میں تیرا جلوۂ بے رنگ کس طرح | نیرنگیوں کا دل پہ اثر دیکھتا ہوں میں
کن کن بتوں کو سجدہ کیا تیرے سامنے | پیشانی اپنی شرم سے تر دیکھتا ہوں میں
دل سے کسی آفتاب کے اٹھنے کا وقت ہے | رگ رگ میں اپنے نورِ سحر دیکھتا ہوں میں
بخشی ہیں میرے ذرہ کو تو نے وہ رفعتیں | سجدہ میں آفتاب کا سر دیکھتا ہوں میں
دولت کی بستیوں سے ہے بستی تری بعید | اجڑے دلوں میں تیرا گزر دیکھتا ہوں میں

حقیقت الامر یہ ہے کہ قدما اپنے ذوقِ جمالیات و سلامت طبع کی رہبری میں حسن کے ناز و انداز اور عشق کے راز و نیاز کے اظہار کے لئے نہ صرف رنگین و جادو اثر الفاظ ہی کے بلکہ لطیف تشبیہوں اور پاکیزہ استعاروں کے بھی وافر ذخیرے تیار کر گئے ہیں جو اب اُردو ادبیات کے جزو بدن بن گئے ہیں۔ ان کو جدا کرنا گویا زبان کی ہیئت وصورت کو بگاڑنا ہے۔ مانا کہ یہ تمام ذخیرے عربی و فارسی کے ادب العالیہ سے ماخوذ ہیں لیکن یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کیونکہ اخلاف کو اپنے برگزیدہ اسلاف کے روشن کارناموں سے استفادہ کا جائز حق حاصل ہے۔ موجودہ یورپ کا سارا علمی و ادبی خزانہ بھی زیادہ تر یونانی و لاطینی خرمن سے خوشہ چینی کا نتیجہ ہے۔ ملل سابقہ اپنے ذہنی تجربات و نتائج افکار کی جو بیش بہا دولت چھوڑ گئے ہیں وہ آنے والی نسلوں کی جائز میراث ہے۔ اگر انسان اپنے آبا و اجداد کے منتقل کردہ علمی و ادبی خزانوں سے کام نہ لے اور ان کی ایجادوں اور دریافتوں سے فائدہ نہ اٹھائے تو تہذیب و تمدن میں جمود و سکون واقع ہو جائے۔ موجودہ تہذیب و تمدن کی سر بفلک عمارت اسلاف ہی کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر قائم ہے۔ ورنہ اگر ہر نسل انسانی صرف اپنے ہی تجربات و مشاہدات اور دریافت و ایجادات کے اندر اپنی تنگ و دو محدود رکھے۔ اور موروثی دولت سے متمتع نہ ہو تو دنیا کبھی دورِ توحش سے آگے قدم نہ بڑھا سکے گی۔ اگرچہ اُردو بولی مختلف ملکی و غیر ملکی زبانوں کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوئی تھی لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو شاعری خاص فارسی شاعری کی منظورِ نظر و حسن ہے۔ اگر لڑکی نے اپنی ماں سے طرزِ گفتگو و اندازِ بیان سیکھا یا زیب و زینت کے سامان یعنی تشبیہات و استعارات حاصل کئے تو یہ فطری امر تھا۔ اس پر تقلید و خوشہ چینی کا الزام عاید کرنا حماقت ہے۔ نادر بندشوں۔ دل آویز

ترکیبوں۔ لطیف استعاروں اور رنگین تشبیہوں کو غیر ضروری روئے سخن کا صرف غازہ نہیں ہیں بلکہ شاعری کی جان ہیں۔ ممکن ہے کہ نثر میں وہ صرف زیب و زینت کے لئے استعمال ہوتی ہوں لیکن شاعری اور خصوصاً غزل میں ان کی حیثیت روح رواں کی ہے۔ ان کے بغیر کلام کی حقیقت جسد بیجان کی سی ہوتی ہے۔ تشبیہہ و استعارہ کو اظہار خیال کے لئے سد راہ سمجھنا تو بالکل جہالت کی نشانی ہے کیونکہ اکثر ادق و پیچیدہ خیالات جو سیدھے سادھے الفاظ میں بیان ہو ہی نہیں سکتے۔ ایک موزوں تشبیہہ و مناسب استعارہ کی مدد سے آئینہ کی طرح صاف اور روشن بن جاتے ہیں۔ وضاحت و صفائی کے علاوہ کلام کی شوخی۔ گرمی۔ رنگینی اور تاثیر بھی بڑی حد تک تشبیہہ و استعارہ ہی کی رہین منت ہے۔ قدیم شعرا کی بلاغت شناسی اور جدت طرازی جن تشبیہات و استعارات سے کلام میں زندگی کی نئی لہریں دوڑاتی تھی وہ زبان اُردو کی ساخت و بساط کے عین مطابق ہوتے تھے۔ کم سواد معترضین اُردو شاعری میں انگریزی یا بھاشا کی سی تشبیہیں ڈھونڈھتے ہیں حالانکہ یہ تشبیہیں اردو زبان کی ساخت و ترکیب اور فطرت و روایت کے منافی ہونے کی وجہ سے بالکل ان مل اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جب معترضین کو قدیم شاعری میں اجنبی و بیگانہ عناصر نہیں ملتے تو وہ رسمیت و محدودیت کا الزام عاید کرنے لگتے ہیں۔ قدیم شاعری کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اساتذۂ سخن نہ صرف ان تشبیہات و استعارات سے کام لیتے تھے جو انھیں اسلاف سے وراثتۃً منتقل ہوئے تھے بلکہ جدید تشبیہیں بھی ایجاد کرتے تھے البتہ اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ جدید تشبیہیں اجنبی۔ بیگانہ۔ نامانوس اور زبان اُردو کی فطرت و طبیعت کے خلاف نہ ہوں بلکہ قدیم تشبیہوں کے ہم رنگ ہوں۔ فصاحت و بلاغت کا مقتضا بھی یہی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بجنوری نے مرزا غالب کے ایجاد کردہ الفاظ اور ان کے خود آفریدہ تشبیہات و استعارات کی طویل فہرستیں پیش کی ہیں۔ مرزا کی ایجادیں قدیم الفاظ و تشبیہات سے اس قدر ملتی جلتی ہیں اور ایسے بے تکلف انداز سے استعمال ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود تھیں اور ہزاروں بار کی سنی ہوئی ہیں۔ مثلاً دام شنیدن۔ خمار رسوم۔ آتش خاموش۔ جوہر اندیشہ گلبانگ تسلی۔ پہلو اندیشہ۔ زنجیر رسوائی۔ موج نگاہ۔ نبض خس وغیرہ الفاظ کی ترکیبی جدت آشکار اور خوبیاں

ظاہر ہیں۔ اسی طرح موئے آتش دیدہ کی زنجیر ہے۔ دانہائے تسبیح کی صد دل عشاق سے خانہ مجنون کی گرد بے دروازہ سے بہار کی حنائے پائے خزاں سے۔ جوہر آئینہ کی طوطی بسمل سے۔ دام موج کی حلقہ صد کام نہنگ سے۔ تار اشک یاس کی رشتہ چشم سوزن سے ہر قطرۂ خون تن کی نگیں نام معشوق سے تشبیہیں جدت و ندرت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ تکسیک الفاظ کی طرح نئی نئی تشبیہیں ایجاد کرنا جو لطافت و پاکیزگی میں پرانی تشبیہوں کی ٹکر کے ہوں ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے بلکہ صرف شکسپیر۔ ملٹن۔ ٹینی سن۔ غالب۔ میر انیس اور اقبال جیسے خدایان سخن کا خلاق دماغ ہی اس مہم کو سر کر سکتا ہے۔ مسٹر گرنگ لیمبورن کا رونا ہے کہ شکسپیر کی دیکھا دیکھی ادنیٰ درجے کے شاعروں نے بھی تصرف شعری و آزادہ روی اختیار کر کے انگریزی ادبیات کو ایسی پست سطح پر ڈال دیا جہاں وہ ابتدائے تاریخ سے آج تک کبھی نہ گری تھی۔ اُردو شاعری میں بھی آج کل نا اہلوں کی کج روی ہے جسے وہ بزعم خود جدت طرازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ متاعِ سخن کو قعر مذلت میں گرا رہی ہے بعض متشاعروں کے شوق الفاظ تراشی نے ان کے کلام کو صرف بے معنی لفظوں کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے جسے دیکھ کر نقاد کو کہنا پڑتا ہے کہ "یہ ہے وہ شعر جو شرمندۂ معنی نہ ہوا"۔ اسی طرح ان کی نوآفریدہ تشبیہوں پر "ایجاد بندہ گرچہ گندہ" کی مثل صادق آتی ہے۔

اُردو شاعری پر فارسی کی نقالی کا الزام عاید کرنے کے ضمن میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اردو شاعری کا بڑا سرمایہ صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ شعرا کے ضخیم دواوین میں اگرچہ دوسرے اصناف سخن مثلاً قصیدے مثنویاں۔ ترکیب بند۔ مسدس۔ رباعیاں وغیرہ بھی نظر آتی ہیں لیکن ان کی مقدار اس قدر کم ہے کہ انہیں کالعدم ہی متصور کرنا مناسب ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چونکہ دور آخر میں فارسی کی ساری پونجی غزل ہی تھی اس لئے اُردو شعرا نے محض تقلیداً صرف غزل گوئی پر اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ فارسی شاعری کے دور آخر میں جو اسباب غزل گوئی کے محرک تھے انہیں اسباب نے اُردو شعرا کو بھی غزل سرائی پر مائل کیا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی قدرتاً لطافت۔ رنگینی۔ نرمی۔ گھلاوٹ۔ صفائی اور شیرینی پیدا ہوتی جاتی ہے۔

فارسی کے شعرائے متاخرین کا خاص جولانگاہ میدان تغزل تھا کیونکہ دیرینہ تہذیب و تمدن کی ترقی نے زبان میں جو نزاکت - پاکیزگی - صفائی اور روانی پیدا کر دی تھی وہ بحیثیت مجموعی غزل ہی کی متقاضی تھی۔ غرض کہ ایک فطری لسانی اصول کے تحت فارسی شعرا غزل سرائی کرنے لگے تھے - پھر انھیں شاعروں نے جب تفنن طبع کے لئے ریختہ کی جانب توجہ کی تو یہ لازمی امر تھا کہ وہ اس میں بھی غزل ہی کہتے۔ اس کے علاوہ تمدنی و معاشرتی فضا بھی غزل گوئی ہی کے لئے موزوں تھی۔ اُردو شاعری جس زمانے میں وجود پذیر ہوئی وہ عیش و عشرت کا دور تھا - حربی جذبات رو بہ زوال تھے - شجاعت رخصت ہو گئی تھی - جو مصافی فضا پہلے اسلحہ کی جھنکار سے گونج رہی تھی وہاں اب تار و رباب کے نغمے سامعہ نواز تھے - ہر طرف رقص و سرود کی گرم بازاری تھی - مغلیہ اقبال کا آفتاب لب بام پہنچ گیا تھا - نبرد آزماؤں کی خارا شگاف تلواریں نیام میں دھری دھری زنگ آلود ہو گئی تھیں - کوئی عظیم الشان معرکہ آرائی نہ تھی جس کے متعلق پر جوش رزمیہ مثنوی لکھی جاتی - کوئی فاتحانہ و شجاعانہ کارنامہ بھی نہ تھا جو شاعروں کو قصیدہ خوانی پر مائل کرتا - امرا کی دیکھا دیکھی عوام بھی رنگ رلیوں میں مصروف تھے - ایسے تعیش پسند ماحول میں اگر کوئی صنف سخن تاب شنیدن کی منت کش ہو سکتی تھی تو وہ صرف ترنم آمیز غزل تھی - اگر کوئی شاعر طویل مثنویاں یا قصیدے لکھتا بھی تو ان کے سننے کی زحمت کون گوارا کرتا - غزل گوئی کی ترقی و عام مقبولیت کی ایک اور وجہ تھی - تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی قوم کا مطلع اقبال زوال و ادبار کے سیاہ بادل سے مکدر ہو جاتا ہے جب دولت و عظمت کی لکشمی منہ موڑ لیتی ہے - جب دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا نقش دلوں پر بیٹھ جاتا ہے تو ملک کے گوشے گوشے میں توکل و قناعت کے صوفیانہ ادارے قائم ہو جاتے ہیں بے شمار خانقاہیں تعمیر ہوتی ہیں جن کی سکون پرور فضا میں قلب مضطر کو ایک گونہ اطمینان و قرار حاصل ہوتا ہے - ان کے سماع خانوں کے دلپذیر نغمے روح پر وجدانی کیفیت طاری کرتے ہیں - لیکن ان تمام صوفیانہ اثر خیزیوں اور راحت آفرینیوں کا دار و مدار غزل ہی پر ہے - الغرض یہ زمانہ ہر لحاظ سے غزل کے لئے موزوں تھا - تاریخی واقعات - سیاسی تحریکات - معاشری حالات - تمدنی کیفیات - سماجی رجحانات - ذہنی و اخلاقی میلانات - صوفیانہ ادارات سب کے سب متحد طور پر غزل

ہی کے متقاضی تھے۔ ایسی حالت میں اگر اردو شعرا کے دواوین غزلوں سے گرانبار ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ الغرض اردو شاعری میں غزلیات کی فراوانی اقتضائے زمانہ کا نتیجہ تھی نہ کہ فارسی کی نقالی کا۔ آج کل بھی جہد للبقا۔ معاشری معاملات کی پیچیدگی۔ زندگی کے مخمصے ضیق معاش وغیرہ کی وجہ سے اطمینان وسکون مفقود ہوگیا ہے۔ اب کسی کو نہ نثر میں لمبی چوڑی داستانوں سے اور نہ نظم میں طول طویل قصیدوں اور مثنویوں سے حظ اندوز ہونے کا موقع حاصل ہے۔ اس عدیم الفرصتی کے زمانے میں چھوٹے چھوٹے افسانوں یا مختصر نظموں یا غزل ہی کو قبول عام کی سند حاصل ہو سکتی ہے۔

خاتمہ سخن پر یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ ادب وشاعری کوئی جامد وساکن چیز نہیں ہے بلکہ زندہ نامیات (Living Organism) کی طرح ترقی پذیر ہے۔ جس طرح زندگی کے اور شعبوں میں انسان اپنے اسلاف کے تجربات ومشاہدات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنی ایجادات واکتشافات کا ان میں اضافہ کرتا ہے اسی طرح ہمیں چاہئے کہ ادب وشاعری میں بھی ہم قدما کی جادو نگاریوں اور رنگین بیانیوں سے مستفید ہوں اور بوقت ضرورت نئے الفاظ وتشبیہات سے زبان کا دامن وسیع کریں لیکن شرط یہ ہے کہ یہ اضافی ہمارے موروثی ذخائر ادبیہ سے میل کھاتے ہوں۔ انھیں کی طرح خوشگوار، شگفتہ اور فصیح ہوں۔ ان میں اجنبیت۔ ثقالت اور غرابت نہ پائی جائے۔ سیاسی ومعاشری اداروں کی طرح زبان بھی قواعد وضوابط کی محتاج ہے۔ ہمارے اسلاف اس حقیقت سے بےخبر نہ تھے۔ انھوں نے اپنے مذاق شعری وضروریات ادبی کے مطابق معنی وبیان کے اصول اور فن انشا وتکلم کے قواعد مدون کئے۔ اب عہد حاضر میں اگر خیالات میں زیادہ وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ نصب العین اور نقطۂ نگاہ میں فرق آگیا ہے۔ کلام وانشا کی غرض وغایت بھی بدل گئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پرانا ضابطہ بالکل بیکار اور بیخ کنی کے لائق ہوگیا۔ دانائی کا تقاضا ہے کہ پرانے ضوابط میں حسب ضرورت اصلاح وترمیم کی جائے۔ جو شخص محض آئین شکنی کو بہت بڑا اجتہادی کارنامہ خیال کرتا ہے۔ وہ فی الحقیقت ادب وشاعری کا سخت دشمن ہے۔ ایک قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ آرائش وزیبائش کی خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ دور توحش کا انسان بھی جس کھو یا غار میں رہتا تھا اس کو پھول پتیوں سے یا شکار کئے ہوئے جانوروں کے خوبصورت سینگوں سے

یا طائروں کے رنگین پروں سے آراستہ کرتا تھا۔ آج بھی صفحۂ عالم پر ایسی جنگلی قومیں آباد ہیں جن کی عورتوں کو اپنے جھونپڑوں سے بالکل برہنہ نکلنے میں عار نہیں ہوتا لیکن وہی عورتیں اپنے جسم کو بغیر رنگے ہوئے یا بغیر مونگے یا سیپی کی مالا پہنے ہوئے منظر عام پر آنے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔ الغرض انسان ضروریات سے زیادہ تعیشات کا دلدادہ ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تعیشات ضروریات زندگی میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ ایک نیم مہذب قوم جن اشیا کو تعیشات میں شمار کرتی ہے وہ ایک مہذب قوم کی ضروریات زندگی سمجھی جاتی ہیں۔ تہذیب و تمدن کی ترقی زندگی کی ضروریات و احتیاجات کے اضافہ پر منحصر ہے۔ اگر کوئی شائستہ قوم تمام آرائشی و زیبائشی سامان سے دستکش ہو جائے۔ تعیشات ترک کر دے اور سادہ غذا۔ موٹا لباس اور ٹوٹی جھونپڑی پر قناعت کرنے لگے تو یہ تمدن کی ترقی نہ ہوگی بلکہ اسے رجعت الی التوحش تصور کیا جائے گا۔ ادب و شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں بھی شائستگی کو افادت پر تقدم و تفوق حاصل ہے۔ اگر انسان اپنا مافی الضمیر سیدھے سادھے الفاظ میں ظاہر کر دے تو یہ محض بول چال کی زبان ہوگی لیکن اسی بات کو وہ ایسے دلکش پیرایہ میں بیان کرے کہ سننے والے کو حظ و انبساط حاصل ہو تو یہ ادبی زبان کہلائے گی۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ بناوٹ اور سجاوٹ کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سیدھی سادی زبان بالکل مبتذل اور سوقیانہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور "انسان کا نفس ناطقہ محض افادت کی طرف سے بےحس ہو جاتا ہے"۔ ادب و شاعری میں شائستگی شائستگی مذاق کی علامت ہے۔ کبھی تو محض شائستگی زمین شعر کو آسمان بنا دیتی ہے۔ ناسخ کا یہ روشن مطلع شائستگی کی سحرکاری کی بہترین مثال ہے۔

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

علم معنی و بیان کی تدوین اور صنائع و بدائع کی ایجاد انسان کے فطری شوق آرائش و شائستگی کی رہین منت ہے۔ شائستگی کے تمام لوازمات کو جو زینت کلام کے موجب ہیں محض تصنع و تکلف قرار دے کر ان سے یکسر دست بردار ہو جانا اور شاعری میں معمولی بول چال کی زبان اختیار کرنا گویا عروس سخن کو بالکل ننگا اور عریاں بنا دینا ہے۔ یہ شاعری کی تعمیر نہیں بلکہ تخریب ہے۔ باکمال شعرا افادت اور شائستگی

دونوں کا مناسب لحاظ رکھتے ہیں۔ اُردو شاعروں نے زیادہ تر وہی صنعتیں استعمال کی ہیں جن سے کلام کی حقیقی زینت ہوتی ہے اور منقوط وغیر منقوط یا رقطا وخیفا یا ذو قافیتین و ذو بحرین وغیرہ کی صنعتوں سے پرہیز کیا ہے کیونکہ ان سے معنی کا خون ہوجایا کرتا ہے۔ یہ بھی ثبوت اس امر کا ہے کہ اُردو شعرا فارسی شعرا کی اندھی تقلید نہیں کرتے تھے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ادب وشاعری میں ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں نہیں بنتیں بلکہ وہ ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ ہر نسل اس میں کم وبیش اضافہ کرتی ہے مختلف تحریکیں اور مختلف درسگاہیں ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہوتیں بلکہ اسی ایک عمارت کے اجزا ہیں جدید شاعری بھی کوئی علٰحدہ شے نہیں ہے بلکہ قدیم شاعری ہی کی بنیادوں پر قائم ہے ضروریات زمانہ کے لحاظ سے نئی نئی منزلیں تعمیر ہوتی چاہئیں لیکن ان کی ساخت وہیئت ایسی ہونی چاہیئے کہ اوہ ایک ہی عمارت کا جزو کہلا سکیں۔ قدما کا کارنامہ قابل احترام ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا اور دو ہی صدیوں میں لے ایسی بلندی پر پہنچا دیا جہاں تک صعود کرنے میں دوسری زبانوں کو آٹھ آٹھ دس دس صدیاں لگی ہیں۔ اس محیر العقول کارنامہ کی جتنی بھی تعریف کیجائے کم ہے۔ موجودہ شعرا کا کام ہے قدما نے ادب وشاعری کو جس منزل تک پہنچایا ہے اس سے وہ آگے قدم بڑھائیں اور ایسی راہ اختیار کریں جو انھیں کعبۂ مقصود کی طرف رہبری کرے۔ ورنہ آئین شکنی وبے راہ روی کا نتیجہ وہی ہوگا جس کے متعلق سعدی علیہ الرحمۃ فرما گئے ہیں کہ

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی　　کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

قلعہ داران سدہوٹ نے اُردو کی کیا خدمت کی؟

دکن کی اسلامی سلطنتوں نے اُردو زبان کی ترقی میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ تاریخ سے پوشیدہ نہیں۔ بہمنہ۔ عادل شاہیہ۔ قطب شاہیہ۔ آصفیہ سلطنتوں کے قطع نظر۔ حیدر علی و ٹیپو سلطان رؤسا ارکاٹ اور قلعہ داران سدہوٹ نے بھی اُردو زبان کی خدمت کی ہے جن میں سر اول الذکر کے متعلق ہم نے سفینہ (مدراس) میں روشنی ڈالی ہے۔ یہاں قلعہ داران سدہوٹ کے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں۔ مگر اس کی صراحت سے پیشتر ان کا تعارف ضروری ہے۔ لہٰذا اولاً مختصر طور پر قلعہ دارن سدہوٹ کی تاریخ پیش کی جاتی ہے۔

بہلول خاں ساونوری عادل شاہی امیر تھا اس کی اولاد سے نبی خاں عرف رن مست خاں میانہ آخری شخص ہے جو بیجاپور میں صاحب عزت و مرتبہ امیر تھا۔ علی عادل شاہ ثانی (سنہ ۱۰۶۷ تا سنہ ۱۰۸۳ھ کے زمانے میں اس کے تین لڑکے اعظم خاں۔ رحیم خاں اور کریم خاں (جو عبدالرحیم خاں اور عبدالکریم خاں سے موسوم تھے) دربار بیجاپور سے کنارہ کشی کر کے اورنگ زیب کے ساتھ مل گئے اور خان جہان کی وساطت سے دربار عالمگیر میں باریاب ہو کر منصب اور جاگیر سے سرفراز ہوئے۔

اعظم خاں اپنے حسن تدبیر اور حسن کارگزاری سے اعلیٰ منصب پر فائز ہوا اور اپنے بھائی کریم خاں کو اپنا میر ساماں مقرر کیا۔ مگر رحیم خاں نے کم مایہ گی سے برداشتہ خاطر ہو کر قطب شاہی سلطنت کی راہ لی۔ میر جملہ کے توسط سے سلطان عبداللہ کے دربار میں باریاب ہو کر منصب سہ ہزار سے سرفراز ہوا۔ بعض معرکوں میں داد شجاعت دے کر نام آوری حاصل کی۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی۔

اس کی جگہ اس کا فرزند نیک نام خاں مامور ہوا۔ بالاگھاٹ کے معرکے میں میر جملہ کے ساتھ شریک رہا۔ واپسی میں قلعہ سدہوٹ کا محاصرہ ہوا مگر "نائد پالیگار" نے صلح کر لی۔ میر جملہ پایان گھاٹ کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا۔ نیک نام خاں کو اس کے عمدہ خدمات کے صلہ میں نہ صرف پرگنہ چھتور جاگیر میں ملا بلکہ

علم - نوبت اور نقارہ سے بھی سرفراز کیا گیا -

میر جملہ کی روانگی کے بعد نیک نام خاں نے قرب وجوار کے دیگر مقامات شلاً کنجی کوٹہ - بدویل - جمل مڑک وغیرہ فتح کئے اور آخر میں قلعہ سدہوٹ بھی تسخیر کرلیا - اس کامیابی کے صلہ میں دربار قطب شاہی سے مزید پچاس لاکھ سالانہ محاصل کی جاگیر تعلقہ کنجی کوٹہ - چنور وغیرہ مل گئی -

نیک نام خاں نے قلعہ سدہوٹ کو اپنا مستقر بنایا اور اس کے باہر جہاں ایام محاصرہ میں میر جملہ کا کیمپ تھا ایک نیا شہر آباد کرکے اپنے نام پر نیک نام آباد سے موسوم کیا - اس عرصہ میں بیجاپور اور گولکنڈہ سلطنت دہلی میں شامل ہو چکے تھے اور خان نبی فرزند خضر خاں ہی عالمگیر کی جانب سے ذوالفقار خاں کی نیابت میں کرناٹک کا صوبہ دار مقرر ہوا -

جب یہ نیک نام آباد پہنچا تو چندے یہاں قیام کیا کیونکہ نیک نام خاں بیمار تھا آخرش اس کا انتقال ہوگیا اور خان نے اس کے بھانجے لعل خاں کو اس کا جانشین نامزد کیا -

جب عالمگیر کے بعد محمد معظم اور محمد اعظم کی خانہ جنگیاں ہوئیں تو اس زمانے میں اعظم خاں اور کریم خاں نے (جن کا قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے) خاصی ترقی کی - محمد معظم بہادر شاہ کی جانب سے مردانہ وار لڑے اور دونوں مارے گئے چونکہ اعظم خاں کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے عبدالنبی ابن کریم خاں دربار مغلیہ کی جانب سے سرفراز کیا گیا - اس کی اولاد کے چھ شخصوں نے تقریباً خود مختارانہ ۱۱۹۱ھ تک سدہوٹ میں حکمرانی کی -

بہلول خاں [1]

|

نبی خاں

اعظم خاں — رحیم خاں — کریم خاں

اعظم خاں: دختر زوجہ عبدالنبی خاں — نیک نام خاں [2]

نیک نام خاں: عزیز خاں

کریم خاں: لعل خاں [4] — عبدالنبی خاں [3]

لعل خاں: عبدالمحمد خاں [4] — عبدالحمید خاں [5]

عبدالنبی خاں: محسن خاں [6] — حسینی میاں [8]

عبدالحمید خاں: عبدالمجید خاں [7]

عبدالمجید خاں: عبدالحلیم خاں [9]

(۱) نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ)

عبدالنبی خاں | عبدالنبی خاں ابن عبدالکریم خاں جو عبدالرحیم خاں کا داماد بھی تھا مغلیہ سلطنت کی جانب سے سدہوٹ کا قلعہ دار بنایا گیا۔ اس کی دلاوری اور کامیابی کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جس وقت عبدالنبی خاں کو دربار سلطانی میں طلب کیا گیا اس وقت عزیز خاں (جو نیک نام خاں کا خواص زادہ تھا) نے جانشینی کا دعویٰ کیا۔ دونوں دعوے داروں کے سامنے ایک شیر چھوڑا گیا۔ عزیز خاں تو شیر کا لقمہ بن گیا مگر عبدالنبی خاں نے اس کو ہلاک کر دیا۔

غرضکہ عبدالنبی خاں قلعہ دار بن گیا۔ اپنے لواحقین اور ماتحتین کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا زمینداران قرب و جوار پر (جو پالیگار سے موسوم تھے) فوج کشی کر کے اپنے علاقے کو وسیع کر لیا۔ نو آباد شہر کو بجائے جدید نام نیک نام آباد کے اس کے قدیم نام "کرپہ" سے موسوم کیا۔ یہاں جدید محلے اور قصر تعمیر کئے دلکشا باغ لگائے۔ علم و ہنر کی ترویج کی۔ محمد بن رضا اسی کے دربار کا شاعر تھا جس نے قصیدہ بردہ کا دکھنی نظم میں ترجمہ کیا۔ ۱۱۴۰ھ میں عبدالنبی خاں کا انتقال ہوا۔ چار لڑکے اپنی یادگار چھوڑے یعنی عبدالمحمد خاں عبدالحمید خاں۔ محسن خاں عرف موچا میاں اور حسینی میاں۔

عبدالمحمد خاں (از ۱۱۴۰ھ تا ۱۱۶۳ھ) | اگرچہ نابینا تھا مگر باپ کے بعد جانشین ہوا۔ بھائیوں نے اطاعت کی فہم و فراست عقل و دانش میں کامل تھا۔ خویش و بیگانہ کو تالیف قلوب سے گرویدہ کر لیا۔

اسی زمانے میں جب داؤد خاں برہان پور میں قتل ہو گیا تو خان جہان خاں نے سید عرب خاں کو کرناٹک کی طرف انتظام کے لئے روانہ کیا۔ عبدالمحمد خاں نے اول تو دوستی ظاہر کی مگر جب کرپہ کے قریب پہنچ گیا تو اپنے بھائی عبدالحمید خاں کے تحت ایک لشکر لڑائی کے لئے روانہ کیا۔ جب اس کو کامیابی نہیں ہوئی تو خود ایک ہزار آہن پوش سواروں کے ساتھ مقابلہ کے لئے آیا عرب خاں پر فتح

(نوٹ صفحہ گذشتہ)

---

(۱) بہلول خاں کی دوسری اولاد بھی جنوبی ہند میں "سرکار بنکاپور" پر حکمران ہوئی۔ عبدالرؤف خاں پسر بہلول خاں کے بعد عبدالکریم خاں اس کے بعد اس کا فرزند عبدالغفار خاں پھر اس کا فرزند عبدالمجید خاں اور اس کے بعد اس کا فرزند عبدالحکیم خاں یہاں حکمران ہوئے ان کا کچھ حصہ ملک تو مرہٹوں نے لے لیا اور باقی حصہ پر حیدر علی نے قبضہ کر لیا۔

پائی اس کو قتل کر دیا اس طرح گویا مغلیہ فوج پر فتح یاب ہو کر کامیاب ہوا۔ اس کے بعد جیتپل درگ کے زمینداروں پر فوج کشی کر کے کامیاب ہوا۔

اب نواب قمر الدین خاں آصف جاہ اول صوبہ دار دکن ہو کر اورنگ آباد آئے ان کے حسب طلب عبد المحمد خاں دربار آصفی میں حاضر ہوا۔ شکر کہرہ کی لڑائی میں آپ کا ساتھ دیا بہادری دکھائی جس کے باعث مورد عنایت آصفجاہ ہوا آپ کے حیدر آباد کی جانب متوجہ ہونے پر اجازت لے کر اپنے مستقر کو روانہ ہوا اس کے چند روز بعد مرہٹوں کی جنگ میں سرخ رو ہوا۔ انیس سال کی حکمرانی کے بعد ۱۱۳۶ھ میں انتقال کیا۔

عبد الحمید خاں (از ۱۱۳۶ھ تا ۱۱۵۹ھ) | بھائی کی جگہ مسند قلعہ داری پر متمکن ہوا۔ آصفجاہ کی اطاعت اختیار کی چند روز تک شریک رزم بزم ہوا۔ جس وقت آصفجاہ اور ناصر جنگ (باپ بیٹے) میں جنگ ہوئی تو اس نے بیٹے کا ساتھ دیا۔ جنگ ختم ہونے پر آصفجاہ نے چشم پوشی کی بلکہ ۱۱۵۷ھ میں جب پائیں گھاٹ کے بندوبست کے لئے روانہ ہوئے تو اس کو مرحمتوں سے سرفراز فرمایا۔ نہٹر نگر (ارکاٹ) کی واپسی پر عبد الحمید خاں نے رخصت چاہی۔ اپنے مستقر کو واپس ہوا۔ اور چند روز کے بعد ۱۱۵۹ھ میں انتقال کیا۔

عبد الحمید خاں کے عہد میں شہر سدہوٹ کو خاصی ترقی ہوئی۔ نئی نئی عمارتیں باغات لگائے گئے۔ علم و فن کی سرپرستی کی گئی۔ شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ قلعہ دار کے سوا امراء دربار کو بھی اس کا شوق تھا۔ محمد حیدر ابن جعفر اسی عہد کا مشہور شاعر ہے جس نے ابن نشاطی کے پھول بن کا اضافہ کیا۔

محسن خاں | بھائی کی جگہ مسند نشین ہوا۔ فرانسیسیوں سے (جو اس زمانے میں پھلچری میں تھے) مدد لے کر زمینداران جرلہ وغیرہ پر فوج کشی کی اس کے بعد بگن پلی کے قلعہ دار میر غلام علی خاں عرف کلو پر چڑھائی کی مگر شکست پائی دوبارہ اپنے بھائی عبد الحمید خاں کی سرکردگی میں پیش قدمی کی۔ فرنچ فوج بھی ہمراہ تھی بگن پلی فتح ہوا قلعہ دار نے پیش کش اور نذرانہ قبول کیا۔

۱۱۶۱ھ میں جب آصفجاہ اول کا انتقال ہوا اور ناصر جنگ جانشین ہوئے۔ ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ اور ناصر جنگ کی لڑائی ہوئی۔ چند اصاحب اور فرانسیسوں نے مظفر جنگ کا ساتھ دیا۔ اس وقت محسن خاں اول تو ناطرف دار رہا مگر اس کے بعد ناصر جنگ کی حمایت کے لئے روانہ ہوا۔ اثنار راہ میں بگاڑ ہوگئی ناصر جنگ شہید ہوگئے۔ مظفر جنگ فرانسیسوں کی مدد سے دکن کے حکمران ہو کر حیدر آباد کی جانب روانہ ہوئے۔ رائچوٹی کے مقام پر فرانسیسوں اور افغانوں میں بگاڑ ہو کر خانہ جنگی برپا ہوئی مظفر جنگ مارے گئے۔ محسن خاں اونٹ پر سوار ہو کر سدہوٹ کو فرار ہوگیا اور وہاں اپنے ملک کے انتظام مالی وملکی میں مصروف رہا۔ مظفر جنگ کے مارے جانے کے بعد نواب صلابت جنگ جو آصفجاہ اول کے تیسرے فرزند تھے۔ دکن کے حکمراں ہوئے اور فرانسیسوں کی فوج کے ساتھ ان کی حمایت میں حیدر آباد روانہ ہوئے۔

عبدالمجید خاں | چونکہ محسن خاں نے ملازمین کی تنخواہیں کم کردی تھیں اس لئے امرا نے بددل ہو کر اس کو مقید کر دیا اور عبدالمجید خاں ابن عبدالحمید خاں کو حکمران بنایا۔

حکمرانی کے بعد عبدالمجید خاں نے اول تو قلعہ و آصفی پر تاخت کا ارادہ کیا مگر پھر پالیگاران بالاگھاٹ کی جانب متوجہ ہوا۔ کھٹ کیز۔ پنکنور۔ مدن پلی وغیرہ مقامات فتح کئے۔ اس کے بعد بلونت راؤ مرہٹہ نے سدہوٹ پر فوج کشی کی۔ ایک مرتبہ مرہٹوں نے عبدالمجید خاں کی ہمشیرہ کے بدرقہ پر چھاپا مارا۔ اس واقعہ کی اطلاع پاکر عبدالمجید خاں کا نائرہ غضب برافروختہ ہوا مرتے مارنے پر آمادہ ہو کر قلعہ سے نکلا اس امر کی منادی کر دی جو شخص مرنے کے لئے تیار ہے وہ ساتھ چلے اور جس کو جان ومال کی تمنا ہے وہ ساتھ نہ ہو۔ ایک ہزار افغان ہمراہ ہوئے قلعہ کی حفاظت کے لئے فرانسیسی فوج چھوڑی گئی مرہٹوں کی تعداد کئی ہزار تھی۔ اس کے مقابل افغان صرف ایک ہزار تھے۔ بریں ہم بڑے معرکے کا رن پڑا۔ صدہا آدمی قتل ہوئے بڑی جوانمردی اور جانبازی کے بعد خود عبدالمجید خاں قتل ہوا لاش سدہوٹ لائی گئی اور باپ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

اس کے زمانے میں بھی دکھنی شعر وشاعری کا رواج تھا۔ ولی ویلوری اسی کے دربار کا شاعر تھا۔

جس نے اس کے عہد میں اپنی مشہور مثنوی رتن و پدم کی تصنیف کی۔

محسن خاں عبد المجید خاں کے مارے جانے پر محسن خاں دوبارہ حکمراں ہوا۔ اس عرصہ میں پالیگار رائے درگ وغیرہ مفتوحہ ممالک پر قابض ہو گئے اور فرانسیسیوں کی تنخواہ کئی ماہ سے ادا نہیں ہوئی تھی جس کے باعث وہ بھی جنگ پر آمادہ ہو گئے سرور خاں متبنٰی لڑکے نے ان کا ساتھ دیا مگر جنگ کی نوبت نہیں آئی تنخواہ ادا کر دی گئی۔ فتنہ فرو ہوا۔ کچھ عرصہ بعد پالیگاران سے وصولی پیش کش کے لئے روانہ ہوا۔ اثنار راہ میں پیمانہ عمر لبریز ہو گیا لاش کڑپہ میں لا کر دفن کی گئی۔

عبد الحلیم خاں محسن خاں کی کوئی اولاد نہیں تھی عبد المجید خاں کا لڑکا عبد الحلیم خاں جانشین ہوا۔ سرور خاں فوج فراہم کرکے مقابلے کے لئے آیا مگر کامیابی نہیں ہوئی اس کے بعد پالیگاران سے مقابلے ہوئے پھر حیدر علی والی میسور نے حملے شروع کر دئے آخر کار ۱۱۹۱ھ میں سدہوٹ بھی فتح ہو گیا عبد الحلیم خاں کو متعلقین گرفتار کرکے گنجام کے قلعہ میں مقید کیا گیا اور حیدر علی کی جانب سے علی رضا خاں سدہوٹ کا قلعہ دار بنایا گیا۔

عبد الحلیم خاں کے داماد سید محمد نے فوج فراہم کی اور انگریزوں سے جو مچھلی بندر میں تھے مدد لیکر ۱۱۹۷ھ میں اپنے آبائی ملک کی واپسی کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ حیدرآباد فرار ہو کر آیا یہاں چند روز کے بعد انتقال کیا۔

اس طرح سدہوٹ ۱۱۹۱ھ میں میسور میں شامل ہو گیا اس کے بعد ۱۲۰۶ھ میں نظام الملک آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں نے اس کو فتح کر لیا اور ۱۲۱۵ھ میں انگریزی فوج کی تنخواہ کے لئے سرکار کمپنی کو دیا گیا جو آج تک گورنمنٹ مدراس کے تحت میں ہے[1]

---

(۱) حالات بالا حسب ذیل تاریخوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔

۱۔ تذکرۃ البلاد والحکام مصنفہ حسن علی کرمانی مرتبہ ۱۲۰۸ھ (مخطوطہ)

۲۔ نشان حیدری مصنفہ حسن علی کرمانی مرتبہ ۱۲۱۷ھ (مخطوطہ)

(باقی آئندہ صفحہ پر)

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ ان قلعہ داروں کی پوری مدت جدال و قتال میں بسر ہوئی شروع سے آخر تک میدان جنگ سے فرصت نہیں ملی۔ ان کو اتنا موقع نہیں ملا کہ اطمینان اور دلجمعی سے کسی علمی کام میں مصروف ہوتے اور علم و ہنر کی ترویج کی جانب متوجہ ہوتے۔ باوجود ان تمام امور کے جب ہم اردو ادبیات میں ان کارہائے نمایاں کو دیکھتے ہیں تو ہم کو ان کی علمی قدردانی اور علمی سرپرستی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ باوجود اپنی جنگی مصروفیت کے انھوں نے بہت کچھ کیا۔

اُردو کی ترقی میں انھوں نے جو حصہ لیا اس کی پوری تفصیل اس لئے ناممکن ہے کہ زمانے کی دست برد سے تصنیفات معدوم ہو چکی ہیں۔ شعراء اور مصنفین کے نام پوشیدہ ہو چکے ہیں۔ ان کے کارنامے گوشۂ گمنامی میں پنہاں ہیں۔ مگر جو کچھ بھی ہے وہ اس امر کے لئے کافی ہے کہ ان کے سرپرستوں کے ناموں کو زندہ رکھے اور تاریخ اُردو میں ان کو مناسب جگہ دی جائے۔

ذیل میں ان مخطوطات کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کے زمانے میں مرتب ہوئے اور آج تک باقی ہیں۔

(۱) ترجمہ قصیدہ بردہ۔ عبدالنبی خاں کے زمانے میں محمد بن رضا نے اس کو دکھنی نظم میں منظوم کیا ہے اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں نمبر ۲۳ پر موجود ہے۔

ابتدا میں ۲۹ صفحات میں حمد، نعت، منقبت اور بادشاہ کی مدح کی گئی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے اس کو ملا جامی کے فارسی ترجمے سے دکھنی میں منظوم کیا گیا ہے۔

حمد حق کا کر اول تو صفحہ دل پر رقم	نام پاک اس پاک کا ہے زینت لوح و قلم
ہے سورج ہور چاند اُس کے صنع پر دل گواہ	ہر گویا ہے ستارے صفحہ محضر بہ مہم
شکر اُس کا کب ہوئے گا ہم سوں جب کیا	مصطفےٰ انبی مہربان کوں ہم اوپر رحیم

۳۔ سوانح دکن مصنفہ منعم خاں اورنگ آبادی (مخطوطہ)

۴۔ حدیقۃ العالم مصنفہ میر عالم (مطبوعہ)

اُس ولی دو جہاں کے گنج کا گنجہ وار   واقف راز نہاں ہور مشفق صاحب رحم
ور دریائے سیادت شاہ عبداللہ ہے   پاشاہ ملک دل کا جان اسکوں بے وھم
خاک راہ اُس شاہ کے درگاہ عالیجاہ کا   ہور یقین دل سوں اُسکا ہے غلام بیدرم
خادم آل محمد یو محمد بن رضا   رحمت باری تعالیٰ اُس پہ ہووے دم بدم

جس کے تصنیف یو شن دل محمد موصلی   قدوہ اہل عرب مشہور در ملک عجم
شرح اس کیتن کیہ ہیں فارسی میں خوش کلام   مولوی جامی کہ جس کا دل رہتا جیوں جام جم
لیک اُسکے کہنے کوں پاتے نے عاجز بھی تمام   کیوں کہ کوزہ میں رکھی ہیں لیا اوقیانوس بم
اس بدل یو خوشہ چیں خرمن اہل کلام   شرح رکھتی سوں کیا صفحہ او پر شرح ہن رقم

اگرچہ شعر نمبرہ سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ عبدالنبی کے عہد کی تصنیف نہیں ہے مگر خاتمے کی عبارت اور اشعار سے بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ عبدالنبی خاں کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے چنانچہ

"تمام شد شرح قصیدہ بردہ بموجب امر واجب الاذعان لازم الاتفاق خورشید اوج سخا مہتاب برج صفا . . . . "

کریم ابن الکریم ابن الکریم است   گل باغ نواب عبدالرحیم است
در بحر نواب عبدالنبی خاں   سخی باکرم ہم جود و احسان

امیر امرائے اعظم الشان یعنی نواب عبدالحمید خاں سلمہ الرحمٰن . . . . "

اس کے علاوہ اسی جلد میں چند اور رسالے مثلاً شعب الایمان وغیرہ بھی شامل ہیں جو سب کے سب صاحبزادہ نواب عبدالحمید خاں کے لئے لکھے جانے کی صراحت موجود ہے۔

نفس مضمون کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

اے محب کر دیا دتوں ہمسایہ شہر سلم   جگ کے انجوان سوں ملا جاری کیا لہو دہم

یا چلی ہے باد خوشبو کاظمہ کے شہر تے　　یا چمک بجلی کی دیکھارات از کوہ اِظم
کیا ہوا تجھ چشم کون جو بس کہے تو رو بت زیاد　　کیا ہوا تجھ دل کون جو کیں ہوش یا تو ہو نے ندم
چاہے عاشق کر چھپاوے عشق تو چھپتا نہیں　　دل جلے جب آگ سوں ہو جگ اچھیں کے غم سوں نم
عشق نین تو اشک نین پرتے نشان یار دیکھ　　یاد کر کوہ و شجر کیوں چشم ہوئیں بیخواب جم

خاتمہ ملاحظہ ہو :-

ہو توں راضی اے خدا ابو بکر ہور فاروق سوں　　ہور عثماں ہور علی جو اتھا صاحب کرم
آل ہور اصحاب ہور سب تابعین سوں جو اچھے　　صاحب تقویٰ و صافی ہور تملکن و کرم
شاخ جھاران کے ہلاوے جب تلک باد صبا　　خوش کرے گا اوٹ کے تین ساربان گہ کر نغم

بخش یارب توں گنہ قاری کے ہور شارح کے سب
بخش سامع ہور کاتب کینن توں اے صاحب کرم

---

(۲) تکمیلہ پھول بن - ابن نشاطی کی پھول بن مشہور مثنوی ہے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۶۶ھ میں لکھی گئی ہے -

اس عہد کے مشہور شاعر محمد حیدر نے (جو خود کو ابن جعفر سے مخاطب کرتا ہے) تقریباً تین سو شعر کہہ کر اس مثنوی کا گویا تکملہ کیا ہے -

محمد حیدر ابن جعفر عبدالحمید خاں کے دربار کا شاعر تھا عبدالکریم خاں کی فرمائش پر اس نے یہ شعر لکھے ہیں - وہ بیان کرتا ہے کریم خاں کو قصے سننے کا شوق تھا جب اس نے پھول بن کے قصہ کو سنا اور اس میں آخر پر ہمایوں فال اور سمنبر کی شادی کے حالات نہ پائے تو بہت افسوس کیا اور اس امر کی خواہش کی کہ اس کی تکمیل کی جائے ابن جعفر کو حکم دیا اس کو مرتب کرے -

ان اضافہ شدہ اشعار میں تفصیل کے ساتھ شادی کے حالات ، رسومات کی وضاحت کی گئی

ہے جو اس وقت کے مسلمانوں میں مروج تھے۔ ان سے رسم و رواج کی پوری صراحت منکشف ہوتی ہے۔ شادی کی رسومات کے بعد ابن جعفر نے ضیافت کا حال بھی نہایت تفصیل سے کیا ہے اس وقت کے رسم و رواج کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ بہرحال ابن جعفر کا یہ تکملہ خاص حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ابن جعفر کا اضافہ ابن نشاطی کے ذیل کے شعر کے بعد ہوا ہے ؎

عدالت کا رکھ اپنی سیس پر تاج فراغت سوں سدا کرتا رہا راج

ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں :-

محمد سید جعفر زبان کھول نچھل در باسوں دل کی درجن رول
سنبر ہور ہمایوں شاہزادہ سکونت جب کئے اس ملک میں آ
دنو آئے سو خوش خبری سنیا جب وک شاہ عجم شاداں ہوا تب
رواں کر یوں محبت ساتھ خامہ لکھیا تب یوں دنو کوں شاہ نامہ

"قلعہ داران سدہوٹ کی تعریف اور اپنے اشعار لکھنے کی صراحت بھی خاتمہ پر درج ہے ملاحظہ ہو:-

صفت ان بزرگاں کی بیشتر ہیں ولیکن یاں کیا ہوں مختصر میں
مردان کا امیر نامور ہے شجاعت اور سخاوت میں نشر ہے
بہوت آئے ہیں واں شہری شہر کے سدا جاتے نہیں بے کچھ مال زر لے
تکل آفاق میں دو یوں ہے مشہور ہے جیوں مشہور کہنکے اوج سور
رہے قانون پر وہ بزرگاں کے ہے ظاہر سب امیران میں جہاں کے
نواب عبدالنبی خاں کا ہے فرزند نواب عبدالرحیم کا وہ ہے دلبند
کرم کے بحر کا رخشاں گہر ہے نواب بہلول خاں کا وہ جگر ہے
نواب عبدالحمید ہے نام اس کا عدل انصاف ہے جم کام اس کا
ہوا اقبالت سب ملکی ملک میں رکھیا حق اس کنیں امن و امان سین

قلعہ سدھوٹ کیراں کون مکان ہے　　مکان اس کے نمن جگ میں کہاں ہے
قلعہ بھی کوئی نہیں ثانی ہے اسکوں　　ندی لائی ہے سر اس کی چرن سوں

قلعہ کے بعد شہر کی اس کے بعد محل شاہی کی تعریف اس کے آرام و آسائش کے ذکر کے بعد اپنی تصنیف کے متعلق صراحت کرتا ہے :-

یو جین استاد کا حق جان و دل سات　　انو کے فرزندان کا بھی اسی دھات
کریم صاحب اہے اس نیک کا نام　　اہے جیون نام ان کا نیک نام
کریم ان کون دیا ہے نام بھی نیک　　دیا ہے اس موافق کام بھی نیک
اچھے قصیاں ستے ان کو اوک ذوق　　کھانیاں سون اچھے دن رات کا شوق
قصے کون پھول بن کے وہ سنے جب　　بچارے یوں آپس دل میں انو تب
حکایت ہے سنبھر کی بہوت خوب　　سگل اس کا بیان ہے بہوت محبوب
ولے نہیں بہاؤ کا مذکور ہے کچ　　نہ ہلدی تیل کا دستور ہے کچ
کچ یک شمہ سخن کا مجھ ستے پائے　　سو یوں اس بہاؤ کا مج حکم فرمائے
کرو کچ ذکر اس کے بہاؤ کا اب　　لکھا دیں قصا تصویر سوں سب
کرے جب حکم سوں یوں سرفراز　　حکم پر میں کیا گنج سخن باز

ابن جعفر کے اضافہ شدہ اشعار کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

شاہ عجم نے اپنے وزیر کے ہاتھ ہمایوں فال کے پاس اپنا نامہ روانہ کیا وزیر قطع منازل کرتا ہوا ہمایوں فال کے پاس پہنچا اور نامہ پیش کیا۔ اس کے بعد سنبھر اور ہمایوں فال ملک عجم کو روانہ ہوئے۔ بادشاہ ملک عجم نے نہایت تپاک کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور دونوں کی شادی کا اہتمام کیا اور کاری گروں کے ہاتھ قصر تیار ہوئے جو روم اور شام کے نمونہ پر تھے اس کے بعد بادشاہوں اور امیروں کو دعوت

نامے بھیجے گئے۔ پھر شادی شروع۔ ہلدی۔ مہندی۔ شب گشت کے بعد محفل عقد منعقد ہوئی۔ عقد کے بعد ضیافت شروع ہوئی اور محفل رقص وطرب کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بازگشت ہوئی اور دلہن کے جہیز کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تک تو دولہا دلھن ملک عجم میں رہے اس کے بعد ہمایوں فال اپنے وطن کو روانہ ہوا باپ سے ملاقات ہوئی۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے شادی کی رسوم۔ ضیافت میں کھانوں کی تفصیل پھر جہیز کے سامان اور زیورات کی صراحت میں بڑی تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

بطور نمونہ کسی قدر کلام پیش کیا جاتا ہے۔

وزیر کون بہوت لشکر دے کر سنگات روانہ تب کیا نامہ بھی دے ہات
وزیر اس شاہ کن تب و واغ ہو چلیا ہے جلد شہزادے طرف دو
ہر یک منزل مراحل قطع کرتا ہر یک جنگل و بستی سون گذرتا
کہتے دن راہ چل کر اس نے تسع سون وو شہزادے کے آپونچیا شہر کون
سو شہزادے کو نامہ شاہ دیتا زبانی بھی سگل اظہار کیتا

شب گشت آئی جلوہ گر ہو نہ تھی شب بلکہ رشک روز تھی وو
فلک پر آکہ شاہ روم تا شام کیا جاری سگل اطراف احکام۔
گیا مغرب میں پھر کرنے کو شاہی چریا تخت فلک بر بدلا ہے
ہوا روپوش جب وو شاہ گل رنگ بھریا سب جگ میں آ لشکر زنگ

مٹھائی بہوت خوش باد ام کے کر جلیبے میاں ہور سموسے بھی رکھی بھر
مٹھائی میں تھے موصوف بہوت خوب اتھا بادام کا حلوہ بھی محبوب
ترنجے ہور نارنجے مربا رکھے پیٹھے کا ہور بھی آم کا لیا

اتھے انگور انجیر و انا راں — پھنس ہور آم خربوزی بھی تھے داں
اتھے تربوز اور شہ توت مرغوب — ہر یک میوہ اتھا یک سے یک خوب

جدان فارغ ہوئے سب کون صلاہات — عطروانیاں بھی لائے پان خوش ذات
گلاب و عطر گل سب کون دئے پان — اوک صمدیاں کیتین سب سون دئے انا
تدان خلعت کیتین لائے ہیں نادر — اتھے خلعت کتے یک یک فاخر
دئے ہر یک کون اس کا مرتبا دیک — نہیں باقی رہیا مجلس میں کوئی یک

رسم سب تیل کا بھی کر کہ تیار — چلے عارس طرف سون نوشو کے دربار
نقارے نوبتاں ہور دبدبی سات — لجا پونچائے نوشو کے گھر کون خوش وقت
بہت دن یو نچ تھے شادی دو طرفا — وہاں کھاتے تھے کھانا لوگ سب آ
اتھے مجلس مجلین یو نچ دن رات — کھلے گلشن منی جیون گل خوشی سات
رسم ہلدی بری ہور جہیز کے جب — بجالائے ادک ترتیب سوں سب

نمونہ بالا سے محمد حیدر کے کلام کا طرز انداز اور قوت بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے اس میں شک نہیں یہ اپنے وقت کا ایک اچھا شاعر تھا۔

(۳) مثنوی رتن و پدم۔ یہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے جو نواب عبدالمجید کے دربار کا شاعر تھا۔

ولی کا نام میر ولی فیاض ہے ویلور علاقہ مدراس کا رہنے والا تھا۔ اولاً فوجی خدمت کے سلسلے میں قلعہ دار سات گڈھ کا ملازم تھا اس کے بعد سدہوٹ آکر قلعہ دار سدہوٹ کی ملازمت اختیار کی اور یہیں انتقال کیا۔

اس کی پہلی تصنیف روضۃ الشہدا[1] ہے جو ۱۱۳۱ھ میں لکھی گئی۔

مثنوی رتن و پدم میں چتوڑ کے راجہ رتن سین اور سرندیپ کی مہارانی پدماوت[2] کی عشقیہ داستان مذکور ہے۔ یہ نایاب مثنوی ہے اس کا ایک نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانہ میں تھا جس کی صراحت اسپرنگر نے اپنی کیٹلاگ میں کی ہے۔ اس کی صراحت سے پایا جاتا ہے یہ ضخیم مثنوی ہے جس کے چار ہزار شعر ہیں۔

مؤلف اردو قدیم نے اسپرنگر کی وضاحت کو اپنی تالیف میں اردو کا لباس پہنایا ہے۔ جو اشعار پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

حراست خاں امیر ایک نامور تھا　　سکونت گاہ اُس کوں سات گڑھ تھا

اتھا او اہل ورد و نیک اعمال　　رفاقت میں اتھا میں اس کے خوشحال

قضا را واں سوں ہو قسمت ذی رجاست　　سوا یا میں طرف کرپہ کے درخواست

نواب عبدالمجید ابن عبدالحمید ایک　　اتھا واں نامور صوبہ سعید ایک

سواد بحر شجاع پروانہ لکھ کر　　بسلک نوکران میں منسلک کر

تعین کر مجکوں سدہوٹ کو روانہ　　کیا وہ صاحب شمشیر تن زمانہ

سو حسب الحکم میں سدہوٹ کو آیا　　زنگار رنگ واں تماشے منے پایا

اس مثنوی کی ابتدا حسب ذیل شعر سے ہی۔

خدایا تو ہے پاک پروردگار　　نزنکار داآر و آچھی اتار

(صفحہ ۸۹ و ۹۰)

---

(۱) روضۃ الشہدا کے متعلق ہم نے ایک علحدہ مضمون لکھا ہے جو ساقی دہلی کے جنوری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔

(۲) پدماوت کے متعلق مختلف قصے لکھے گئے ہیں جن پر ہم نے ایک مضمون لکھا ہے، جو نیرنگ خیال جولائی ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ہے۔

چونکہ یہ مثنوی میری نظر سے نہیں گزری اسی لئے اس کے متعلق مزید وضاحت نہیں کی جاسکتی۔
یہ صراحت ان چند مخطوطات کی ہے جو آج ہمیں معلوم بھی نہیں۔ نمعلوم اور کون کون تصنیفات
ان قلعہ داران سدہوٹ کے زمانے کی ہوں اور کون کون نامور شاعروں نے ملک سخن سے داد لی۔
اس میں کوئی شک نہیں قلعہ دان سدہوٹ نے اُردو کی سرپرستی کی اور ان کے دربار سے
شعرا کی فیاضانہ مدد کی گئی جس کا بدیہی ثبوت آج بھی موجود ہے۔
خوش قسمتی سے انڈیا آفس کا نسخہ "پھول بن" وہی ہے جو قلعہ داروں کے لئے مرتب ہوا تھا
اس کا خوشخط بہترین کاغذ، مطلا نقش و نگار عمدہ تصاویر اس امر کے مین شاہد ہیں کہ قلعہ داروں
کو علم و ادب سے کس قدر الفت تھی اور کس طرح وہ اردو کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔
بہر حال ملک دکن کا چپہ چپہ زبان اُردو کی سرپرستی کیا کرتا تھا اور اس کی مردم خیز زمین سے
اُردو کے نامور شعرا عالم وجود میں آئے ہیں جو آسمان شہرت پر آفتاب بن کر چمکے مگر افسوس آج ہم بہت
کم ان کے کارناموں سے واقف ہیں۔

چینی قومیت و جمہوریت

ڈاکٹر سن یت سین کے تین اصول

۳۔ معیشت

معیشت کی تعریف :۔

معیشت کیا ہے ؟ یہ وہی لفظ ہے جو برابر ہماری زبان پر آتا ہے ، ہاں شاید ہم اس لفظ کو بے سوچے سمجھے اپنے منہ سے نکالا کرتے ہیں اور اس کو معنی خیز نہیں سمجھتے لیکن آج کل کا زمانہ اور ہے ، جدید علوم اور سائنس نے دنیا کا رنگ بدل دیا ہے ۔ جدید علوم کے حدود میں اس لفظ کو اجتماعی معاش پر استعمال کرنے سے اتنے معانی نکالے جا سکتے ہیں کہ ہم حیرت میں رہ جاتے ہیں ۔ اس وقت ہم اس کی تعریف کرنے کو بیٹھے ہیں ، مگر کیسی ؟ مکمل تعریف کرنا تو بہت مشکل ہے ۔ بہرحال جہاںتک ہماری سمجھ میں آتا ہے کسی نہ کسی طریقہ سے اس کا مفہوم محدود کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اس دائرے کے اندر کچھ بحث کر سکیں ۔ اس کے متعلق مختصراً ہم یہ کہتے ہیں کہ معیشت ایک سوال ہے انسان کی زندگی کا ۔ اجتماعیت کی بقا کا ۔ قوم کے ذرائع زندگی کا اور عوام کے وسائل معاش کا ۔ اب ہم اس معیشت کے نام سے اسی اہم اور عالمگیر سوال پر بحث کریں گے ۔ جو کہ موجودہ صدی میں ممالک مغرب کے اندر رونما ہوا ۔ یہ انسانی اجتماعیت کا سوال ہے ۔ اجتماعی زندگی کا سوال ۔ بین دین کا سوال ہے ۔ کھانے پینے کا سوال ہے ۔ رہنے سہنے کا سوال ہے اور تعلقات و رشتے قائم رکھنے کا سوال ہے جس کو ہم اپنی اصطلاح میں معیشت کہتے ہیں ، اس کا دوسرا نام عام اقتصادی یا عمرانی زندگی ہے ۔

معیشت اور مسئلہ اجتماعیہ

معیشت کا سوال درحقیقت اسی زمانے میں پیدا ہوا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آج کل سارے

عالم میں مادی ترقی کا دور ہے۔ صنعت و حرفت تیزی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ انسان کی قوت اختراع
میں بیحد اضافہ ہو رہا ہے۔ بالفاظ دیگر مشین کی ایجاد ہونے کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا ..... مشین
کی ایجاد کے بعد قوت صنعت میں انقلاب عظیم ہو گیا۔ . . . بہت سے لوگ کاموں سے محروم رہ گئے
قوت بازو استعمال کرنے کی کہیں جگہ نہیں رہی جس کی وجہ سے بہت لوگ روٹی کمانے سے محروم ہو گئے
اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے مزدوری پیشہ طبقے سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ ان مصیبتوں کو دور
کرنے کے لئے اجتماعیت کا سوال پیدا ہوا۔ یہی اجتماعیت کا سوال آج ہماری معیشت کا موضوع
بحث ہے۔

علم اجتماعی کے حدود حالات اجتماعیہ۔ اجتماعیت کے ارتقا، اور عوام کی باہمی معاشرت کے
نشو و نما پر مشتمل ہیں۔ اجتماعیت کا دائرہ، اجتماعی معاشیات اور انسانی زندگی کے مسائل پر محیط ہے، بالفاظ
دیگر یہ عوام کے معاشی حالات دریافت کرتا ہے، بجائے لفظ اجتماعیت، ہم نے یہاں معیشت کا لفظ اس
لئے استعمال کیا کہ یہ مسئلہ کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے اس لفظ سے لوگ فوراً اس کی حقیقت اور اہمیت کو
سمجھ سکتے ہیں جنگ عظیم سے پہلے، یورپ میں اشتراکی اور غیر اشتراکی دو جماعتیں پیدا ہو چکی تھیں، ان
میں باہمی لڑائی ہوتی تھی۔ یا یوں کہو کہ سرمایہ دار طبقے اشتراکیوں کے خلاف آلات حرب اٹھاتے
تھے، یہ جنگ ایک عرصہ تک جاری رہی۔ جنگ عظیم کے بعد یہ معلوم ہوا کہ سرمایہ دار مغلوب ہو گئے
اب اشتراکیوں موقع ملا کہ وہ مسئلہ اجتماعیت کو حل کر دیں اس وقت جو اشتراکیت کے حامی تھے
ان کو کوئی اچھی ترکیب نہ مل سکی جس سے وہ اس مسئلہ کو حل کر سکتے۔ اس واسطے اس کے حل کرنے میں
ایک ناگوار صورت پیدا ہو گئی۔ اشتراکی اور غیر اشتراکی کی نزاع سے کہیں زیادہ خوفناک نظر آئی، دن
بدن اس کے حل کرنے میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں کہ اس کا حل ہونا مشکل ہو گیا جب سرمایہ دار
اور اشتراکیوں کے مابین مخالفت ہوتی تھی تو سارے عالم میں جتنے اشتراکیت کے حامی تھے خواہ وہ ہموطن
ہوں یا نہ ہوں، ایک دوسرے کے معین اور حامی بن جاتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں جماعت اشتراکی
کی کیفیت اور ہو گئی جرمن اشتراکی روس کے اشتراکیوں کو اپنا دشمن اور روس کے اشتراکی
انگریز اشتراکیوں کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے پر بدگمانی اور طعنہ زنی کرتے ہیں۔ ان کا

خیال کچھ اوران کا خیال کچھ اور۔ اس افتراق کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات جیسے ہونے چاہئیں تھے نہیں ہو سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہموطن اور ایک ہی ملک کے اہل اشتراکیت میں بھی طرح طرح کی عداوت و رقابت ظہور پذیر ہوئی۔ ان وجوہ سے مسئلہ اجتماعیت پر جتنی بحثیں کی جاتی ہیں، اتنی ہی مشکلات نظر آتی ہیں اور اب تک اس کے حل کرنے کی کوئی معقول ترکیب نہیں ملتی ہے۔

نظریہ مارکس پر ایک نظر:۔

اشتراکیت کے اندر جو اہم سوال درپیش ہے وہ معاش کا یعنی عوام کی زندگی کا سوال ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے اشتراکیت کا مطالعہ کرنے والے دن بدن زیادہ ہوتے جاتے ہیں اُن کی تعداد شمار سے باہر ہے اُن میں سے جس نے اس مسئلے پر گہرائی اور محنت سے غور کیا ہے اس کا نام سب پر روشن ہے یعنی مارکس

مارکس کا نظریہ وجود میں آنے سے پہلے دنیا میں جو اشتراکیت کے علما تھے، اُن کا تخیل ناقابل عمل اور حقیقت سے بہت بعید تھا۔ مارکس نے تاریخی واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ معاشی تغیر و تبدل کے جو وجوہ و اسباب تھے۔ ان کو جمع کیا۔ اور بغور مطالعہ کرنے کے بعد اصول معیشت کی بنا پر اپنا نظریہ قائم کیا اس نے متقدمین پر اعتراض کیا۔ اور ان کے تخیل پر یہ رائے ظاہر کی کہ یہ محض ان کے انفرادی اخلاق کا ظہور اور اجتماعی ہمدردی کا اظہار تھا اور کوئی چیز ان کے ذہن میں موجود نہ تھی، مارکس کی رائے میں مسئلہ معیشت انفرادی اخلاق اور اجتماعی ہمدردی سے کہیں زیادہ عمیق ہے اور محض اخلاق کے اظہار یا ہمدردی کی نمود سے اس کا حل ہونا بہت مشکل ہے۔ اس کے حل کرنے کے لئے در اصل سوشل زندگی اور اجتماعیت کے ارتقا پر نہایت عمیق مطالعہ اور مسلسل غور کی ضرورت ہو . . . . یہ مسئلہ صرف تاریخی شہادات اور واقعات کے مطالعے اور اُن کے اسباب و نتائج کی تحقیق سے حل ہو سکتا ہے نہ کہ تخیل سے

اس میں شک نہیں کہ مارکس نے اجتماعی زندگی کا مطالعہ سائنٹفک اصول سے کیا ہے، اس نے جو ترکیب مسئلہ معیشت کے حل کرنے کے لئے بتائی ہے وہ سائنٹفک ترکیب ہے۔ اپنے عمیق مطالعہ

سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا میں ہر انسان کی نقل و حرکت جنبش و سکونت اگر یادداشت میں نوٹ کرلی جائیں تو وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاریخ کے متعلق اس نے جو خاص بات بتائی وہ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ کا مبدا اور منبع مادیات ہیں اور چونکہ مادیات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اس لئے دنیا میں انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے حرکات مادیاتی کیف پر منحصر ہیں۔ اسی واسطے دنیا کی تہذیب و تمدن مادیات کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ . . . مارکس نے جو مادی تغیر کی بات ہمیں بتایا، شاید یہی تاریخ کا منبع ہو۔

حقیقت میں کیا مادیات ہی تاریخ کا منبع ہے؟ جنگ عظیم کے تجربات سے بعض علماء نے ثابت کیا ہے کہ یہ بات غلط ہے . . . . امریکہ میں ولیم ام مارکس کا ایک بڑا معتقد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مارکس نے جو مادیات کو تاریخ کا مرکز اور منبع ثابت کیا ہے۔ وہ غلط ہے اس کی رائے میں مادیات تاریخ کا منبع نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخ کا مرکز اجتماعی زندگی کا سوال ہے۔ اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو دنیا کی تاریخ نہ ہوتی۔ اجتماعی زندگی نہ صرف تاریخ کا منبع ہے۔ بلکہ بقا کا مرکز بھی ہے۔ یہی معقول بات ہے۔

اس بنا پر ہماری معیشت بقائے انسان کا سوال ہے۔ وہ اصول کے لحاظ سے ارتقاء، اجتماعیت کا مرکز ہے اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے تاریخ کا منبع ہے اتنا کہنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تاریخ کا مرکز و منبع معیشت ہے نہ کہ مادیات . . . . . اس لئے ہم معیشت کے اصول پر غور کرتے ہیں مطالعہ کرتے ہیں اور تحقیق کرتے ہیں کہ اسی لفظ معیشت میں مسئلہ اجتماعیت مضمر ہے۔ یہ لفظ اجتماعیت یا اشتراکیت سے کہیں زیادہ صاف اور واضح ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے معیشت کو اپنی اصطلاح کے لئے منتخب کیا ہے۔

ولیم یہ کہتا ہے کہ ہر عہد میں خواہ قدیم زمانہ ہو، خواہ جدید، انسان کی یہ کوشش رہی ہے کہ زندگی اور بقا کا سوال حل ہو جائے۔ انسان کا اپنی زندگی اور بقا کے لئے کوشش کرنا، ارتقاء، اجتماعیت کا قانون اور تاریخ کا منبع ہے۔ مارکس کا نظریہ مادیات، ارتقاء، و اجتماعیت کا قانون نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہوگا۔ اور نہ وہ تاریخ کا منبع ہے اور نہ ہوگا۔

مارکس نے اپنے مشاہدات سے یہ ثابت کیا کہ درجات وطبقات کے نزاعات صنعتی انقلاب کے بعد کی نئی چیزیں نہیں ہیں بلکہ جتنے زمانے گزرے ہیں ہر ایک میں درجات کی نزاع پائی جاتی ہے۔ قدیم زمانہ میں آقا غلام سے لڑتا تھا۔ زمیندار اور کسان کے درمیان نزاع ہوتی تھی۔ شریف ورذیل کے مابین دشمنی ہوتی تھی۔ مختصراً یہ کہ ہر دبانے والے اور ہر دبے ہوئے کے درمیان جنگ ہوتی تھی۔ جب تک سوشیل نظام میں خرابی رہے گی۔ تب تک یہ نزاع جاری رہے گی جبتک سوشیل نظام میں انقلاب ہوگا تب تک طبقات کا تنازع کبھی نہ مٹ سکے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ طبقات کا تنازع اجتماعی زندگی کی کشمکش سے ہوا اور اسی اجتماعی زندگی کی کشمکش سے دنیا کو ترقی ملی چونکہ اب تک یہ کشمکش باقی ہے۔ لہذا دنیا بھی حسب دستور ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے

ارتقاء اجتماعیت کے معاملے میں مختلف پہلو موجود ہیں اگر ہم صرف معیشت کا پہلو لیں اور اسی کی روشنی میں سرسری طور پر ممالک مغرب کے معاشی حالات پر نظر ڈالیں تو اس میں سے کم سے کم ہمیں چار چیزیں نظر آئیں گی۔ (۱) سوسائٹی اور صنعت کی اصلاح۔ (۲) ذرائع نقل وحمل پر عوام کی ملکیت۔ (۳) محصول بلاواسطہ۔ (۴) عناصر اجتماعیت کا تناسب اور ہم آہنگی .... اگر مارکس کے نظریہ کے مطابق ہم ان چار چیزوں پر حکم لگائیں تو ضرور ہم یہ کہیں گے کہ یہ درجات کے تنازع سے رونما ہوئیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کے فائدہ ونفع کے ایک دوسرے کے منافی ہونے کی وجہ سے تصادم برابر جاری رہتا ہے۔ اس تصادم میں طرفین میں سمجھوتہ نہ ہونے کی وجہ سے نزاعات پیدا ہوتی ہیں۔ ہیں نزاعاتی کشمکش سے اجتماعی زندگی کو ترقی ملتی ہے لیکن اگر ممالک مغرب کے موجودہ اجتماعی حالات کی تحقیق کریں تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ ان دونوں کا نفع وفائدہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسرے کا معاون ہے۔ اس اعتبار سے جس چیز سے اجتماعیت کو ارتقاء اور ترقی ملی ہے اور ملتی ہے وہ اجتماعی زندگی کی ہم آہنگی ہے۔ وہ ہم آہنگی جس میں سرمایہ دار مزدور دونوں کا فائدہ یکساں ہے۔ نہ کہ وہ تصادم جس سے طرفین ایک دوسرے کے متضاد ہوجاتے ہیں۔

اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا معیشت کی رو سے ایک دوسرے کو نفع وفائدہ پہنچانا ہے،

اور سب کو یکساں نفع و فائدہ ملنے سے اجتماعی زندگی میں ترقی ہوتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہونا ناممکن ہے جبکہ بنی نوع انسان کو مسئلہ معیشت کا کوئی حل نہ ملے۔ آدم سے لے کر آجتک لوگ جد و جہد کرتے آئے ہیں، کرتے ہیں اور کریں گے، وہ اس لئے ہے کہ ان کی زندگی قائم رہے، انسان کا اپنی بقا کے لئے کوشش کرنا، اجتماعی زندگی کی ترقی کا سبب ہے۔ درجاتی نزاع اس کا سبب نہیں ہے۔ درجاتی نزاع کی حیثیت اجتماعی زندگی کی راہ میں صرف اتنی ہے کہ وہ انسانی زندگی کا ایک مرض ہے جو بقائے حیات قائم کرنے میں معقول ترکیب نہ ملنے سے پیدا ہوا۔ زندگی کو قائم کرنے میں مشکلات پیش آنے سے آخر درجاتی مرض لاحق ہوا۔ مارکس نے جو مسئلہ اجتماعیت پر غور و مطالعہ کیا تو اس کو صرف ترقی اجتماعیت کا مرض نظر آیا جس کو اس نے ترقی کا سبب سمجھ لیا حالانکہ درحقیقت ترقی کا سبب اور ہے اس بنا پر ہم مارکس کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے صرف اجتماعی زندگی کے مرض کا سبب دریافت کیا، نہ کہ ترقی کا سبب۔

مارکس دنیا کے تمام پیداوار کے کارنامے مزدوری پیشہ طبقہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس نے سوسائٹی کی انفرادی محنت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ سوسائٹی کا ہر فرد چاہے بالواسطہ ہو، یا بلاواسطہ، مال کی پیداوار اور نکاسی میں ضرور کچھ نہ کچھ سوسائٹی کی خدمت کرتا ہے ..... مانا کہ سرمایہ دار اور مزدور کے مفاد میں ہم آہنگی نہیں ہے جس سے نزاعات پیدا ہوتی ہیں۔ پھر بھی جن سرمایہ داروں سے وہ جنگ کرتے ہیں وہ سوسائٹی کے با اثر اور قابل لوگ ہیں۔ مزدوری پیشہ طبقے کیسے ان کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں، وہی لوگ اُن سے جنگ کرتے ہیں جو سرمایہ داروں کے شاکی ہیں اور جنھوں نے مزدوروں پہ اثر اور رعب جما رکھا ہے...... الغرض تمام انسانوں کو اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے معاشی نزاع دور کرنا ہے۔ اس لئے اُن کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اجتماعی مفاد مدنظر رکھتے ہوئے درجات و طبقات کے حدود مٹانے کی کوشش کریں اور اُن میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کام کریں۔ جب اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی تو پھر اس کی ترقی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ اس وقت تمام انسان بے خوف و خطر رہ سکتے ہیں۔ معیشت کا اصول اسی مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ ان وجوہ سے

ہم یہ کہتے ہیں کہ معیشت ہی اجتماعی زندگی کی ترقی کا منبع اور اس کی اصلی قوت ہے۔

ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہیں جن کو مارکس نے اپنے خیال کے مطابق ہمیں بتایا۔ لیکن وہ اسی زمانے میں خلاف واقع ثابت ہوئیں۔ اُن میں سے صرف ایک بات کا ذکر کرنا اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ اس نے اپنے نظریہ کو کس غلط بنیاد پر رکھا ہے۔ مارکس کا یہ خیال تھا کہ عالم میں اگر سرمایہ دار لوگ زیادہ ہوگئے تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو کھا جائیں گے، اور خود بخود مٹ جائیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ ہم کو یہ بتا رہا ہے کہ سرمایہ داروں کے بجائے مٹنے کے توقع سے زیادہ ترقی ہوتی جاتی ہے۔ مارکس کی رائے ہے کہ تین شرائط پر عمل کرنے سے سرمایہ داروں کو خالص نفع مل سکتا ہے۔ (۱) مزدوری میں کمی کرنا۔ (۲) کام کا وقت بڑھانا۔ (۳) پیداوار کو غیر معمولی قیمت پر فروخت کرنا...

... اب ہم کارخانہ فورڈ کے صنعتی اصول کا مارکس کے اس نظریہ سے مقابلہ کریں تو پورا پورا عکس ثابت ہوتا ہے یعنی باوجودیکہ مزدوری میں اضافہ کیا، کام کا وقت گھٹایا، اور سستے دام فروخت کیا پھر بھی مالک کارخانہ کو نفع ہی نفع ملتا ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ جو کچھ روپیہ پیسہ سرمایہ داروں کو ملتا ہے وہ مزدوروں کے نفع میں سے ہے .... پیداوار کی نکاسی لین دین، خرید و فروخت کا معاملہ تاجروں سے ہوتا ہے۔ مگر پیداوار تو بیچارے مزدوروں کی محنت سے ہوتی ہے۔ مالک کارخانہ اور تاجر دونوں مل کے بیچ میں فائدہ اٹھاتے ہیں اور بیچارے مزدوروں کو محروم کر دیتے ہیں، اس سے اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ دار مزدوروں کے لئے نقصان دہ اور دنیا کے لئے مضر ہیں اس لئے ان کو مٹانا ضروری ہے ...... اس کے خیال کے مطابق سرمایہ دار کو پہلے مٹانا پڑے گا اس کے بعد تاجر کو .... مگر آج اتحادی جمعیت کا نظام قائم کیا جا رہا ہے جس کے ذریعہ سے سب سے پہلے تاجر مٹ جائے گا۔ بعد میں سرمایہ دار ...... یہ بھی مارکس کی رائے کے خلاف ظاہر ہوا۔

اس کے نظریہ کے مطابق، دنیا کی صنعتی ترقی کثرت پیداوار پر موقوف ہے اور پیداوار کی کثرت، کافی سرمائے پر ہے۔ جب سرمایہ کافی ہو تب پیداوار میں اضافہ ہو سکتا ہے اور صنعت کو ترقی مل سکتی ہے اور مالک کو نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر لوہے کے کارخانہ (ہان کیو چین) کے پاس کافی سرمایہ ہے۔

اور پیداوار بھی کثرت سے ہوتی ہے۔ چاہئے تھا کہ نفع ملتا اور ترقی ہوتی مگر خسارہ ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟
.... اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ صنعت کی ترقی کا، پیداوار اور سرمایہ کے اوپر دار و مدار
نہیں ہے صنعتی ترقی کا دار و مدار صرف اس پر ہے کہ سوسائٹی کتنا سامان قبول کر سکتی ہے اور کتنے
کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیداوار اگر زیادہ ہو اور نکاسی کم تو کیسے نفع مل سکتا ہے۔ اسی واسطے آج کل
دنیا میں جتنے بڑے بڑے کارخانے ہیں ان میں جتنا مال و سامان تیار کیا جاتا ہے۔ وہ سوسائٹی
کی ضرورت کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں بعض مزدور بھی ال کی نکاسی میں کارخانہ کی
مدد کرتے ہیں، اس نکاسی کی وجہ سے اجتماعی زندگی کا سوال پیدا ہوتا ہے یعنی معیشت، ان وجوہ سے
صنعتی ترقی نہ پیداوار پر موقوف ہے اور نہ سرمایہ پر بلکہ عوام کے معاشی حالات پر موقوف ہے۔ معیشت کا سوال
گویا سیاسی تحریک کا مرکز ہے۔ نزاعات طبقات کا باعث اور تاریخی واقعات کا محرک۔ اجتماعی زندگی کی
تمام دشواریوں کو دور کرنے میں ہم کو ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مادیات ہی تاریخ کا منبع ہیں۔

مسئلہ معیشت حل کرنے کی ترکیب:۔

ہر ملک کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور سرمایہ کی کیفیت کے اختلاف کی وجہ سے مسئلہ معیشت کے
حل کرنے میں مختلف ملک مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں ..... ممالک مغرب نے مسئلہ معیشت کو
حل کرنے کے لئے اب تک کوئی خاص اور معقول ترکیب نہیں نکالی ہے، بہر حال اس کے متعلق دو جماعتیں
موجود ہیں جو کہ اس مسئلہ پر غور کرتی ہیں۔ ایک وہ جماعت ہے جو مارکس کے خیال کے مطابق مسئلہ معیشت
میں مکمل تبدیلی یعنی انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یہ سرعت پسند جماعت ہے جس کی رائے میں سیاسی معیشت
کا حل صرف انقلاب سے ہو سکتا ہے۔ دوسری جماعت وہ ہے جو کہ ایک پر امن طریقہ اختیار کرنا
چاہتی ہے اور اس پر امن طریقے کے ماتحت سیاسی مفاوضات اور سمجھوتے سے طرفین کو باہم ملا کر اس
مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش میں ہے۔ یہ سوشیلسٹ ہے (غیر اہل اشتراکیت)، ان کے خیال میں یہی
بہتر طریقہ ہے جس سے مسئلہ معیشت کے حل ہونے کی امید ہے۔ ممالک مغرب میں ان دونوں جماعتوں
کی کشمکش بڑی شدید ہے، ہر ایک نے غیر معمولی روش اختیار کر رکھی ہے۔ ان میں تصادم پیدا ہوتا ہے

اور ہر ایک اپنے ہی راستے پر چلتا ہے۔

انقلاب سے مسئلہ معیشت کا حل کرنا مشکل ہے:

انقلاب کے ذریعہ سے مسئلہ معیشت کو حل کرنے کی ترکیب روس نے اختیار کی تزار کو تخت سے اتارے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے۔ مگر روس میں صرف سیاسی معاملے کا حل ہوا ہے۔ جہاں تک معیشت کا تعلق ہے۔ انقلاب روس کے بعد ہی اب تک کوئی اس کا معقول حل نظر نہیں آیا۔ آج کل روس نے اگرچہ معاشیات کے متعلق ایک نئی اسکیم تیار کی ہے مگر وہ بھی زیر تجربہ ہے فوراً اس پر کاربند ہو جانا ناممکن ہے اس سے معلوم ہوا کہ معیشت کا سوال انقلاب سے حل کرنا مشکل ہے بلکہ ایک معقول ترکیب درکار ہے یہی وجہ ہے کہ ممالک مغرب کے اہل معاش اور ماہرین معیشت، روسی علماء کے ہمخیال نہیں ہیں اور ان کی رایوں کو ناقابل قبول سمجھتے ہیں۔ علماء مغرب کا خیال ہے کہ مسئلہ معیشت، سیاسی تحریک اور رضامندی سرمایہ دار اور مزدور کے سمجھوتے سے حل ہو سکتا ہے۔ طرفین کو سیاسی تحریک سے ملا دینا ایک دن کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت ہے۔ جلد بازی نہایت تلخ پھل لاتی ہے۔ یہ لوگ امن پسند اور اتحاد پسند ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق دنیا کے جتنے سرمایہ دار ترقی یافتہ ممالک ہیں ان کو مارکس کی ترکیب سے کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ اس سے معیشت کا حل نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک صرف امن کے طریقہ سے، صلح کے طریقہ سے اور اتحاد کے طریقہ سے اس کا حل ہو سکے گا۔ اس کی ترکیب کیا ہے؟ اس کی ترکیب ہم ذکر کر چکے ہیں، یعنی (۱) سوسائٹی اور صنعت کی اصلاح (۲) ذرائع نقل و حمل پر عوام کی ملکیت۔ (۳) محصول بلا واسطہ (۴) عناصر اجتماعی کا تناسب اور ہم آہنگی . . . . اتحادی جمعیت یہ چار باتیں مارکس کی رائے کے خلاف ہیں۔

ممالک مغرب کی آئندہ اجتماعی زندگی:

حقیقت میں ممالک اپنی اجتماعی زندگی اور مسئلہ معیشت کے حل کرنے کے لئے کیا عمل اختیار کریں گے اور ان کا طرز کیا ہوگا، اس وقت ہم قطعاً کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے . . . . . امن اور اتحاد پسند لوگوں کے خلاف اہل سرمایہ نے ناراضگی ظاہر کی۔ اس بنا پر بہت ممکن ہے کہ لوگوں کو جلد بازی کرنی

پڑے یعنی انقلاب کے ذریعے سے موجودہ معیشت کا نظام الٹ دیں اور قوت سے اس کا حل نکالیں۔ اب سرمایہ داروں کا حال یہ ہے کہ وہ اس طریقے سے اپنے مفاد و منافع کی حفاظت کرنے کو تیار ہیں جس طریقے سے اہل شہنشاہیت تخت شاہی کی حفاظت کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لوگ شخصیت اور استبداد سے سوشلسٹ کے خلاف اٹھیں گے اور ان کو قوت سے دبائیں گے۔ ان وجوہ سے ممکن ہے کہ مغرب کے معیشت کے مصلح حالات کی مجبوری سے مارکس کے عقیدہ پر عمل کرنے کو آمادہ ہو جائیں۔

اشتراکیت :

اشتراکیت کا نظام اس زمانے سے قائم ہوا ہوگا جس زمانے سے تاریخ کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ نظام پھر ٹوٹ گیا ہوگا۔ مگر کون سے زمانے میں یہ نظام ٹوٹا؟ میرے خیال میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام اس زمانے میں ٹوٹا جس زمانے میں ضرب نقود کی ابتدا ہوئی۔ نقود کے ضرب کے بعد غالباً اشتراکیت کا نظام اس طریقے سے الٹ گیا ہوگا جس طریقے مشین کی اختراع کے بعد پیشہ وری کے دستور کا خاتمہ ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں عالم کے اکثر سمجھدار اور طاقتور لوگوں نے دنیا کے تمام ذرائع معاش پر اپنے ذاتی منافع اور مفاد کے لئے قبضہ کر لیا ہوگا اور ناتوان کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی ہوگی تاکہ وہ ان کی بجائے کام کریں جس کی وجہ سے انسان انسان کے درمیان نہایت دردانگیز اور المناک واقعات پیش آئے ہوں گے۔ خونریزی تو کیا مقتولوں کے پہاڑ لگا دئے گئے ہوں گے، خون کے دریا بہادئے گئے ہوں گے۔ مگر یہ نزاعات کب ختم ہوں گی؟ یہ نزاعات اشتراکیت کے دوبارہ پیدا ہونے کے بعد موقوف ہوں گی، اشتراکیت کے زمانے میں تمام عوام کو روٹی مل سکتی ہے جس سے انسان کا انسان کے ساتھ جنگ وجدال دور ہوسکتا ہے۔

معیشت اور اشتراکیت :

اشتراکیت جو دنیا میں رونما ہوئی اس کی اصلی غایت اجتماعی زندگی کو درست کرنا اور مسئلہ زندگی کو حل کرنا ہے۔ ہماری جماعت کی معیشت کا اصول، نہ صرف ایک اعلیٰ خیال ہے جس پر عمل کرنے سے اجتماعی زندگی کا سوال حل ہوجاتا ہے بلکہ یہی اجتماعیت کا سرچشمہ و مرکز ہے اور تاریخی واقعات کا محرک اور منبع اجتماعی زندگی کا حل ہونا معیشت کے حل ہونے پر موقوف ہے۔ انسان کو اس وقت راحت و آرام ملیگا جب

اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے ۔اس موقع پر ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ بتائیں کہ معیشت اور اشتراکیت میں کیا فرق ہو۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت ہماری معیشت کا خواب ہے اور معیشت اس کی تعبیر ہو حقیقت میں ان دونوں کے درمیان کوئی بڑا فرق نہیں ہے ۔صرف طرز عمل کا اختلاف ہو۔

چین کی اجتماعی حالت:

ہم اس وقت تک معیشت کے متعلق کوئی اطمینان بخش اسکیم نہیں تیار کرسکیں گے ،جب تک ہم تاریخ اور واقعات سے مواد نہ اخذ کریں ۔صرف منطقی بحث سے ہم کو کیا ملے گا! . . . . چین کے صحیح حالات اور واقعات کیا ہیں ؟ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غربت ہے، افلاس ہے ۔یہاں غم خوردہ، دل شکستہ اور مصیبت زدہ رہتے ہیں ، کہنے کو تو یوں ہے کہ چین نگار خانہ ہے ۔مگر حقیقت میں چالیس کروڑ خدا کی مخلوق با مشقت اپنی زندگی اس سرزمین میں کاٹتی ہے ۔اہل چین دولتمندی کے دولتمند نہیں بلکہ مفلسی کے دولتمند ہیں ۔یعنی یہاں بڑے سے بڑے مفلس اور غریب کثرت سے پائے جاتے ہیں ۔مگر چھوٹے سے چھوٹا دولتمند شاذو نادر ۔نواب اور اجارہ دار کا تو کیا ذکر ۔اہل چین کے قول "دولت و غربت میں توازن نہیں" کا مطلب یہ نہیں ہو کہ دولتمند کا سر آسمان پر ہے ،اور غریب کا سر زمین کے نیچے بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ اُن میں کوئی چھوٹا غریب ہو اور کوئی بڑا ۔یہی وجہ ہے کہ آج کل سرزمین چین میں ایک بھی ایسا زمیندار نہیں ہے جو حقیقۃً زمیندار کہلانے کا مستحق ہو ۔بلکہ غریب اور مفلس نما زمیندار ہیں . . . . . اس زمانے میں جب کہ یورپ کا معاشی طوفان چین کی طرف بہتا آرہا ہے اور ہر قسم کے نظام میں کچھ نہ کچھ تبدیلی نظر آتی ہے تو سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین کس کی ملکیت میں رہنا چاہیے ۔کوئی کہتا ہے کہ زمیندار کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے وہی اس کا تنہا مالک ہو کوئی کہتا ہو زمین زمینداروں سے چھین کر حکومت کے ہاتھ میں آنا چاہیئے ۔ یہ بالکل وہی سوال ہے جو مغربی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان پیدا ہوا ۔مزدوری طبقے یہ سمجھتے ہیں کہ مال کے منافع و مفاد ہمیں ملنے چاہئیں، سرمایہ دار یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہی منافع و مفاد کے مستحق ہیں ۔

زمین کا سوال :

اس میں شک نہیں کہ زمین کی قیمت کا بڑھنا اور گھٹنا عوام کی محنت اور کوشش سے ہو اور زمیندار کو مطلقاً اس میں دخل نہیں ...... عوام اپنی محنت و مشقت سے جس زمین کو اصلاح کر کے اچھی بنا لیتے ہیں اُس زمین کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور یہ لازمی بات ہو کہ جب کسی زمین کی قیمت بڑھتی ہے تو اس کے ارد گرد جو ضروریات اور لوازمات ہیں ان کی قیمت بھی بڑھنے لگتی ہے مطلب یہ ہے کہ زمین سے جو کچھ اور جس قدر منافعے پیدا ہوتے ہیں وہ عوام کے پیدا کردہ ہیں۔ مگر حقیقتہً مالکان زمین سارے منافع پر قبضہ کر کے اپنا ہی بنا لیتے ہیں۔ اس ناانصافی اور ظلم کو دور کرنے کے لئے اہل یورپ نے کوئی ترکیب ہمیں نہیں بتائی ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اس وقت صرف ہم کو کوشش کرنی ہے۔ اس لئے کہ اس وقت اس کا حل کرنا ہمارے لئے بہ نسبت اور وقت کے زیادہ آسان ہو اگر صنعت و حرفت کی ترقی کے بعد ہم اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں گے، تو اس وقت ہمارے لئے نہایت دشواری ہوگی۔

معیشت اور اہل انقلاب چین :

ہاں ہم نے ذکر کیا تھا کہ زمین کس کی ملکیت میں رہنا چاہئے، زمینداروں کے ہاتھ میں یا حکومت کے ؟ اور اس کے متعلق اہل انقلاب کے پاس کیا ترکیب ہو ؟ ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ زمین کی ملکیت زمینداروں کے ہاتھ میں رہے یا حکومت کے۔ سوال صرف یہ ہو کہ ہمارے پاس کیا طریقہ ہے جس سے ہم مسئلہ زمین کو حل کر سکیں اور جس سے کسان، زمیندار اور حکومت تینوں مطمئن ہو جائیں اور کوئی کسی کا شاکی نہ ہو۔ اس کے متعلق ہمارے پاس ایک ترکیب ہو کہ ملکیت میں تناسب اور مساوات قائم رہے۔ معیشت کی غرض و غایت یہ ہو کہ اجتماعی زندگی کے متعلق جتنے ذرائع معاش ہیں۔ اُن کی ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کی جائے جس سے نہ زمینداروں کو نقصان ہو اور نہ حکومت کو نفع۔ نہ حکومت کو نقصان ہو اور نہ مالکان سرمایہ کو نفع۔ اُن کی ملکیت یکساں رہے اور نفع دونوں کو برابر ملے۔ اس وقت ہمارا سب سے اہم کام ملکیت کا سوال حل کرنا ہے اس کے متعلق ہمارے پاس ایک

ترکیب ہو کہ ملکیت میں تناسب اور مساوات قائم رہے۔ معیشت کی غرض وغایت یہ ہو کہ اجتماعی زندگی کے متعلق جتنے ذرائع معاش ہیں، اُن کی ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کی جائے۔ جس سے نہ زمینداروں کو نقصان ہو اور نہ حکومت کو نفع نہ حکومت کو نقصان ہو اور نہ مالکان سرمایہ کو نفع۔ اُن کی ملکیت یکساں رہے اور نفع دونوں کو برابر ملے۔ اس وقت ہمارا سب سے اہم کام ملکیت کا سوال حل کرنا ہے۔ اس کے حل کئے بغیر ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کرنا ناممکن ہے . . . . . اس بات کو سن کر غالباً مالکان اور زمینداران کے دلوں میں وہم اور خوف پیدا ہوا ہوگا کہ ہم اُن کے حقوق اور ملکیت چھیننے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہماری جماعت کی ترکیب سے زمین کے متعلق جو فیصلہ کیا جاتا ہے اس سے زمینداروں کو بالکل مطمئن اور بے ڈر رہنا چاہیئے . . . یہ ترکیب کیا ہے؟ وہ یہ کہ حکومت زمین پر قیمت کے مطابق محصول لگائے گی یا قیمت کے مطابق زمینداروں سے خریدے گی . . . . . . جہاں تک میرا خیال ہے قیمت کے متعلق زمیندار کو فیصلہ کرنا چاہیئے یعنی وہ خود زمین کی قیمت مقرر کر کے حکومت کو اطلاع دیدیں تاکہ حکومت اُن کے مطلع شدہ قیمت کے مطابق زمین پر محصول لگائے یا اُن سے خریدے۔ محصول تو عموماً ایک فیصدی ۱/۱۰۰ کے حساب سے لگائیں گے۔ زمینداروں کو اختیار ہے زمین کی قیمت جتنی لگانا چاہیں لگا سکتے ہیں قانوناً ان کا اطلاع نامہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر حکومت کو یہ اختیار ہے کہ چاہے مطلع شدہ زمین پر محصول لگائے اور چاہے اسی قیمت پر زمینداروں سے خریدے۔ یہ دو اختیار دینے سے طرفین کی تعدی رک جاتی ہے۔ نہ حکومت زمینداروں پر ظلم کر سکتی ہے کہ وہ مفت اُن کی ملکیت چھین لے اور نہ زمینداروں کو حکومت سے زیادہ وصول کرنے کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اگر زمینداروں نے واجبی قیمت سے زیادہ حکومت کو اطلاع دی تو ممکن ہے کہ حکومت قیمت کے مطابق زمین پر محصول لگائے اور اُن سے خریدے نہ۔ اگر انھوں نے کم دام کو بتائے تو یہ بھی احتمال ہے کہ حکومت اُن سے بجائے محصول کے قیمتہً خرید لے . . . . . ان وجوہ سے زمیندار یقیناً ٹھیک ٹھیک دام بتا دیں گے نہ زیادہ اور نہ کم۔ قیمت تعین کرنے کے بعد ہم زمین پر ایک قانون نافذ کر دیں گے وہ یہ کہ اُس سال سے جس زمین کی قیمت کا تعین

ہوا ہے، زمین کی قیمت جتنی بڑھے یا بڑھائی جائے وہ اصلی قیمت کے علاوہ سب کی سب حکومت کی ملکیت ہوگی۔ نہ کہ کسی فرد کی . . . . . یہ ہے ہماری ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کرنے کی ترکیب۔ اسی سے ہم کو معیشت کا سوال حل کرنا ہے۔ گویا ایک قسم کی اشتراکیت ہے۔ مگر حقیقت میں اشتراکیت سے بالکل الگ ہے۔ یعنی ہماری اشتراکیت مستقبل میں ہوگی نہ کہ حال میں۔ اور یہ مستقبل کی اشتراکیت بالکل انصاف اور عدل پر قائم ہوگی۔ اس وقت جس کے پاس زمین ہے اگر وہ ہماری ترکیب کے مطابق عمل کرے تو اس کو نقصان نہ ہوگا۔ اور نہ حکومت کو۔ یہ ترکیب اہل یورپ کی ترکیبوں سے بالکل علیحدہ ہے اہل یورپ کی رائے میں عوام کی جتنی ملکیت اور جائداد ہے بلا معاوضہ یا خفیف معاوضہ دے کر حکومت کو اُن پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ یہ مالکان اور زمینداران کے لئے ایک نہایت مہلک گرفت ہے جس سے سوائے تباہی کے اور کچھ نہ ہوگا۔

معیشت کا سوال حل کرنے میں یہ بات ضروری ہے کہ ہم سرمایہ کو محدود کریں۔ چین میں سب سے بڑا سرمایہ دار ہے۔ وہ زمیندار ہے۔ یہ زمیندار اگرچہ بین الاقوامی سرمایہ داروں کے مقابلے میں معمولی غریب کے برابر ہے مگر اپنی قوم کے اندر اس کو سرمایہ دار خیال کرنا پڑتا ہے کیونکہ چین میں جو کچھ روپیہ پیسہ ہے اکثر اسی کے پاس ہے۔ زمیندار کے علاوہ اور کوئی ایسے بڑے کارخانہ کا مالک نہیں ہے جس کے پاس بے شمار دولت ہو۔ زمین کی ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کرنا ایک طرف سے سرمایہ کو محدود کرتا ہے اور دوسری طرف سے مسئلہ معیشت کے حل کرنے میں آسانی بہم پہنچاتا ہے۔ چین کو اپنے معیشت کے سوال کو حل کرنے کے لئے محض سرمایہ کا محدود کرنا کافی نہیں ہے۔ کیونکہ غیر ممالک دولتمند ہیں اور چین غریب۔ غیر ممالک کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے اور چین کی پیداوار ضرورت سے کم۔ اس وقت چین کو نہ صرف ذاتی ملکیت اور سرمایہ کا محدود کرنا ہے۔ بلکہ ملکی ملکیت اور قومی سرمایہ کو بڑھانا اور ترقی دینا ہے۔ قومی سرمایہ کے ذریعہ سے دستکاری کو ترقی دے کر معیشت کا سوال حل ہونے کی امید ہے۔ صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً ذرائع آمد و رفت، حمل و نقل اعلیٰ پیمانے پر تیار کرنا۔ ریلوے کی تعمیر کرنا۔ دریا کھودنا۔ جہاز کی کمپنی قائم کرنا۔

شاہراہ بنانا۔ موٹر کے لیے سڑکیں تیار کرنا۔ یہ صنعت کو ترقی دینے کا پہلا زینہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معدنیات نکالیں خواہ وہ لوہا ہو یا کوئلہ یا اور کوئی چیز۔ چین میں معدنیات بہت ہیں۔ مگر اب تک زمین کے اندر مدفون ہیں نہ لوگوں نے ان کو نکالا ہے اور نہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ سبب پوچھئے تو کہتے ہیں سرمایہ کہاں! روپیہ کہاں! اس میں شک نہیں کہ ذاتی سرمایہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتا اور نہ کسی شخص کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ تنہا ایک کان کھودے۔ اب قومی سرمایہ سے مدفون ذخیرہ کو نکالنا پڑے گا جس سے سب کو نفع و فائدہ ہوگا۔ تیسرا یہ ہے کہ دستکاری کو سائنٹفک اصول سے ترقی دے اور جدید آلات سے مال کی پیداوار میں کام لے، چین میں اگرچہ مزدور بہت ہیں اور کام کرنے والوں کی کمی نہیں مگر مشین نہ ہونے کی وجہ سے چین کی صنعت غیر ممالک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لہذا چین کو جن چیزوں کی ضرورت ہے غیر ممالک سے ان کی درآمد کا محتاج ہے۔ اس وجہ سے سالانہ چین کو بیحد روپیہ غیر ممالک کی طرف بھیجنا پڑتا ہے۔ جب ہم درآمد کا سدباب کرنا اپنا روپیہ اپنے ہاتھ میں رکھنا اور اپنے جائز حق سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ضرورت اس کی ہے کہ ہم جلد از جلد دستکاری کو ترقی دیں، جدید آلات سے کام لیں تمام مزدوروں کو کاموں میں لگائیں۔ کوئی فرد بیکار نہ رہے اور سب کو روٹی مل سکے۔ جب ہماری دستکاری ترقی کرے گی تب ہماری آمدنی میں اضافہ ہوگا اور چینی باشندے بھوکے نہ مریں گے۔

اجتماعی زندگی کی مشکلات کو حل کرنے کا اصلی مقصد:

چین کی اجتماعی زندگی کی مشکلات کو دور کرنے سے ہمارا اصلی مقصد غیر ممالک سے کسی قدر مشابہ ہے یعنی یہ کہ تمام باشندے خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کریں اور ہر قسم کی معیبت و تکلیف جائداد کے عدم تناسب، ملکیت کی عدم مساوات اور طبقات کی جنگ سے آزاد ہو جائیں یعنی ایک مشترک زندگی جس میں نہ امیر و غریب کا امتیاز ہو نہ رنگ و بو کا فرق ہو۔ اور نہ من و تو کا احساس ہو۔ ہمارے تین اصول ہیں یعنی جمہوری ملکیت، جمہوری نظام، جمہوری منافع . . . . حکومت عوام کی ملکیت ہوگی معاملے عوام کے انتظامات سے ہوں گے۔ منافع و مفاد میں عوام حق دار ہوں گے . . . . . عوام نہ صرف جائداد و ملکیت میں شریک ہوں گے بلکہ ہر چیز میں۔ یہی معیشت کی اصلی غایت ہے اور اسی

کوکانفوشس کے الفاظ میں عالمگیر حکومت کہتے ہیں۔

روٹی کا سوال:

معیشت میں جو سب سے اہم سوال ہے وہ روٹی کا ہے۔

۱۔ روٹی کے سوال پر ایک نظر...... جن ملکوں میں کافی روٹی مل سکتی ہے ان میں اول نمبر امریکہ ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کے باشندے کو پیٹ بھر کے کھلا سکتا ہے۔ بلکہ اہل یورپ اس سے بہت کافی مدد لیتے ہیں۔ دوسرا نمبر روس ہے وہ ایک نہایت وسیع اور زرخیز ملک ہے وہاں کے باشندے بہ نسبت اور ملک کے بہت کم ہیں۔ پیداوار اس کی بہت ہے۔ اس لئے اس کو کافی روٹی مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا، کناڈا، جنوبی امریکہ اور ارجنٹائن جیسے ممالک ہیں، جن میں کثرت سے غلے پیدا ہوتے ہیں خود استعمال کرنے کے بعد کافی مقدار غیر ممالک میں بھیجتے ہیں جس سے غیر ممالک کی کمی پوری ہوتی ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں حمل ونقل کے جہازوں کو جنگی ساماں پہنچانے کے لئے طاقتوں نے قبضہ میں کر لیا۔ جس سے غلہ کی آمد ورفت کا راستہ بند ہو گیا۔ اور یورپ بھر میں قحط کے آثار نمودار ہوئے۔ اس وقت اہل یورپ روٹی کے لئے بہت پریشان ہوئے اور قریب تھا کہ غلہ کی کمی کی وجہ سے اہل یورپ بھوکے مر جائیں۔ اس اثنا میں چین کے اندر اس لئے روٹی کا سوال نہیں پیدا ہوا کہ نہ سیلاب تھا، جس سے کھیتی باڑی برباد ہو جائے، نہ بارش کی کمی تھی جس سے غلہ کی فصل کم ہو اور نہ اور کسی قسم کی آسمانی آفت تھی جس سے قحط کا اندیشہ ہو۔ کسان خوشحال تھے۔ غلے کثرت سے پیدا ہوئے تھے یہ گویا اہل چین پر خدا کی برکت تھی، جس سے اس مضطرب زمانے میں چین کو روٹی کا سوال پیش نہ آیا۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ دنیا کے کن کن ملکوں کو روٹی کی کمی ہے۔ یورپ کے مغرب میں ایک ملک جو تین جزیرے نما سے بنا ہے اور جس کو برطانیہ عظمےٰ کہتے ہیں، اس میں سال بھر میں جو غلے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف تین مہینے کے لئے کافی ہوتے ہیں اور نو مہینے کی روٹی باہر سے مانگنی پڑتی ہے۔ جنگ عظیم کے موقع پر جب جرمنی نے سمندر کا سد باب کر دیا اور جہازوں کو روک دیا تو قریب تھا کہ روٹی نہ ملنے کی وجہ سے سارے انگریز مر جائیں۔ ایشیا کے مشرق

شاہراہ بنانا۔ موٹر کے لیے سڑکیں تیار کرنا۔ یہ صنعت کو ترقی دینے کا پہلا زینہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معدنیات نکالیں خواہ وہ لوہا ہو یا کوئلہ یا اور کوئی چیز۔ چین میں معدنیات بہت ہیں۔ مگر اب تک زمین کے اندر مدفون ہیں نہ لوگوں نے ان کو نکالا ہے اور نہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ سبب پوچھئے تو کہتے ہیں سرمایہ کہاں! روپیہ کہاں! اس میں شک نہیں کہ ذاتی سرمایہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتا اور نہ کسی شخص کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ تنہا ایک کان کھودے۔ اب قومی سرمایہ سے مدفون ذخیرہ کو نکالنا پڑے گا جس سے سب کو نفع و فائدہ ہوگا۔ تیسرا یہ ہے کہ دستکاری کو سائنٹفک اصول سے ترقی دے اور جدید آلات سے مال کی پیداوار میں کام لے، چین میں اگرچہ مزدور بہت ہیں اور کام کرنے والوں کی کمی نہیں مگر مشین نہ ہونے کی وجہ سے چین کی صنعت غیر ممالک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا چین کو جن چیزوں کی ضرورت ہے غیر ممالک سے ان کی درآمد کا محتاج ہے۔ اس وجہ سے سالانہ چین کو بیحد روپیہ غیر ممالک کی طرف بھیجنا پڑتا ہے۔ جب ہم درآمد کا سدباب کرنا اپنا روپیہ اپنے ہاتھ میں رکھنا اور اپنے جائز حق سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ضرورت اس کی ہے کہ ہم جلد از جلد دستکاری کو ترقی دیں، جدید آلات سے کام لیں تمام مزدوروں کو کاموں میں لگائیں۔ کوئی فرد بیکار نہ رہے اور سب کو روٹی مل سکے۔ جب ہماری دستکاری ترقی کرے گی تب ہماری آمدنی میں اضافہ ہوگا اور چینی باشندے بھوکے نہ مریں گے۔

اجتماعی زندگی کی مشکلات کو حل کرنے کا اصلی مقصد:

چین کی اجتماعی زندگی کی مشکلات کو دور کرنے سے ہمارا اصلی مقصد غیر ممالک سے کسی قدر مشابہ ہے یعنی یہ کہ تمام باشندے خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کریں اور ہر قسم کی معیشت و تکلیف جائداد کے عدم تناسب، ملکیت کی عدم مساوات اور طبقات کی جنگ سے آزاد ہو جائیں یعنی ایک مشترک زندگی جس میں نہ امیر و غریب کا امتیاز ہو نہ رنگ و بو کا فرق ہو۔ اور نہ من و تو کا احساس ہو۔ ہمارے تین اصول ہیں یعنی جمہوری ملکیت، جمہوری نظام، جمہوری منافع . . . . حکومت عوام کی ملکیت ہوگی معاملے عوام کے انتظامات سے ہوں گے۔ منافع و مفاد میں عوام حق دار ہوں گے . . . . . عوام نہ صرف جائداد و ملکیت میں شریک ہوں گے بلکہ ہر چیز میں۔ یہی معیشت کی اصلی غایت ہے اور اسی

کو کانفوشس کے الفاظ میں عالمگیر حکومت کہتے ہیں۔

روٹی کا سوال:

معیشت میں جو سب سے اہم سوال ہے وہ روٹی کا ہے۔

۱۔ روٹی کے سوال پر ایک نظر . . . . . جن ملکوں میں کافی روٹی مل سکتی ہے ان میں اول نمبر امریکہ ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کے باشندے کو پیٹ بھر کے کھلا سکتا ہے۔ بلکہ اہل یورپ اس سے بہت کافی مدد لیتے ہیں۔ دوسرا نمبر روس ہے وہ ایک نہایت وسیع اور زرخیز ملک ہے وہاں کے باشندے بہ نسبت اور ملک کے بہت کم ہیں۔ پیداوار اس کی بہت ہے۔ اس لئے اس کو کافی روٹی مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا، کناڈا، جنوبی امریکہ اور ارجنٹائن جیسے ممالک ہیں، جن میں کثرت سے غلے پیدا ہوتے ہیں خود استعمال کرنے کے بعد کافی مقدار غیر ممالک میں بھیجتے ہیں جس سے غیر ممالک کی کمی پوری ہوتی ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں حمل ونقل کے جہازوں کو جنگی ساماں پہنچانے کے لئے طاقتوں نے قبضہ میں کر لیا۔ جس سے غلہ کی آمد و رفت کا راستہ بند ہو گیا۔ اور یورپ بھر میں قحط کے آثار نمودار ہوئے۔ اس وقت اہل یورپ روٹی کے لئے بہت پریشان ہوئے اور قریب تھا کہ غلہ کی کمی کی وجہ سے اہل یورپ بھوکے مر جائیں۔ اس اثنا میں چین کے اندر اس لئے روٹی کا سوال نہیں پیدا ہوا کہ نہ سیلاب تھا، جس سے کھیتی باڑی برباد ہو جائے، نہ بارش کی کمی تھی جس سے غلہ کی فصل کم ہو، اور نہ اور کسی قسم کی آسمانی آفت تھی جس سے قحط کا اندیشہ ہو۔ کسان خوشحال تھے۔ غلے کثرت سے پیدا ہوئے تھے یہ گویا اہل چین پر خدا کی برکت تھی، جس سے اس مضطرب زمانے میں چین کو روٹی کا سوال پیش نہ آیا۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ دنیا کے کن کن ملکوں کو روٹی کی کمی ہے۔ یورپ کے مغرب میں ایک ملک جو تین جزیرے نا سے بنا ہے اور جس کو برطانیہ عظمے کہتے ہیں، اس میں سال بھر میں جو غلے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف تین مہینے کے لئے کافی ہوتے ہیں اور نو مہینے کی روٹی باہر سے مانگنی پڑتی ہے جنگ عظیم کے موقع پر جب جرمنی نے سمندر کا سد باب کر دیا اور جہازوں کو روک دیا تو قریب تھا کہ روٹی نہ ملنے کی وجہ سے سارے انگریز مر جائیں۔ ایشیا کے مشرق

میں ایک ملک ہے وہ بھی تین جزیرے نما سے بنا ہے اور جس کا نام جاپان ہے۔ اس کی سالانہ غلہ کی پیداوار جو ہے وہ اس کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ تاہم جاپان کو روٹی کی فکر اتنی نہیں ہے جتنی کہ برطانیہ کو کیونکہ اس کو صرف ایک مہینے کے لئے روٹی کی کمی پڑتی ہے اور اپنے ملک کی پیداوار سے گیارہ مہینے تک کام چلا سکتا ہے۔ جرمنی کا غلہ صرف دس مہینے کام دیتا ہے۔ دو مہینے کی روٹی کے لئے غیر ممالک کا محتاج ہے۔ اُن کے علاوہ اور بہت سے ممالک ہیں جن کو روٹی کی فکر رہتی ہے۔ امن وامان کے زمانے میں بھی جرمنی کو کافی روٹی نہیں ملتی۔ جنگ عظیم کے موقع پر اس کو اور زیادہ روٹی کی فکر ہوئی کیونکہ اکثر نوجوان کسان فوج میں بھرتی کئے گئے۔ زمین بیکار پڑی رہی جس کی وجہ سے پیداوار اور کم ہو گئی۔ اس لئے بالآخر جرمنی کو شکست کھانی پڑی۔ ان باتوں سے مطلب یہ ہے کہ روٹی کا سوال نہایت اہم ہے۔

۲۔ چین میں روٹی کا سوال . . . . چین کی زمین وسعت کے لحاظ سے امریکہ سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ آبادی کے اعتبار سے اس سے تین گنی زیادہ ہے۔ اگر ہم مقابلۃً چین اور امریکہ کے روٹی کے سوال پر غور کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ چین ہرگز امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر ہم فرانس کے ساتھ مقابلہ کریں تو چینی باشندے فرانس سے نو گنے زیادہ ہیں اور اگر زمین کی وسعت میں مقابلہ کریں تو فرانس کی زمین چین کی صرف ۱/۲۰ کے برابر ہے۔ مگر اہل فرانس نے جن کی تعداد صرف چار کروڑ ہے۔ جدید آلات اور سائنٹفک اصول سے اپنی کاشتکاری کی اصلاح کر لی ہے اور اگرچہ ان کو چین کی صرف ۱/۲۰ زمین ملی ہے مگر ان کو روٹی کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ چین کے پاس اگرچہ وسیع زمین موجود ہے۔ مگر زراعت کی اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے پیداوار کم ہوتی ہے جس سے کافی روٹی نہیں مل سکتی آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قحط اور بھوک سے جو مرتے ہیں ان کی تعداد لاکھوں ہوتی ہے۔ اگر ساتھ ہی ساتھ کوئی آفت بھی ان پر آجاتی ہے تو لاکھوں کی تعداد کیا بلکہ لاکھوں کے لاکھوں مرجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف دس سال کے اندر نو کروڑ نفوس قحط اور بھوک سے ہلاک ہو گئے۔ یہ کس قدر دردانگیز اور اندوہناک امر ہے! . . . . . . یہ روٹی کی کمی کا نتیجہ ہے۔ روٹی کی کمی کاشتکاری اور زراعت کی پستی کی

وجہ سے ہی۔غیر ممالک کے معاشی دباؤ سے ہے۔ معاشی دباؤ کی وجہ سے چینی غیر ممالک کو روپیہ پیسہ نہیں دے سکتے۔ بجائے روپیہ پیسہ کے، اپنے غلّے غیر قوموں کے ہاتھ میں سپرد کردیتے ہیں۔ اس لئے خود بھوک اور فاقہ پر مجبور ہوتے ہیں۔

۴۔ جنس انسان کے لئے چار ضروری غذائیں۔۔۔۔۔ انسان کو کن چیزوں کے کھانے کی ضرورت ہے اور کن چیزوں کے کھانے سے وہ زندہ رہ سکتے ہیں؟ ہم روزانہ اپنی جان بچانے کے لئے جو چیزیں کھاتے ہیں وہ درحقیقت چار اہم جزو میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ پہلی چیز ہوا ہے۔ جب ہم ہواخور کہتے ہیں تو اس پر اکثر لوگ ہنسنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی مذاق اڑا رہے ہیں۔ مگر انھوں نے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا کہ ہوا کا کھانا کھانا، کھانے سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ دوسری کھانے کی چیز پانی ہے (اُردو میں پانی پینا کہتے ہیں۔ فارسی میں آب خوردن اور نان خوردن میں کوئی فرق نہیں۔ چینی زبان میں پانی پینے کو "ہِن" کہتے ہیں، جس کے معنی پینے کے ہیں مگر کبھی کبھی پانی پینے کو "چھِی" کہتے ہیں، جس کے معنی اردو میں کھانے کے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر سن یٹ سین نے یہاں "چھِی" کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے اصلی لفظ اور نیز اس موقع کے آگے پیچھے جملوں کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے یہاں پانی پینے کے لئے کھانے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اگرچہ اردو محاورہ کے خلاف ہے۔ مگر اس جگہ پر کھانے کا لفظ استعمال کرنا ہی مناسب ہے۔ اگر قارئین کے نزدیک یہ عیب ہے تو امید ہے کہ اس عیب سے درگزر فرمائیں۔ بدرالدین)۔ تیسری چیز حیوانات ہے یعنی گوشت کھانا۔ چوتھی چیز نباتات ہے۔ یعنی غلّے، میوے، سبزی وغیرہ۔ یہ ہوا، پانی، حیوانات اور نباتات جنس انسان کے لئے چار اہم غذائیں ہیں۔ اب تفصیل کے ساتھ اُن پر بحث کرتا ہوں۔

(الف) ہواخور۔۔۔۔ اگر آپ کو یقین نہیں ہے کہ ہوا کھانے کی ضرورت ہے تو آزمائش کے طور پر آپ یہ کیجئے کہ آپ اپنی ناک بند کرلیں۔ صرف ایک منٹ تک بند رکھئے۔ تب دیکھئے کہ آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ ایک منٹ تک کیا آپ صبر کرسکتے ہیں کہ ہوا نہ کھائیں؟ کیا ایک منٹ تک آپ ہوا نہ کھانے سے تکلیف نہیں محسوس کرتے ہیں؟ ضرور محسوس کرتے ہوں گے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک

منٹ میں آپ کو کتنی دفعہ ہوا کھانے کی ضرورت ہے؟ ایک منٹ میں سولہ مرتبہ۔ ہم روزانہ زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ کھانا کھاتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ہمیں کھانا کم ملے تو بھی گزر کر سکتے ہیں۔ ایک دو روز تک بھوک برداشت کر سکتے ہیں۔ ہم کو روزانہ ۲۳۰۴۰ مرتبہ ہوا کھانے کی ضرورت پڑتی ہے، اگر اس سے کم ہو، تو ہماری طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔ اگر چند منٹ تک ہوا نہ کھائیں تو مرنا یقینی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہوا انسان کی پرورش کے لئے ایک اہم غذا ہے۔ (ب) آب خور . . . . اگر ہم صرف کھانا کھائیں گے اور پانی نہ پئیں گے تو زندگی مشکل ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس کھانا نہیں ہے تو چھ سات دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس پانی نہیں ہے تو تین چار دن تک ہی زندہ رہنا محال ہے (ج) حیوانات (د) نباتات۔

ہر جگہ قدرت نے ہوا مہیا کر رکھی ہے دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ہوا نہ ہو اور ہوا کھانے کے لئے بغیر دام و معاوضہ مل سکتی ہے۔ اسی وجہ سے اس سے کوئی معاشی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے پانی کی کثرت اور ہر فرد کو بغیر محنت کے مل جانے کی وجہ سے اس سے بھی کوئی معاشی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ الأ شاذ و نادر یعنی جہاں پانی کی کمی ہے وہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربستان میں قبایل پانی کے لئے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ حیوانات کا انسان زیادہ محتاج نہیں ہے۔ ان کو کھانے سے اگرچہ فائدہ ہے مگر نہ کھانے سے ضرر نہیں ہے۔ اور نہ ہماری جان مفقود ہونے کا ڈر ہے۔ اسی واسطے ان سے بھی کوئی معاشی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے مگر نباتات جو ہیں، ہر شخص ان کا محتاج ہے۔ ان کے نہ ملنے سے انسان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان کی پیداوار انسان کی محنت پر موقوف ہے۔ محنت کی کمی، پیداوار کی کمی کا باعث ہے۔ دنیا میں جس چیز کی کمی یا ناکافی ہونے سے معاشی سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ نباتات ہیں۔ خاص کر اہل چین کے غذا کا دارومدار نباتات ہی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو اپنے کھانے اور روٹی کا سوال حل کرنے میں سب سے پہلے پیداوار کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

چین کے کسان :

زمانہ قدیم سے لے کر آج تک چین زراعتی ملک رہا ہے۔ اس واسطے زراعت یہاں کی پیداوار کا ایک بڑا پیشہ ہے۔ غلہ کی پیداوار کا تعلق کسان سے ہے۔ کسان جب بے فکری سے اپنی کھیتی باڑی میں جی لگاتے ہیں تو پیداوار میں زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ اگر وہ پریشانی کی حالت میں رہے اور کھیتی باڑی بھی کرے تو اس سے یہ توقع کرنا بالکل حماقت ہو کہ وہ پیداوار میں اضافہ کر سکے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ قانون کے ذریعہ سے کسانوں کو اتنے حقوق دے جائیں جن سے وہ اپنی آپ حفاظت کرسکیں۔ چینی باشندوں میں تقریباً نوے فیصدی کسان ہیں۔ مگر وہ اپنی قوت بازو، جفاکشی اور مسلسل محنت سے جو کچھ کماتے ہیں اور جس قدر غلہ حاصل کرتے ہیں، ان کے اکثر حصے زمینداروں کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں اور جو کچھ ان کے لئے بچتا ہے وہ ان کے پیٹ پالنے کے لئے کافی نہیں ہوتا . . . . پیداوار میں اس وقت اضافہ ہوسکتا ہے جبکہ کسانوں کی ہمت افزائی کا کوئی دوسرا طریقہ ہو۔ اور ان کے منافع و مفاد کی حفاظت کی کوئی ترکیب ہو، جس کی وجہ سے وہ پیداوار میں اضافہ کرسکیں۔ یہ سوال زمین کی ملکیت میں تناسب اور مساوات کا ہے . آئندہ زمانے میں معیشت کا مقصد پورا ہوسکتا ہے یا نہیں اور کسانوں کے معاملے طے ہو سکتے ہیں یا نہیں یہ صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ آیا کسان خود زمین کا مالک ہوسکتا ہے یا نہیں اگر کسان خود مالک بن جائے گا تو یہ سوال سوال ہی نہ رہے گا اور خود بخود حل ہوجائے گا . . . . چین میں اگرچہ کوئی بڑا زمیندار نہیں ہے مگر اکثر کسان زمین کے مالک بھی نہیں . . . . حال کی تحقیقات سے ہم نے یہ معلوم کرلیا ہے کہ کسان سالانہ جتنے غلے پیدا کرتے ہیں ان کا نصف سے زیادہ زمینداروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور خود ان کو جو ملتا ہے وہ بچ ہے ان وجوہ سے کسانوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ وہ کھیتی باڑی کریں اور زمین جوتیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر زمینیں بیکار پڑی ہوئی ہیں۔

زمین کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے طریقے :

۱۔ جدید آلات . . . . . مشین سے زمین جوتنا۔ اس سے پیداوار میں دوگنا اضافہ

ہوگا اور خرچ میں دس گنی یا اس سے زیادہ کی تخفیف ہو گی۔

۲۔ کھاد . . . . کیمیاوی ترکیب سے کھاد بنانا۔ زراعت میں بجلی سے کام لینا، پانی سے بجلی پیدا کرنا وغیرہ۔

۳۔ بیج کی تبدیلی . . . . بیج تبدیل ہونے سے زمین کی تجدید ہوتی ہے۔ اس کی قوت پیدائش بڑھتی ہے اور عمدہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

۴۔ مضر چیزوں کا انسداد . . . . . . (الف) مضرات نباتات کا جدید طریقے سے استیصال کرنا (ب) نقصان رساں کیڑوں کو دیسی ترکیبوں سے مارنا۔

۵۔ تحفظ . . . . (الف) دیسی ترکیب سے (۱) سوکھا رکھنے سے (۲) نمکین بنا کر (ب) بدیسی ترکیب سے کھانے کی چیزوں کو ابال کر یا پکا کر ٹین میں محفوظ کرنا۔

۶۔ تعمیر ذرائع نقل و حمل . . . . ذرائع نقل و حمل کی کمی کی وجہ سے چین کو خواہ مخواہ آمدنی میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ ایک نامعلوم نقصان ہے اور اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں جہاں جہاں غلے ضرورت سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں وہاں فاضل غلے کو کام میں نہیں لا سکتے۔ مجبوراً وہ سڑ جاتے ہیں یا ان کو جلانا پڑتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسان تو غریب ہی لوگ ہیں۔ ان کے پاس اتنی قوت نہیں کہ ذاتی اخراجات سے فاضل غلے کو ان مقامات پر پہنچا سکیں جہاں غلے کی کمی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک طرف تو ارزانی رہتی ہے اور دوسری طرف قحط سے لوگ مرتے ہیں۔ اگر ذرائع نقل و حمل کافی ہوں تو ایسی حالت ہرگز پیش نہ آئے۔ ان وجوہ سے ذرائع نقل و حمل کی تعمیر میں ایک لمحے کے لئے تاخیر نہ ہونی چاہئے۔ ذرائع نقل و حمل کی تعمیر کرنے میں ان چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۱) دریائی راستے . . . ’’تعمیر جدید چین‘‘[1] کے تعمیری پروگرام کے مطابق جو دریا موجود ہیں

---

(۱) ایک کتاب کا نام ہے جو ڈاکٹر سن یٹ سین کی لکھی ہوئی ہے اور جس میں جدید چین کے تعمیری کاموں کی ایک پوری اسکیم درج ہے۔

ان کو درست کیا جائے اور گہرائی کھودی جائے۔ جہاں جہاں نہریں کھودی جانے کا امکان ہے کھودی جائیں۔ سمندر میں جو ذرائع نقل وحمل ہیں وہ جہاز ہیں۔ اس کی ضرورت یہ ہو کہ جہاز کی کمپنی اعلیٰ پیمانہ پر قائم کی جائے۔

(۲) خشکی کے راستے . . . . (الف) ریلوے۔ ایک ضلع دوسرے ضلع کے ساتھ ملادیا جائے جس سے غلہ اور پیداوار کا لانا اور لیجانا آسان ہو۔ (ب) موٹر کی سڑک۔ بعض دیہات میں جہاں ریل کا جانا مشکل ہے وہاں موٹر کی سڑک تعمیر کی جائے جو ریل کی کمی کی تلافی کر سکے (ج) قلی۔ بارکش مزدور اگرچہ مزید خرچ کا سبب ہے مگر جہاں موٹر نہ جاسکتی ہو، وہاں اس سے مجبوراً کام لینا پڑتا ہے۔

۷۔ آفتوں کا انسداد . . . . (الف) دریائی راستوں کا درست کرنا دونوں کناروں پر دیواریں تعمیر کرنا تاکہ سیلاب سے محفوظ رہے (ب) خشک زمین میں انسداد قحط کی تدبیر کرنا۔

(۱) فوری ترکیب: مشین سے آب پاشی کرنا خصوصاً بلند علاقوں میں اس کی سخت ضرورت ہے۔

(۲) دائمی ترکیب۔ کثرت سے درخت لگانا۔ جنگل کی درستی کرنا جس میں عناصر آب کے اجتماع کی کافی گنجائش ہو۔

روٹی میں تناسب کی ضرورت :۔

مکمل طور پر معیشت کا سوال حل کرنے میں ہم کو نہ صرف پیداوار کا سوال حل کرنا ہے، بلکہ مسئلہ تناسب کی طرف بھی توجہ کرنی ہوگی۔ منصفانہ تناسب کا نظام ذاتی سرمایہ کے ماتحت قائم کرنا مشکل ہو۔ . . . . . غلے کی پیداوار سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ روپیہ کمایا جائے . . . . جب تک افراد میں روپیہ کمانے کی خواہش باقی ہے تب تک ملک میں قحط اور روٹی کی کمی لازمی ہے۔ سرمایہ دار لوگ تو خوب اپنا پیٹ سیر کرتے ہیں۔ مگر ان کو غریبوں اور مصیبت زدوں سے کیا واسطہ۔ تناسب کی طرف توجہ کرنے سے ہمارا یہ مطلب ہو کہ سب کو یکساں کھانا مل جائے اور ملک میں جو غلہ اور دوسری قسم کی پیداوار ہوتی ہیں، سب کی سب جمع کر کے مشترک طور پر خرچ کی جائیں۔ اس منزل مقصود

پر پہنچنے کے لئے ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ہر سال کا جو فاضل غلہ اور پیداوار ہے اس کو جمع کر کے جمہوری خزانے میں محفوظ رکھیں اور ایک دانہ غیر ممالک نہ جانے دیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس طریقہ سے جب تک چینی باشندے کو کافی روٹی نہ مل جائے ، اُس وقت تک غیر ممالک میں غلہ لیجانے کی اجازت نہ دی جائے کہ اس سے قوم کی تباہی ہوتی ہے ۔

اصولاً معیشت اور سرمایہ داری کا اختلاف :

اصولی طور پر معیشت اور سرمایہ داری میں جو اختلاف ہے وہ یہ کہ سرمایہ داری کا مقصد ذات کے لئے روپیہ جمع کرنا ہے ۔ اور معیشت کا مقصد عوام کے لئے کھانا فراہم کرنا ہے یہ ایک نیک مقصد ہے جس پر ہماری معیشت مبنی ہے ۔ پرانا سرمایہ داری کا نظام ٹوٹ سکتا ہے لیکن اس وقت ہم کو اپنے اصول سے روٹی کا سوال کرنا ہے اگر سرمایہ داری کے نظام کو توڑے بغیر ہم اپنے سوال کو حل کر سکتے ہیں تو ہم اس کو کیوں نہ باقی رکھیں ۔ اس میں کچھ ترمیم و اصلاح کر کے اپنے کام چلائیں ۔ کیونکہ اکبارگی اس کو توڑ دینا نہایت مشکل ہے ۔

معیشت کے لوازمات :

ہمارے مطالعہ کے مطابق معیشت کے لوازمات میں چار چیزیں شامل ہیں ۔ یعنی کھانا ۔ رہنا پہننا اور چلنا ۔ ہم کو اصول ثلثہ سے جدید چین تعمیر کرنا ہے ۔ اس کی غایت یہ ہوگی کہ عوام کو ان چار چیزوں کی فکر نہ ہوگی ۔ اس کے تمام فرائض اور ذمہ داریاں سب کی سب حکومت کی گردن پر ہوں گی ۔ اگر حکومت نے حسب منشار عوام کے لئے ان چار چیزوں کو فراہم نہ کیا تو عوام اس سے مطالبہ کر سکتے ہیں ۔

مسئلہ پوشاک :

انسانی زندگی کے نشوونما کی کیفیت ـــــ انسانی زندگی کی کیفیت تہذیب و تمدن کے لحاظ سے تین درجے میں تقسیم کی جاسکتی ہے ۔ پہلا یہ کہ انسان کی زندگی کے لئے ضروریات مہیا ہوں ورنہ اس کا زندہ رہنا محال ہے اور اگر اس کو ضروریات ناکافی ملیں تو اس کی زندگی غیر مطمئن

زندگی ہوگی۔ یعنی نہ زندہ انسان کی طرح رہ سکتا ہے اور نہ مردہ انسان کی طرح آرام لے سکتا ہے۔ اسی واسطے انسان اپنی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جب حضرت انسان کو ضروریات مل گئیں تو وہ دوسرے درجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں یعنی ان کو آرام و راحت کی خواہش ہوتی ہے۔ اس وقت اگرچہ وہ اپنے کھانے اور پینے سے بے فکر رہتے ہیں مگر ان کو آسائش کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ آرام و راحت مل جانے کے بعد ان کو ایک اور خیال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ نہایت شان و شوکت اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔ اس وقت ان کو رقص و سرود اور شراب و کباب اور دیگر نفیس اور قیمتی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کو ایک باثروت آدمی اپنی عزت اور آبرو سمجھتا ہے۔

پوشاک کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے شروع زمانہ میں لوگ اس پر قانع تھے کہ گرمی میں ان کو ٹھنڈے کپڑے اور سردی میں گرم کپڑے مل جائیں۔ جب گرمی میں ٹھنڈے اور سردی میں گرم کپڑے ان کو میسر ہو گئے تو وہ پھر کپڑوں کی باریکی، نرمی، نفاست اور خوشنمائی پر توجہ کرنے لگتے ہیں۔ جب ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی تو گرمی میں کیسے کیسے پائدار ریشم اور کس کس وضع کے سن کے کپڑے جو نزاکت و لطافت کے لحاظ سے فن دستکاری اور صنعت کے انتہائی کمال کا نمونہ ہیں، انتخاب کرنے لگتے ہیں اور جاڑے میں کیا کیا باریک اون کے کپڑے اور کیسی کیسی نفیس کھال جو قیمت کے لحاظ سے نہایت گراں اور وزن کے لحاظ سے بہت ہلکی ہیں، پسند کرنے لگتے ہیں، یہ ہیں پوشاک کے متعلق حضرت انسان کے کارنامے۔

کھانے کے متعلق بھی وہی کیفیت ہے جو پوشاک کے متعلق انسان نے پیدا کر رکھی ہے۔ شروع میں لوگ صرف دال روٹی کے طالب تھے۔ جب دال روٹی سے سیر ہو گئے تو گوشت مچھلی، انڈے مرغی وغیرہ کھانے میں داخل کرنے گئے اور جب یہ سب مہیا ہو گئے تو مٹھائی، ٹین کے میوے، مربے، اچار اور بہت سے لوازمات شامل کرنے کی ضرورت ہوئی۔ بلکہ مختلف چیزوں کی چکھنے اور جدید چیزوں سے لطف اٹھانے اور قیمتی چیزوں کے کھانے کے شائق ہو گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ سوائے فضول خرچی، عیاشی اور بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہم کو اس وقت معیشت کا سوال حل کرنا

نہ اس لئے ہے کہ لوگوں کو فضول خرچی اور عیاشی کی زندگی بسر کرنے دیں اور نہ اس لئے ہے کہ آرام اور عیش کی زندگی لوگوں کو بہم پہنچائیں۔ بلکہ اس لئے ہے کہ ضرورت کی زندگی لوگوں کے لئے فراہم کر دیا تاکہ ہمارے چالیس کروڑ باشندوں کو اپنی زندگی کی ضروریات مل سکیں اور ان کے لوازمات پورے ہو سکیں۔

پوشاک کے اصلی سامان:

پوشاک کے مسئلے پر غور کرنے میں اس بات کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے کہ وہ کن چیزوں سے بنائی جاتی ہے۔ اور ان چیزوں کے اجزا کیا ہیں؟ پوشاک کے اصلی اور اہم سامان حیوانات اور نباتات سے فراہم کئے جاتے ہیں حیوانات اور نباتات سے پوشاک کے سامان جو فراہم کئے جاتے ہیں، وہ چار قسم کے ہیں۔ دو قسم کے سامان حیوانات سے اخذ کئے جاتے ہیں اور دو قسم کے نباتات سے۔ حیوانات سے۔ اون اور سمور حاصل ہوتا ہے۔ ریشم ایک قسم کے کیڑے سے حاصل ہوتا ہے۔ سن اور روئی نباتات سے۔ اون و سمور۔ ریشم۔ سن اور روئی یہ چار چیزیں پوشاک کے اصلی متاع اور سامان ہیں۔

چین کا ریشم:

چینی ریشم کو بین الاقوامی بازار میں غیر ملک کے ریشم سے شکست ہوتی ہے۔ اس کی صنعت اتنی اچھی نہیں جتنی کہ غیر ممالک کی۔ قیمت بھی اتنی بلند نہیں جتنی کہ اوروں کی اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر باشندگان چین غیر ممالک کے بنائے کپڑے اور سوٹ پسند کرتے ہیں اور ان کو لے کر اپنی ضروریات کو پوری کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ہم اپنی صنعت کی طرف سے غافل ہوتے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہم نہ صرف ریشم کی صنعت کو ترقی نہیں دے سکتے۔ بلکہ دیسی ریشم کے استعمال کرنے سے بھی نفرت ظاہر کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی دیسی دستکاری کو ترقی دیتے اور انکی اشاعت کرتے، بدیسی صنعت کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کی ترقی و اشاعت کرنے میں ہم خود اپنے آپ کو رضا کاروں کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں . . . . چینی ریشم کی صنعت کی ترقی میں دوسری جو رکاوٹ ہے وہ یہ ہے کہ تیاری کے طریقے اچھے نہیں۔ ریشم کے کیڑوں کو جس طریقے سے پالتے ہیں وہ اچھے طریقے نہیں ہیں۔

کیڑے اکثر بیمار ہوتے ہیں۔ ان بیمار کیڑوں سے جو مواد اخذ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے وہ کمزور اور بے رونق ہوگا۔ ریشمی کپڑے کی بناوٹ بھی نہایت خراب ہوتی ہے۔ تار اکثر ٹوٹ جاتے ہیں جس سے کپڑوں میں بھدے نظر آتے ہیں۔ جدید آلات سے ہم کام نہیں لیتے ...... دیہاتی لوگ قدیم روایات کے پیرو ہیں۔ جدید طریقہ سے ان کو کیا واسطہ۔ اور خصوصاً اس زمانے میں جب کہ ابھی تک ریشمی کیڑوں کی تربیت کے لئے کوئی خاص تربیت گاہ بھی نہیں کھولی گئی ہو، جس سے ہم ریشم کے کیڑوں کو عمدہ طور پر تربیت کر سکیں اور ریشم کے مواد کی اصلاح کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بجائے ترقی کے، ریشم کی صنعت روز بروز تنزل کی طرف چلی جا رہی ہے۔ چینی باشندوں کی اپنی دستکاری کو نہ استعمال کرنے اور بین الاقوامی بازار میں مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے، نہ صرف مالگذاری کی ایک آمدنی کا ذریعہ کم ہو گیا ہے۔ بلکہ ان چیزوں کے عوض میں، جن میں ہم بالفعل غیر ممالک کے محتاج ہیں۔ کوئی چیز ان کو نہیں بھیج سکتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چین یا تو غیروں کا مقروض بن جائے۔ یا ہلاک ہو جائے۔ ان وجوہ سے پوشاک کا سوال حل کرنے میں ہم کو نہ صرف اصلی صنعت کو ترقی دینا، عمدہ بنانا اور جدید طریقے سے تیار کرنا ہے۔ بلکہ ریشم کے کیڑے کی تربیت، ریشم نکالنے کی ترکیب اور بناوٹ کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کرنا ہے اور جدید اصول پر مشین سے ریشم کے کپڑے تیار کرنا ہے۔ مشین سے جو کپڑے تیار ہوں گے وہ ہاتھ کے تیار کئے ہوئے کپڑوں سے زیادہ مضبوط اور خوشنما ہوں گے۔ جس کی وجہ سے ہم بھی ان کو پسند کریں گے اور غیر بھی اس کے شائق ہوں گے۔ جب دیسی ریشم ملکی ضروریات کو پورا کرے گا تو درآمد سامان میں ضرور تخفیف ہوگی۔ مالگذاری کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور ان چیزوں کے عوض میں جن میں ہم غیر ممالک کے محتاج ہیں، ریشم دیا جا سکے گا۔

سن کی اصلاح :

سن کی صنعت میں ہمیں اصولاً کھیتی کی طرف توجہ کرنا پڑیگی۔ کس طرح سن لگانا چاہئے، کس طرح کھاد سن کے لئے مفید ہے۔ اور کس طرح سن کا تاگا اور سوت بنانا چاہئے۔ ان سب چیزوں کی پوری تحقیق کے بعد ایک خاص سکیم تیار ہو سکے گی۔ اس اسکیم کے ماتحت عمل کرنے سے ہماری سن

کی صنعت کی ترقی ہوگی۔ نئی سکیم کے مطابق جو چیزیں تیار ہوں گی وہ زیادہ جاذبِ نظر اور فائدہ مند ہونگی۔ ہاتھ سے سن کے سوت بنانا اور تاگا نکالنا نہ صرف تضیع اوقات ہے بلکہ تضیع سرمایہ بھی ہے ہاتھ سے جو چیزیں تیار ہوں گی وہ ادنیٰ ہی ہوں گی اور لوگ اس کو پسند نہ کریں گے۔ راس المال بھی زیادہ لگے گا۔ داموں میں کم ہونگی۔ اس واسطے سن کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے ایک پوری سکیم کی ضرورت ہو۔ اس سکیم میں وہ تمام باتیں جو کہ سن کی کاشت سے لے کر کپڑے تیار کرنے تک ہوں۔ شامل کرنی چاہئیں۔ اس کے متعلق ہر ایک قدم پر جدید اصول سے کام لینا ہوگا۔ ہر ایک بات میں تخفیف کرنی ہوگی اس طریقہ سے ہم سن کی صنعت کو ترقی دے سکتے ہیں۔ اور اس سے ملک اور عوام کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

روئی کی دستکاری:

بدیسی کپڑے، بناوٹ کے لحاظ سے چین کے دیسی کپڑوں سے اچھے ہیں۔ قیمت بھی معقول یہی وجہ ہو کہ اہل چین خود بدیسی کپڑوں کو پسند کرتے ہیں اور دیسی کپڑوں کو چھوڑنے پر آمادہ ہیں جس سے دیسی کپڑوں کے بازار پر بدیسی کپڑوں نے آکر قبضہ کر لیا ہے . . . . . چین میں کپڑوں کی جتنی ملیں ہیں۔ ان میں معمولی سے معمولی کارخانے بھی کپڑوں کے تیار کرنے میں بدیسی سوت کو ترجیح دیتے ہیں اور دیسی سوت ان کو پسند نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ چین میں روئی کی دستکاری اصلو غیر ممالک کے ہاتھ میں ہے چین میں جتنی روئی پیدا ہوتی ہے اور ان سے جتنا کچھ سامان تیار کیا جا سکتا ہے۔ اہل چین خود اُن سے کام نہیں لیتے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ غیر ممالک میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں کپڑے یا سوت تیار کرنے کے بعد پھر بے وقوف چینی ان کو بڑی گراں قیمت پر واپس خرید لیتے ہیں . . . . چین کا روپیہ پانی کی طرح غیر ممالک کی طرف بہتا جاتا ہے جس سے اہل چین کی معاشی زندگی تلخ اور برباد ہوگئی ہے . . . . آج کل اہل چین کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے نالائق وارث ہیں، عزت فروش ہیں اور ذلت و رسوائی کے سزاوار ہیں وہ نہ صرف اپنے ملک، اپنے آباؤ اجداد اور اپنی قوم و وطن سے دغا کرتے

ہیں، بلکہ انھوں نے اپنے شعور، اپنے ضمیر، اپنے ایمان، اور اپنے اصول کو دھوکا دیا ہے۔ وہ فطرت اور انسانیت کے اخلاقی مجرم ہیں۔ وہ نہ تو خود اپنے کھانے پینے کے لئے کچھ کماتے ہیں جس سے ان کی زندگی درست ہو اور نہ اپنے آبا و اجداد کے متروکہ کی حفاظت کرتے ہیں جس سے ان کی زندگی قائم رہے۔ ایسی قوم اور ایسے انسانوں کو دنیا میں رہنے کا کیا حق ہے! جب دیکھتے ہیں کہ اُن کے پاس کھانے کو نہیں ہے اور نہ پینے کو ہے تو اپنے آبا و اجداد کے زیورات اور جواہرات معمولی داموں پر غیروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور ان داموں پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہ آرام کی زندگی بسر کریں گے! چین پر جو معاشی دباؤ پڑتا ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کس قدر گراں ہے! منجملہ اور دباؤوں کے روئی کی دستکاری کے پست ہونے کی وجہ سے بدیسی کپڑے کا کثرت سے درآمد ہونا بھی بذات خود ایک بڑا دباؤ ہے ..... درآمد برآمد کے مقابلے میں تیس کروڑ ٹل (پچاس کروڑ روپیہ کے قریب) زیادہ ہوتا ہے۔ درآمد جو اہم چیز ہے وہ بدیسی کپڑا ہے۔ اس واسطے درآمد سے جو نقصان چین کو پہنچتا ہے وہ روئی کی دستکاری کی پستی کی وجہ سے ہے ...... مطلب یہ ہے کہ سالانہ ہر ایک چینی کو غیر ممالک کو ایک روپیہ چار آنے کپڑے کا محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔

سوال پوشاک کا حل:

اگر ہم معاشی حیثیت سے پوشاک کا سوال حل کریں تو بہت مشکل ہے۔ اسی مسئلہ کے متعلق ہمیں سیاست کی طرف توجہ کرنی ہوگی۔ غیر مساوی معاہدوں کو منسوخ کرنا ہوگا۔ کسٹم ہاؤس کا انتظام غیروں کے ہاتھ سے واپس لینا ہوگا۔ امتیازی حقوق کو مٹانا ہوگا جب ہم بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ پر پہنچ جائیں کہ ہم خود اپنے گھر کے معاملے میں جو جی چاہے طے کر سکیں۔ تو ہم کو اختیار ہے کہ کسٹم ڈیوٹی میں اضافہ کریں جس سے ہم بدیسی مال کی حفاظت اور بدیسی مال کا سدباب کر سکیں یہ ایک اصلی ترکیب ہے۔ دیسی دستکاری کو ترقی دینے کی ..... پوشاک کا سوال حل کرنے میں ہمیں دیسی کپڑا پہنا ہوگا۔ اور بدیسی مال چھوڑنا پڑے گا۔ اس مقصد

میں کامیابی کی شرط یہ ہے کہ ہماری پشت پر سیاسی قوت ہو۔ اس وقت ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ تمام باشندوں کی اجتماعی قوت سے ایک ایسا نظام قائم کریں جس سے ہمارے سیاسی حقوق سب کے سب واپس مل جائیں۔ حکومت کے سرمایہ سے روئی، ریشم، زراعت اور دستکاری کے کارخانے قائم کریں اور کسٹم ہاؤس واپس لے لیں۔ اس سے ہماری صنعت و دستکاری کا تحفظ اور اس کی ترقی ہوگی۔ ان کے علاوہ برآمد کے سامان خام پر اور درآمد کے تیار شدہ سامان پر بھاری محصول عائد کریں[1]۔ اس طریقہ سے ہم دیسی دستکاری کو ترقی دیں اس کی ترقی میں مسئلہ پوشاک کا حل ہے۔

پوشاک اور معیشت:

اصول معیشت پر کاربند ہونے کے لئے یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ پوشاک سے انسان کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے تین فائدے ہیں ۱۔ حفاظت جسم۔ ۲۔ تزئین۔ ۳۔ آرام۔ تزئین اور آرام کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں ملک کے ہر گوشے میں درزی خانے قائم کرنے ہوں گے۔ باشندوں کی حالت اور موسم کی کیفیت کی بنا پر قومی درزی خانوں میں ضروری لباس تیار کئے جائیں گے اور ان کو لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح کہ لوگوں کو یہ شکایت نہ ہونے پائے گی کہ کسی کو کم ملا اور کسی کو زیادہ . . . .

ہم کو مجبوراً اس مضمون کو نامکمل چھوڑنا پڑا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر سن یٹ سین قبل اس کے کہ وہ معیشت کے لکچروں کا سلسلہ ختم کریں جو کہ چھ لکچروں پر مشتمل ہے (قومیت اور جمہوریت، ہر ایک کے متعلق چھ چھ لکچر ہیں) چوتھے لکچر کے بعد بیمار ہوگئے اور اسی بیماری میں ان کو اس دار فانی سے رخصت ہونا پڑا۔ اس کے بعد نہ ان کے جانشین نے ان کو پورا کیا اور نہ کسی اور عالم نے۔ لہٰذا ہم کو بھی وہیں اپنے قلم کو روکنا پڑا جہاں پر انھوں نے چھوڑا تھا۔

---

(۱) ریوٹر کی خبر سے معلوم ہوا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۳۱ء سے حکومت نانکینگ نے نئے محصول کا ایک اعلان کیا ہے۔ جس سے درآمد مال پر مزید ڈیوٹی قائم کی گئی ہے۔

یہ تین مضامین جو کہ رسالہ جامعہ میں شائع کئے گئے ہیں، ڈاکٹر سن یت سین کے اصول ثلثہ سے کچھ اقتباسات ہیں۔ اگر ناظرین ان کے متعلق اور مزید حالات معلوم کرنا چاہتے ہوں، تو انشاءاللہ کچھ عرصہ کے بعد ہم اُن تین اصولوں کو جو کہ چینی زبان میں مفصل ہیں پورے کے پورے پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اُن سے چین کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر مزید روشنی پڑے گی اور یہ بھی اہل ہند پر بالکل صاف اور واضح ہو جائے گا کہ چین میں خانہ جنگی برابر کیوں ہوتی ہے اور بین الاقوامی سیاست میں چین کیوں پیچھے ہے۔ نیز یہ بھی کہ چین کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے کیا واقعی ان اصول ثلثہ پر عمل کرنا کافی ہے؟

غزل

از حضرت ثاقب لکھنوی

سچ ہے کہ خواب دیکھتا ہوں قید خانے میں — سناٹا میرے دل کی طرح ہے زمانے میں

دم گھٹ رہا ہے آپ سے آپ آشیانے میں — اچھی نہیں چمن کی ہوا اس زمانے میں

خونباریوں کا مجھ کو صلہ مل گیا کہ آج — کچھ رنگ بڑھ گیا مرے دل کے فسانے میں

پہلے تو آہ سرد سے آتا تھا دل کو چین — اب کیا کروں کہ آگ لگی ہے زمانے میں

دیکھی سوائے شام غلامی نہ صبح عیش — آزادیاں تمام ہوئیں قید خانے میں

کام آئیں دل کے بھی یہ تلون مزاجیاں — میرے بھی دن پھریں کبھی تیرے زمانے میں

گلچین و باغباں کی نظر ہے اسی طرف — کچھ میرے بعد بھی ہے میرے آشیانے میں

کیوں میرے داغ دل کی ہے دشمن ہوا ہوئے — ایسے چراغ بجھ نہیں سکتے زمانے میں

جس میں بھرا ہوا ہے مری زندگی کا حال — دنیا کو نیند آتی ہے اب اس فسانے میں

مدت ہوئی کہ موت نے آکر چھڑا دیا ۔۔۔ اب کون ڈھونڈتا تھا مجھے قید خانے میں

برسوں نہ سوئے بعد مرے ساکنانِ دہر ۔۔۔ آوازِ نالہ گونج رہی تھی زمانے میں

جب میں نہیں تو باغ میں اُسکا مقام کیوں ۔۔۔ اچھا ہوا کہ لگ گئی آگ آشیانے میں

اے قصہ گوئی بزم مری داستان چھیڑ ۔۔۔ نیند آچلی ہے اُن کو کسی فسانے میں

ہجراں کشیدہ ہوں مجھے کیا کام دہر سے ۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ دن نہیں ہوتا زمانے میں

صد چاک دل رہا نہ ہوا دامِ زلف سے ۔۔۔ زلفیں نکل نکل گئیں آ آ کے شانے میں

کیا پڑھ رہے ہیں دور سے اصحابِ اعتبار ۔۔۔ میری جبیں یہ ہے کہ ترے آستانے میں

بس اے شبِ فراق نہ دے ذکرِ غم کو طول ۔۔۔ کیا اور کوئی رات نہ ہوگی زمانے میں

مُسکت ہر ایک حرف تھا دلکش ہر اک بیاں ۔۔۔ کیوں بولتا کوئی مرا قصہ سنانے میں

جو کھو چکا ہوں عالمِ ہستی میں آکے میں ۔۔۔ جھک جھک کے ڈھونڈتا ہوں اُسی کو زمانے میں

چُپ شب کے پاسباں بھی ہیں اور رات بھی ۔۔۔ کوئی نہ کوئی محو ہے میری فسانے میں

رنگِ ملال و عیش ہو ثاقب کہ شام و صبح
وہ سب ہی میرے دل میں جو کچھ ہے زمانے میں

شذرات

موسم گرما کی تعطیلات کے سلسلہ میں ۱۵ رمئی سے جامعہ دو ماہ کے لئے بند کر دی گئی ہے۔ تمام طلبہ اور اساتذہ اپنے وطن یا سیر و سیاحت کی غرض سے مختلف مقامات کو چلے گئے ہیں۔

شکر ہے کہ جامعہ کا یہ سال باوجود چند در چند مشکلات اور آزمائشوں کے (جن کا تذکرہ ایک سے زائد بار انہیں صفحات میں کیا جا چکا ہے) ہر حیثیت سے کامیاب رہا۔

آئندہ کے لئے چھٹیاں شروع ہونے سے قبل ہی تعلیم و تربیت نیز دیگر امور سے متعلق بہت سی مفید تجویزوں اور نئی نئی اسکیموں پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کارکنوں کی ہمتوں میں ابھی سے تازگی اور جوش عمل میں سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جامعہ کے مقاصد کے لئے فال نیک ہے اور توفیق ایزدی شامل حال رہی اور ان مفید تجاویز اور جدید اسکیموں پر صحیح طور پر عمل کیا گیا (جس کا ہمیں یقین ہے) تو انشاء اللہ ترقی کی طرف یہ ایک نیا اور شاندار قدم ہوگا۔

اس کے علاوہ تمام ماتحت شعبوں میں خواہ ان کا تعلق تعلیم سے ہو یا تجارت سے ضروری اور مفید اصلاحات کی گئی ہیں اور جہاں تک جامعہ پریس کا تعلق ہے ان اصلاحات پر نہ صرف عمل شروع کر دیا گیا ہے بلکہ اس کے خوشگوار نتائج بھی ظہور میں آنے لگے ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ اطلاع بھی ضروری ہے کہ جامعہ کی تعلیم کو ارزاں تر بنانے کے لئے تعلیم اور بورڈنگ کی فیس میں معقول تخفیف کر دی گئی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

فیس تعلیم و دار الاقامہ سال گزشتہ		تخفیف شدہ فیس	
مکتب تا ابتدائی سوم	لعہ/	ابتدائی	عہ/
ابتدائی چہارم تا ششم	معہ/	ثانوی اول تا سوم	عہ/
ثانوی اول تا سوم	عنہ/	ثانوی چہارم تا سندی	معہ/
ثانوی چہارم تا سندی	لعنہ/		

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہو کہ دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں ہمارے یہاں کے اخراجات پہلے ہی بہت کم تھے اب اس موجودہ تخفیف کا مقصد یہ ہے کہ وہ طلبہ بھی جو مالی دقتوں کے باعث ہمارے یہاں تعلیم حاصل کرنے سے مجبور و معذور ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔

جامعہ کے اکثر اساتذہ و طلبہ نے طے کیا ہے کہ اس مرتبہ دو مہینے کی چھٹیاں مفید طریقہ پر گزاری جائیں اور سب سے مفید طریقہ اس موقع پر مختلف مقامات کی سیر و سیاحت ہو جس سے تندرستی وصحت میں ترقی اور اضافہ معلومات کے علاوہ دوسرے گوناگوں فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ طلبہ کی ایک جماعت جناب حامد علی خاں صاحب بی اے (جامعہ) کی نگرانی میں سائکلوں پر کشمیر کے سفر کے لئے روانہ ہو چکی ہے اور تقریباً نصف منزل طے کر چکی ہے۔ یہ لوگ پوری چھٹیاں اسی سفر میں گزاریں گے۔

اساتذہ اور طلبہ کی ایک اور جماعت مولانا شفیق الرحمٰن صاحب بی اے (جامعہ) کی سرکردگی میں کشمیر کی سیاحت کے لئے روانہ ہو گئی ہے۔ یہ حضرات جموں تک ریل میں اور وہاں سے پیدل سفر کریں گے۔ انھوں نے سیر و سیاحت کے علاوہ یہ اہم مقصد بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے کہ وہاں کے باشندوں کی زبوں حالی کا بغور مطالعہ کریں اور ان کی ترقی کے عملی وسائل پر غور و فکر کریں۔

طلبہ کی ایک دوسری جماعت افغانستان کے دور دراز سفر کے لئے روانہ ہوئی ہے یہ بھی پوری چھٹیاں اسی سفر میں گزارے گی۔

مدرسہ تحتانیہ کے بعض اساتذہ تعلیم و تربیت سے متعلق مفید معلومات حاصل کرنے کے لئے پنجاب اور دوسرے صوبوں کے مدارس کا دورہ کریں گے۔

جامعہ کی طرف سے ان تمام جماعتوں کو بیش از بیش سہولتیں اور آسانیاں فراہم کی گئی ہیں توقع ہے کہ یہ تمام حضرات خیریت اور کامیابی کے ساتھ جامعہ واپس آئیں گے۔

صحت کی تیر بہدف گولیاں

OKASA

جرمنی کی جادو اثر طبی ایجاد

کون ہے جس نے تجدید کی شہرہ آفاق، ہر پروفیسران درناف اور اشٹنکاہ کی حیرت انگیز تدابیر جراحی کا حال نہ سنا ہو۔ صرف بعض غدودوں کے بدل دینے سے (بوڑھے سے بوڑھا آدمی تندرست جوان بن جاتا ہے) ان تدابیر پر دنیا ہنوز انگشت بدنداں تھی کہ جرمنی کے نامور ماہر طبیعات ڈاکٹر لاہوسین (ایم۔ ڈی) پروفیسر برلن یونیورسٹی نے اپنی اس دوا کے انکشاف سے ہل چل پیدا کر دی ہے۔ جو کثیر المصارف عمل جراحی کے عذاب اور خطرہ میں ڈالے بغیر از سر نو صحت کو بحال کر دیتی ہے۔

اس عظیم الشان انکشاف پر اوکاسا کمپنی (برلین) کو بین الاقوامی نمائش پیرس اور اطالوی نمائش (فلورنس) میں گرینڈ پرکس طلائی تمغے اور مشہور و معروف "کراس آف آنر" بطور سند ملی ہیں۔ اسناد کی نقلیں ہمارے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔ جھریاں اور سپید بال نیست نابود ہو جاتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اضمحلال چڑچڑا پن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے۔ اس سے پہلے، کہ بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے۔ یہ دوا ہر دوا فروش کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں

Sole Agency OKASA Co; Ltd; (Berlin)
22, Apollo Street, P.O. Box No. 396,
Bombay.

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے نا آشنا تھے۔ آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں، پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اس کو لیجانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گٹھیا، ورم۔ درد۔ پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بےمثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۸ دہلی

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

نمبر ۶	بابتہ ماہ جون ۱۹۳۱ء	جلد ۱۶

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا۔

مسلمانان چین

"کاش مسلمانان ہند کو خدا یہ توفیق دے کہ وہ چین کے مسلمانوں کے صحیح صحیح حالات بہم پہنچائیں اور روابط قائم کرنے کے لئے مناسب ذرائع اختیار کریں اور اپنی عالمگیر اخوت کا عملی ثبوت دیں"

یہ مولانا عثمان صاحب فارقلیط دہلوی کے اس مضمون کے آخری الفاظ ہیں جو انھوں نے اخبار الجمعیۃ دہلی ۱۳ر نومبر ۱۹۳۰ء میں "چین کے مسلمان - دنیائے اسلام کی ایک عظیم ترین اور فراموش شدہ برادری" کے عنوان سے لکھا ہے -

میں مولانا موصوف کا ممنون ہوں کہ انھوں نے انگریزی اور عربی کتب سے جو مواد مل سکے ان کو جمع کر کے چینی مسلمانوں کے کچھ حالات اہل ہند کے لئے بہم پہنچائے - مجھے اس سے مطلب نہیں کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط - اس سے بھی مطلب نہیں کہ چین میں مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ یا چار کروڑ یا ڈھائی کروڑ ہے اس سے بھی مطلب نہیں کہ فلاں مقام میں مسلمانوں کی اسقدر آبادی ہے اور فلاں صوبے میں اتنی مسجدیں بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ چینی مسلمانوں کی حالت آغاز عہد سے لے کر آج تک عالم اسلامی کے لئے ایک راز ہے جس کے انکشاف کے لئے اہل ہند بیتاب ہیں -

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانان چین کے حالات جو لکھے جاتے ہیں جاسوسی کے قصوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں - شروع شروع میں پڑھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ قصہ کے آخر میں کیا ہے - لوگ تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حیرت کی نظر سے پڑھتے ہیں - اور تجسس کے ارادے سے جلد جلد اس کے ورق الٹتے ہیں تاکہ آخر میں جا کر بھید ظاہر ہو جائے - مولانا عثمان کے ان آخری مذکورہ بالا الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہند مسلمانان چین کی حالت دریافت کرنے کے لئے بے تاب ہیں اور ان کی دلی تمنا یہ ہے

کہ کوئی معلوم یا نا معلوم۔ صحیح یا غیر صحیح طریقہ سے چینی مسلمانوں کے حالات کی اطلاع ان کو دے دے تاکہ ان کی تمنا پوری ہو جائے۔ اور وہ اپنے بھائی چینی مسلمانوں کی کیفیت معلوم کر کے لطف اندوز ہوں۔ اصلیت یہ ہے کہ مسلمانان چین کی حالت ایک ایسا معمہ ہے جس کا حل مشکل ہے کیونکہ چینی مسلمانوں کے تعلقات عالم اسلامی سے ہمیشہ سے منقطع رہے ہیں۔ اور دیگر ممالک کے مسلمان چینی نجاننے کی وجہ سے ان کے حالات سے باخبر نہ ہو سکے۔ اس لئے یہ راز اور زیادہ مخفی رہا۔

انگریز مصنفین اور بالخصوص مشنریز ان کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اپنے اندازہ اور خاص زاویہ نگاہ سے لکھتے ہیں۔ یہی حال فرنچ اور جرمن مصنفوں اور سیاحوں کا ہے خود ان کے بیانات چینی مسلمانوں کے متعلق اس قدر باہم مختلف ہیں کہ اہل اسلام یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہیں کہ کس کا بیان صحیح ہے اور کس کا غلط۔ اس لئے ان کی بے تابی اور بھی بڑھ گئی ہے کہ کسی معتبر اور صحیح ذریعہ سے چینی مسلمانوں کے حالات معلوم ہوں۔

میں کچھ تو مدیر صاحب رسالہ جامعہ کی فرمائش اور کچھ مسلمانان ہند کی اس تشنگی کو رفع کرنے کے لئے چینی مسلمانوں کے حالات کے متعلق یہ مختصر مضمون لکھتا ہوں۔ میں خود اگرچہ چین کا باشندہ ہوں لیکن کمسنی میں وطن کو چھوڑ کر تحصیل علم کے لئے ہندوستان آگیا۔ اس لئے مجھے یہ موقع نہ مل سکا کہ تفصیل کے ساتھ مسلمانان چین کے حالات اپنے ساتھ لے چلوں تاکہ اس کو اہل ہند کے سامنے پیش کر سکوں اور یہاں بالفعل میرے پاس وہ کتابیں موجود نہیں ہیں جو چینی مورخین نے چینی مسلمانوں کے متعلق اپنی زبان میں لکھی ہیں۔ ان وجوہ سے حالات لکھنے میں بہت بڑی مشکل ہے۔ لہذا اس وقت ان اخباروں اور رسالوں سے جو چین سے میرے پاس آتے ہیں کچھ حالات اخذ کر کے لکھتا ہوں۔ اس میں جو باتیں صحیح ہیں یا غلط ہیں ناظرین کو خود ان کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

کیونکہ میں نے محقق کی حیثیت سے ان بیانات کو قلمبند نہیں کیا ہے بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ چین میں تاریخ داخلہ سے آج تک کے مختصر حالات مسلمانوں کے لکھ دوں۔ ان سے اگرچہ چینی مسلمانوں کی حقیقی اور مفصل کیفیت نہیں معلوم ہو سکتی ہے لیکن تاہم ایک دھندلی سی تصویر ان کی اس میں نظر آجائے گی جس سے کچھ انکی حالت کا اندازہ ہو سکے گا۔

بدرالدین

چینی زبان میں مسلمانوں کی تاریخ :

اب تک چینی زبان میں بھی مسلمانان چین کی کوئی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی ہے۔ یوں تو بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جو کسی خاص واقعہ یا کسی خاص عہد سے تعلق رکھتی ہیں مگر نفس اسلام اور چین کے موضوع کو پیش نظر رکھ کر کسی نے اب تک مستقل کتاب نہیں تصنیف کی۔ چین کی عام تاریخوں سے بے شک وہاں کے مسلمانوں کی تاریخ بھی مرتب کی جا سکتی ہے لیکن اس کے لئے عہد تانگ سے لے کر آج تک جو ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کے لئے بڑی محنت اور بڑی مدت درکار ہے۔ کیونکہ ان میں کہیں کہیں جستہ جستہ ضمناً مسلمانوں کا ذکر ملے گا جن کو ایک ایک کر کے چننا پڑے گا۔

۱۹۲۶ء میں ایک چینی مورخ نے جو پیکن یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہے مسلمانان چین کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا اعلان کیا تھا جس کا خاکہ اس طرح تھا۔

مذہبی خیالات۔ شرعی احکام۔ اسلامی خاندان۔ ان کی مردم شماری۔ مساجد۔ آثار قدیمہ اسلامی۔ اسلامی علوم و فنون۔ اہم واقعات۔ چینی اور ہجری جنتری۔ عہد تانگ اور سونگ (۶۰۵ء تا ۱۲۷۹ء تک) مسلمانوں کی سفارتیں اور معاہدے۔ عہد یونگ و مینگ و چنگ (۱۲۷۵ء سے ۱۹۱۲ء تک) مسلمانوں کی خدمات اور سرکاری ملازمت میں حصے۔

مگر چونکہ مردم شماری اور مساجد کے متعلق تفصیل نہیں مرتب ہوئی تھی اس لئے کتاب مذکور اب تک شائع نہیں ہو سکی۔ ورنہ اس سے ہم کو مسلمانان چین کے متعلق بہت قیمتی حالات معلوم ہو جاتے جو بلحاظ

مغربی مصنفین کے مفصل بھی ہوتے اور صحیح بھی۔ کیونکہ جس طرح مسلمان تاریخ لکھتے ہیں واقعات کو زیادہ صحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اسی طرح چینی مورخ بھی ہمیشہ حقیقت کا متلاشی ہوتا ہے اور بلا شبہ وہ انگریز یا جرمن و فرینچ مورخین سے بہت زیادہ سچے اور حقیقی حالات پیش کرتا ہے چینی مورخ کی کتاب میں اگر کوئی واقعہ غلط ملے تو یہ یقین کرنے کے وجوہات ہیں کہ اس کی ناواقفی یا غلط فہمی سے یہ غلطی واقع ہوئی کیونکہ وہ عمداً جھوٹ نہیں لکھتا ہے۔

چینی مورخ کی اس کتاب کی بابت میں دریافت کرتا رہتا ہوں جوں ہی کہ وہ شائع ہوگی اسی وقت رسالہ جامعہ کے ذریعے سے برادران ہند کی خدمت میں اس کا ترجمہ پیش کروں گا۔ انشاءاللہ۔

چینی اور ہجری جنتری کا اختلاف:

چین میں مسلمانوں کی صحیح تاریخ داخلہ معلوم کرنے کے لئے ہم کو اس فرق کا سمجھنا ضروری ہے جو چینی اور ہجری کلینڈر (جنتری) کے درمیان ہے۔ گو کہ چینی اور ہجری سنہ دونوں قمری ہیں مگر اختلاف یہ ہو کہ سنہ ہجری میں بخلاف چینی کے کبیسہ نہیں نکالا جاتا۔ سنہ ہجری کا ایک سال تین سو چون یا تین سو پچپن دن کا ہوتا ہے۔ چینی جنتری میں ہر تیسرے سال ایک مہینہ بڑھا لیا جاتا ہے۔ اگر چینی جنتری سے سنہ ہجری کا مقابلہ کیا جائے تو ہر تیس سال کے بعد ایک سال کا فرق پڑ جاتا ہے۔ ہر سو سال میں تین سال اور ہر ہزار سال میں تیس سال کا۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے یا بعثت سے چینی جنتری کے مطابق آج تک کا حساب لگایا جائے تو سنہ ہجری سے بہت زیادہ فرق پڑ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض چینیوں نے اسلامی حالات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان میں تاریخوں کی غلطی نظر آتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے چینی اور ہجری جنتری کے اختلاف پر نظر نہیں ڈالی۔ مثلاً عہد سونگ (۹۶۰ سے ۱۱۹۰ء تک) میں رسالہ "کوی شنگ" اور عہد ٹینگ (۱۶۴۴ سے ۱۹۱۲ء تک) میں ممالک مغرب[1] کے مختصر

---

(۱) ازمنہ وسطیٰ میں چینی تاریخ کی کتابوں میں جہاں جہاں "ممالک مغرب" کا لفظ آیا ہے اس سے مراد وسط

حالات ،، اور موجودہ زمانے میں " رسوم چینی ترکستان ،، جن لوگوں نے لکھی ہیں انھوں نے سنہ ہجری کا ذکر کیا ہے مگر اس کو تین سو ساٹھ دن کا قرار دیا ہے۔ "حالات عرب ،، اور " معلومات چین ترکستان " میں تو ان کے مصنفوں نے سنہ ہجری کو تین سو چونسٹھ دن کا رکھ لیا ہے۔ چانگ چونگ کے " سفرنامہ ممالک مغرب ،، میں سنہ ہجری کے دسویں مہینے کی پہلی تاریخ کو جو عید الفطر کا دن ہے آغاز سال قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح چیوکری نے رسالہ " کوی ثنگ ،، میں ہجری سال کے بارہویں مہینے کی دسویں تاریخ کو جو بقرعید کا دن ہوتا ہے سال نو کی ابتدا سمجھا ہے۔ لی کوی ٹینگ نے " حالات مسلمان " میں ترفان کے عہد نامہ کی تاریخ جو ۱۰۶۶ھ میں ہوا تھا شاہ یون چی کے گیارہویں سال (۱۶۵۵ء) میں لکھا ہے۔ دوسری کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد نامہ شاہ کانگ شیسی کے بارہویں سال (۱۶۷۲ء) میں ہوا تھا۔

ان امور کے ذکر سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم بغیر ہجری اور چینی کلینڈروں کا فرق معلوم کئے ہوئے مسلمانوں کے چین میں داخل ہونے کی صحیح تاریخ متعین نہیں کر سکتے۔

مسلمانان چین کے متعلق وہاں کے اکثر لوگ یہی کہیں گے کہ وہ شاہ کائی وان کے انیسویں سال (۵۹۹ء) میں آئے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ چین تو کجا خود مدینہ شریف میں ہجرت نبوی یعنی اسلام کا داخلہ ۶۲۲ء میں ہوا ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ شاہ ہونگ او کے سترہویں سال (۱۳۸۵ء) جب چینی حکومت نے سنہ ہجری کا استعمال اختیار کیا ہے تو وہ ۷۸۶ھ تھا۔ عہد مینگ کے مورخ نے مسلمانوں کی تاریخ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴۱)

ایشیا۔ ہندوستان۔ ایران اور عرب ہے۔ چین کے مغرب میں بحر متوسط اور بحیرۂ قلزم تک جس قدر ممالک ہیں ان سب پر اس کا اطلاق ہوتا تھا اب البتہ ممالک مغرب کا لفظ یورپ کے لئے بولا جاتا ہے

داخلہ کا حساب لگانے کے لئے بجائے ہجری کے چینی جنتری کے حساب سے ۸۶، سال پیچھے کا اندازہ لگایا جس سے کائی وان کی حکومت کا انیسواں سال (۵۹۹ء) نکلا اور اس نے بھی لکھ دیا۔ اسی کلینڈروں کے فرق نے صحیح تاریخ داخلہ معلوم کرنے میں بڑی رکاوٹ پیدا کر رکھی ہے۔ امسال سنہ ۱۳۴۹ھ ہے اگر چینی جنتری کے حساب سے ۱۳۴۹ سال پیچھے کا اندازہ لگائیں تو یہ شاہ زی وہ کا دوسرا سال (۵۸۲ء) پڑتا ہے۔ اس طرح فرق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

چینی مسلمانوں کی تصنیفوں میں سے ایک مشہور کتاب جس کا نام "ہوئی ہوئی آن والہ (مسلمانوں کی آمد) ہے۔ اس میں درج ہے کہ جس سال مسلمان چین میں آئے وہ شاہ چینگ کونگ کا دوسرا سال تھا یعنی سنہ ۶۲۸ء بعض لوگوں نے اس کتاب کے بیانات کو غیر صحیح کہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی وہی حساب کی غلطی ہے۔ مصنف نے قصداً غلط تاریخ نہیں درج کی ہے۔ اس کتاب میں شاہ چینگ کونگ کا دوسرا سال جو لکھا گیا ہے وہ درحقیقت شاہ یون ہولا کا دوسرا سال تھا۔ یعنی سنہ ۶۵۱ء کیونکہ عہد ٹانگ کی دیگر تاریخی کتب سے یہ بات ثابت ہے کہ شاہ یون ہوئی کے دوسرے سال میں عربی وفد چین میں آیا تھا۔

اس زمانے میں چین میں یہ دستور تھا کہ غیر ملکوں سے جو سفیر آتے تھے وہ تانبے کی ایک جوڑ مچھلی لاتے تھے جن پر ان کے نام کندہ کر کے شاہی خزانے میں رکھ دئے جاتے تھے مگر جس ملک کا سفیر پہلی بار آتا تھا وہ اس دستور سے ناواقف ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب بھی اپنے ساتھ تانبے کی مچھلیاں نہیں لے گئے تھے۔ عہد ٹانگ کے مجالس نامہ میں اس بات کو خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

عہد ٹانگ کی تاریخ میں عربوں کی بابت جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ بات بھی مذکور ہوئی ہے کہ "شاہ یون ہوئی کے دوسرے سال ان کے سفیر آئے جن کا بیان یہ ہے کہ ان کی سلطنت ۳۴ سال سے قائم ہے اور اس وقت ان کا تیسرا بادشاہ تخت پر ہے۔"

ہجری اور چینی جنتریوں کے مقابلے سے ہم نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ یون ہوئی کا دوسرا سال سنہ ۶۵۱ء ہے۔ یہ سنہ ہجری کا انتیسواں سال پڑتا ہے جو عربی سفیر کے بیان سے ۳۴ سال اسلامی

حکومت کے قیام کو بتاتا ہے، مخالف ہو۔ عہد تانگ کے سفارت ناموں کے احوال میں لکھا ہے کہ عربوں کا سفیر شاہ یون ہوئی کے چھٹے سال میں آیا۔ یہ ۶۵۵ء کا سفیر تھا۔ مورخ سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اس کو ۶۵۱ء کا ذکر سمجھ لیا۔

۶۵۵ء ۳۴ ہجری پڑتا ہے جیسا کہ سفیر نے بیان کیا تھا اور یہ زمانہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کا ہے۔

الغرض عربوں کا پہلا وفد جو چین میں گیا وہ یون ہوئی کے دوسرے سال ۶۲۹ء میں گیا (۶۵۱ء) اب تک شہر کنٹن میں ابو وقاصؓ کا مقبرہ موجود ہے جس کو اہل چین پہلا عرب مسلمان سمجھتے ہیں جو ان کے ملک میں سفیر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس مقبرہ پر ایک کتبہ بھی ہے جس کے متعلق لوگ بیان کرتے ہیں کہ شاہ چینگ کونگ کے تیسرے سال ۶۲۹ء میں نصب کیا گیا۔ اس فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے جو چینی اور ہجری جنتری کے درمیان ہم نے بیان کیا ہے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تاریخ غلط ہے اور یہ کتبہ یون ہوئی کے تیسرے سال ۶۵۲ء میں نصب کیا گیا ہو۔

مسلمانوں کی رسوم اہل چین کی نظر میں :

چینی زبان کی کتابوں میں جس میں مسلمانوں کے صحیح اور سچے حالات درج ہیں وہ دو ہو تنگ کا روزنامچہ ہے دو ہو تنگ کا بیٹا دو وانگ شاہ ہیانگ پاؤ کے عہد میں ۷۵۱ء میں مغربی مہم پر جنرل کو ہیانگ تنگ کے ساتھ گیا تھا اور مغرب کے ممالک میں ۱۲ سال رہا تھا اس کے بعد بحری راستے سے کنٹن ہوتے ہوئے واپس آیا اور اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ آج کل یہ سفرنامہ نایاب ہے مگر بعض دوسری کتابوں میں اس کے بیانات منقول ہوئے ہیں انھیں میں سے چند فقرے یہاں لکھتا ہوں جس سے اہل ہند اندازہ لگا سکیں گے کہ ازمنہ متوسط میں اہل چین اسلام اور اسلامی رسوم کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

"مسلمانوں کا جو عبادت خانہ ہے اس میں ہزارہا آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ ہر جمعہ کو بادشاہ و خلیفہ نکل کر آتا ہے اور منبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھتا ہے۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی مشکل ہے۔ خدا کے عذاب سے نجات پانا آسان نہیں

زنا۔ ڈاکہ۔ چوری۔ غیبت۔ تہمت۔ اپنے لئے کسی غیر کو خطرہ میں ڈالنا۔ غریبوں اور بیکسوں پر ظلم کرنا یہ سب گناہ عظیم ہیں۔ مسلمان جو جہاد میں شہید ہوتا ہے اس کا صلہ جنت الفردوس ہے۔ ایک دشمن کے قتل کرنے کے عوض میں بے شمار ثواب ملے گا۔"

ممالک مغرب میں مختلف مذہب کے لوگ بستے ہیں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلمان بھی۔ مسلمان سور، کتا، گدھا، اور گھوڑے کا گوشت نہیں کھاتے۔ بادشاہ اور والدین کو عبادت کے قابل نہیں سمجھتے۔ مختلف دیوتاؤں کے قائل نہیں ہیں صرف ایک خدا کو مانتے ہیں۔ رسم یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن تعطیل مناتے ہیں۔ اس دن کاروبار بند رکھتے ہیں اور لین دین نہیں کرتے۔"

اسی قسم کے بیانات مسلمانوں کے متعلق عہد ٹانگ کی کتب میں بھی ملتے ہیں مگر وہ بہت واضح اور صاف نہیں ہیں۔ عہد سونگ کی کتابوں میں مسلمانوں کے متعلق بہت کچھ مواد مل سکتا ہے۔ اس عہد کے اکثر مورخین نے مسلمانوں کو دیوتا کے نام سے خطاب کیا ہے چاؤ جوخوی اپنی مکتوبات میں لکھتا ہے۔ "مچہ (مکہ) مسلمانوں کا اصلی سرچشمہ ہے وہاں ایک محل (کعبہ) ہے جو کئی رنگ کے پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ہر سال ایکبار وہاں بڑا مجمع ہوتا ہے۔ ممالک اسلامی کے بادشاہ وہاں آکر عبادت کرتے ہیں اور صدقہ اور خیرات دیتے ہیں۔ اس محل پر ایک قیمتی غلاف چڑھایا جاتا ہے۔" داستان لینگ چاؤ میں لکھا ہے کہ

"کنٹن میں اجنبی لوگ بہت ہیں۔ ان کے کھانے وہی ہیں جو ہم کھاتے ہیں لیکن سور کا گوشت ان کے نزدیک سخت ممنوع ہے۔ وہاں جتنے اجنبی ہیں سور کا گوشت بالکل نہیں کھاتے۔"

حکایات نانگ ہائی میں تحریر ہے کہ "کنٹن میں عربوں نے عہد ٹانگ میں ایک منار تعمیر کیا ہے جس کا نام ہے دی شینگ تھا۔ (منار یادگار نبی) اس کی بلندی ۱۶۰ فٹ ہے۔ صبح وہاں سے پکارنے کی آواز آتی ہے اور اس میں نعرے لگائے جاتے ہیں اس منارہ کے نیچے ان کا عبادت خانہ ہے۔"

تذکرہ انساں میں ہے۔

"مسلمانوں کے بادشاہ اور عوام سب صرف ایک معبود (اللہ) کو مانتے ہیں۔ ہر ہفتہ میں داڑھی کٹواتے۔ ناخون ترشواتے اور نہاتے ہیں۔ سال میں ایک مہینہ تک اپنی مقدس کتاب کی تلاوت کرتے اور روزانہ پانچ دفعہ عبادت کرتے ہیں"

تاریخ یوکان میں یہ بیان ہے:

"فان یونگ میں دریائی مسافروں نے آکر سکونت اختیار کرلی ہے۔ دیوتا (معبود) کو پوجنے کے لئے ہاتھ پاؤں دھوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ صفیں باندھ کر عبادت کرتے ہیں۔ ان کا اپنا الگ عبادت خانہ ہے۔ طرز عبادت چینیوں سے ملتا جلتا ہے۔ مگر ان کے سامنے کوئی تراشی ہوئی مورت نہیں ہوتی۔ وہ آیا آیا (اللہ۔ اللہ) پکارتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ عبادت خانہ پر لمبے لمبے کتبے ہیں جن میں عجیب زبان لکھی ہوئی ہے۔ کوئی چاقو کوئی قینچی کی صورت نظر آتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کس ملک کی زبان ہے۔ عبادت کرنے میں سب کے سب رُخ ایک ہی طرف کرتے ہیں"

کنٹن کے محصول نامہ میں لکھا ہے کہ:

"عربی تاجر کثرت سے آتے ہیں۔ ان کے جہازوں نے کنٹن کے بندرگاہ کو آباد کردیا ہے جس کی وجہ سے کنٹن کی آمدنی میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے"

خاندان ٹانگ کے عہد میں مسلمانوں کی کیفیت:

"ٹانگ اور سونگ کے عہد میں اسلامی سلطنتوں کے تعلقات چین کے ساتھ ایسے تھے جیسے آج کل امریکا۔ انگلینڈ اور فرانس کے ہیں۔ اس زمانے میں جو تجارتی جہاز چین میں آتے تھے وہ اکثر ایرانی مسلمانوں کے تھے۔ "ٹائی پینگ کے روزنامچہ میں جو ۹۷۶ء میں لکھا گیا ہے ایرانی تجار کے متعلق یہ بیان ہے کہ ان کے پاس بے شمار دولت ہے۔ چینگ جیشان نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جس وقت ٹیانگ زین کونگ کے لشکر نے یانگ چاؤ میں بغاوت کی اور اس

شہر کو لوٹ لیا اس وقت جتنے آدمی ہلاک ہوئے ان میں سے کئی ہزار مسلمان تھے ۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب اس چھوٹے سے شہر میں اس قدر کثیر تعداد مسلمانوں کی تھی تو کل چین میں ان کی آبادی کس قدر ہوگی ۔

عہد ٹانگ میں جبکہ اسلامی حکومت اسپین سے لے کر ہند تک اور قسطنطنیہ سے لے کر کاشغر تک پھیلی ہوئی تھی مسلمان چین سے غافل نہ تھے چینی کاشغر کو فتح کرنے کے بعد ان کا ارادہ تسخیر چین کا بھی تھا۔ مگر خاندان ٹانگ کی خارجہ پالیسی ایسی تھی جس سے ان کا ملک اسلامی حملہ سے محفوظ رہ گیا۔ وہ حتی الامکان پڑوسی ممالک کے ساتھ مصالحت اور آشتی رکھنی چاہتے تھے اور یہی کوشش کرتے تھے کہ ہم سرحد سلطنتوں کو ان کی طرف سے کوئی شکایت کا موقع نہ مل سکے۔ مسلمانوں کی طاقت ان کی وسعت سلطنت کے ساتھ بہت بڑھ گئی تھی اور اس کی ہیبت سارے جہان پر چھائی ہوئی تھی ۔ اس کے اقبال کا ستارہ بلندی پر تھا۔ خاندان ٹانگ نے خوب اندازہ لگا لیا تھا کہ اس غیر معمولی طاقت کے ساتھ جنگ چھیڑنا خطرہ سے خالی نہیں ہے لہذا جب مسلمانوں کا پہلا وفد ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے کچھ دے کر صلح جوئی کا راستہ اختیار کر لیا ۔ یہ ممکن تھا کہ مسلمان اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیتے اور بغیر خراج لئے چین کو نہ چھوڑتے مگر اسی زمانے میں حجاج بن یوسف کی وفات اور تسخیر فرانس کے لئے مزید فوجی کمک کی دربار خلافت دمشق سے طلب پھر ولید بن عبد الملک کے انتقال کی وجہ سے ایک اضطرابی حالت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اس ہدیہ کو غنیمت سمجھا اور چین کو اس کی حالت پر چھوڑ کر خوش خوش وہاں سے واپس آ گئے ۔

خاندان ٹانگ نے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مصالحت رکھی بلکہ اپنے اندرونِ ملک میں بغاوت کو دبانے کے لئے ان سے مدد بھی مانگی جس کی وجہ سے تعلقات اور بھی مضبوط ہو گئے ۔

ہر شخص جانتا ہے کہ چین ایک وسیع ملک ہے ۔ مگر اس زمانہ میں چین کی وسعت اتنی نہ

تھی جتنی آج ہے۔ اصل چین تو دریائے زرد سے کر دریائے یانگ ٹس تک تھا۔ باقی جو صوبے تھے وہ چین کی ملحقہ سلطنتیں تھیں جو اس کو صرف خراج دیتی تھیں۔ ان میں سے اکثر بسا اوقات چین کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے تھے۔ ایک ہی وقت میں سلطنت چین کے لئے متعدد دشمنوں کا مقابلہ مشکل تھا۔ جب کثرت بغاوت کی وجہ سے اس کا دم ناک میں آگیا تو اس کو اسلامی حکومت سے امداد مانگنی پڑی چنانچہ شاہی تذکرہ میں یہ یادداشت مسطور ہے کہ جینگ یونگ کے دوسرے سال (۷۸۶ء) میں ایک سپہ سالار سیمی نامی چین سے مسلمانوں کے پاس مدد مانگنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ درخواست کا مضمون یہ تھا۔

"ممالک مغرب میں مسلمان سب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ان کی سلطنت بحیرۂ روم سے کاشغر چین تک پھیلی ہوئی ہے۔ عالم کے اکثر حصے ان کے قبضے میں ہیں۔ ہمارے ملک میں بغاوتیں ہو رہی ہیں۔ جن کو فرو کرنے کے لئے ہمارے پاس لشکر بہت کم ہے۔[?] ہم مسلمانوں سے مدد کی توقع رکھتے ہیں۔"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چینی سلاطین مسلمانوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے باہمی تعلقات کیسے تھے۔

دوانگ کے سفرنامہ میں ہے کہ دیار عرب میں پکین کے دو باشندے تھے اور ہوانگ کے چند۔ ان لوگوں نے وہاں عربوں کے درمیان سکونت اختیار کر لی تھی۔ حالات دارالسلطنت میں لکھا ہے کہ "سنہ ۱۳۴۲ء کے بعد صرف شہر چاآن میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار تھی۔" غالباً اس زمانے میں پکین میں بھی غیر ملکیوں کی تعداد اتنی نہیں ہے جس قدر کہ اس زمانے میں چاآن میں مسلمانوں کی تھی۔

الغرض خاندان طانگ اور مسلمانوں کے درمیان نہایت گہرے تعلقات تھے۔ تاریخ سفارت نامہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۵۱۶ء سے سنہ ۱۹۸ء تک اسلامی حکومتوں کی طرف سے جو سفراء چین میں گئے تھے جن کے نام سفارت نامہ میں درج کئے گئے ان کی تعداد ۳۰[?] تھی اور جن کے نام درج نہیں کئے گئے یا جو غیر سرکاری طور پر گئے ان کی تعداد کا علم نہیں۔

ایک پرانا اسلامی کتبہ۔ اور مندر کو مسجد بنانا۔

چین میں مسلمانوں کا ایک قدیم کتبہ ہے جو صوبہ شنسی کے شہر شی آن کی ایک مسجد میں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ۷۴۲ء کا ہے۔ اس زمانے میں خاندان ٹانگ کا بادشاہ ٹیانگ پایۂ تخت پر تھا۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ اس کتبہ کا مضمون بادشاہ کے ایک درباری وان کونگ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ کتبہ اگر واقعی ثابت ہو جائے تو چینی مسلمانوں کی تاریخ میں اس کو ایک غیر فانی اہمیت حاصل ہوگی مگر یہ امر ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ عبارت اور الفاظ کی ترکیبوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عہد سونگ یا مینگ کا ہے۔ کیونکہ اس میں اور عہد ٹانگ کی لفظی ترکیبوں میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں طرز تحریر بھی اس زمانے کا نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے عہد سونگ کا ہو۔ کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظی ترجمہ وہ ہے جو عہد مینگ میں کیا جاتا تھا۔

عہد ٹانگ میں مشہور علماء کثرت سے تھے اور وان کونگ صرف ایک معمولی شاہی ملازم تھا۔ کسی جرم کی بنا پر بادشاہ نے اس کے لئے خودکشی کا فرمان جاری کیا تھا۔ اس وجہ سے لوگوں کو شبہ ہے کہ مضمون کے لئے وان کونگ کو کیوں منتخب کیا گیا۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ عہد مینگ کے لوگوں کو آخر مصنوعی کتبہ بنانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر وان کونگ کا نام لکھنا کیا ضرور تھا۔

مزید تحقیقات سے لوگوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد ٹانگ میں وان کونگ نے شہر شی آن کے جنوب میں ایک محل بنایا تھا جس میں وہ ایک عرصہ تک رہا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے اس محل کو مندر بنانے کے لئے وقف کر دیا۔ اس موقع پر مندر میں یہ کتبہ نصب کیا۔ اس کے بعد جب اس شہر میں مسلمان آبادی کی کثرت ہو گئی تو یہ مندر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور انھوں نے اس کو مسجد میں منتقل کر دیا اور کتبہ کو تاسیس مسجد کی تاریخ لکھنے کے لئے کام میں لائے۔ ان وجوہ سے اس کا مضمون عہد مینگ کا معلوم ہوتا ہے مگر تاریخ عہد ٹانگ کی ہے۔ لیکن ابھی تک بلا مزید تحقیق کے اس کے متعلق قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ہاں یہ ثابت ہے کہ وان کونگ نے اپنے مندر کے لئے وقف کیا۔ بعد میں یہ مندر مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا اور انھوں نے اس کو مسجد بنا لیا

جو مسلمانان چین کی مذہبی تاریخ میں ایک دلچسپ ورق ہے۔

عہد ٹانگ میں مسلمان شاعر اور حکیم:

عہد ٹانگ میں ایک مسلمان کو جس کا نام لی شیان شیگ تھا چنشی (ڈاکٹر) کا خطاب دیا گیا تھا۔ سنہ ۹۲۲ء میں چین میں دو ایرانی مسلمان علم و فضل میں بہت مشہور تھے۔ یہ دونوں بھائی بہن تھے۔ چنانچہ وانشو فو کی داستان میں ذکر ہے کہ لی شیلانگ جو کہ لی ٹینی کے لقب سے معروف ہے اس کے آبا و اجداد ایرانی تھے۔ یہ ہیچونگ کے ساتھ سنہ ۹۴۲ء میں سزیچوان میں آیا۔ اس کے بعد بادشاہ چین نے اس کی لیاقت کی وجہ سے اس کو اپنے درباریوں میں داخل کر لیا۔ اس کا ایک بھائی شونگ نامی شاعری میں مشہور تھا جس کے ارد گرد ہر وقت احباب اور دوستوں کا مجمع رہتا تھا۔ لی ٹینی ایک شریف مزاج۔ خوش طبع۔ صالح اور قانع حکیم تھا۔ وہ لوگوں کا علاج کرتا تھا اور اس سے جو کچھ کماتا تھا سال کے آخر تک سب خرچ کر دیتا تھا۔ اور سوائے طبی کتابوں اور دوائیوں کے اور کچھ اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔

ہوکونگ یون ایک چینی تذکرہ نگار اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ:

لی شونگ ایرانی نسل سے تھا وہ بچپن ہی سے محنت اور جفاکشی کا خوگر تھا۔ اور علوم و فنون کا عاشق۔ لوگ اس کو علوم کا دیوانہ کہہ کر پکارتے تھے۔ جب شعر سناتا تو لوگوں کو مست کر دیتا۔ شہر میں ایک حاکم تھا جس کو لی شونگ سے محبت تھی مگر وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس پر لی شونگ جھٹ سے شعر کہہ دیتا تھا۔

غیر ممالک کے اخلاقی امور میں نمائش نہیں　　لی شونگ ایرانی باشندہ کی شاعری میں بناوٹ نہیں
اگر خوش قسمتی سے شاہی محل کا پھول بھی مجھ کو ملے　　گو اس میں رنگ کی نمائش ہو مگر حقیقت میں خوشبو نہیں

یانگ زنگ کے مجموعہ میں ہے کہ لی شونگ کی حقیقی بہن شیو یونگ بھی اچھے خاصے شعر کہتی تھی چنانچہ شاہی دعوت کے موقع پر اس نے یہ شعر کہے تھے۔

بلبل کی آواز نکایک باہر سے سننے میں آئی　　چونک اٹھیں بیگمات محل کی خواب سے

ہر کیا؟ آہا! شاہ نے کھینچی اپنی سنہری کمان　　پھول کی جانب تیر چلایا اور مار لیا بلبل کو اچانک

"انتخابات پھول" میں بھی شونگ کے بہت سے اشعار مندرج ہیں۔ وہ نہ صرف شاعر تھا۔ بلکہ حکیم بھی تھا اور لوگوں کا علاج کرتا تھا۔ اس کا پیشہ بالکل عہد یونگ کے مسلم شاعر تنگ فونیانگ کے مشابہ تھا۔ وہ بھی شاعر تھا یہ بھی شاعر۔ وہ بھی حکیم تھا اور یہ بھی حکیم۔ شعر گوئی اور طبابت یہ مسلمانوں کی خاص خصوصیت ہے جو کسی دوسری قوم میں نہیں پائی جاتی۔ آج کل چینی زبان میں شونگ کا ایک مجموعہ معالجات ملا ہے جس میں جڑی بوٹیوں کے نام اور نسخے درج ہیں۔

تذکرۂ مصوری میں ہے کہ لی شونگ کی بہن نہ صرف شاعر تھی بلکہ مصورہ بھی تھی۔ اور خوب تصویر کھینچتی تھی۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بہت قابل عورت تھی۔

چینیوں اور مسلمانوں میں باہمی ازدواج :

اس زمانے میں بعض چینی شاہزادوں نے مسلمانوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں جس سے چینیوں اور مسلمانوں کے تعلقات زیادہ مضبوط ہو گئے۔ عہد سونگ میں چینیوں اور عربوں کے درمیان باہمی ازدواج کا دروازہ کھل گیا۔ عہد سونگ سے پہلے ہم کو معلوم نہیں کہ عربوں اور چینیوں میں شادیاں ہوتی تھیں یا نہیں لیکن ایرانیوں اور چینیوں میں شادی کا ثبوت ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ چینی تاریخوں میں ایرانیوں کا لفظ جو لکھا ہے اس سے مراد وہ جملہ مسلمان ہوں جو اس زمانے میں چین کے شہروں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ بہرحال عہد سونگ میں عربوں اور چینیوں کی مخلوط شادیوں کا تذکروں میں خصوصیت کے ساتھ ذکر موجود ہے۔

سونینگ کے ساتویں سال ۱۱۳۶ء میں عرب کے ایک مالدار تاجر ابو علی کنٹن میں رہتے تھے وہاں کے ایک تحصیلدار جینلہ نامی نے ابو علی سے دوستی پیدا کی۔ اس کی نگاہ اس بے شمار دولت پر تھی جو ابو علی رکھتے تھے۔ اس لئے اس نے اپنی حقیقی بہن ابو علی کے نکاح میں دے دی جس کی وجہ سے ابو علی پھر اپنے ملک کو نہ جا سکے اور کنٹن ہی میں انتقال کر گئے۔

الغرض عربوں اور چینیوں میں مخلوط شادیاں کثرت سے ہوئیں اور ان میں کوئی رکاوٹ

نہیں رہی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد چین میں تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی۔

پیکن کا بانی مسلمان تھا:

عہد سونگ میں عرب سے جو مسلمان چین میں آئے تھے وہ دریائی راستے سے آئے تھے اور تاتاری اور مغل مسلمان خشکی کی راہ سے۔ عہد یونگ (کوبلے خاندان کے زمانہ) میں چین میں مسلمانوں [1] کو روز افزوں ترقی نصیب ہوئی اور حکومت میں ان کا اثر اور ملک میں ان کی قوت بہت بڑھ گئی وہ ہر لحاظ سے چینی باشندوں سے بہتر حالت میں تھے۔ اس عہد میں سرکاری اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کی جو تعداد تھی اور جن کے نام رپورٹوں میں درج کئے گئے ہیں وہ سو سے زیادہ تھی۔ علم و فضل میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ تقریباً ہر شعبے میں انھوں نے کتابیں لکھیں۔ مسلمان شاعر ینگ خونیانگ کا دیوان آجتک چینی زبان میں موجود ہے۔

نہ صرف علم و فضل سے وہ چینیوں سے آگے تھے بلکہ فن تعمیر میں بھی چنانچہ چین کا دارالسلطنت جو پیکن کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں ہی کا تعمیر کردہ ہے۔ اس کے اصل بانی کا جو مسلمان تھا

---

(۱) عہد یونگ چین کے کمال عروج کا زمانہ تھا اس میں چنگیز خاں نے مشرق سے مغرب تک فتوحات کیں اور پھر اس کی اولاد نے۔ کوبلے (قوبلائے پسر تولی خاں) چنگیز خاں کا پوتا اور ہولاکو کا بھائی تھا چین کے تخت پر ۳۴ سال تک شان و شوکت کے ساتھ فرمانروائی کرکے ۶۹۳ھ میں گزر گیا اس کے عہد میں چین میں سید اجل بخاری کا خاندان وزارت پر رہا یعنی پسر زادہ سید اجل۔ پھر اس کا بیٹا ناصر الدین پھر ناصر الدین کا بیٹا ابوبکر۔ کوبلے کے زمانے میں غازان خاں اور اس کے ساتھی تاتاری ایران میں مسلمان ہوئے۔ جن کے اثر سے خود کوبلے کا پوتا انندہ سلطان والی ختا مع اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج کے مسلمان ہوگیا۔ اور تقریباً سارے چینی ترکستان میں اسلام پھیل گیا۔ کوبلے کے بعد اس کا پوتا تیمور (الجائیتو خاں) چین کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے اکثر امراء مسلمان تھے۔ اسی کے عہد میں وزیر رشید الدین فضل اللہ نے فارسی زبان میں جامع التواریخ لکھی جو چین کی تاریخ کے متعلق واحد دستاویز مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

اسلم

بخدر نام تھا۔

اس قسم کے علمی تعمیری اور ملکی اور فوجی بہت سے کام تھے جن کو مسلمانوں نے بخوبی انجام دیا ہے جن کی تفصیل بلا ایک مبسوط تاریخ کے اس مختصر مضمون میں نہیں ہو سکتی۔ افسوس یہ ہے کہ دیگر ممالک کے مسلمان بھائی چینی زبان نہ جاننے کی وجہ سے چینی مسلمانوں کے حالات سے واقف نہ ہو سکے اور چینی مسلمان اپنے بھائیوں سے الگ رہتے اور ان کی زبان نہ جاننے کی وجہ سے اپنے حالات ان تک نہ پہنچا سکے۔ جن کی وجہ سے وہ بقیہ بلاد اسلام سے منقطع رہ گئے۔ حالانکہ اسلام سے ان کا تعلق بجنسہ قائم ہے۔

عہد یونگ میں مسلمانوں کی علیحدہ عدالت:

اس عہد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی علیحدہ عدالت تھی۔ یہ غالباً مسلمانوں کے ان امتیازات اور اثرات کا نتیجہ تھا جو اس زمانے میں ان کو حاصل تھے ان کی تعداد کی ترقی اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے حصے زیادہ ہونے کی وجہ سے شاہ چین سے انھوں نے جداگانہ عدالت کا حق حاصل کر لیا۔ چنانچہ عہد یونگ کے عدالت نامہ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ہادی اعظم (قاضی اعظم) کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی مقدس کتاب کے مطابق احکام شرعی جاری کرے اور ان کی پابندی کرائے اور مسلمانوں کے تنازعات اور قضایا کو اس کے ماتحت فیصل کرے۔

مختلف عہدوں میں مسلمانوں اور اسلام کے لئے مختلف نام:

اسلام اور مسلمانوں کا نام چینی زبان میں ہر عہد میں مختلف رہا ہے۔ گو ان سب کا مطلب ایک ہی ہے لیکن الفاظ اور ان کی کتابت میں اختلاف ہے۔ کوئی خاص نام ان کے لئے کبھی متعین نہیں ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل چینی زبان میں اسلام اور مسلمانوں کے بہت سے نام ہیں جس نام سے چاہیں خطاب کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بعضوں نے معنی کے لحاظ سے ان کے نام رکھے بعضوں نے لفظوں کے۔ اور بعضوں نے قوم کے لحاظ سے اور بعضوں نے دین کے

جہاں تک نسلی لحاظ سے نام کا تعلق ہے عرب تاتاری اور ہوی چینی اس میں شامل ہیں۔ ہر عہد کا لفظی ترجمہ بھی مختلف رہا ہے یعنی حروف میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ گو تلفظ تقریباً ایکساں رہا ہے۔ ہم ذیل میں ان ناموں کو لکھتے ہیں۔ اگرچہ ناظرین کرام ان الفاظ کو پسند نہ کریں گے لیکن ان کا درج کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

(الف)

نسلی نام سے۔ ہوی ہوی چاؤ۔ ہوی چاؤ۔ نیانگ تانگ چاؤ ...... }
لفظی ترجمہ سے۔ آشلام۔ آشلا۔ آسلان۔ آسلم .... } اسلام
معنوی لحاظ سے۔ داتنفا۔ داتنفی چاؤ۔ ٹسینگ چینگ چاؤ ...... }

(ب)

نسلی نام سے۔ ہوی چیپا۔ ہوی خوی۔ آسلان ہوی خوی۔ وی او۔ وی ہو۔ ہوی ہوی }
لفظی ترجمہ سے۔ سلمان۔ مسلومان۔ مسودان۔ موسومان۔ سومان۔ مسوامان۔ مسلم ..... } مسلمان
معنوی لحاظ سے۔ چاؤ مینگ۔ ٹینگ چینگ چاؤ مینگ۔ ہوی ہوی چاؤ مینگ ...... }

عہد ٹانگ میں لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موہو یا محامو کہتے تھے۔ اس کا ٹھیک لفظی ترجمہ ۱۳۵۱ء میں ہوا جو ٹینگ چیو کی مسجد کے سنگ بنیاد پر کندہ ہے۔ جھوانگ چیو کی مسجد پر بھی یہی نام لکھا گیا ہے۔ مگر کنٹن کی مسجد النبی میں محامو لکھا ہے۔

ہوی چیپا ترکستان کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ چونکہ چنگیز خاں کی مغربی و شمالی فتوحات کے بعد اس سرزمین میں لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے چینی زبان میں اسلام کے لئے جو سب سے پیارا اور صحیح معنوں میں ٹھیک نام ہے وہ ٹینگ چینگ ہے یعنی خالص دین اس واسطے مسلمان کو ٹینگ چینگ چاؤ مینگ کہتے ہیں یعنی خالص دین والے۔ آج کل چینی زبان میں اسلام کے لئے ہوی چاؤ اور مسلمان کیلئے ہوی ہوی پسند کیا گیا ہے۔ عام طور پر انھیں لفظوں سے وہ پکارے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس کا تعلق نسل سے ہے مگر اس سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن کا بتایا ہوا عقیدہ رکھتا

عہد مینگ میں مسلمانوں کا اثر:

عہد یونگ (تتاری عہد) کے بعد جب خاندان مینگ (۱۳۶۸ء سے ۱۶۶۲ء تک) کی حکومت قائم ہوئی تو اس زمانے میں مسلمانوں کی تعداد اور بڑھ گئی کچھ تو اس وجہ سے کہ عہد یونگ ہی سے وہ بڑھ گئے تھے اور کچھ امیر تیمور کی وسط ایشیا کی فتوحات سے ان کا اقتدار زیادہ ہو گیا۔ اور غیر معمولی طور پر چین میں مسلمانوں کی حالت ترقی کر گئی۔ سرکاری دفاتر میں زیادہ تر امرا، اور عمال مسلمان ہی تھے اس عہد میں چینی مسلمانوں کی حالت کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہاں کی سول سروس کے امتحان میں ۱۳۸۵ء میں دس مسلمانوں نے کامیابی حاصل کی تھی مجھے معلوم نہیں کہ آج کل کس قدر ہندی مسلمان برطانوی سول سروس کے امتحان میں سالانہ کامیابی حاصل کرتے ہیں مگر یہ تو چھ سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔

عہد مینگ میں مسلمانوں کی حالت دن بدن بہتر اور برتر ہوتی گئی۔ صرف یہی نہیں کہ شاہی ملازمت میں ان کی تعداد کثیر تھی بلکہ ادر ہر قسم کے کاموں میں وہ شریک تھے۔ اس عہد میں ایک دار الترجمہ قائم ہوا تھا جس کا صدر بھی ایک مسلمان تھا اور اس کے کارکن بھی اکثر مسلمان ہی تھے۔ جو مشائخ کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

مینگ ٹائی ٹسو اپنی یادداشت میں لکھتا ہے کہ اس کے اکثر فرامین مشائخ محمد کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے تھے

یون لیوؤ کے عہد (۱۴۰۳ سے ۱۴۲۴ تک) شہنشاہی حاجب ممالک مغرب میں بھیجا گیا تھا۔ جس کا نام چینگ ہو تھا۔ یہ مسلمان تھا۔ یہ ہم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کے باپ کی قبر جو صوبہ یونان میں ہے اس پر ایک طویل کتبہ ہے جس پر یہ بھی لکھا ہے کہ حاجی ماکونگ کے دو بیٹے ہیں چھوٹے کا نام ماخاؤ ہے جو شہنشاہ کے دربار میں ملازم ہے۔ شہنشاہ نے اس کو چینگ کا خطاب دیا جس سے چینگ ہو ہو گیا۔ چونکہ حاجی سوائے مسلمان کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اس لئے یہ یقین کر لینا چاہئے کہ یہ دونوں باپ بیٹے مسلمان ہی تھے۔

سنہ ۱۵۰۵ء میں شہنشاہ چین ہو چونگ نے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کی جس کی وجہ سے اس نے سور کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا ممنوع قرار دیا ورنہ اس سے پہلے سوائے مسلمانوں کے جملہ اہل چین خنزیر کھاتے تھے۔

ان باتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عہد مینگ مسلمانوں کا اثر کس قدر تھا۔

مسلمانانِ چین اور تعلیمات کانفوشس:

چینی مسلمانوں نے کانفوشس کی تعلیمات کا بے تعصبی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اور اس کو پسند کیا۔ اس لئے وہ کانفوشس کی عظمت کرتے ہیں۔ وہ اس قدر متعصب نہیں جس قدر دوسرے مذاہب کے لوگ ہیں۔ ان کی باتیں جو چینیوں سے الگ ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ کسی مورت کو نہیں پوجتے اور اللہ کے سوا کسی دیوتا کو نہیں مانتے۔ نہ وہ قبروں کی پرستش کرتے ہیں نہ کسی بت کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ کانفوشس کو وہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں چنانچہ ایک مسلمان شاعر نے کہا ہے۔

سادھو کہتے ہیں کہ گوتم بدھ ہو مغرب میں   تارک الدنیا سمجھتے ہیں کہ خضر ہیں دریائے ہند میں

مگر کانفوشس کی تعلیم کی حقیقت میری نظر میں ہے   کہ اس سے زندگی موج زن ہے زمانہ کے آغوش میں

صوبہ یونان میں کانفوشس کی خانقاہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی بنائی ہوئی ہے۔ وانگٹ تاؤ یولی نے جو تعلیم الاسلام تصنیف کی ہے اس میں کانفوشس کا فلسفہ نظر آتا ہے۔ ۱۷۲۲ء میں لیوچی نے جو عقائد اسلام مرتب کی اس میں بھی کانفوشس کے اقوال کثرت سے نقل کئے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانانِ چین کے خیال پر کانفوشی تعلیمات کا اثر قائم ہے۔

اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پہلے شاہی ملازمت کے لئے خود مسلمان باہم ایک دوسرے کے ساتھ سابقت تے تھے اور علوم و فنون سیکھتے تھے اس میں اسلامی اور غیر اسلامی علوم کا امتیاز نہ تھا۔ اور چین میں علوم و فنون کا سرچشمہ کانفوشی تعلیمات ہیں۔ اس لئے انھوں نے اس کو بھی اچھی طرح سیکھا۔

عہد ہنگ میں چین کے علما اکثر مسلمانوں کے ساتھ بحث و مباحثے بھی کرتے تھے یا یوں کہئے کہ باہم ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے تھے جس سے طرفین پر ایک دوسرے کے مذہبی عقائد کا اثر پڑا۔

مسلمان اپنے مذہبی رسموں کی ادائگی میں آزاد رہے۔

موجودہ زمانے سے نصف صدی پہلے سے عیسائی مشنری چین میں آنے لگے مگر حکومت چین نے ان کی تبلیغ اور مذہبی رسوم کی ادائگی کو قانوناً روک دیا۔ لیکن اہل اسلام چین میں اپنے مذہبی معاملات میں ہمیشہ آزاد رہے اور کبھی ان کے مذہبی امور کے متعلق کوئی قانون نافذ نہیں کیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ شاہی حکم سے اسلامی مساجد اور معابد کی حفاظت کی جاتی تھی۔ آج اگر کوئی سیاحت کے لئے چین میں جائے اور وہاں کی مساجد کو دیکھے تو اس کو ہر مسجد میں ایک لوح ملے گی جس پر سنہری حرفوں میں ایک عبارت لکھی ہوئی ہوگی جس کا ترجمہ یہ ہے (بادشاہ زندہ باد، مسجد صرف مسلمان سے آباد)۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان نماز کے وقت بادشاہ کا نام لیتے یا اس کی تعظیم کرتے تھے۔ بلکہ اس سے مسجد کی حفاظت اور حرمت مقصود تھی۔ حالت یہ تھی کہ بعض غیر مسلم مسجد کو مندر یعنی عبادت گاہ سمجھ کر اس میں گھس جاتے تھے اور اپنے شرکیہ مراسم ادا کرنے لگتے تھے جس سے مسلمانوں کی دل آزاری اور مسجد کی بے حرمتی ہوتی تھی اس وجہ سے بادشاہ نے حکم دیا کہ ہر مسجد میں ایک تختی لگا کر اس پر یہ عبارت لکھ دی جائے تاکہ کوئی غیر مذہب کا آدمی اس میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ تختیاں پہلے تو ایک نمایاں جگہ پر لگائی جاتی تھیں لیکن جب سے چین میں جمہوریت پھیلی ہے اس وقت سے کسی کونے میں رکھ دی گئی ہیں لیکن اب تک موجود ہیں اور اکثر مساجد میں ملتی ہیں۔

حکومت کی مسلمانوں سے مخالفت:

جب خاندان ہنگ کی حکومت ۱۶۴۴ء میں مٹ گئی اور خاندان ٹینگ کے اقتدار کا آغاز ہوا اس وقت مسلمانوں کی حالت بالکل بدل گئی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ عہد ہنگ میں شاہی ملازمتوں

میں مسلمانوں کی تعداد غالب تھی اور ان کا اثر ان کی تعداد کے ساتھ پھیلتا جاتا تھا جب خاندان
مینگ مٹ گیا اور ٹینگ کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ آگئی تو طبعاً ان کو اپنی حکومت استوار
کرنے کے لئے مسلمانوں کو ملازمتوں سے نکالنا پڑا۔ مگر ان کو نکالنا آسان نہ تھا کیونکہ تمام بڑے بڑے
عہدوں پر یہی لوگ تھے اس لئے ٹینگ خاندان کے اس جور و تعدی کی وجہ سے کبھی کبھی مسلمان
مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے یعنی یہ بغاوتیں خود حکومت کے ظلم و جبر سے پیدا ہوئی تھیں۔
اور یہ ہم اپنی ذاتی رائے نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ عہد ٹینگ (۱۶۴۴ سے ۱۹۱۲ء تک) کے مورخین
نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ان تمام جنگوں میں جو مسلمانوں کے ساتھ ہوئیں مسلمان بے قصور تھے۔ اور
یہ صرف حکومت کی غیر رواداری اور متعصبانہ روش تھی جس نے ان کو بغاوت پر مجبور کر دیا تھا۔
چیانگ لونگ کے وسط عہد سے لے کر کوانگ چوان کے آغاز تک (۱۷۷۶ سے ۱۸۷۸ء تک) کہ
تقریباً سو سال کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں جو اہم واقعات مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے وہ پانچ
ہیں جن کو عہد ٹینگ کے مورخین بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں ان کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں
ان کے نام اور جلدوں کی تعداد مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ سوزی شیشان کی بغاوت ـــ واقعہ لانگ چاؤ (۱۷۸۲ء) ۲۰ جلدیں
۲۔ ہانینگ ہینگ کی بغاوت ـــ واقعہ شیفان پاؤدہ (۱۷۸۵ء) ۲۰ جلدیں
۳۔ چانیک کیل کی بغاوت ـــ تذکرہ باغیان ہینگ چانگ (۱۸۲۱ سے ۱۸۳۰ء تک) ۸۰ جلدیں
۴۔ دودین شیوان کی بغاوت ـــ تذکرہ مسلم باغیان یونان (۱۸۵۵ سے ۱۸۸۰ء تک) ۵۰ جلدیں
۵۔ عقبہ (؟) کی بغاوت ـــ تذکرہ استیصال مسلم باغیان شنسی کانسو و چینی ترکستان
(۱۸۵۵ سے ۱۸۸۹ء تک) ۳۲۰ جلدیں۔

مندرجہ بالا کتب کو چینی مورخین نے مسلمانوں کی اہم شورشوں کے متعلق تصنیف کیا ہے
ان کتابوں میں اس آخری دو صدی کے مسلمانان چین کے مفصل حالات آگئے ہیں چونکہ ان میں
سے کوئی کتاب میرے پاس اس وقت نہیں ہے اس لئے کوئی اقتباس نہیں دے سکتا۔

مسلمان اپنی حالت پر برابر قائم رہے ہیں :

چین کے مسلمانوں کو ٹینگ خاندان نے اگرچہ برابر ستایا اور ان کو مٹانے کی کوشش کی مگر ان کی قوت اور اثر میں کوئی فرق نہیں آسکا ان کی حالت تقریباً وہی رہی جو عہد مینگ میں تھی۔ باوجود اس کے کہ مسلمانوں نے چین میں کوئی حکومت نہیں قائم کی اور نہ انھوں نے کبھی مذہبی تبلیغ کی مگر ان کی تعداد برابر بڑھتی رہی۔ کوئی قوت ان کو نہیں دبا سکی اور ان کا اثر اور وقار برابر بڑھتا رہا۔ ہمارے خیال میں ان کے ترقی کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) تجارت۔ اور تجارت کی غرض سے دور دراز کے سفر۔

(۲) عسکری قوت کی پشت پناہی۔

(۳) ان کی نسلوں اور خاندانوں کا انتشار۔

(۴) چینی تمدن اور تہذیب کا اختیار کرلینا۔

ان اسباب کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) عہد ٹانگ۔ سونگ اور یونگ میں چین میں جو مسلمان آئے اور جنھوں نے وہاں سکونت اختیار کرلی اور ان کی نسلیں بڑھیں۔ اس کی وجہ تجارت تھی۔ ان زمانوں میں خشکی اور دریائی دونو راستوں سے مسلمان چین میں تاجرانہ حیثیت سے جاتے تھے اور وہیں رہ پڑتے تھے۔ یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ کنٹن میں ان کے جہاز بے شمار تھے جن کی آمدنی سے چین کے مالیہ میں اضافہ ہوا۔

(۲) وسط ایشیا چینی ترکستان۔ کانسو اور تنلسی وغیرہ میں مسلمانوں کی جو کثرت ہوئی اس کی وجہ عسکری قوت تھی۔ اگرچہ مسلمانوں کی عسکری قوت کا براہ راست چین پر اثر نہ تھا لیکن بالواسطہ ان کی قوت چین کے مسلمانوں کی حالت پر ضرور کافی طور پر اثر انداز ہوئی۔ اسلامی سلطنت کی قوت کی وجہ سے خود چینی حکومت نے ان سے فوجی امداد مانگی۔ یہ فوجیں جو کمک کے لئے آئی تھیں شاہ چین کی اجازت سے شمالی مغربی چین میں سکونت پذیر ہوگئیں اور ان کی اولاد بہت بڑھی۔

(۳) مسلمانوں میں کثرت ازدواج کا رواج تھا۔ اور ان کے لئے چینی عورتوں سے شادی

کرنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے نسلی اور قبائلی انتشار اور کثرت ازدواج کی وجہ سے ان کی تعداد اور ساتھ ہی ساتھ قوت بڑھتی گئی۔

(۴) عہد یونگ اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کو اپنے علم و فضل کی بدولت دربار شاہی اور سرکاری ملازمتوں میں بے نظیر رسوخ حاصل تھا۔ اور ان کے چینی تہذیب اختیار کر لینے کی بدولت چینیوں کو ان سے کوئی بیگانگی اور منافرت نہیں تھی۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، رہنا، سہنا، کھانا، پینا سب چینی روش پر تھا۔ ان کے نام بھی چینی ہی تھے اور اب تک ہیں وہ اپنے سکون اور حرکت میں، لباس اور وضع میں چینی ہیں۔ اس وجہ سے وہ چین کے غیر مذہب والوں کے ساتھ تمدنی حیثیت سے بالکل ہم آہنگ رہے اور کبھی کوئی تصادم واقع نہیں ہوا۔

مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ جہاں کہیں وہ جاتے ہیں وہاں کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا اثر خود قبول کرتے ہیں اور اپنا اثر ان پر ڈالتے ہیں چنانچہ ازمنہ متوسطہ میں تاتاریوں نے جب مسلمانوں پر فتوحات حاصل کیں تو ان کے اثر سے خود مسلمان ہو گئے۔ چینی مسلمانوں میں جذب و کشش خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں اور چینی تہذیب و تمدن اختیار کر لینے سے اور بھی ارتباط بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے ان کی حالت ہمیشہ اچھی رہی اور کبھی فرق نہ آیا۔

مذکورۂ بالا چاروں اسباب کے علاوہ دو سبب اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ وہ کانفوشس کی تعلیم کو پسند کرتے ہیں اور اس پر اعتراض نہیں کرتے۔

عدم تبلیغ میں عین تبلیغ:

غالباً بیان بالا سے اہل ہند کو خیال ہوگا کہ چین کے مسلمان بالکل مردہ ہیں جو مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے۔ وہ چین میں رہتے ہیں۔ وہاں کے حالات سے باخبر ہیں اور زبان جانتے ہیں پھر چینیوں کو مسلمان کیوں نہیں بنا لیتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چینی مسلمان اگرچہ تبلیغ سے خاموش ہیں مگر یہ اسلام فراموشی نہیں ہے۔ اگرچہ ان میں جوش نہیں ہے مگر وہ اس ملک کی آب و ہوا کے مطابق خاموشی اور استقلال کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں وہ یہ نہیں چاہتے کہ باہم ایک ہی ملک کے باشندوں میں

ناگوار صورتیں پیش آئیں۔ اور مذہب کی وجہ سے آپس میں تنافر پیدا ہو۔ کیونکہ مذہب عداوت پیدا کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ چینی مسلمانوں کی کیفیت اس پودے کے مانند نہیں ہے جو باد بہار کے جھونکے سے پھولا اور مرجھا گیا۔ یا اس بلبل کی طرح جو گلشن میں آئی، چہچہائی اور اڑ گئی بلکہ ایک دریا کے مانند ہے جس کی روانی برابر قائم رہتی ہے اور گرد و غبار اس میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتے۔ چین میں مسلمان اپنی تاریخ داخلہ سے آج تک باوقار ہیں۔ ان میں سوائے ترقی کے کبھی تنزل کے آثار نہیں پیدا ہوئے اگر اہل اسلام کو اس بات پر ناز ہے کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا اور ناز ہونا بھی چاہئے تو اس کی زندہ مثال جو معترضوں کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ چین کے مسلمانوں کی ہے۔

چینی مسلمان اگرچہ اسلام کی حقیقت سے زیادہ واقف نہیں مگر ان کا یقین غیر متزلزل اور ایمان بڑا پختہ[1] ہے۔

چینی مسلمان اور غیر مذاہب:

چینی مسلمانوں کے تبلیغ نہ کرنے سے غیر مذاہب کے اہل چین ان کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور نہ اجنبی سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ خوش خلقی اور نیک برتاؤ سے رہتے سہتے ہیں۔ اور اپنا ہم وطن بلکہ بھائی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مذہب والوں کے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور آئندہ بھی اس کا اندیشہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ داخلہ سے لے کر آج تک کسی مذہبی نزاع کا وقوعہ نہیں ہوا۔ ۱۹۲۸ء جبکہ اہل چین نے بدھ کی مورتیں توڑنی شروع کیں اور جملہ بیرونی مذاہب سے مخالفت کا اظہار کیا اس وقت بھی مسلمانوں کا اور اسلام کا احترام ان کے دلوں میں قائم

---

(۱) چینی مسلمانوں میں وہ دو عیب نہیں ہیں جو بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں عام ہیں۔ ایک تو قبر پرستی اور دوسرے فرقہ بندی۔ چینی مسلمان اس بات سے واقف نہیں کہ اللہ کے سوا بھی کسی کے آگے سر جھکایا جاتا ہو یا اس سے مدد طلب کی جاتی ہو۔ اور نہ وہ سنی شیعہ اور حنفی وہابی کی تفریقوں سے آشنا ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ نہ ان میں پیر ہیں جنھوں نے مذہب کو پیشہ بنا لیا ہو نہ فقہا ہیں جن کا کام سوائے فرقہ بندی کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ اسلم

رہا۔ انھوں نے تمام مذاہب سے نفرت ظاہر کی خصوصاً گوتم بدھ کی تعلیم پر کانفوشس کے ایک سرگرم معتقد نے ایسا حملہ کیا کہ جس سے ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ان کے آدمیوں کو مار ڈالو۔ کتابیں جلا دو۔ مندروں سے راہبوں کو نکال کر ان کو ذاتی گھر بنا لو تب کانفوشی تعلیم زندہ ہو گی اور بدھ مت مٹے گی۔" اسی صدی میں باکسر عیسائی مشنریوں کے خلاف اٹھے تھے اس کا بھی تماشا دنیا نے دیکھ لیا۔ مگر ایک مسلمان ہیں جن کے خلاف چین میں کبھی شورش نہیں ہوئی یعنی مذہبی حیثیت سے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ اور ان کی عزت اور ان کا وقار برابر قائم رہا۔

عہد ٹینگ میں اگر حکومت مسلمانوں پر جور و تعدی نہ کرتی اور ان کو ان کے اقتدار نہ کہ مذہب کی وجہ سے نہ ستاتی تو یونان۔ کانسو شینسی اور چینی ترکستان میں جو ناگوار صورت پیدا ہو گئی تھی کبھی نہ پیدا ہوتی۔ چینی مورخین سب متفق ہیں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ خاندان ٹینگ کی زیادتی تھی۔ اور مسلمانوں کا قصور نہ تھا۔ اگر یہ پانچ واقعات چینی مسلمانوں کی تاریخ میں پیش نہ آتے تو آج ان کی قوت و عزت اور ان کا اثر اور زور ہر اعتبار سے زیادہ نمایاں ہوتا۔ تاہم مقابلۃً وہ چین کی دیگر اقوام سے اچھی حالت میں ہیں اور ان کی اصلی شان باقی ہے۔

انقلاب کے بعد:

ادھر آخری زمانے میں جب انقلاب ہوا۔ اور شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور جمہوری حکومت قائم ہوئی تو مسلمان کسی لحاظ سے بھی دوسروں سے پیچھے نہیں رہے۔ جمہوریہ کے اصول اساسی میں ایک اصول یہ رکھا گیا کہ پانچوں اقوام (مسلمان۔ چینی۔ پانچوں۔ منغول اور تبتی) کے حقوق مساوی ہوں گے۔ اور حکومت ان کی مشترکہ حکومت ہو گی۔ سرکاری ملازمت قابلیت کے لحاظ سے دی جائے گی نمائندوں کے انتخاب میں ہر شخص آزاد ہے۔ یعنی عوام جس کو اچھا سمجھتے ہوں خواہ مسلمان ہو خواہ غیر مسلمان اس کے حق میں رائے دیتے ہیں وہاں آج نہ اقلیت کا سوال ہے نہ اکثریت کا۔ نہ تحفظات ہیں اور نہ "سیف گارڈ" مذہبی معاملے میں ہر شخص آزاد ہے۔ سیاسی معاملات قوم کی رائے پر موقوف ہیں۔

مسلمانان چین کی تعداد :

چونکہ چین میں مردم شماری نہیں ہوئی ہے اس لئے میں مسلمانوں کی صحیح تعداد نہیں بتلا سکتا نہ میرے پاس اس کے دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ ہے۔ چینی حکومت کے اندازہ میں کل چین کی آبادی چالیس کروڑ ہے جس میں سے مسلمانوں کا تخمینہ ۲ کروڑ کم و بیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ وہاں کے دستور اساسی میں نہ یہ تعین ہے کہ مسلمانوں کے نمائندے اس قدر ہونے چاہئیں نہ سول ملٹری سروس میں ان کی تعداد مقرر ہے اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ حکومت میں ان کی تعداد کس قدر ہے۔ آفیشیل گزٹ سے بھی ہم نہیں معلوم کر سکتے کیونکہ چینیوں اور مسلمانوں کے ناموں میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ جہاں تک مجھے ذاتی علم ہے کہ حکومت نانکینگ کی مرکزی مجلس عاملہ میں دو ممبر مسلمان ہیں۔ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ عہدوں پر چار ہیں۔ فوجی جنرلوں میں ان کی کثرت ہے۔ ۱۹۲۳ء میں وزیر تعلیم مسلمان تھا اور چینی ترکستان کا گورنر بھی مسلمان تھا۔ سیاسی امور میں مسلمان اپنے ہموطنوں سے پیچھے نہیں ہیں اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اب چین میں منگولین اور تبتی کانفرنس کے لئے ۱۳۱ نمائندے منتخب ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیس مسلمان ہیں اور کانفرنس کا صدر بھی مسلمان ہی ہے جس کا نام ما فو ہنگ ہے۔ یہ ٹسن ٹاؤ کے ہاں کمشنر رہ چکے ہیں اور حکومت نانکینگ نے ان کو محکمہ مال کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا ہے۔

قصۂ حسینی

یعنی

قطب شاہی عہد کی ایک نامعلوم مثنوی

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے متعدد شعرا اور اُن کی تصانیف کا پتہ چل چکا ہے مگر ہنوز آئے دن نئے شعرا اور ان کی گراں بہا تصانیف کا اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ یورپ کے ذخیرہ کے مدنظر ہم متعدد تصانیف کا اضافہ کر سکتے ہیں جن کی پوری صراحت انشاء اللہ ہماری زیرِ تالیف کتاب "یورپ کے دکھنی مخطوطے" میں ہوگی۔ یہاں ایک غیر مشہور مثنوی کا تعارف ناظرین سے کرایا جاتا ہے۔ یہ مثنوی "قصۂ حسینی" ہے۔

یہ مثنوی انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ نمبر ([illegible]) تعداد اوراق (۷۹)، سائز (۸ ½ × ۴) سطر (۱۶)، اشعار کی تعداد تقریباً (۱۲۰۰) ہے۔

اس کے متعلق بلوم ہارٹ مصنف کیٹلاگ کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

"امام حسین کے حالات اور ان کی جنگ کا بیان ابتدا میں حمد و نعت، خلفائے راشدین کی منقبت شیخ عبدالقادر جیلانی اور محمد حسینی گیسو دراز کی مدح ہے۔ مصنف عزیز تاریخ تصنیف ۱۱۹۰ھ"

اسپرنگر۔ اسٹوارٹ۔ ڈی ٹاسی کسی نے بھی اس مثنوی کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی ہے اور پھر بلوم ہارٹ نے بھی صحیح حالات نہیں لکھے مثنوی کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔ مصنف اور تاریخ تصنیف کی جو وضاحت کی گئی ہے وہ بھی صحت طلب ہے۔

میری تحقیقات سے اس مثنوی کا نام "قصۂ حسینی" ہے جیسا کہ خود مثنوی کے اشعار سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

دھروں نام قصۂ حسینی مگر   بھی کد کوئی ایسا نکتے بشر

(ص ۹۷ب)

قصیان ہیں قصایوا ہے آبدار حسینی قصے ہوا ہے آبدار

(ص ۲۰۰)

بلوم ہارٹ نے جس شعر سے ۱۱۰۹ھ اخذ کیا ہے وہ درست نہیں ہوسکتا بلکہ اس شعر سے صاف طور پر ۱۰۹۰ھ ظاہر ہوتا ہے۔

تھے ہجرت نود پہ ہزار ایک سنہ گذرے کے نبی مافتا ہور ہنہ

(ص ۱۴۵ ب)

علاوہ ازیں زبان کے لحاظ سے بھی یہ گیارہویں صدی ہجری کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ مصنف کے متعلق بلوم ہارٹ نے جن اشعار سے عزیز خیال کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں

سنو اے عزیزاں قصہ دلپذیر قصے میں قصہ بھی کہوں بے نظیر

(ص ۲۰ ب)

عزیزاں سنو گیاں سو کان دھر حسن شہ کا قصہ دھیان دھر

(ص ۸۰ ب)

عزیزاں سنو بات دل و جان سوں کہوں بات سانچے میں ایمان سوں

(ص ۱۴۴ ب)

نہ رہنا کفر میں آ اے عزیز لیا ایمان سگل یو چلو باتمیز

(ص ۱۴۳ ۲)

میری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے یہاں عزیز سے مصنف اپنی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہے بلکہ مخاطب کر رہا ہے اس کے برخلاف میں اس کو "خواص" کی تصنیف قرار دیتا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ خواص علی مصنف کا نام ہو۔ میں اپنے بیان کی تائید میں حسب ذیل اشعار پیش کرتا ہوں:۔

سنیا کان دھر جب یہ بچن خواص یو سمرن کر کھیا یوں نپٹ داس ہو

(ص ۶۹ ب)

ہوویں خواص ہور عام کون تام یو　　رہیں بعد میرے میرا نام یو
(ص ۱۰۰)

اے یاراں سنو بھی علی خواص کے　　کیا صفت جب ہیں ایسی ذات کے
(ص ۱۴۵)

امید ہیں دہروں یوں خدا پاس یو　　وید یدار مجکون کریں خواص او
(ص ۱۴۶)

رکھیں بھی چرن پاس نبی خواص کے　　گل اندام نازک مشک باس کے
(ص ۱۴۶)

جگت خواص ہور عام کون شاد کر　　اور لیسہ سب کا برباد کر
(ص ۱۴۶)

اسپرنگر نے عیار الشعرا کے حوالہ سے ایک دکھنی شاعر خاص کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے وہ یہی ہو۔

اگرچہ دکھنی تذکروں میں بھی ان کا نام نہیں ہے مگر یہ کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے کیونکہ اسی عہد کے متعدد شعرا جن کا کلام موجود ہے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ بہرحال میری رائے یہی ہے کہ قصۂ حسینی کا مصنف خواص ہے۔ جو قطب شاہی دور کا شاعر تھا۔ زبان کے لحاظ سے بھی اس کو قطب شاہی تصنیف قرار دینا ضروری ہے۔

خواص کے کچھ حالات خود اس کی تصنیف سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ فقیر منش آدمی تھا۔ صوفی شاہ قادری سے بیعت تھی۔ ان سے خلافت بھی حاصل تھی۔ اس کو شاہی دربار سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ اس کو اپنی شاعری پر دعویٰ نہیں اور نہ اپنے آپ کو وہ شاعر تصور کرتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے اس قصے کو ایک بشارت کی بنا پر لکھا گیا ہے اس کے متعلق تفصیل کی ہے اور بتایا ہے ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ آنحضرت صلعم کی مجلس میں موجود ہے۔ آپ کے آل اصحاب

جمع ہیں آنحضرت نے اس سے ارشاد فرمایا کہ حسین کا قصہ لکھے۔ اس حکم کی تعمیل میں اس نے قصہ لکھا پندرہ ذی الحجہ ۱۰۹۰ھ کو عصر کے وقت اس سے فرصت ہوئی۔ قصہ مرشد کو سنایا گیا وہ بہت خوش ہوئے اور پان عنایت فرمایا۔

مثنوی میں حسب رواج قدیم اول حمد ہے پھر نعت پھر خلفائے راشدین کی منقبت اس کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی مدح پھر محمد گیسو دراز کی تعریف اس کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ بادشاہ کی تعریف وغیرہ کچھ نہیں ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا اس میں حضرت امام حسین کا قصہ ہے مگر شہادت (؟) کی اصلی واقعات نہیں بلکہ درحقیقت ایک افسانہ اور قصہ ہی ہے۔ وہ لکھتا ہے عبدالمناف کے دو فرزند تھے جن میں سے ایک ہاشم تھے ان کے فرزند عبدالمطلب ہیں۔ ان کے پوتے آنحضرت کے نواسے امام حسن اور حسین ہیں۔ ان کو آنحضرت نہایت عزیز رکھتے تھے ایک دن جبرئیل آئے اور خبر دی کہ ان کو قتل کیا جائے گا۔ آپ نے دریافت کیا کون قاتل ہوگا؟ کہا گیا یزید بن معاویہ۔ اس کے بعد آنحضرت نے انتقال فرمایا ابو بکر رض جانشین ہوئے۔ پھر عمر اور عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے بعد دیگر حکمران ہوئے علی علیہ السلام کے بعد معاویہ نے اپنی حکومت مستحکم کر لی۔ اس زمانے میں یزید مدینہ آیا۔ مدینہ کی ایک حسین اور جمیل خاتون زینب نام عبداللہ ابن زبیر کی بی بی تھیں۔ یزید ان کو دیکھ پایا عشق کا تیر جگر کے پار ہو گیا اپنا حال زار باپ سے بیان کیا۔ معاویہ نے ابن زبیر کو مال و زر کا لالچ دیا کر زینب کو طلاق دلا دی۔ عدت کے ختم ہونے پر موسیٰ انصاری کے ذریعہ یزید کا پیغام روانہ کیا گیا۔ راستے میں قاسم بن عباس سے ان کی ملاقات ہوئی۔ قاسم نے موسیٰ سے کہا ان کا بھی خیال رکھا جائے اس کے بعد موسیٰ کی حسن ابن علی رض سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے بھی اپنے متعلق کہا۔ غرضکہ موسیٰ زینب کے پاس پہنچے اور تینوں کے ارادے سے اطلاع دی۔ زینب نے ان ہی سے مشورہ کیا انھوں نے جواب دیا اگر حکومت مال اور دولت کی خواہش ہے تو یزید کو ترجیح دے، اگر حسن کی خواہش ہے تو قاسم کو منظور کرے۔ اور اگر آخرت کی تمنا ہے تو امام حسن کو قبول کرے۔ زینب نے امام حسن

کو پسند کیا اور عقد ہو گیا۔ جب یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان کو زہر کے ذریعہ ہلاک کر دیا اور امام حسین سے جنگ کے لئے فوج روانہ کی اس کے بعد کربلا کے حالات لکھے گئے ہیں پھر بیان کیا گیا ہے کہ امام حسین کی شہادت کے بعد ایک تاجر ہاشم نام نے محمد ابن حنیفہ کو خط لکھ کر یزید سے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ وہ بھیس بدل کر آئے یزید سے ملاقات کی اس کو قتل کیا۔ امام زین العابدین کو طلب کر کے بادشاہ بنایا گیا۔ اس مضمون پر قصہ ختم ہو جاتا ہے۔

اب کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

حمد میں کہتا ہے :

نہ تج نیند غفلت نہ انکھیاں نے تون　　　سدا جیو تا ہے تون بن جیو سو ن

نہ تج باپ مادر نہ عورت اہے　　　نہ فرزند بیٹا نہ بیٹی اہے

نعت میں کہتا ہے :

محمد تون ہے نور دنتا گنبھیر　　　جگ آدھار ہے ہور جگ دستگیر

شرف یو جو تجکوں خدا نے دیا　　　اپس نور تے تجکوں پیدا کیا

تون صاحب ہے لولاک تعریف کا　　　تون سرور نبیاں میں ہر عاریف کا

شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کرتا ہے۔

تون اے غوث اعظم سو ثقلین ہے　　　تون اکمل مکمل سو کونین ہے

کہیا رب نے تج تے سو جم جم کلام　　　تون نور ہے نبی کا علیہ السلام

مثنوی کی تصنیف اور بشارت کے متعلق دیکھو :

سنا تھا سو یک رات میں خواب میں　　　ولیکن دل اندر اتھا یاد میں

کرم لطف کر تج پہ عالم پناہ　　　نبی یا محمد شفیع الگناہ

ہیدر چودہ دیس چاند کے برج کا　　　سندر حسن کا دو رچکے برج کا

آئے دیدے سون چندر سور ہے　　　نہ چندر سورج کون اتھا نور ہے

حسن اور حسین بھی اتھے چہار یار　　اُنو میں علی شاہ دلدل سوار

کھرا ایک طرف ہیں تھا حیران ہو	بھی تلتل نبی پر قربان ہو
دیکھے بھر نظر منج بلائے نزدیک	ہور رحمت خدا تج ہی پیارا دیک
بٹھائے سمور آپ پکڑ ھات منج	تون ہے دوست میرا کہے سات منج
اہے پیار میرا اُپر تج زیاد	تون تلتل میرے دل کون کرتا ہی شاد
اہون میں محمد نبی الثحم	ہوے نور تے منج بوں سارے عدم
کہوں بات میں ایک توں کان دھر	سینے پر توں چلتا اہے گیان دھر
تھا ایک حسن شاہ حسین نچھل	بنا تون دہریں سب تصوی میں فضل
دکھن سال موتی نچھل دھال کے	لیا تون سمندر تے اپر خیال کے
گندوں ہار اس کے یوں کانٹ سون	شجاعت حسین شاہ بہوت بہات سوں

جبرئیل آنحضرت کو شہادت حسینؑ کی خبر دیتے ہیں :-

کہے جبرئیل اے حبیب خدا	مریضان کیتن توں طبیب سدا
سنو بولتا ہوں بیان دار سول	تون آدھار مت نرادھار کوں
معاویہ ہر یک تج پر ذات کا	یزید اسکون بٹیا ہے کم ذات کا
کھڑے رہیں عدو ہو کہ جن کے نپٹ	کٹاویں تیری آل وندی
نہ رہے سر پہ تون ہور فاطمہ یا چہار یار	کئے آل کون تج عدو ٹہار ٹہار
اپن بھی غدا بانتے مرجائے گا	بکل تن کے کھڑے لیو نہائے گا

موسیٰ انصاری زینب کے مشورے کا جواب دیتے ہیں :-

اگر چاہے دولت دنیا دار کوں — سوکرنا یزید کوں نکاح آج توں
اگر چاہے صورت حسن دار توں — نکاح کر توں قاسم بن عباس کوں
اگر چاہے توں حق نے رحمت کرے — بھی دنیا ہور عقبٰی بنی سر پہ سے
سوکرنا نکا توں حسن جان کوں — بولیا بو ہمارا سو سچ مان توں

علی اکبر کا حملہ کرنا :

اتھا ناؤں اس کا سو اکبر علی — ولیان میں خدا کے اتھا اکمل ولی
اتھا او چند رشہ کبرا پیار کا — صورت میں اتھا او نبی سار کا
دیکھے شاہ اسے حبیب نبی یاد آویں — اپسنے سوں لگا کر کرتے تسلی آئیں

اٹھا غلغل تب او تکبیر کا — اٹھا شیر بالک حسین شیر کا
پڑیا جا غنم پر سو اد قہر ہو — چلیا مارتا زہر پہ زہر ہو
لگیا تور نے بے ضرب بے شمار — منڈیاں تٹ غنیم گیاں پڑے ٹہار ٹہار
کیا سب و ندیانکوں رات تل اپر — ماریا چہار صد سوار جنگی بشر
ولیکن نہ پانی اسنے پائیا — سو پھر باپ کے پاس اب لیائیا

محمد حنیفہ کا زین العابدین کو بادشاہت دینا :-

بزاں شہ محمد حنیفہ نول — کئے پر فنا سب و ندیاں کوں کھل
خلافت شہ کنول پھول کوں — او فرزند حسینا کے مقبول کوں
کرایا شرن سب جگت خواص کوں — دلا خلعتاں پاس اخلاص سوں

قصہ کے ختم پر اپنے پیر کی مدح شروع کرتا ہے:-

کروں بھی صفت میرے پیر کی ‏ ‏ ‏ ‏ اور دسش منور اہے سور کی
زعن تج اپرہے یو شہ کارنے ‏ ‏ ‏ ‏ ثنا کر بدل شہ اپر و ارنے
پکڑ ہات میرا چندر ادس رات ‏ ‏ ‏ ‏ او حضرت صوفی شہ قادری ذات
جس کا کرشہ مجکوں کرم پار سوں ‏ ‏ ‏ ‏ رکھیا کر الیس مج زرا دھار کوں
ہور نور پر نور بھی نور کوں ‏ ‏ ‏ ‏ کیا دل منور ادک سور کوں
پریں ایک پر یک ستی لے گر ‏ ‏ ‏ ‏ پھریں ایک چرن شاہ شرف پائے گر
تھا مکشوف شہ کوں دنیا دین سب ‏ ‏ ‏ ‏ او یوتا میرا کان ہے معشوق رب
عرش تے سرے لگ چھپا کچ نہا ‏ ‏ ‏ ‏ مراقع مینی شاہ رہے دیکھتا

اس کے بعد مزید مدح کی گئی ہے کہ مریضوں کو ان سے شفا ہوتی ہے ۔ راجہ پرجا کوئی ان کی نظر میں نہ تھا ۔ ان کو کبھی غصہ نہ آتا تھا ۔ اس کے بعد لکھتا ہے :-

اسی نور تے کچ رہیا پاس منج ‏ ‏ ‏ ‏ جنم جگ جے لگ رہے پاس منج
اسی نور تے منج سدا نور ہے ‏ ‏ ‏ ‏ وے شہ غم دو دل سدا چور ہے
ز برکت چندر شہ کے ہر حال میں ‏ ‏ ‏ ‏ لے آیا ہوں ایسے رتن لال میں
دگرنہ نظم کے سکت کان منے ‏ ‏ ‏ ‏ یو توفیق ہوئی منج چندر جگ تے
ولیکن بدن بیس پاتی کیا ‏ ‏ ‏ ‏ یزاں یو قصہ منج شافی ہوا

اس کے بعد اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ انھوں نے قصہ کو پسند کیا ، پان عنایت فرمایا ، شال دی اسی وقت سے ان کا دل منور ہوا اسی حال میں ایک شیر آیا جس کے خوف سے سب لوگ فرار ہو گئے ۔ انکے مرشد نے فرمایا شیر ان کی ملاقات کے لئے آیا ہے ۔ اس کے بعد وہ شیر غائب ہو گیا ۔

اس کے بعد اپنے متعلق صراحت کی ہےاور اپنے شاعر نہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔

ہوے فارغ کھاں کھا شہ نول	منگائے بزاں پان کھائے بدل
پتیاں پان کے دو نجھل لیائے	دے یک مج دو جی شہ اپے کہائے
بزاں یک مینڈا ساز روشاں تھا	پیٹے ور پیشاں کا بہتر خیال تھا
دوجی یک ہری شال کا جامہ نجھل	سفید پاک سالو کا فامیاں سگل
منگائے سو درحال اولیائی کر	نیائے مجھے لیا بہوت چاؤ کر
بزاں ہات پکڑ منجہ کتک راز کئے	رضائے بزاں مج اپی و ہاں ج رہے
ہوا دل منور اسی وقت پر	پھریا دوک جون شہ پرا نجتور
اے یاراں سنو بھی علی خواص کے	کیا صفت جب میں ایسی ذات ہے
آیا شیر بنگی بہتر گھر سنے	لرزنے لگے سب پیری در سنے
علی شیر ہیں ہوں خدا جا نتا	انا مج ملاقات کے واسطا
ہوا اک غائب اس ٹہار پر	اے شاہ محمد نبی ہائے کر
میں تو کچ نہ شاعر ہوں دعوا کروں	نہ شعر اوپر میں ہلاوہ کریں
نفر ہو پیر یا ہوں سدا سو جتا	کریں عاقبت کیا نہ مج سو جتا

نمونہ پیش شدہ سے شاعر کی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔اگرچہ اس نے اپنے متعلق نہایت انکسار سے کام لیا ہے مگر کلام ایسا نہیں ہے جو نظر انداز کیا جائے۔اگرچہ اس کو قطب شاہی دور کے صف اول میں جگہ نہیں دیجا سکتی مگر آخر پر بھی نہیں رکھا جاسکتا۔

مصری لشکر عہد فراعنہ میں

اس کی تنظیم اور قوت

جس طرح قدیم ہندوستان میں چار طبقے رعایا کے کئے گئے تھے اسی طرح قدیم مصر میں بھی رعایا کے طبقے مقرر تھے، لیکن مورخین کا اختلاف ہے کہ قدیم مصر میں کتنے طبقے تھے اور ان کی کیا کیا خدمات مقرر تھیں۔

چنانچہ مشہور مورخ ہیروڈوٹس اپنی کتاب میں سات طبقے بیان کرتا ہے مگر استرابو نے صرف تین ہی بیان کئے ہیں۔ افلاطوں کی رائے میں چھ ہیں۔

علاوہ ان کے اور مورخین میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے سات سے زائد اور بعض نے کم بیان کئے ہیں، لیکن جہاں تک تحقیقات اور معلومات صحیحہ کے ذریعہ نتیجہ اخذ کیا جا سکا یہی معلوم ہوا کہ رعایا کے چار ہی طبقے تھے جن کی ہندوستان قدیم کے طبقوں سے مشابہت کامل تھی۔ یعنی علماء مذہب جس طرح ہندوستان میں برہمن، سپاہی جیسے چھتری، کاروباری جیسے ویش، عوام جیسے شودر، مگر مصر میں تاریخ عوام کی وہ حالت چھوت چھات کے اعتبار سے نہیں بتاتی جو حالت ہندوستان میں شودر کی رہی ہے۔

اس تقسیم کے مطابق لشکری طبقہ کا مرتبہ علماء مذہب کے بعد تسلیم کیا گیا تھا۔ قانوناً حکومت پر لازم تھا کہ وہ کل اراضی کا ثلث ⅓ حصہ فوج کے لئے مخصوص کر دے تاکہ فوج زمانہ امن میں اس اراضی کو کاشت کر کے یا کسانوں کے ذریعہ خود کاشت کرا کر اپنی ضروریات حاصل کرے (یہ طریقہ ہندوستان میں جاگیروں اور معافیوں کی شکل میں بعض دیسی ریاستوں میں اب بھی مروج ہے) اور یہی لوگ حالت جنگ میں ملک کے محافظ اور دشمن پر حملہ کرنے والے سپاہی تھے چنانچہ ہیروڈوٹس

اپنی تاریخ مصر میں لکھتا ہے کہ ہر ایک سپاہی کو اس کے رتبہ کے موافق فرعون کی جانب سے زمین ملی ہوتی ہے جس کا وہ حکومت کو کوئی لگان ادا نہیں کرتا۔ اور اسی زمین سے وہ اپنی ضروریات زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ جب عسکری طبقہ کا لڑکا فوجی خدمت کے قابل عمر کو پہنچتا تھا تو وہ مدرسہ حربیہ میں بھیجدیا جاتا تھا۔ ہر سپاہی پر لازم تھا کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرے اور ضرورت پیش آنے پر دشمن کے ملک پر بھی حملہ کرے۔ ان سپاہیوں کو حملہ کرنا قلعوں کی حفاظت کرنا وغیرہ غرض فنون جنگ سے متعلق حملہ و دفاع کی پوری پوری تعلیم دی جایا کرتی تھی۔ اور خاص طور پر ہر سپاہی کے یہ ذہن نشین کیا جاتا تھا کہ ملک کی ضرورت پر کس طرح وہ آناً فاناً ملک کی خدمت کے لئے حاضر ہو۔ چنانچہ زمانہ قدیم میں اسی اصول کے تحت جو فوج تھی اس نے ہی کل لڑائیاں لڑی ہیں۔

مصری لشکر کی تنظیم :

تاریخی کتابوں سے جہانتک معلوم ہوسکا اس زمانے میں مصری فوج کی تعداد ۴ لاکھ دس ہزار کے قریب قریب تھی اور یہ فوج دو حصوں میں منقسم تھی ایک کا نام کالینزریس اور دوسری کا ہیرموتبیس تھا اور ہر سال اس میں سے سو جوان فرعون کی فوج خاصہ یعنی باڈی گارڈ کے لئے منتخب ہوتے تھے۔ اس فوج باڈی گارڈ یا خاصہ کو علاوہ معاوضہ اراضی کے ۵ روٹیاں، کافی مقدار میں بکری کا گوشت اور کچھ شراب روزانہ بطور راشن بھی ملا کرتی تھی۔

ہیرموتبیس فوج کے مقابلے میں کالینزریس سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس فوج کی تعداد قریب قریب دو لاکھ پچاس ہزار کے تھی اور ان کی چھاؤنیاں طیبہ، بوبسطہ، افیئیر، تانیس، منڈس، جزیرہ سیکفوریس، اتابیس و تمیس وغیرہ مقامات پر پڑی ہوئی تھیں۔

بعض بعض قدیمی تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض حصوں میں آج کل کی طرح ڈویژن و برگیڈ کا نظام تھا اور انکے نام انکے دیوتاؤں کے ناموں پر تھے مثلاً کسی ڈویژن حصہ فوج کا نام (رع) اور کسی برگیڈ حصہ فوج کا نام (آمون) (پتاح) وغیرہ تھا۔

فرعون تمام افواج کا قائد اعظم یا کمانڈر انچیف تھا۔ اس کو ہی یہ حق تھا کہ ہر سر فرقہ یعنی ڈویژن وبریگیڈ پر اپنے عزیزوں اور اپنی اولاد وحاشیہ کے لوگوں میں سے افسر مقرر کرے۔ کبھی کبھی وہ ایسے افسر قیدیوں میں سے یا ان کی اولاد میں سے بھی منتخب کر لیا کرتا تھا جو کسی پہلی جنگ میں بحیثیت قیدی فرعون کے قبضہ میں ہوتے تھے اگر ملک سے باہر فوج کو لڑانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اکثر خود فرعون کی ہی زیر قیادت لشکر حملہ کرتا اور وہ خود جملہ امور جنگی کا نگراں رہتا۔ اکثر حالت جنگ میں فرعون اپنے رتھ میں سوار اپنے خاصہ کی فوج اور بڑے بڑے امرا، رؤسا، قوم کے ہمراہ میدان جنگ میں موجود ہوتے اور اس کی وجہ سے فوج کے سپاہی جان چرا کر میدان جنگ سے فرار نہیں ہو سکتے تھے۔

اس لشکر کے علاوہ ایک لشکر مصر میں اور تھا جن کو نقدی سے معاوضہ دیا جاتا تھا جیسا کہ آج کل عموماً فوجوں کی نقد تنخواہ دینے کا دستور ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر جنگی قیدی یا ان کی اولاد ہوتی تھی جو مدت سے مصر میں ہی سکونت پذیر ہو گئی تھی۔ اس ماتحت ملک کی فوج بھی جو مصر کے بادشاہ کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر چکی تھی۔ لیکن یہ فوجیں اگرچہ نشان اپنا ہی استعمال کرتی تھیں۔ مگر وہ مصری افسروں کے ہی ماتحت ہوتیں اور جس طرح مصری افسر چاہتے ان سے کام کیا کرتے تھے۔ مگر ان میں مصری فوج کی سی طاقت نہیں ہوتی تھی نہ یہ ایسے دلیر اور آزمودہ کار ہوتے تھے جیسا کہ مصری اصلی فوج مگر ایک نمایاں حیثیت ضرور ہو جاتی تھی۔ مگر تاریخ میں ایک زمانہ ایسا بھی ہے کہ نوبیہ اور حبشی فوجوں کی فضیلت (جو مصر کے ماتحت ممالک تھی) مصری اصلی فوج پر ہر حیثیت سے ثابت ہوتی ہے اور یہ فوج اصلی مصری نہیں تھی بلکہ ملازم کی ہی حیثیت رکھتی تھی چنانچہ فرعون رمسیس ثانی کے زمانے میں بھی لیبیا، نوبیہ وغیرہ کی فوجوں کی فضیلت خاص مصری فوج پر ثابت ہے۔

مصری ہتھیار:

مصری ہتھیار میں تیر، کمان اور نیزہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان فنون میں مصری خاص طور سے ممتاز ہوتے تھے۔ اس میں پیدل وسوار کی کوئی تخصیص نہ تھی بلکہ جو لوگ اپنی جنگی گاڑیوں

میں سوار ہو کر لڑائی میں شریک ہوتے تھے۔ ہم نے مندر آسیا اور معبد اوفو میں جو مرقع دیکھا ہے اس
میں مصری فوج کے ہتھیار انکی جنگی پوزیشن اس طرح ظاہر کی گئی ہو کہ جنگی گاڑیاں ہیں پھر سوار ہیں اور
ان کے امدادی پیدل سپاہی ہیں۔ یہ سب تیر کمان اور برچھی سے مسلح ہیں۔ کمانڈر انچیف قلب لشکر
میں ہے اور باقی افسر قلب کے دونوں بازوؤں پر کمان کر رہے ہیں۔ چنانچہ توریت کی چودہویں
فصل جو سفر الخروج کے نام سے ہے جس میں فرعون کا سمندر میں غرق ہونا ظاہر کیا گیا ہے اس میں بھی
یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سوار اور گاڑیوں کے سوار وغیرہ سب فرعون کے ہمراہی ہیں اور یہ واقعہ کے
خلاف نہیں ہے۔ بلکہ عین مطابق واقعہ ہے کیونکہ فراعنہ اپنی جنگی گاڑیوں ہی میں بیٹھ کر لڑائی میں
شریک ہوتے تھے۔ سوار تو زیادہ تر والنٹیر کور میں ہوتے تھے اصلی فوج کے پاس تو عموماً گاڑیاں
ہوتی تھیں۔ بلکہ شمپلیون تو یہاں تک لکھتا ہے کہ توریت میں جہاں سواروں کا ذکر ہے وہاں گھوڑے
کے سوار مراد نہیں ہیں بلکہ بگھی گاڑیوں کے سوار مراد ہیں۔ غرض مصری فوج میں جنگی گاڑیاں بمقابلہ
گھوڑوں کے زیادہ مروج تھیں۔ مصری پیدل فوج چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم تھی جس طرح پلٹن کا
اس زمانے میں رواج ہے۔ اور ہر ہر حصہ کے پاس اس کے خاص نشان یا جھنڈے ہوتے تھے۔
بقول پلوٹارک مورخ ہر پلٹن اپنے اپنے ہتھیاروں سے ممیز ہوتی تھی۔ ان پلٹنوں کی تقسیم انکے
اسلحہ کے اعتبار سے حسب ذیل تھی یعنی تیر کمان بردار دستے۔ نیزے بردار دستے۔ تلوار بردار
اور گوپھن بردار وغیرہ اور یہ سب فوج اسی طرح جس طرح آج کل کمپنی پلٹن بریگیڈ اور ڈویژن میں منقسم ہوتی
ہیں۔ قدیم مصر میں بھی اسی قسم کی تقسیم تھی اور ہر کمپنی اور پلٹن بریگیڈ کی جھنڈیاں تھیں اور انکے جداجدا
افسر تھے۔ دوسری تاریخوں سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ عبرانی فوجوں میں بھی اس وقت میں
ایسی ہی ترتیب و نظام مروج تھا۔ کوچ و مقام کے وقت افسر اپنی پلٹن بریگیڈ وغیرہ کی پوری نگرانی
رکھتے تھے۔ ان میں ایک خاص گروہ بھی ہوتا تھا جو زرہ خود پوش ہوتا تھا عموماً یہ لوگ حالت کوچ اور
جنگ کی صورت میں باقی فوج کے آگے رہا کرتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عموماً حملہ کے وقت تیر
کمان نیزے گوپھن اور تلوار سے کام لیا کرتے تھے۔ ان کے پاس عام زرہ خود وغیرہ تھے لیکن اس

زرہ کا پتہ نہیں چلتا جس سے پنڈلیاں اور رانیں بھی محفوظ رہ سکیں۔ غالباً مصری ایسے لباس سے
واقف نہ تھے۔ ان میں سب سے زیادہ وہ زرہ مروج تھی جو سپاہی کے بازو طویل اور عرض میں [illegible]
کے نصف ہوتی تھی۔

یہ زرہیں اکثر معدنی چیزوں کی بنائی جاتی تھیں اور کبھی کبھی [illegible] کی کھال کی بھی بنائی جاتی تھیں
لیکن بال بھی کھال پر ہوتے تھے اور بال والا حصہ اوپر ہوتا تھا جیسا کہ آج کل افغانستان میں پوستین
مروج ہے۔ یہ زرہیں یونانی و رومانی زرہوں کی طرح ہوتی تھیں بہت تھوڑا فرق تھا۔ ان زرہوں
کی کڑیاں ایسی ہلکی بنائی جاتی تھیں کہ کل زرہ کا وزن کم ہو اور اس کو اٹھانے لیجانے میں زیادہ دقت
اور تکلیف محسوس نہ ہو۔

مصری کمان یورپین قدیم کمان کے بالکل مشابہ ہوتی تھی عموماً دو فٹ یا ساڑھے پانچ فٹ
لانبی ہوتی تھی۔ تیر عموماً ۲۲ انچ سے ۲۴ انچ تک لانبا ہوتا تھا۔ اس کے سرے پر [illegible] دھات کا پھل
لگا ہوا ہوتا تھا۔ یہ تیر لکڑی کے ہوتے تھے

فوج کے پڑاؤ یا کیمپ:

مصری فوج مربع یا متوازی الاضلاع شکل میں پڑاؤ ڈالا کرتی تھی عموماً پڑاؤ کا صرف ایک
ہی دروازہ رکھا جاتا تھا۔ وسط میں سپہ سالار کا خیمہ نصب ہوتا تھا کیمپ کا نظام ترتیب قریب قریب قدیم
رومانی کیمپ کے نظام کے ہوتا تھا۔ سپہ سالار کے خیمہ کے چاروں طرف خندق کھودی جاتی تھی
یا خاص استحکام کیا جاتا تھا۔ اس کے ہی قریب میں تین خیمے اور ہوا کرتے تھے جو سپہ سالار عام
کے ماتحت بڑے افسروں کے ہوتے تھے۔ سپہ سالار کے باڈی گارڈ کا پہرہ ہر وقت اس جگہ رہا کرتا
تھا۔ اور ایک خاص محافظ دستہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ فوج کے کیمپ کے قریب ہی فوجی [illegible]
گاڑیوں اور سامان حرب وغیرہ کے لئے جگہ رکھی جاتی تھی۔

سپہ سالار کے خیمہ کے برابر ایک چھوٹا سا مندر اپنے کسی دیوتا کا بھی بنایا کرتے تھے اور اس کے
ہی ملحق اپنے مذہبی مراسم کے لئے انتظام کیا جاتا تھا چنانچہ بعض بعض تصاویر جو قبروں [illegible]

سے برآمد ہوئی ہیں انکے دیکھنے سے کیمپوں کے ایسے ہی نقشے سمجھ میں آتے ہیں۔ اور ان ہی تصاویر میں گدھے اونٹ بلا کاٹھی بھی دکھائے گئے ہیں اور ان کے سامنے چارہ دکھایا گیا ہے یعنی ایسی حالت میں کہ وہ کیمپ میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد گاڑیوں اور جنگی گاڑیوں کی قطار نظر آتی ہے۔ ایک طرف ہتھیاروں کا ایک قرینہ سے رکھا ہونا بتایا گیا ہے۔ کیمپ کے داہنی جانب ایک میدان فوجی کرتبوں وغیرہ کے لئے مخصوص کیا جاتا تھا۔ ایک جگہ مجرمین کو سزا دی جا رہی ہے۔ ایک جگہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ بعض بعض فوجی افسر اور امرا اپنی اپنی جنگی گاڑیوں میں سوار لشکر میں گشت کر رہے اور حکم احکام ضروری نافذ کر رہے ہیں لشکر کے بائیں جانب شفاخانہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس کے پاس ہی حیوانات کا شفاخانہ تھا جہاں مریض حیوان دکھائے گئے ہیں۔ اور ان تصاویر میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح دوا ساز دوا تیار کرتا اور مریضوں کو پلاتا ہے۔

ہر ہر بریگیڈ اور پلٹن کا نشان اور جھنڈا علیحدہ ہوتا تھا اور اس کا نام بھی ہوتا تھا جو عموماً کسی دیوتا یا بادشاہ یا حیوان مقدس کے نام سے منسوب ہوتا تھا۔ اس نشان کو عموماً ہر سپاہی ایک مقدس مذہبی شے خیال کرتا اور نہایت احترام و عزت سے اس کی طرف دیکھتا تھا۔

دیودورصقلی لکھتا ہے کہ یہ جھنڈیاں برچھی پر بندھی ہوا کرتی تھیں جس کو افسر خود اپنے ہاتھ میں لیکر اپنے حصہ فوج کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔ اور افسر اس نشان سے فوج میں حرکت عصبیت و شجاعت پیدا کیا کرتے تھے۔ عموماً علمبرداری کی خدمت نہاد رجہ شریف بہادر آدمی کی قسمت میں آتی تھی۔ اور تمام فوج میں سے ایسا سپاہی منتخب ہوا کرتا تھا جو تمام صفات شجاعت و فنون سپہگری شرافت و نجابت میں سب سے زیادہ ممتاز ہوتا تھا۔

سلطنت کی طرف سے بھی ایک عام نشان فوج کے ہمراہ ہوتا تھا اس کو صرف فرعون کے خاص امرا یا عزیز ہی اٹھا سکتے تھے اور وہ مرتبہ میں سپہ سالار یا جنرل کے رتبہ کے ہوتے تھے۔ یہ عموماً وہ لوگ ہوتے تھے جو حالت جنگ اور درباروں میں بادشاہ کے مقربین خاص ہوتے تھے۔ اور یہی لوگ شاہی عصا دربار میں اٹھاتے تھے۔ شاہی پنکھا بھی انھیں کے پاس ہوتا تھا۔

کوچ :

کوچ یعنی سفر میں تمام بھاری وزنی چیزیں اور گاڑیاں قلب لشکر میں ہوتی تھیں ۔ فوجی گاڑیاں فوج کے آگے یا پیچھے ہوتی تھیں ۔ ہراول یعنی مقدمۃ الجیش کے پاس صرف ہتھیار ہوتے تھے اور کوئی وزنی سامان نہیں ہوتا تھا ۔

جب دشمن قریب ہوتا تو بادشاہ یا سپہ سالار ایک عام جلسہ منعقد کرتا تمام فوجی سرداران وافسران کو طلب کرتا پھر اپنے اپنے دیوتاؤں سے امداد کی دعائیں مانگی جاتیں ۔ پھر بادشاہ ایک گروہ کو جس کے ساتھ ایک گاڑی مینڈھے کی شکل کے مشابہ ہوتی تھی آگے کرتا ۔ اس گاڑی میں سورج کی تصویر ہوتی تھی اور اس سے یہ کنایہ مقصود تھا کہ دیوتا آمون رع خود مصری فوج کی کمان کر رہا ہے ۔ حملہ کے وقت یہی گاڑی سب سے آگے ہوتی تھی اور اس کی حفاظت فوج کے بہترین سپاہی کرتے تھے اور بادشاہ سپہ سالاروں کو فوجی تحفے دے دے کر لڑائی کے لئے حکم دیتا رہتا تھا ۔ یہاں تک کہ دشمن کو شکست فاش ہو جاتی ۔ پھر بادشاہ خود جملہ افسروں کے سامنے ایک تقریر کرتا اور لڑائی اور اس کی حالت اور اپنی کامیابی سب بیان کر دیتا تھا پھر قیدیوں کا شمار کیا جاتا اور دشمن کے مقتولوں کے داہنے ہاتھ کاٹے جاتے اور وہ سب ہاتھ بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے ان کا شمار کیا جاتا جس سے دشمن کے نقصان کی تعداد معلوم ہوتی یہ پوری تفصیل مندر اسیس ثالث میں جو شہر آبو میں ہے منقوش ہے ۔

اگر لڑائی خشکی میں ہوتی جیسا کہ ذکر ہوا ہے تو عموماً بادشاہ وسط فوج میں اپنی گاڑی پر سوار ہوتا تھا ۔ اگر لڑائی بحری ہوتی تو مصری جنگی کشتیاں ساحل کے برابر صف بستہ ہوتیں ساحل کی فوج بھی دشمن کی کشتیوں پر تیر و گوپھن سے حملہ کرتی تھی ۔ بادشاہ عموماً بری فوج کے ہی ہمراہ ہوتا اور خشکی و سمندر دونوں طرف سے دشمن کی فوج کی نقل و حرکت نظر میں رکھتا تھا جب کامیابی ہو جاتی تو دشمن کا تعاقب کیا جاتا ۔ دریاؤں پر پل بنائے جاتے اور لشکر اس پل پر سے عبور کر کے دشمن کے ملک میں داخل ہو جاتا اور دشمن کے ملک پر جہاں تک ہو سکتا قبضہ کر لیا جاتا تھا ۔ پھر دشمن سے صلح کی جاتی اور اس پر جزیہ مقرر کیا جاتا کبھی یہ سونے اور چاندی کی ایک مقررہ مقدار

ہوتی کبھی مویشی لے جاتے کبھی اسلحہ جنگ حاصل کئے جاتے کبھی ایسی نادر اشیا طلب کی جاتیں جو مصر میں کمیاب اور دشمن کے ملک میں ہوتی ہوں اس کے بعد بادشاہ ایک عام جلسہ کرتا اور جملہ شرکا جنگ افسروں کو جنھوں نے اس کے حکم سے مصر کے لئے خونریزی کی تھی اس میں مدعو کرتا۔ ایک تقریر کرتا ان کا شکریہ ادا کرتا اور اپنے معبودوں کی عبادت کرتا کہ انھوں نے حالت جنگ میں ان کی امداد کی اور اس مدد سے ملک مصر کو کامیابی ہوئی پھر سب لوگوں کو اپنے اپنے مقامات پر واپس جانے کا حکم دے دیا جاتا۔

مصر کے قدیم معابد میں جو لوحیں ہیں انکے دیکھنے سے فراعنہ کے لشکر اور اس کی عظمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے خصوصاً معبد امسیس ثالث کو اگر دیکھو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس زمانے کے لشکروں میں ہیں، تقریبًا دس لوحیں ہیں اور ان میں فوجوں کی ترتیب ان کا طریقۂ جنگ کوچ و قیام وغیرہ سب معلوم ہوتا ہے خصوصاً امسیس ثالث کے ہی زمانے میں جو جنگ اہل مصر اور اہل لیبا کے درمیان یا قوم تکاری اور مصریوں سے ہوئی ان کا نقشہ خوب اور صاف دکھایا گیا ہے اور قریب قریب ہر چھوٹی سی چھوٹی بات لوح پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ ہم ان دس لوحوں کی تفصیل ناظرین کی دلچسپی کے لئے حسب ذیل لکھتے ہیں۔

اول اس لوح میں مصری فوج کی ترتیب کوچ کی حالت میں انکے اسلحہ جو اس وقت میں مروج تھے صاف ظاہر ہوتے تھے۔

دوسری مصر اور لیبا کے درمیان جو جنگ ہوئی جس میں مصری کامیاب ہوئے ظاہر کی گئی ہے بادشاہ خود جنگ میں شریک ہے اور اس کے سامنے لاتعداد مقتول پڑے ہوئے ہیں۔

تیسری مصری فوج نے دشمن کے ۱۲۵۳۵ سپاہی قتل کئے ہیں سپہ سالار دشمن کی فوج کا قید ہو کر بادشاہ کے سامنے مع دیگر قیدیوں کے پیش ہو رہا ہے قیدیوں میں سپہ سالار سب سے آگے دکھایا گیا ہے۔

چوتھی بادشاہ فوج کے درمیان میں کھڑا ان کو لڑائی کے لئے آمادہ کر رہا ہے اور لشکر

اپنے اپنے ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر کوچ و حملہ کے لئے بالکل تیار ہے۔ اس لوح میں خصوصیت سے سپاہیوں کے تفریحی کھیل کو دبھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

پانچویں، فوج کا صف در صف دوبارہ کوچ دکھایا گیا ہے۔

چھٹی، دوسری جنگ اور مصری فوج کی کامیابی کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

ساتویں، ایک شکارگاہ کا نقشہ ہے بادشاہ مع فوج درندوں کے شکار میں مصروف ہے چندوہ شکار کر چکتا ہے لیکن آخر کو خود زخمی ہو جاتا ہے۔

آٹھویں یہ سب سے زیادہ عجیب و غریب لوح ہے آثار قدیمہ مصر نے اس سے بہتر ابھی تک کوئی لوح حاصل نہیں کی۔ اس میں بحری جنگ کا نقشہ اس زمانہ میں جہازوں کی ساخت انکے حملہ کا طریقہ مدافعت غرض سب معلوم ہوتا ہے۔ قوم تکاری کے جہاز قوم شرتنا کے جہازوں کے ساتھ مل کر ملک مصر پر حملہ کر رہے ہیں۔ مصری جہاز مدافعت میں مصروف ہیں خود بادشاہ امیس ثالث مع اپنی بری فوج کے ساحل پر موجود ہے، تیروں اور گوپھنوں سے دشمن کے جہازوں پر حملہ کر رہا ہے۔

نویں، مصری فوج اپنے ملک کو واپس آ رہی ہے اور ایک قلعہ کے پاس فوج ٹھہر کر دشمن کے مقتولوں کے کٹے ہوئے ہاتھوں سے ان کا شمار کر رہی ہے اور قیدی صف بستہ بادشاہ کے سامنے موجود ہیں، بادشاہ اپنے امراء اور شہزادوں کے سامنے کھڑا ہوا لکچر دے رہا ہے۔

دسویں، بادشاہ شہر میں داخل ہو رہا ہے اور اپنے ان معبودوں کی ثنا و صفت ہاتھ اٹھا کر رہا ہے جنھوں نے اس کو اس جنگ میں کامیاب کیا۔ اور یہاں بھی خطبہ دینے کی سی حالت معلوم ہوتی ہے۔

کیا اہل مصر کے لئے یہ فخر نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے ملک اور بادشاہ کی بڑے بڑے

بادشاہوں کے مقابلے میں ہمیشہ حفاظت کی اور اکثر و بیشتر دشمنوں کو شکست نصیب ہوئی۔

مصری قوم کی قدیم عظمت اس کی فوجی طاقت دیگر اقوام پر جو مصر قدیم کے زمانے میں متمدن و مہذب تھیں ہمیشہ فائق رہی ہے۔ یہ اہل مصر کے لئے قابل فخر ہے اور مصریوں کو چاہئے کہ وہ اپنے قدیم فخر کو اب بھی برقرار رکھیں

عہدِ قدیم میں عربوں کی تجارت

اہل یمن کی تجارت سے مناسبت، تجارتی سامان، تجارتی تعلقات، بری و بحری سفر، تجارتی قافلے اور بیڑے، توراۃ میں ذکر، کتب بلینوس اور بطلیموس میں تجارت کا ذکر، عرب مشرق و مغرب میں ذریعہ تعارف اور مواصلت تھے، سرمایہ تجارت، مشہور بازار

جریدہ "المقتطف" میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں عربوں کی تجارت پر نہایت ہی تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے، مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، "زمانہ جاہلیت" اور "زمانہ اسلام"، ہم زمانہ جاہلیت کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں یہ حصہ زیادہ تر اہل یمن کے تجارتی حالات پر مشتمل ہے، کیونکہ جزیرۃ العرب میں سب سے زیادہ اسی ملک کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔

یمن کچھ ایسے موقع پر واقع ہے کہ وہاں کے لوگ طبعاً تجارت پیشہ ہوتے ہیں، اگر وہ ایک طرف بحری راستہ سے تجارت کرتے ہیں تو دوسری طرف خشکی کا راستہ بھی ان کے بہت ہی مناسب ہے۔

اہل یمن ہندوستان سے بہت ہی گہرے تجارتی تعلقات رکھتے تھے، یہ ہندوستان جایا کرتے اور وہاں کی خام پیداوار اور دیگر مصنوعات لاتے تھے جو یہاں عام طور پر استعمال ہوتی تھیں اور یمن کے بازاروں میں ان کی بہت قدر تھی، اس کے علاوہ عربوں کے تجارتی تعلقات اہل مصر، فنیقیہ، بابلیہ اور کلدانیہ سے بھی تھے۔

اہل یمن بری اور بحری دونوں ذریعے سے تجارت کرتے تھے، ان کی تجارت گاہیں بہت آباد تھیں، سب سے بڑی تجارت گاہ جزیرہ "سقطرہ" تھا جو کہ نہایت ہی مناسب جگہ پر واقع تھا، اس کے علاوہ عدن، حصن غراب (فانا)، اور مسقط بھی مشہور تجارتی مقامات تھے۔

اس زمانے میں ضرورتیں بھی محدود تھیں اور وسائل تجارت بھی، بالعموم "قافلہ" ذریعہ تجارت تھا، موسم اور ضرورت کے اعتبار سے یہ قافلے ایک دوسرے مقام پر جایا کرتے، قافلوں کے لئے بہت سی منزلیں اور حفاظت گاہیں تھیں جب کوئی قافلہ ان قیام گاہوں میں مقیم ہوتا۔ وہاں کے قبایل اس کی حفاظت کرتے اور اپنی سرحد میں یہ قبایل ہر طرح سے ذمہ دار ہوتے جب تک کہ وہ قافلہ ان کی سرحد سے چلا نہ جائے کیونکہ خدانخواستہ اگر کوئی قافلہ لوٹا جاتا تو یہ بدنامی کا دھبہ ان کے دامن سے کبھی دور نہ ہوتا دیگر قبائل کی نظروں میں وہ گر جاتے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عربوں کی بہادری غیرت، ہوس جاہ و حشمت کب اس کو گوارا کر سکتی، قافلے ایسی جگہوں پر لٹ جاتے تھے جہاں کوئی قبیلہ دور یا نزدیک خیمہ زن نہ ہوتا۔

توراۃ میں اسماعیلیہ قافلہ کا تذکرہ ہے جو کہ سامان تجارت مصر کو لیجاتا تھا۔ انھیں قافلوں میں ایک وہ تجارتی قافلہ بھی ہے جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو آپ کے بھائیوں سے خرید اور مصر لے جاکر فروخت کیا تھا، جہاں آپ اپنی پاکدامنی، سچائی اور دانائی کے سبب بہت مشہور ہوئے۔

کتب بلینوس اور بطلیموس میں ان قافلوں کا نہایت ہی تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہے اور حرقبال کا سفر سے لوٹنا نیز عرب کے رؤسا اور تجار کا بھی ذکر صفحہ ۲۷ - ۲۱ - ۲۲ میں موجود ہے۔

تجار عرب و روما کے درمیان معاہدات کا بھی پتہ چلتا ہے جو کہ اس قانون کے مطابق ہے جس کو تاودسیوس اکبر نے مرتب کیا تھا جس میں اس نے ان قافلوں کا تذکرہ اور ان کی تجارت کے حالات بیان کئے ہیں جو کہ اسکندریہ سے بلاد حمیر اور حبشہ کی طرف جاتے تھے وہ لکھتا ہے کہ اہل عرب ہی سے قوم میں مشرق و مغرب کے درمیان ذریعہ تجارت اور وجہ مواصلت تھے۔ وہ بہت سے تجارتی مال مشرق سے مغرب میں لیجاتے اور پھر وہاں کی چیزیں مشرق میں لاکر فروخت کرتے بعض مورخین نے مال تجارت کا اندازہ بھی لگایا ہے یعنی اہل عرب تقریباً ۱۰۰۰۰ لیرہ کی سالانہ تجارت کرتے تھے اور تجار جو سالانہ محصول ادا کرتے تھے ۲۰۰۳ ہزار لیرہ ہوتا تھا (لیرہ۔ ترکی پونڈ ہے)

بہ کے مساوی ہوتا ہے، مترجم)

اہل یمن کی مشہور تجارت سونا، قیمتی پتھر، تلعی، ہاتھی دانت، صندل، مصالحہ (ایک قسم کی لکڑی تھی جس سے کپڑا وغیرہ رنگتے تھے) اور اسی قسم کی دوسری اشیاء کی۔ ہندوستان سے خاص تجارت ان کی روئی کی تھی اور شترمرغ کے پر، ہاتھی کے دانت، سونا، خوشبوئیں اور آبنوس کی تجارت افریقہ کے مشرقی ساحل سے کرتے تھے، بحرین سے موتی، عود، بخور، مر (یہ سب ایک قسم کے خوشبو دار گوند ہیں) یمنی قیمتی پتھر اور دیگر قسم کی خوشبوؤں کی تجارت کرتے تھے۔

ان تجارتی قافلوں کے سبب مشرق اقصیٰ، افریقہ اور بلاد یمن میں بہت کچھ ربط وضبط قائم ہو گیا تھا اور ان کے درمیان تجارت بہت کچھ ترقی کر گئی تھی جب سے کہ قدیم زمانے میں اہل فنیق اور بابل کے درمیان تجارتی سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ (فنیق ایک مشہور شہر تھا جو کہ بحر ابیض کے کنارے آباد تھا)

اہل یمن نسبتہً بری راستوں کو بہت پسند کرتے تھے، ان کی اکثر تجارت بری ہی ہوتی تھی کیونکہ بحری راستہ تجارت کے لئے خالی از خطرہ نہ ہوتا تھا اور پھر موافق ہوا کا انتظار، ہاں وہ بحری سفر اس وقت پسند کرتے جبکہ انھیں طاقت سے کام لینا پڑتا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تجارت کے لئے وہ بحری سفر بالکل کرتے ہی نہ تھے، کرتے تھے لیکن نسبتہً کم

قوم (شراب فروخت کرنے والے) شام کی مصنوعات شراب اور روغن زیتون وغیرہ اور فنیقین کی مصنوعات جیسے شیشہ وغیرہ اپنے شہروں کو لیجایا کرتی اور ایشیا کے مشرقی حصہ سے کپڑے، لوہے کے برتن، چاندی کی اینٹیں اور (ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے) برغرض فروخت لاتی تھی۔

یمن کی تجارت بہت ہی وسیع تھی، وہاں کے بازار خوب آباد تھے۔ بالعموم تجارت کرنے والے قبائل معین، جبائین، سبئیں، قتابین اور رذمین تھے، یہانتک کہ وہ زمانہ آیا کہ تجارت عربوں کے ہاتھ سے نکل کر رومیوں کے ہاتھ میں چلی گئی، سلکت زنجبار قرن اول میلاد میں مملکۃ عربیہ

کے تابع تھا جسکی حکومت پورے مغربی افریقہ پر تھی، وہاں کے بادشاہوں میں عفیر بسبا اور حمیر تھے، ان کی بعض اولادیں زنجبار کے تخت سلطنت پر حکومت کر چکی تھیں،

ملوک قحطان (۱۰۰۰ ق م) نے جزیرۃ العرب کے جنوبی حصہ پر حملہ کیا اور تابع کر لیا، انھیں میں کا ایک گروہ حضرموت کی جانب گیا اور ایک نے مدینہ سبا کی بنیاد رکھی جو کہ بہت ہی مشہور ہوا یہی لوگ بنی یعرب تھے ان میں سے بعض نے مملکت عثمانیہ میں بھی حکومت کی، ملوک عمان نے بھی سلطنت زنجبار پر حکومت کی اور اس طرح سلطنت زنجبار ملوک عمان اور سبا دونوں سے مربوط ہو گئی، سبا نے تجارت کو بہت فروغ دیا اور سارے مشرقی افریقہ پر حاوی ہو گئے، جیسے فینیقین سواحل بحر ابیض اور غربی یورپ تک سرگرم تجارت تھے، سبا سواحل جزیرۃ العرب اور بحر ہند میں مصروف تجارت تھے، اہل عرب جو کہ ان شہروں پر حاوی تھے، کشتی رانی میں بہت ہی ماہر ہوتے، انکے تجارتی بیڑے بالعموم چالیس کشتیوں پر مشتمل ہوتے جس پر چار ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے، زنجبار کی حد گویا ان کی حفاظت گاہ اور آرام لینے کی جگہ تھی، یہ تجار وہاں تقریباً ۶ ہفتے ٹھہرتے تھے اور ان ایام میں وہ یہاں خشک مچھلی، مسالہ، عربی قالین اور اسی قسم کی دیگر چیزوں کو دانے لکڑیاں اور مکانات کی تعمیر کے سامان وغیرہ سے تبدیل کرتے، جب وہ اس طرح ۶ ہفتے پورے کر لیتے اور لین دین ختم ہو جاتا تو وطن کی جانب مراجعت کرتے۔

بطلیموس الجغرافی نے جو حالات اس عہد کے مہیا کئے ہیں اس میں ایک کتاب "المرشد للمحیط الہندی" کا بھی پتہ چلتا ہے، یہ کتاب سنہ ۶۰ میلاد کی تصنیف ہے، اس میں تجارت کے حالات اور افریقہ و عرب اور زنجبار کے تجارتی تعلقات بیان کئے گئے ہیں،

قوم انباط (عراق عرب میں آباد تھی) اپنے تجارتی مقام "بترہ" یا "سالع" پر جو کہ وادی موسیٰ میں واقع تھا بہت ہی فخر کرتی تھی، یہ مقام اپنے تجارتی موقع کے اعتبار سے نہایت ہی عمدہ تھا اور اکثر تجارتی قافلوں کا مرکز، وہ لوگ اس کی بہت حفاظت کرتے تاکہ پر امن طریقے پر تجارت کو فروغ دے سکیں۔

عربوں کی تجارت اس میں ہندوستان چین اور بلا فارس تک پھیلی ہوتی تھی، خشکی اور تری دونوں ذریعے سے عربی تجار ان ممالک میں جاتے، اپنا تجارتی سامان فروخت کر کے وہاں کی پیداوار اور مصنوعات لے آتے۔ اس ربط ضبط سے عربی تہذیب و تمدن کچھ نہ کچھ مخلوط ضرور ہو گیا لیکن انکے خیالات اور جو ان کی خصوصیتیں تھیں ان پر اور جلا ہوتی گئی اس لئے ان کے "ہمچو دیگرے نیست" کے مسلک کا اقتضا بھی یہی تھا۔ ان کے نزدیک عرب "عرب" تھا اور عجم "عجم"۔

اس عہد میں عرب میں بہت سے بازار تھے جو کہ مہینوں قائم رہتے تھے لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور بازار "سوق عکاظ" تھا یہ سال میں ایک بار لگتا، یہاں عرب کے بڑے بڑے تجار جمع ہوتے۔ ہر قسم کی خرید و فروخت ہوتی اور ہر قسم کی علمی و ادبی مجالس منعقد ہوتیں جلسے ہوتے اور مہینوں یہ سلسلہ قائم رہتا۔

مصر کے قدیم آثار

(جدید انکشافات)

مصر کی سرکاری یونیورسٹی "جامعہ امیریہ" کی جانب سے پروفیسر سلیم حسن جو آثار قدیمہ کے ماہر اور محقق ہیں، متعین کئے گئے تھے کہ مصر کے قدیم آثار کا پتہ چلائیں اور تلاش و تجسس کے بعد اپنے نتائج محنت مفصل رپورٹ کی صورت میں پیش کریں چنانچہ انھوں نے اگلے چند روز ہوئے جیزہ کے لق و دق صحرا میں محنت شاقہ برداشت کرکے بہت سے نایاب و اہم آثار دریافت کئے ہیں۔ یہ آثار مصر کی قدیم تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے اس ملک کی تاریخی منزلت میں اور زیادہ اضافہ ہوجائے گا جو زمانہ قدیم سے تہذیب کا مرکز، تمدن و شائستگی کا گہوارہ اور مختلف حکومتوں اور سلطنتوں کا پایہ تخت رہا ہے، نیز دنیا میں اپنی خاص تہذیب و معاشرت اور آثار کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت اور بلند پایہ رکھتا ہے۔

پروفیسر سلیم نے ان آثار کے متعلق مصر کے وزیر تعلیمات اور یونیورسٹی کے چانسلر (مدیر الجامعہ) کی خدمت میں اپنے کارناموں کی رپورٹ پیش کردی ہے، یہ صحرائے جیزہ کے ان زبردست آثار قدیمہ کے بیش بہا خزانے پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے جو مشہور مصری اہرامات کے زیریں حصہ کے نزدیک مقبرہ (ربع ولہ) کے جوار میں دستیاب ہوئے ہیں ان کا انکشاف مصر کے اس نامور ماہر اثریات نے گزشتہ سال میں کیا ہے، اور اب "المسا" کے نامہ نگار کی بدولت اس کی تمام تفصیلات کی اشاعت کا موقع ملا ہے۔ نامہ نگار کا بیان ہے کہ:۔

"دریافت شدہ آثار میں سب سے اہم ایک تابوت ہے جس میں ایک عورت کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ یہ تابوت سفید چونے کے پکائے ہوئے پتھر کا ہے، یہ تابوت بند پایا گیا جو کہ

نہایت مضبوط قفلوں سے بند اور محفوظ کیا گیا تھا۔ باوجود اس احتیاط اور حفاظت کے قبرستان کا بدبودار پانی اس تابوت میں کسی قدر سرایت کر گیا ہے۔

یہ لاش اس تابوت میں اوندھی لٹائی پائی گئی، اور اس کا منہ مشرق جانب تھا۔ ابتک اس کے متعلق صرف اتنا ہی سمجھ میں آسکا ہے کہ یہ خاتون (رع ور) کا ہن (مذہبی پیشوا) کی کوئی رشتہ دار ہے اور اس کی عمر ۳۲ سال سے زیادہ کی نہیں ہے یہ لاش قسم قسم کے بہت زیوروں سے آراستہ ہے۔

اس کے سر پر ایک سونے کا تاج ہے جس کی لمبائی ساٹھ سنٹیمیٹر ہے اس تاج کے دونوں جانب سونے کے دو ٹکڑے دو پھولوں کی طرح آویزاں ہیں یہ دونوں پھول ایک گول عقیق کے نگینے کے پاس آکر مل جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پھول پر ایک چھوٹی چڑیا کی مورت ہے یہ چڑیا اُس چڑیا سے تقریباً بہت زیادہ مشابہ ہے جسے آج کل مصر میں "ابو قردان" کہتے ہیں، اس تاج کے بیچ میں ایک سونے کی ٹکیہ اور ایک سونے کا ٹکڑا لگا ہوا ہے جو اسطوانی شکل کا ہے جس کا قطر ایک سنٹیمیٹر ہے اور بلندی ڈیڑھ سنٹیمیٹر سے زیادہ نہیں۔

دوسرے زیوروں میں لاجورد کا ایک ہار ہے جس میں اٹھائیس دانے ہیں اور دو ہار سونے کے ہیں جو نہایت قیمتی جواہرات سے آراستہ ہیں ایک اور ہار معمولی جواہرات کا ہے۔ ہار سونے کے ٹکڑوں سے مل کر بنا ہے یہ دونوں ٹکڑے اُس حرف نون کی شکل ہیں جو مصر کی قدیم زبان میں مروج تھا یعنی پانی کے تموج کی شکل کے ان میں سے پہلے ٹکڑے کا طول سات سنٹیمیٹر ہے۔ اسی میں ایک چھوٹا سا طلائی ٹکڑا اور آویزاں ہے جو نصف دائرہ کی شکل کا ہے۔ اس کا قطر ساڑھے پانچ سنٹیمیٹر ہے۔ اس میں بے شمار خزف[1] لاجورد، فیروزہ، سونے اور عقیق کے دانے ہیں۔

انھیں زیوروں میں ایک اور ہار ہے جس میں ۱۵ دانے لاجورد کے ہیں اور (۱۳۴) دانے اُس پتھر کے جو (شانبت) کے نام سے متعارف ہے۔ دو دانے سونے کے ہیں اور ایک دانہ

---

(۱) آگ میں پکی ہوئی مٹی۔

عقیق کا۔ ایک اور ہار ہے جس کے دو دانوں کے درمیان میں سونے کا ایک ٹکڑا تموج کی شکل کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی لمبائی اڑھائی ۲½ سنٹیمیٹر ہے اور ایک سونے کی مالا ہے جو پچاس دانوں سے بنائی گئی ہے اور ایک طلائی کنگن ہے اور دو کنگن برونز[1] کے ہیں اور ایک کنگن دو طلائی تاروں سے بنا ہوا ہے اور ایک کنگن شاخ دار یا لڑی دار ہے جس کی شاخ یا لڑی نہایت نادر صنعت کا نمونہ ہے ہر لڑی یا شوخ میں سونے کے کئی کئی دانے ہیں اور ایک سونے کی پازیب یا چھاگل ہے۔

اور اس خاتون کے دونوں پاؤں کے پاس دونوں قدموں کی مٹی کی بنائی ہوئی انگلیاں بھی رکھی ہیں۔ ان مصنوعی انگلیوں کے بنانے میں ایک خاص حکمت ہے جو مصریوں کے ایک نہایت قدیم عقیدے کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ یہ کہ جب اصلی انگلیاں گل کر ضائع ہو جاتی ہیں تو یہ مصنوعی مٹی کی انگلیاں انکی جگہ لگ جاتی ہیں۔

پروفیسر سلیم حسن نے اسکے علاوہ ایک گہرا کنواں بھی دریافت کیا ہے جس کے اندر تین کھڑکیاں ہیں ان غرفوں میں دو رسیاں کوئیں میں اترنے کی لگی یا بندھی ہیں ان میں سے ایک نمایاں طور پر نظر آتی ہے اس پر ایک سونے کی تختی ہے۔ اس تختی پر سیاہ روشنائی سے "کتاب الموتی" کی تیسویں فصل کا کچھ حصہ لکھا ہوا ہے جس طرح اکثر تعویذ و لپٹ لکھا رہتا ہے جو بڑی تعداد میں سفید چونے کے پکائے ہوئے پتھر کے دستیاب ہوتے ہیں!

اور (۸۷) برتن سنگ مرمر کے چکنے پالش کئے ہوئے ملے ہیں چار برتن مٹی کے پکے ہوئے ہیں اور ایک چھوٹی چوکی قربانیاں چڑھانے کی ہے یہ بھی پالش کئے ہوئے مرمر کی ہے ایک اور چوکی ہے جس پر باقی قربانیاں رکھی ہیں۔ پھر پانچ طباق (تھالیاں) نہایت پتلے پتلے سنگ سرخ پکی ہوئی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر ایک خاص قسم کے مادہ کی پالش کی ہوئی ہے۔

---

(۱) ایک مرکب دھات۔

اس عظیم الشان انکشاف کے اثنا میں اس ماہر اثریات کو حسن اتفاق سے دو قبریں اور ملیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک قبر (نتاع حوی) کاہن کی ہے۔ جو (رع ور) کے کاہنوں میں سے تھا۔ دوسری پر صاحب قبر کا نام (رنسوکا) لکھا ہوا ہے مگر اس سے زیادہ اب تک اس شخص کی حقیقت اور شخصیت کے متعلق اور کچھ پتہ نہیں چلا، اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ بھی کوئی کاہن تھا۔ ان کے علاوہ پروفیسر موصوف نے ایک اور کنویں کا سراغ لگایا ہے۔ اس کی گہرائی تقریباً ۹ میٹر ہے۔ اس کنویں کی تاریخ مصر کے قدیم چوتھے خاندان شاہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس کی کھدائی کے سلسلے میں پروفیسر سلیم کو ایک چھوٹی سی سنگ مرمر کی مورت بھی ملی ہے۔ جو بڑے کاہن (رع ور) کی ہے۔

یہ ہیں تفصیلات ان آثار کی جو المساء کے نامہ نگار نے جامعہ امیریہ کے دفتر سے حاصل کی ہیں۔ علامہ احمد بک لطفی السید جامعہ کے رجسٹرار اور اُن کے ساتھ علامہ عبدالحمید بدوی پاشا ان قیمتی آثار کو دیکھنے کے لئے صحرائے جیزہ کو تشریف لے گئے ہیں۔

مصر کی وزارت تعلیمات عامہ نے جیزہ میں ایک مکان کرایہ پر لیا ہے تاکہ مصر کے ان علماء آثار کے ذریعے جو مصر کی جامعہ امیریہ کی جانب سے کھدائی کا کام کر رہے ہیں جن جن آثار کا انکشاف ہو وہ حفاظت سے یہاں رکھے جائیں۔

(روزنامہ المساء قاہرہ)

انسان اور زمانہ

از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب بی اے (جامعہ) ڈی لٹ (پیرس)

لطف شعور زیست نے — رقص خودی کو دیکھ کر
حیرت نقش جلوہ ہیں — شوق کا رنگ بھر دیا

عالم رنگ و بو ہیں تھا — حسن ہنوز محو خواب
جلوہ فروز کائنات — عشق ازل نے کر دیا

مرکز گردش زماں — نقطۂ وہم پر نہ تھا
ساز خودی کے تار ہیں — لرزش کیف حق نہاں

مہر بہ لب ملک تمام — حیرتیان با صفا
پست نشیمنی پہ یہ — بالِ ہما کا حوصلا

دہر کی چشم تیز بیں — محرم راز انس و جن
محو تماشۂ ازل — عارف بخت زندگی
بھانپ گئی کہ ہے یہی — پرتو ذات کبریا
وجہ وجود کائنات — عطر رگ گل حیات

آئینۂ تضاد میں — صورتِ حق ہے جلوہ گر
اس کا پیام آرزو — رنج و طرب کا آشنا
اس کے فسونِ شوق سے — گردشِ ہفت آسیا
اس کی طلب کے داغ میں — آئینۂ جہاں نما
نغمۂ جاں نواز میں — لذتِ کرب کا خمیر
شورشِ اضطراب میں — شانِ سکونِ مستنیر
دردِ تپش کا پیچ و تاب — حاملِ رمزِ موجِ رقص
ہدیۂ لذتِ گناہ — مایۂ خیر و اتقا
اس کی کرشمہ سازیاں — پردہ درِ متاعِ عقل
اس کا زیاں بھی سود ہے — اس کے شرر میں گل نہال
اس کی شکست کی صدا — نقشِ وجود نغمہ ہے
اس کا نشاطِ بیخودی — رشکِ شعورِ دو جہاں

مردمِ چشمِ انتظار — وقفِ طلسمِ ہست و بود
طائرِ دل کو کر لیا — یاد کے دام میں اسیر

ماضی و حال کو کیا — بطنِ زماں نے آشکار
لمحوں کے گیسوؤں میں زیست — صیدِ زبونِ خستہ جاں

اوتائی

(ایک جاپانی قصہ)

بہت دنوں کی بات ہے کہ نیاگا شہر میں ناگو نامی ایک شخص رہتا تھا۔ ناگو ایک حکیم کا لڑکا تھا اور خود اسے بھی حکمت کی تعلیم دی گئی تھی۔ کم سنی ہی میں اس کی نسبت ایک لڑکی سے جس کا نام اوتائی تھا ٹھہر گئی تھی۔ لڑکی اس کے باپ کے ایک دوست کی بیٹی تھی۔ لڑکے لڑکی کے ماں باپ میں یہ سمجھوتا ہو گیا تھا کہ لڑکے کی شادی پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہی کر دی جائے گی۔ نسبت طے ہونے کے بعد لڑکی کی صحت کچھ خراب رہنے لگی اور جب پندرہ برس کی ہوئی تو تپ دق کا عارضہ ہو گیا جب اس بیچاری غریب لڑکی کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس دنیا میں بس چند دن کی اور مہمان ہے تو اس نے ناگو کو بلا بھیجا تاکہ اس سے رخصت لے۔ ناگو اس لڑکی کے بستر کے قریب دو زانو بیٹھ گیا تو اوتائی نے کہا :

ناگو۔ میرے منگیتر۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو زبان دے چکے تھے اور اس سال کے ختم ہونے تک ہماری آپس میں شادی ہوتی لیکن تمھیں معلوم ہے کہ میں اب عنقریب مرنے والی ہوں بس دیوتاؤں کو ہماری بہتری معلوم ہے۔ اگر یہ ممکن بھی ہو کہ میں اپنی زندگی کے کچھ سال اور اسی طرح کاٹ سکوں تو میرا زندہ رہنا دوسروں کے لئے تکلیف اور رنج کا باعث ہوگا۔ میں بیمار ہوں۔ میرا جسم کمزور ہے۔ میں کسی طرح سے ایک اچھی بیوی نہیں بن سکتی اگر میں اس حال میں زندہ رہنا چاہوں تو یہ تمنا ایک بڑی خود غرضانہ خواہش ہوگی۔ یہ میں ضرور جانتی ہوں کہ اس سے تم کو بجد خوشی حاصل ہوگی لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں خوشی کے ساتھ مرنا اچھا سمجھتی ہوں اور تم سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ تم میری موت کے بعد میرے لئے ماتم نہ کرنا۔ ہاں ایک بات تم سے اور کہہ دوں وہ یہ ہے کہ شاید میں پھر دوبارہ تم سے ملوں۔ ناگو

فوراً بول اٹھا: "بے شک ہم دونوں پھر ملیں گے اور اس پاک ملک میں جہاں جدائی کی تکلیف کا کھٹکا نہیں۔"

"نہیں نہیں" آہستہ سے اوتائی نے جواب دیا۔ "میرا مطلب اس پاک ملک سے نہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ ہماری قسمت میں یہ بدا ہے کہ ہم پھر اسی دنیا میں ملیں گے حالانکہ میں شاید کل ہی دفنا دی جاؤں۔" ناگو اس کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور اس کی ہنسی پر تعجب کر رہا تھا۔ اس نے ناگو کی حالت دیکھ کر دھیمی اور سریلی آواز میں کہا:

"ہاں میری اسی دنیا سے مراد ہے! تمہاری اسی زندگی میں۔ ناگو اگر تمہاری یہ خواہش ہو! اپنی بات رکھنے کے لئے مجھے پھر لڑکی کا جنم لینا پڑے گا اور رفتہ رفتہ ایک حسین خاتون بننا پڑے گا۔ اس لئے تم کو کچھ انتظار کرنا ہوگا، تقریباً پندرہ یا سولہ برس تک! یہ خاصہ زمانہ ہے! لیکن میرے منگیتر شوہر تمہاری عمر اس وقت تو صرف انیس سال کی ہے۔"

ناگو چاہتا تھا کہ اس کی موت کے آخری لمحے سکون کے ساتھ گذریں۔ اس نے محبت میں ڈوبے ہوئے انداز سے جواب دیا:۔

"تمہارا انتظار کرنا میرے لئے صرف خوشی ہی کا باعث نہ ہوگا بلکہ ایک فرض ہے ہم اپنے اعتقاد کے مطابق سات جنم تک ایک دوسرے سے محبت کے رشتہ میں گوندھے ہوئے ہیں۔" اوتائی نے سوال کیا۔ "لیکن کیا تمھیں اس میں شک ہے؟" ناگو نے جواب دیا "میری غمگسار ہاں مجھے شک ہے! کیونکہ میں تم کو دوسرے جنم میں دوسرے نام میں کس طرح پہچان سکوں گا۔ جب تک کہ تم مجھکو اپنی کوئی نشانی یا یادگار نہ دو گی۔" لڑکی نے کہا "یہ میں نہیں کر سکتی۔ سوائے دیوتاؤں اور خدا شناسوں کے کوئی نہیں جانتا کہ ہم کیسے اور کہاں ملیں گے لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ اگر تم مجھ سے خوشی خوشی نہ ملے تو میں اس قابل نہ ہونگی کہ تمہارے پاس پھر واپس آسکوں۔ ان الفاظ کو یاد رکھو" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چند ہی گھڑیوں میں وہ دنیا سے کوچ کر گئی۔ ناگو اوتائی کی محبت میں گرفتار تھا۔

اس کی موت کا اس کو بیحد صدمہ ہوا۔ لڑکی کی یاد میں اس نے ایک تعویذ بنایا جس میں اس نے اپنی محبوبہ کا نام اور اس کی پیدائش کا دن لکھا تھا اور اس تعویذ کو اس جگہ رکھ دیا جہاں گھر کے دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی اور ہر روز اس تعویذ پر پھول چڑھاتا تھا (یہ ایک خاص جاپانی رسم ہے کہ ہر ایک گھر میں دیوتاؤں اور بزرگوں کی پوجا ہوتی ہے) وہ اکثر اوتائی کی ان عجیب پراسرار باتوں پر غور کیا کرتا تھا جو اس نے مرنے سے پہلے کی تھیں۔ اس آس میں کہ اوتائی کی روح کو فرحت پہنچے۔ ایک دن اس نے تعویذ پر اپنا وعدہ لکھ دیا کہ اگر اوتائی دوسرا جنم لے کر پھر نمودار ہو تو میں اس سے شادی کر لوں گا۔ اس اقرار پر اپنی مہر لگائی اور اسے بھی پوجا کی جگہ جا کر رکھ دیا۔

اپنے خاندان میں ناگو بس ایک ہی لڑکا تھا۔ اس کے والدین چاہتے تھے کہ لڑکے کی شادی کہیں ہو جائے۔ ناگو کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے والد کی پسند کردہ لڑکی سے شادی کرے۔ آخر کار ایک لڑکی سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد بھی وہ حسب معمول تعویذ پر پھول چڑھایا کرتا۔ اور اس کے دل سے کبھی اوتائی کی محبت کا نقش مٹا نہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اوتائی کی تصویر اس کے دل میں دھندلی ہونے لگی جیسے کسی خواب کا یاد کرنا مشکل ہوتا ہے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اسے مصیبتوں نے آگھیرا۔ اس کے والدین موت کے شکار ہو گئے بیوی بھی چل بسی، اور اس کا اکلوتا لڑکا بھی تمام ہو گیا وہ بیچارا اب دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ اس نے گھر بار کو خدا حافظ کہا۔ اور اس امید میں ایک لمبے سفر کو چلا کہ شاید اپنی مایوسیوں اور مصیبتوں کو بھول جائے۔

سفر میں وہ ایک دن آکو نامی ایک مقام پر جا پہنچا۔ یہ پہاڑی گاؤں گرم چشموں اور قرب و جوار کے مناظر کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس گاؤں کی ایک سرائے میں جا اترا ایک خادمہ اس کی خدمت گزاری کے واسطے حاضر ہوئی۔ ناگو کی نظر اس لڑکی کے چہرے پر پڑی ہی تھی کہ اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس لڑکی

میں اس نے اوتائی کی کمال شاہت پائی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ عالم خواب میں ہے یا جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے وہ حقیقت ہو۔ اس نے اپنے زور سے چٹکی لی تاکہ پتہ لگ جائے کہ وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی باہر چلی گئی اور جب پھر اندر کھانا لے کر آئی۔ اس کی ادا اور چال ڈھال سے ناگو کے دل میں اسی لڑکی کی یاد تازہ ہوگئی جس سے اس نے اپنی جوانی میں شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے لڑکی سے باتیں کیں کہ اس لڑکی نے نرم آواز سے جواب دیے جن کی شیرینی نے اس کے پرانے غموں کی یاد تازہ کرکے اُسے اور غمگین بنا دیا۔ ناگو نے تعجب کے ساتھ اس سے سوال کیا:

"بڑی بہن! تمھاری شکل ایک لڑکی سے بہت ملتی ہو جسے میں کچھ عرصہ ہوا جانتا تھا۔ میں حیرت میں رہ گیا جب میں نے تمھیں اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ معاف کرنا اگر میں تمھارے شہر کا اور تمھارا نام دریافت کروں"۔ لڑکی نے فوراً ایک مرے ہوے کی نہ بھولنے والی آواز میں جواب دیا "میرا نام اوتائی ہے اور تم نیاگا نا کے رہنے والے میرے منگیتر شوہر ہو۔ سترہ برس ہوے میرا انتقال لیاگاتا میں ہوا تھا۔ تم نے اس وقت اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ تم مجھ سے شادی کروگے جب میں دوبارہ عورت کا جنم لے کر اس دنیا میں آؤنگی تم نے اپنے عہد کو مہر لگائی تھی اور دیوتاؤں کے پاس جاکر رکھ دیا تھا۔ جہاں میرے نام کا ایک تعویذ تم نے بھی بنا کر رکھا تھا"۔ ان لفظوں کا منہ سے نکلنا تھا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ کچھ دیر میں اسے ہوش آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ بالآخر ناگو کی اس سے شادی ہوگئی اور دونوں نہایت ہی خوشی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن عجیب بات ہو کہ اوتائی اپنی پرانی داستان بالکل بھول گئی اور اس کو اپنی پچھلی زندگی کا کوئی واقعہ یاد نہ رہا۔

شذرات

"جامعہ" کے صفحات میں بار بار یہ تلخ حقیقت ظاہر کی جا چکی ہے کہ عربی تعلیم جس پر مسلمانوں کے دین اور تمدن کی بنیاد قائم ہے، سرعت کے ساتھ زائل ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا قدیم نظام مکاتب جس کے اکثر پرانے مسلمان مداح ہیں تقریباً بالکل فنا ہو چکا ہے اور اس کی جگہ سرکاری اور نیم سرکاری مدارس نے لی ہے جن کو ہمارے مذہب یا تمدن سے کوئی قریبی واسطہ بھی نہیں ہے۔ بڑے بڑے عربی مدارس کا نظام اس قدر فرسودہ ہے کہ بجز فنا کے ان کی زندگی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

اکثر علماء اسلام اور بعض جرائد نویس جنھوں نے "مذہب" کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے اور جو بالعموم خود مسلمانوں ہی سے اپنے مخالف بنا کر ان سے لڑتے رہتے ہیں اور حمایت اسلام کے مجاہدانہ فرائض بزعم خود ادا کرتے ہیں ان کی نگاہیں اس قدر قاصر ہیں کہ وہ اس کٹتی ہوئی جڑ کو نہ دیکھتے ہیں نہ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ بڑے سے بڑے عربی تعلیم کے حامی اسی دقیانوسی طریق تعلیم کے موئید ہیں اور کوئی نئی صورت عربی تعلیم کے احیاء کی نہیں سوچتے۔ حالانکہ اس قدیم طریقہ کی تعلیم کا اس زمانہ میں زندہ رکھنا تقریباً محالات میں سے ہے۔ کیونکہ اس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ثابت ہو چکا ہے۔

مسلمانوں نے عربی تعلیم کو ہمیشہ سے دینی غرض سے سنبھالے رکھا اور آج بھی اس کا سب سے بڑا مقصد وہی ہے۔ اس لئے ضرورت دینی کو پیش نظر رکھ کر ہم کو ایک نہایت صحیح نصاب ہلکے سے ہلکا اور مکمل سے مکمل تیار کرنا چاہیے جس کو مسلمانوں کی زیادہ تعداد پڑھ سکے اور جو ان کے دنیاوی مفاد اور کسب کمال میں خلل انداز نہ ہو۔ قدیمی نصاب اس قدر بوجھل اور اس

قدر غیر ضروری اور لاطائل مضامین سے پُر کیا گیا ہے کہ اس کے لئے ایک انسان جبتک اپنی پوری زندگی یا کم سے کم زندگی کا بڑا حصہ نہ صرف کرے اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور میرے خیال میں اصلی وجہ علما کے مذہب کو پیشہ بنا لینے کی یہی ہوتی ہے کہ وہ اس نصاب کو پورا کرنے کے بعد کسی دوسرے کام کے قابل نہیں رہ جاتے یا کوئی دوسرا ہنر سیکھنے کا جس سے عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں موقع نہیں پاتے۔ اس لئے دین کو کمائی کا ذریعہ بنا کر نہ صرف اپنی بلکہ بہتوں کی دنیا اور نیز دین دونوں کو برباد کرتے ہیں۔

آج کل کا زمانہ جس قدر عربی تعلیم کا مخالف ہے اس سے زیادہ خود عربی تعلیم کا موجودہ نظام اس کے لئے مہلک ہے۔ اسی طرح مذاہب کے لئے دنیا میں جس قدر فضا تنگ ہوتی جاتی ہے اس سے زیادہ خود مذاہب کی رسوم و قیود سے گرانباری انکے وجود کو مٹانے والی ہے لیکن دین حقیقی ایک زندہ جاوداں شے ہے جس کو کوئی فنا نہیں کر سکتا اور عربی زبان کی تعلیم ایک مفید علمی کمال ہے جس کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ کاش ہماری قوم اس حقیقت کو سمجھتی۔

کیا کلثوم ابن عیاض کی فوج میں جتنے جوان تھے سب مضبوط و مستقل مزاج تھے۔ کلثوم کے لئے بہت سی رعائتیں رکھی گئی تھیں۔ اس اہتمام کے ساتھ کلثوم مصر روانہ ہوا اور وہاں کے لوگوں میں سے تین ہزار سپاہی بھرتی کئے اب اس کے لشکر میں تیس ہزار نفر تھے جن کا باقاعدہ اندراج تھا جو لوگ اپنی خوشی سے ان میں شامل ہو گئے ان کی تعداد اس کے سوا ہے۔

امیر المومنین نے کلثوم کو حکم دے دیا تھا کہ ہارون قرنی مولائے معاویہ بن ہشام اور مغیث مولائے ولید کی اطاعت کرے کیونکہ یہ دونوں مقامی حالات سے واقف ہیں اور عامل افریقیہ کو حکم بھیج دیا کہ تم کلثوم ابن عمرو کی اطاعت کرو۔ پھر کلثوم افریقیہ پہنچا۔ وہاں بھی افریقیہ کے باشندے اور طنجہ کے عرب کثرت سے بھرتی ہوئے یہاں تک کہ کلثوم کی فوج کی مجموعی تعداد (۷۰) ہزار ہو گئی۔ افریقیہ کی پیادہ فوج پر مغیث اور سوار فوج پر ہارون قرنی سردار بنائے گئے۔

بربریوں کی شورش کے اسباب بربری قبائل اور ان کے سردار میسرہ کو اس لشکر کی آمد معلوم ہوئی تو یہ لوگ بھی جمع ہوئے اس کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انکے خروج و بغاوت کی کیا وجہ تھی۔ جن لوگوں کو حکام پر طعن کرنے کی عادت ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بربری اپنے عمال کی حرکتوں سے تنگ آکر بغاوت کر بیٹھے۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ خلیفہ اور اس کے بیٹے جب ضرورت ہوتی تو عمال طنجہ سے لیے چمڑے کی ڈھال کرتے تھے جو حاملہ بکریوں کا پیٹ چاک کر کے ان کے بچوں سے حاصل کیا جاتا تھا اور یہ شرط بھی لگا دیتے تھے کہ یہ چمڑا شہد کا ہم رنگ ہونا چاہیے چنانچہ عمال اپنی نگرانی میں سو سو بکریاں ذبح کرا لیتے مگر بسا اوقات ان میں ایک چمڑا بھی شرائط کے مطابق نہ ملتا تھا اور یہ بات بربریوں کی تکلیف و برہمی کا باعث ہوتی تھی۔ غرض جن لوگوں کو امرائے اندلس سے بغض ہے وہ اسی قسم کے الزامات لگا کر اس بغاوت کا باعث وہاں کے امراہی کو قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ الزامات سچ ہیں تو ازارقہ و اہل نہروان و اصحاب راسبی عبداللہ ابن وہب و زید ابن حصن وغیرہ کی اقتدا میں قرآن اٹھوانے اور سر منڈوانے کی کیا توجیہ ہے۔

شامی فوج کے انتظامات بہر حال میسرہ نے بے شمار فوج جمع کر کے موضع بقدورہ میں کلثوم ابن عیاض

کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ کلثوم نے اس وقت تک خندق نہیں کھدوائی تھی۔ ہارون دمغیث نے کلثوم کو مشورہ دیا کہ آپ خندق کھدوائیے اور سواروں کی ایک بڑی جماعت تیار رکھئے اور ایک دستہ سواروں کا ہمیں دیجئے۔ تاکہ ہم اُن سے اُن کے گاؤں اور مسکنوں تک لڑتے چلے جائیں۔ کلثوم نے اس بات کو اہم جان کر تامل کیا اتنے میں اس کا قائمقام بلج آگیا۔ بلج اس کا حکم کبھی نہ ٹالتا تھا۔ بلج نے کہا کہ آپ ایسا نہ کیجئے باغیوں کی کثرت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان میں سے اکثر ننگے اور ننہتے ہیں اس کے بعد جب لڑائی شروع ہوئی تو کلثوم کی سوار فوج کا افسر بلج تھا۔ افریقیہ کی سوار فوج کا ہارون قرنی اور پیادہ فوج کا مغیث اہل شام کی پیادہ فوج پر کلثوم خود نگراں تھا۔

بربریوں کی ایک چال یہ جنگ نہایت سخت تھی۔ بربری فوج کا پلہ بھاری تھا جب بلج اپنے سواروں کو لے کر حملہ آور ہوتا تھا تو بربری بھی مقابلہ کرتے تھے اور چمڑے کی گوپھین میں پتھر رکھ کر اہل شام پر سنگباری کرتے تھے اور اونٹوں کی دم میں پانی کی مشک اور خشک چمڑے باندھ کر ان کو کلثوم کے لشکر پر چھوڑ دیتے تھے۔ اس حرکت سے شامی لشکر کے گھوڑے بھڑکتے تھے اور سواروں کے قابو سے باہر ہو جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر لوگ بلج کے حکم سے پیادہ ہو گئے۔ مورخین کہتے ہیں کہ بربریوں کو ایسا کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ بربریوں کی سوار فوج اتنی نہ تھی کہ حریف کی سوار فوج کا مقابلہ کرسکتی۔ جب کلثوم کی سوار فوج میں سے اکثر لوگ پیادہ ہو گئے تو بلج کی سوار فوج میں بارہ ہزار نفر رہ گئے اور بقول بعض سات ہزار سوار باقی رہے۔ قول آخر زیادہ صحیح ہے۔

سواروں کے پیادہ ہونے اور بربریوں کے عجیب الہیئت اونٹوں کے گھسنے سے حملہ آوروں کی صفیں ٹوٹ گئیں انتظام جاتا رہا اور اب بربریوں نے سختی کے ساتھ حملہ شروع کیا۔ بلج بہت کوشش کرتا تھا مگر ان پر قابو نہ ملتا۔ یکایک بربریوں نے جنگ مغلوبہ شروع کر دی اور اہل شام کی صفوں پر ٹوٹ کر گرے اور نہایت سختی سے در آئے۔ بلج نے یہ دیکھ کر ایکبار نہایت برہم ہو کر سختی سے مقابلہ کیا اور بربریوں کی فوج کو درہم برہم کر دیا۔ اس کے بعد چاہا کہ ایک بار اور ایسا ہی پرزور حملہ کرے مگر اب کے بربری فوج تازہ دم ہو کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک جماعت نے کلثوم پر کیا اور ایک بلج سے

مقابلہ کرتی رہی اور ایسی سختی سے گھیرا کہ بلج اپنے پرائے پر نہ جاسکا اور بربریوں کی فوج کے پیچھے ہوگیا بربریوں کا ایک گروہ اس سے برابر لڑتا رہا۔ مگر دوسری طرف ان کی فوج کا بڑا حصہ میسرہ کے ساتھ بھڑ گیا اور یہ لوگ لڑتے لڑتے کلثوم تک پہنچ گئے۔ ان کی اس معرکہ آرائی سے حبیب ابن ابی عبدہ قرشی، مغیث اور ہارون شہید ہوگئے اور اہل افریقیہ کی سوار و پیادہ فوج شکست کھا کر بھاگ گئے جو کلثوم کے لشکر کا ایک حصہ تھی۔ صرف کلثوم میدان میں جمے رہے۔

ایک شخص کی حیرت انگیز بہادری لشکر شام کی ہزیمت اور جنگ کے نتائج

مجھے ایک ثقہ شخص سے روایت پہنچی ہے کہ اس ہنگامے میں شام والوں میں کا ایک شخص اٹھا جس کے سر پر تلوار کا زخم لگا تھا یہ زخم اتنا کاری تھا کہ سر کی کھال الٹ کر اس کی آنکھوں پر آپڑی تھی۔ اس شخص نے اسی حالت میں سر کی کھال الٹ کر آنکھوں سے سر پر رکھی اور اپنے لوگوں کو آواز دی۔ اس کے ساتھیوں نے کمزور طریقہ پر اس کی طرف سے مدافعت کی اور وہ بلند آواز سے یہ آیت پڑھتا جاتا تھا "ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم واموالہم (الخ) اس آیت کے بعد اس نے یہ آیت پڑھی وماکان لنفسٍ ان تموت الا باذن اللہ کتاباً موجلاً وہ یہ آیت پڑھ ہی رہا تھا کہ بربریوں نے پھر شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ اس حملے میں وہ گر پڑا اور اس کے ساتھی کام آئے۔ اس وقت تک شاہی جھنڈا اور کسی نے نہیں لیا تھا غرض شامی لشکر بری طرح پسپا ہوا جو لوگ سوار ہوسکے وہ سوار ہوکر افریقیہ کی طرف بھاگے۔ بربریوں نے مفرور لشکر کا تعاقب کیا اور شام کی شکست خوردہ فوج کو قتل اور قید کرنے میں کمی نہ کی۔ چنانچہ جب حساب ہوا تو شام کے ثلث لشکری مقتول، ثلث اسیر اور ثلث مفرور معلوم ہوئے۔ مگر بلج بربری لشکر سے مقابلہ کرتا رہا اور جم کے لڑا کئی بار فریقین نے ایک دوسرے کو روک دیا۔ بلج کی تیغ زنی سے بہت سے بربری مارے گئے مگر چونکہ بربریوں کی فوج بے شمار تھی اس لئے ان کے مقتولین کا حساب نہ ہوسکا۔ بلج اسی عالم میں تھا کہ بربری کلثوم کو قتل کر کے اس کے ساتھیوں سے فارغ ہوکر بلج کی طرف جھپٹے جب بلج نے دیکھا کہ اب مقابلہ و مدافعت کی طاقت نہیں ہے تو مجبوراً پسپا ہوا اور انھیں کے شہروں سے گزرتا ہوا سمندر کی طرف بڑھا۔ بربریوں نے بحر اخضر تک اس کا تعاقب کیا، مگر بلج بڑھا چلا گیا اور شہر

سبتہ میں پناہ لی۔ اس سے پہلے اس کا ارادہ طنجہ میں داخل ہونے کا تھا مگر طنجہ پر دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا اس لئے سبتہ میں داخل ہوا۔ سبتہ نہایت بارونق و با آباد شہر تھا اس کی مضبوطی و دولت قابل رشک تھی۔ بلج نے یہیں پڑاؤ ڈال کر سبتہ پر قبضہ رکھا اور ذخائر رسد جمع کئے مگر ہنگامی ضرورت سے زیادہ فراہم کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔

بربریوں نے یہ خبر سن کر بلج پر چڑھائی کی مگر بلج نے سر میدان مقابلہ کر کے ان کو بھگا دیا۔ اور نہایت بے دردی سے قتل کیا۔ دوبارہ پھر بربریوں نے حملہ کیا اور بلج سے ہار گئے۔ اسی طرح پانچ یا چھ بار بربریوں نے فوج کشی کی اور ہارے۔

بربریوں کی دوسری چال جب ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اب بلج کے پاس لشکر باقی نہیں رہا ہے تو سبتہ سے دو دن کی مسافت تک آس پاس کے تمام مواضعات لوٹ کر اس سرزمین کو ہر طرف سے بے آب و گیاہ کر دیا تاکہ بلج کے ہاتھ کچھ نہ آئے اور خود چلتے ہوئے۔

اب بلج اور اس کے ہمراہیوں نے ان کے قیاس کے مطابق پڑاؤ سے نکل کر غارتگری شروع کی مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی اور کچھ دن بعد انکے ذرائع معاش بالکل منقطع ہو گئے اور یہ لوگ اتنے مجبور ہوئے کہ وہ اپنے گھوڑے تک ذبح کر کے کھا گئے۔ پھر اسی قسم کی پریشانیاں اٹھاتے ہوئے خراب وخستہ حالت میں اندلس پہنچے۔ باقی واقعات حسب موقع آئندہ لکھے جائیں گے۔

خلیفہ ہشام کی ندامت اور دوبارہ فوج کشی بلج کے ہمراہیوں کے علاوہ جو شامی اس ہزیمت کے بعد نہایت کم تعداد میں بچ کر شام پہنچے تو ہشام اور اہل شام کو یہ بات بہت گراں گذری اور وہ شام کا لشکر بھیجنے پر بہت پچھتائے اور یہ خیال کیا کہ انکے ساتھ عراقیوں کو کیوں نہ بھیجا شام کے لشکر میں اتنی کمی نہ آتی پھر ہشام نے قسم کھائی کہ اگر زندہ رہا تو اہل بربر پر ایک لاکھ آدمیوں کا لشکر بھیجوں گا اور یہ سب تنخواہ دار ہونگے۔ اس کے بعد پھر ایک لاکھ فوج بھیجوں گا اور برابر بھیجتا رہوں گا یہاں تک کہ سوائے میرے اور میرے بیٹوں کے کوئی باقی نہ رہے۔ پھر ان میں بھی قرعہ ڈالوں گا اگر میرے نام پر قرعہ نکلا تو میں خود لڑنے کے لئے نکلوں گا۔ یہ قسم کھا کر ہشام نے بشر بن صفوان گورنر افریقیہ

حنظلہ ابن صفوان کی مہم | کے بھائی حنظلہ بن صفوان کلبی کو تیس ہزار آدمیوں کی جمعیت سے جنگ کے لیے افریقیہ روانہ کیا۔ اور انھیں ہدایت کردی کہ جب تک میرا حکم نہ پہنچے افریقیہ سے نہ ہٹنا کیونکہ ہشام کو بربریوں سے اندیشہ تھا کہ افریقیہ پر غالب نہ آجائیں اس لیے حنظلہ کو وہاں جلد پہنچنے کی تاکید کردی تاکہ افریقیہ پر مضبوط قبضہ رہے اور افریقیہ سے فوج اور خزانہ و رسد وغیرہ پہنچنے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ حنظلہ نے افریقیہ پہنچ کر ایسا ہی کیا پھر ہشام نے حنظلہ کے پاس بیس ہزار آدمیوں کا لشکر اور بھیج دیا۔

بربریوں سے دوسری عظیم الشان جنگ | کلثوم اور انکے ہمراہیوں کی جنگ اور ہلاکت جس میں خود کلثوم اور حبیب ابن ابی عبیدہ وغیرہ کام آئے سنہ ۱۲۲ھ میں ہوئی اور حنظلہ کی آمد کا سال سنہ ۱۲۳ھ ہے۔ حنظلہ افریقیہ پہنچے تو ہشام کی بھیجی ہوئی کمک بھی پہنچی سنہ ۱۲۴ھ میں میسرہ نے فوج اکٹھا کی اور میسرہ اور حنظلہ میں جنگ ہوئی۔ اس موقع پر میسرہ نے بربریوں کے دو بڑے لشکر مرتب کئے تھے جن میں بے شمار سپاہی تھے ادھر ہشام بستر علالت پر دراز تھے اور ان کی یہی علالت بعد میں مرض موت ثابت ہوئی۔

ہشام کے متعلق ایک روایت | خلیفہ ہشام کی علالت کے سلسلے میں ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن شدت مرض ان کی زبان سے نکلا یا حنظلہ ابدی یا حدی الطائفتین قبل الاخری (حنظلہ میسرہ کے دونوں لشکروں میں سے پہلے ایک سے جنگ کرلو") لوگ یہ سمجھے کہ ہذیان کی حالت میں بڑبڑا رہے ہیں۔ ادھر حنظلہ نے ایسا ہی کیا اور موقع قرن میں بربریوں کے ایک لشکر کو ختم کرکے دوسرے لشکر پر حملہ کیا۔ جو موضع اصنام میں تھا۔

ان دونوں لشکروں کو شکست فاش دینے کا واقعہ سنہ ۱۲۴ھ کے بعد پیش آیا۔ اس عظیم الشان فتح کی اطلاع حنظلہ نے ہشام کو دی اور بربریوں کے شہروں پر چڑھائی کرنے کی اجازت طلب کی حنظلہ کا یہ خط ہشام کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ نزع کے عالم میں تھے۔ ہشام کا انتقال شعبان سنہ ۱۲۵ھ میں ہوا۔

بلج کی بقیہ سرگزشت
عبدالملک ابن قطن کی بے اعتنائی

بلج کے اندلس میں داخل ہونے کا مجمل حال بیان ہو چکا ہے یہاں تفصیل لکھی جاتی ہے ۔ بلج اپنے چچا کلثوم بن غیاض کے کام آنے کے بعد تقریباً ایک سال سبتہ میں محصور رہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ۔ محاصرہ کی سختیاں اس حد کو پہنچ گئیں کہ اپنے جانور ذبح کر کے کھا گئے اور چمڑا پکا پکا کر اس سے پیٹ بھرنے لگے اور ہلاکت تک نوبت پہنچی ۔ اس زمانے میں اندلس کا والی عبدالملک ابن قطن تھا ۔ بلج نے عبدالملک ابن قطن کو کئی بار لکھ کر امداد طلب کی اور امیرالمومنین و سلطنت عربیہ کی اطاعت پر توجہ دلائی کہ ہم تم دونوں ایک ہی خلیفہ کے محکوم ہیں مگر اس نے تغافل سے کام لیا بلکہ ان کی اس حالت سے خوش ہوا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ اس پر غلبہ نہ حاصل کر لیں جب اندلس کے عربوں سے ان کی حالت زار نہ دیکھی گئی تو بنی لخم کے ایک شخص عبدالرحمن ابن زیاد احرم کو رحم آیا اور اس نے دو کشتیوں میں جو اور ترکاری وغیرہ اشیاء خوردنی بار کر کے اُن کے پاس بھیج دیں جس سے کچھ مصیبت کم ہوئی مگر یہ امداد اس درجہ غیر مکتفی تھی کہ اس سے چنداں فائدہ نہ ہوا اور پھر وہی فاقہ کشی اور ہلاکت سے سابقہ پڑنے لگا مگر کچھ مدت بعد زمین سے روئیدگی کے آثار نمایاں ہوئے اور سبزی وغیرہ پیدا ہو گئے جس پر اُن لوگوں نے گزارہ کیا ۔

عربوں کا قتل

اس کے بعد اندلس کے بربریوں کو جب عربوں اور مطیع رعایا پر باغی بربریوں کی یورش معلوم ہوئی تو وہ اطراف اندلس میں اکٹھا ہوئے اور پہلے جلیقیہ کے عربوں کو نکال کر قتل کیا پھر استرقہ اور اُن شہروں کے عربوں کو نکالا جو دریائے وادی الحجارہ کے دوسری جانب رہتے تھے مگر ان حالات سے عبدالملک ابن قطن بالکل خوفزدہ نہ ہوا ۔ ادھر جو عرب بربریوں سے بچ کر نکل آئے تھے وہ بھی اُس کے پاس آ گئے اور اطراف کے تمام عرب وسط اندلس میں اکٹھا ہو گئے صرف سرقسطہ اور بربری سرحدوں کے عرب رہ گئے ۔ کیونکہ ان کی تعداد بربریوں سے زیادہ تھے ۔ اسی لئے بربری ان پر ترغہ نہ کر سکے ۔

بعد ازاں عبدالملک ابن قطن نے بربریوں پر کئی لشکر بھیجے مگر بربریوں نے ان کو شکست دی

اور جہاں عربوں کو پایا قتل کیا۔

عبدالملک ابن قطن بلج کی فوج سے مدد لیتا ہے

جب عبدالملک نے بربریوں کی پوری تعداد اور اپنی حالت کا صحیح اندازہ لگایا تو ڈرا کہ کہیں ہماری بھی وہی نوبت نہ ہو جو افریقیہ کے علاقہ طنجہ میں عربوں کی ہوئی اور اس موقع پر اہل شام سے جو سبتہ میں تھے مدد لینے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی۔ یہ سوچ کر اس نے اہل شام کے پاس سامان رسد وغیرہ سے بھری ہوئی کشتیاں بھیجیں اور اُن سے یہ طے کر لیا کہ شام والے اپنی ہر فوج میں سے دس افسر رہن کے طور پر دینگے جن کو جزیرہ میں رکھا جائے گا جب لڑائی کے شام کی فوجوں کی ضرورت نہ رہے گی تو اُن فوجوں اور افسروں کو جہازوں پر سوار کر کے افریقیہ پہنچا دیا جائے گا۔ شامیوں نے بھی عبدالملک سے یہ عہد لیا کہ ہم لوگوں کو افریقیہ اکٹھا بھیجا جائے گا۔ اور نہیں بربریوں کے مقابلہ پر نہ لایا جائے گا۔ اس قرار داد کے بعد شامیوں نے اپنے یہاں سے لشکر بھیجے جن میں عبدالرحمٰن ابن حبیب ابن ابی عبیدہ فہری بھی تھے۔ یہ عبدالرحمٰن وہ ہیں جن کے باپ مقام نقدورہ پر شہید ہو چکے تھے۔ جب عبدالرحمٰن شامی کمک لے کر ۱۲۳ھ میں اندلس آئے تو عبدالملک نے ان لوگوں کو جو بطور رہن ساتھ لائے تھے جزیرہ ام حکیم میں ٹھہرایا۔ اس موقع پر شامیوں کی حالت نہایت تباہ ہوئی۔ ان کے پاس کچھ نہ رہا۔ کپڑے تک نہ رہے۔ زرہوں سے ستر پوشی کرنے لگے پھر یہ شامی فوجیں جزیرہ اندلس میں اتریں یہاں ان کو پکا یا ہوا چمڑا بافراط ملا۔ اس چمڑے سے انھوں نے تن پوشی کی پھر قرطبہ آئے تو عبدالملک ابن قطن نے انکے سرداروں کو خلعت دی اور ہر ایک کو انعام دیا مگر یہ سب کچھ بھی اتنا نہ تھا کہ انھیں کافی ہوتا۔ پھر اندلس کے عرب امرا نے ان لوگوں کا استقبال کیا اور ان کے معززین کو اپنے یہاں کے معززین کا لباس پہنایا اور اُن پر بڑی مہربانی کی۔ ان عربی سرداروں کی میزبانی سے ان کی حالت درست ہوئی اور کھا پہن کر سیر ہو گئے۔

عبدالملک ابن قطن سے بربریوں کی جنگ

اب کے بربریوں نے اندلس میں اپنا سردار ابن (۴ صفحہ ۲۹[ا]) کو مقرر کیا تھا اور جلیقیہ، استورقہ، ماردقہ، قوریہ، اور طلبیرہ سے اپنی افواج اکٹھا کی

[ا] اصل کتاب میں نام کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔

تھی۔ اس جنگ کے لئے ان کے پاس اس کثرت سے فوج جمع ہوگئی تھی کہ اس کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا اس تیاری کے بعد بربری دریائے تاجہ کی طرف بڑھے تاکہ اسے عبور کر کے قرطبہ میں عبدالملک ابن قطن پر حملہ کر دیں۔

عبدالملک ابن قطن نے مدافعت کے لئے اپنے دونوں بیٹے قطن اور امیہ بلج کے ساتھ والی شامی عربوں اور شہر کے عربوں کے ساتھ بھیجے۔

شامیوں اور بربریوں کا تصادم اور بربریوں کی شکست

بربریوں کو ان کی آمد معلوم ہوئی تو انھوں نے میسرہ کی تقلید میں اپنے سر منڈوا ڈالے تاکہ مقابلہ کے وقت مخلوط نہوں اور آسانی سے پہچان لئے جائیں اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کر سکیں پھر یہ بربری شہر طلیطلہ کی طرف بڑھے اور ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اب قطن اور امیہ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ ان کی طرف بڑھے۔ سرزمین طلیطلہ میں مقام وادی سلیط پر دونوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ حسب سابق اس جنگ میں بھی بربری جی توڑ کر لڑے مگر اہل شام چونکہ پہلے کی شکست سے بہت زیادہ خار کھائے ہوئے تھے۔ اور تلافی کے لئے موقع کے منتظر رہتے تھے اس لئے انھوں نے نہایت غیظ و غضب کے ساتھ حملے کئے اور دلیرانہ جوش کے ساتھ بربریوں کو مارنے باندھنے میں مصروف رہے۔ آخر بربری شکست کھا کر بھاگ نکلے اور جو بھاگ کر نکل گئے وہی بچ گئے ورنہ اور سب وہیں کھیت ہوگئے۔

شامی فوج کا عبدالملک ابن قطن سے جھگڑا اور اس کی نتائج

اس جنگ کے بعد اہل شام نے باقاعدہ مسلح فوج تیار کی اور اندلس کے علاقوں میں جابجا تقسیم ہو کر بربریوں کو قتل کرنا شروع کیا۔

بلج کی امارت

جب اس کارروائی سے بربری فسادات کی آگ بجھ گئی تو ان لوگوں نے معاہدہ کے مطابق اپنی واپسی کی خواہش کی اس پر عبدالملک نے عذر کیا کہ ہمارے یہاں اتنی کشتیاں نہیں ہیں جن پر تم ایک دم سوار ہو کر جاسکو کیونکہ تمھارے ساتھ گھوڑے غلام پوشاک وغیرہ سامان کافی کھڑاک ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے افریقیہ بھیج دئے جاؤ۔ شامیوں نے جواب دیا کہ ہم تو سب ایک ساتھ جائیں گے۔ پھر عبدالملک نے کہا اچھا تم افریقیہ نہیں جاتے ہو تو سبتہ

کی راہ لو اس بات پر شامی بگڑ گئے اور انھوں نے کہا تم ہم کو طنجہ کے بربریوں سے الجھانا چاہتے ہو، اس سے تو بہتر یہ ہے کہ ہمیں سمندر کے گرداب میں ڈھکیل دو۔ اس حصص بحص جب شامیوں نے ابن قطن کے تیور اچھے نہ دیکھے تو سب نے متفق ہو کر اس پر حملہ کر دیا اور قصر حکومت سے اس کو نکال کر اپنے سردار و رفیق بلج کو امیر بنایا۔ ابن قطن یہاں سے نکل کر اپنے اس مکان میں اترا جس کو دار ابی آیوب کہتے تھے۔ ابن قطن کے دونوں بیٹے بھاگ گئے ایک ماردہ پہنچ گیا دوسرے نے سرقسطہ میں پناہ لی۔ یہ دونوں تھوڑے دن اپنی اپنی جگہ مقیم رہے اور اپنی تدبیریں لگے رہے۔

یہ شامی لشکر کچھ مدت تک قرطبہ میں رہے اور اپنی رائے سے کام کرتے رہے۔ اندلس کے لوگ بھی حکومت کی نسبت کوئی فیصلہ کن تجویز نہ کر سکے اور یوں ہی انکے معاملات میں ڈھیل پڑتی رہی۔ ادھر الجزیرہ کے والی نے ان رہن شدہ شامیوں کی امداد سے ہاتھ روک لیا جو جزیرہ ام حکیم میں مقیم تھے اور ان کی غذا و آب رسانی کا انتظام بند کر دیا۔ اس جزیرہ میں پانی بالکل نہ تھا۔ ان تکلیفوں کی شدت سے ان لوگوں کے ساتھ والوں میں شام کے ایک ذی عزت شریف کا انتقال ہو گیا۔

عبدالملک ابن قطن کی شامت اور انجام جب بلج نے ان لوگوں کو جزیرہ سے نکالنے کے لئے آدمی بھیجے تب یہ لوگ نجات پا کر آئے اور ابن قطن کے سلوک کی شکایت کی اور کہا کہ ابن قطن نے ہمارے ایک سردار کو پیاسا رکھ کر مار ڈالا اس لئے ابن قطن ہمارا مجرم ہے اسے ہمارے حوالہ کر دیا جائے تاکہ ہم اس سے سمجھ لیں۔ بلج نے ان کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ وہ قریش سے ہے اس کے علاوہ تمہارے ساتھی کی موت ابن قطن کے ہاتھ سے قتل خطا کے طور پر ہوئی ہے تمھیں اس وقت تک صبر کے ساتھ خاموش رہنا چاہیئے جب تک معاملات و حالات پر قابو نہ مل جائے۔ اس جواب سے شامی لشکر کے یمنی سپاہی دفعۃً برہم ہو گئے اور انھوں نے بلج سے بگڑ کر کہا کہ تم نے مضر کی حمایت کی ہے یہ اچھا نہیں کیا جب بلج کو ان کے فساد و تفرقہ کا ڈر ہوا تو مجبوراً اس نے ابن قطن کو قید خانے سے نکلوایا۔

ابن قطن نوے سال کے سفید ریش بڈھے پھونس تھے۔ اہل مدینہ کے ساتھ واقعہ حرّہ میں شریک ہو چکے تھے اور جنگ حرّہ سے بھاگ کر افریقیہ آئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی مجمع نے شور کیا اور کہا کہ "کیوں رے بھگوڑے" ، تو حرّہ کے واقعہ میں ہماری تلواروں سے بچ کر نکل آیا اور یہاں اس کا بدلہ یوں لیا کہ ہمیں تو نے کتوں کا کھانا اور کھالیں کھانے کو دیں اور امیر المومنین کی فوجیں اس کھانے کے معاوضہ میں خرید کر ضائع کر دیں۔ پھر اس پر ہجوم کر کے گھیرتے ہوئے پل پر لائے اور قتل کر کے اس کی لاش راستے میں ایک جگہ لٹکا دی اور لاش کے دائیں جانب ایک سور اور بائیں جانب ایک کتے کی لاش لٹکا کر اپنی ناراضگی کا مظاہرہ کیا۔

عبدالملک ابن قطن کی لاش ایک دن تک وہیں لٹکی رہی پھر اس کے بربری غلام جو مدوّر کے رہنے والے تھے لاش چرا کر لے گئے اور اپنے اہتمام سے اسے دفن کیا۔ اس مقام کو جہاں کہ عبدالملک کی لاش لٹکائی گئی تھی مصلب عبدالملک ابن قطن کہتے تھے۔ جب یوسف قرطبہ کا والی ہوا اور امیہ ابن عبدالملک نے مصلب عبدالملک پر ایک مسجد بنوائی تو اس کو مسجد امیہ کہنے لگے۔ مصلب کا نام جاتا رہا۔ پھر جس زمانے میں اہل قرطبہ نے حکم ابن ہشام پر زغہ کیا اور یہ مقام میدان ہو گیا اور مصلب اور مسجد دونوں کے نام جاتے رہے۔

ابن قطن کے بیٹوں کی جنگی تیاریاں | جب عبدالملک کے دونوں بیٹے اپنے باپ پر شامیوں کا زغہ دیکھ کر بھاگ گئے تو انھوں نے کچھ مدت بعد والی اربونہ کو ہموار کر کے اربونہ میں فوجیں جمع کرنا شروع کیں ساتھ ہی یہ دیکھ کر کہ اب اہل بلد اور بربری دونوں واپس ہو گئے ہیں اور اہل بلد کی تلواروں سے اہل بربریوں کا خون خشک نہیں ہوا ہے، بربریوں کے داغ ابھی تازہ ہیں، بربریوں کو بھی شامیوں سے بدلا لینے پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ شریک کر لیا اور بربریوں سے طے کر لیا کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد تمھیں اختیار ہو گا کہ اہل بلد کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔ اس اہتمام و اجتماع کے بعد

عبدالرحمٰن ابن حبیب اور عبدالرحمٰن علقمہ لخمی | عبدالملک کے دونوں بیٹے عبدالرحمٰن ابن حبیب کے ساتھ فوجکشی کے ارادے سے بڑھے۔ عبدالرحمٰن ابن حبیب بلج کے ساتھیوں میں تھے جب عبدالملک

۱۱ھ

والا واقعہ پیش آیا تو بلج سے الگ ہوگئے اور اہل شام کی رفاقت سے انکار کر دیا۔ اور اس موقع پر ان کے خلاف عبدالملک بیٹوں کے ساتھ شریک ہوگئے۔ عبدالرحمٰن ابن علقمہ لخمی والی اربونہ نے خود بھی ان کا ساتھ دیا۔ غرض مجموعی طور پر یہ فوج ایک لاکھ آدمیوں پر مشتمل ہو کر بلج اور اس کے خلاف چڑھائی کر کے قرطبہ پہنچی۔

بلج کی فوجی استعداد | بلج کا لشکر شمار میں تقریباً بارہ ہزار سواروں پر مشتمل تھا یہ سوار وہی مفرور شامی تھے جو پہاڑوں، قریوں یا افریقیہ کے بعض مقامات میں روپوش تھے اور شام واپس جانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اہل بلد و اہل بربر کے غلام جو بلج نے اکٹھا کر لئے تھے وہ ان کے علاوہ تھے یہ سب کے سب قرطبہ سے ہوتے ہوئے تقریباً ۲۵ میل پر اس موضع میں آئے جسے اقوہ برطورہ کہتے ہیں اور بلج کے لشکر میں شامل ہوگئے۔

عبدالرحمٰن ابن علقمہ کا بلج سے مقابلہ | بلج ان سب کا لشکر لئے ہوئے مقابلہ پر آیا اور جنگ شروع ہوئی اس موقع پر شامی لشکر نے کچھ زیادہ استقلال سے کام نہ لیا اور معمولی طور پر لڑتے رہے اس اثنا میں عبدالرحمٰن ابن علقمہ جو اہل اندلس کے شہ سواروں میں مشہور تھے آگے بڑھے اور انھوں نے شامیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہمیں بلج کو دکھلا دو تاکہ میں اسے قتل کر دوں یا خود اس کے ہاتھ سے مارا جاؤں۔ شامیوں نے اشارہ سے بلج کو دکھا دیا کہ وہ سفید گھوڑے پر سوار ہے عبدالرحمٰن نے دیکھتے ہی سرحد کے سواروں کو ساتھ لے کر اس پر حملہ کیا۔ شام والوں نے ہٹ کر راستہ دے دیا اس وقت جھنڈا بلج کے ہاتھ میں تھا۔ عبدالرحمٰن نے پاس پہنچ کر بلج کے سر پر تلوار کے دو وار کئے مگر حصین ابن دجین عقیلی نے جو لشکر شام کے حصہ قنسرین کا سردار تھا مقابلہ میں آکر تلوار سے عبدالرحمٰن کے حملہ کا جواب دیا۔ عبدالرحمٰن دفع کرتا رہا۔ اس مقابلے نے اتنا طول کھینچا کہ عبدالرحمٰن جہاں پہنچا حصین وہیں اپنی فوج کے ساتھ مقابلہ پر آجاتا آخر حصین نے عبدالرحمٰن کے گھوڑے کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اس کو پیادہ کر کے کئی پر زور حملے کئے اور حملے کے زور میں ان کو ان کے لشکر تک ریل کر لے لیا مگر عبدالرحمٰن اتنے زبردست شہ زور سوار تھے اور ایسے اچھے اسلحہ و لباس جنگ سے

آراستہ تھے کہ اُن پر حصین کی تلوار اثر نہ کرتی تھی۔ آخر کو بلج کی فوج ہمت ہار کر بری طرح پسپا ہوگئی اور حملہ آوروں نے تعاقب کر کے ان لوگوں کو مارنا باندھنا شروع کیا۔ اور فاتح ہزاروں نفوس قتل و قید کر کے واپس ہوئے۔

بلج کا تھوڑے دن بعد انتقال ہوگیا بعض کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن ابن علقمہ کی تلوار سے جو زخم آئے تھے انھیں کے صدمے سے وفات پائی اور بعض کا خیال ہے کہ اجل طبعی سے انتقال کیا۔ غرض بلج کے بعد اہل اندلس نے ثعلبہ ابن سلامہ عاملی کو اندلس کا والی بنایا۔ ان کے برخلاف

ثعلبہ بن سلامہ عاملی کی امارت

اہل بلد اور بربریوں نے اکٹھا ہوکر ماردہ پر چڑھائی کی۔ ثعلبہ نے مقابلہ کیا مگر ان لوگوں نے اس کثرت سے فوجیں مہیا کیں اور اس شدت سے جنگ کی کہ ثعلبہ ان کی مقابلے کی تاب نہ لا سکا۔ اور اپنی پوری کوششوں کے بعد بھی اسے قلعہ بند ہوکر اپنی حفاظت کرنا پڑی تاہم مقابلہ ہوجانے پر ثعلبہ ان سے خوب لڑا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس نے اپنے نائب متعینہ قرطبہ کو لکھا کہ بلدیوں سے مقابلے کے لئے ہمارے باقی ماندہ لشکری بھیجدو۔

ثعلبہ کی محصوری کے زمانہ میں جبکہ بلدی عرب اور بربری ثعلبہ کے مقابلے کے لئے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے عیدالفطر یا عیدالضحیٰ آگئی اس موقع پر ثعلبہ نے دشمنوں کی غفلت اور انتشار سے فائدہ اٹھایا اور دشمنوں کو عید کی تیاری میں مشغول دیکھ کر حملہ کی تیاری کی اور کوچ کرکے عین عید کی صبح کو حملہ کیا اور شکست دے کر بُری طرح قتل کیا اور اُن کے بچوں کو بھی قید کرلیا۔ حالانکہ اس جنگ سے پہلے بلج نے اسیران جنگ کی اولاد و ناموس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا اس لئے

ثعلبہ کا عجیب ظلم

اس زمانے میں یہ لوگ محفوظ تھے ثعلبہ کے زمانے میں انھیں میں کے دس ہزار سے کچھ زائد قیدی قرطبہ کے محلہ مسارہ میں آئے۔ اندلس کے ان حالات کی اطلاع افریقیہ کے گورنر کو بھی ہوئی پھر اندلس کے ثقہ و صالح لوگوں نے خود بھی وفد و مراسلت کے ذریعہ سے گورنر کو توجہ دلاکر الحاح وزاری سے استدعا کی کہ ہم پر ایسا امیر مقرر کیجئے جو ہم سے اپنے اور امیرالمومنین کے لئے اس بات پر بیعت لے کہ شام و اندلس کے تمام ممالک ایک ہی حکومت میں آجائیں گے۔ کیونکہ

نظم حکومت کی اس ابتری سے دن رات کے قتل وغارت نے ہمیں تباہ کر دیا اور اب تو ہمیں اپنی اولاد کے متعلق بھی اندیشہ ہے

جنگ کے قیدیوں کی ارزانی قیمت

ابھی یہ معاملہ گورنر کے یہاں زیر غور تھا۔ ادھر ثعلبہ مسارہ میں اترا ہوا اہل بلد کے بوڑھوں اور بچوں کو بیچ رہا تھا۔ جو لوگ بک جاتے ان کو ان کی کجاووں میں بٹھا کر روانہ کر دیتا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس نے ان قیدیوں میں سے جو بوڑھے تھے انھیں اس طرح بیچا کہ جو کم سے کم قیمت دے وہی لے جائے۔ چنانچہ مدینہ کے اندلسی عربوں میں سے ابن الحسن اور حرثہ ابن اسد جہینی پر بولی کا حکم دیا اور کہا کہ ان دونوں کے کم سے کم دام کون لگاتا ہے ایک شخص نے کہا میرے پاس ۱۰ دینار ہیں ثعلبہ نے کہا اس سے کم کون دیتا ہے غرض لوگ نرخ میں کمی کرتے رہے اور وہ برابر کمی پر اصرار کرتا رہا۔ آخر ان میں سے ایک کو ایک کتے کے معاوضے میں اور ایک کو ایک بھیڑ کے بدلے بیچ دیا

ابو الخطار حسام ابن ضرار کی امارت

یہاں یہی تماشا ہو رہا تھا کہ سارہ میں ابن الخطار حسام ابن ضرار کلبی، حنظلہ بن صفوان گورنر افریقیہ کی طرف سے اندلس کے والی مقرر ہو کر آ پہنچے۔ اس وقت یزید ابن ولید خلیفہ تھے۔ ابو الخطار اندلس کے نئے والی شام کے نیک لوگوں میں سے تھے اور دمشق اُن کا وطن تھا۔ شامی اور بلدی عرب ان سے خوش رہے انھوں نے آتے ہی قیدیوں اور لونڈی غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اس لئے ان کے لشکر کا نام عسکر العافیہ مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد سے ملک میں امن و اتحاد قائم ہو گیا اور یہ رنگ دیکھ کر ثعلبہ ابن سلامہ اور عثمان ابن ابی نسعہ اور شام کے ۱۰ سرداروں نے راہ فرار اختیار کی۔ عبد الملک ابن قطن کے بیٹوں کو بھی شر فساد سے نجات مل گئی۔ امن و امان کی بدولت لوگوں کی حالت درست ہو گئی اور شام کے باشندوں نے اندلس کے اضلاع و اقطاع میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

عبد الرحمٰن ابن معاویہ کی آمد شام میں بنی امیہ کا آخری دور

اب کچھ بیان عبد الرحمٰن ابن معاویہ کے اندلس میں داخل ہونے کا کیا جاتا ہے مگر چونکہ دولت امویہ کے انقلاب کے بعد ہی عبد الرحمٰن ابن معاویہ

اندلس میں آئے اس لئے واقعات کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے اس سلسلہ کے ضروری واقعات کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

مروان ابن محمد بنی امیہ کے آخری خلیفہ پر مشرق میں بنی امیہ کا شیرازہ بکھر کے بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی۔ مروان ۱۳۲ھ میں قتل ہوا اور اس کا سر ابوالعباس سفاح پہلے خلیفہ عباسی کے پاس پہنچایا گیا سفاح نے خلیفہ ہوتے ہی امیہ کو چن چن کر قتل کرانا شروع کیا۔ اس نے اس نے بنی امیہ کی نسبت اتنے سخت احکام نافذ کر دئے تھے کہ ان میں کا کوئی فرد بھی جہاں کہیں مل جاتا۔ حکومت کے لوگ اسے قتل کر کے اس کا مثلہ کر ڈالتے تھے۔ ابان ابن معاویہ گرفتار ہوئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان کو شام کے محلوں میں تشہیر کیا گیا۔ مناوی حکم کے مطابق ان کی سواری کے پاس نعرہ لگاتا جاتا تھا کہ "ابان ابن معاویہ بنی امیہ کا سردار یہی ہے" اسی حالت میں ابان بن معاویہ کی جان گئی۔ اس کے بعد تو بنی امیہ کی عورتیں اور بچے کوئی قتل سے نہ بچے۔ عباسی لشکر نے عبدہ بنت ہشام ابن عبدالملک کو صرف اس بنا پر قتل کر ڈالا کہ اس سے جواہرات اور خزانوں کا پتہ پوچھتے تھے۔ مگر اس نے کچھ نہ بتایا۔ اس خوفناک ہنگامہ سے مرعوب ہو کر بنی امیہ کے بڑے بڑے عالی مرتبہ سردار بھاگ گئے۔ اور عرب کے مختلف مقامات میں ایسے چھپے کہ تلاش کرنے پر بھی ان کا پتہ نہ چلا۔

بنی عباس کا فریب | انہی روپوش ہونے والوں میں سے عبدالواحد بن سلیمان اور عمر ابن زید وغیرہ بھی ہیں جن کو اب اپنی بے بسی کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ بنی عباس نے اس خیال سے کہ سلیمان ابن ہشام ہمارا فریب معلوم کر کے کہیں بھاگ نہ جائے سلیمان سے معاہدہ کر لیا اور بناوٹی ندامت ظاہر کر کے جو بنی امیہ زندہ بچ رہے تھے ان کی امان کا اعلان عام جاری کر دیا کچھ مدت کے لئے تلواریں میان میں کی گئیں اور بنی امیہ کے نام اشتہار ہوا کہ "بنی امیہ پر جو کچھ گزری ہے اس سے امیر المومنین نادم ہیں اور وہ ان کی زندگی چاہتے ہیں لہذا بنی امیہ کے لئے امان کا عام اعلان کیا جاتا ہے۔ اب کسی کو بنی امیہ سے تعرض کرنے کی جرات نہ ہو"

اس قسم کی منادی شام کے محلوں اور سلیمان کے لشکروں میں بھی پہنچی۔ سلیمان ابن ہشام اس وقت لشکر میں تھے۔ اس منادی کے بعد بنی امیہ نے کئی وفد بھیجے اور کچھ اوپر ستر شخصوں کو نجات ملی۔ یہ سب قبیلہ کلب سے اور انکے موالی میں سے تھے۔ اور ان میں تقریباً سب کی بنی امیہ کے ساتھ سسرالی رشتہ داری تھی۔ انھیں لوگوں میں عبدالواحد عمر اور اصبغ ابن محمد ابن سعید تھے اور ان کے علاوہ ایک گروہ ایسا تھا جس کا نام معلوم نہیں۔

اس زمانے میں جب عباسیوں کے پاس بنی امیہ کا کوئی شخص آجاتا تو عباسی اس کی عزت کرتے۔ اس کو اپنے یہاں ٹھہراتے اور اس سے یہ وعدہ کر لیتے کہ ہم آپ کو امیرالمومنین تک پہنچانے سے پہلے کسی قسم کی تکلیف نہ دیں گے۔ پھر یہ لوگ امیرالمومنین کی حضور میں پیش ہوتے اور امیرالمومنین اعلان کے مطابق ان کو پوری آزادی دے دیتے۔ مجھے ایک معتبر بزرگ سے معلوم ہوا ہے کہ ان لوگوں کے لئے کامل امن کا انتظام کر دیا گیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے مفرور مطمئن ہو کر واپس آگئے۔ یحیٰی بن معاویہ بن ہشام اس موضع میں رہتے تھے جس سے ۶ میل کے فاصلہ پر صالح بن علی کا لشکر مقیم تھا یحیٰی ابن معاویہ، صالح بن علی ہی کے مکان میں تھے مگر ان کو اور لشکر والوں کی طرح کسی قسم کا اضطراب نہیں ہوا جب اس لشکر کی نسبت صدور حکم کا وقت آیا تو لوگ یحیٰی بن معاویہ کی سکونت و قرب کی وجہ سے تشویش میں پڑ گئے کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ انتظار و تشویش کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک، یہ، عراق اور مصر کے اموی نا آگئے جب ان مقامات کے اموی بھی جمع ہو گئے تو یحیٰی ابن معاویہ نے اپنا آدمی بھیجا کہ واقعات کی تفتیش کر کے اطلاع دے۔ وہاں یہ آدمی پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اموی قتل کئے جا رہے ہیں اور ایک آفت برپا ہے وہ یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور بھاگ بھی نہ سکا۔ دشمنوں کے سواروں نے اس کو آلیا اور اسے بھی قتل کر ڈالا۔

ابن معاویہ کا شام سے فرار | عبدالرحمٰن ابن معاویہ بھی یحیٰی کے ساتھ اس گاؤں میں رہتے تھے مگر اتفاق کی خوبی ہے کہ اس دن شکار کے لئے کہیں گئے ہوئے تھے رات کے انھیں اس حادثہ کا علم

ہوا فوراً بھاگنے کی تیاری کی اور ساتھ والوں کو ہدایت کی کہ انکے بیٹے ابوایوب اور دونوں بہنیں ام الاصبغ اور امۃ الرحمٰن بعد میں بھیجدی جائیں۔

جن بزرگ کا اوپر ذکر ہوچکا ہے انھیں سے معلوم ہوا ہے کہ جب بنی امیہ سفاح کے نزدیک جمع ہونا شروع ہوئے تو وہ ان لوگوں کو عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتا اور سرا پردہ میں ٹھہراتا رہا۔ جب سب اکٹھا ہوگئے اور سفاح کی نظر عبدالواحد بن سلیمان پر پڑی تو سفاح نے عبدالواحد کا ایک احسان یاد کرکے اس کے معاوضے میں اپنے قریب بٹھایا اور اس احسان کا ذکر کرتا اور انھیں امید دلاتا رہا اس وقت چاروں طرف مسلح سپاہی لوہے کے گرز تانے ہوئے کھڑے تھے۔ دفعۃً سفاح نے ان کو اشارہ کیا اور کہا کہ ان لوگوں کے سر کچل ڈالو۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی پھر سفاح نے عبدالواحد سے مخاطب ہوکر کہا "تجھے بھی اپنی قوم اور زوال اقبال کے بعد جینا مناسب نہیں ہے ہم نے تیرے لئے فیصلہ کردیا ہے کہ تجھے تلوار سے قتل کیا جائے۔ چنانچہ حکم کے ساتھ ہی عبدالواحد کو قتل کردیا گیا۔ جس نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ جان دی۔ پھر یہی عمل عمر ابن یزید کے ساتھ ہوا۔ سب سے آخر میں سلیمان ابن ہشام کی گردن بھی ماردی گئی۔

یہ بیان بھی انھیں راوی کا ہے کہ جب بقیہ بنی امیہ نے امان کا یہ نتیجہ سنا تو دور دور کے ضلعوں میں اپنے ٹھکانوں میں چلے گئے۔ مذکورہ بالا مقتولین کے سبب سے نہر ابی فطرس کے مقتولوں کی تعداد پوری بہتر ہوگئی۔ حفص ابن نعمان نے اپنے اشعار میں انھیں کا ذکر کیا ہے۔

این اصحاب العطایا منہم　　　والبہالیل بنو الصید النجب

من یرد یسل عنہم نبہم　　　حیث . . . . من فوق الخشب

(ان میں کے اصحاب عطا و کرم کہاں اور بنی صید کے شریف و سربلند لوگ کدھر گئے۔ جو شخص ان کی حالت پوچھنا چاہے اس سے کہدو ان کا جنازہ اٹھ گیا)

افریقیہ میں بنی امیہ کی آمد | اس کے بعد بنی امیہ کی تلاش بڑی سختی سے ہونے لگی یہ لوگ جا بجا بھاگ کر روپوش ہوگئے اور چونکہ ان لوگوں نے سنا تھا کہ ان کا امن مغرب ہی میں ہوگا اس لئے اکثر لوگ

(باقی)

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے ناآشنا تھے۔ آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں، پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اس کو لیجانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گٹھیا، ورم۔ درد۔ پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بے مثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۸ دہلی

جرمنی کے بہترین

یعنی

دنیا کے بہترین ٹائپ

Bijou

S&N

"بجو"

ہلکے سفری ٹائپ رائٹر کا جدید ترین نمونہ
جو سہولتیں اس مشین میں ہیں کسی دوسرے ٹائپ رائٹر
میں نہیں، نہایت خوبصورت پائدار وزن کل ۴ سیر
قیمت انگریزی مبلغ ۱۸۰
قیمت اردو مبلغ ۲۱۰

"آئیڈیل"

اسی کارخانے کی بڑی مشین۔ دفتر کے لئے
اسے رکھئے اور اپنے دفتر کی کارکردگی میں
۵۰ فیصدی اضافہ کر لیجئے۔
قیمت انگریزی مبلغ ۳۸۰
" " اردو مبلغ ۴۲۰

S&N

Ideal

صحت کی تیر بہدف گولیاں

OKASA

جرمنی کی جادو اثر طبی ایجاد

کون ہے جس نے بحدیہ کی شہرہ آفاق، ہر پروفیسران درناف اور اسٹنکاہ کی حیرت انگیز تدابیر جراحی کا حال نہ سنا ہو۔ صرف بعض غدودوں کے بدل دینے سے (بوڑھے سے بوڑھا آدمی تندرست جوان بن جاتا ہے) ان تدابیر پر دنیا ہنوز انگشت بدنداں تھی کہ جرمنی کے نامور ماہر طبیعات ڈاکٹر لاہوسین (ایم۔ ڈی) پروفیسر برلن یونیورسٹی نے اپنی اس دوا کے انکشاف سے ہل چل پیدا کر دی ہے۔ جو کثیر المصارف عمل جراحی کے عذاب اور خطرہ میں ڈالے بغیر از سر نو صحت کو بحال کر دیتی ہے۔

اس عظیم الشان انکشاف پر اوکاسا کمپنی (برلین) کو بین الاقوامی نمائش پیرس اور اطالوی نمائش (فلورنس) میں گرینڈ پرکس طلائی تمغے اور مشہور و معروف "کراس آف آنر" بطور سند ملی ہیں۔ اسناد کی نقلیں ہمارے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔ جھریاں اور سپید بال نیست نابود ہو جاتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اضمحلال چڑچڑا پن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے۔ اس سے پہلے، کہ بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے یہ دوا ہر دوا فروش کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں

Sole Agency **OKASA** Co; Ltd; (Berlin)
22, Apollo Street, P.O. Box No. 396,
Bombay.

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ١٦

از جنوری تا جون سنہ ١٩٣١ء

مذہب

ادب و تاریخ ادب

تاریخ و سوانحعمریاں

سیاست

نفسیات

افسانہ

نظم

تنقید و تبصرہ

کتب :

رسائل

شذرات

فہرست مضمون نگاران

(۱) محمد حسین صاحب ادیبؔ ایم اے۔ بی۔ ای۔ ٹی۔ (حیدرآباد دکن)

(۲) نصیر الدین ہاشمی صاحب ایم آر۔ اے ایس۔ ایف آر۔ ایس اے (لندن)

(۳) ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب بی اے (جامعہ) ڈی۔لٹ (پیرس)

(۴) ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپہ صاحب پی ایچ ڈی۔ استاد مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۵) وہاج الدین صاحب ایم اے پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد (دکن)

(۶) مولنا محمد اسلم صاحب جیراجپوری

(۷) مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی

(۸) عبدالواحد صاحب سندھی متعلم جامعہ ملیہ دہلی

(۹) بدرالدین صاحب جینی متعلم جامعہ ملیہ دہلی

(۱۰) خواجہ منظور حسین صاحب

(۱۱) محمد زکریا صاحب مائل بھوپال

(۱۲) قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی

(۱۳) منظور صاحب سروش

(۱۴) حضرت ثاقب کانپوری

(۱۵) حضرت جگر مرادآبادی

(۱۶) سید فضل الرحمٰن بانکی پور

(۱۷) محمد حمید اللہ صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۱۸) حضرت فہمی

(۱۹) غلام سرور صاحب بی اے (جامعہ) حال مقیم مصر
(۲۰) حضرت ثاقب لکھنوی
(۲۱) سید ابو حمزہ صاحب بھوپال
(۲۲) محمد ابراہیم صاحب عمادی ندوی متعلم جامعہ ملیہ دہلی
(۲۳) مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا

مسلمانوں کے لئے

الجمعیۃ کا مطالعہ کیوں ضروری ہے!

سہ روزہ الجمعیۃ دہلی، بڑے بڑے علما اور اہل قلم حضرات کی نگرانی اور سرپرستی میں تقریباً سات سال جاری ہے اس عرصہ میں اس نے اپنی خصوصیات کیوجہ سے ہندوستان کے باہر جو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اگر آپ چاہتے کہ ہر تیسرے دن نہایت بلند پایہ علمی مضامین پیچیدہ مذہبی مسائل کی تحقیق، اسلامی ملکوں کی اہم خبریں، عربی، فارسی اور انگریزی سے عمدہ مضامین کے ترجمے، ہندوستان کے ممتاز شعرا کی دلچسپ نظمیں، ہندوستان اور ممالک غیر کی تازہ خبریں اور ملک کے سیاسی مسائل، معقول اور مدلل مقالے گھر بیٹھے پڑھا کریں تو آپ الجمعیۃ کے خریدار ہونے پر مجبور ہیں۔ الجمعیۃ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام مذہبی اور ملکی مسائل میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ حالانکہ الجمعیۃ کا سائز عام اخباروں سے بہت بڑا ہے اور سہ روزہ شائع ہوتا ہے لیکن اس کے فوائد کو عام کرنے کے لئے چندہ صرف چھ روپیہ (۶ للعہ) سالانہ۔ تین روپیہ چار آنے (۳ عہ) ششماہی اور دو روپیہ (۲ عار) سہ ماہی رکھا گیا ہے۔

اگر آپ الجمعیۃ کے خریدار نہیں ہیں تو آج ہی اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج کر اخبار جاری کرالیں یا ہمیں وی پی بھیجنے کی اجازت دیں ورنہ کم از کم نمونہ مفت طلب کر کے الجمعیۃ کی خوبیوں کی تصدیق کریں۔

منیجر اخبار الجمعیۃ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ڈی

جلد ۱۷ بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۱ء نمبر ۱

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا۔

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی مراکز

مولوی غلام سرور صاحب نے مصر سے یہ دوسرا مقالہ جو جامعہ مصریہ کے اساتذہ کے لکچروں سے لیا گیا ہے رسالہ جامعہ کے لئے بھیجا ہے۔ اس میں پہلی صدی ہجری میں مکہ۔ مدینہ۔ کوفہ۔ بصرہ۔ دمشق اور فسطاط کی علمی تحریک کی ایک مختصر بلکہ اجمالی کیفیت دکھائی گئی ہے۔

مقالہ نگار کو اس بیان پر کہ پہلی صدی ہجری میں حجاز میں سرود نغمہ نے بہت ترقی کی تھی میں کبھی مبارکباد نہیں دے سکتا۔ اس سے پیشتر بعض یوربین مورخین نے بھی یہی لکھا ہے کہ حجاز اس عہد میں ساز و سرود کا گہوارہ بن گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اسی قسم کے بیانات سے اساتذہ جامعہ مصریہ نے بھی یہ کہنے کی جرأت کی ہو۔

حقیقت یہ ہو کہ عربی ادبی مورخین خاصکر ابوالفرج اصفہانی جس نے بیس جلدوں میں غنا اور مغنیوں کے حالات لکھے ہیں زیادہ تر بازاری گپیں اور سوقیانہ خرافات فراہم کی ہیں جن کو تاریخ کا درجہ دینا تاریخ کا منہ چڑھانا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ چند لاابالی مزاج امرا اور خوش باش نوجوان تھے جو اس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ عام طور پر نہ اس کا رواج تھا نہ اس کو مقبولیت ہوئی بلکہ دینداری اور تقوے کا غلبہ تھا۔ انسانی جماعت بہرصورت انسانی جماعت ہو نہ کہ ملکوتی۔ خاصکر جب دولت اور فارغ البالی ہو تو ضرور کچھ افراد ایسے ہو جاتے ہیں جو کہ اس قسم کے بے سود مشغلے اختیار کر لیتے ہیں

از روئے تاریخ یہ کہنا بالکل صحیح ہو کہ اسلام میں غنا و سرود ہمیشہ ادنے درجہ کی چیز سمجھی گئی ہے۔ اور امرا کے لئے ارباب نشاط بھی خدام ہی میں گنے جاتے رہے

ہیں۔

حیرت یہ ہے کہ عراقی ساز و نغمہ کی آواز مقالہ نگار کو سنائی نہ دی اور اس نے حجاز سے عراق کو زیادہ پاک قرار دیا حالانکہ خود اصفہانی کے بیان سے اس کے خلاف نتیجہ نکلتا ہے۔

عراق کی علمی تحریک خاصکر اختلافات مذہبی کے بیان میں مطلق تعمق سے کام نہیں لیا گیا۔ اور حقیقی وجوہ تک مقالہ نگار کے ذہن کی رسائی نہ ہو سکی۔ دراصل عراق مرج البحرین تھا جہاں عجمی اور عربی ذہنیت میں تصادم ہوا۔ مگر باوجود اختلاف کے دونوں میں ایک یگانگت ضرور تھی وہ یہ کہ عجمی سلاطین خاصکر آل ساسان اور عربی قبائل کی تاریخ تمام تر شخصیت پرستی سے لبریز تھی اس لئے یہاں جو اختلافات مذہبی پیدا ہوئے وہ سب کے سب شخصی عقیدت پر مبنی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پیدا تو ہو جاتے تھے لیکن مٹ نہ سکتے تھے۔ چنانچہ آجتک ہم ایک طرف اذانوں میں "علیؑ ولی اللہ وصی رسول اللہ" اور دوسری طرف جمعہ کے دن خطبوں میں منبر ول پر سے جو ہدایت خلق کے لئے رکھا گیا ہے ایک طویل فہرست صحابہ کے ناموں کی سنتے ہیں۔

اس قدر جزئی اور حقیر باتوں پر جداگانہ مذاہب کی تعمیر ہوتی تھی جن پر حیرت ہوتی ہے۔ اور افسوسناک امر یہ ہے کہ یہی اختلافات جن سے حقیقی دین کا تار و پود بکھیر دیا گیا امت اسلامی کا ذخیرہ بن گئے اور اس میں وراثتہً چلے آئے جن کا نتیجہ ہلاکت ہوا۔

ہم منتظر ہیں کہ آئندہ قسط میں کیا آتا ہے۔

اسلم

(جامعہ مصریہ میں عربی ادب اور تاریخ ادب کا خاص اہتمام ہے۔ تاریخ ادب کا مطالعہ شعراء کے سوانح حیات اور ان کے منتخب کلام اور اہل قلم کے چیدہ چیدہ نثری شہکاروں کے

محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس میدان میں وہ مروجہ نصاب سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ مندرجہ
ذیل مضمون سے قارئین کرام کو معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ ادب کی تعلیم میں عرب قوم کی سیاسی،
اجتماعی، دماغی اور اخلاقی زندگی کے تجزیہ کی کوشش کی گئی ہے۔ تقریباً ایک سال ہوا کہ جامعہ
کے اساتذہ کے لیکچرز (محاضرات) کی پہلی قسط فجر الاسلام کے نام سے شائع ہو گئی ہے اس کتاب
میں پہلی صدی ہجری کی ادبی تاریخ ہے اور اس کے تین مستقل حصے ہیں۔ ایک حصہ میں عربوں
کی علمی و عقلی زندگی پر بحث کی گئی ہے جس کے ایک باب کا ترجمہ ہدیہ قارئین ہے۔ باقی دو حصے
جس میں علی الترتیب سیاسی اور ادبی تاریخ پر بحث ہو گی ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔)

سرور

دیکھنے میں آیا ہے کہ مذاہب، علوم و فنون اور ادب و شعر نے ہمیشہ شہروں میں جنم لیا اور
وہیں پروان چڑھے۔ یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ عہد حاضر میں بھی جدید افکار و
آرا اور اصلاح و ترقی کے خیالات شہروں ہی سے اٹھتے ہیں اسی طرح علم و فن کی درسگاہیں
ادبی ادارے، کتب خانے اور اخبارات و رسائل دیہات کے مقابلے میں شہروں میں زیادہ
پھلتے پھولتے اور رونق پذیر ہوتے ہیں۔ اس خصوصیت کا اہم ترین سبب شہروں کی کثرت
آبادی اور عمرانی ترقی ہے۔ کثرت آبادی اور ترقی و تمدن نتیجہ ہے وسائل زندگی کی فراوانی
کا۔ فراوانی ایک تو بلا واسطہ ہوتی ہے جیسے زمین کی زرخیزی اور پیداوار کی افراط اور دوسرے
بالواسطہ اور وہ یہ کہ دوسرے زرخیز علاقوں سے اہل شہر اپنی مصنوعات کے تبادلہ میں خام
اجناس کی کثرت سے درآمد کریں۔ کثرت آبادی اور فراوانی معیشت کا لازمی نتیجہ ہے کہ اہل شہر کو فرصت
کی گھڑیاں میسر آتی ہیں جن میں ان کو کسب رزق اور دنیا کے دوسرے دھندوں سے قدرے
فارغ البالی نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے آگے چل کر سیاسی بیداری پیدا ہوتی ہے اور لوگ
ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور زندگی کو محض ٹھوس اور مادی
نقطہ نظر کے علاوہ دوسرے پہلو سے بھی دیکھنے لگتے ہیں چنانچہ آرا و افکار وجود میں آتے

ہیں۔ علوم وفنون کی داغ بیل پڑتی ہے اور ادب پھلتا پھولتا ہے[1]۔

تمام شہر ایک سے نہیں ہوتے۔ ہر ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی امتیازی خصوصیت ضرور رکھتا ہے۔ اس تنوع سے ان کے علوم و معارف میں بھی تباین ہونا قدرتی امر ہے چنانچہ ایک شہر ایک خاص علم میں ممتاز ہوتا ہے اور دوسرا دوسرے علم میں نمایاں اور اسی طرح کہیں فلسفہ و حکمت کے چرچے ہوتے ہیں اور کسی جگہ شعر و سخن کی گرم بازاری۔ مثلاً صدر اسلام کی تاریخ ملاحظہ ہو۔ علم حدیث اور تاریخ کی حجاز میں کثرت نظر آتی ہے۔ مذاہب دینیہ اور جدید افکار و آرا کا عراق سرچشمہ بنا اور بصرہ کو نحو کی اختراع کا فخر حاصل ہوا۔ اس سے یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ کہ یہ تنوع اور اختلاف اتفاقات زمانہ کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب نتیجہ تھے طبعی اسباب کے جو پس پردہ کارفرما تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ اس کے سوا دوسرے مظاہر عالم وجود میں آتے۔ اسلامی شہروں کی شہرت علمی میں مختلف ہونے اور تنوع علوم میں اُن کی انفرادی حیثیت کے کئی ایک اسباب ہیں۔ اس زمانہ کا خیال رکھتے ہوئے جو ہمارا موضوع بحث ہے اہم اسباب ذکر کئے دیتے ہیں۔

۱۔ اسلامی مدنیت و تمدن کی عمارت مدنیات قدیمہ کے کھنڈرات پر قائم ہوئی اور ہر شہر اپنے مقامی رنگ اور ماحول کے اثرات سے متاثر ہوا۔ جب مسلمانوں نے عراق و شام کی تسخیر کی تو وہاں کے باشندے اپنی پرانی ذہنیت اور افکار و مزاج سے جو اُنھیں آبا و اجداد سے وراثت میں ملے تھے یکسر خالی ہو نہیں سکتے تھے۔ البتہ اسلام کا اثر ان پر غالب آیا چنانچہ

---

[1] اس بارے میں ابن خلدون کا بیان ملاحظہ ہو "تمدن و حضارت عقل کے لئے ترقی بخش ہے۔ تمدن مجموعہ ہے۔ تدبیر منزل۔ افراد قوم کے باہمی اختلاط اور معاشرت کا۔ باہمی اختلاط و معاشرت سے آداب وجود میں آتے ہیں۔ اور امور دین کے قیام اور اُس کے آداب و شرائط کی طرح پڑتی ہے اور یہ سب چیزیں قوانین ہیں جن سے علوم کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ عقل کی افزائش و ترقی ہے۔

نئی ذہنیت کی تشکیل عمل میں آئی جو نتیجہ تھی قدیم افکار و آرا پر اسلامی خیالات کے اثر و نفوذ کا۔

۲۔ صحابہ کرام اور تابعین کا اہل علم طبقہ علمی رجحانات اور دماغی انفرادیت میں ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اس اختلاف کے علاوہ صحابہ کرام نے ممالک اسلام کے مختلف حصوں کو اپنا آماجگاہ بنایا۔ اور وہاں اپنے درس و تدریس اور اثر و نفوذ سے علمی مراکز اور فکری اداروں کی بنیاد رکھی ان کی تکوین میں اُن کے شخصی رجحانات اور نقطۂ نظر کا ضرور پر تو پڑا اور بعد میں آنے والے لوگ بھی ان کے نقش قدم پر چلنے لگے اور اس طرح سے کئی ایک مستقل فکری ادارے قائم ہو گئے

۳۔ تیسرا اہم سبب سیاسی اور تاریخی حوادث کا ظہور ہے۔ جس نے مختلف شہروں کی علمی و ذہنی زندگی کی بالکل کایا پلٹ دی۔ مکہ کیا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول اجلال نے اس کو کیا سے کیا کر دیا۔ مدینہ آپؐ کے دار الہجرت ہونے سے ایک نئے رنگ میں منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا۔ سیاسی انقلابات و حوادث کی گرم بازاری اور فتنہ و فساد کی کثرت نے عراق کو نئے نئے افکار اور جدید مذاہب کا بازی گاہ بنا دیا۔ اسی طرح دمشق کی ذہنی زندگی کی تشکیل اور نشو و نما پر خلافت اموی کا مرکز ہونے نے مہتم بالشان اثر ڈالا۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات پیش کریں گے۔

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی و عقلی مراکز حسب ذیل تھے۔ سرزمین حجاز میں مکہ و مدینہ۔ عراق میں بصرہ و کوفہ۔ شام میں دمشق اور مصر میں فسطاط۔

حجاز خطۂ حجاز بنجر اور بے سر و سامان اور دریا و انہار سے خالی ہے۔ زمین کا بیشتر رقبہ صحرا اور پتھریلا ہے۔ تمازت آفتاب کی وہ شدت کہ چند منتشر وادیوں کے سوا روئیدگی زمین سے سر نہیں نکال سکتی۔ باشندوں کا جزو غالب بادیہ نشین ہے۔ حجاز آس پاس کی دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ اس سرزمین میں نہ تو کبھی تہذیب و تمدن کا سایہ پڑا اور نہ یہاں کے باشندوں نے بیرونی دنیا سے تہذیب و تمدن مستعار لینے کی زحمت گوارا کی۔ باہر کی دنیا سے یہودیت و نصرانیت کے قدم اس خطہ تک پہنچے اور قدرے فلسفی آرا و افکار نے بھی اس طرف راہ پائی لیکن بالکل

غیر منظم صورت میں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اہل حجاز ایسی حکمراں قوموں کی سیادت سے محروم رہے جو انھیں تہذیب و تمدن کا سبق دیتیں لیکن اُن کی اس محرومی نے اُن میں غیرت، عزتِ نفس، خود اعتمادی اور غیر معمولی فریفتگیِ حریّت کے جذبات پیدا کئے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے دنیا جہان کو تسخیر کرنے کی ٹھانی۔

اس ظلمت کدہ میں نورِ اسلام طلوع ہوتا ہے۔ اس کی زرفشانیوں سے مکہ و مدینہ علم و حکمت کے مراکز بن جاتے ہیں لیکن یہ علم و حکمت زیادہ تر دینی تھا اور خالص عربی ماحول میں۔

مکہ معظمہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظہور مبارک کا شرف حاصل ہوا۔ اور اس سے آپ کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ قریش کو دعوت حق اور اُن کی خودسری اور مخالفت اور عہد نبوت کے ابتدائی حوادث اس سرزمین میں واقع ہوئے اور اس جگہ شریعت مکی کا وجود عمل میں آیا۔ مکی شریعت کی صحیح طور پر سمجھنے کے لئے مکہ کی اجتماعی تاریخ کا جاننا اشد ضروری اور لابد ہے۔

مکہ کے بعد مدینہ مطہرہ کو آپ کے دار الہجرت ہونے کی سعادت ملی اور یہ شہر اسلامی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا گیا۔ اس جگہ شریعت اسلامی کا بڑا حصہ مدون ہوا اور صدر اسلام کے اہم تاریخی واقعات کا سرچشمہ یہی شہر تھا۔ مدینہ ہی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تعداد میں حدیثیں چھوڑیں۔ اس عہد کی اسلامی تاریخ اور تشریع و قانون کو خاطر خواہ سمجھنے کے لئے مدنی ماحول اور اس کے مختلف اجزا کا غائر مطالعہ نہایت اہم ہے۔

نیز مسلمانوں کے انتہائی عروج کے زمانہ یعنی حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں مدینہ ہی دار السلطنت رہا اور صحابہ کرام کی بڑی تعداد یہیں مقیم تھی۔ ان بزرگوں نے آنحضرت کو دیکھا تھا۔ آپؐ کے ارشادات سنے تھے اور غزوات اور مہمات میں آپ کے رفیق تھے۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انتقال کے بعد یہ لوگ آپ کے سوانح حیات

اور آپ کے اوامر کا تذکرہ کرتے ہوں گے۔

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مکہ و مدینہ کی علمی شان اور ان کی مرکزی اہمیت میں کوئی شک باقی نہیں تھا۔ صدر اسلام میں علوم حدیث و قرآن، فقہ اور تاریخ کے طلبہ کا مرجع و مقصد ہی دو شہر تھے۔ ان دونوں میں آخر الذکر اول الذکر سے فوقیت لے گیا تھا۔ بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کا ممتاز حصہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہی مکہ سے ہجرت کر گیا تھا۔

نیز ہجرت کے بعد اہل مکہ میں سے جو بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتا۔ سیدھا مدینہ کا رُخ کرتا۔ اور خاص طور پر اہل مکہ کے ذی اثر افراد و اصحاب عقل و فہم مدینہ کی سکونت کو ترجیح دیتے اس کے علاوہ نبی کریمؐ کی آخری زندگی مدینہ میں گزری اور اسلامی عظمت و رفعت کا سرچشمہ یہی شہر تھا۔ عرب کے طول و عرض سے متلاشیان حق اسی سرزمین کا قصد کرتے تھے۔ سیرت نبوی میں عام الوفود کی اہمیت اہل نظر سے مخفی نہیں۔ بہت سے صحابہ کرام کی شیفتگی اور عشق نے جو انھیں رسول کریمؐ سے تھا مجبور کیا کہ وہ اپنے آبائی جگہوں کو چھوڑ کر مدینہ ہی میں چلے آئیں تاکہ آپ کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہوسکیں اور اسلامی سرگرمیوں میں آپ کے ساتھ شرکت کا شرف حاصل کریں۔ آنحضرت کے وصال کے بعد مدینہ کی مرکزیت میں فرق نہ آیا ورنبوت کے بجائے اب وہ خلافت کی آماجگاہ قرار پایا۔ اہل اثر حضرات کو مدینہ ہی میں رکھنے کے لئے حضرت عمر نہایت مصر تھے۔ اُن کے عہد خلافت میں رؤسائے قریش بغیر کسی خاص ضرورت کے مدینہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اس عہد کی عظیم الشان فتوحات میں تمام اسیران جنگ دار الخلافہ میں پہنچتے تھے حضرت عمر کا خاص حکم تھا کہ جنگ میں جو قیدی مسلمان فوجوں کے ہاتھ لگیں ان کو آپس میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ سیدھا مدینہ بھیجا جائے۔ ان اسیران جنگ میں فارس و روم کے طبقہ امراء کے ممتاز افراد بھی ہوتے تھے اور وہ اپنے ملک اور دستور کے مطابق علوم مروجہ سے بہرہ ور بھی ہوتے ہونگے ان میں سے ایک کافی تعداد مدینہ میں بس گئی۔ چنانچہ ابن سعد نے اپنی مشہور کتاب طبقات میں ان میں سے کثیر التعداد افراد کے نام گنائے ہیں۔ یہ لوگ ان اکابر صحابہ کے موالی

شمار ہوتے تھے جن کے ہاتھ پر یہ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے افکار اور نفسیات میں اپنے عرب ہم مذہبوں سے ضرور مختلف ہوں گے۔ ان کے امتزاج اور معاشرت سے اسلامی زندگی کا موثر ہونا ایک مسلمہ امر ہے۔ یہ مسلم گروہ اپنی قوموں کے منظم علوم وفنون اور مدون کتابوں سے کافی مانوس ہوگا۔ اور اُن کی سابقہ تعلیم وتربیت نے اُن میں افکار وخیالات ضرور چھوڑے ہوں گے۔ ان حالات میں وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور اسی ذہنیت کے ساتھ احکام اسلام سمجھنے لگے۔

مذکورہ بالا اسباب کا نتیجہ تھا کہ علمی اہمیت اور سیاسی مرکزیت میں مدینہ مکہ سے بہت بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ یہ اضافہ بے محل نہ ہوگا کہ عہد ابتدا میں مہاجرین مدینہ چھوڑ کر پھر مکہ میں آباد ہونا نہایت کراہت سے دیکھتے تھے چنانچہ ابن سعد کا بیان ملاحظہ ہو "محمد بن عمر کہتے ہیں کہ مہاجرین اہل بدر میں سے کوئی ایسا فرد یاد نہیں پڑتا جو رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد مکہ واپس چلا گیا ہو۔ صرف ابی سبرۃ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ صحابی مکہ گئے اور وہاں مقیم ہوگئے۔ مسلمانوں نے اُن کے اس فعل کو نہایت برا سمجھا۔ صحابی موصوف کے لڑکے اس واقعہ سے انکار کرتے ہیں اور اس کے ذکر کو پسند نہیں کرتے"۔

مدرسہ (SCHOOL) مدینہ کی علمی شہرت اور بلند پائیگی کے یہی اسباب تھے صدر اسلام کے بیشتر علما، تفسیر وحدیث، فقہ وتاریخ اس مدرسہ سے نکلے اور نیز دور دراز حصوں سے تحصیل علم کی غرض سے طلبہ مدینۃ النبی کا قصد کرتے تھے۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ عبدالعزیز بن مروان نے اپنے بیٹے عمر کو جو بعد میں خلیفہ ہوئے تعلیم وتربیت کے لئے مدینہ بھیجا اور صالح بن کیسان کو اُن کی نگرانی سپرد کی۔ ایک دن عمر نے نماز میں تاخیر کی۔ صالح بن کیسان کی جواب طلبی پر آپ نے کہا مشاطہ میرے بالوں کو درست کر رہی تھی۔ صالح نے اس واقعہ کی اطلاع عبدالعزیز بن مروان کو دی انھوں نے ایک خاص ایلچی بھیجا اور اس نے بالوں کا سرے سے صفایا کرکے دم لیا۔ محمد بن اسحاق اور واقدی نے مدینہ ہی میں نشوونما پائی اور اسی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ متاخرین اہل تالیف نے مغازی

و سیر تدوین میں ان ہر دو سے جو مدد لی وہ ظاہر ہے۔

طبعی امر ہے کہ رسول اللہ صلعم کی حدیث اور آپ کے غزوات کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا۔ آپ کی زندگی اور جانشین خلفا راشدین کی تاریخ سے واقف ترین اہل مدینہ سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ لوگ تھے جن کے سامنے یہ سب واقعات رونما ہوئے تھے اور وہ اس کے شاہد عینی تھے۔ اب مکہ و مدینہ کے مدرسہ کے دیگر حالات اور وہاں کے مشاہیر علما کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے۔

مدرسہ مکہ | مکہ فتح کرنے کے بعد آنحضرت نے حضرت معاذ کو اپنا جانشین چھوڑا تاکہ وہ اہل مکہ کو دینی تعلیم دیں اور حلال و حرام کے احکام سے آگاہ کریں اور لوگوں کو قرآن سکھائیں۔ حضرت معاذ اپنے علم، صبر و تحمل اور فیاضی میں نوجوانان انصار میں خاص طور پر ممتاز تھے۔ آپ رسول کریم کی تمام علمی زندگی کے عینی شاہد تھے۔ آپ کا شمار مسائل حلال و حرام میں معرفت نامہ رکھنے والے صحابہ میں ہوتا تھا۔ نیز آپ قرآن کے بہترین قاریوں میں سے تھے اور عہد نبوت میں قرآن جمع کرنے کی سعادت آپ کو نصیب ہوئی تھی۔ حضرت عمر، ابن عباس، ابن عمر نے آپ سے روایت کی۔ حضرت معاذ نے طاعون عمواس میں انتقال فرمایا۔

حضرت معاذ کے بعد ابن عباس نے اپنی آخری زندگی میں مکہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے قبل مدینہ و بصرہ آپ کے علمی فیوض سے سرفراز ہو چکے تھے۔ عبد الملک اور عبد اللہ بن زبیر کی خانہ جنگی کے دوران میں آپ مکہ منتقل ہو گئے اور اس جگہ اپنی علمی بساط بچھائی۔ آپ کعبہ میں تشریف فرما ہوتے اور یہیں تفسیر، حدیث اور فقہ و ادب کا درس دیتے۔ مکہ کی علمی شہرت اور مرکزیت ان کے اور ان کے تلامذہ کی رہین منت ہے۔ اس درسگاہ کے فارغ التحصیل علما میں سے حسب ذیل تابعین خاص طور پر ممتاز ہیں۔ مجاہد بن جبر، عطا بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان[۱]۔

---

(۱) ذہبی نے طاؤس کا شمار علماء و فقہاء یمن میں کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق آپ نے ایام حج میں مکہ میں

یہ تینوں بزرگ غیر عرب یعنی جماعت موالی میں سے تھے۔ مجاہد بنی مخزوم کے مولیٰ تھے ابن عباس کی تفسیر کے راوی یہی ہیں۔ مجاہد کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباس کے سامنے تین دفعہ قرآن پڑھا۔ ہر آیت پر ٹھہر تا تھا اور اس کے متعلق ان سے استفسار کرتا کہ یہ آیت کس بارے میں اتری اور کہاں اتری۔ اور اس کا کیا مطلب ہے۔

عطا ابن ابی رباح بنی فہر کے مولی تھے۔ آپ کا رنگ سیاہ، ناک چپٹی اور بال گھونگھر والے تھے۔ آپ کا شمار مکہ کے جلیل ترین فقہاء اور عبادت گزاروں میں ہوتا تھا حضرت عطار مناسک حج کے احکام میں سب سے چوٹی پر سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ حرم میں بیٹھ جاتے اور لوگ ان کے گرد حلقہ باندھ لیتے۔ آپ ان سے گفتگو کرتے۔ پڑھاتے اور فتوے دیتے۔

طاؤس یمنی تھے اور ابناء فارس کی اولاد میں سے تھے۔ آپ بہت سے صحابہ سے ملے اور ان سے تحصیل علم کی۔ آخر میں ابن عباس کے زمرۂ تلامذہ میں منسلک ہو گئے۔ آپ کا شمار ابن عباس کے خاص شاگردوں میں ہوتا ہے۔ نیز آپ ممتاز تابعین میں سے تھے اور مکہ کے فقیہ و مفتی مانے جاتے تھے۔

اس مدرسہ کی علمی سرگرمیوں کا سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ جاری رہا۔ ہر طبقہ کے مشہور علماء کے نام گنانے اور ان کے حالات زندگی کے بیان کے لئے غیر معمولی طوالت ہو جائے گی جو سر دست ممکن نہیں۔ بالاختصار واضح ہو کہ اس سلسلہ کی پانچویں کڑی میں سفیان بن عیینہ اور مسلم بن خالد الزنجی کی شخصیتیں خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں بزرگ موالی تھے۔ امام شافعی نے جو قریش میں سے تھے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ امام موصوف غزہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والدہ مکے لے گئیں۔ ادب و شعر میں اہل بادیہ کی شاگردی کی۔ آپ شعر حفظ کرتے اور لغت سیکھتے تھے۔ بعد ازاں مقدم الذکر

انتقال فرمایا۔ ابن سعد بھی اس طرف گیا ہے۔ لیکن ہم نے ابن القیم الجوزیہ کے حوالہ سے ان کو علماء مکہ میں گنا ہے۔

علمائے کی درسگاہ میں حدیث وفقہ پڑھا۔ بیس سال کی عمر میں مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں تعلیم مکمل کی۔

مدرسہ مدینہ | اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے کہ مدینہ کا مدرسہ علمیت میں ممتاز ترین اور شہرت میں سب سے چوٹی پر تھا۔ اور اس کے اسباب بھی بیان کر دئے گئے ہیں۔ اس مدرسہ کے اہل علم صحابہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت علی خاص طور پر مشہور ہیں لیکن اس درسگاہ کے ممتاز ترین مؤسس جنھوں نے اپنی زندگی صرف درس و تدریس کے لئے وقف کر دی اور اُن کے شاگردوں اور ساتھیوں کا دائرہ بہت وسیع ہوا صرف دو ہیں۔ زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر۔ یہ دونوں بزرگ اپنے علمی مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ زید بن ثابت انصاری تھے صغر سنی ہی سے آنحضرت کے ساتھ رہے۔ سریانی اور عبرانی زبانوں کی بھی تحصیل کی لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ ان زبانوں میں اُن کو کہاں تک درک حاصل تھا۔ اہل سیرت کا بیان ہے کہ زید موصوف نے پندرہ دن میں عبرانی اور سترہ دن میں سریانی پڑھی۔ اس قلیل مدت میں کسی زبان پر قدرت اور اُس کے آداب سمجھنے کی پوری صلاحیت کا بہم کرنا مشکل امر ہے۔ کیا انھوں نے تحصیل کا سلسلہ جاری رکھا اور ان زبانوں میں مہارت حاصل کی؟ اس کے متعلق ہماری معلومات قاصر ہیں۔ بہرحال احکام اسلام کے فہم و ادراک میں زید بن ثابت کا درجہ مسلم ہے۔ قرآن وحدیث سے استنباطاتِ مسائل میں اُن کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ اور جب کوئی مسئلہ قرآن وحدیث میں نہ ملتا تو اپنی رائے وقیاس سے کام لیتے۔ ان کے بارے میں سلیمان بن یسار کہتے ہیں "حضرت عمرؓ وعثمانؓ مقدمات کے فیصل کرنے، فتوے دینے، علم الفرائض اور قرأت میں زید بن ثابت پر کسی کو ترجیح نہیں دیتے تھے" القاسم لکھتے ہیں "حضرت عمر جب کبھی سفر کرتے زید بن ثابت کو اپنا قائم مقام بناتے اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کو وہ اور اور جگہ بھیجتے ..... حضرت عمرؓ اہل فہم وذکا اشخاص کو دریافت کرتے تو زید بن ثابت کا نام لیا جاتا۔ آپ فرماتے کہ زید کی منزلت سے مجھے انکار نہیں لیکن اہل مدینہ کو آئے دن کے مسائل میں زید کی اشد ضرورت رہتی ہے اور اُن کے سوا دوسرا یہ کام کر نہیں سکتا۔ اس لئے میں زید کو باہر نہیں بھیج سکتا۔"

قبیصہ کا قول ہے "حضرت عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم کے زمانہ خلافت میں مدینہ کی قضاء، فتوے روایت اور فرائض (وراثت) کے مناصب ان کے سپرد تھے۔ حضرت علی کے بعد امیر معاویہ نے بھی اُن کو اسی خدمت پر بحال رکھا۔ یہاں تک کہ ۵۴ ہجری میں راہی ملک عدم ہوئے"۔ ابن عباس ان کی رکاب تھام کر کہا کرتے کہ علماء اور اکابر کی توقیر یوں کی جاتی ہے۔ زید بن ثابت ریاضیات میں خاص ماہر تھے۔ اور فرائض میں تو اُن کا کوئی مثیل نہ تھا۔ جنگ یرموک کی غنیمت اُن کے ہاتھوں تقسیم ہوئی۔ المختصر زید بن ثابت بلند پایہ عالم اور فقیہہ تھے۔ اس کے ساتھ ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور مسائل و معانی کے استنباط میں اُن کو خاص ملکہ ودیعت کیا گیا تھا۔ جو مسئلہ قرآن و حدیث میں نہ ملتا اس میں اپنی رائے سے کام لیتے۔

حسان بن ثابت رسول اللہ صلعم کے شاعر نے آپ کی وفات پر مرثیہ کہا۔ اُس میں کا ایک شعر یہ ہے۔

فمن للقوافی بعد حسان وابنہ ۔۔۔ ومن للمعانی بعد زید بن ثابت

(حسان اور اس کے بیٹے کے بعد اہل سخن کون ہے؟ اور زید بن ثابت کے بعد صاحب معانی کون ہے؟)

یہی معانی، یا معنویت کا وصف جس کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے زید بن ثابت کا نمایاں جوہر ہے اور یہی خصوصیت عبداللہ بن عمر سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔ ابن عمر صرف عالم تھے۔ وہ حدیثیں جمع کرتے۔ ان کی روایت کرتے اور اُن کو قلمبند کرتے۔ فتوے دیتے اور ذاتی رائے کے اظہار سے وہ ہمیشہ بچتے۔ علوم اسلامیہ کی تاریخ میں یہی دونوں میلان (تقلید و اجتہاد) ایک طویل عرصہ تک پہلو بہ پہلو سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

مدرسہ مدینہ نے علماء تابعین کی کافی تعداد پیدا کی۔ ان کے سرتاج اور سب سے مشہور سعید بن المسیب ہیں۔ آپ زید بن ثابت کے تلامذہ میں تھے۔ سعید موصوف اپنے استاد کے فتووں کو محفوظ رکھتے تھے اور اُن کے قول کو دوسرے اقوال پر ترجیح دیتے۔

عروہ بن زبیر بن عوام بھی اسی درسگاہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ مدینہ کے اہل علم و اہل تقوےٰ بزرگوں میں آپ کی ممتاز حیثیت تھی

علمار کے اسی گروہ سے ابن شہاب الزہری قریشی نے علم حاصل کیا۔ صاحب موصوف نے علمار مدینہ سے فقہ و حدیث لی۔ زمرۂ علمار میں سے تدوین علم میں آپ نے سبقت کی۔ آپ کو متعدد خلفار امیہ کے ہاں تقرب حاصل تھا۔ اور خاص طور پر عبدالملک اور ہشام آپ کا بہت احترام کرتے۔ یزید بن عبدالملک اُن سے فتوے طلب کیا کرتے۔ عمر بن عبدالعزیز نے انھیں کے متعلق فرمایا تھا کہ پیشر و سنت کا جاننے والا الزہری سے بڑھ کر کوئی نہیں ملے گا۔

آخر میں اس مدرسہ نے امام مالک بن انس ایسی زبردست شخصیت پیدا کی۔

جہاں سرزمین حجاز میں ایک طرف یہ قابل احترام اور باعظمت علمی تحریک جس کے کارنامے محدثین فقہا و علما کے رشحات قلم نے آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دئے ہیں۔ سرگرم عمل تھی اسی کے ساتھ عیش و نشاط اور رنگ و طرب کی زندگی بھی موجود تھی۔ اس کی تفصیل کے لئے کتب ادب اور خاص طور پر کتاب الاغانی کا مطالعہ کیجئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے صحیح تجزیہ کے لئے تصویر کے دونوں رخ سامنے رکھیں اور اس دور کی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کی جائے۔

حجاز میں زہد و ورع۔ دینداری اور حدیث و فقہ کے چرچے تھے اور رنگ و طرب۔ لہو و لعب کے بھی حلقے موجود تھے۔ شراب بھی تھی اور اشعار میں عورتوں سے تغزل و تشبیب بھی ہوتی تھی اور راگ و سرود کی محفلیں بھی رہتی تھیں۔ اول الذکر تحریک نے اسلامی علوم کو ترقی دی اور دوسری زندگی نے، ادب، نکتہ سنجی، شعر و سخن اور راگ و رنگ کی طرح ڈالی۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ فن لطیف عراق اور شام کے مقابلہ میں حجاز میں زوروں پر تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ و مدینہ اور ان کے اطراف گانے والوں اور گانے والیوں سے بھرے پڑے تھے۔ ابوالفرج کے قول کے مطابق مغنی قافلوں کی صورت میں حج کے لئے نکلتے تھے۔ ایک زمانہ

میں ان چار مغنیوں کا بہت شہرہ تھا۔ ان میں سے تین ابن سریج، الغریض، معبد تو حجاز میں تھے اور حنین عراق میں۔ ان تینوں نے آخر الذکر کو حجاز بلا بھیجا چنانچہ وہ آیا اور چاروں اہل کمال حضرت سکینہ کے ہاں جمع ہوئے اور بزم سرود آراستہ کی گئی۔ شائقین کو صلائے عام تھی بس پھر کیا تھا خلقت ٹوٹ پڑی۔ مکان کی چھت پر اتنا اژدہام ہوا کہ چھت نیچے آ رہی اور حنین دب کر مر گیا۔
ایک اور واقعہ ہے کہ حجاز میں حسب ذیل مشہور و معروف گانے والے اور گانے والیاں جمع ہوئیں۔

جمیلہ۔ ہیت۔ طویس۔ دلال۔ برد الفؤاد۔ نومۃ الضحیٰ۔ رحمۃ۔ ہبۃ اللہ۔ معبد۔ مالک ابن عائشہ۔ نافع ابن طنبورہ۔ عزۃ المیلاء۔ حبابہ۔ سلامہ۔ بلبلہ۔ لذۃ العیش۔ سعیدہ۔ الزرقاء وغیرہ۔ روایت ہے کہ ان لوگوں نے حج کیا اور مکہ میں ان میں سعید بن مسجح۔ ابن سریج۔ الغریض ابن محرز کا اضافہ ہو گیا۔ اہل مکہ مرد و عورت ان کے حسن ہیئت کو دیکھتے تھے۔

ابو الفرج ایک اور جگہ کہتا ہے کہ ایک دفعہ جمیلہ مغنیہ کے ہاں شائقین کا ہجوم ہوا اس نے ستار لیا۔ اور لونڈیوں کے ساتھ مل کر سب نے ساز چھیڑا چنانچہ کوئی پچاس نغمے نکالے اور مکان لرزنے لگ گیا۔ اس کے بعد عود پر گایا اور لونڈیاں ساز بجاتی رہیں۔

مکہ کا طرز راگ اور تھا اور مدینہ کا اور۔ اور دونوں میں خوب چشمک رہتی تھی۔ راگ و رنگ کی طرف لوگوں کا اشتیاق اتنا بڑھا کہ ابو الفرج کے بیان کے مطابق ایک دفعہ خلیفہ عبد الملک اموی سے یہ شکایت کی گئی کہ مکہ میں ایک کالا کلوٹا سعید بن مسجح نامی ہے جس نے قریشی نوجوانوں کو خراب کر دیا ہے۔ اور وہ بے طرح اس پر زر و مال کی بارش کرتے ہیں۔ خلیفہ نے عامل مکہ کو حکم دیا کہ سعید کا مال ضبط کر کے اس کو کوڑے لگائے جائیں! ایک اور روایت ہے کہ امام مالک بن انس نے بیان کیا میں لڑکا ہی تھا اور گانے والوں کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا اور ان کے راگ یاد کرتا۔ ایک دن والدہ نے کہا کہ بیٹا اگر مغنی بدصورت ہو تو اس کے راگ کی طرف زیادہ التفات نہیں ہوتا۔ راگ و غنا چھوڑ کر علم فقہ کی تحصیل کرو۔ کیونکہ اس میں بدصورتی گزند نہیں پہنچاتی۔ چنانچہ میں نے گانے کا شوق چھوڑا اور فقہ کی طرف توجہ کی اور اس میں خدا تعالیٰ نے مجھے

فضل وکمال بخشا۔

گانے کے علاوہ نکتہ سنجی اور ذکاہات وظرافت کی بھی گرم بازاری تھی۔ مدینہ میں الناصری اس فن کا استاد تھا۔ اس کے بعد اشعب نے اس کی جگہ لی اور حجاز کو نوادر و ذکاہات اور خوش گوئی سے مسحور کر دیا۔ اہل مدینہ کی بزم طرب کے اس گل سرسبد کے کارنامے اب تک کتب ادب میں ثبت ہیں۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ سرزمین حجاز راگ ورنگ اور ذکاہات وظرافت سے بھی مالا مال تھی اور حدیث وفقہ کے درس وتدریس کا چشمہ فیض بھی اُمڈ رہا تھا۔ اس عہد کے چوٹی کے مغنی جن سے امرائے بنی امیہ کی محفلیں سجتی تھیں سب حجازی درسگاہ کے فارغ التحصیل تھے۔ اس کے ساتھ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ حجاز میں فقہ وحدیث کی غیر معمولی فراوانی ہو۔ اس کے اسباب اوپر گذر چکے ہیں۔ ہاں تعجب تو اس پر ہے کہ راگ ورنگ اور شعر وسخن میں حجاز عراق اور شام پر بازی لے جائے۔ چاہئے تو یہ تھا اور یہ ہے بھی قریب الفہم کہ عراق جو قدیم تمدن وحضارت کا حامل اور شام جو رومی تہذیب کا آماجگاہ رہ چکا تھا۔ راگ ورنگ میں حجاز سے پیشقدمی کرتا۔ اور حجاز کی حالت تو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ تہذیب سے زیادہ اسے بدویت سے قرب تھا اور وہ شام اور عراق کے مقابلہ میں اقتصادی لحاظ سے بالکل صفر تھا۔ آخر یہ کیا راز ہے؟

اس عہد کی کتب ادب سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حجاز ظرافت اور لطافت طبع میں عراق وشام کے باشندوں سے فوقیت لے گئے تھے۔ یہاں تک کہ حجاز کے فقہا راگ وسرود کے معاملہ میں فقہاء عراق سے زیادہ بردبار اور وسیع القلب تھے۔ ہمارے خیال میں عراق کا یہ مذہبی تشدد فارسی اثرات کا نتیجہ تھا۔ آغانی عبداللہ بن عمر العمری سے بیان کرتا ہے کہ میں نے حج کا قصد کیا راستہ میں ایک حسین عورت کو دیکھا کہ گفتگو میں فحش کی حد تک پہنچ گئی۔ میں نے اپنی ناقہ کو اس کے قریب لا کر کہا۔ خدا کی بندی حج کا ارادہ ہے اور اللہ سے نہیں ڈرتی۔ عورت نے اپنے حسین چہرہ سے جس کی تاب جمال آفتاب بھی نہ لا سکے۔ نقاب الٹ کر کہا کہ میں ان میں سے ہوں جن کے متعلق العرجی

کہتا ہے ؎

من اللا ر لم یحجن بغین حسبتہ — ولکن لیقتلن البریٔ المغفلا

(میں اُن میں سے ہوں جو ثواب کی غرض سے حج نہیں کرتیں بلکہ ان کا مقصد بے گناہ سادہ لوحوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے)

میں نے کہا۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ اس چہرہ کو عذاب آتشیں سے مامون رکھے۔ سعید بن المسیب مفتی مدینہ کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو کہنے لگے کہ خدا کی قسم اگر اہل عراق میں سے کوئی جلا بھنا ہوتا تو کہتا۔ ہٹ دور ہو۔ خدا تجھے غارت کرے۔ لیکن یہ اہل حجاز کے عبادت گزاروں کی ظرافت ہے۔ کتاب الاغانی میں ایک اور مقام پر داود الثقفی کا قول منقول ہے کہ ہم ابن جریج کے حلقہ میں بیٹھے تھے اور وہ حدیث بیان کر رہے تھے۔ اُن کے ارد گرد کافی مجمع تھا جس میں عبداللہ بن مبارک اور چند عراقی بھی تھے۔ اسی اثنا میں ابن میزل مغنی ادھر سے گزرا۔ ابن جریج نے بلایا اور گانے کی فرمائش کی۔ ابن میزل نے عذر کیا ادھر سے مزید اصرار ہوا۔ آخر ابن میزل نے گایا۔ اور آخر میں کہا کہ اگر آپ کے پاس ان خشک مزاج حضرات کا ہجوم نہ ہوتا تو میں آپ کو دل بھر کر گانا سناتا کہ آپ نہال ہو جاتے۔ ابن جریج اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا شاید تم نے میرے اس فعل کو ناپسند کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ عراق میں ہم گانے کو پسند نہیں کرتے اور کراہیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ابن جریج نے پوچھا۔ رجز یعنی حدی کے متعلق کیا خیال ہے؟ کہنے لگے اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ابن جریج نے کہا کہ حدی اور غنا میں کیا فرق ہے۔ ابوالفرج لکھتا ہے کہ ایک دفعہ حنین شام میں پہنچا اور نوجوانوں کی ایک محفل میں بزم سرود جمائی۔ حنین نے ہر رنگ کے راگ الاپے اور ہر ساز چھیڑا لیکن اہل محفل محظوظ نہ ہوئے اور ہنبہ مغنی کی فرمائش کی۔ وہ آیا اور سخیف گانا گایا۔ حاضرین اس پر لٹو ہو گئے، حنین جھلا اٹھا اور کہا کہ خدا کی قسم یہاں ایک رات گذارنا بھی مجھ پر حرام ہے

اس کا ایک اور سبب ہے اور وہ یہ کہ حجاز امرائے عرب کا مرکز تھا اور انھیں کے ہاتھوں

پر بڑی بڑی فتوحات سر ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ مال غنیمت میں سے سب سے چوٹی کی لونڈیاں جو عالی نسبی اور تعلیم و تربیت میں خاص ممتاز تھیں ان کے حصہ میں آئیں۔ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جو امرا و بادشاہوں کے محلات میں پلیں اور تہذیب و تمدن سے کافی بہرہ ور تھیں۔ ان لونڈیوں کی وساطت سے یہ چیزیں حجاز میں پہنچیں اور یہاں ان پر عربی رنگ چڑھا۔ حجاز میں مدرسہ موسیقی کی تاسیس انھیں لوگوں کی رہین منت ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اہل بادیہ جب دائرۂ تہذیب میں آئیں اور انھیں وسائل زندگی کی فراوانی حاصل ہو تو وہ اُس شخص کی طرح جو تنگی و فقر و فاقہ کے بعد فارغ البال ہوا ہو لہو و لعب میں پڑجاتے ہیں۔

اس کا یہ بھی سبب ہے کہ بنی امیہ خود خلافت پر قابض ہوگئے اور اُس کو اپنے گھرانے تک کیا صرف ایک خاندان میں محدود کرلیا۔ اور دوسری قریشی خاندانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کردیا۔ یہاں تک کہ اُن کے لئے امور سیاست میں دخل تو کیا اُس میں فکر و غور کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ شام بنی امیہ کا موید تھا اور عراق ان کا شدید مخالف۔ حجاز کا نوجوان طبقہ خلافت اور سیاست دونوں سے بے نیاز ہوگیا۔ مال و دولت اور جاہ و ثروت کی کیا کمی تھی۔ اس کا نتیجہ رنگ و طرب ظرافت و نکاہات اور لہو و لعب لازمی تھا۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ حجاز میں جو کچھ رونما ہوا وہ ان مذکورہ بالا اسباب کا نتیجہ تھا۔ زندگی کی اس خاص روش کا اثر ادبیات پر زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے اس پر مزید گفتگو ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔

عراق | وادی دجلہ و فرات کا جنوبی حصہ عراق کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ پانی کی فراوانی ہے اور آب و ہوا معتدل ہے۔ اسی سبب سے اس کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں سب سے پہلے تہذیب و تمدن کی داغ بیل پڑی۔ حضرت مسیح سے تین ہزار سال قبل مختلف متمدن قوموں نے یکے بعد دیگرے عراق کو اپنا جولانگاہ بنایا۔ اہل بابل۔ اشوری۔ کلدانی۔ فارسی اور

یونانی نسلوں نے اپنے اپنے وقت میں عراق پر قبضہ کیا اور ہر ایک نے اپنے دستور کے مطابق یہاں سلطنتوں کی بنیادیں رکھیں۔ یہ اپنے مظاہر اور خصوصیات میں ایک دوسرے مختلف تھیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان کی تہذیب و تمدن کی ضیا باریاں آس پاس کے ملکوں کو برابر منور کرتی رہیں۔

اہل عرب قدیم سے اس سرزمین کو جانتے تھے۔ قبائل بکر و ربیعہ تو یہاں آباد بھی ہو گئے تھے اور بعد میں ان لوگوں نے یہاں ایک ریاست بھی قائم کی جو ریاست حیرہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عراق مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں بصرہ و کوفہ نئے شہروں کی بنیاد بڑی جوش سرعت پروان چڑھے۔ مدائن جو کسریٰ دار السلطنت رہ چکا تھا اُس کے مال و دولت کے خزانے بصرہ و کوفہ کے حصہ میں آئے اور اہل اور حیرہ کی تہذیب نے بھی ادھر کا رخ کیا چنانچہ بنی امیہ کے دور حکومت میں عراقی تہذیب کی مرکزیت صرف ان دو شہروں میں سمٹ آئی تھی۔ یہاں تک کہ اُس زمانہ میں عراق سے بصرہ و کوفہ مراد لئے جاتے تھے اور بسا اوقات ان پر "عراقین" کا اطلاق کیا جاتا تھا۔

جب عراق فتح ہو گیا اور اہل عرب نے اس کی ثروت کے قصے سنے تو اس طرف کا رخ کیا۔ طبری کا بیان ہے "عتبہ نے انس بن حجیہ کو ایران سے حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا۔ آپ نے مسلمانوں کی کیفیت دریافت کی۔ انس نے کہا کہ دنیا اُن کے اوپر ڈھے پڑی ہے اور وہ سونے چاندی سے کھیلتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں کو بصرہ کا اشتیاق ہوا اور بڑی تعداد میں وہاں پہنچے حضرت عمرؓ نے اراضی اصلی باشندوں کے پاس ہی رہنے دی۔ البتہ اس پر خراج لگایا چنانچہ ایک جریب (۳۶۰۰ مربع ہاتھ) خرمہ پر دس درہم۔ نیشکر پر چھ درہم۔ گیہوں پر چار درہم اور جو پر دو درہم خراج مروی ہے۔ اس حساب سے مالگزاری کی مجموعی تعداد دس کروڑ درہم تک پہنچی۔ علاوہ ازیں غیر مسلم رعایا پر جزیہ بھی نافذ کیا گیا۔ جزیہ دینے والوں کی تعداد پانچ لاکھ پچاس ہزار تھی۔ جزیہ کی تعداد ایک سی نہ تھی ۴۸ دینار سالانہ سے لے کر حسب توفیق ۲۴ اور ۱۲ دینار تک اس کی تعداد یں مقرر تھیں۔ اس

بیان سے عراق کی ثروت و امارت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے چنانچہ یہی سبب تھا کہ اہل عرب نے بڑی تعداد میں ادھر کا رُخ کیا۔

عرب سرزمین عراق میں پہنچے تو اپنے ساتھ قبائلی رقابتیں اور فاتحانہ عالی دماغی بھی لیتے گئے اول الذکر جذبہ کا مظاہرہ بصرہ و کوفہ کے تعمیری نقشہ میں ہی کیا گیا۔ ان ہر دو شہروں کی تقسیم روز اول قبیلہ وار کی گئی۔ کوفہ کے دو حصے کئے گئے شرقی اور غربی۔ شرقی حصہ موخر الذکر سے بہتر تھا۔ اب معاملہ یہ درپیش ہوا کہ بہتر حصہ کسے ملے۔ آخر کار شرقی حصہ اہل یمن نے لیا اور دوسرا نزاری قبائل کے حصہ میں آیا۔ اس تقسیم کے بعد ہر جماعت نے اپنے اپنے حصہ کو قبیلہ وار تقسیم در تقسیم کیا۔ اس کی تفصیلی تشریح کے لئے تاریخ طبری ملاحظہ ہو۔ شعبی کا بیان ہے کہ کوفہ میں اہل یمن نزاریوں سے زیادہ تھے۔ اول الذکر بارہ ہزار تھے اور نزاری صرف آٹھ ہزار۔ ان دونوں کی باہمی کشمکش نت نئے فتنوں کا سبب بنتی رہتی تھی جب کبھی کوفہ اور بصرہ کے عربوں میں لڑائی ٹھنتی تو ہر ایک قبیلہ علٰحدہ علٰحدہ اپنے اپنے قبیلہ کے خلاف صف آرا ہوتا۔ مثلاً کوفہ کے یمنی بصرہ کے یمنیوں سے الجھتے اور کوفہ کے بنو ربیعہ بصرہ کے بنو ربیعہ کے مقابل میں آئے۔ اسی طرح مضر مضر سے بھڑتے

(باقی آئندہ)

صحبت کا اثر تعلیم کی جان ہے

گِلِ خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بہ دستم
بدو گفتم کہ مشکے یا عبیری — کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گِلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

آج کل ہماری آنکھوں میں مغربی تمدن کی روشنی ایسی سمائی ہے کہ مشرق کی کوئی چیز نظر میں نہیں جچتی۔ ہمارے کالجوں کے طالبعلموں سے پوچھئے کہ دنیا کے سب سے بڑے شاعر کون تھے تو وہ چھٹتے جواب دیں گے ہومر، ورجل، ڈانٹے، شکسپیر، ملٹن، گوئٹے، پھر کچھ سوچ کر حبِ وطن کی خاطر کالیداس اور فردوسی کا نام بھی لے دیں گے مگر ڈرتے ڈرتے کہ کہیں آپ یہ نہ پوچھ بیٹھیں: "ان میں سے کسی کا کلام بھی پڑھا ہے؟" اگر ان سے یہ سوال کیجئے کہ سب سے بڑے معلم کون گذرے ہیں تو وہ سقراط، افلاطون، روسو، پیستالوزی، فروبل کی فہرست گنوا کر خاموش ہوجائیں گے۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ مشرق میں بھی کوئی ایسا شخص گذرا ہے جو ان معلموں کی صف میں ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہے۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو تعلیم کے پیمبر دنیا میں تین ہی ہوئے ہیں مغرب میں سقراط اور پیستالوزی اور مشرق میں شیخ سعدی شیرازی۔

شیخ سعدی کا نام سن کر لوگ چونکیں گے اور کہیں گے کہ انھوں نے کونسی کتاب نظریۂ تعلیم یا فنِ تعلیم پر لکھی ہے جو ان کا شمار دنیا کے بڑے معلموں میں کیا جائے؟ ان حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ بیشک شیخ سعدی نے کوئی "رہنمائے مدرسین" یا "ضابطۂ تعلیمات" تصنیف نہیں

کیا جو ٹیکسٹ بک کمیٹی میں پیش کیا جا سکے۔ مگر یہ شرف تو سقراط کو بھی حاصل نہ تھا۔ اس نے تو تعلیم کیا کسی موضوع پر ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ پیستالوزی کی بھی جو عظمت ہے وہ اس کی تصانیف کی وجہ سے نہیں ہے۔ ہم نے ان تینوں کو تعلیم کا پیمبر کہا ہے۔ پیمبر کا کام صفحہ کاغذ کو سیاہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ زمانے کے ورق پر اپنی کتاب زندگی تحریر کرے جو اس کے عہد میں بلکہ قیامت تک دنیا کے لئے چراغ ہدایت کا کام دے۔ تعلیم کا پیمبر اسے کہنا چاہئے جو سرسے پیر تک بچوں کی نارستہ یا نوجوانوں کی ناشگفتہ روح کی محبت میں ڈوبا ہوا ہو جسے خدا نے یہ ملکہ عطا کیا ہو کہ ایک نظر میں ان کے دل کے بھید کو سمجھ لے ایک بات میں ان کی زندگی کی رو کو پلٹ دے اور یہ توفیق دی ہو کہ اپنے آپ کو ان کے بنانے کی کوشش میں مٹا دے۔ یہ چیز اگر یونان کے حکیم اور جرمنی کے مدرس کے یہاں بدرجہ اتم نظر آتی ہے تو ایران کے شاعر کے یہاں بھی کچھ کم نہیں۔

افسوس ہے کہ شیخ سعدی کی زندگی کا یہ پہلو ان کے سوانح نگاروں نے اچھی طرح نہیں دکھایا مگر دیکھنے والے کے لئے گلستاں اور بوستاں کا ہر صفحہ ایک چمن ہے جس میں تعلیمی نکتوں کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں اصول تعلیم اور نفسیات شباب کے متعلق ایسی ایسی بتے کی باتیں ملتی ہیں جن سے پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ اس عارف زندگی کا دل تعلیم کی سچی روح سے معمور تھا اور اُسے خدا نے اس لئے پیدا کیا تھا کہ نوجوانوں کو نغمہ شعر کے پردے میں راز حیات کا محرم اور بار امانت کا حامل بنا دے۔

چنانچہ دیکھئے گلستاں کے اس مشہور قطعے میں جو ہمارے مضمون میں زیب عنوان ہے تعلیم کا اصل اصول کس خوبی سے ایک لطیف حکایت کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ تعلیم کی جان استاد کی صحبت کا اثر ہے۔ یہ روح افزا اور روح پرور اثر آہستہ آہستہ شاگرد پر پڑتا ہے اور اس کے نفس کی تہذیب اور ترقی میں معاون ہوتا ہے۔ ہم اس قطعے کے مضمون کی تحلیل کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ شاعر کے وجدان صحیح نے وہ نظریہ تعلیم پہلے ہی محسوس کر لیا تھا جسے آگے چل کر فلسفیوں نے غور و فکر سے معلوم کیا۔

ایک اتفاقی واقعے سے شاعر شیراز کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ باغ کی مٹی میں گلاب کے پھولوں کی خوشبو سرایت کر جاتی ہے اس مضمون کو اس کا حسن آفریں قلم بڑے پیارے انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مٹی میں ایسی خوشبو پاکر مجھے حیرت ہوئی " میں نے اس سے کہا تو مشک ہے یا عبیر ہے کہ تیری پیاری خوشبو نے مجھے مست کر دیا۔ مٹی نے جواب دیا نہیں میں تو ناچیز مٹی تھی مگر کچھ دن گلاب کے پھول کے ساتھ رہی۔ یہ اسی کی خوشبو مجھ میں آگئی ہے ورنہ میں وہی مٹی ہوں جو پہلے تھی۔"

اب ذرا غور کیجئے تو اس چھوٹے سے قطعے میں یہ چاروں باتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ اگر دو آدمی مدت تک ساتھ رہیں تو ایک کی صحبت کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے جسے تعلیم کہتے ہیں دوسرے یہ کہ تعلیمی اثر ڈالنے کے لئے شرط ہے کہ ان میں سے ایک شخص کمال علم و اخلاق سے مالا مال ہو جیسے گلاب کا پھول جمال رنگ و بو سے مالا مال ہوتا ہے اور دوسرا خاک کی طرح خاکسار ہو اور بیرونی اثر قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔ تیسرے یہ کہ یہ اثر اصل میں بے محسوس کئے ہوئے خود بخود پڑتا رہتا ہے جیسے پھول کی خوشبو مٹی میں جذب ہوتی ہے۔ چوتھے یہ کہ اس اثر کی ایک حد ہے۔ اچھی صحبت انسان کے جذبات و خیالات کو بہت کچھ بدلتی ہے مگر اس کی وضع نفسی یعنی طینت کو نہیں بدل سکتی۔ مٹی مٹی ہی رہتی ہے چاہے اس میں خوشبو پھول کی پیدا ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں نظریۂ تعلیم کے اہم ترین مسئلے یعنی شخصی تاثیر و تاثر کے پانچ پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (۱) صحبت کے اثر کی اہمیت۔ (۲) اثر آفرینی کی شرائط۔ (۳) اثر پذیری کی شرائط۔ (۴) اثر پڑنے کا طریقہ (۵) اس کی حد۔

ہم ان پانچوں پہلوؤں پر الگ الگ کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے تاکہ تعلیم کا یہ اصل اصول ارباب نظر کو متوجہ کرے اور وہ اس پر غور کرکے ہم سے زیادہ گہرے اور مفید نتائج پر پہنچ سکیں۔

(۱)

یوں تو جب کبھی دو آدمی ساتھ رہتے ہیں۔ ایک کی خو بو کا اثر دوسرے پر ضرور پڑتا ہے۔

اور اس طرح کے ہر اثر کا شمار تعلیم میں ہے۔ مگر ہمیں اس وقت اس مسئلے سے بحث کرنا ہے کہ باقاعدہ تعلیم میں صحبت کا اثر کیا اہمیت رکھتا ہے اور اس شخص میں جس کا کام دوسروں پر تعلیمی اثر ڈالنا ہو کیا صفات ہونا چاہئیں۔ تعلیم میں بچوں یا نوجوانوں پر ایک دوسرے کی صحبت کا اثر بھی پڑتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تعلیمی قوت اس تاثیر میں ہے جو شاگردوں کی سیرت میں استاد کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اسی کی ذات ان کے سامنے ہمیشہ نمونے کے طور پر رہتی ہے۔

پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ تاثیر کن چیزوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ استاد کی صحبت کا جو اثر شاگردوں کی ذہنی تربیت پر پڑتا ہے اسے سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ اگر استاد نا قابل، کند ذہن یا بدشوق ہو تو یہی نہیں کہ شاگردوں کو اس سے کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ اکثر وہ جوہر قابل بھی جوان میں ہے ضائع ہو جاتا ہے۔ ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر انگریزی ہمیشہ دیسی لہجے میں اردو کی نحوی ترتیب کے ساتھ بولتے تھے اور شعر خواہ کسی زبان کا ہو ناموزوں پڑھتے تھے۔ اس سُدیشی انگریزی اور شرعی شعر خوانی کا اثر ان کے شاگردوں پر یہ ہے کہ ان کی انگریزی اور قواعد صرف و نحو میں ہمیشہ ان بن رہتی ہے اور شعر اگر ان کی زبان پر آجائے تو صحیح سلامت بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس سے ان کی عام ذہنی قابلیت خصوصاً احساس تناسب اور ذوق ادب کا جو اندازہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ شکر ہے کہ اب ہمارے ملک میں مدرسوں کا معیار قابلیت بڑھانے پر زور دیا جا رہا ہے مگر ہیڈ ماسٹری کے لئے اب بھی ذہنی قابلیت سے زیادہ ضروری خوش پوشاک "ونگ" تیز زبان، تیز مزاج اور انگریز ہونا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ہیڈ ماسٹر اسکول کے لڑکوں کی نظر میں مولانا حالی کے موچی کی طرح افلاطون سے کچھ یوں ہی سا کم ہوتا ہے۔ اس کی قابلیت ان کے نزدیک وہ بلندی ہے جہاں مرغ خیال مشکل سے پہنچتا ہے۔ اب اگر خود ہیڈ ماسٹر صاحب کی علمی پونجی تھوڑی ہو تو طالب علموں کی بے مائگی کا کیا پوچھنا ہے۔

بچے جب اسکول میں آتے ہیں تو ان کے دل پر ایک عجیب وحشت سی طاری ہوتی ہے انھیں شوق تو ہوتا ہے "زندگی کے ہرے بھرے درخت" کے پھل کھانے کا اور سابقہ پڑتا ہے

علم جیسی "خشک اور بیرنگ" چیز سے جسے لاکھ دلچسپ بنایئے پھر بھی طبیعت اس سے اچاٹ رہتی ہے۔ اگر استاد قابل ہو تو شاگردوں کو دکھا دے کہ یہ بوجھ ہنستے کھیلتے اٹھایا جا سکتا ہے لیکن اگر خدا نخواستہ وہ خود ہی علم کے نام سے گھبراتا ہو تو ظاہر ہے کہ شاگرد تو اس مصیبت سے کوسوں دور رہیں گے۔

اخلاقی تربیت پر محبت کا اثر اور بھی زیادہ پڑتا ہے۔ سچ پوچھیے تو اخلاق کی تعلیم کا سوائے اچھی صحبت کے اور کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے اخلاق برتنے کی چیز ہے۔ اس کا ایک نظری پہلو بھی ہوتا ہے مگر وہ محض جسم ہے جس کی جان عمل ہے۔ اخلاقی اصول جن کی بچوں کو تلقین کی جاتی ہے مردہ الفاظ کے سوا کچھ نہیں۔ ان میں زندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان پر عمل کرکے دکھایا جائے۔ بچوں کے والدین اور استاد جس قدر اہتمام وعظ و نصیحت میں کرتے ہیں اس کا آدھا بھی اس بات میں کریں کہ بچوں کے پیش نظر ریاکاری سے پاک سچے اخلاق کے نمونے رہا کریں تو ان کی کوششوں میں کہیں زیادہ کامیابی ہو۔

تربیت کا ایک اور شعبہ ہے جو سراسر تاثیر محبت پر مبنی ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچوں میں ذوق جمال پیدا ہو جس میں لباس کا ستھرا پن۔ رہنے سہنے کا سلیقہ، فطرت کے خوشنما مناظر کا شوق، آرٹ کے حسین نمونوں کی قدردانی۔ دلکش اطوار، دلپذیر اخلاق، دل پسند گفتگو، سبھی کچھ داخل ہے تو انھیں ایسے استاد کے سپرد کرنا چاہیے جسے خدائے جمیل نے ہر چیز میں حسن کے پہچاننے اور برتنے کا جوہر عطا کیا ہو۔ ہماری موجودہ تعلیم کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے طالب علموں میں ظاہری ٹیپ ٹاپ اور عورتوں کی طرح بننے سنورنے کا شوق تو بیحد ہے مگر سچے ذوق جمال سے وہ عموماً مطلق بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھیں اپنے استادوں میں ہمیشہ "جلالی شان" نظر آتی ہے "جمالی شان" کا دیکھنا کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ فطرت اور آرٹ کے حسن کی بصری اور اخلاقی صفات کی خوشنما ہم آہنگی تو ایک طرف ہمارے معلموں کی ظاہری وضع قطع میں اس قدر خشونت ہوتی ہے کہ حسن ذوق

کوان کی صورت سے وحشت ہو۔ غالب کے ایک شعر میں تھوڑا سا تصرف کر کے ہم اسکول کے ماسٹر صاحب کی شان جلال کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تر ش رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی ماسٹر کو میں

یہ بات ہماری تعلیم اور ہماری قومی زندگی کے لئے باعث افسوس ہے کہ ہم حسن کے ذوق سے قریب قریب عاری ہیں۔ ہم اپنے پرانے جمالی معیار کھو بیٹھے اور نئے ابھی ہاتھ نہیں آئے۔ ہم مکان کی آرائش، لباس، آداب مجلس، فنون لطیفہ میں عموماً مغربی معیاروں کی بری بھلی تقلید کرتے ہیں لیکن یہ چیزیں ہماری وضع نفسی کے مطابق نہیں اس لئے ہم انھیں اچھی طرح جذب نہیں کر پاتے۔ اس کا اثر ہماری ذہنی اور اخلاقی زندگی پر بہت خراب پڑتا ہے۔ ذوق جمال ہی انسان کو اعتدال، تناسب اور ہم آہنگی سکھاتا ہے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بغیر ذہنی اور اخلاقی زندگی ناتمام اور ناتراشیدہ سمجھی جاتی ہے۔ ہماری تعلیم میں حسن ذوق کی تربیت کی بہت سخت ضرورت ہے خصوصاً معلموں کی تعلیم میں کیونکہ انھیں کی صحبت میں ہمارے ملک کی آئندہ نسل نشوونما پائے گی۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تربیت نفس کے سب سے اہم عنصر یعنی مذہبی تربیت کا دار و مدار بھی صحبت کے اثر پر ہے۔ مذہب نام ہے اس عقیدے کا جو انسان حیات و کائنات کے بنیادی مسائل کی نسبت رکھتا ہے۔ لیکن عقیدہ حقیقی معنی میں مذہب جبھی کہلائے گا جب یہ انسان کے احساس وجذبات پر چھایا ہوا ہو اور اس کی نفسی زندگی کا مرکز اور اس کے عمل کا محرک بن گیا ہو۔ بچوں کو مذہبی اصول رٹا دینے سے ان میں سچی مذہبیت ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ ان اصولوں کا زبان پر چڑھ جانا کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ وہ دل میں اتر جائیں اور روح میں پیوست ہو جائیں یہ کام درس و تدریس کے بس کا نہیں۔ اس کی تو یہی صورت ہے کہ قلب سے قلب پر اثر پڑے۔ جتنی وجدانی چیزیں ہیں ان کی حقیقت الفاظ میں کبھی نہیں ظاہر ہو سکتی یہ اگر جیتی جاگتی نظر آتی ہیں تو کسی دل والے کے دل ہی میں نظر آتی ہیں اور وہیں سے حاصل کرنے والا انھیں حاصل کر سکتا ہے۔ حسن

خلق اور حُسن ذوق کی طرح حسن عقیدت بھی اچھوں کے فیضان صحبت ہی سے میسر آتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا　　دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

مذہبی تعلیم کے بارے میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اگر استاد کسی خاص مذہب کا پابند ہے تو لازمی ہے کہ شاگرد بھی اس کے اثر سے اسی مذہب کے پیرو بن جائیں۔ اسی لئے ہمارے ملک میں لوگ چاہتے ہیں کہ ہر مدرسے میں ہر فرقے کی مذہبی تعلیم دینے والے موجود ہوں اور جب اس کا انتظام نہیں ہو سکتا تو مذہبی تعلیم ہی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مشترکہ مدارس میں جو مذہبی تربیت ہو اُسے مخصوص مذاہب کے عقیدوں سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ یہاں تو استاد بس اتنا کرے کہ شاگردوں کے دل میں ایک عام احساس اور عقیدہ پیدا کر دے کہ انسان کی نجات زندگی اور کائنات کے حقیقی سرچشمے تک پہنچنے اور اُس سے روحانی علاقہ قائم کرنے پر موقوف ہے۔ یہی قلبی کیفیت وہ بنیاد ہے جس پر ہر مذہب کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ استاد مدرسے میں یہ بنیاد قائم کرے تو آگے چل کر ہر شاگرد اپنی خاندانی روایات اور ذاتی روحانی ضروریات کے لحاظ سے کسی مخصوص مذہب کے اصول اختیار کر سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں ایسے استاد موجود نہیں ہیں اور ہوں بھی تو والدین اتنی وسعت نظر نہیں رکھتے کہ اپنے بچوں کو ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے دیں۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کے نزدیک تو مذہبی تربیت کے معنی یہ ہیں کہ بچوں کو دوسرے مذہب کے لوگوں سے نفرت کرنا اور ان کے عقائد کو حقارت کی نظر سے دیکھنا سکھایا جائے۔

(۴)

اوپر کی سطروں سے واضح ہو گیا کہ ذہنی تربیت بڑی حد تک اور جمالی، اخلاقی، مذہبی تربیت سراسر صحبت کے اثر پر موقوف ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اثر آفرینی کی قوت ہر شخص میں یکساں نہیں ہوتی۔ بُرا اثر جو عموماً فوری لذت کی ترغیب پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر شخص ڈال سکتا ہے کیونکہ اکثر

لوگوں کا نفس خود ہی اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ مادی لذات کی خواہش انسان اور حیوان میں مشترک ہے اور ہر نفس میں خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ تربیت یافتہ ہو یا غیر تربیت یافتہ موجود ہوتی ہے اس چنگاری کو ترغیب کی ہوا سے بھڑکا دینا بہت سہل چیز ہے مگر اچھا اثر ڈالنا یعنی اعلیٰ قدور کی آرزو کو جوان ان کے دل کے کسی گوشے میں چھپی ہوتی ہے ڈھونڈھ نکالنا اور اُسے اتنا ابھارنا کہ لذت پرستی کی شدید قوت پر غالب آجائے بڑا کام ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر افیونی اپنے مشرب کی تبلیغ میں بہت آسانی سے کامیاب ہوجاتا ہے۔ جہاں کسی کو نزلے کی دوا کے نام سے افیون کی گولیاں چند روز کھلائیں اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کالی بلا کے دام میں گرفتار ہوا مگر کسی افیونی کی افیون چھڑانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ بہت کم لوگ ایسے نظر آتے ہیں جن کا عقیدہ یا ارادہ اتنا مضبوط ہو کہ وہ دوسروں کے کمزور ارادے کو تقویت پہنچا کر ہوائے نفس کا مدمقابل بنا سکیں اور جو ہوتے بھی ہیں ان کی اس قوت کے مختلف درجے اور مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ بعض کا اثر اپنے خاندان یا اپنے حلقۂ احباب تک محدود ہوتا ہے۔ بعض کا اس سے زیادہ وسیع دائرے میں کام کرتا ہے۔ بعض ایک خاص قسم کی طبیعت کے لوگوں پر اثر ڈال سکتے ہیں بعض ہر قسم کے لوگوں پر۔ بعض کا اثر اپنے ہمنشینوں کی زندگی کے کسی خاص پہلو پر پڑتا ہے۔ بعض کا ساری زندگی پر۔

معلم کی اثر آفرینی کا دائرہ ہے بچوں اور نوجوانوں کی زندگی اور اس کا مقصد ان کی جسمانی ذہنی، اخلاقی قوتوں کی ہم آہنگ تربیت یعنی ان کی مجموعی سیرت کی تشکیل میں مدد دینا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس ہمہ گیر اثر آفرینی کے لئے معلم میں کون کونسی صفات ہونا چاہئے۔

سب سے پہلی چیز تو یہی ہے کہ جو ذہنی اور اخلاقی فضائل بچوں کی زندگی میں پیدا کرنا ہیں وہ خود معلم کی زندگی میں موجود ہوں جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں تعلیم و تربیت کے اہم ترین شعبوں میں شاگرد استاد کی تلقین سے نہیں بلکہ اس کے نمونے سے متاثر ہوتا ہے۔ اس محفل میں اصل چیز "حال" ہے "قال" نہیں۔

ہمارا یہ مطلب نہیں کہ معلم زندگی کے تمام اعلیٰ قدروں کا مالک ہو یعنی اس کی ذات میں تمام

انسانی فضائل مکمل حیثیت سے موجود ہوں۔ یہ تو انسان کامل کی صفت ہے جو روز روز پیدا نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو بچوں کو پڑھایا نہیں کرتا۔ ہم جو چیز معلم میں چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسے کل تمدنی قدروں یعنی مذہب، علم، آرٹ وغیرہ سے محبت اور ایک گونہ مناسبت ہو۔ جب تک اتنی ہمہ گیری اس کی طبیعت میں نہ ہو وہ اپنے شاگردوں کی مجموعی سیرت کی تشکیل نہیں کرسکتا

اسی کے ساتھ اس کا دل تمام انسانوں خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کی محبت اور جذبۂ خدمت سے معمور ہونا چاہیے جس کے دل میں یہ لگن نہ ہو وہ معلمی کی کٹھن ذمہ داری اپنے سر کیوں لے گا۔ اور لے بھی لے تو اسے پورا کیسے کرے گا۔ یوں پیٹ پالنے کے لئے معلمی کا دھندا جو چاہے لیکن اسے فطرت کی پاک امانت سمجھ کر وہی شخص قبول کرسکتا ہے جسے اس راہ کی کڑیاں جھیلنے میں لطف آتا ہو۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب ان کا کسی اور پیشے میں ٹھور ٹھکانا نہیں لگتا تو وہ معلمی اختیار کرتے ہیں۔ مگر بعض ایسے بھی ہیں جو اسی کو اپنے لئے سعادت کا سرمایہ سمجھتے ہیں اور اس کی خاطر دولت، شہرت، عزت تج دیتے ہیں۔ یہی سچے معلم کی صفت ہے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ انسان کا دل دوسروں کے درد سے دکھتا ہو اور اُن کی خدمت کے لئے تڑپتا ہو۔

مگر خدمت خلق کے لئے محض جوش اور درد کافی نہیں بلکہ انسان میں یہ مادہ بھی ہونا چاہئے کہ جن کی خدمت کرنی ہے ان کی طبیعت کو پہچان کر اور ان کی ضرورتوں کو دیکھ کر اصلاح و ترقی کی کوشش کرے۔ یک من جوش را دہ من علم و صد من عقل باید۔ ہر خادم خلق کے لئے مردم شناسی کا جوہر ضروری ہے اور معلم کے لئے تو یہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس کا کام مختلف طبیعتوں پر اثر ڈالنا ہے اور وہ بھی ہر ایک کی فطری صلاحیتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جس طرح سچا مرشد ہر مرید کی روحانی حالت اور استعداد کو دیکھ بھال کر اس کی ہدایت کرتا ہے اسی طرح سچا معلم ہر بچے کی سیرت اور سرشت کو سمجھ بوجھ کر اُسے تعلیم دیتا ہے۔ اسی تعلیم میں تاثیر بھی ہوتی ہے ورنہ یوں تو اخبارات، واعظ، خطیب دن رات پکار پکار کر تعلیم دیتے ہی رہتے ہیں۔ یہ صفت انسان میں بڑی حد تک مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتی ہے لیکن جب اس کا تھوڑا بہت فطری مادہ طبیعت میں نہ ہو تجربہ کوئی مدد نہیں

دیتا۔

ایک اور صفت بھی معلم کے لئے ناگزیر ہے جس کی طرف لوگوں کا خیال کم جاتا ہے یعنی بڑا بھاری صبر واستقلال۔ یہ اثر آفرینی اور اثر پذیری کا عمل جسے ہم تعلیم کہتے ہیں اتنا دیرطلب ہے کہ یہاں بے صبر اور کم ہمت آدمی کا گذر ہی نہیں۔ اصلی تعلیم یعنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی نشوونما اس قدر آہستہ اور غیر محسوس طور پر ہوتی ہے کہ انسان ایک ایک بچے کی تربیت میں برسوں محنت کرے تب جاکر کچھ تھوڑا سا نتیجہ نظر آتا ہے۔ بلکہ اکثر نتیجہ زمانۂ تعلیم کے ختم ہوجانے کے بعد آئندہ زندگی میں ظاہر ہوتا ہے۔ کاشتکار خصوصاً ہندوستانی کاشتکار کا صبر مشہور ہے۔ مگر معلم کو کاشتکار سے بھی زیادہ صابر ہونے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کی کھیتی صبر ہی کے پانی سے سینچی جاتی ہے۔ اس کا حوصلہ تو وہ کرے جو مدتوں تک خدا کے اور انسانی فطرت کے بھروسے پر بچوں کی کشت دل کی آبیاری کرتا رہے چاہے اُسے پودوں کا بڑھنا اور پنپنا نظر آئے یا نہ آئے۔

ان خلقی صفات کے علاوہ معلم کی تعلیم بھی وسیع اور ہمہ گیر ہونا چاہئے یعنی اسے تمدن کے ہر شعبے سے تھوڑا بہت مس ہو اور کسی ایک شعبے پر ایک حد تک عبور حاصل ہو۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ معلم کو ہر چیز میں کمال ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ ایک حد تک مضر ہے۔ بچے اور نوجوان اس شخص سے کچھ فیض نہیں حاصل کرسکتے جو سفر زندگی میں منزل مقصود پر پہنچ چکا ہو انھیں تو ایسے رہبر کی ضرورت ہے جو تھوڑی بہت اٹکل رکھتا ہو اور ہر قدم پر رستہ ڈھونڈھتا ہو۔ یہ ڈھونڈھنا اور پانا تعلیم کا لازمی جزو ہے اور اسی پر سقراطی طریقۂ تعلیم کی بنیاد ہے۔ سقراط کے اصول کے مطابق پختہ کار مسافروں کو بھی اپنے نوسفر ہمراہیوں کی خاطر ناآشنائے راہ بننا اور ٹٹول کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ سقراط اور سعدی دونوں میں یہ صفت تھی کہ نوجوانوں کی رہنمائی میں ان کے آگے آگے نہیں بلکہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اور ہر نئی وادی میں پہنچ کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مل کر خوشیاں مناتے تھے۔ جیسے انھوں نے بھی پہلی بار یہاں قدم رکھا ہو۔

یہ چیزیں تو وہ ہیں جو خود معلم میں ہونا چاہئے اب اس سماج (سوسائٹی) کا جس کے بچوں

کو معلم تعلیم دیتا ہے، یہ فرض ہے کہ اسے اس کی خدمات کا اتنا معاوضہ دے کہ وہ فراغت کی زندگی بسر کر سکے اور اپنے ہم چشموں اور شاگردوں کی نظر میں اپنا وقار قائم رکھ سکے۔ ہمارے ملک کی حالت آج کل یہ ہے کہ معلم تمام مساوی قابلیت رکھنے والے سرکاری ملازموں سے کم تنخواہ پاتا ہے اور سب سے کم درجے کا سمجھا جاتا ہے۔ ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر کلکٹر کا ادنیٰ ماتحت سمجھا جاتا ہے بلکہ دیسی ہیڈ ماسٹر تو ڈپٹی کلکٹروں کے سلام کو بھی جایا کرتا ہے۔ ابتدائی مدرسے کے مدرس کی حیثیت گاؤں کے پٹواری کے مقابلے میں کچھ نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ استاد کو اپنے شاگردوں پر جن میں بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے لڑکے بھی ہوتے ہیں رعب قائم رکھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ جب اس کی ظاہری حیثیت اس کے وقار کو کم کرتی ہے تو اُسے خواہ مخواہ بید کے نسخے سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ افلاس کے سبب سے معلم میں وہ بلند نظری، سیر چشمی اور بے طمعی نہیں ہوتی جو شاگردوں پر جمالی اور اخلاقی اثر ڈالنے کے لئے ضروری ہے۔

(۳)

مگر استاد کی اثر آفرینی بجائے خود مکمل نہیں۔ اس کی تکمیل شاگرد کی اثر پذیری سے ہوتی ہے۔ تعلیم کا موضوع بچے یا نوجوانوں کا نفس ہے جو کوئی بیجان، بے حس یا بے نمو چیز نہیں بلکہ زندگی احساس اور بالیدگی کا طلسم ہے اس پر کوئی اثر تبھی ڈالا جا سکتا ہے جب وہ خود اثر قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ عمل تعلیم کا سب سے اہم عنصر یہی ہے کہ بچے یا نوجوان کی اثر پذیری کی صلاحیت ابھاری جائے۔

اس کی پہلی شرط تو یہی ہے کہ طالب علم وہ کم سے کم جسمانی اور ذہنی قوتیں رکھتا ہو جو تعلیم کا بوجھ اٹھانے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ سیدھی سی بات ہے مگر اس پر بھی ہمارے ملک میں بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ خدا جانے کتنے بچے جو خفیف سی جسمانی مشقت سے بھی معذور ہیں یا جس کا دماغ تقریباً ماؤف ہے مار مار کے عام مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں حالانکہ ان کے لئے خاص طریقہ تعلیم اور خاص نصاب تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ بعض تو کسی طرح نہیں پڑھ سکتے۔ بہت سے نوجوان جن میں اسکول کے معیار

سے آگے تعلیم پانے کا بوتا نہیں جبراً کالجوں میں بھیجے جاتے ہیں اور چار برس کی جگہ آٹھ آٹھ دس دس برس میں مر مر کے بی اے پاس کرتے ہیں یا بے پاس کئے تعلیم ختم کر دیتے ہیں۔ ان کی صحتیں برباد ہو جاتی ہیں ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور زندگیاں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔ اگر وہ اسکول کی تعلیم کے بعد کوئی دوسرا کام سیکھتے یا عملی زندگی میں داخل ہو جاتے تو چار پیسے بھی کماتے اور ملک وقوم کے لئے بھی کسی حد تک مفید ہوتے مگر اب وہ بالکل بیکار رہتے ہیں اور ان کا وجود ملک اور قوم پر بار ہو جاتا ہے۔

اس عام جسمانی اور ذہنی استعداد کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم پانے والا کسی ایک شعبہ ذہنی میں خاص طور پر صلاحیت رکھتا ہو۔ تعلیم کے معمار یعنی استاد کو شاگرد کی سیرت کا قصر تیار کرنے کے لئے ایک بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر بچوں یا نوجوانوں میں کوئی خاص وضع نفسی زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ کسی کو کسی علم وفن سے مناسبت ہوتی ہے کسی کو عملی زندگی یا تخئیلی زندگی کے کسی شعبے سے۔ استاد اسی چیز کو مرکز قرار دے کر اس کے ذریعے سے اس کی اور ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ابھارتا ہے اور اس کی مجموعی سیرت کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم ایسا ہو جسے ایک چیز کی طرف بھی خاص رجحان نہ ہو تو اس کی تعلیم بہت ہی دشوار ہے۔

تعلیمی تاثر کی ایک اور اہم شرط یہ ہے کہ شاگرد استاد کا ادب کرتا ہو اور اس کے دل میں عجز و انکسار کا جذبہ موجود ہو۔ یہ بات سن کر لوگ ہم پر قدامت پرستی کا الزام لگائیں گے کیونکہ اس آزادی اور خودداری کے دور میں ادب وغیرہ دقیانوسی چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ محض واعظوں کی نصیحت نہیں بلکہ علم نفس کی ایک حقیقت ہے۔ شاگرد تمدنی زندگی کا محرم بننا چاہتا ہے اور استاد اسے اس حلقے میں داخل کرتا ہے۔ تمدن ایک زندہ اور نامی چیز ہے اس کے حاصل کرنے میں محض ادراک کام نہیں دیتا بلکہ اسے کل روحانی اور ذہنی قوتوں کی مدد سے جذب کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے سچی اور گہری آرزو کی ضرورت ہے اور محبت اور ادب اور احترام کی جب تک بچے کو تمدنی زندگی اور اس کے حامل اور مبلغ یعنی معلم سے یہ قلبی تعلق نہ ہو وہ راہ طلب میں قدم کس برتے پر بڑھائے گا۔ فطرت انسانی کا عارف گوئٹے ولہیلم مائسٹر میں ادب

کو تعلیم کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ ایشیا میں تو سب حکما یہی کہتے آئے ہیں۔

(۴)

ہم نے ابتک یہ کہا ہے کہ تعلیم کا جزو اعظم صحبت کا اثر ہے اور استاد کی اثر آفرینی اور شاگرد کی اثر پذیری کی کیا صورت ہونا چاہئے۔

شاگرد کی اثر پذیری کی ایک شرط ہم نے یہ قرار دی ہے کہ اس کا دل استاد کے ادب عجز و انکسار اور استاد کے ادب و احترام سے معمور رہو۔ کہیں اس کے معنی یہ نہ سمجھ لئے جائیں کہ شاگرد اپنی عقل اور اپنے ارادے کو معطل کر کے ہر چیز میں استاد کی تقلید کرے اور اپنی زندگی کو اس کی زندگی کی عکسی تصویر بنا دے یہ بات سراسر تعلیم کے منشا کے منافی ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہر فرد کے نفس میں جو قوتیں مضمر ہیں وہ ابھر آئیں اور اس کی سیرت اپنے قانون ارتقا کے مطابق نشو و نما پائے۔ جو استاد یہ کوشش کرتا ہے کہ شاگرد کو اپنے نمونے پر ڈھالے وہ گویا اس کو بے حس اور بیجان مادہ سمجھتا ہے اور اس کی انسانی عظمت کی توہین اور شاگرد اس پر راضی ہوتا ہے وہ خدا کی دی ہوئی بہترین نعمت یعنی شخصیت کو کھو کر روحانی موت اختیار کرتا ہے۔ یہ تعلیم کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے ہر شاگرد اور استاد کو ڈرنا چاہئے۔ پرانے طرز کے مدرسوں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شاگرد لباس، رفتار، گفتار سے لے کر خیالات اور عقائد تک ہر بات میں استاد کی تقلید کرتے ہیں۔ اگر استاد کا کرتہ گھٹنوں تک پہنچتا ہے تو شاگرد کو بھی گھٹنوں تک کا کرتا پہننا ضروری ہے۔ اگر استاد بال کم ہونے کے سبب سے سر گھٹاتا ہے تو شاگرد محض تقلید میں گھٹاتے ہیں۔ استاد افیوں کی عادت کی وجہ سے ناک میں بولتا ہو تو شاگرد خواہ مخواہ اس درد ناک آواز میں گفتگو کرتے ہیں اگر استاد جبر کا قائل ہے تو شاگرد بھی ہیں وہ اختیار کو مانتا ہے تو شاگرد بھی مانتے ہیں۔ یہ نقالی جو انسان کو بندر بنا دیتی ہے اور جو کچھ بھی ہو مگر تعلیم ہرگز نہیں ہے۔

استاد کا سب سے نازک فرض یہی ہے کہ شاگرد کے انفرادی رجحانات کو پہچانے اور اس کو اسی رستے پر ڈالے جس پر چلنے کی اس میں صلاحیت ہو۔ خیالات اور عقائد کے بارے میں

دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ اُستاد شاگرد کو ہر مسئلے کے کل پہلو سمجھا دے اور اسے اپنے طور پر رائے قائم کرنے دے۔ اگر کبھی اس کے عقائد پر اثر بھی ڈالے تو اس کی رضامندی سے اور جائز ترغیب اور تلقین کے ذریعے سے۔ اپنی شخصیت یا اپنے رتبے کے دباؤ سے کوئی بات منوانے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ معلمی کے قابل وہی شخص ہے جس کی سرشت میں بنی نوع انسان کی خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کی محبت ہو۔ سچ پوچھئے تو یہ محبت سب سے بڑی تعلیمی قوت ہے اور اسی کی بدولت تعلیم کا سارا طلسم قائم ہے۔ اگر استاد اور شاگرد کے درمیان محبت کا رشتہ نہ ہو تعلیمی اثر آفرینی اور اثر پذیری ایک سطحی اور مصنوعی چیز ہو کر رہ جائے۔ استاد کی بات شاگرد کے دل میں تبھی اترتی ہے جب وہ شفقت سے کہی جائے اور محبت سے سنی جائے۔

مگر محبت کا لفظ اتنے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ ہمیں اُس خاص مفہوم کو جو ہمارے پیش نظر ہے کسی قدر وضاحت سے بیان کر دینا مناسب ہے۔

محبت پانچ طرح کی ہوتی ہے :-

(۱) انسانی ہمدردی جو فطری جذبۂ اُنس اور جذبۂ خدمت پر مبنی ہے۔

(۲) عزیزوں کی الفت جو اتحاد خون اور اتحاد نسل پر مبنی ہے۔

(۳) رفاقت جو اتحاد مقاصد پر مبنی ہے۔

(۴) دوستی جو اتحاد طبیعت اور اتحاد مذاق پر مبنی ہے۔

(۵) عشق جو خدا جانے کس چیز پر مبنی ہے۔

ان میں سے عزیزانہ الفت صحیح معنی میں استاد اور شاگرد میں عموماً نہیں ہو سکتی اور دوستی کی بھی گنجائش نہیں کیونکہ اس کے لئے ہمسنی، ہمچشمی اور ہم مشربی کی ضرورت ہے جو استاد اور شاگرد کے درمیان عموماً نہیں ہوتی۔ استاد جو محبت شاگرد سے رکھتا ہے اُس میں گہرا رنگ جذبۂ خدمت اور ہمدردی کا ہوتا ہے مگر کبھی کبھی رفاقت اور عشق کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ استاد اور شاگرد میں پیر اور مرید یا گرو اور چیلے کا تعلق بھی ہوتا ہے یعنی استاد کی طرف سے شفیقانہ اور مرشدانہ سلوک اور شاگرد کی طرف

سے جوش عقیدت۔ یہی روحانی تعلق ان دونوں کی سچی اور مستحکم بنیاد ہے
اس محبت میں عشق کا عنصر جہاں کہیں ہوتا ہے عموماً بے محل ہوتا ہے اور اس سے تعلیمی تاثیر و تاثر میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ عشق بھی ایک تعلیمی قوت ہے مگر اسی وقت تک کہ یہ نفسانی خواہشات سے الگ رہ سکے اور یہ بات صرف بچوں کے آپس کے عشق میں ممکن ہے۔ پختہ عمر کے لوگوں کے دل میں عشق کے ساتھ جنسی شہوت کے عنصر کا موجود ہونا قریب قریب لازمی ہے اور یہ چیز تعلیم کے لئے مہلک ہے۔ اور فرض کیجئے کہ استاد کا عشق شاگرد سے بالکل پاک بھی ہو اس کی بدولت اسے ایک گونہ تسلیم و نیاز کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو شان ہدایت کے بالکل خلاف ہے۔ اگر اخلاقی پہلو سے قطع نظر کر کے محض تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھئے تب استاد و شاگرد کا باہمی عشق تعلیم میں مانع آتا ہے اور اکثر شدید نفسی کشمکش اور صدمات کا باعث ہوتا ہے۔ اس نکتے کو نہ سمجھنے سے بہت سی تعلیمی کوششیں بیکار رہتی ہیں اور بہت سی قیمتی زندگیاں برباد جاتی ہیں۔

(۵)

آخر میں ہم یہ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ تاثیر و تاثر کا عمل جو تعلیم کہلاتا ہے کوئی اسم اعظم کا عمل نہیں جس کی کامیابی غیر محدود ہو۔ اول تو استاد کی اثر آفرینی اور شاگرد کی اثر پذیری کے لئے جتنی شرطیں ہم نے بیان کی ہیں ان سب کا پورا ہونا کارے دارد پھر اگر یہ سب کچھ ہو بھی جائے یعنی استاد کامل ہو اور شاگرد مستعد اور تعلیم کا طریقہ صحیح تب بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نتیجہ توقع کے مطابق ہوگا کیونکہ شاگرد پر استاد کے تعلیمی اثر کے علاوہ بھی بہن دوستوں عزیزوں اور غیروں کے اثرات پڑتے رہتے ہیں اور یہ سب عناصر مل کر اس کی مجموعی سیرت کی تشکیل کرتے ہیں۔ پھر سب سے قوی عنصر خود اس کی فطری صلاحیتوں کا ہے جن میں استاد کی صحبت کا اثر اس سے زیادہ تصرف نہیں کر سکتا کہ انھیں کسی قدر ابھار دے یا دبا دے یا ان میں ترتیب اور ہم آہنگی پیدا کر دے۔ ایک لحاظ سے دیکھئے تو استاد کی صحبت کی بدولت جو تہذیب اور پختگی شاگرد کی سیرت میں پیدا ہوتی ہے

وہ اسے بالکل نیا آدمی بنا دیتی ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ " جمال ہم نشیں در من اثر کرد "، لیکن اصل میں اس کی فطرت اپنے اندرونی قانون ارتقا کے مطابق نشو و نما پاتی ہے یعنی وہ جو تھا وہی رہتا ہے اور اسے کہنا پڑتا ہے " ہماں خاکم کہ ہستم "

اکثر یہ احساس استاد کے لئے نہایت المناک ہوتا ہے کہ اس کا اثر شاگرد کی تربیت میں بہت محدود ہوتا ہے یعنی وہ لاکھ کوشش کرے اُسے جیسا چاہتا ہے ویسا نہیں بنا سکتا لیکن وہ غور کریگا تو اس کو بہت غنیمت سمجھے گا کہ اس کے سر انسانی سیرت کی تخلیق کی ذمہ داری نہیں بلکہ اس کا کام محض اتنا ہے کہ جوہر اعلیٰ کی تشکیل میں مدد دے۔

ہندوستان

عربی جریدہ "الشہاب" میں یہ مختصر مضمون شائع ہوا ہے، اور چونکہ نہایت ہی دلچسپ ہے
اس لئے ہم اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ ابراہیم عادی

ہندوستان میں حکومت حاضرہ کے خلاف سخت جہاد ہو رہا ہے[1] اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ہندوستانی قوم اس باب میں متحد ہو کر غلامی کے جوئے کو اتار پھینکے گی، ان میں ۲۳۰ ملین ہندو اور ۷۰ ملین مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں، حکومت کے خلاف عام منافرت کا اظہار کیا جا رہا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس قدر مختلف عناصر، مختلف المذاہب، مختلف زبان اور مختلف خیال رکھنے والے لوگ ایشیا کے اس شاداب خطہ میں رہتے ہیں دنیا کے کسی حصہ میں نہ ہوں گے۔

قومیں اور زبان

براعظم ہند میں کم از کم ۲۰ قسم کی قومیں پائی جاتی ہیں اور یہ سب تمام ۲۲۲ قسم کی زبانیں بولتی ہیں۔ ان کے لہجے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوتے ہیں، ۵۰ قسم کے رسم الخط جاری ہیں بعض بعض کے حروف ہجا تقریباً پچاس ہیں۔ جملہ تعداد حروف ہجا ۲۰۰ تک پہنچ جاتی ہے۔
مشہور اور عالمگیر زبان "اردو" ہے جو کہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اردو دل طبقہ کوشش کر رہا ہے کہ سارے ہندوستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہو جائے۔

---

(۱) لیکن اب صلح ہو گئی۔

بلاد ہند میں ہزاروں طرح کی بُری بُری رسمیں جاری ہیں اور ۵۰۰۸۰۰۰۰۰ آدمی ایسے ہیں جو کہ بالکل ناکارہ اور بیکار ہیں، لیکن فقرار، خدارسیدہ بندوں کی بھی تعداد کم نہیں یعنی یہ لوگ ۵۲۱۷۴۸ ہیں۔

گائے

جیساکہ مشہور ہے برہمنوں کا طبقہ گائے کی تعظیم اور پرستش کرتا ہے۔ گایوں کی تعداد جو کہ صرف عبادت کے لئے مخصوص ہیں ۱۱۴۶۰۰۰ ہے جن پر سالانہ ۱۵۰ ملین فرنک خرچ کیا جاتا ہے ان کی اس قدر تعظیم کیجاتی ہے کہ کوئی شخص ان کو مار نہیں سکتا، یہ گائیں دن رات کھلی ہوئی ادھر اُدھر ٹہلتی رہتی ہیں اور جو چاہیں کھا سکتی ہیں، کوئی سبزی فروش انھیں مار کر ہنکال نہیں سکتا، اگر یہ کہیں راستے میں بیٹھ جائیں تو کوئی شخص ان مقدس گایوں کو اٹھا نہیں سکتا، یہ بیٹھی رہیں گی اور راہ گیروں نیز گاڑی والوں کو چاہئے رستہ کترا کر جائیں تاکہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔

شادی

ہندوستان میں سالانہ ۳۲۰۰۰۰۰ لاکھ لڑکیاں قبل البلوغ شادی کے سبب جاں بحق ہوجاتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر ظلم یہ ہوتا ہے کہ سن رسیدہ اور ادھیڑ لوگوں کی شادی نوجوان کم عمر لڑکیوں سے کردی جاتی ہے جس سے کہ آئندہ نسل پر نہایت ہی بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ بڈھے شوہر کے مرنے کے بعد نوجوان بیوہ دوبارہ شادی نہیں کرسکتی، اور اس میں بڑی حد تک رسم دخل ہے۔ مجوسیوں یہاں بیوہ عورتوں کا نکاح قطعاً جائز نہیں، اسی وجہ سے ہندوستان میں ۳۰ ملین عورتیں حالت بیوگی میں زندگی بسر کررہی ہیں۔

برہمنوں کا قدیم مذہب مجوسیت کے اثر سے پاک نہیں، چنانچہ ان رسوم کے علاوہ جس طرح مجوسیوں کے یہاں لڑکیاں ان کے معبد میں خدمت کے لئے ہزاروں کی تعداد میں رہتی ہیں برہمنوں کے یہاں بھی ہزاروں کنواری لڑکیاں مندروں میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔

ادنیٰ طبقے کے لوگ

ہندوؤں میں جو ادنیٰ طبقے کے لوگ ہیں، بلند پایہ ہندوان سے گفتگو کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے چہ جائیکہ ان کا عبادت خانوں میں داخل ہونا۔ اس چیز نے قومیت متحدہ کو سخت پہنچا رکھا ہے۔
سعی بلیغ کے بعد انگریزی حکومت نے ۱۹۲۲ء میں ان ادنیٰ ذات کے لوگوں کے لئے معمولی مدرسے کھولے گئے اور ان کو اجازت ہوئی کہ قانوناً ہر کنوے سے پانی لے سکیں۔

غیر ملکی حکومت

انگریزی حکومت کا اسقدر جلد استحکام حاصل کر لینا اور حسب منشا حکومت کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں کتنے بڑے بڑے شان و شوکت کے بادشاہ گذرے اور ایسی حکومت کی کہ غیر ممالک کے بادشاہ ہوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتی۔
ہندوستان میں انگریزی فوج ۶۰ ہزار رہتی ہے اور وظیفہ خواران حکومت کی تعداد ۳۳۴۴ ہے اسی فوج اور انھیں ہوا خواہان حکومت کے سبب غیر ملکی حکومت قائم ہے اور لاکھوں کی تعداد میں اہل ہند غیر ممالک میں یورپ کی عظمت برقرار رکھنے کے لئے بھیجے گئے۔

غزل

از یادگار اساتذہ حضرت اثر ردولوی

سوزِ پنہانی سے اشکوں کی فراوانی کہاں — قلزمِ خاطر میں وہ اگلی سی طغیانی کہاں

آج امیدِ سحر اے دردِ پنہانی کہاں — دیکھئے پہنچے شبِ فرقت کی طولانی کہاں

اک زمانہ ہو گیا قیدِ قفس کو جھیلتے — ہمصفیرو اب وہ یارائے پرافشانی کہاں

شکوہ سنجیِ تغافل کیش اے دل ہے عبث — روح فرسا دردِ کرفکرِ درمانی کہاں

خوب سمجھے ہیں مآلِ وحشتِ جوشِ بہار — بابِ زنداں چھوڑ کر جائینگے زندانی کہاں

ہو چکی جمعیتِ خاطر میانِ جلوہ زار — دیکھئے لیجائے تاروں کی پریشانی کہاں

زاہدا نازاں مری تر دامنی کے سامنے — پرنیاز و عجز تیری پاک دامانی کہاں

راز افشا ہو چلا خاموش اے شمعِ مزار — دیکھ پہنچا ہے ترا دردِ پریشانی کہاں

چشمِ گریاں قلبِ مضطر نالۂ آتش فشاں — لیکے جائیں ہم اثر اسبابِ ویرانی کہاں

مشتری

نظام شمسی میں چھٹے درجہ پر جو سیارہ ہے اس کو مشتری (Jupiter.) کہتے ہیں۔ اس کا فاصلہ اوسطاً آفتاب سے اڑتالیس کروڑ تیس لاکھ اور زیادہ سے زیادہ چون کروڑ پچاس لاکھ میل ہے۔ اس کی رفتار آٹھ میل فی سیکنڈ اور قطر ہماری زمین سے پانسو پچانوے گنا زیادہ ہے۔ وہ چار ہزار تین سو تینتیس دن میں اپنا سال پورا کرتا ہے۔ مشتری کی چال سے اس قانون کی تصدیق ہوتی ہے کہ جو سیارہ آفتاب سے جس قدر دور ہوگا اسی قدر سست رفتار ہوگا اس کا قطبی قطر جو اسی ہزار چار سو اور استوائی قطر نواسی ہزار چھ سو میل ہے۔ اپنی جسامت و محوری گردش کی سرعت کے سبب سے قطر پر چپٹا اور استوا پر موٹا ہے۔ نو گھنٹے پچپن منٹ کے دن رات ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے محور پر نو گھنٹہ پچپن منٹ میں گردش کر لیتا ہے۔ اس کے نو توابع یا اقمار (Satellites) ہیں۔ زمین کے چاند کی مانند ان کی ایک سمت ہمیشہ مشتری کی جانب اور دوسری اس کے خلاف رہتی ہے۔

سنہ ۱۶۱۰ء میں پہلی مرتبہ دوربین کا استعمال گلیلو[1] (Galileo) نے اجرام فلکی کے مطالعہ کے لئے کیا تھا۔ چنانچہ ایسے چار اجرام کا انکشاف ہوا جو مقابلۃً تمام نظام شمسی میں روشن و عظیم الجثہ اقمار (Satellites) ہیں اور کمزور سے کمزور دوربین میں بھی بہ آسانی نظر آسکتے ہیں۔ وہ سب مشتری سے ایسے ہی ملحق ہیں جیسے ہمارا چاند زمین سے ہے۔ انکے نام یہ ہیں۔
آئو۔ یوروپا Europa گنی میڈ Ganymede اور کیلسٹو Callesto دیگر اقمار (Satellites) بھی مثل ان چاروں کے جب کہ گلیلیو

---

(۱) Galileo سنہ ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔

(Galileo) نے ان کا انکشاف کیا تو خیال تھا کہ پہلا قمر (Satellite) بہ نسبت
دیگر اقمار (Satellites) کے مشتری سے زیادہ قریب ہے مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا اور
پروفیسر برنارڈ Prof.Barnard نے ۱۸۹۲ء میں مشتری کے پانچویں مدہم قمر
(Satellite) کا انکشاف کیا جو پہلے قمر (Satellite) کے مدور (orbit) میں واقع
تھا۔ اب یہ بہ نسبت دیگر اقمار (Satellites) کے مشتری سے زیادہ قریب ہو گیا۔ بعد ازاں
چار اقمار Satellites کا انکشاف ۱۹۱۴ء تک وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں نے کیا جب سے
اب تک ان میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ مشتری سے اس کے اقمار کے فاصلے یہ ہیں۔

دو لاکھ سرسٹھ ہزار۔ چار لاکھ چوبیس ہزار۔ چھ لاکھ اٹھتر ہزار۔ گیارہ لاکھ اکواسی ہزار۔ ایک لاکھ
پندرہ ہزار۔ بہتر لاکھ تیس ہزار۔ چھہتر لاکھ چالیس ہزار۔ ایک کروڑ انچاس لاکھ دس ہزار اور ایک کروڑ
پچپن لاکھ ساٹھ ہزار میل ہے۔

اقمار Satellites کے قطر (Dia) تقریباً دو ہزار پانسو سے تین ہزار
چھ سو تک ہیں۔ تیسرے کا قطر سب سے زیادہ ہے اور نویں کا صرف پندرہ میل تخمینہ کیا گیا ہے۔
اول کے چاروں بڑے اقمار (Satellites) کے قطر تقریباً گول ہیں اور مشتری کے
استوا کی سطح مستوی میں واقع ہیں۔ جب وہ مشتری کے نیچے جا کے اس کے سایہ سے گذر جاتے
ہیں۔ تو وقتاً فوقتاً خسوف واقع ہوتا ہے۔ مگر چوتھے قمر (Satellites) کا مدار Orbit
قدرے مختلف واقع ہوا ہے وہ بہ نسبت دیگر اقمار (Satellites) کے زیادہ جھک گیا ہے
جب وہ قمر (Satellite) اوپر یا نیچے سے گزرتا ہے تو اس کے جھکاؤ کے سبب سے
اس میں گہن نہیں لگتا۔ آج کل مشتری رات کو ۱۱ بجے تقریباً بالکل سر پر ہوتا ہے اور اقمار
Satellites سب سے زیادہ روشن چمکدار سیارہ ہے۔ دو گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں
چھٹے اور ساتویں کا مشتری سے تقریباً یکساں تفاوت ہے۔ اور دور کا وقت بھی قریب قریب ایک ہی سا ہے
علاوہ بریں انکے مدار (Orbits) ایک دوسرے سے منسلک و وابستہ ہیں۔ اور سیارے

کی استوائی سطح مستوی کی طرف بہت مائل ہیں آٹھویں اور نویں قمر (Satellite) کے نظام میں بھی مطابقت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان کی گردشی حرکت میں یہ خصوصیت ہے کہ جب دیگر اقمار (Satellites) سیارے کے گرد چرخ کھاتے ہیں تو یہ دونوں خلاف سمت اختیار کرتے ہیں۔ ان کی اس حرکت معکوس کا نام رجعت قہقری ہے۔

ان اقمار Satellites کی دریافت سے کوپرنکس Copernecus کا نظام شمس زیادہ واضح ہوگیا ہے۔ اقمار Satellites مشتری کے خسوف سے روشنی کی رفتار نہایت صحیح طور سے ناپی گئی ہے جس کی تفصیل کے لئے رسالۂ جامعہ بابتہ ماہ اگست ۱۹۲۷ء ملاحظہ فرمائیں۔ علاوہ مشتری کے سات بڑے سیارے اور بھی ہیں وہ یہ ہیں۔

عطارد (Mercury) زہرہ (Venus) زمین (Earth) مریخ (Mars) زحل (Saturn) یورنس (Uranus) نیپچون (Neptune)

عطارد (Mercury) یہ سیارہ آفتاب سے بہت ہی قریب ہے۔ اس لئے نظر نہیں آتا۔ اس کا مدار (Orbit) دیگر سیاروں سے بہت چھوٹا ہے۔ آفتاب سے تین کروڑ ستر لاکھ میل فاصلہ ہے۔ بوجہ قرب آفتاب اس میں اس قدر حرارت ہے کہ وہاں پانی صرف بحالت ابخرات رہ سکتا ہے۔ کم و بیش اٹھاسی دن میں اپنی محوری گردش آفتاب کے گرد تمام کرتا ہے۔

زہرہ (Venus) نہایت ہی خوبصورت سیارہ ہے۔ اس کی حالت سطحی زمین سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں بھی عظیم الشان پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض پہاڑوں کا ارتفاع ہمارے ہمالیہ سے بھی چہار گنا زیادہ ہے۔ یہ بھی مثل چاند کے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ صبح کے وقت مشرق سے نہایت روشن سیارہ طلوع ہوتا ہے۔

زمین (Earth) اس کا فاصلہ آفتاب سے نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ اس کی سالانہ گردش تقریباً سوا تین سو پینسٹھ دن میں تمام ہوتی ہے۔

مریخ (Mars) یہ سیارہ مدار ارض کے باہر گردش کرتا ہے۔ آفتاب سے اسکا بُعد تقریباً دو کروڑ اکتالیس ہزار میل ہے اس میں بھی مثل زہرہ (Venus) کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ مزید براں جنگل و دریا بھی معلوم ہوتے ہیں۔ نہریں بھی جابجا جاری ہیں۔ جو زی حیات مخلوق کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں۔

زحل (Saturn) اس کا بعد آفتاب سے تقریباً نوے کروڑ میل ہے۔ اس کی سالانہ گردش کم و بیش انتیس سال میں تمام ہوتی ہے اس کو ایک نورانی مادہ محیط کئے ہوئے ہے

یورینس (Uranus) قدیم ہیئت داں اس کے وجود سے بالکل بے خبر تھے اس کو سر ولیم ہرشل (۱) (Sir William Herschel) نے ۱۷۸۱ء میں دریافت کیا۔ یہ تقریباً ایک ارب اٹھتر کروڑ میل آفتاب سے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔

نپ چون (Neptune) یہ سیارہ موجودہ معلوم شدہ سیاروں میں سب سے زیادہ دور ہے۔ ۱۸۴۶ء میں اس کا انکشاف ہوا۔ سب سے آخر میں گزشتہ سال جنوری ۱۹۳۰ء میں ایک اور سیارہ معلوم ہوا جس کا فاصلہ آفتاب سے چار ارب میل ہے۔

ان آٹھ سیاروں کے علاوہ تین سو ساٹھ چھوٹے سیارے اور بھی ہیں جن کے مدار Orbits بہت ہی قریب قریب واقع ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں جذب مادی سے آپس میں منطبق ہو کے مثل زمین (Earth) یا زہرہ (Venus) کے ایک جدید سیارہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ ان میں بڑے سے بڑے کا رقبہ ریاست حیدرآباد کے برابر اور چھوٹے سے چھوٹے کا رقبہ پانچ میل ہے۔ سیاروں کے علاوہ کروڑہا تارے اور پھر مدار

---

(۱) Sir William Herschel (۱۷۳۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۲ء میں فوت ہوا

تارے وشہاب ثاقب وغیرہ ہیں۔ کوئی کہاں تک شمار کرے۔ بقول سر اسحاق نیوٹن (Sir Issac Newton) میں نے اپنی حیات میں جو کچھ کیا وہ بہت تھوڑا کیا کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علم ایک وسیع سمندر ہے جس کے کنارہ پر میں بچے کی طرح کبھی سیپ اور کبھی گھونگے چنتا رہا ہوں۔

آخر میں انسان اپنی جہالت اور لاعلمی کا اعتراف کر کے مجبوراً کہتا ہے۔
(سبحٰنک لاعلم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم)

---

(۱) Sir Issac Newton. ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۲۷ء میں پچاس برس کی عمر میں فوت ہوا۔

بیوقوف

بہارستان ایک چھوٹی سی بستی تھی جو چاروں طرف عظیم الشان پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی یہاں کے رہنے والے کسی دوسرے مقام سے واقف ہی نہ تھے۔ ان کی دنیا چند ہی میل کے اندر محدود تھی۔ یہاں دس مہینے خزاں رہتی اور صرف دو مہینے بہار۔ بہار آتے ہی ساری وادی رشک فردوس بن جاتی۔ چھوٹی چھوٹی نہریں پہاڑوں سے بہہ نکلتیں۔ زمین سبزے سے ڈھک جاتی سوکھی جھاڑیاں جنگلی پھولوں سے سج جاتیں اور ساری وادی ان کی خوشبو سے مہک اٹھتی۔ تناور درختوں پر کونپلیں پھوٹ نکلتیں۔ ان کی شاخوں اور تنوں پر عشق پیچاں کی بیلیں پھیل جاتیں۔ دور دور سے چڑیاں آتیں جو دن رات درختوں پر چہچہایا کرتیں۔ بھونرے اور تیتریاں پھولوں پر منڈلاتے۔

اسی موسم میں یہاں کے رہنے والوں کی فصل تیار ہوتی۔ اس میں صرف اتنا پیدا ہوتا تھا کہ وہ لوگ سال بھر کھا سکتے تھے۔ اسی لئے بہارستان میں نہ کوئی محتاج تھا اور نہ کوئی داتا۔ اگر کسی وجہ سے کسی کی فصل تباہ ہو جاتی یا کھلیان جل جاتا تو اس کو سال بھر پتیاں ابال کر کھانا پڑتیں۔ لوگ اس کی حالت کو دیکھتے اور ترس کھا کر رہ جاتے۔ وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ اگر کوئی دو ایک روز کا اناج دے دیتا تو اس کو خود اتنے دنوں پتیاں ابال کر کھانا پڑتیں۔

اسی وادی میں ہمیشہ ہوشیار، سمجھ دار لوگ پیدا ہوتے تھے۔ ایک بار ایک بیوقوف پیدا ہوا۔ وہ سوچتا بہت اور کرتا کم۔ اکثر اپنی کھیتی چھوڑ کر دوسروں کی کھیتی درست کرتا۔ ایک دفعہ ایک آدمی کا کھلیان آدھا جل گیا۔ بیوقوف نے اس کو اپنا آدھا اناج دے دیا اور خود چھ مہینے پتیاں ابال کر کھائیں۔

جب بہار کا زمانہ نکل جاتا تو وادی کی گھاس زرد ہو جاتی۔ پتیاں جھڑ جاتیں، چڑیاں اور تیتریاں چلی جاتیں، برف گرنے لگتی اور ساری بستی اجاڑ معلوم ہوتی۔ بستی والے ان تماشوں

کے دیکھنے کے عادی تھے مگر کبھی کبھی وہ بھی اس منظر سے اکتا جاتے اور بہار کی یاد میں گیت گانے لگتے۔

بہار کے موسم میں یہاں کے رہنے والے رنگ کھیلتے۔ جلسے کرتے۔ باغوں میں ناچتے مگر خزاں میں گھروں سے بھی نہ نکلتے۔

ہر قوم میں کچھ نہ کچھ روایتیں ضرور ہوتی ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں میں ایک یہ روایت مشہور تھی کہ پہلے اس وادی میں ایک دریا بہتا تھا جس سے وہ سدا بہار تھی مگر کسی وجہ سے وہ دریا خشک ہو گیا۔ ایک جادوگر ان پہاڑوں میں رہتا ہے اگر وہ چاہے تو دریا پھر جاری کر دے اور پھر وادی سدا بہار بن جائے۔ یہ روایت بیوقوف نے بھی سنی۔ خزاں کے دس مہینوں میں جب لوگ گھروں سے نہ نکلتے، بیوقوف جادوگر کی تلاش میں پہاڑوں میں گھوما گھوما پھرتا۔ آخر ایک دن اس کو جادوگر مل گیا۔ بیوقوف نے کہا

"میں اپنی وادی کو سدا بہار بنانے آیا ہوں"۔

جادوگر نے جواب دیا

"اگر کوئی شخص مجھ کو چار سال تک برابر اپنا کھلیان دے تو میں وادی میں اگلا دریا چھوڑ دوں گا اس سے وادی پھر سدا بہار بن جائے گی۔

بیوقوف نے کھلیان دینا منظور کر لیا۔

جب بہار کا زمانہ آیا۔ کھیتیاں لہلہانے لگیں۔ باغوں میں جلسے ہونے لگے۔ لڑکے تیتریاں اور چڑیاں پکڑنے کے لئے جنگلوں میں گھومنے لگے تو بیوقوف نے جادوگر سے جا کر کہا :-

"کھلیان تیار ہے"

جادوگر اس وقت کچھ نہ بولا۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ بیوقوف کا کھیت کٹا ہوا ہے لوگوں نے بیوقوف سے پوچھا۔

"کھیت کیا ہوا"

بیوقوف نے خوش ہو کر کہا۔

"میں نے جادوگر کو دے دیا۔ اگر چار سال تک میں برابر اپنا کھلیان دیتا رہوں گا تو وادی پھر سدا بہار بن جائے گی۔"

"دیکھو کتنا بیوقوف ہے۔ اگر وادی سدا بہار بن گئی تو اس کو کیا مل جائے گا یہ تو چار سال میں مر جائے گا۔"

بیوقوف سال بھر تک پتیاں کھاتا رہا۔

پھر جب بہار کا زمانہ آیا۔ کھیتیاں لہلہانے لگیں باغوں میں ناچ و رنگ ہونے لگا۔ بچے بوڑھوں نے رنگین کپڑے پہن لئے تو بیوقوف کا بھی کھیت تیار ہوا۔ اس نے جادوگر سے جا کر کہا۔ کھیت تیار ہے۔ جادوگر اس وقت کچھ نہ بولا۔ صبح کھیت کٹا ہوا تھا۔

لوگوں نے جب بیوقوف کا کھیت کٹا ہوا دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔

"کتنا بیوقوف ہے ایک سال اور پتیاں کھائیں۔"

پھر بہار آئی۔ تیتریاں اور بھونرے پھولوں پر منڈلانے لگے۔ شاداب کھیتیاں لہلہانے لگیں وادی کی لڑکیاں باغوں میں ناچنے لگیں۔ اب کی بیوقوف بہت کمزور ہو گیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے کھیت گوڑا، بیج ڈالے۔ آخر خزاں کے ابتدائی زمانے تک کھیت تیار ہو گیا۔ بیوقوف جادوگر سے کہا کھیت تیار ہے۔

دوسری صبح کو کھیت کٹا ہوا تھا۔

لوگوں نے جب بیوقوف کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔

"بیچارا کھیلوں میں بھی نہیں شریک ہونے پاتا ہے۔ افسوس بالکل بیوقوف ہے!"

چوتھی دفع بہار آئی۔ بستی والے خوشی خوشی گھروں سے نکلے اور کھیت گوڑے ان ہی لوگوں میں بیوقوف بھی شامل تھا مگر زار و نزار۔ اٹھتا بیٹھتا آتا اور ایک گھنٹے کا کام ایک دن میں کرتا۔ اس طرح جب دوسروں کے کھیت تیار ہو گئے اور وہ رنگ رلیاں منانے لگے تو اس کے

کھیت میں صرف بیج پڑے تھے۔

ایک روز جب باغوں سے واپس آرہے تھے تو دیکھا کہ بیوقوف کھیت میں مرا پڑا ہے سب نے ترس کھایا اور کہا " افسوس بچارے کی تمنا دل ہی میں رہ گئی اور وادی کو سدا بہار نہ دیکھ سکا۔ بیوقوف تو تھا ہی۔ مفت میں اپنی جان گنوائی۔

دوسرے دن بہارستان کے رہنے والوں کا جلسہ تھا جب ناچ شروع ہوا تو باجوں سے بھرائی ہوئی آواز نکل رہی تھی اور ناچنے والی لڑکیوں کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔

ایک شخص بولا۔ لڑکیاں آج کتنا خراب ناچ رہی ہیں۔

ایک ناچنے والی لڑکی بولی۔ بانسری سے کتنی خراب آواز نکل رہی ہے۔ جیسے ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہو۔

ایک بانسری بجانے والا بولا۔ موسم کتنا خراب ہے۔ سورج بادلوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بیوہ ماتمی لباس میں۔

اس دن پانی برسنے کے بعد لڑکے بیر بہوٹیاں چننے جنگلوں میں گئے۔ زمین پر یہاں سے وہاں تک سرخ سرخ چتیاں تھیں۔ لڑکوں نے کہا۔

"شاید بیر بہوٹیوں کو کسی نے کچل ڈالا"

شام کو لڑکوں نے پہاڑوں کے اندر گڑگڑاہٹ سنی جیسے کوئی کراہتا ہو۔ رات کو جب بہارستان کے رہنے والے جلسے سے واپس آرہے تھے تو ان کے بخور دانوں سے خوشبو نکل رہی تھی۔ ان کے ستار خاموش اور ان کی گانے والی لڑکیوں کے گلے پڑے ہوئے تھے سارے مجمع پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

ایک لڑکا بولا " بہار کے اندر ہم نے دردناک غرغراہٹ سنی"

دوسرا لڑکا " افسوس۔ اگر بیوقوف ایک مہینہ اور زندہ رہتا تو وادی سدا بہار

بن جاتی اور بیر بہوٹیاں نہ مرتیں۔"

پہلا لڑکا "ہم اپنا کھلیان برابر چار سال تک جادوگر کو دیں گے۔"

ایک اور لڑکا "اور ہم بھی دیں گے۔"

سبھوں نے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

تنقید و تبصرہ

کتب :

مخزن ادب ۔ قواعد مضمون نویسی ۔ کردار اور افسانہ ۔ محمود گاوان
یورپ میں ایک سال ۔ مولود ہمایوں ۔ قرآن اور نئی روشنی

مخزن ادب | مصنفہ مولوی حافظ ڈاکٹر محمد عبدالشہید ۔ این ۔ ایس ۔ ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ آئی ۔ جی مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ ۔ ملنے کا پتہ ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس ۔ شمشاد مارکٹ ۔ سول لائن علیگڑھ

یہ کتاب ہائی اسکول اردو کورس کے لئے شائع کی گئی ہے ۔ اس میں سب سے پہلا مضمون انشا پردازی اور ضروری کاروباری خطوط نویسی کے متعلق ہے جس کے سلسلے میں مشاہیر ادب اُردو کے بعض خطوط اور رقعات بھی دیے گئے ہیں ۔ پھر معاملات کے متعلق ضروری تحریری معلومات جو طلبہ کے لئے لابدی ہیں درج کی گئی ہیں ۔ اس کے بعد مختصر مضامین ادب عالیہ کے بڑے بڑے اہل قلم کی تحریروں سے منتخب کئے گئے ہیں ۔ پھر نظم کا حصہ ہے جو مشہور شعرا کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے ۔ آخر میں ان حضرات کے مختصر حالات دیے گئے ہیں جن کے مضامین نظم و نثر اس کتاب میں لئے گئے ہیں ۔

لکھائی چھپائی اچھی ہے ۔ کاغذ اوسط ہے ۔ اور چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات پر ختم ہوتی ہے ۔ اس کی ترتیب میں یہ امر خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جو کچھ درج کیا جائے وہ طلبہ کے لئے کار آمد اور مفید ہو ۔ موجودہ طریقہ کتب نصاب کا جو مروج ہے اس پر اگرچہ ہم کو اعتراض ہے کہ صرف چند پرانے اہل قلم ہیں وہی انتخاب کئے جاتے ہیں اور موجودہ دور کے ادبا جو قدما سے کہیں اچھی اردو لکھتے ہیں متروک و مہجور ہیں اور اس کتاب میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے

مگرچونکہ انتخاب اچھا ہے اور افادیت کا خیال رکھا گیا ہے اس لئے ہم کو یہ کورس پسند آیا۔ ہم اس کو بمقابلہ دیگر کتب کے جو اسی غرض کے لئے لکھی گئی ہیں مرجح سمجھتے ہیں۔

قواعد مضمون نویسی حصہ دوم | مصنفہ مولوی محمد مظفر الدین صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ قصبہ مانوت (حیدرآباد دکن) مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی حیدرآباد دکن چھوٹی تقطیع صفحات ۸۰ قیمت ۶/
اس کتاب میں مدارس تحتانیہ کے طلبہ کی حالت کو پیش نظر رکھ کر مضمون نویسی کے اصول سلاست کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ عام طور پر اسکول کے لئے اس کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے۔

کردار اور افسانہ | مصنفہ عبدالقادر سروری۔ ایم اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ مددگار پروفیسر اردو و فارسی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔ چھوٹی تقطیع تعداد صفحات ۲۳۲۔ مجلد۔ قیمت فی نسخہ عہ/
یہ کتاب دنیائے افسانہ کا دوسرا حصہ ہے جس کو مصنف نے مذکورہ بالا نام سے شائع کیا ہے اس میں افسانہ کی کردار نگاری۔ اشخاص اور ان کی سیرت اور ان کے تشخصات ممیزہ کی بحث تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ اور اردو کے مقبول اور پسندیدہ افسانوں سے کردار افسانہ کے نمونے اور مثالیں دکھائی گئی ہیں۔ افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

محمود گاوان | مصنفہ محمد ظہیر الدین صاحب۔ بہ سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ۔ تعداد صفحات ۵۵ تقطیع خورد۔ قیمت فی نسخہ ۸/ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط
اس کتاب میں محمد ظہیر الدین صاحب متعلم بی۔ اے کلاس جامعہ عثمانیہ نے سلاطین بہمنیہ

کے مشہور وزیر محمود گاوان کے تاریخی واقعات تفصیل کے ساتھ مختلف زبانوں کی تاریخی کتابوں سے اخذ کرکے فراہم کئے ہیں۔ اور نہایت خوبی کے ساتھ ان کو مرتب کیا ہے۔ ان کی محنت قابل داد ہے لیکن ابھی وہ طالب علم ہیں اس لئے میں ان کی توجہ ایک ضروری امر کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنے بزرگوں کی تاریخ کے ساتھ جو عقیدت ہے وہ فخر تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں کے اکثر مورخین جنھوں نے زمانہ حال میں سلف کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اسی مفاخرانہ عقیدت کے ساتھ لکھی ہیں لیکن اصول تاریخ کے مطابق یہ جمیت پسندیدہ نہیں ہے۔ تاریخ میں واقعات کی صداقت کو اس سے کہیں زیادہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ جس قدر کہ اس کی عظمت جس کی تاریخ لکھی جارہی ہے۔ تعصب یا پاسداری سے مورخ کو قطعاً سروکار نہ ہونا چاہئے۔

یورپ میں ایک سال | نوشتہ نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ ایل (لندن) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر چارمینار حیدرآباد دکن۔ قیمت ندارد۔ تعداد صفحات ۹۰ تقطیع خورد۔

اس کتاب میں سید صاحب موصوف نے ایک سال تک یورپ میں رہ کر وہاں کے حالات جو ہندوستانی طلبہ کے لئے ضروری اور مفید ہیں لکھے ہیں۔ مختلف راستے اور بود و باش کے طریقے درج کئے ہیں تاکہ ہندوستان سے جانے والے لوگوں کو رہبر کا کام دے۔

مولود ہمایوں | مصنفہ حاجی محمد موسیٰ خاں شروانی رئیس دتاولی ضلع علیگڑھ۔ تقطیع چھوٹی۔ صفحات ۱۶۲ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ۔ مطبع عہد آفریں۔ ترپ بازار حیدرآباد دکن

حاجی صاحب نے جو مشہور قومی کارکن اور ممتاز اہل قلم ہیں اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تحقیق و اختصار کے ساتھ جمع کئے ہیں۔ مولود میں عام طور پر جو باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان کا اکثر حصہ غلط ہوتا ہے۔ غالباً یہی سوچ کر حاجی صاحب نے صحیح حالات

فراہم کردیے ہیں کہ لوگ بجائے رسمی مولودوں کے اس کو پڑھیں۔ انھوں نے اس کتاب میں قلب اور نیت اور تمدن و معاشرت کی اصلاح کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا ہے۔ اس کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے جس کو مصنف نے نظر ثانی کر کے صحت کے ساتھ طبع کرایا ہے۔ یہ کتاب دراصل ان کی مشہور کتاب کارنامہ خلافت کے دوسرے حصہ کی پہلی جلد ہے۔ اس میں صرف ولادت سے ہجرت تک کے حالات ہیں۔

قرآن اور نئی روشنی | مترجمہ سید حبیب احمد کاظمی امروہی۔ پبلشر قاضی عبدالرزاق صاحب سندھی ترقی بک ڈپو۔ جھونا مارکیٹ۔ کراچی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ قیمت عہ/

مصر کے مشہور اسلامی فلسفی علامہ طنطاوی جوہری نے مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کا شوق دلانے کے لئے قرآنی آیات سے ایک کتاب "القرآن والعلوم العصریہ" لکھی ہے۔ سید حبیب صاحب نے اسی کا ترجمہ اردو میں عمدگی کے ساتھ کر کے شائع کرایا ہے۔ اس کتاب میں علوم جدیدہ کی ضرورت اور اتحاد بین المسلمین پر تعلیم قرآن کی روشنی میں خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا ہے۔ جملہ مسلمانوں کو اس کتاب کو غور سے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ علامہ طنطاوی نے اس بات کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ ایک علوم مفیدہ جدیدہ سے جہالت اور دوسری فرقہ بندی۔ اس لئے ہر مسلمان کو ان دونوں یعنی جہالت اور فرقہ بندی کے خلاف جہاد کرنا چاہئے۔

رسائل

پیشوا (رسول نمبر) ۔ مادر وطن ۔ مرغ سحر

پیشوا (رسول نمبر) | سید عزیز حسن صاحب بقائی ہر سال اپنے رسالہ پیشوا دہلی کا خوبصورت اور راز معلومات رسول نمبر نکالا کرتے ہیں۔ اس سال بھی ربیع الاول کا پیشوا رسول نمبر ہے جس میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نثر و نظم کے مضامین تقریباً سوا سو صفحہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سب مفید اور سب دلچسپ نصیحت آمیز اور سبق آموز۔ رسالہ پڑھنے کے بعد سید صاحب موصوف کی کوشش نہایت قابل قدر معلوم ہوتی ہے۔ اس خاص پرچہ کی قیمت عہ ہے جو ان قیمتی مضامین کو دیکھتے ہوئے جو اس رسالہ میں درج ہوئے ہیں۔ بہت کم ہے۔

رسالہ پیشوا کی قیمت سالانہ کل ۶ ہے۔ سید صاحب اعلان کرتے ہیں کہ جو لوگ رسول نمبر سے خریداری شروع کریں گے ان کو ستمبر میں دو صفحہ کا فسانہ نمبر بھی مفت دیا جائے گا۔

آئندہ سے وہ پیشوا کا سستا ایڈیشن بھی شائع کر رہے ہیں جس کی ضخامت میں کوئی فرق اصل ایڈیشن سے نہ ہوگا صرف کاغذ ہلکا ہوگا۔

مادر وطن | یہ رسالہ مسلمان خواتین کی ترقی و بہبود کے لئے الہ آباد سے ایم اے سکینہ بیگم کی ادارت میں ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ اوسط تقطیع ضخامت ۲ جز۔ لکھائی اور چھپائی عمدہ قیمت سالانہ دو روپیہ رسالہ زیر تنقید ماہ جولائی ۱۹۳۱ء کا ہے جس کو دیکھ کر امید ہوتی ہے کہ انشاء اللہ یہ خواتین کی ترجمانی اور ان کی بہتری کی کوشش میں کامیابی حاصل کرے گا۔

مرغ سحر | یہ رسالہ ماہوار لکھنؤ دلکشا روڈ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقصد مرغی پالنے کی تعلیم اور مرغبازوں اور صوبہ متحدہ کے مرغی پالنے والوں کو اس کے مفید طریقے سکھلانا ہے۔ ضخامت ایک جز قیمت درج نہیں ہے۔

بارگاہِ رسالت میں

زمیں تمہارے ہی قدم سے رشکِ خلد بن گئی　　تمھیں نے پیکرِ جہاں میں آکے روح پھونک دی
تمہارے ہی تو پرتوِ کرم کی ہے یہ روشنی　　تمہارے ہی لئے تو ہے یہ ساری انجمن سجی
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جو تم پہ اے نبی ہوا دل اور جان سے فدا　　وہی جہاں میں کامیاب اور سرخرو، رہا
حیاتِ بے ثبات کا اسی کو کچھ مزہ ملا　　مجھے بھی دو جہاں میں تمھارا ہی بس آسرا
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

زباں کو جرأتِ بیاں نہیں وہ اضطراب ہے　　کہ خوشگوار زندگی بھی اب مجھے عذاب ہے
تمہارے رنجِ ہجر میں جیوں کہاں یہ تاب ہے　　تمہارے ہی لئے تو دل تباہ ہے، خراب ہے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

بتاؤں آہ کیا کسی کو جو جگر کا حال ہے　　ہر ایک زخم وہ کہ غیر ممکن اندمال ہے
سلام ایسی زندگی کو جس کا یہ مآل ہے　　نگاہ لطف ابتو ہو کہ آہ بھی محال ہے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جو یہ ہجومِ یاس ہو تو دل کو کیا سکوں رہے　　یہ حال ہو تو چشم تر سے کیوں نہ جوئے خوں بہے
کہاں تک ایک دردمند ایسے درد و دکھ سہے　　سوا تمھارے اور کس سے اپنا حال دل کہے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جگر میں داغ، دل میں زخم، اف مجھے یہ کیا ہوا　　تلاطم ایک حسرتوں کا سینے میں ہوا اب بپا
یہی کشاکشِ حیات ہے تو آہ میں چلا　　بس اب تمھارے ہاتھ ہے مری فنا مری بقا
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

مژہ پہ اشک لالہ گوں نہیں یہ دل کا خون ہے   مگر ستم زدہ کو یہ نجات کا شگون ہے
کہاں تمہارے غم میں جان کو سکون ہے   دوا ہے خاکِ طیبہ جس کی وہ مرا جنون ہے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

یہ آفتیں غم حبیب! ایک جاں نثار پر   خدا کے واسطے نہ ڈھا جفا وفا شعار پر
خدا کے واسطے ستم نہ ہوں دل فگار پر   خدا کے واسطے کرم ہو میرے حالِ زار پر
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

مریض عشق کو عطا ہو آج تو کوئی دوا   کہ بڑھتے بڑھتے ہو گیا ہے درد دل کا جانگزا
نہیں ہے خیر جان کی یہ غم جو کچھ دنوں رہا   کرو کچھ اب تو التفات سن کے میرا ماجرا
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

مری طرح جہاں میں کوئی جئے تو کیا جئے   کہ بیشمار جرم اور رات دن گنہ کئے
نگاہِ شرم سوئے روضہ ہے مری اس لئے   سوا تمھارے اور کون چاک زخم دل سیئے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

نصیب ہو وہ عیش کیا جو چاہتا ہے میرا دل   کہ میرا عشق خام اور میرا شوق مضمحل
مگر ہوں اپنے جرم اور معصیت پہ منفعل   جو چاہو تم تو ہوں ابھی تمام زخم مندمل
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

حلیم بھی، رؤف بھی، رحیم بھی تمھیں تو ہو   نذیر بھی، بشیر بھی، کریم بھی تمھیں تو ہو
نسیم باغ قدس کی شمیم بھی تمھیں تو ہو   کہ بارگاہ خاص کے ندیم بھی تمھیں تو ہو
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

تمھارے ہاتھ ہی میں بس ہماری سب کی لاج ہے   تمھاری چشم لطف ہی فراق کا علاج ہے
تمھارا ہی تو دو جہاں میں اے حبیب! راج ہے   شفاعتِ گناہ کا تمھارے سر پہ تاج ہے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جبیں تمہاری خاک آستاں سے زیب پائے گی — وہیں یہ چشم خوں چکاں بھی میری رنگ لائیگی
وہیں بجائے اشک شرم، اشک خوں بہائیگی — جو زخم دل تمھیں نہیں، تو پھر کسے دکھائے گی
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

گناہ اور معصیت سے حال ہے بہت زبوں — وہ بار ہے کہ پشت زخم ہے اور میں ہوں سرنگوں
کہوں نہ تم سے درد دل تو اور کس سے پھر کہوں — تمھارا بندۂ وفا، تمھارا میں غلام ہوں
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

ہوئی جو پرسش گناہ کیا جواب دوں گا میں — عمل جو پوچھے گا کوئی تو کیسے چپ رہوں گا میں
حضور کا غلام ہوں، فقط یہی کہوں گا میں — تمھارا نام لوں گا میں تمھارا نام لوں گا میں
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جو روز حشر ہوگا سر پہ ظل شاہ انبیا — امید ہے بر آئے گا ضرور دل کا مدعا
اگرچہ ہوں گناہ گار، معصیت میں مبتلا — مگر سوا تمھارے کون میرا ہوگا آسرا
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جہاں کے سارے مخلصوں کو اب مرا سلام ہے — بس اک تمھارے ذکر خیر سے ہمیشہ کام ہے
مری زباں پہ رات دن فقط تمھارا نام ہے — یہی مری عبادت اور یہی مرا کلام ہے
"تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!"

سفر دراز آخرت کا، بار جرم پشت پر — نہ آہ کوئی راہبر، نہ زاد راہ و ہم سفر
تمھاری ہی نگاہ لطف پر ہے بس مری نظر — بھلا ہے کون تم سے بڑھ کے اور مرا چارہ گر
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

حسین بھی، وجیہہ بھی، جمیل بھی تمھیں تو ہو — ہر ایک گناہ گار کے وکیل بھی تمھیں تو ہو
ہمارے عفو جرم کے کفیل بھی تمھیں تو ہو — شہ رسل، پیمبر جلیل بھی تمھیں تو ہو
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

امام انبیاء بھی تم ہو اور شاہ دیں بھی ہو — رسول دوسرا بھی تم، شفیع مذنبین بھی ہو
حبیب کبریا بھی تم ہو ختم مرسلیں بھی ہو — رہین لطف خاص، کاش محوی حزیں بھی ہو
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

رباعیات فراق

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے — دنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے
ہاں میکدۂ جہاں کا ذرہ ذرہ — سرشار مجاز ہو حقیقت کیا ہے

ہوں عشق سیاہ کار مجھ میں ہیں نہاں — صد جلوۂ بیقرار حسن جاناں
چشمک زن برق طور ظلمت ہو مری — سرتا سر ہوں فراق سحر لرزاں

ممکن ہو تو فرض عشق پورا کر لیں — ممکن ہو تو دل میں درد پیدا کر لیں
اپنا کر لیں تجھے یہ قسمت ہو کہاں — دکھتے دل سے تری تمنا کر لیں

سوتے رہے میٹھی نیند سونے والے — کھوتے رہے جان، جان کھونے والے
بڑھتا ہی رہا سکوت شام ہجراں — روتے ہی رہے کسی کو رونے والے

ہستی کو کسی طرح سے یہ راز ملے — ہستی کو کسی ساز سے یہ ساز ملے
ہستی کو تو ہم دیتے سکون جاوید — کچھ دل کے دھڑکنے کا بھی انداز ملے

رہتی ہے جان لے کے پیاری دنیا   رہتی ہے خراب کرکے اچھی دنیا
دنیا میں ہر اک ہے ایک جانی دنیا   ہے کوئی ادا تمھاری کیسی دنیا

کچھ حال مرا مری زبانی سن لو   کس طرح کٹی ہے زندگانی سن لو
ارباب نشاط کے ترانے تو سنے   دکھتے ہوئے دل کی بھی کہانی سن لو

پینا جو نہیں تو خیر پینے کا ہے نام   تر کرے لبوں کو کیوں ہی رہتا ناکام
پیمانۂ دل کی تہ میں کچھ تو ہے تری   قسمت میں کہاں فراق چھلکا ہو جام

اس سال کے شروع میں ہم نے رسالہ جامعہ میں اعلان کیا تھا کہ مئی یا جون کے مہینہ میں ہم محمد علی نمبر نکالیں گے۔ لیکن ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے عارضی رخصت پر چلے جانے کی وجہ سے اس کے لئے پوری کوشش نہ ہو سکی اور جس قدر مضامین اور جس پایہ کے مضامین اس نمبر کے لئے درکار تھے وہ مہیا نہ ہو سکے۔ اس لئے اب خاص نمبر نکالنے کا خیال چھوڑ دیا گیا۔ مگر اس سلسلہ میں جو مضامین موصول ہوئے ہیں ان کو بتفاریق رسالہ جامعہ میں ہم شائع کر دیں گے

صوبہ بہار و اڑیسہ کے شعبۂ تعلیم کی طرف سے اس کمیٹی کی رپورٹ جو مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کے نصاب کی اصلاح اور ترمیم کے لئے مقرر کی گئی تھی تنقید اور رائے لینے کی غرض سے شائع کی گئی ہے تاکہ حکومت کو کمیٹی مذکورہ کی تجاویز کے متعلق رائے عامہ معلوم ہو جائے جو زیادہ سے زیادہ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۱ء تک شعبہ مذکورہ کے سکرٹری کے پاس پہنچ جانی چاہئے۔

یہ کمیٹی اگرچہ صرف ترمیم نصاب کے لئے مقرر کی گئی تھی لیکن اس کے حدود زیادہ وسیع کر دئے گئے اور اس نے نصاب کے ساتھ عربی نظام تعلیم پر بھی رائے زنی کی کہ ہندوستانی مدرسوں میں اسلامی علوم کی تعلیم کن اصولوں پر دی جائے اور کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔

کمیٹی مذکورہ کے اراکین میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور مولانا عبد العزیز المیمن وغیرہ و دیگر ممتاز اہل علم حضرات شامل تھے مختلف نشستوں میں ان حضرات نے مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کے نقائص کو دیکھ کر اس میں ترمیم کی سفارشات کیں اور نظام میں بھی اصلاح کی۔

کمیٹی نے اپنی سفارشات میں ایک ہی اصول کو پیش نظر رکھا ہے یعنی موجودہ زمانہ میں اسلامی علوم کا احیاء۔ اس اصول کے لحاظ سے ان کی جملہ تجاویز ہیں۔

کمیٹی نے جو سفارشات منظور کر کے پیش کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) جونیر چہارم اور اوپر کے کل درجوں میں انگریزی لازمی کر دی جائے۔

(۲) مدرسہ کی انتہائی تعلیمی مدت ۱۵ سال سے ۱۳ سال کر دی جائے۔

(۳) فاضل کے درجہ میں ایک فن مکمل طور پر پڑھایا جائے

(۴) فاضل کے بعد ایک درجہ اعلیٰ کا اضافہ کیا جائے۔

(۵) سینیر کے ہر درجہ کی مدت تعلیمی دو سال رکھی جائے۔

(۶) سینیر کے ہر امتحان میں طلبہ کا امتحان پورے نصاب میں لیا جائے۔

(۷) عالم اور مولوی کا نصاب سب کمیٹی کی سفارشات کے مطابق مقرر کیا جائے اور طلبہ اختیاری فنون میں سے دو فن اختیار کریں۔

(۸) جونیر کے درجوں میں ریاضی و تاریخ و جغرافیہ و علم الصحت کا وہی معیار ہو جو مڈل انگلش اسکولوں میں ان کے مقابل درجوں میں ہے۔

(۹) دینیات کے علاوہ دوسرے فنون میں ایسی کتابیں مقرر کی جائیں جن میں کسی خاص فرقہ کی تعلیم نہ ہو۔

(۱۰) شیعہ اور سنی طلبہ کے لئے دینیات کی تعلیم کا انتظام علیحدہ علیحدہ کیا جائے

(۱۱) جونیر چہارم سے ہفتم تک تاریخ اور جغرافیہ ایک فن قرار دیا جائے اور اردو۔ قواعد۔ ترجمہ اور انشاء ایک فن سمجھا جائے۔ ان سب درجوں میں اردو نظم اور نثر کی مناسب کتابیں نصاب میں رکھی جائیں۔

(۱۲) منطق جونیر ششم اور ہفتم کے نصاب سے خارج کر دی جائے۔

(۱۳) جونیر درجوں میں ہر فن لازمی ہو۔

(۱۴) جونیر چہارم سے ہفتم تک کے نصاب میں عربی اور فارسی ادب کی جو کتابیں اس وقت ہیں ان کے عوض میں مناسب معیار کی کتابیں رکھی جائیں جو عرب اور فارس کے مصنفوں کی ہوں۔

(۱۵) موجودہ نصاب چونکہ بارگراں ہے اس لئے اس کی مقدار کم کردی جائے۔

(۱۶) تاریخ اسلام میں شیعہ اور سنی طلبہ کے لئے مختلف کتابیں مقرر کی جائیں۔

(۱۷) موجودہ ملّا امتحان کے عوض میں ایک دوسرا امتحان جونیر درجوں کی تعلیم کے اختتام پر ہو۔ یہ امتحان بورڈ کے زیر اہتمام ہو اور درجہ مولوی کے داخلہ کا امتحان قرار دیا جائے۔

ان کے علاوہ سب کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ جونیر چہارم اور پنجم میں تجوید کی علمی تعلیم دینے کے بجائے یعنی فن قرأت سکھایا جائے اور نصاب کی تیاری میں ہر فن کے مستند مصنفوں کی طبع زاد تصانیف کو فوقیت دی جائے۔ اور خالص علم ادب کے علاوہ دوسرے فنون میں صرف ایسی کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں جن میں خالصۃً اسی فن کے اصول سے بحث کی گئی ہو۔

کمیٹی کی مندرجہ بالا سفارشات کی معقولیت میں کوئی شک نہیں ہے۔ جس ظرف جس ماحول بلکہ جن مجبوریوں کے ساتھ ان اراکین کو نظام اور نصاب میں ترمیم کرنی تھی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ وہ کچھ کر نہیں کرسکتے تھے۔

حیرت ہے کہ جونیر ششم اور ہفتم سے منطق کے خارج کر دینے پر خان بہادر مولانا ابو نعیم نے اختلاف کیا اور اختلافی نوٹ لکھا۔ ہم کو ان کے اس اختلاف میں کوئی معقولیت نظر نہ آئی بجز رسم اور قدامت پرستی کے کوئی دوسرا جذبہ منطق کی حمایت میں کارفرما نہ تھا۔ انھوں نے کلکتہ مدرسہ۔ مدرسہ عالیہ رامپور اور دیوبند کی مثالیں دی ہیں لیکن کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ان مدارس نے اپنے نصابوں کی کامیاب اصلاح کرلی ہے۔

بیشک جونیر چہارم اور اس کے اوپر کے درجوں میں انگریزی لازمی کر دینے پر خان بہادر موصوف نے جو اختلاف کیا ہے وہ معقول دلائل پر مبنی ہے۔ ہم خوش ہوتے اگر کمیٹی نے ان کے بیان کو بامعان نظر دیکھا ہوتا۔ جہاں بعض لوگ مذہبًا انگریزی سے نفرت رکھتے ہوں۔ یا بعض مدارس مالی مجبوری سے اس کا بندوبست نہ کرسکتے ہوں وہاں انگریزی لازمی کر دینے کے کچھ معنی نہیں۔ ا

کو صرف اختیاری ہی مضمون رکھنا چاہئے تھا۔

تعلیمی مدت میں بھی دو سال کی کمی کی گئی ہے۔ اس کی تلافی نصاب کی تخفیف ہو سکتی ہے۔ ابتک عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ نصاب تعلیم عالم و فاضل بلکہ کامل بنا دیتا ہے۔ حالانکہ نصاب سے یہ غرض نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ نصاب کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کا فارغ التحصیل طالب علم ہو جائے اور اس قدر قابلیت اس میں آ جائے کہ اپنی کوشش سے ان فنون میں سے جو اس نے پڑھے ہیں کسی فن میں پختگی پیدا کر سکے۔ اس لئے جن لوگوں نے مدت کم کرنے پر اعتراض کیا ہے انھوں نے دراصل نصاب کی غرض کو پیش نظر نہیں رکھا۔

نصاب کی جو شکل ابھی تک کمیٹی نے پیش کی ہے وہ خام ہے یعنی صرف علوم گنا دئے ہیں اور کتب نہیں مقرر کیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہی کمیٹی جس میں ایسے علم والے لوگ شریک تھے کتب کی بھی تعیین کرے گی۔

تجویز میں ایک بات یہ بھی اچھی رکھی گئی ہے کہ نصاب پر ہر سال نظر ثانی کی جائے اور بشرط ضرورت کتابیں بدلی جائیں جس سے امید ہے کہ سال بسال نصاب اچھا ہوتا جائے گا۔

لیکن تعلیم میں سب سے بڑا عنصر نہ نظام ہے نہ نصاب ہے بلکہ استاد ہے۔ وہ استاد جس دماغ صحیح ہو۔ جس کی عقل ماؤف نہ ہو جو اپنے علم سے کام لینا جانتا ہو اور اس پر عمل کرتا ہو۔

افریقیہ کی طرف روانہ ہوئے ان میں سے السفیانی الثائر اور ولید بن یزید کے بیٹے العاصی وموسیٰ اور حبیب بن عبدالملک بن مروان قابل ذکر ہیں۔ ان سے پہلے جو لوگ افریقیہ جا چکے تھے ان میں جبری ابن عبدالعزیز بن مروان اور عبدالملک بن مروان ہیں جو خلیفہ مروان کے قتل کے وقت گئے تھے۔ اس کے بعد سے افریقیہ میں کثرت سے اموی وشامی پہنچ گئے۔

عبدالرحمٰن ابن حبیب گورنر افریقیہ

اس زمانہ میں افریقیہ کے گورنر عبدالرحمٰن ابن حبیب ابن عبیدہ فہری تھے۔ عبدالرحمٰن نے ان لوگوں کی آمد افریقیہ میں بری نظر سے دیکھی پھر عبدالرحمٰن ابن معاویہ ابن ہشام نے بھی یہیں پناہ لی۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی باقی سرگزشت

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی آمد کے واقعات یہ ہیں کہ جب ابی فطرس کے باشندوں کو امن ملا تو عبدالرحمٰن سترہ سال کے نوعمر لڑکے تھے سیاہ جھنڈوں کی (عباسی لشکر کی آمد) خبر سن کر اپنے مکان واقعہ دیر حنا ضلع قنسرین میں واپس آ گئے اور یہاں ٹھہر کر اپنے بعض بھائیوں اور عزیزوں کو جمع کیا۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے ساتھ ان کا بیٹا سلیمان ابوایوب بھی تھا جو مروان کے زمانہ میں سنہ ۱۳۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ مجھے عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی فراری کے واقعات ایک ایسے شخص سے معلوم ہوئے ہیں جس نے خود عبدالرحمٰن کو ایک جماعت سے اپنے واقعات بیان کرتے ہوئے سنا تھا۔ ذیل کے واقعات اس شخص کے حوالے عبدالرحمٰن کی زبانی نقل کئے جاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی اپنے متعلق روایت خود ان کا ایک زبانی بیان

عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ جب ہمیں امن کی خبر ملی تو میں تفریح کے لئے باہر روانہ ہو چکا تھا۔ یکایک میری غیبت میں خاندان والوں پر آفت نازل ہوئی میں گھر واپس آیا اور اپنے اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات ومصالح کا انتظام کر کے گھر سے نکلا اور فرات کے کنارے ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ یہ گاؤں بہت سرسبز اور آباد تھا مگر میں تو مغرب کا ارادہ کر کے چلا تھا یہاں کیوں ٹھہرتا۔ علاوہ اس کے میرے کانوں میں ایک روایت ایسی پڑی ہوئی تھی جس نے مجھے مغرب کے

طویل سفر کے لئے اچھی طرح آمادہ کر دیا تھا۔ یعنی میرے والد خدا اُن پر رحم کرے میرے دادا مرحوم و مغفور کے زمانے میں انتقال کر چکے تھے جس وقت اُنکی وفات ہوئی میں لڑکا ہی تھا ان کی وفات کے وقت مجھے اور میرے بھائیوں کو میرے دادا کے پاس رصافہ میں پہنچا دیا گیا۔ مسلمہ بن عبدالملک اس وقت زندہ تھے۔ ہم اپنی سواریوں پر ان کے دروازہ پر کھڑے تھے کہ مسلمہ نے ہمارا حال پوچھا کہ کون ہیں، جواب میں اُن سے کہا گیا کہ یہ معاویہ کے یتیم بچے ہیں یہ سن کر مسلمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انھوں نے دو دو کر کے سب کو بلایا جب میری باری آئی تو مجھے لیا اور پیار کیا پھر اپنے داروغہ سے کہا کہ ان کو لو اس نے مجھے سواری سے اتار کر انکے پاس کھڑا کر دیا انھوں نے بے اختیارانہ مجھے چومنا اور رونا شروع کر دیا میرے بعد جو لوگ مجھ سے چھوٹے تھے ان کو نہیں بلایا۔ میری طرف متوجہ رہے اور اپنے پاس ہی رہنے دیا۔ میں انکے آگے ان کی زین پر بیٹھا ہوا تھا اسی اثنا میں میرے دادا کا ادھر سے گذر ہوا جب انھوں نے مسلمہ کی یہ حالت دیکھی تو پوچھا کہ اے ابوسعید یہ کیا ہے انھوں نے کہا کہ یہ ابو مغیرہ کے بیٹے ہیں۔ پھر میرے دادا کے قریب ہو کر ان سے کہا "وقت قریب آگیا ہے وہ یہی ہیں" انھوں نے پوچھا کہ واقعی یہی ہے مسلمہ نے جواب دیا "بخدا یہی ہے میں نے اُس کی پیشانی اور گردن سے علامات امارت پہچان لی ہیں۔ پھر داروغہ نے مجھے مسلمہ کے حکم سے میرے دادا کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت میری عمر دس سال کے قریب تھی۔ اس وقت سے میرے دادا میرے ساتھ بہت رعایت کرنے لگے۔ ہر ماہ میرے پاس جیب خرچ اور قاصد بھیجتے تھے ہم لوگ ضلع قنسرین میں رہتے تھے اور ہمارے اور اُنکے درمیان ایک دن کی مسافت تھی۔ میرے ساتھ ان کا یہ طریقہ آخر وقت تک رہا۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا ان کے انتقال سے دو سال پہلے مسلمہ وفات پا چکے تھے۔

ان واقعات کی بنا پر مسلمہ کا قول میرے ذہن میں چند، در مذکورہ واقعات کے ساتھ جم گیا۔ جب یہ موقع آیا تو میں ایک گانوں میں اپنے مسکونہ گھر کے ایک تاریک حصہ میں بیٹھا ہوا

تھا اس وقت تک ہمیں سیاہ جھنڈے والوں کی آمد کا علم نہ ہوا تھا۔
اس دن میری آنکھیں سخت آشوب کر آئی تھیں۔ میرے پاس ایک سیاہ کپڑا تھا میں اس سے اپنی آنکھوں کی کیچڑ صاف کرتا جاتا تھا۔ میرا لڑکا سلیمان جو تقریباً چار سال کا تھا باہر کھیل رہا تھا یکایک وہ دروازے سے آکر میری گود میں گر پڑا اور بچوں کی طرح آواز سے رونے اور بیقراری ظاہر کرنے لگا۔ میں نے اپنی تکلیف کی وجہ سے اسے ڈھکیل دیا پھر میں نے باہر نکل کر دیکھا تو مجھے بڑے بڑے سیاہ جھنڈے نظر آئے میں ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہوا مگر میرے بھائی نے آکر مجھے مطلع کیا کہ میں نے سیاہ پوش لشکر کو آتے ہوئے دیکھا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے میں بھی لڑکے کی حرکت سے متاثر ہو کر باہر دشمنوں کو دیکھ آیا تھا غرض میں انتظام سفر کے لئے جستجو کی تو مجھے چند دینار سے زیادہ کچھ نہ ملا۔ ان دیناروں کو لے کر میں نے اپنے لڑکے اور بھائی کو ساتھ لیا اور ام اصبغ وامۃ الرحمٰن کو اپنے ارادہ سے مطلع کر کے ہدایت کی کہ میرے غلام کو مناسب سامان کے ساتھ میرے پاس بھیج دیا جائے اگر زندہ رہا تو مل جاؤں گا"
یہ کہہ کر میں نکل کھڑا ہوا اور ایک ایسی جگہ چھپ گیا جو گاؤں کے ایک جانب تھی۔ جن لوگوں سے ہم کو اندیشہ تھا انھوں نے بڑھ کر گاؤں کا اور پھر میرے گھر کا محاصرہ کر لیا مگر انھیں میرا کوئی پتہ نہ چلا۔ چلتے چلتے ہمیں ہمارا غلام بدر بھی مل گیا۔ اس کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے ایک شخص سے ملے اور ہم نے اس سے سواری و ضروری سامان خریدنے کے لئے کہا۔ ہم اس کا انتظار کر ہی رہے تھے کہ سامان ملجائے تو چلیں کہ اتنے میں اس شخص کے غلام نے آکر خبر دی کہ آپ کے دشمن تعاقب میں ہیں۔ یہ سنتے ہی ہم نے تیزی سے دوڑنا شروع کیا اب دشمن ہمارے اتنے قریب آپہنچے کہ اُن کے گھوڑوں کی چاپ کانوں میں آنے لگی مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور پاپیادہ بھاگ کر فرات میں کود پڑے۔ سوار گھومتے ہوئے وہاں پہنچے مگر ہم اُن سے پہلے فرات میں کود چکے تھے ہمیں دیکھ کر سواروں نے غل مچایا کہ "پلٹ آؤ تمھیں کوئی خطرہ نہیں ہے مگر میں نے اور میرے بھائی نے تیرنا شروع کر دیا جب ہم نے تقریباً نصف فرات طے کر لیا

تو میں نے اپنے بھائی کو ہمت ہارتے دیکھ کر چلا کر تیرنے اور اپنے پہنچنے کی ہدایت کی مگر وہ ڈوبنے کے اندیشہ سے اتنا خائف تھا کہ ان کے امان کے وعدہ سے دھوکے میں آگیا اور دریا سے بیچ کر موت کے منہ میں جا پڑا وہ میرے بار بار کہنے سے بھی نہ مانا اور ان کے ہاتھوں پڑ کر میرے سامنے مارا گیا۔ اُس وقت اس کی عمر تیرہ سال تھی۔ میں تیرتے تیرتے فرات کو عبور کر گیا۔ میرے تعاقب میں اگرچہ ایک دو شخصوں نے دریا میں کودنا چاہا مگر ان کی رائے پلٹ گئی اور میں سلامت نکل گیا۔

دوسروں کے بیانات یہ سارا بیان امیر عبدالرحمٰن الداخل کا ہے۔ ان کے سوا جن لوگوں سے ان کے واقعات معلوم ہوئے وہ یہ ہیں کہ عبدالرحمٰن یہاں سے آگے چل کر فلسطین پہنچے یہاں ان کی بہن ام اصبغ ان کا غلام بدر اور ام اصبغ کا غلام سالم ابو شماع آئے ام اصبغ عبدالرحمٰن کی سگی بہن تھی ان دونوں غلاموں کے ساتھ کچھ جواہرات اور کھانا وغیرہ تھا۔ ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے عبدالرحمٰن افریقیہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک افریقیہ میں ان کے خاندان کی ایک جماعت پہنچ چکی تھی۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے متعلق ایک یہودی کی پیشین گوئی اس زمانے میں افریقیہ کے گورنر عبدالرحمٰن ابن حبیب کے پاس ایک یہودی تھا جو مسلمہ بن عبدالعزیز کا دوست تھا وہ اکثر ابن حبیب سے کہا کرتا تھا کہ اندلس پر ایک شہزادہ کی حکومت قائم ہوگی جس کا نام عبدالرحمٰن ہوگا اور اور اس کے دو زلفیں ہوں گی یہ سن کر ابن حبیب نے اس پیشین گوئی کو اپنی طرف منسوب کرنے کے لئے اپنی زلفیں چھوڑ دی تھیں۔ عبدالرحمٰن ابن حبیب کی اس حرکت پر یہودی ان سے کہا کرتا تھا کہ تم بادشاہوں کی نسل سے نہیں ہو۔ ابن حبیب جواب دیتے کہ نہیں بخدا میں ہوں۔

عبدالرحمٰن ابن حبیب کی مضحکہ خیز جسارت جب عبدالرحمٰن ابن معاویہ، عبدالرحمٰن ابن حبیب کے پاس آئے اور ابن حبیب نے دیکھا کہ ان کی زلفیں چھٹی ہوئی ہیں تو یہودی کو بلا کر کہا کمبخت یہ وہی ہیں جس کو تو کہتا ہے اب میں اس کو قتل کئے ڈالتا ہوں۔ یہودی نے کہا کہ اگر تو نے اس کو قتل کر ڈالا تو میں کہوں گا کہ یہ وہ نہیں ہے اور اگر چھوڑ دیا تو بیشک وہی ہے۔ پھر

ابن حبیب نے ولید ابن زید کے دونوں بیٹوں کو قتل کرا کے اسمٰعیل ابن زیان ابن عبدالعزیز کو گرفتار کیا اور انکے مال پر بھی قبضہ کر کے اسمٰعیل کی بہن سے زبردستی نکاح کر لیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی فکر میں رہنے لگا۔

کچھ لوگوں نے عبدالرحمٰن ابن حبیب کے منصوبوں سے عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو آگاہ کر دیا۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ فوراً اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھے اور یہ سب بربری شہروں میں منتشر ہو گئے۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ ایک گاؤں بارمی نامی میں آئے اور قبیلہ مکناسہ میں مقیم ہوئے مگر اس قبیلہ والوں سے انھیں کچھ تکلیف پہنچی اس لئے ان لوگوں کو چھوڑ کر دریا کے پاس مقام سبتہ میں پہنچے یہاں قبیلہ نفزہ کے مہمان ہوئے اس قبیلہ کے لوگ ان کے ماموں تھے کیونکہ ان کی والدہ نفزیہ تھیں۔

سالم غلام کا واقعہ | ان سفروں میں ان کا غلام بدر ساتھ رہا۔ سالم افریقیہ میں جدا ہو گیا جس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک زود غضب اور تند مزاج غلام تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا کہ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے پاس ان کے بعض چچیرے بھائی ملنے آئے عبدالرحمٰن نے سالم کو چلا کر آواز دی۔ سالم کو خبر نہ ہوئی جب عبدالرحمٰن کے حکم سے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دئے گئے تب وہ ہوش میں آیا مگر یہ بات اسے ناگوار ہوئی اور وہ خفا ہو کر شام کو واپس چلا گیا۔

سالم ابو شجاع اندلس کے حالات سے واقف تھا کیونکہ وہ موسیٰ ابن نصیر کے ساتھ یا انکے بعد اندلس آ چکا تھا اور اسی اندلس کے عیسفی لشکروں میں رہ کر لڑنے کا تجربہ تھا، اس لیے عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو اس کی جدائی شاق گزری۔ غرض سالم ابن معاویہ کو چھوڑ کر ام الاصبغ کے پاس چلا گیا۔

ابوالخطار کی امارت کے بقیہ حالات | اب پھر ابوالخطار کی ولایت اندلس کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ ابوالخطار چار سال چھ ماہ تک اندلس کے والی رہے یعنی ۱۲۸ھ تک ان کے زمانے میں

صمیل کی آمد | اہل شام کی مدد کے لئے صمیل بن حاتم بن شمر بن ذی الجوشن کرفی اندلس میں آ چکا تھا جب شمر نے حسین بن علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تو مختار نے انکے انتقام میں شمر کو قتل کر دیا۔ اس زمانے

میں شمر کا بیٹا حاتم کوفہ سے نکل کر مغرب کی طرف چل پڑا اور جزیرہ میں سکونت اختیار کی۔ پھر جب قنسرین کا لشکر تیار ہوا تو صمیل اس میں داخل ہو کر اپنے ساتھیوں کے خیال سے اندلس پہنچ گیا۔

ابوالخطار اور صمیل کی کشیدگی اور اس کے نتائج

اندلس میں صمیل نے بڑا مرتبہ حاصل کیا۔ قبیلہ قیس والوں نے صمیل کے ساتھ تعلقات بہت بڑھا لئے ان کی امداد سے صمیل کو نمایاں کامیابی ہوئی اور وہ اندلس میں اپنی جرأت و سخاوت کے لحاظ سے بہت نامور ہو گیا۔ اس کی اس ناموری سے ابوالخطار آزردہ ہوئے۔ ایک دن صمیل انکے یہاں گیا اس وقت ابوالخطار کے لشکر والے بھی ان کے پاس جمع تھے ابوالخطار نے اس موقع پر صمیل کی توہین کرنا چاہی اور گفتگو بہت بڑھ گئی آخر صمیل گالیاں اور گھونسے کھا کر ابوالخطار کی مجلس سے نکلا اور اپنے گھر آ کر اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگ جمع کئے اور جو کچھ گزری تھی اس کی شکایت کی ان لوگوں نے کہا "ہم تمھارے ساتھ ہیں جیسا کہو ویسا کریں۔ صمیل نے کہا خدا کی قسم میں یہ نہیں چاہتا کہ بنی مضر کو بنی قضاعہ اور یمنی قبائل سے ٹکرا دوں لیکن ہم حسن تدبیر اور نرمی کے ساتھ قوم مرج راہط کو البتہ دعوت دیتے ہیں اور بنی لخم و جذام کو مدد کے لئے بلاتے ہیں اور انھیں میں سے ایک شخص کو انتخاب کر کے سردار بناتے ہیں۔ نام اس کا ہو گا کام ہم سب کریں گے۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور صمیل کے حکم سے ثوابہ بن سلامہ جذامی کو لکھا گیا۔

امارت کے لئے جنگ۔ ابوالخطار کی شکست اور ثوابہ ابن سلامہ کا امارت پر تقرر

ثوابہ فلسطین کے باشندے تھے مراسلت کے ساتھ ایک وفد بھی ثوابہ کے پاس بھیجا گیا۔ بنی لخم و بنی جذام کی رفاقت اور صمیل کی اس تیاری کا علم ابوالخطار کو ہوا تو انھوں نے اہل اندلس کی ایک جماعت ساتھ لے کر جنگ کی تیاری کی۔ دریائے شذونہ کے کنارے ثوابہ نے ابوالخطار سے مقابلہ کیا۔ اس مقابلے میں ابوالخطار کو شکست ہوئی اور وہ قید ہو گئے۔ اس جنگ میں ابوالخطار کے آدمی کم مارے گئے تھے پھر ابوالخطار کے قید ہونے پر ثوابہ نے اہل اندلس پر تلوار نہ اٹھائی اور بڑھتا ہوا قصر اندلس میں داخل ہو گیا۔ ابوالخطار ثوابہ کی نگرانی میں یہیں قید رہے یہاں ثوابہ نے ایک سال تک حکومت

کرکے ۱۲۹ھ میں انتقال کیا۔

یوسف ابن عبدالرحمن فہری کا انتخاب

ثوابہ کے بعد اہل اندلس نے بڑے اختلاف کے بعد یوسف ابن عبدالرحمن ابن عقبہ ابن نافع فہری کی حکومت پر اتفاق کیا۔ لیکن ان کے انتخاب میں کوئی معرکہ آرائی نہیں ہوئی

یوسف اور عمرو بن ثوابہ کا امارت کے متعلق معاہدہ

یوسف ابن عبدالرحمن کے دو حریف تھے ایک یحیٰی ابن حریثہ جذامی باشندہ اردن نے اپنی اہلیت کا دعوٰی کیا تھا دوسرے عمرو ابن ثوابہ[1] تھے جو یحیٰی پر اپنی ترجیح کے مدعی تھے۔ انکے باہمی اختلاف سے تصفیہ میں دیر ہوئی آخر یوسف کا انتخاب ہو گیا اور طے پایا کہ ضلع ریہ یحیٰی ابن حریثہ کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اہل اردن اس میں سکونت اختیار کریں یحیٰی نے بھی اس تصفیہ سے اتفاق کیا۔

عبدالرحمن ابن نعیم کلبی

پھر بنی قضاعہ جمع ہوئے تو انھوں نے اپنا رئیس عبدالرحمٰن ابن نعیم کلبی کو مقرر کیا عبدالرحمٰن نے دو سو پیادے اور چار سو سوار لے کر قصر قرطبہ پر شبخون مارا قصر کے سواروں کو ہٹا کر قیدخانے پر چڑھ آیا اور ابو الخطار کو قید سے نکال کر ان کے ساتھ رات کو بھاگ نکلا پناہ کے لئے بنی کلب اور حمص کے قبائل میں ٹھہرنا چاہا تو ان لوگوں نے مزاحمت کی اور مدد دینے سے انکار کر دیا مجبوراً یہاں سے بھی بھاگا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن ابن نعیم نے کوئی نئی بات نہیں کی اور سب لوگ بلا اختلاف یوسف کی حکومت سے متفق ہو گئے

یحیٰی ابن حریث کے ساتھ یوسف ابن عبدالرحمن کا نقض عہد

یوسف نے حکومت میں استقلال پیدا کرتے ہی ابن حریث کے ساتھ بے وفائی کی اور ریہ سے معزول کر دیا اس لئے یحیٰی ابن حریث نہایت خفا ہوا اور ابوالخطار سے گفت و شنید و مراسلت شروع کر دی۔

ابوالخطار و ابن حریث کا اختلاف

جب ابوالخطار اور ابن حریث یوسف کے خلاف سعی امارت کے لئے

(۱) اصل کتاب میں ثوابہ ابن ہے مگر صحیح عمرو ابن ثوابہ ہے۔

جمع ہوئے تو ان میں آپس میں اختلاف ہوگیا۔ ابو الخطار نے کہا میں امیر ہوں ابن حریثہ نے کہا نہیں بلکہ مجھے امارت کا حق زیادہ ہے۔ کیونکہ میری قوم تمھاری قوم سے زیادہ ہے جب بنی قضاعہ نے ابن حریثہ کے دعوے پر غور کیا تو انھوں نے چاہا کہ یمنیوں میں اتحاد ہو جائے اس غرض سے انھوں نے ابن حریثہ کا دعوے تسلیم کرکے ابن حریثہ کو ترجیح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس کے یمنیوں میں قبائل حمیر کندہ مذحج اور قضاعہ نے ابن حریث پر اتفاق کیا اور قبیلہ مضر و ربیعہ کے لوگ یوسف کے طرفدار ہوگئے کیونکہ ربیعہ کی تعداد اندلس میں بہت کم تھی اس لئے ہر فوج میں سے یمنی سردار ابن حریث کے ساتھ ہوگئے۔ بلدیئین بھی اہل شام کی ناراضگی کے خیال سے یوسف سے ناراض ہوگئے صرف مضر کے سرداروں نے یوسف اور صمیل کی حمایت قبول کی۔

ایک عظیم الشان خانہ جنگی کی تیاریاں

غرض اس فرقہ بندی کے ساتھ تمام لوگ اپنی اپنی قوم کی جماعتوں میں داخل ہوگئے یعنی یمنی الگ ہوگئے اور بنی مضر الگ۔ اس موقع پر یہ بھی ہوا کہ فریقین کے لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے تھے اور باہم مزاحمت نہ کرتے تھے یہاں تک کہ ہر فریق کے آدمی اپنی اپنی جماعت میں جا کر مل گئے۔ اسلام میں اپنی شان کی پہلی جنگ تھی اس سے پہلے کبھی ایسی جنگ نہ ہوئی تھی اس کی تباہ کن نوعیت سے اندلس میں اسلام کے تباہ ہونے کا اندیشہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی۔

جنگ اور یمنیوں کی شکست

راوی کا بیان ہے کہ اس تیاری کے ساتھ ابن حریث اور ابو الخطار نے یوسف و صمیل پر قرطبہ میں دھاوا بول دیا۔ ادھر یہ دونوں قریہ شقندہ سے ہوتے ہوئے دریائے قرطبہ پر اترے ادھر یوسف و صمیل اپنے لشکر کے ساتھ دریا کو عبور کرکے ابو الخطار و ابن حریث کی فوجوں کی طرف بڑھے۔ صبح کو نماز کے وقت مقابلہ شروع ہوا پہلے سواروں میں نیزہ بازی شروع ہوئی اور اتنی دیر تک رہی کہ نیزے بیکار ہوگئے گھوڑے تھک گئے اور دھوپ میں تیزی پیدا ہوگئی۔ اب لڑنے والوں نے دست بدست جنگ کی خواہش کی اور سب نے گھوڑوں سے اتر کر

تلواروں سے لڑنا شروع کیا جب تلواریں بھی ٹوٹ گئیں تو ہاتا پائی اور نوچ کھسوٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ مسلمانوں کی جنگ میں اتنی سخت استقلال کی مثال سوائے جنگ صفین کے دوسری نہیں ملتی فریقین کے سردار تک بھی گتھے ہوئے تھے، دونوں پلے برابر کے معلوم ہوتے تھے۔ صرف یمنیوں کی تعداد کسی قدر زائد تھی۔ جب یہ لڑنے والے دست بدست لڑائی سے بھی تھک گئے تو ایک نے دوسرے کے منہ پر خالی کمان اور ترکش مارنا شروع کئے اور دھول اڑائی۔ اسی ہنگامہ میں یکایک صمیل کو ایک بات سوجھ گئی اور اس نے یوسف سے کہا کہ "ہم کو اس کا خیال ہی نہ رہا کہ ہم ایک لشکر اور چھوڑ آئے ہیں اور ہم اس سے ابتک غافل رہے یوسف نے پوچھا وہ کونسا لشکر ہے صمیل نے کہا قرطبہ کے بازار والے۔

یہ سن کر یوسف نے اپنے مولی خالد بن یزید اور ایک دوسرے شخص کو اہل بازار کو لانے کے لئے بھیجا۔ ان دونوں نے بازار والوں میں سے تقریباً چار سو پیادے جمع کئے ان لوگوں کے پاس لکڑیاں اور ڈنڈے تھے کچھ لوگوں کے پاس تلواریں اور برچھیاں بھی تھیں۔ میدان جنگ میں پہنچتے ہی قصابوں نے چھریاں ہاتھ میں لے کر دفعتہً حملہ کر دیا۔ اب ظہر و عصر کا وقت گزر چکا تھا۔ لڑنے والوں نے نماز امن ادا کی تھی نہ نماز خوف سب لڑائی میں نہایت سختی سے مشغول تھے۔ جدید حملہ آوروں نے ان کو سخت مرعوب کر دیا۔ اور بکثرت آدمیوں کو قتل و اسیر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یمنی گروہ کو شکست ہوئی۔ ابوالخطار و ابن حریث قید ہوئے یہ دونوں فریق ثانی یعنی یمنی گروہ کے امیر تھے۔

ابوالخطار و ابن حریث کی قید کا دلچسپ واقعہ

ابن حریث و ابوالخطار کی اسیری کا واقعہ بہت دلچسپ ہے جب ابن حریث نے دیکھا کہ قرطبہ کے بازار والے اس کے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں تو وہ چھپ گیا اور ایک چکی کے نیچے بیٹھ رہا جو لکڑیوں کی ایک ٹال پر نصب تھی جب بنی مضر نے ابوالخطار کو قید کیا اور اسے قتل کرنا چاہا تو ابوالخطار نے کہا "میں کہیں بھاگا نہیں جاتا ہوں" "تم پہلے ابن سوداء[1] ابن حریث کی تو خبر لو جو تمہارے ہی قبضہ میں ہے،" یہ کہہ کر ابن حریث کا پتہ بتا دیا تلاش

(۱) طنزیہ فقرہ ہے چونکہ ابن حریث کی ماں حبشن تھی اس لئے ابوالخطار نے یہ چوٹ کی۔ (مترجم)

کرنے سے ابن حریث مل گیا پھر ابوالخطار و ابن حریث دونوں قتل کر دیے گئے۔

پہلے ابن حریث کہا کرتا تھا کہ "اگر اہل شام کا خون میرے لئے کسی بڑے پیالے میں جمع ہو جائے تو میں یقیناً سب پی جاؤں گا" قتل ہوتے وقت نے اس سے طنزیہ کہا "اے ابن سودا تیری پیالے میں کچھ بچ تو نہیں رہا"

صمیل کی ستمگری | انکے قتل کے بعد قیدیان جنگ طلب ہوئے، صمیل ان کے تصفیہ کے ایک کرچی میں بیٹھ گیا جو شہر قرطبہ کے اندر واقع تھا اب اس جگہ مسجد جامع بنی ہوئی ہے یہیں سے اس نے ستر آدمیوں کو مارا جب قاسم ابوعطا ابن حمدمری نے یہ حالت دیکھی تو اٹھ کھڑے ہوئے اور جوش میں آکر صمیل سے کہا "اے ابو جوش بس اب اپنی تلوار میان میں کر لو" صمیل نے جواب دیا "اے ابوعطا بیٹھ جاؤ اسی میں تمھاری اور تمھاری قوم کی عزت ہے" ابوعطا بیٹھ گئے مگر صمیل نے تلوار میان میں نہ کی تھی۔ اس لئے ابوعطا پھر اٹھے اور کہا "اے اعرابی بخدا تو ہم کو صفین کی عداوت میں قتل کرنا چاہتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس ارادے سے باز آ ورنہ پھر ہم اہل شام کو دعوت دیتے ہیں" یہ سن کر صمیل نے تلوار میان میں کر لی اور قیدیوں کو ایک بڑی مصیبت کے بعد ابوعطا کی بدولت خطرۂ قتل سے نجات ملی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۳۱ھ سے پہلے کا ہے اور اس واقعہ نے لوگوں پہ اتنا اثر ڈالا کہ آپس میں قرابت و رشتہ کے تعلقات منقطع ہو گئے۔

قحط اور عیسائیوں سے مقابلے | ان بے عنوانیوں کے عذاب میں اللہ تعالیٰ نے اہل اندلس کو ۱۳۲ھ میں قحط کی بلا میں مبتلا کیا۔ انھیں دنوں اہل جلیقیہ نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ عیسائیوں کے بادشاہ بلائی کو مسلمانوں نے حقیر جان کر غفلت سے کام لیا تھا اس کا نتیجہ اب ملا، شاہ بلائی پہاڑوں سے نکل کر ضلع واستورس پر قابض ہو گیا۔ اس سے جلیقیہ کے مسلمانوں سے جنگ ہوئی اور اہل استرقہ سے بھی عرصہ تک لڑائی رہی۔ ابوالخطار و ثوابہ کے فتنہ تک یہی حالت رہی جب ۱۳۳ھ شروع ہوا تو شاہ بلائی نے مسلمانوں کو شکست دی اور جلیقیہ سے سب کو نکال دیا جو لوگ اپنے عقیدہ میں پختہ نہ ہوئے تھے وہ سب پھر عیسائی ہو گئے۔ جتنے قتل ہوئے ان کا حساب نہیں

جو مسلمان بچ کر نکل آئے وہ پہاڑ کے پیچھے استرقہ وغیرہ کی طرف چلے گئے جب قحط سخت ہو گیا تو عیسائیوں نے مسلمانوں کو استرقہ سے بھی نکال دیا اور یہ لوگ ۱۳۱ھ میں دوسرے درہ ہائے کوہ اور قوریہ و ماردہ میں منتقل ہونے پر مجبور ہوئے جب یہاں بھی قحط کی سختی ناقابل برداشت ہو گئی تو اکثر مسلمانان اندلس طنجہ واصیلا وریف کی طرف چلے گئے۔ شذونہ کے ضلع میں ایک دریا تھا اس سے گزر کے یہ لوگ روانہ ہوئے تھے اس دریا کو وادی برباط کہتے ہیں اور ان واقعات کی بنا پر ان سالوں کو سنین برباط کہا جاتا ہے۔ غرض ان وجوہ سے اندلس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہو گئی اور قریب تھا کہ دشمن ان پر غالب آجائیں لیکن وہ خود بھوک کی بلا میں پریشان تھے اس لئے زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

صمیل کی ناموری | یوسف نے صمیل کو ملک کی بڑی سرحد سرقسطہ پر روانہ کر دیا تھا وہاں کے باشندے اچھی حالت میں تھے اس وقت یہ سرحد یمنی قبائل کے قبضہ میں تھے۔ یوسف نے یمنیوں کو ضعیف سمجھ کر انھیں ذلیل کرنے کے لئے کوہ سرقسطہ کی طرف بھیجا۔

صمیل اس مہم پر گیا تو اس کے حذم وحشم وغیرہ کے علاوہ اس کے ساتھ دو سو آدمی اور گئے صمیل نے اس جمعیت کے ساتھ مالی وملکی فتوحات حاصل کیں، غریبوں کے وفد اس کے پاس آئے تو اس نے ان کو روپیہ اور غلام تقسیم کئے اور ایسی فیاضی سے کام لیا کہ دوست دشمن میں سے کوئی محروم نہ رہا۔ اس فراخدلی سے اس کی عزت بہت بڑھ گئی۔ اس کے بعد صمیل نے سرقسطہ میں کئی سخت سال بسر کئے

عامر اور قبیلہ بنی عبدالدار | ان دنوں قرطبہ کے لوگوں میں قبیلہ بنی عبدالدار کا ایک نوجوان بہت زیادہ نامور وممتاز ہو گیا تھا۔ اس کا نام عامر تھا اور یہ ابو عدی برادر مصعب ابن ہاشم صاحب لوا، رسول مقبول صلعم کی اولاد سے تھا یہ مصعب وہی ہیں جن کو جنگ بدر واحد میں لوا، مبارک کی خدمت تفویض ہوئی تھی۔

عامر کی تیاریاں | مقبرۂ عامر جو شہر قرطبہ کے مغربی فصیل کی طرف واقع ہے اسے عامر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ عامر یوسف سے پہلے صوائف کے لشکروں کا افسر رہ کر ناموری حاصل کر چکا تھا۔ یوسف

کواس کی عزت و مرتبہ پر حسد ہوا۔ عامر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے جیسا کہ مشہور ہے ابوجعفر منصور (خلیفہ عباسی) سے درخواست کی کہ میرے پاس اندلس کی گورنری کا فرمان بھیجدیا جائے۔ اس کارروائی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عامر کو قبائل یمن میں یوسف کی خونریزی وغیرہ سخت ناگوار گزری تھی اور وہ اس کی زیادتیوں کی وجہ سے اس پر خار کھائے بیٹھا تھا۔

اس کے بعد عامر نے اپنی آراضی میں جس کو قناعت عامر کہتے تھے اور قرطبہ کے مغرب میں واقع تھے۔ ایک چھوٹا سا احاطہ بنوایا وہاں کی تعمیرات میں اتنا غلو کیا کہ اس حصہ کو ایک مضبوط محفوظ شہر بنا دینا چاہا تاکہ اس کو حسب ضرورت اپنی حفاظت کے لئے بھی کام میں لاسکے اور اطمینان کے ساتھ یوسف کی فوجوں پر اس وقت تک چھاپے مارتا رہے جب تک اس کے پاس یمن والوں کی امداد نہ آجائے۔

یوسف کا ضعف حکومت | ادھر یوسف کی قوت میں ضعف پیدا ہو گیا اور اس کی طاقت اتنی کمزور ہو گئی کہ اس کے باڈی گارڈ میں ۵۰ سوار بھی نہ رہے۔ اندلس میں سب نے اس کا ضعف محسوس کر لیا اس میں اس نے چاہا کہ عامر کو گرفتار کرے مگر عامر کو اس کا ارادہ معلوم ہو گیا اور وہ مدافعت کی تدبیروں میں مصروف ہوا۔ یوسف چونکہ بزدل تھا اس لئے اپنی موجودہ طاقت کو دیکھتے ہوئے عامر سے مقابلہ کی جرأت نہ کرسکا۔ اس کا منتظر رہا کہ صمیل آجائے تو کچھ کروں۔ چنانچہ صمیل کو عامر کی حالت و جرأت سے مطلع کر کے مدد چاہی۔

صمیل نے جواب میں یوسف کو جرأت دلائی اور عامر کے قتل پر ابھارا بر خلاف یوسف کے عامر باخبر تھا اس سے یوسف کی کوئی حالت پوشیدہ نہ تھی وہ اس کی کمزوریوں سے خوب واقف تھا۔ وہ بہت فیاض، ہوشمند اور ادیب تھا۔ اسے ایک مخبر نے خبر دی اور کہا کہ اپنی جان بچاؤ کیونکہ یوسف کے پاس صمیل کا خط آیا ہے جس میں اس نے یوسف کو تمہارے قتل پر ابھارا ہے۔

یہ خبر سن کر عامر قرطبہ سے نکل کر سرقسطہ روانہ ہوا جہاں صمیل موجود تھا کیونکہ عامر نے یمنیوں کی کثرت کی وجہ سے اپنے لئے سرقسطہ سے بہتر محفوظ جگہ نہ سمجھی تھی اور اضلاع کے لشکروں پر

ان کے ضعف اور واقعہ شقندہ[1] کی وجہ سے عامر کو کوئی اعتماد نہ رہا تھا۔

سرقسطہ میں بنی زہرہ کلابی کا ایک شخص بہت مغرور تھا۔ عامر نے اس کو لکھا اور بنی زہرہ والی ولدقصی کے ساتھ اپنی قرابت جتائی اس نے عامر کو مدد دینا منظور کر لیا اس لئے عامر سرقسطہ کے بعض نواح میں آگیا اور یہاں عامر اور زہری نے مل کر لوگوں کو دعوت دی کہ ابوجعفر منصور کا فرمان نافذ ہوا ہے سب لوگ اس کی تعمیل کے لئے جمع ہوں اس دعوت پر یمن کے کچھ لوگ اور بربری اور بعض دوسری قومیں جمع ہوگئیں۔ صمیل کو معلوم ہوا تو اُس نے غیر مسلم بطیع فوج میں سو سوار و پیادہ سپاہیوں کا لشکر بھیجا جس نے عامر اور اُس کے گروہ کو شکست دی مگر اس کے بعد عامر و زہری کی حمایت میں لوگ کثرت سے اکٹھا ہو گئے اور انھوں نے یورش کر کے صمیل کو شہر سرقسطہ میں گھیر لیا۔

یوسف کی فوجی تیاریاں صمیل نے مدد کے لئے یوسف کو لکھا۔ یوسف کو لوگوں میں اتنی سکت نہ معلوم ہوئی (یہ واقعہ ۱۳۹ھ کا ہے) اس لئے اُس نے قبیلہ قیس کو مدد کے لئے لکھا جن کی فوجیں قنسرین یعنی جیان[2] اور دمشق یعنی البیرہ میں پڑی ہوئی تھیں اور اہل قبیلہ پر اپنے حق کی عظمت ظاہر کر کے انھیں توجہ دلائی کہ اس موقع پر تمھاری تھوڑی مدد بھی بہت ہو جائے گی۔ اس بنا پر عبید اللہ ابن علی کلابی اور کلاب و محارب و سلیم و نصر و ہوازن کی تمام جماعتیں یوسف کی طرفداری پر تیار ہو گئیں صرف بنی کعب ابن عامر و عقیل و قشیر و حریش نہ شریک ہوئے ان میں اور بنی کلاب میں چشمک تھی کیونکہ اندلس کی ریاست اس میں رہ چکی تھی۔ بلج قشری تھا بعدازاں اندلس کی ریاست کلاب

---

[1] واقعہ شقندہ سے وہ جنگ مراد ہے جس میں یمنی قبائل اور بنی مضر سے جنگ ہوئی تھی یمنی قبائل کے دو سردار تھے ابوالخطار و ابن حریث اور مضر کا امیر یوسف تھا۔ اسی جنگ میں آخر کار یمنیوں کو ہزیمت ہوئی تھی۔ فقرہ زیر بحث میں اسی جانب اشارہ ہے۔ (مترجم)۔

[2] عرب فاتحوں نے وطن کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اندلس کے بہت سے مقامات کے نام عربی مقامات سے موسوم کئے تھے مثلاً جیان کو قنسرین اور البیرہ کو دمشق کہتے تھے۔ (مترجم)

ابن عامر کی طرف منتقل ہوگئی۔ اس زمانے میں بنی کعب ابن عامر کا سردار دمشق یعنی البیرہ میں سلیمان ابن شہاب اور قنسرین یعنی جیان میں حصین ابن دجن عقیلی تھا اور قبیلہ غطفان والے اس معاملے میں مذبذب تھے۔ ان کا کوئی رئیس نہ تھا جو انھیں مطمئن کرتا۔ ان کے سردار ابو عطار کے بعد سے اس قبیلہ کی یہی حالت ہوگئی تھی۔

عبید ابن علی کی تیاریاں قبائل قیس کی امداد

جب عبید ابن علی کمربستہ ہوگیا اور اس نے صمیل کی اعانت کے لئے لشکر والوں کو متوجہ کیا تو ابن شہاب و ابن دجن نے شرکت سے انکار کردیا اور تمام بنو عامر عبید ابن علی کی امداد کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں کلاب و نمیر و سعد اور تمام قبائل ہوازن وسلیم بن منصور شریک تھے بعد میں غطفان بن سعد بھی شامل ہوگئے۔ پھر جب سلیمان و حصن کو یہ معلوم ہوا کہ دونوں کا بیٹھ رہنا صمیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تو یہ دونوں بھی شرمندہ ہوکر عجلت کے ساتھ اپنی قوم کو لئے ہوئے عبید ابن علی کی فوج میں آملے۔ جب اسی طرح تمام قبیلہ قیس صمیل کی مدد کے لئے تیار ہوگیا اور قرطبہ کے قریب کے دونوں لشکر لے کر روانہ ہوا تو بھی تین سو ساٹھ یا اس سے کچھ زیادہ سوار بدقت مہیا ہوسکے۔ یہ حالت دیکھ کر ان لوگوں نے اپنا ضعف اور تعداد کی قلت محسوس کی تاہم دل مضبوط رکھا اور عبید ابن علی سے کہا "ہم ہلاک ہی کیوں نہ ہوجائیں مگر تجھ ایسے شخص کو چھوڑ نہیں سکتے۔

البیرہ والے بنی امیہ کی امداد

اس زمانے میں اکثر بنی امیہ دمشق یعنی البیرہ میں تھے ان میں سے تیس سوار عبید ابن علی کی مدد کے لئے فوراً روانہ ہوئے۔ اس گروہ کے سردار ابوعثمان عبیداللہ ابن عثمان اور عبداللہ ابن خالد یہ دونوں یکے بعد دیگرے بنی امیہ کے علمبردار ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ یوسف ابن بخت بھی تھے یہ سب معرکۂ شقندہ میں یوسف و صمیل کے ساتھ شریک تھے اور اس معرکہ میں بڑا صبر و استقلال دکھا چکے تھے۔ اس لئے یوسف و صمیل اور تمام قیس و مضر کی طرف سے ان کی بڑی مدارات ہوتی تھی اور یہ بڑی عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ غرض قبیلہ قیس کے ساتھ بنی امیہ کے تمام مستطیع و طاقتور لوگ شامل ہوگئے تھے۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی باقی سرگزشت

اب یہاں پھر کچھ بیان عبدالرحمن ابن معاویہ کا کیا جاتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے صمیل کے محصور ہونے کا ذکر کر دیا ہے تاکہ واقعات مرتب رہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ جب عبدالرحمٰن ابن معاویہ علاقہ سبرہ کے موضع نفزہ میں داخل ہوئے تو انھیں فی الجملہ اطمینان ہوا اور انھوں نے اندلس میں اپنے موالی کو لکھ کر ان کی مصیبت پر اپنی ہمدردی ظاہر کی اور ان پر اپنا حق ثابت کرتے ہوئے اپنے آنے اور اپنے ساتھ ابن حبیب کے سلوک اور افریقیہ میں اپنی قوم کی سرگزشت کے تمام واقعات لکھے اور لکھا کہ اگر میں یوسف کے پاس پہنچ گیا تو وہ مجھے امن سے نہ رہنے دے گا۔ اس لئے میں تم لوگوں کے ذریعہ سے مدد حاصل کرنا اور کامیاب ہونا چاہتا ہوں

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کا بنی امیہ سے مدد چاہنا بنی امیہ کی باہمی مشاورت

یہ خط اپنے غلام بدر کے ہاتھ بھیجا۔ جب بدر ان لوگوں کے پاس پہنچا تو وہ جمع ہوئے اور باہم مشورہ کر کے یوسف ابن بخت کو بلایا جو ان لوگوں میں ایک بہادر جوان شمار ہوتا تھا اور ان دنوں قنسرین یعنی جیان کے لشکر میں تھا۔ بعض مصالح کی بنا پر ان سب کی رائے یہ ہوئی کہ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو اس وقت جواب نہ دیا جائے جب تک صمیل سے اس بارہ میں مشورہ نہ کر لیا جائے بدر و یوسف ابن بخت کو اعتماد تھا کہ اگر صمیل نے شرکت نہ منظور کی تو بھی وہ ہمارے خلاف نہ کرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نے صمیل کی امداد کر کے اس پر اور قبیلہ قیس پر احسان کیا ہے اس لئے ہمیں اس سے مخالفت کی امید نہیں ہے۔

بنی قیس کے خروج کا ذکر صمیل کی بروقت امداد

اب پھر بنی قیس کے خروج کا ذکر کیا جاتا ہے یہ لوگ تقریباً تین سو ساٹھ سوار کی جمعیت سے روانہ ہوئے ابن شہاب اور حصین ابن دجن ان کے ساتھ تھے۔ بنی قیس نے ابن شہاب کی تالیف قلب کے لئے اپنا رئیس اسی کو مقرر کیا تھا۔ اس انتخاب کی تحریک عبید ابن علی نے کی تھی جو اس زمانے میں صمیل کے بجائے بنی کلاب کا سردار تھا جب بنی قیس دریائے اناک پہنچے جہاں عقدہ بن بکر بن وائل اور بنی علی کا دخل تھا تو انھوں

نے دریائے انا کے قریب رہنے والوں سے بھی مدد مانگی اور یہاں سے بھی چار سو یا کچھ زائد آدمی ساتھ لے کر آگے بڑھے جب طلیطلہ پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ محاصرہ سے صمیل کو نقصان پہنچے گا اس خبر سے انھیں اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ صمیل مدد سے مایوس ہو کر ہمت ہار دے اور ہلاک ہو جائے۔ اس لئے بڑی عجلت کے ساتھ ایک ایلچی کو صمیل کے پاس بھیجا اور اسے سمجھا دیا کہ بنی عامر و زہری کے سواروں میں بغیر ظاہر ہوئے شامل ہو کر فصیل کے سامنے جانا اور یہ پتھر جو ہم دیتے ہیں اس کو فصیل پر پھینک دینا۔ اس پتھر پر یہ شعر لکھے تھے۔

تبشر بالسلامة یا جدار آتاک الغوث وانقطع الحصار

اتتک نبات اعوج ملجمات علیها الاکرمون وهم نزار

(اے دیوار خوش ہو کہ تیرا مددگار آگیا اور محاصرہ ختم ہوا۔ تیرے پاس وہ گھوڑیاں آپہنچیں جن پر قبیلہ نزار کے شرفا سوار ہیں۔)

ایلچی یہ پتھر لے کر روانہ ہو گیا اور ہدایت کے مطابق فصیل پر پھینک دیا۔ اس پتھر کی اطلاع صمیل کو ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے پڑھ کر سنایا جائے کیونکہ صمیل پڑھا ہوا نہیں تھا جب یہ شعر اس نے سنے تو اپنی قوم سے کہا "لوگو تمھیں بشارت ہو"، یہ کہہ کر حصار کی طرف خصوصیت سے توجہ کی اور بے دل ہو کر مدافعت

کمک کی آمد اور ابن معاویہ کے خط کا ضمنی تذکرہ

میں مصروف ہوا۔ اتنے میں کمک آگئی جس میں ابو عثمان و عبد اللہ ابن خالد و ابن بخت وغیرہ بنی امیہ کے لوگ تھے اور ابن معاویہ کا ایلچی بدر بھی تھا جس کو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابن معاویہ نے اپنے موالی کو جو شقہ لکھا تھا اس کے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان سب لوگوں سے مراسلت کی جائے جو ہماری فتح کے امیدوار ہیں۔ اس شقہ کے ساتھ ابن معاویہ کی مہر بھی تھی ابو عثمان وغیرہ نے ابن معاویہ کے خط کی تعمیل کی اور صمیل کو بھی بنی امیہ کے احسانات یاد دلا کر امداد کے لئے توجہ دلائی۔

محاصرہ کا اختتام اور بلج کمک کے ساتھ صمیل کا سلوک

جب عامر و زہری نے دیکھا کہ صمیل کے پاس کافی

(باقی)

جرمنی کے بہترین
یعنی
دنیا کے بہترین ٹائپ
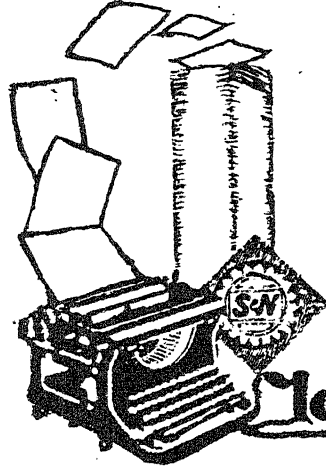
Seidel & Numan (India)
Bruce Street, Fort
Bombay

صحت کی تیر بہدف گولیاں

OKASA

جرمنی کی جادو اثر طبی ایجاد

کون ہے جس نے بجدیہ کی شہرہ آفاق، ہر پروفیسران ورناف اور اسٹنکاہ کی حیرت انگیز تدابیر
جراحی کا حال نہ سنا ہو۔ صرف بعض غدودوں کے بدل دینے سے (بوڑھے سے بوڑھا آدمی تندرست جوان
بن جاتا ہے) ان تدابیر پر دنیا ہنوز انگشت بدنداں تھی کہ جرمنی کے نامور ماہر طبیعات ڈاکٹر لاہوسین (ایم ڈی)
پروفیسر برلن یونیورسٹی نے اپنی اس دوا کے انکشاف سے ہلچل پیدا کر دی ہے۔ جو کثیر المصارف عمل جراحی
کے عذاب اور خطرہ میں ڈالے بغیر از سر نو صحت کو بحال کر دیتی ہے۔

اس عظیم الشان انکشاف پر اوکسا کمپنی (برلین) کو بین الاقوامی نمائش پیرس اور اطالوی نمائش
(فلورنس) میں گرینڈ پرکس طلائی تمغے اور مشہور و معروف "کراس آف آنر" بطور سند ملی ہیں۔ اسناد کی
نقلیں ہمارے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے چہرہ کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے جھریاں اور
سپید بال نیست نابود ہو جاتے ہیں۔ اعصاب رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اضمحلال چڑچڑاپن
نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے۔ اس سے پہلے کہ بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے۔ یہ دوا ہر دوا
فروش کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

ذیل کے پتے سے بھی منگا سکتے ہیں

Sole Agency Okasa co; Ltd; (Berlin)
22, Apollo Street P.o. Box No. 396,
Bombay.

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جارہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے ناآشنا تھے آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جاکر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، یہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں۔ پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہ راز افشا ہوگیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اس کو لیجانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت، حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گنٹھیا، ورم، درد، پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بے مثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے۔ جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہے تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۸ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۷ — بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۱ء — نمبر ۲

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) ایڈیٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا۔

مولانا محمد علیؒ جوہرؔ کی شہادتِ عظمیٰ

(نفسیاتِ اجتماعی کی روشنی میں)

ہمارا بے بہا اور لازوال ترکۂ ملّی!

ہر رشک ایک خلق کو جوہرؔ کی موت پر ۔۔۔ یہ اس کی دین ہے، جسے پروردگار دے!

" رہرو تھا راہِ عشق کا منزل کو پالیا! " ۔۔۔ اب اور کیا نشان، میری لوحِ مزار دے!!

جوہرؔ

ملّی زندگی اور ملّی "روایات" انسانی معاشرہ و ملل کی نفسی زندگی کا ایک بڑا اصل مبصرینِ نفسیاتِ اجتماعی نے "روایات" کو تسلیم کیا ہے۔ "روایات" سے ایک جماعت کی کلچر کے وہ عناصر، عملی و دماغی مراد ہیں جو ماضی کے اعمال و افکار سے چھَن چھَن کر بعد تنازع للبقا، باقیاتِ صالحات کی صورت میں نسل بعد نسل منتقل ہو کر اُس تک پہنچتے ہیں اور جن کو حال کے اربابِ فکر و عمل کچھ اضافہ اور جلا کے بعد مستقبل کو سونپتے ہیں روایات دراصل اجتماعی توریث کے مصنوعی میکانزم ہیں، ٹھیک جیسا کہ جرمی خُلیات (Germ cells)، نسلی توریث کے طبعی میکانزم ہیں۔ جس طرح خُلیات کے واسطہ سے اسلاف اپنے اخلاف کی رگوں اور خونوں میں زندہ ہیں، اسی طرح ماضی کے خیالات و عقائد، تصورات و حیات اصولِ اخلاق و نمونہ ہائے عمل اور مؤسسات و معاہد اور عادات و مراسم حال کے حافظہ میں "روایات" کے وسیلے سے محفوظ ہیں۔ حیاتِ ملّی ایک شئے واحد ہے جس کا گذشتہ، موجودہ اور آئندہ روایات و سنن ملّی کے اعصاب سے عضواً (Organically) باہم پیوستہ اور مربوط ہیں۔ جوہراً "ملت" نفسی وحدت ہے اور اس نفسی وحدت کی آبیاری و بقا روایاتِ ملّی سے وابستہ ہے۔ امر بدیہی یہ ہے کہ ملت کا اصل الاصول "روایاتِ ملّی" ہیں، ٹھیک جس طرح حیوانی

اور نباتی زندگی کا اصل الاصول "اجرام حیوانی" ہیں۔ مگر زندگی خواہ حیوانی ہو یا انسانی شخصی ہو یا سماجی جمود کی نفی اور حرکت کا وجود چاہتی ہے، پس روایات ملی بقا کے لئے تنہا کافی نہیں ہیں۔ اُن کی کیفیت و کمیت میں تغیر ضروری، لازمی اور لابدی ہے، اگر تغیر کسی اخلاقی نصب العین یا عقلی مقصد کے لئے ہوا ہے اور اُس سے قدور منسوب ہو سکتے ہیں اور اُس کے وجود میں لانے کا باعث انسانی ضمیر ارادہ اور عمل ہے تو پھر اس کو "اجتماعی ترقی" کا معزز نام دیا جا سکتا ہے۔ ملی زندگی کی تکوین کے لئے "ملی روایات" اور اُن میں مناسب حال "ترقی" دونوں ضروری ہیں۔

اجتماعی قیادت اور اجتماعی ترقی | اجتماعی ترقی اپنی پیدائش اور بالیدگی کے لئے ایسے صاحبان فکر و عمل اور ارباب ایمان و عزم کی ہدایت چاہتی ہے جو اپنی زندگی یا موت یا دونوں کے ذریعہ "روایات" ملی میں بلحاظ ظرف زمانہ بہتر سے بہتر اضافہ کرنے کے قابل ہوں، جو نئی راہوں کے باز کرنے والے ہوں، نئے خیالات و رجحانات کی برقی لہروں کا اجرا کرنے والے ہوں، پرانی عمارات کے مصلح اور نئی اساسات کے موسس ہوں اور جن کو سماج کو چلانے کی صلاحیت حاصل ہو یعنی جو اپنی زندگی اور موت کے نمونہ سے اپنی ملت اور جماعت کو بہتری کی طرف بڑھانے والے اور برتری کی طرف اٹھانے والے ہوں۔ جو ملتیں ایسے نفوس بکثرت پیدا کرتی ہیں وہ اپنی روایات کو مالا مال کرتی ہیں، بطن ملی کو زرخیز بناتی ہیں اور اس لئے جہاد زندگی میں باقی رہتی اور ترقی کرتی ہیں، اس طرح تاریخ ملی بنتی اور سنورتی رہتی ہے۔ بالعکس جن جماعات کے اعصاب اجتماع — روایات . . . . میں ضعف اور اضمحلال چھاتا ہے اور جو قائدین کو پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں اور اس لئے روایات میں نئے خون کا دوران کر کے اُن کا اعادہ شباب نہیں کر سکتی ہیں وہ طبعًا رفتہ رفتہ کمزور ہو جاتی ہیں اور سڑنے والی لاش کے اعضا کی طرح، معمولی سے خارجی وباؤ پر ان کے اجزا پریشان ہو جاتے ہیں اور وہ معنًا بحیثیت ملی فنا ہو جاتی ہیں

تاریخ ملت کی تخلیق میں جوہر کا شاہکار

مولانا محمد علی جوہر ایسے ہی ملی قائدین میں سے تھے جن کا کام، روایات ملی کو روشن تر، زرخیز تر

اور بلند تر بنا تا تھا۔ آپ نے ایک سے زیادہ ملی راہوں کو باز فرمایا ہے۔ کئی تحریکوں کی امامت کی ہے کئی رجحانات کو جاری کیا ہے اور کئی موسسات ملی کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ آپ فکر و عمل کے ایک پاور ہاؤس تھے اور آپ کی ذات سے لوگوں کو روشنی اور زندگی، ایمان و عزم کے روحانی انوار حاصل تھے۔ آپ نے کامریڈ اور ہمدرد۔ سیاسی بیداری اور شعور کی پیدائش، مسلم لیگ۔ کانگرس خلافت کمیٹی۔ علی گڑھ۔ جامعہ ملیہ۔ موتمر اسلامی۔ دار الخلافت بمبئی وغیرہ کے لئے کام کیا ہے اور ان سب پر جوہر کا احسان عظیم ہے۔ مگر سوالوں کا سوال یہ ہے کہ دنیا کو اور علی الخصوص اسلامی دنیا کو محمد علی جوہر نے وہ کونسی چیز دی ہے جو ان کی زندگی کے تمام وسیلوں اور عطیوں سے بہتر تمام کارناموں سے روشن تر اور تمام حاصل زندگی سے برتر ہے؟ وہ کونسا مخصوص کام ہے جو جوہر کی زندگی کا شاہکار ہے۔ ایک ایسا شاہکار جس میں شہید کربلا کے بعد وہ یکتا اور اکیلا ہے۔۔۔ ایک ایسا شاہکار جس کی توقیر پر موجودہ دنیا کے سب سے بڑا شہنشاہ[1] اور سب سے بڑا فقیر[2] ہم زبان ہیں۔۔۔۔ ایک ایسا شاہکار جس کی تعظیم میں ایشیا، یورپ اور افریقہ تینوں براعظموں کی گردنیں فرط احساس سے ادباً جھکی ہیں؟

ایک نئی "دنیائے کربلا" کی روایت آفرینی صاحبان دل! محمد علی جوہرؒ کا سب سے بڑا دین، اُس کی مجاہدانہ زندگی اور اُس کے کارنامے نہیں ہیں جو بہت اور بلند ہیں اور بلاشبہ تاریخ ملت کو روشن تر کرنے والے ہیں، بلکہ ہمارے لئے اُس کا سب سے بڑا ترکۂ ملی اُس کی بے نظیر شہادت عظمیٰ ہے جس نے تاریخ انسانیت کو ایک دوسری "دنیائے کربلا" کی روایت کبریٰ بخشی ہے۔ دنیا میں ہر لحظہ زندگی کی پیدائش اور فنا ہو رہی ہے اور جس طرح یہاں انگنت قسم کی زندگیاں ابھرتی ہیں اسی طرح بے شمار قسموں کی موت مرتی ہیں۔ مگر محمد علی جوہر کی "موت" ان سب سے بالکل نرالی اور انوکھی

---

(۱) ملک معظم، جارج پنجم۔
(۲) مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی۔

شان کی موت ہے کیونکہ تاریخ انسانیت میں وہ ایک عجیب اور بے عدیل شہادت ہے اور خود متوفی کی ساری زندگی کی تمناؤں اور تیاریوں کا حاصل ہے "معمولی موت"، تو وہ ہے جو دنیا میں ہر لحہ واقع ہو رہی ہے اور جس سے لوگ ہر دم خائف، ہراساں اور نفور ہیں "شہادت" وہ ہے جو آمد نہیں آورد ہے یعنی جس کے لئے راہِ حق میں خود گزرنے والے نفس کا پاک ارادہ اور روشن عمل . . . اور یہ عمل خواہ کسی نوع کا عمل ہو مگر راہ حق میں ہو . . . ذمہ دار ہو۔ جوہر اس معنی میں جیسا کہ آوازہ خلق اور نقارہ خدا نے اعلان کیا ہے "چودہویں صدی کا شہید اعظم ہے" مگر کس نوع کا شہید؟ اس کی شہادت بھی اس کی زندگی کی طرح ایک نرالی شان کی شہادت ہے کیونکہ وہ میدان قتال میں نوع کشی کے خون سے رنگین شہادت نہیں ہے بلکہ نوع خواہی و صلح جوئی اور حق پرستی و حریت طلبی کے لئے قلب کے آخری قطرۂ خون کو خرچ کرنے اور دماغ و حواس کو ان کے بالکل معطل ہونے تک استعمال کرنے اور زبان کو اس کے بالکل بند ہو جانے تک راہ مولیٰ میں کام میں لانے کے غیر معمولی فشار سے واقع ہوئی ہے۔ پھر یہ کوئی مرگِ مفاجات، حادثہ کی موت اور سقوط قلب نہیں ہے بلکہ ایک ارادی کارنامہ، ایک اخلاقی عمل اور ایک محبوب منزل کا پالینا ہے ساری زندگی کی کاشت کا پھل! تمام عمر کی طلب صادق کا مطلوب! اور ایک بالکل طبعی نتیجہ اور وہ بھی حق ہے!!!

اکسیر یہی ایک دعا میرے لئے ہے!   اللہ کے رستے ہی میں موت آئے مسیحا

جوہر نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں   دار و رسن کے گرچہ نہیں بانیوں میں ہم

بہار خونِ شہادت دکھا گئے جوہر   خزاں میں اور یہ رنگ شباب دیکھ تو

کربلا ہے بہانہ کوثر   جائے صدقے اس بہانے کے

کربلا اب سے شہادت کا بنی ہے کلمہ — دین ہر امی و عالم کا اب ایمان حسینؓ
گر شہادت کہیں جوہر تجھے مل جائے تو پھر — رہے کوثر پہ بھی وابستہ دامان حسینؓ

جوہر

والہانہ تمنائے شہادت!

جوہر کی "اسلامیت" اور جوہر کی شاعری | حضرت جوہر ایک مبصر حیات تھے اور آپ کی فطانت اور بصیرت کو ایچ جی ویلز، جارج برنارڈ شا، چیسٹرٹن جیسے عہد حاضر کے ارباب کمال نے عرصہ سے تسلیم کیا تھا۔ اس بنا پر کئی بار آپ نے اس امر حق کا اظہار کیا تھا کہ حق کے لئے زندہ رہنا، حق کے لئے مرنے سے زیادہ سخت، اہم اور ضروری ہے۔ تاہم اگرچہ ان کی زندگی میں حق کے لئے جینے کی زبردست خواہش کارفرما ہے مگر حق یہ ہے کہ ان میں حق کے لئے مر مٹنے کی آرزو، ان کی سب آرزوؤں پر غالب نظر آتی ہے اللہ کے رستے میں مرنے کی دعا اُن کی سب سے پرانی دعا ہے جو تحریر و تقریر، نظم و نثر، جلوت و خلوت اور قید و آزادی میں بے اختیار اُن کے عمق روح سے نکلتی رہی ہے۔ ایک فاضل[1] نے آپ کی شاعری کو "سیاسی تصوف" سے مملو بتایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شاعری بھی آپ کے "اسلام" اور "شوق شہادت" کی مظہر ہے مگر چونکہ آپ کی روح اسلام اور آپ کے سودائے شہادت کا میدان عمل اجتماعی زندگی کے مختلف شعبے رہے ہیں لہٰذا ان کی روحانیت انھیں وادیوں اور گھاٹیوں میں جلوہ گر رہی ہے اور حق یہ ہے کہ حقیقی روحانیت اور حقیقی تصوف بجز اجتماعی زندگی کے دوسری جگہوں میں ناممکن اور ناپید ہے۔ خانقاہ نشین خداوندان تصوف کے بارے میں خود فرماتے ہیں:-

کہہ دو ان گوشہ نشینوں سے بھریں گوشۂ قبر — نہیں دنیا میں جگہ آپ سے بیکاروں کی!
کہہ دو رضواں سے نہیں سایۂ طوبیٰ درکار — اپنی جنت ہے یہیں چھاؤں میں تلواروں کی!

جوہر

---

(۱) پروفیسر سید عبداللہ ایم اے

یہ آپ کے "اسلام" ہی کا کرشمہ ہے کہ زندانِ بیجاپور میں اپنی عزیز بچی آمنہ کی مہلک علالت کی خبر سن کر تڑپ جاتے ہیں اور ایک دردناک دعائے اسیری لکھتے ہیں مگر فرماتے ہیں۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن "اس کو" نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

اور دوسری جگہ:

میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں زندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے!

اس سے آگے بڑھ کر وہ خود دین وملت کی فتح و شکست اور کامیابی وناکامیابی سے بے پرواہ ہوجاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں:

ہم اس کے ہو لئے تو پھر اب اس سے کیا غرض وہ جیت اپنی فوج کو دے یا کہ ہار دے؟

سینچا تھا اس چمن کو لہو سے حسین نے اب چاہے اس چمن کو خزاں دے بہار دے! جوہر

رفتہ رفتہ یہ روحِ اسلامیت "عشق" میں تبدیل ہوجاتی ہے اور آپ اس کی تصویر اور ساتھ ہی خود اپنے نفس کی تصویر ان اشعار میں کھینچتے ہیں:

عشق ہی باعثِ تکوینِ جہاں ہے غافل! تو نے جانا کہ یہ اک شغل ہے بیکاری کا!

عاشقوں کے لئے ہے دار ہی دارُوئے شفا عشق کی طب میں دوا نام ہے بیکاری کا

دل وجاں سونپ چکے ہم تجھے اے جانِ جہاں اب ہمیں خوف ہی کیا اپنی گرفتاری کا

اجل استادہ ہے بالیں پہ مریضِ غمِ عشق! آنکھ تو کھول ذرا، وقت ہے بیداری کا

عشق بن کر جئے تو خاک جئے زندہ وہ ہے جو اُن پہ مرتا ہے!

نام پر اس کے سب جو دے بیٹھا وہی اک ہے جو نام کرتا ہے!

وقفِ مومن ہے آزمائشِ عشق اس میں پورا وہی اترتا ہے

جس کو دنیا نے نامراد کہا وہی ناکام کام کرتا ہے؛

قلزمِ عشق میں گرا سو گرا اس کا ڈوبا کہیں ابھرتا ہے؟

مئے اسلام کا بھلا جوہر نشہ چڑھ کر کہیں اترتا ہے؟

اقبال اور جوہر — "قال" اور "حال"

اس ذیل کی ایک دوسری عجیب حقیقت اقبال اور جوہر کی روحانی وحدت ہے۔ عموماً جوہر کی زندگی اقبال کے آتش فشاں "قال" کا زلزلہ انگیز "حال" رہی ہے مگر خصوصی طور پر اُن کی "زندگی"۔ ۔ ۔ اقبال کے ان اشعارِ شعلہ آفریں کی عملی تفسیر ہے کہ:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ۔۔۔ ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی!
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ ۔۔۔ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے ۔۔۔ سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی!
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ ۔۔۔ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب ۔۔۔ اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے ۔۔۔ گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی!
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب ۔۔۔ اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنگار تو!

جو صداقت کے لئے مرنے کی جس دل میں تڑپ ۔۔۔ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار ۔۔۔ اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے!
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار ۔۔۔ تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے!
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب ۔۔۔ تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے!

اقبال

ان آتشیں اشعار کا اگر کوئی نورانی مصداق ہوا ہے تو پھر وہ جوہر کے سوا اور کون ہے؟ حضرت علامہ اقبال خود فرماتے ہیں:

جلوۂ او تا ابد باقی بچشمِ آسیاست ۔۔۔ گرچہ آں نورِ نگاہ خاور از خاور گزشت

"داستانِ عشق" جوہر کی اپنی زبان سے — ۱۹۲۷ء کے ۱۰ جون کو آپ نے اپنی عمر کی پنجاہ سالہ سالگرہ کی

تقریب پر ہمدرد میں اپنی گذشتہ اور موجودہ زندگی پر ایک تبصرہ لکھا اور اپنی آئندہ کی تمناؤں کو بھی پیش کیا۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"جس سال سے میدان صحافت میں قدم رکھا ہے ذیابطیس جیسے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہوں اور جو راحت و آرام سکون و بے فکری اس کا مقابلہ کرنے کے لئے درکار ہیں وہ مفقود ہیں۔ اعضا میں اب قوت باقی نہیں ہے۔ حافظہ اب بجد خراب ہوگیا ہے . . . اور گو سال گذشتہ میں چار مہینے صاحب فراش بھی رہا، تب بھی ملک و ملت کے کاموں میں شرکت کی اور بیٹھے بیٹھے بلکہ لیٹے لیٹے بھی وہ خدمات انجام دیتا رہا جو کانگرس اور خلافت کے سلسلے میں مجھ سے متعلق تھیں۔ اسی حالت میں حج و زیارت کا شرف بھی نصیب ہوا اور اسی دن جس دن موتمر اسلام نے رسمی افتتاح کے بعد اپنا اصلی کام شروع کیا۔ آدھے جسم پر بے حسی پیدا ہو گئی اور وہ بھی قلب والے آدھے حصہ میں اور میں سمجھا کہ میاں نے اپنے گھر بلا کر ہمیشہ کے لئے مہمان نوازی فرمائی مگر موت نصیب ہوکر "جنت المعلی" میں سونا نصیب نہ ہوا۔ دوسرے ہی دن سے موتمر کے جلسہ میں شریک ہوا اور جو کچھ ہو سکا کیا۔ اس کے ختم ہوتے ہی زیارت روضۂ رسول کے لئے نکلا تو راستہ میں وہ دنبل نکلا جس سے خیال ہوا کہ شاید اس سوراخ سے ملک الموت تشریف لانے والے ہیں اور جنت المعلی کی جگہ "جنت البقیع" میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہمانداری کرائی جائیگی۔ مگر جو موت مکہ معظمہ میں نصیب نہ ہوئی تھی وہ مدینہ منورہ میں بھی میسر نہ آئی . . . اس ذات پاک سے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشت استخواں کے لئے دو مشت خاک پاک نصیب ہوجائے تو بڑا کرم ہوگا لیکن اگر اس سعادت سے محروم رہوں تب بھی یہ تو آج حکم ہوجائے کہ جس بندۂ خدا کا نام محمدؐ اور علیؓ کے اسمائے گرامی پر آج سے پچاس سال پیشتر ہم نے رکھوایا تھا اس کو اب جتنے دن اور جینا ہے محمدؐ اور علیؓ کے دین کے لئے جلایا جائے . . . اور جہاں کہیں بھی موت آئے اسی راستے میں آئے جس میں محمدؐ اور علیؓ کو موت آئی تھی۔

---

(۱) جنت المعلی۔ مکہ معظمہ کا مشہور تاریخی قبرستان جہاں اصحاب رسول کے مقابر ہیں۔

(۲) جنت البقیع مدینہ منورہ کا مشہور تاریخی قبرستان جس میں اکثر اکابر، انصار، مہاجرین اور اہل بیت مدفون ہیں

از ہمدرد سالگرہ نمبر ۱۷ ؍ جون ۱۹۲۷ء جبکہ مولانا جوہر پچاس سال کی عمر کو پہنچے تھے۔

"دنیائے کربلا" | مگر ہر آئیڈیلسٹ کے آگے ایک اسوۂ عمل شخص ہوتا ہے اور جوہر کے آئیڈیل۔ راہ حق میں شہادت کے آگے بھی ایک نمونہ عمل تھا جو اُن کی روح کو متحرک و متلاطم اور ان کے قلب کو مضطرب و ملتہب رکھا کرتا تھا اور وہ "کربلا" کا اسوۂ عالی تھا۔ "کربلا کو جوہر ایک طرف راہ حق میں قربانی، فداکاری اور جانسپاری یعنی "کامل اسلام" کا عالی شان آئیڈیل یقین فرماتے تھے اور دوسری جانب وہ اس حادثہ کبریٰ کو تاریخ اسلام اور تاریخ انسانیت کا ایک عظیم الشان اجتماعی انقلاب تصور فرماتے تھے کیونکہ نظام اسلام۔ خلافت راشدہ پر آخری ضرب رومانی ہرقلیت اور ایرانی کسرانیت نے کربلا ہی میں لگایا تھا جس کے صدمہ سے اسلام پالیٹی (نظام اجتماع) پھر ابھر نہ سکا مگر جس کی تجدید جوہر کی زندگی کی سب سے بڑی مثبت اور ایجابی آرزو تھی۔ پس کربلا جوہر کی نگاہ میں راہ حق میں قربانی اور شہادت اور سب سے اول و آخر اسلامی جمہوریت کا کلمہ تھی۔ جوہر شہادت کربلا کی صحیح روحانیت اور حقیقی معنویت کے نشہ سے سرشار تھا اور جوہر کا خانوادہ ایک خدمت گذاران حق کا خانوادہ ہے جس کی بانی اور مربیہ حضرت بی اماں رحمۃ اللہ علیہا تھیں اور جس کے چھوٹے بڑے تمام اعضائے خدمت حق کو اپنی اپنی زندگیوں کا مآل قرار دئے رکھا۔ آج اس ملک میں وطن خواہی، حق دوستی اور فی سبیل اللہ خدمۃ خلق کے اندر کوئی خاندان اُن سے ممتاز نہیں ہے۔ خدمت ملی کے جذبہ کی انتہائی ترقی یہ ہے کہ علی برادران اور ان کے کنبہ کی پبلک اور پرائیویٹ لائف ایک ہی ہے، مولانا جوہر اور شوکت کے نجی اور گھریلو خطوط بھی جو بستر مرگ تک سے تحریر ہوئے ہیں وہ درد ملت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ خصوصیت حضرت مولانا محمد علی جوہر کو کربلا کے اولیاء حق سے کتنا قریب کر دیتی ہے اور پھر اُن کی راہ حق و حریت اور جادۂ حب انسانی و اخوت جہانگیری میں غریب الوطنی کی شہادت اُن کو دراصل ان کی منزل کربلا سے کاملاً ہمدوش اور ہمکنار بنا دیتی ہے کیونکہ کربلا جوہر کی بصیرت میں ایک منزل اور مطلوب کا نام ہے نہ کہ ماتم و شیون کی چیز ہے۔ یہ تشنگان شہادت اور عشاق حق کی ایک "دنیائے راز" ہے

۱۷ ؍ جون ۱۹۲۷ء کو حضرت جوہر نے اپنی پنجاہ سالہ سالگرہ منائی تھی اور اس تقریب پر اپنی مجاہدانہ

زندگی پر ایک ریویو ہمدرد میں لکھا تھا جس کا ایک اقتباس اوپر درج ہوا۔ اس سالگرہ کے بعد مولانا جوہر سخت علیل ہوئے اور بمشکل یورپ صحت یابی کے لئے بھیجے گئے۔ ۱۹۲۷ء کے اواخر میں یورپ اور ترکیہ سے واپسی میں آپ نے فلسطین، سوریہ اور عراق عرب کے تمام شہدائے اسلام کے مشہدوں پر حاضری دی اور ہر جگہ آنسوؤں کا سیلاب بہا بہا کر خلافت راشدہ کی احیا کی دعا اور اس راہ میں خود شہید کربلا کے اسوۂ شہادت کی پیروی میں جاں بحق ہونے کی آرزو کا اظہار کیا اور جب سید الشہدا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہد پر پہنچے تو بے اختیار ہو گئے! اور حالت بیخودی میں زندانِ بیجاپور کے یہ اشعار آپ کی زبان پر جاری ہو گئے اور یہ دراصل روح جوہر کی ایک عریاں تصویر اور قلب جوہر کا ایک عکس ناطق ہے۔

بے تاب کر رہی ہے تمنائے کربلا — یاد آ رہا ہے بادیہ پیمائے کربلا!
ہے مقتلِ حسین کی اب تک وہی بہار — ہیں کس قدر شگفتہ یہ گلہائے کربلا!
اس باغ میں خزاں کا نہ ہوگا گزر کبھی — کیا رنگ دیکھئے ابھی دکھلائے کربلا!
بنیاد جبر و قہر اشارے میں ہل گئی — ہو جائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا!
روز ازل سے ہے یہی اک مقصد حیات — جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا!
جو راز کیمیا ہے نہاں خاک میں اُسے — سمجھا ہے خوب ناصیہ فرسائے کربلا!
مطلب فرات سے نہ آب حیات سے — ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا!
کوثر کے انتظار میں ہوں کب سے تشنہ کام — مجھ پر بھی اک نظر شہ والائے کربلا!
کرنے کو یوں ہزار کریں سینہ کو یاں — ہے چند ہی کے واسطے دنیائے کربلا!

جوہر مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز
اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا!

یہ والہانہ تمنائے شہادت کس بے نظیر شان سے پوری ہوئی۔ کچھ قریب کے ناظرین اور مشرقِ عرب کی زبانِ خلق سے ہی سننے کے لائق ہے:۔

ڈیلی ایکسپریس لندن | "میں اپنے وطن عزیز کی آزادی، سرسبزی، خوشی اور امن وسکون کا خواہشمند ہوں اور دنیائے اسلام میں ایک عالمگیر اتحاد واتفاق کا متمنی ہوں"

"یہ آخری الفاظ تھے جو مولنا محمد علی کی زبان پر مرتے دم جاری رہے۔ مولنا محمد علی موت کے آغوش میں انگلستان تشریف لائے تاکہ گول میز کانفرنس میں شرکت فرماکر اپنے ملک وملت کی بہترین خدمت انجام دیں۔ ان کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آخری وقت بالکل قریب ہے اور اُن کو بتایا گیا کہ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے لیکن باوجود اس کے روحانیت کے اُس جذبہ کے ماتحت جو اہل مشرق سے مخصوص ہے آپ نے زندگی کی آخری رات بھی ڈیلی گیٹوں کو اپنا آخری اور الوداعی پیغام لکھوانے میں گزار دی۔ تاکہ کسی طرح سے فرقہ وارانہ پیچیدگی کو سلجھا کر اپنا در وطن کی آخری خدمت انجام دیں۔ آپ نے لندن ہوٹل میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، والیان ملک اس قائداعظم کی بالیں پر اشکبار تھے۔ ایک ہاتھ اپنی عاشق زار بیگم کے ہاتھ میں اور دوسرا اپنے شیدائی برادر بزرگ کے ہاتھ میں، جو کہ تمام آئرلینڈ سے سفر کرتے ہوئے موت سے چند ہی گھنٹے پہلے پہنچے تھے۔"

"ہندوستانی شاہزادے بار بار کمرے میں آتے اور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے تھے! لیکن موت آہی پہنچی اور وہ ابدی نیند میں سو گیا!"

نیوز کرانیکل لندن | "آپ کی وجیہہ اور پرشوکت وضع قطع، دیوہیکل زبردست شخصیت اور رعد کی سی گرجنے والی آواز قصر سینٹ جیمس کے حاضرین کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ وہ ڈھیلا ڈھالا، بھورا سا منقش اور قراقلی کی خوشنما ٹوپی چمکتے ہوئے ہلالی نشان کے ساتھ کیسی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ جب نومبر گزشتہ کی ابتدا میں آپ برطانیہ تشریف لائے تو موت کے مونھ میں تھے لیکن اس سے جنگ کرتے ہوئے چنانچہ جب گول میز کانفرنس میں آپ تقریر کر رہے تھے تو اُن کے برادر بزرگ مولنا شوکت علی اپنے گراںڈیل اور پرہیبت جسم کے ساتھ سہارا دئے کھڑے تھے... موت مونھ کھولے سامنے کھڑی ہے اور آپ درحقیقت اُس کے مونھ میں ہیں لیکن ہندو مسلم مصالحت کے لئے تادم واپسیں مصروف جہاد ہیں۔"

ڈیلی ہیرلڈ، لندن۔ آرگن سرکاری لیبر پارٹی | "مولٰنا محمد علی کی موت سے کل صبح گول میز کانفرنس کا سب سے بڑا بہادر، عظیم الشان اور نہایت دلیر لیڈر چل بسا! اس دیو ہیکل اور جانباز لیڈر کا جسم عنصری تو ہندوستان سے چلتے وقت ہی متعدد مہلک بیماریوں کا گھر بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے رائے دی کہ ایسا لمبا سفر خطرناک ہے۔ لیکن جانباز سپاہی موت کے آغوش میں وطن کی خدمت کے لئے چل ہی پڑا۔ ساتوں سمندر پار کا صعوبت خیز سفر ایک زبردست قوت ارادی کے ساتھ کٹ گیا تو آپ نے انگلستان پہنچتے ہی کہا کہ "میری بیوی جو کہ غیر زبان کا ایک لفظ بھی بول نہیں سکتی آج پہلی مرتبہ پردہ سے باہر آکر میرے ساتھ آئی ہے کہ میری تیمارداری کرے یا مجھے سپرد خاک کرے" ہم زبردست قوت ارادی اور استقلال کا ایک عظیم الشان مظاہرہ سمجھتے ہیں کہ ایسی حالت میں وہ بستر سے اٹھ کر گول میز کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور وہاں وہ شاندار تقریر فرمائی جو صفحۂ تاریخ پر آب زر سے لکھی جائے گی"

لارڈ پیل (رکن قدامت پسند پارٹی) سابق وزیر ہند | "ہم مولٰنا محمد علی کی جرأت و استقلال کے قائل ہیں کہ آپ نے اس حالت میں یہ طویل سفر اختیار کیا جبکہ وہ موت کو ہر دم اپنے ساتھ ساتھ دیکھ رہے تھے کس جوانمردی اور ہمت کے ساتھ آخری وقت تک اُس کو نباہتے رہے خدمتِ عامہ کا کبھی کم نہ ہونے والا جذبہ آپ کے دل میں تھا"

لارڈ ریڈنگ (رکن لیبرل پارٹی) سابق وائسرائے ہند | "مولٰنا محمد علی کی معجز بیان اور زبردست شخصیت سے ذاتی طور پر ملاقات مجھے انگلستان میں ہی حاصل ہوئی ہے۔ جب وہ ایک بات کو یقینی طور پر تسلیم کر لیتے تھے تو پھر اُس کے لئے دھڑ بندہ جاتی تھی۔ بسا اوقات ہمیں اُن کی وجہ سے مشکلیں پیش آئیں لیکن اب میں اُن کی جرأت، استقلال اور صبر کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں کہ باوجود صحت کی انتہائی خرابی کے وہ مادر ہند کی آئینی ترقی کے لئے اس کانفرنس میں شامل ہوئے اور اپنے اصول پر جان لڑاتے ہوئے ایک "شاندار موت" سے ہمکنار ہوئے!"

لارڈ سانکی (رکن لیبر پارٹی، لارڈ چانسلر یعنی صدر ہاؤس آف لارڈ، صدر پریوی کاونسل اور صدر فیڈرل کمیٹی)

"محمد علی ایک ایسا لیڈر تھا جس کو لوگ تہ دل سے پیار کرتے تھے اور جو بات اس نے اپنے خیال میں

حق اور مناسب سمجھی اس کو پورا کرنے کے لئے جان لڑا دی۔ افسوس ہے کہ اپنے قول و فعل سے اپنے ملک کی آخری خدمت کرتا ہوا یہ جانباز سپاہی اپنی سرزمین سے اتنی دور غریب الوطنی میں فوت ہو گیا۔ مجھے فخر ہے کہ آپ نے مجھے اپنے بستر مرگ پر تبادلۂ خیالات کے لئے بلایا۔ ضعف اور نقاہت تو اس قدر تھی کہ میں بیان کرنے سے قطعاً قاصر ہوں۔ لیکن اس نازک ترین وقت میں بھی آپ کو اپنی مطلق فکر نہیں تھی اگر فکر تھی تو ہندوستان کی۔ امیدیں تھیں تو ہندوستان کے متعلق اور آرزوئیں تھیں تو ہندوستان سے وابستہ۔ ہم میں سے بہت سے اصحاب ایسے ہیں جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں آپ کے ساتھ پڑھتے رہے اور ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ آپ اصول کے لئے جئے۔ اصول کے لئے صعوبتیں اٹھائیں۔ اور اصول کے لئے مر مٹے!"

ویجوڈ بین (وزیر ہند)	نے وفات سے ایک مہینہ قبل مولانا سے پرائیویٹ ملاقات کے بعد یہ بیان دیا۔

"جس طرح ہندوستانی اور اسلامی معاملات کو مولانا محمد علی نے مجھے سمجھایا وہ ابتک کسی نے بھی نہیں سمجھایا تھا۔ مولانا نے عجیب و غریب انکشافات کئے، قوت استدلال مولانا محمد علی سے بہتر کسی میں نہیں۔ اور صاف گوئی تو ایسی ہے کہ اس شخص کے نزدیک شاہ و گدا دونوں برابر ہیں۔ حاکم کے سامنے اس کی یا اس کی حکومت کی خامیاں اس طرح بیان کر دیتا ہے جس طرح غریب کے سامنے اس کے معائب کی تشریح"۔ وفات کے بعد وزیر ہند نے اعلان کیا: "مولانا محمد علی کو خوب معلوم تھا کہ دست اجل ان کی طرف دراز ہو چکا ہے مگر انھوں نے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ ہندوستان کی خدمت میں انھوں نے ہنسی خوشی حدود عالم کو عبور کیا۔ پرانے سال کے آخری دن اپنے معالجوں کی عدول حکمی کرتے ہوئے احباب کی ایک جماعت کو مدعو کیا اور اپنے بستر مرض سے جو ان کا بستر مرگ ثابت ہوا انھوں نے ہمیں خطاب کیا۔ انھوں نے کمال اخلاص سے وسیع تر آزادی اور بہتر مفاہمت کے لئے اصرار کیا۔ مولانا محمد علی ایک عظیم الشان "مسلم" ایک عظیم الشان "وطن خواہ" اور ایک عظیم الشان "پیغامبر انسانیت" تھے اور انھوں نے بڑی شجاعت سے عالم مفاہمت و مصالحت کی خاطر جان دی ہے!"

انگلشمین کلکتہ	"ہندوستانی سیاست کا طوفانی پیٹرول" The strong Petrol of Indian Politics.

کلکتہ میونسپل گزٹ | "ایک پیدائشی مجاہد۔ ایک عظیم الشان فرزند ہند۔ جس نے ملک کے لئے دکھ بھرا اور ملک ہی کے واسطے جان قربان کر دی . . . ایک شہید وطن خواہی۔ ایک شہید بین الملی اور ایک شہید فریضۂ عامرہ!"

تاریخ انسانیت میں بے نظیر عالمگیر ماتم!

"تاریخ انسانیت میں بہتیرے دوستداران بشر اور شہدائے حق ہو گزرے ہیں مگر حق یہ ہے کہ آج تک مشرق و مغرب میں اُن کا ایسا وسیع پر خلوص اور عام اور عالمگیر ماتم نہیں ہوا ہے جیسا کہ اس شہید انسانیت کا کیا گیا ہے۔ سلطنت برطانیہ عظمیٰ کے شہنشاہ جارج پنجم اور اُن کے وزرا و امرا اور مشہور لیبرل لیڈر مسٹر لائڈ جارج جیسے برطانوی اعظم و اکابر اور جارج برنارڈشا وغیرہ جیسے ائمہ ادب و فکر سے لے کر غلام ہندوستان کے وائسرائے بہادر اور وطنی زعما مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، پنڈت مالوی اور والیان ملک سب نے ان کا پر خلوص ماتم شخصی محبت اور پریم کے ساتھ کیا ہے۔ مسلمانان ہند کا ماتم چنداں قابل تعجب نہیں کہ مرحوم اُن کے اپنے تھے اور انھوں نے اپنے آبا و اجداد کا گھر اجاڑ کر ملت کی آنکھوں میں اپنا گھر بنایا تھا۔ البتہ بقول مسٹر ہنری واٹسن (ایڈیٹر اسٹیٹس مین کلکتہ) "یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بر اعظموں اور تمام دنیا کی ملتوں اور مذہبوں کے زعما کا بیت المقدس میں ایک ہندوستانی "معلم وطن خواہ" (Teacher Patriot) کی شہادت پر لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر ماتم کرنا اور آنسو بہانا ایک ایسا عجیب، اہم، اعظم اور اثر انگیز منظر پیش کرتا ہے جس کو چشم فلک نے آج تک نہیں دیکھا ہے۔ بیت المقدس یہودیت۔ عیسائیت اور اسلام کا مشترکہ حرم ہے اور مولانا محمد علی کے مدفن نے پہلی بار ان کو ایک مشترکہ ماتم میں متحد کیا ہے یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ مدفن ہند اور قدس کو مربوط کرے گا اور آئندہ اتحاد عالم اور اتحاد انسانیت کا ایک نشان اکبر ثابت ہوگا کیونکہ مرحوم کا آئیڈیل دراصل وحدت انسانی تھا۔ دنیا کے شاہوں اور شہنشاہوں کی اموات پر سرکاری رسمی ماتموں کو اس جہانگیر ماتم سے کیا واسطہ جو حُبِ انسانیت اور خدمت خلق کی راہ میں بہادرانہ اور رضاکارانہ شہادت کے اعتراف میں شرق و غرب میں آپ سے ظاہر ہوا۔ مولانا جوہر مصری نہیں تھے مگر سلطنتِ مصر اُس کے قومی لیڈر و اکابر و جمہور کا والہانہ

محبت کے ساتھ ایک دو شب کے لئے نعش جوہر کو اپنی آنکھوں اور دلوں میں پذیرائی کرنے کا منظر اُن
کو شاہ مصر سے بھی ممتاز بنا رہا تھا۔ ممالک اسلامیہ سے مصر، نجد و حجاز، یمن، شرق یردن، عراق،
سوریہ، مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، ایران، ترکستان، افغانستان، ترکیہ وغیرہ کے نمائندگان
اس شہید حق کے ماتم میں شریک ہیں جس طرح ایک بھائی دوسرے کے غم میں شریک ہوتا ہے ہز ایکسیلنسی
حافظ وہبہ وزیر مختار سلطنت عربیہ و نجد و حجاز و عسیر، حسین رؤف بے (جو یونانی ترکی جنگ کے دوران
میں انگورہ گورنمنٹ کے صدر اعظم اور جنگ عظیم میں انور پاشا کی حکومت میں وزیر بحر تھے اور اس سے
پہلے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں حمیدیہ کے کپتان کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہیں) ہز ایکسیلنسی
جنرل محمد ولی محمد خاں فاتح کابل، وزیر مختار افغانستان، ہز ایکسیلنسی عفیفی پاشا وزیر مختار مصر اور ہز ایکسیلنسی
آقائے وزیر مختار سلطنت ایران پایتان لندن میں آپ کے جنازہ کو سنوارنے اور کندھا دینے میں شریک
اور سلطان فواد مصری، پرنس محمد علی پاشا برادر عباس حلمی پاشا سابق خدیو، شاہ نادر افغانی، رضا شاہ
پہلوی، امیر فیصل شاہ عراق، پرنس عمر طوسوں پاشا، علامہ عبدالعزیز ثعالبی قائد اعظم تونس، آل عبدالقادر
الجزائری اور سلطانی خانوادۂ عثمانیہ کے شاہزادے سب اس جہانگیر غم ملت میں ماتم گسار تھے! آخر
اس غلام ہندوستان کے اس فرزند میں وہ کونسی بات تھی جس نے مشرق و مغرب کے دلوں کو
ہلا دیا اور اُن کے تخئیل پر قابض ہو گیا؟ آخر آپ کی موت میں وہ کونسی ادائے خاص تھی جس پر سفید
فام مغرب، سیہ فام افریقہ اور زرد فام ایشیا لوٹ گیا؟

جواب یہ ہے کہ محمد علی جوہر کی زندگی ایک کامل مومن و مسلم اور سچے محب ملک و ملت و انسانیت
کی زندگی تھی۔ آپ کی عظیم فطانت و ذہانت وسیع علم و پُر سحر بیان و زبردست قوت فکر و عمل سب کچھ
اللہ اور اس کی مخلوق کے لئے وقف تھی۔ ملت اسلام اور ہندوستان سے وطنی اور مذہبی قربت کی
وجہ سے خاص لگاؤ تھا مگر حقیقۃً آپ کی زندگی ایک محب حق و انسانیت کی زندگی تھی۔ آپ نے زندگی
بھر جہاد کیا اور مرتے دم تک جہاد کیا اور اپنے ارادہ، ضمیر، عشق اور ایمان کی تمام طاقتوں کے ساتھ حق کے
لئے اپنا سب کچھ کھونے، تجنے اور مٹانے کا فیصلہ کیا اور حقیقۃً آپ نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

سب کچھ تج دیا اور سب کچھ مٹا دیا - دولت بھی! صحت بھی!! اور آخر کار اپنی جان مستعار بھی!!! ایسی عظیم الشان قربانی اور اُس کی ایسی جہانگیر توقیر و تعظیم! ایک ہندی کا انتقال اور عرب و عجم، شرق و غرب کا نالہ و شیون! قدس میں جامعہ اسلامیہ بیادگار جوہر کا قیام اور ہندوستان میں اس کی تیاری! کیا ماضی و حال میں کسی نے ایسی شاندار موت ایک ایسی شاندار زندگی کے بھرا تمام کی صورت حاصل کی ہے؟ اور کیا اس شہادت کبریٰ نے "روایات ملیہ" میں ایک زندگی بھر کے مجاہد حق اور شہادت فی سبیل اللہ کی ایک "دوسری دنیائے کربلا" کی روشن، ایمان پرور اور زندگی بخش روایات کا باب نہیں تیار کیا ہے؟

میں اس سرسری مطالعہ کو تین مزید اقتباسات پر ختم کروں گا جس سے یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ مولانا جوہر نے "روایات ملیہ" میں کتنا بے بہا اور لازوال ترکہ کا اضافہ کیا ہے۔

محمد علی کے آنسوؤں کا سیلاب!

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی فاضل مصر: "کوئی نہیں جس نے مسلمانوں کی خدمت محمد علی سے زیادہ کی ہو، کوئی نہیں جس نے مسلمانوں پر محمد علی سے زیادہ آنسو بہائے ہوں۔ وہ کون مجلس ہے جس نے محمد علی کے آنسوؤں کا سیلاب نہیں دیکھا؟ وہ کون مسلمان ہے جس نے محمد علی کی روح کی بیقراری نہیں دیکھی؟ روتے روتے اُس کی آنکھیں تقریباً پھوٹ چکی تھیں۔ کڑھتے کڑھتے اس کے اعضائے رئیسہ تقریباً معطل ہو چکے تھے۔ ایک طرف بیماریوں کی یورش، دوسری طرف افکار کا ہجوم! آخر شمع حیات ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی!"

ہمارے آنسوؤں کا دریا!

"ہم رو رو کر آنسوؤں کا دریا بھی بہا دیں مگر محمد علی کے ایک آنسو کا بھی معاوضہ ادا نہیں کر سکتے جو اُس نے درد امت میں بہایا تھا! ہم ماتم کرتے کرتے اپنے سینے پاش پاش بھی کر ڈالیں، مگر محمد علی کی ایک آہ کی قیمت بھی پوری نہیں کر سکتے جو غم ملت میں اُس نے کھینچی تھی!"

"ہمارے آنسو اور ہماری آہیں اپنے محسن کے لئے ہوں گی لیکن محمد علی کے آنسو اور آہیں ایک

غافل اور ناشکرگزار قوم کے لئے تھیں۔ ہم اس لئے روتے ہیں کہ فیض کا دروازہ ہم پر بند ہوگیا۔ اور وہ اس لئے روتا تھا کہ ہماری بلا طلب ہم پر اپنے فیض کا دروازہ کھول دے۔ ہم اپنی محرومی پر ماتم کرتے ہیں اور وہ اپنی عطائی تعمیم کے لئے ماتم کرتا تھا!"

شاہزادہ محمد علی پاشا برادر عباس حلمی پاشا سابق خدیو مصر نے تابوت کے سامنے فرمایا: "اللہ کا سلام اُس روح طاہر پر۔ ہمارے جلیل القدر بھائی۔ اسلامی مجاہد۔ محمد علی رہنمائے ہندیہ۔۔۔۔ مرحوم اپنے جسم کے ساتھ ہم سے جدا ہوگئے ـــ وہ جسم جسے جہاد نے کمزور اور بالآخر فنا کرڈالا۔ لیکن انھوں نے اپنے جسم کی قربانی سے ایک ایسا "روحانی نور" پیدا کردیا ہے جس کی روشنی ہمیشہ مسلمانوں کو راہ حق دکھلائے گی!

محمد علی پورے استحقاق کے ساتھ شہدائے مجاہدین کے درجے پر فائز ہوئے ہیں کیونکہ وہ ضرورت کے وقت مسلمانوں کے حقوق کی مدافعت پر بلند ہمتی اور بے نظیر شجاعت کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ جب کبھی جہاد کی دعوت بلند ہوتی تھی، محمد علی، اللہ کے راستے اور اللہ کے دین حق پر جان و مال سے قربان ہونے کے لئے تیار ہوجاتے تھے!"

وزیر محمد علی پاشا سابق وزیر اوقاف دولت مصریہ نے تابوت کے سامنے کھڑے ہوکر فرمایا:۔ اُس رہنما کی تاریخ حیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی بلند نفسی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اُسے مجبور کیا کہ اپنے وطن اور دنیائے اسلام کے لئے انصاف حاصل کرنے کے واسطے جہاد کرے وہ انصاف سے واقف ہوا، اور اُس کا عاشق بن گیا اور عمر بھر اس کی طلب میں سرگرداں رہا! لیکن اس عشق میں اُس نے خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اتنی محنت کی جو برداشت سے زیادہ تھی، آخر وطن اور اسلام کی راہ میں جان قربان کرڈالی!

"لہٰذا وہ اپنے وطن، تمام مشرق، اسلام اور پوری انسانیت کا شہید ہے!"

تو نفسی تفسیر ان آفاق گیر تاثراتِ ممزوجہ کی یہ ہے کہ آج جمعیۃ بشری نے اپنے ایک عظیم الشان

مورث اعلیٰ کو کھویا ہے اور ساتھ ہی اس نباغِ عظیم سے ہی ایک ورثہ غیر فانی حاصل کیا ہے ـــ محمد علی جوہر کی فطین، مجاہدانہ اور انقلاب آفریں "شخصیت" کو گنوایا ہے اور ایک جہادِ جلیل اور شہادت بے عدیل کی "روایت" کو اپنایا ہے۔

حیاتِ انسانی، "ایک فردِ حیات" سے محروم مگر ایک چشمہ زار زندگی سے بہرہ یاب ہوئی ہے!

تو پھر کیا وہ اُمتِ مسلمہ جو ایسی روایت آفریں قیادتِ اجتماعی کی پیدائش پر قادر ہے اپنے روشن اور بلند مستقبل سے مایوس ہو سکتی ہے؟ نہیں۔ کہ خود انسانیت کی فلاح و نجاح کی آخری امیدگاہ، جیسا کہ جارج برنارڈ شا نے اعلان کیا ہے کہ مذہب اسلام اور اس کے جوہر جیسے پیامبرانِ انسانیت کے روایاتِ عمل اور پیغاماتِ ایمان و بصیرت ہیں!

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی مراکز

(گذشتہ سے پیوستہ)

فاتحانہ عالی دماغی غیر عرب یعنی جماعت موالی کے مقابلہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ عراق کی اکثریت اہل فارس پر مشتمل تھی اور عرب نسبتہً قلیل تھے۔ یہ تو گذر چکا کہ اس عہد میں سرزمین عراق میں جزیہ دینے والوں کی تعداد ۵ لاکھ ۵۰ ہزار کے قریب تھی۔ اُن کے علاوہ اور بھی اہل فارس تھے جو حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور جزیہ دینے والوں میں اُن کا شمار نہ تھا۔ یہ لوگ موالی کہلاتے تھے۔ قاعدہ یہ تھا کہ موالی قبائل عرب کے حلیف بن جاتے اور اُن کی حمایت کے مستحق قرار پاتے۔ یہ لوگ ان قبائل کے موالی کہلائے جاتے تھے اور وہ ان کے لئے روسا کا درجہ رکھتے تھے۔ حلیف ہونے کے بعد موالی بھی اپنے حلیف قبیلوں کی عصبیت میں اُن کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ بلاذری لکھتا ہے "اہل فارس کی فوجی جماعت جو اساورہ کے نام سے مشہور ہے شروع میں بنی ازد کی حلیف بنی، بعد ازیں انھوں نے دریافت کیا کہ بنی ازد اور بنی تمیم میں آنحضرت صلعم اور ان کے خلفاء کرام کو نسبت میں کون قریب پڑتے ہیں اور نیز ان میں سے کس نے آپ کی زیادہ مدد کی ہے چنانچہ بنی تمیم کا نام بتانے پر وہ ازد کی بجائے اُن کے حلیف بن گئے"۔ عراق کی تمام صنعت و حرفت اور تجارت انھیں لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ عرب حکمراں عنصر تھا اور تلوار اور سیادت اس کے پاس تھی۔

اہل عرب کی اس قبائلی عصبیت نے جہاں وہ گئے اور جس جگہ وہ آباد ہوئے اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ کوفہ کے عرب اور اُن کے حلیف موالی کوفہ کی عصبیت کا دم بھرتے تھے اور اسی طرح بصرہ والے بصرہ کو سراہتے تھے۔ ہر جماعت اپنے شہر کے طبعی اوصاف اور محل و قوع کی خوبیاں کو فخریہ بیان کرتی اور جو جو معرکے انھوں نے سر کئے تھے اُن پر فخر کیا جاتا اور جس کسی کو آنحضرت

صلعم کے صحابہ کرام کی تشریف آوری اور نزول اجلال کی سفارت ملی تھی وہ اس پر رجز خوانی کرتا اور تو اور علم و فضل میں بھی مفاخرت اور چشمک کا بازار گرم تھا۔ اس بیان کی تفصیل اور اہل بصرہ و کوفہ کی باہم چشمک آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے لئے ہمذانی کی کتاب البلدان کا مطالعہ کیجئے۔
اس مفاخرت علمی اور باہمی نوک جھونک، رشک و چشمک اور اپنے اپنے شہر کے علما، کی طرفداری و عصبیت کے مظاہر علوم کی متعدد شاخوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ علم نحو میں بصری و کوفی فقہ میں بصری و کوفی، مذاہب دینی میں بصری و کوفی اور ادب و شعر میں بصری و کوفی کی تقسیم جلوہ فرما ہے۔ اعشی انی کہتا ہے۔

اکسع البصری ان لاقیتہ	انما یکسع من قل و ذل
واجعل الکوفی فی الخیل و ا	تجعل البصری الا فی الثقل
واذا فاخرتمونا فاذکروا	ما فعلنا بکم یوم الجمل
بین شیخ خاضب عثنونہ	وفتی ابیض وضاح فل
جاءنا یخطر فی سا بغۃ	فذبحناہ ضحی ذبح الحمل
وعفونا فنسیتم عفو نا	وکفرتم نعمۃ اللہ الرجل

۱۔ جہاں کہیں کسی بصری سے ملاقات ہو اُس کے چپت رسید کرو۔ کیونکہ قلیل التعداد اور کم سوادوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔
۲۔ کوفی کو شاہسواروں میں جگہ دو اور بصری کو ہمیشہ فالتو لوگوں میں رکھو۔
۳۔ جب تمھیں ہم سے مفاخرت کا خیال ہو تو جنگ جمل[1] میں جو ہمارے ہاتھوں سے تم پر گذری تھی اس کو یاد کرو۔

---

(۱) یہ جنگ حضرت علی اور حضرت عائشہ و طلحہ و زبیر کے درمیان واقع ہوئی۔ آخر الذکر فریق کو ہزیمت ہوئی یہ اصل میں بصرہ کی کوفہ کے سامنے پسپائی تھی۔

۴۔ صاحب قریش کی داڑھی خون میں رنگین تھی اور سفید رو حسین نوجوان بڑی طمطراق والا۔
۵۔ زوردار زرہ پہنے اینٹھتا ہوا ہماری طرف آیا۔ ہم نے تڑکے ہی دنبے کی طرح اس کو ذبح کر ڈالا۔
۶۔ اس کے بعد ہم نے تم سے درگذر کیا۔ لیکن تم ہمارے عفو و کرم کو بھول گئے اور تم نے خدائے بزرگ و برتر کی نعمت کی ناشکری کی۔

مجموعی حیثیت سے عراق کو تمام بلادِ اسلامیہ سے زیادہ علمی و ادبی سرمایہ نصیب ہوا۔ البتہ بعض باتوں میں اہل حجاز اس سے بازی لے گئے۔ عراق کی اس فراوانی علم کے کئی ایک اسباب ہیں:

۱۔ اسلامی عراق کی تکوین جیسا کہ ہم اس سے پیشتر عرض کر آئے ہیں۔ قدیم تہذیبوں کے کھنڈرات پر عمل میں آئی تھی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اسلامی فتح کے بعد اہل عراق بیدار ہوتے اور اپنے قدیم تمدن اور علوم کو جو انھیں ورثہ میں ملے تھے زندہ کرتے، فتح سے قبل عراق کے طول و عرض میں سریانی عنصر پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی درسگاہیں بھی تھیں جہاں یونانی علوم کی تعلیم ہوتی تھی، نیز عراق میں مسیحی فرقے بھی تھے اور ان میں عقائد کے متعلق بحث و جدل کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ خاص حیرہ میں یونانی تہذیب کی تربیت یافتہ افراد جو رومی و ایرانی جنگوں میں اسیر ہوئے تھے، بھی موجود تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ ان اجتماعی کیفیات سے جدید افکار و آرا کو معرض وجود میں نہ لایا ہو۔ خیالات تھے اور ضرور تھے۔ اسلامی فتوحات کے تموج میں یہ خیالات وقتی طور پر دب گئے لیکن مٹے نہیں اور امن و امان کی بحالی پر انھوں نے سر نکالا۔ یہ بھی واضح رہے کہ اہل عراق کی کثیر التعداد آبادی زمرہ اسلام میں منسلک ہو گئی تھی۔ اسلامی تعلیمات نے ان کے قدیم افکار و آرا کو آہستہ آہستہ اسلامی رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ جو خیالات اسلام کے موافق تھے اُن کو فروغ حاصل ہوا اور مخالف خیالات دن بدن مرجھاتے گئے۔

یہ حقیقت بھی مخفی نہ رہے کہ عراق جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے زرخیز اور شاداب خطہ تھا وسائل زندگی کی یہاں افراط تھی اور لوگ بآسانی تحصیل علم کے لئے وقت نکال سکتے تھے۔

۲۔ دولت امیہ کے عہد میں عراق باہمی جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کا میدان کارزار بنا رہا اس میں سلطنت اسلامیہ کے تمام حصے اس سے پیچھے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد سے عراق برابر مشتعل رہا۔ حضرت عائشہؓ، طلحہؓ و زبیرؓ نے بصرہ کا رخ کیا اور حضرت علی نے کوفہ کو مرکز بنایا۔ پھر کوفہ و بصرہ کے درمیان جمل کا معرکہ ہوا۔ حضرت امام حسینؓ حجاز سے کوفہ روانہ ہوئے اور کربلا میں ان کو شہید کیا گیا۔ مختار الثقفی نے کوفہ ہی سے انتقام حسین کا نعرہ بلند کیا۔ عبداللہ بن زبیر کے بھائی مصعب نے بصرہ پر قبضہ کر کے کوفہ پر چڑھائی کی اور مختار مقتول ہوا۔ عبدالملک بن مروان اموی خلیفہ نے شام سے عراق پر فوجکشی کی اور مصعب قتل ہوئے۔ عبدالرحمٰن ابن عوف نے اموی خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور کوفہ پر مسلط ہو گیا۔ حجاج نے مقابلہ کیا اور شکست دی اس انقلاب گردی میں قدرتی طور پر لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہو گا کہ کون فریق غلطی پر ہے اور کون راستی پر؟ اور اس بارے میں ایک دوسرے سے دریافت بھی کرتے ہوں گے۔ قاتلین عثمانؓ حق پر تھے یا وہ گناہ کے مرتکب ہوئے؟ حضرت عثمان کی شہادت میں حضرت علی کا بھی ہاتھ ہے؟ حضرت عائشہ و طلحہ و زبیر حضرت علی کے خلاف جنگ کرنے کے مجاز تھے؟ مسئلہ تحکیم میں حضرت علی کہاں تک حق بجانب تھے۔ والی عراق حجاج کے ظلم و ستم اور قتل و غارت کی وجہ سے خلیفہ وقت یعنی عبدالملک کے خلاف خروج کرنا جائز ہے؟ جن لوگوں نے ایسا کیا اور عبدالرحمٰن بن اشعث کا ساتھ دیا وہ حق بجانب تھے؟ الغرض اس قسم کے بیسیوں سوالات و بحثیں اٹھتی ہوں گی۔ بلکہ ان کی بہت کثرت تھی۔ یہاں تک کہ مساجد میں درس و تدریس کے حلقوں میں یہ سوالات پوچھے جاتے تھے چونکہ عراق میں ان جنگوں کا جولانگاہ تھا اس لئے طبعًا عراقی ان بحثوں میں زیادہ پڑتے تھے۔ چنانچہ اسی سرزمین سے پیشتر مذاہب دینی کا آغاز ہوا۔ اس بیان کی تفصیل آگے آئے گی۔

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ اس فتنہ و فساد کے زمانہ میں علماء وقت کے سرتاج حسن بصریؒ سمجھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ چند لوگ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ اس سرکش (حجاج) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ اس نے بیجا کشت و خون کیا۔ ظلمًا لوگوں کے مال غصب کئے

نماز ترک کی۔ اور ایسا کیا اور ویسا کیا الخ۔ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ ایک شخص نے حسن بصری سے پوچھا کہ اس جنگ میں یزید بن مہلب اور عبد الرحمٰن بن اشعث کا ساتھ دیں یا نہ؟ آپ نے جواب دیا نہ اس کا ساتھ دو نہ اُس کا۔ اس پر اہل شام میں سے ایک شخص بول اٹھا، اور نہ امیر المومنین کا۔ اے ابو سعید (حسن بصری کی کنیت ہی) پھر وہ طیش میں آیا اور ہاتھ کو بڑے زور سے حرکت دے کر کہا اور نہ امیر المومنین کا ساتھ دیں، "ہاں"، آپ نے کہا "اور نہ امیر المومنین کا"، اس، اس قبیلے کی بیشتر نظیریں صفحات تاریخ پر نظر آتی ہیں۔

۳۔ اہل عراق جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ عربوں اور موالی پر مشتمل تھے۔ عربوں کے ہاتھ میں سیادت تھی۔ موالی دینی اور دنیوی اغراض کے لئے عربی سیکھنے لگے۔ اُن کی قدرۃً یہ خواہش ہوگی کہ عربی سیکھنے کا کوئی آسان طریقہ ہاتھ آجائے۔ چنانچہ علم نحو کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ ظاہر ہے کہ عراق میں علم نحو کی داغ بیل پڑنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ بہ نسبت حجاز اور شام کے۔ اہل حجاز کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ اُن کی زبان کی درستگی کے لئے قواعد کا وجود عمل میں آتا اور نیز شام کے مقابلہ میں عراق کے موالی عربی زبان کے زیادہ شائق تھے۔ چنانچہ یہ معلوم ہی ہے کہ عربی کی طرف اہل فارس کا سب سے زیادہ رجحان تھا۔ واضح رہے کہ اسلام سے پہلے عراق میں سریانی ادبیات کا چرچا تھا اور اس زبان میں قواعد پہلے سے موجود تھے۔ چنانچہ اُس میں کوئی دقت نہ تھی کہ سریانی قواعد کے طرز پر عربی زبان کے قواعد وضع کئے جاتے اور خصوصاً جب کہ عربی اور سریانی دونوں زبانیں لسانی تھیں۔ کوفہ سے پہلے بصرہ میں علم نحو کی بنیاد پڑی اور بادیہ عرب کی قربت کی وجہ سے اہل بصرہ کوفہ والوں سے جو سرچشمہ فصاحت یعنی صحرائے عرب سے نسبتہً دور تھے بازی لے گئے۔

اب کوفہ و بصرہ کی علمی سرگرمیوں کی مختصر تاریخ ملاحظہ ہو۔

کوفہ یا رسول اللہ صلعم کے صحابہ کرام کی کافی تعداد کوفہ میں رونق افروز ہوئی۔ علمی لحاظ سے ان سب میں مشہور حضرت علی و ابن سعود تھے۔ حضرت علی تو دوران قیام عراق میں سیاسیات میں الجھے رہے اور جنگ و قتال نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر سکتے۔ البتہ ابن سعود

نے سرزمین کوفہ میں سب صحابہ کرام سے زیادہ اپنا علمی اثر چھوڑا، آپ سابقین اسلام میں سے تھے بلکہ مروی ہے کہ اُن افراد میں سے جو آنحضرت پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ آپ چھٹے تھے۔ ابن سعود ہجرت حبشہ اور بعد ازیں مدینہ کی ہجرت میں شریک تھے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے اور آپ کی خدمت بجالاتے تھے۔ اور نیز آنحضرت نے ابن مسعود کو اپنے مکان میں اس وقت اجازت دی جب کہ دوسروں کا جانا ممنوع تھا۔ آپ کو قرآن سے غیر معمولی شغف تھا۔ زیادہ تر اس کو پڑھتے اور اس میں غور کرتے۔ یہی سبب تھا کہ احکام اسلام کے فہم و ادراک۔ معانی قرآن اور احادیث نبوی کے سمجھنے میں اکابر صحابہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں اہل کوفہ کی تعلیم و تدریس ان کے سپرد کی۔ کوفہ کے کثیر التعداد لوگ آپ سے فیضیاب ہوئے۔ آپ کے گرد کافی شاگرد جمع ہوگئے تھے جو آپ سے پڑھتے اور آپ کے نقش قدم پر چلتے۔ اس جماعت کے متعلق سعید بن جبیر کا قول ہے "ابن مسعود اور اُن کے رفقا کوفہ کی مشعلیں ہیں"، آپ قرآن کا درس دیتے اس کی تفسیر بیان کرتے اور جو کچھ آنحضرت سے سنا تھا اس کو سناتے۔ جب احکام و مسائل اُن کے سامنے پیش ہوتے تو قرآن و حدیث سے استنباط کرتے اور فتوے دیتے اور اگر کوئی مسئلہ ان ہر دو میں نہ ملتا تو ذاتی رائے سے کام لیتے۔ اس مدرسہ سے جو چھ بزرگ مشہور ہوئے ان کا علمی شغل درس قرآن تھا اور احکام و مسائل میں یہی لوگ فتوے دیتے تھے۔ ان کے نام نامی یہ ہیں۔

علقمہ۔ اسود۔ مسروق۔ عبیدہ۔ حارث بن قیس۔ عمرو بن شرحبیل۔ کوفہ میں عبداللہ بن مسعود کے بعد یہ چھیوں بزرگ تعلیم و تدریس میں ان کے جانشین ہوئے۔ یہ یاد رہے کہ تمام علما کوفہ ابن مسعود کے شاگرد نہیں تھے۔ بلکہ ان میں سے بہت سے مدینہ میں رہے اور وہاں حضرت عمرؓ۔ علیؓ۔ ابن عباسؓ معاذؓ اور دوسرے صحابہ سے اکتساب علم کیا۔ مذکورہ بالا اسباب کا نتیجہ تھا کہ کوفہ جلیل القدر علمی سرگرمیوں کا جولانگاہ بنا۔ بعد ازیں اس سرزمین نے شریح۔ شعبی۔ نخعی اور سعید بن جبیر ایسی بلند پایہ شخصیتیں پیدا کیں۔ علمی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ ترقی و پختگی کے منازل طے کرتا ہوا امام ابو حنیفہ کی ذات گرامی

میں اوج کمال تک پہنچا۔

بصرہ۔ کوفہ کی طرح بصرہ کو بھی کثیر التعداد صحابہ کے نزول اجلال کی سعادت ملی۔ صحابہ کی اس جماعت کے علمی سرتاج ابو موسیٰ اشعری اور انس بن مالک تھے

ابو موسیٰ اشعری یمنی تھے۔ مکہ میں آئے اور یہیں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ہجرت حبشہ میں بھی شریک تھے۔ اہل علم صحابہ میں آپ کی ممتاز حیثیت تھی۔ آپ بصرہ میں اترے اور یہاں مسند تعلیم و تدریس بچھائی۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے انس بن مالک سے پوچھا "اشعری کو کس حال میں چھوڑا"، کہنے لگے "لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں"، حضرت عمرؓ فرماتے لگے" ابو موسیٰ ضعیف ہیں لیکن یہ بات ان کو نہ کہنا"، مقدمات میں اُن کے فیصلوں اور فتووں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن و حدیث میں معرفت سے زیادہ اُن کو فقہ میں مہارت تھی۔ انس بن مالکؓ انصاری تھے۔ آپ بچے ہی تھے کہ رسول اللہ صلعم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ اس کے بعد تقریباً دس سال تک حضرت انس کو آپؐ کی حضوری خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ آخر میں بصرہ میں منتقل ہو گئے اور عمر دراز پائی۔ بصرہ کی جماعت صحابہ میں سب سے آخر میں آپ کا وصال ہوا۔ یہ واقعہ اغلباً ۹۲ھ ہجری کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انس بن مالک ابو موسیٰ اشعری اور عبداللہ بن مسعود کے مبلغ علم تک نہ پہنچ سکے۔ آپ کو فقہ سے زیادہ حدیث میں ملکہ حاصل تھا۔

خلافت بنی امیہ میں حسن بصری اور ابن سیرین کی تابناک شخصیتوں نے مدرسہ بصرہ کو خاص امتیاز بخشا۔ یہ دونوں بزرگ موالی تھے۔ ہر دو نے علمی سرمایہ اپنے حلیفوں سے ترکہ میں پایا۔ حسن بصری، حضرت زید بن ثابت کے موالی تھے۔ زید موصوف کی عظمت اور اُن کا فضل و کمال صحابہ کرام میں مسلم تھا۔ ابن سیرین کو انس بن مالک کا مولیٰ بننا نصیب ہوا۔ اُن کی شخصیت حضرت انسؓ کی علمیت اور اُن کے فیوض صحبت کی پرتو تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں میں بصرہ میں حسن بصری اور ابن سیرین کا سکہ چلتا تھا۔ اول الذکر پختگی اخلاق۔ نیک روی۔ علم و حکمت اور فصاحت و بلاغت کے اوصاف جمیلہ کے شاندار مظہر تھے۔ اُن کی پختگی اخلاق تو اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اظہار رائے میں

وہ کسی مادی قوت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ یزید بن معاویہ کی خلافت کے متعلق آپ سے پوچھا گیا۔ ابن سیرین اور شعبی نے تو اظہار رائے سے احتراز کیا لیکن حسن بصری ہی وہ بزرگ تھے جنھوں نے صریح طور پر اپنی رائے عدم موافقت کا اعلان کر دیا۔ اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے جنگ و قتال میں شریک کرنے کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے دونوں جماعتوں سے علیحدہ رہنے کی رائے دی۔ اُس کے مزید اصرار پر کہ کیا امیرالمومنین کا بھی ساتھ نہ دیں آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ امیرالمومنین کا بھی ساتھ نہ دو۔ حسن بصری زور بیان اور خطابت میں حجاج کے مدمقابل سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا سب سے نمایاں وصف آپ کا زہد و اتقا تھا۔ اسی بنا پر اہل تصوف آپ کو صوفیائے کرام میں شمار کرتے ہیں اور آپ کے کلموں اور دانائی کے مقولوں کو بطور ضرب المثل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح معتزلہ آپ کو رئیس المعتزلہ مانتے ہیں کیونکہ آپ نے مسئلہ قضا و قدر پر بحث کی اور نیز یہ کہ آپ شخصی ارادہ کی حریت کے قائل تھے۔ آپ فقیہ بھی تھے جو نئے نئے مسائل روزمرہ کی زندگی میں درپیش آتے۔ اُن کے متعلق لوگ آپ سے فتوے طلب کرتے۔ قصہ گوئی میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ قصہ گویوں کے سرتاج اور ان میں سے صادق ترین سمجھے جاتے ہیں الغرض حسن بصری کی شخصیت ان تمام گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی اور ہر خصوصیت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ۱۱۰ھ میں جب حسن بصری کا انتقال ہوا تو تمام اہل بصرہ اُن کے جنازے کی معیت میں تھے۔ یہاں تک کہ نماز عصر پڑھنے کے لئے مسجد میں کوئی نمازی نہ رہا۔

ابن سیرین نے زید بن ثابت، انس بن مالک اور شریح وغیرہ سے تحصیل علم کیا۔ آپ قابل وثوق محدث اور فقیہ تھے۔ مسائل و احکام میں آپ سے فتوے طلب کئے جاتے تھے۔ ابن سیرین حسن بصری کے معاصر تھے۔ کبھی تو دونوں میں خوب دوستی رہتی اور کبھی ناچاقی بھی ہو جاتی ناچاقی کا سبب ان دونوں بزرگوں کی طبیعتوں کا اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ حسن بصری صاف گو اور برملا کہنے والے تھے۔ آپ عصبی مزاج کے تھے۔ غم و غصہ کے اثرات سے بہت جلد متاثر ہوتے اور اپنے عقیدہ کے اظہار میں خواہ مخواہ خطرناک سے خطرناک سیاسی مسئلہ کے متعلق ہو ذرا باک نہ کرتے

ان کے مقابلہ میں ابن سیرین حلیم الطبع اور ہنس مکھ بزرگ تھے۔ ایسی بات کہنے سے جس پر تعزیر و مواخذہ ہو ہمیشہ احتراز کرتے۔ بعد میں ان کو خوابوں کی تعبیر کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی اور اُن کے نام سے اس موضوع پر ایک جعلی کتاب بھی منسوب کر دی گئی۔ ابن الندیم نے الفہرست میں کتاب مذکورہ کا ذکر کیا ہے اور اُسے ابن سیرین کی تصنیف گردانا ہے لیکن متقدمین کی تالیفات مثلاً طبقات ابن سعد میں تعبیر رویا کے سلسلہ میں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ آپ نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ حسن بصری اور آپ دونوں سرداران بصرہ شمار ہوتے ہیں۔

ان مذہبی اور علمی سرگرمیوں کے علاوہ سرزمین عراق میں ایک اور تحریک بھی سرگرم عمل تھی جسے ہم عہد جاہلیت کی یادگار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس تحریک میں روح تو عہد جاہلیت کی کام کر رہی تھی، البتہ جامہ اسلامی تھا۔

بصرہ و کوفہ میں جو عرب قبائل آباد ہوئے تھے۔ اُن میں رؤسا کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ ان رؤسا کا وجود بہت حد تک عہد جاہلیت کی روایات ریاست کا مظہر تھا۔ قبائل میں اُسی طرح اُن رؤسا کی سیادت تسلیم کی جاتی تھی اور افراد قبیلہ ان کے گرد جمع ہوتے۔ جنگ و صلح میں انھیں کا حکم چلتا۔ شعرا ان رؤسا کے دروازوں پر کھڑے ہوتے اور اُن کی شان میں قصائد کہے جاتے اور اُن کے دشمنوں کی ہجو کی جاتی وغیرہ وغیرہ۔ ان سرداران قبائل میں سے جن کے جاہ و جلال، مروت و کرم اور فیاضی کے شہرے تھے۔ یہ لوگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بنی تمیم بصرہ کے رئیس احنف بن قیس۔ عبدالقیس بصرہ کے رئیس حکم بن منذر۔ بنی بکر بصرہ کے رئیس مالک بن مسمع۔ قیس بصرہ کے رئیس قتیبہ بن مسلم۔ تمیم کوفہ کے رئیس محمد بن عمیر بن عطارد۔ بنی ضبیہ میں سے حسان بن منذر کندہ کوفہ کے سردار حجر بن عدی اور محمد بن اشعث وغیرہم۔ یہ اور ان کے ہم مثل دوسری شخصیتیں اس عہد کی شاندار ادبی زندگی کا سرچشمہ تھیں۔ انھیں کے دم سے شعر و سخن میں جاہلی رنگ نظر آتا تھا اور اکثم بن صیفی (ایام جاہلیت کے نامور حکیم) کی سی حکم بیان کی جاتی تھیں

ان ادبی سرگرمیوں کی تفصیل کے لیے اس وقت گنجائش نہیں البتہ ان ممتاز شخصیتوں کا ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ ان کی زندگی اور اُن کے ادبی اثرات کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے لیے احنف بن قیس کی شخصیت کو منتخب کرتے ہیں۔

احنف بن قیس جیسا کہ گزر چکا ہے۔ بنی تمیم بصرہ کے رئیس تھے ان کے متعلق مشہور تھا کہ احنف کے برافروختہ ہونے پر ایک لاکھ تلواریں نیام سے نکل پڑتی ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ برافروختگی کا سبب کیا ہے۔ جس قبیلہ سے احنف کی پرخاش ہوتی بنی تمیم اس سے بھڑ جاتے اور اُن کے ایک اشارہ پر تلواریں نیام میں ہوتیں۔ امیر معاویہ احنف کی قدر و منزلت اور اُن کے اثر و نفوذ سے واقف تھے۔ اس لیے اُن کو اپنا مقرب بنایا اور ان پر اعزاز و اکرام کی بارش کی۔ امیر معاویہ نے اپنے والیوں کو بھی اس امر کی وصیت کر دی تھی اور جس والی پر احنف ناراض ہوتے اس کو معزول کر دیتے امیر معاویہ احنف کی سخت بات بھی برداشت کرتے اور اُن کی مدارات ملحوظ رکھتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امیر معاویہ نے اُن سے کہا کہ خدا کی قسم احنف! جب جنگ صفین کا خیال آیا ہے تو دل میں سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ (جنگ صفین میں احنف امیر معاویہ کے خلاف حضرت علی کے ساتھ تھے) احنف نے جواب دیا "خدا کی قسم معاویہ! وہ دل جو تم سے نفرت کرتے تھے ابھی تک ہمارے سینوں میں موجود ہیں۔ اور وہ تلواریں جو تمھارے خلاف نکلی تھیں، ہنوز نیاموں میں ہیں۔ اگر تم لڑائی کی طرف ایک انگل بھر اقدام کرو گے تو ہم ایک بالشت بڑھیں گے۔ اور اگر تم اُس کی طرف چلو گے تو ہم دوڑیں گے

احنف بن قیس کا وجود بصرہ کے مخالف قبائل کو متحد کرنے میں بہت کام آتا تھا۔ آپ علو ر اخلاق فضل و کرم اور مروت میں ضرب المثل تھے۔ چنانچہ آپ کی وفات پر کہا گیا "آج عرب کا راز جاتا رہا) اور اُن کی بیوی نے بین میں کہا "تو قبیلہ کا سردار تھا اور خلیفہ کے ہاں قوم کا نمائندہ تیری بات سنی جاتی اور تیری رائے پر چلا جاتا" احنف کی امثال اور پرحکمت مقولوں سے کتب ادب بھری پڑی ہیں۔ اُن میں سے چند ایک مثال کے طور پر بیان کیے دیتے ہیں "وہ لذت لاحاصل ہے جس کا انجام ندامت ہو"، "جس نے بے نیازی اختیار کی وہ کبھی محتاج نہ ہوا"، "اس سے پہلے کہ تمھارا

کوئی غیر محاسبہ کرے خود آپ اپنا محاسبہ کرلو" وصال کے بعد قطع تعلق کتنی تکلیف دہ چیز ہے" "راہ حق میں خرچ کرو اور دوسروں کے خزانچی نہ بنو" "حاسد کو سکون اور جھوٹے کو عزت کہاں"

عراق میں فلسفی سرگرمیوں کا ذکر مذاہب وعینیہ کے سلسلہ میں کیا جائے گا۔ یہ فلسفی تحریک عہد عباسیہ میں اوج کمال کو پہنچی اور سرزمین کوفہ نے بڑے بڑے فلاسفر پیدا کئے۔ اور ادھر بصرہ سے اخوان الصفا کی جماعت پیدا ہوئی۔

شام۔ شام کا خطہ زرخیز اور ذی ثروت ہے۔ یہاں کی زمین سرسبز و شاداب۔ پانی کی کثرت اور آب وہوا معتدل ہے۔ اس ملک میں کثیر التعداد انبیاء مبعوث ہوئے اور اُن کی تعلیمات کا یہاں خوب اشتغال ہوا۔ اور نیز یکے بعد دیگرے کئی قوموں اور کئی تہذیبوں نے یہاں ڈیرے جمائے اور اس ملک میں اپنے علمی اور تمدنی اثرات چھوڑتی گئیں، سب سے پہلے فینقین آئے اور پھر کلدانی، مصری عبرانی، یونانی اور رومانی قوموں نے اس کو آماجگاہ بنایا۔ ان میں سے ہر ایک قوم اپنی مستقل تہذیب و تمدن رکھتی تھی اور اُن کے ہاں علوم وفنون کی بھی کمی نہ تھی۔ اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ شام میں علوم وفنون بکثرت پھیلے۔ اہل ملک ان علمی سرگرمیوں میں برابر کے ساجھی تھے بلکہ وہ اس میدان میں حکمرانوں کے مدمقابل تھے اور انھوں نے اس میں اپنے جوہر دکھائے۔ سرزمین شام میں صور انطاکیہ، صیدا، بیروت، حمص اور دمشق علمی و فلسفی تحریکات کے مرکز شمار ہوتے تھے۔ شام کو فینقین سے حروف کتابت ترکہ میں ملے۔ بنی اسرائیل نے دینی تعلیمات دیں۔ یونان نے فلسفہ وحکمت کی طرح ڈالی اور رومانیوں نے اس زمین میں قانونیت کا بیج بویا۔ چنانچہ اہل شام کی عقلی تشکیل میں ان اثرات نے گہرا اثر ڈالا۔ علاوہ ازیں شام اور آس پاس کے ممالک میں سریانیوں کی علمی جدوجہد اور ان کی مساعی نشر واشاعت کا بیان اس سے قبل ہو چکا ہے۔

اسلام سے قبل اہل عرب شام سے کافی واقف تھے اور اس زمین کی زرخیزی اور ثروت

---

(۱) شام میں فلسطین کا خطہ بھی شامل ہے۔ عرب جغرافئین مثلاً یاقوت وغیرہ اسی طرف گئے ہیں۔

کی کشش انھیں اپنے آغوش میں کھینچ بھی لائی تھی۔ چنانچہ دوسری صدی قبل از مسیح حمص اور بطرہ میں عربی ریاستیں معرض وجود میں آئیں۔ بعدازیں پانچویں صدی عیسوی میں بنی غسان کا دور دورہ ہوا اور انھوں نے اس قطعۂ زمین میں اپنے قدم جمائے اور جب سرزمین شام میں نصرانیت کا پرچار رہا تو وہ بھی دائرہ عیسائیت میں داخل ہوگئے اور مسیحی تہذیب و تمدن سے بھی کچھ بہرہ ور ہوئے۔ یہ لوگ آرامی و عربی زبانوں سے مخلوط زبان بولتے تھے اور اپنے آپ کو اہل شام میں سے تصور کرتے تھے اور جزیرہ عرب سے زیادہ شام اور اہل شام سے ان کو ارتباط و تعلق تھا۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ ہی شام میں عربی زبان اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت شروع ہوگئی اور شامی عرب قریش کی زبان (قرآنی زبان) سیکھنے لگے۔ نیز دیگر باشندوں نے بھی اپنی مروجہ زبانوں آرامی و یونانی کے علاوہ عربی بولنا اور اس کو سیکھنا شروع کیا۔ اسی طرح نصرانیت اور یہودیت کی جگہ اسلام نے لینی شروع کی اور اہل شام میں سے کثیر التعداد لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ دوسرے نو مفتوحہ ممالک کی طرح یہاں بھی تعلیمات اسلام کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس کے لئے حضرت عمرؓ نے مبلغ یا معلم بھیجے۔

امام بخاری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ یزید بن ابوسفیان نے حضرت عمر کو لکھا کہ اہل شام کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو انھیں قرآن کی تعلیم دیں اور مسائل فقہ بتائیں۔ چنانچہ حضرت عمر نے معاذ ابوالدردا اور عبادہ بن صامت کو ارسال فرمایا۔ فی الحقیقت یہ تینوں بزرگ مدرسہ شام کے اولین مؤسس ہیں۔ حضرت معاذ کی علمی سرگرمیاں تو آپ مدرسہ مکہ کے سلسلہ میں ملاحظہ کرچکے ہیں۔ ان کی آخری زندگی شام میں درس و تدریس کے شغلہ میں گذری۔ عبادہ بن صامت انصاری تھے اور قرآن جمع کرنے کی سعادت آپ کو بھی نصیب ہوتی تھی۔ ابوعبیدہ بن جراح افواج اسلامیہ کے سپہ سالار نے حمص کی ولایت پر آپ کو متعین کیا۔ اور اس کے ساتھ فلسطین کی کرسی قضا بھی آپ کے سپرد کی گئی۔ عبادہ بن صامت تعلیمات اسلام کی معرفت تامہ رکھنے والے صحابہ میں سے شمار ہوتے تھے۔ اور اس کے ساتھ حق کی حمایت میں بہت سخت تھے۔ آپ نے امیر معاویہ کے بہت سے

کاموں کو ناپسند فرمایا اور حضرت عثمان سے ان کی شکایت کی۔ آپ کا شام میں انتقال ہوا۔
ابو الدرداء انصاری تھے اور اہل علم صحابہ میں سے تھے۔ آپ کو دمشق کا قاضی مقرر کیا گیا۔
اور اسی شہر میں آپ نے وفات پائی۔

مذکورہ بالا تینوں بزرگ شام کے مختلف شہروں میں تقسیم ہوئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں ان لوگوں نے حمص میں قیام کیا وہاں سے ابو الدرداء تو دمشق چلے گئے اور معاذ فلسطین۔ باقی رہے عبادہ صامت وہ حمص ہی میں رہے۔ بعد ازاں وہ بھی فلسطین پہنچ گئے۔ ان کے بعد حضرت عمر نے عبد الرحمٰن بن غنم کو بھیجا تابعین میں سے اکثر علماء انھیں بزرگوں کے شاگرد ہیں ان میں سے مشہور یہ ہیں۔ ابو ادریس خولانی۔ مکحول۔ عمر بن عبد العزیز۔ رجاء ابن حیوٰۃ۔ آخر میں اس مدرسہ سے امام عبد الرحمٰن اوزاعی نکلے۔ یہ امام مالک اور ابو حنیفہ کے معاصر تھے۔ آپ بعلبک میں پیدا ہوئے اور دمشق و بیروت میں پرورش پائی۔ آپ کو امام اہل شام کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اہل شام نے ان کا مذہب اختیار کیا اور مراکش اور اندلس میں بھی اس مذہب کو فروغ حاصل ہوا لیکن امام شافعی اور امام مالک کے مذاہب نے اس مذہب کو پنپنے نہ دیا اور وہ بسرعت راہی فنا ہوا۔

عہد امیہ میں دمشق خلافت کا دار السلطنت تھا۔ قدرتی بات تھی کہ سلطنت کے طول و عرض سے علماء اس طرف کا رُخ کرتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلفاء بنی امیہ نے علمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ نہ کی۔ ان کی سرپرستی صرف شعر و سخن، خطابت اور فنون ادب تک محدود رہی۔ علمی تحریکات اپنے آپ بڑھتی چلی گئیں۔ ان میں سے سب سے اہم دینی علوم کی تحریک تھی۔ جس کی ترقی و فروغ کا سب سے بڑا سبب مذہبی حمیت و جوش تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو آئے دن حلال و حرام میں تمیز کرنے کی ضروریات پیش آتی رہتی تھیں اور اُن نئے نئے حوادث و معاملات سے جن سے ابتدائے اسلام میں انھیں پالا نہ پڑا تھا دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ان کی بنا پر اُن میں مذہبی جستجو اور علمی جدوجہد روز افزوں روبہ ترقی رہی۔

سرزمین شام میں عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے دین پر قائم رہے اور جزیہ اور مالگذاری کی ادائیگی بطیب خاطر منظور کرلی۔ ان میں سے کثیر التعداد مشرف بہ اسلام بھی ہوئے ایک طرف تو یہ نومسلم تھے اور دوسری طرف غیر مسلم عیسائی۔ اور یہ دونوں مسیحی تہذیب و تمدن کے تربیت یافتہ تھے۔ ایک طرف گرجے اور کلیسے تھے اور دوسری طرف مسجدیں آباد ہو رہی تھیں۔ اس دوعملی کا لازمی نتیجہ تھا کہ اسلام اور نصرانیت میں ذہنی تصادم ہوتا۔ اور بحث و مباحثہ اور تکرار و مناظرہ کی بحثیں گرم ہوتیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اس کی شہادت کے لئے مسیحی اہل قلم یحییٰ دمشقی کی تصنیفات مطالعہ فرمائیے۔ اس باہمی تصادم اور متضاد خیالات کی آویزش سے قضا و قدر، جبر و اختیار کے مسائل چھیڑے گئے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق کہ آیا وہ عین الذات ہیں یا اس کے خلاف، بحث و تمحیص ہونے لگی اور غالباً علم کلام کی بنیادی اینٹ یہیں رکھی گئی۔

مصر۔ مسلمانوں نے مصر فتح کیا تو ملک کے طول و عرض میں یونانی رومی تہذیب و تمدن کا دور دورہ تھا۔ اس سے قبل مدرسہ اسکندریہ کی علمی و فلسفی جدوجہد پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ جب مصر کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی تو اہل عرب اس کی زرخیزی اور ثروت کا ذکر سن کر جوق در جوق آنے لگے۔ چنانچہ فسطاط آباد ہوا۔ جس کی آبادی میں وہی قبائلی تقسیم مدنظر رکھی گئی۔ اس کے علاوہ اہل عرب قصبوں اور دیہاتوں میں بھی پھیل گئے۔ اور وہاں اقامت گزیں ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ مصر کے اصلی باشندے یعنی قبطی بڑی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور عربوں اور قبطیوں کے درمیان کثرت ازدواج سے دونوں قومیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہوگئیں اور تفریق نسب مشکل ہوگئی

مسلمانوں کے ورود مصر کے فوراً بعد یہ ملک سیاسی مرکز کے علاوہ اسلامی سلطنت کا ایک اہم علمی مرکز بن گیا۔ لیکن ابتدائے عہد میں یہ علمی سرگرمیاں فلسفی اور دنیوی علوم سے بے تعلق رہیں اس علمی ادارہ کی بھی وہی حالت تھی جو اسلامی سلطنت کے دوسرے اداروں کی۔ سب سے اہم اور قابل توجہ چیز مذہب تھی۔ چنانچہ اس عہد میں مذہب اور مذہبی علوم کا ہر طرف چرچا ہونا لازمی امر

تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یونانی رومانی تہذیب و تمدن جو مصر، شام اور عراق میں پھیلا ہوا تھا۔ فتح
اسلام سے بالکل مٹ گیا اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تہذیب
اسلامی فتوحات کے سامنے ماند پڑ گئی اور مذہب کی پرجوش رو کے مقابلہ میں اس کی کچھ نہ چل سکی
لیکن جوں ہی کہ ملک میں سکون ہوا۔ قدیم رومانی تہذیب نے پھر سر نکالا۔ اور نئی قوت و سرگرمی دکھانی
شروع کی۔ یہ تہذیب تھی تو قدیم لیکن اسلامی اثر و نفوذ نے اس کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اس کے
علاوہ تہذیب مذکور کی اس حیات نو میں جو خیالات و افکار اسلام کے مخالف پڑتے تھے وہ اسلامی مصر
میں جانبر نہ ہو سکے اور خود بخود مٹتے چلے گئے اور غیر مخالف آراء کی نشو و نما میں کوئی قوت حارج نہ تھی
لیکن فلسفی تحریک صحیح معنوں میں دولت امیہ کے آخری اور بنی عباس کے ابتدائی عہد میں پروان چڑھی

صحابہ کرام میں سے جو مصر میں آئے اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مدرسۂ مصر کے
مؤسس بنے عبداللہ بن عمرو بن عاص سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کو رسول اللہ صلعم کی بہت
حدیثیں یاد تھیں۔ آپ ان صحابہ میں سے شمار ہوتے ہیں جن کو آنحضرت کی سب سے زیادہ حدیثیں یاد
تھیں۔ آپ کی عادت تھی کہ رسول اللہ صلعم سے جو کچھ سنتے قلمبند کرتے جاتے۔ مجاہدؒ کا بیان ہے۔
"میں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کے پاس ایک صحیفہ دیکھا۔ میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو
فرمایا کہ یہ سچا صحیفہ ہے۔ اس میں صرف وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلعم سے خود سنیں اور اس میں
میرے اور ان کے درمیان کوئی واسطہ روایت نہیں۔" حدیث کے علاوہ عبداللہ بن عمرو کی معلومات
کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ابن حجر اصابہ میں لکھتے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے کہ عبداللہ توراۃ پڑھتے تھے
ابن سعد طبقات میں شریک سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ کو سریانی پڑھتے دیکھا۔ آپ سے
مدینہ، شام اور مصر میں کثیر التعداد صحابہ اور تابعین نے حدیث روایت کیں۔ جب امیر معاویہ نے ولایت
مصر عمرو بن عاص کے حوالہ کی تو یہ بھی اپنے والد کی معیت میں مصر پہنچے۔ عمرو بن عاص نے مرتے وقت
مصر میں ان کو اپنا جانشین بنایا۔ امیر معاویہ نے پہلے تو بحال رکھا بعد میں برطرف کر دیا۔
عبداللہ بن عمرو حج و عمرہ کے بعد شام آتے اور وہاں سے مصر۔ مصر میں انھوں نے رہنے

کے لئے مکان بنایا۔ آپ اسی میں رہتے اور یہیں وفات پائی۔ ایک روایت کے بموجب آپ کا انتقال عبدالملک بن مروان کے زمانہ خلافت میں ہوا۔ اور مکان ہی میں مدفون ہوئے۔ عبداللہ بن عمرو مدرسہ مصر کے حقیقی مؤسس تھے۔ مصر کے کثیر التعداد لوگوں نے آپ سے اکتساب علم کیا۔ آپ کے شاگرد جو کچھ آپ سے سنتے قلمبند کر لیتے۔ مقریزی لکھتے ہیں "حیوۃ بن شریح سے مروی ہے کہ انھوں نے بیان کیا میں حسین بن شفی بن مانع الاصبحی کے ہاں پہنچا اور وہ کہہ رہے تھے کہ خدا تعالیٰ اس کا ایسا کرے۔ میں نے کہا آخر کیا ہے؟۔ کہنے لگے اُس نے دو کتابوں کا قصد کیا جو ان حدیثوں پر مشتمل تھیں جو شفی نے عبداللہ بن عمرو سے سنی تھیں۔ ایک میں رسول اللہ صلعم نے جو فیصلے کئے اور جو انھوں نے فرمایا تھا درج تھا۔ اور دوسری میں قیامت تک جو حوادث پیش آنے والے تھے ان کا ذکر تھا۔ اس نے دونوں کو لیا اور خولہ[1] اور رباب کے درمیان دریا میں پھینک دیا۔

عہد صحابہ کے بعد مدرسہ مصر میں یزید بن حبیب کی شخصیت نے شہرت حاصل کی۔ آپ نوبہ کے باشندے تھے۔ اصل وطن دنقلہ تھا۔ یزید موصوف نے بہت سے صحابہ سے جو مصر میں اترے تھے علم حاصل کیا۔ کندی لکھتے ہیں کہ آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سرزمین مصر میں حلال اور حرام میں تمیز اور مسائل فقہ کی نشر و اشاعت کی۔ اُن سے قبل صرف فتن و مغیبات پر گفتگو رہتی تھی۔ آپ اور دو اور بزرگوں کو عمر بن عبدالعزیز نے فتوے دینے کے لئے مقرر کیا۔ عربوں نے اس فعل کو ناپسند کیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ موالی تو بام ترقی پر چڑھتے ہیں اور تم اس سے قاصر ہو۔ یزید جنگ و قتال کی تاریخ سے بھی ماہر تھے۔ اور فتح مصر کے متعلق تاریخی معلومات اور اُس کے دیگر امور اور والیوں کی تفصیلی حالات میں آپ کو خاص طور پر درک تھا۔ کندی نے اور علما کے علاوہ آپ سے بھی اپنی کتاب (ولاۃ مصر وقضاتہا) کی تالیف میں مدد لی۔ یزید بن ابی حبیب کے شاگرد دو ہیں

---

(۱) مقریزی ج۱ صفحہ ۳۳۳ ابو سعید بن یونس نے کہا کہ خولہ اور رباب دو بڑی کشتیاں تھیں جو فسطاط کے پل کے سرے پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ اتنی بڑی تھیں کہ ان کے نیچے سے کشتیاں گذر جاتی تھیں۔

عبداللہ بن لہیعہ اور لیث بن سعد بہت مشہور ہوئے۔ اول الذکر عرب تھے اور حضرموت کے باشندے اس حضرموت مصر میں کثرت سے تھے۔ عبداللہ موصوف بہت سے تابعین سے ملے اور اُن سے علم حاصل کیا، آپ جو کچھ سنتے قلمبند کر لیتے۔ کثیر التعداد محدثین مثلاً بخاری اور نسائی وغیرہ آپ کو ثقہ نہیں مانتے۔ ہمارے افسوس ہے کہ مصری اسلامی تاریخ کی بیشتر معلومات انھیں کے ذریعہ پہنچیں اور ان تمام روایات کے یہی رکن رکین ہیں۔ تقریباً ۱۰ سال تک مصر کے منصب قضا پر بھی فائز رہے۔

صحیح ترین قول کے مطابق لیث بن سعد موالی میں سے تھے۔ یہ اصل میں اصفہان کے تھے۔ مرجح قول یہی ہے کہ آپ مصر (قلقشندہ) میں پیدا ہوئے، اور تحصیل علم کی غرض سے بہت سے شہروں کی سیاحت کی۔ آپ مکہ، بیت المقدس اور بغداد تشریف لے گئے اور تقریباً ۹۹ تابعین سے ملاقات کی اور اُن سے حدیثیں روایت کیں۔ امام مالک کے ساتھ بھی آپ کے تعلقات تھے۔ اُن سے خط و کتابت تھی اور فقہ و تشریع کے متعلق خطوط میں اُن سے بحث آرائی ہوتی۔

روایت ہے کہ امام شافعی نے فرمایا کہ لیث فقہ میں مالک سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں لیکن لیث کے ساتھیوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ لیث کا اپنی قوم میں بڑا اعزاز اور قدر و منزلت تھی۔ اہم اور غیر معمولی معاملات میں والی اور قضاۃ ان سے مشورہ لیتے۔ آپ ثقہ سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی صداقت اور امانت میں کسی نے شک نہیں کیا۔ لیث بن سعد کا اپنا مستقل مذہب تھا جو اُن کے نام سے مشہور رہا۔ اہل مصر نے اُس کو اختیار کیا اور اُس کے نقش قدم پر چلے تو سہی لیکن آخر میں یہ مذہب بھی شام کے مذہب اوزاعی کی طرح زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا کہ فتوحات کے بعد سلطنت اسلامیہ کے مختلف شہروں میں صحابہ کرام پھیل گئے تھے۔ ان صحابہ کرام میں سے درس و تدریس کی غرض سے مختلف شہروں کو علماء کے طبقہ نے اپنا مرکز بنایا اور وہاں مدرسوں کی بنیاد رکھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک

اپنی مستقل علمی شخصیت رکھتا تھا۔ اُن کی اس انفرادی شخصیت کا مدرسہ پر اثر پڑنا لازمی امر تھا۔ ان علمی مراکز میں اثر و نفوذ کے اعتبار سے یہ شخصیتیں سب سے فوقیت لے گئی تھیں، مدینہ میں عبداللہ بن عمر، کوفہ میں عبداللہ بن مسعود، مکہ میں عبداللہ بن عباس اور مصر میں عبداللہ بن عمرو بن عاص۔

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مذکورہ بالا بزرگوں میں سے ہر ایک رسول اللہ صلعم کے تمام اقوال او افعال کے علم پر حاوی تھا۔ اور تعلیمات اسلام کے متعلق ہر ایک کے پاس مکمل معلومات تھیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض وقت ایک صحابی رسول اللہ کے پاس ہوتا اور دوسرا نہ ہوتا اور وہ آپ کے ایک فعل کو دیکھتا اور آپ سے حدیث سنتا لیکن دوسرا اس سے محروم رہتا۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک کے پاس کچھ معلومات تھیں اور کچھ نہیں تھیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ بعض شہروں تک چند حدیثیں پہنچیں اور چند نہ پہنچ سکیں۔ صحابہ کے بعد تابعین آئے انھوں نے اُن سے تحصیل علم کی اور علم کی نشر و اشاعت میں ان کے قائم مقام ہوئے۔ ان میں سے بعض نے محسوس کیا کہ چند شہروں میں ایسی حدیثیں بھی ہیں جو دوسروں میں نہیں۔ اس لئے ذخیرۂ علم بڑھانے کی غرض سے ان لوگوں نے بہ کثرت سفر کئے۔ چنانچہ علما میں تحصیل علم کے لئے سفر و سیاحت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مصری مدینہ پہنچتا اور مدینہ کا طالب علم کوفہ۔ اسی طرح کوفہ کے شائقین علم شام کا رخ کرتے اور شامی مصر کا قصد کرتا۔ اس سفر و سیاحت اور علما کے اختلاط و امتزاج نے تمام علمی مراکز کو متحد کرنے میں بڑا کام کیا۔ نیز اس کا یہ اثر پڑا کہ صحابہ کی مختلف علمی شخصیتوں کے پیدا کردہ اثرات کے اختلافات بہت حد تک کم ہو گئے۔ تابعین کے بعد اہل علم کا دوسرا طبقہ آیا اور وہ انھیں کے نقش قدم پر گامزن ہوا۔

اب یہ کہ ان مختلف علمی مراکز میں کیا پڑھایا جاتا تھا؟ اور علمی سرگرمیوں کا دارومدار کن مباحث پر تھا؟ کیا مختلف شہروں کے ماحول نے علمی زندگی کو متاثر کیا؟ شام اور مصر میں یونانی و رومانی تہذیب و تمدن نے علمی تحریک پر کیا اثر ڈالا؟ عراق میں کہاں تک ایرانی تمدن کے اثرات

پڑے ؛ حجازی علمی زندگی کے نشوو ارتقا میں عرب کی سادگی کا کیا اثر پڑا ؟ اسلامی سلطنت کے مختلف حصوں میں فتح سے پہلے جو دینی افکار و آرا پھیلے ہوئے تھے کیا اسلام میں مختلف مذہبی فرقوں کا وجود انھیں کے اثر سے عمل میں آیا ؟ ان دقیق مباحث کو سلجھانے کی انشاء اللہ آئندہ دو بابوں میں کوشش کی جائے گی۔

غزل

از جلیل قدوائی صاحب بی اے (علیگ)

آپ کو میری وفا یاد آئی ۔۔۔ خیر ہے، آج یہ کیا یاد آئی

یاد اُس بت کی بھلائی نہ گئی ۔۔۔ ہاں بھلانے سے سوا یاد آئی

پھر مرے سینہ میں اک ہوک اُٹھی ۔۔۔ پھر مجھے تیری ادا یاد آئی

خوش ہوا تھا نگہ لطف سے دل ۔۔۔ کہ تری طرز جفا یاد آئی

بے رخی پہ تری جب غور کیا ۔۔۔ مجھ کو اپنی ہی خطا یاد آئی

ہاتھ میں ساغر مے آتے ہی ۔۔۔ نگہ ہوش رُبا یاد آئی

جس سے اُس در پہ رسائی ہوتی ۔۔۔ کوئی ایسی نہ دعا یاد آئی

کیوں کس سوچ میں بیٹھے ہو جلیل
کیا پھر اُس بت کی ادا یاد آئی

وضع حدیث

نومبر ۳۰ء کے جامعہ میں مولانا اسلم جیراجپوری کا ایک مقالہ عنوان بالا سے شائع ہوا ہے مضمون کے مطالعہ کے بعد ہر شخص یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے

"اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلاشبہ صحیح ہیں، اس طرح مخلوط ہوگئیں کہ بڑے بڑے نقادوں کے لئے یہ مشکل ہوگیا کہ" اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں"، جامعہ، صفحہ ۴۲۳۔ نومبر ۱۹۳۰ء "

گویا "سچائی کے وہ قطرے" "اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں" اس طرح مدغم ہوئے کہ اس پردۂ عالم پر تحقیق طور پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے حدیث صحیح کے نام سے باور کیا جا سکے، جس کے متعلق یہ سمجھا جا سکے کہ وہ قول رسول ہے، جس کے متعلق یہ اعتماد کیا جا سکے کہ وہ لوث کذب و دروغ سے پاک ہے لیکن کیا واقعات بھی اس دعوے پر شاہد ہیں؟ کیا حقیقۃً یہ دعویٰ ایسا ہے کہ جس پر ایمان لایا جا سکتا ہے؟

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہب کے نام پر، جذبات کے نام پر، قرآن و حدیث کے نام پر آپ کے احساسات سے اپیل کروں اور یہ چاہوں کہ آپ مذکورۂ بالا دعوے کی صداقت اس لئے تسلیم نہ کریں کہ اس سے حدیث پر زد آتی ہے، حدیثیں مشتبہ ہو جاتی ہیں اور اقوال رسول کی جو نعمت عظمیٰ ہمارے پاس تھی وہ چھنی جاتی ہے، اگر وہ دعوے دلائل کی بنیاد پر استوار ہو سکے تو یقیناً ہمیں اس "دفتر بے معنی" کو "مے ناب" میں نہیں بلکہ اسی "جھوٹ اور کذب" کے سیلاب میں بلا تامل غرق کر دینا چاہیے۔ آج کی صحبت میں اسی موضوع پر گفتگو مقصود ہے کہ آیا وہ "جھوٹ اور کذب کا سیلاب" ہے یا حقائق و معارف کا بحر بیکراں؟

یہ حقیقت ہے کہ عہد رسالت میں احادیث کے ضبط و کتابت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی،

اس لئے کہ احتمال تھا کہ قرآن و حدیث آپس میں مخلوط نہ ہو جائیں، اس کے علاوہ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں خود "حدیث ناطق" موجود تھی، یعنی سرکار رسالت کا وجود باجود، جب تک رسالت مآب رونق بخش کارگاہ حیات رہے اس وقت تک حدیثیں منضبط نہیں ہو سکیں اس لئے کہ رسول اللہ کی حیات طیبہ جس وقت تک باقی رہی اس وقت تک استفسار و استصواب سوال وجواب اور پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رہا، نماز کے متعلق کچھ شبہ ہوا کہ "خیط ابیض" اور "خیط اسود" سے کیا مراد ہے، سرکار نے اس کی تشریح فرما دی، امامت کون کرے؟ کس کا حق ہے! کے وقت کی نماز فرض ہوتی ہے، سنتوں کی حیثیت کیا ہے۔ تیمم کس کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ یہ اور اس قبیل کے بیسیوں جزئی سوالات ہیں جن کا جواب قرآن مجید میں نہیں مل سکتا، لامحالہ ہمیں اس "عمل" کو ڈھونڈھنا پڑے گا جسے خود قرآن نے "اسوہ حسنہ" کے نام سے یاد کیا ہے، اور اُس "قول" کی جستجو کرنی پڑے گی جسے قرآن ہی نے "ان ہو الا وحی یوحیٰ" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ جب ہم میں کسی بات میں اختلاف ہو، راہ حق مفقود ہو رہی ہو تو لامحالہ "ردوا الی اللہ ورسولہ" پر عمل کرنا پڑے گا، اب عہد حاضر میں خدا براہ راست ہم پر وحی نازل نہیں کر سکتا کہ وہ ہمارے "تنازعہ" کا خاتمہ کرے، اگر قرآن میں وہ چیز ہمیں نہیں ملتی تو ہم سوا اس کے اور کیا کر سکتے ہیں کہ رسول کی طرف رجوع کریں رسول بھی مرئی اور مادی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں تو چارہ کار سوا اس کے اور کیا رہ جاتا ہے کہ رسول کے اقوال، اس کے اعمال و افعال، اور اس کے بنائے ہوئے راستوں اس کے کئے ہوئے فیصلوں، اور اس کے فرمائے ہوئے ارشادات کو مشعل راہ بنائیں اور اسی کی روشنی میں تلاش و تجسس اور غور و تفحص سے وہ راہ حق ڈھونڈیں جس کے ہم متلاشی ہیں۔

کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ

"وضاعین و کذابین کی ایک بے شمار فوج پیدا ہو گئی، جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی، بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ یہی تھا صفحہ ۲۳۴"

اس صورت میں بھلا حدیث پر استناد کی کیا صورت ہے؟ اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس

مشکوک و مشتبہ صورت مسئلہ میں کمزور پہلو پر عمل کیا جائے؟

جواب نہایت غیر مشتبہ ہے۔ آج ہم بے تامل کذابین وضاعین حدیث کی ایک فہرست پیش کر دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں مسئلہ پر جتنی حدیثیں وارد ہوتی ہیں وہ غلط ہیں، موضوع ہیں، باطل ہیں۔ لیکن ہمارے قول کی بنیاد کیا ہے، ان "وضاعین وکذابین" کے ہم شاہد عینی نہیں، ہم نے نہ انھیں جھوٹ بولتے سنا، نہ وضع حدیث کرتے دیکھا، ہمارا مبلغ علم یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے، نقادانِ فن نے، اور حدیث و اشخاص کے پرکھنے والوں نے متفقہ طور سے ان کے ضعف، کذب اور دروغ گوئی کا پردہ فاش کیا ہے، اس پر اعتماد کریں اور ان لوگوں کو کاذب، وضاع اور نہ معلوم کیا کیا سمجھیں پس معاصرین کے قول کی روشنی میں، مبصرین و نقادانِ اسماء الرجال کی رائے کے مطابق ہم ایک جماعت کو غیر ثقہ قرار دے سکتے ہیں، دروغ گو باور کر سکتے ہیں تو ایک دوسری جماعت کے متعلق اس کی توثیق قبول نہیں کر سکتے؟ اور پھر جب یہ حقیقت بھی ہم پر روشن ہے کہ ان ائمہ جرح و تعدیل نے بلا تذبذب بلا تامل، بلا پس و پیش، جس جماعت کی توثیق کی اسے سچا جانا، تنقیدی نظر ڈالنے کے باوجود اسے کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ اس کی ساری زندگی ان کے سامنے گزری پر انھوں نے کبھی بھی اس جماعت کے کسی فرد کو کسی آلودگی میں ملوث نہیں پایا۔ نازک سے نازک موقع پر ان کا اعلان صداقت زلزلہ انداز قصر طاغوت ثابت ہوا۔ سخت سے سخت آزمائش پر ان کی زبان سے اگر نکلا تو کلمہ حق۔ جرح کرتے وقت انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ امام وقت ہے، علامہ دہر ہے۔ عوام کے نزدیک مقبول و محبوب ہے ان کا دوست ہے، رشتہ دار ہے، عزیز ہے۔ انھوں نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بڑی سے بڑی شخصیتوں پر جرح کی، تنقید کی، ان کی زندگی کے ہر پہلو کو پبلک کے سامنے پیش کیا، اور بتلا دیا کہ اس کی حقیقت کیا ہے پھر وہ کون سے اسباب و علل ہیں جو مانع ہوتے ہیں کہ ہم اس توثیق کے بعد انھیں ثقہ نہ مانیں راست گو نہ مانیں، صداقت شعار نہ مانیں، ہم اگر نہ بھی ماننا چاہیں تو ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے اور مجبور کرتا ہے کہ ہم ان کی رائے پر اعتماد کریں اور ان کے فرمودہ حق کو بالکل "حق" مانیں۔ یہ ضرور ہے کہ جب آثار و اخبار کی کثرت ہوئی، اور مکہ شریف و مدینہ منورہ سے باہر قال اللہ و قال

الرسول کا غلغلہ بلند ہوا تو ان میں خرقہ پوشان مکر و سالوس بھی تھے، جو بظاہر مسلمان تھے لیکن جن کے قلوب کفر و شرک کی تاریکی سے ظلمت شب تاب کا منظر پیش کر رہے تھے، انھوں نے اپنے اغراض نامسعود کے لئے اپنے مصالح سیاسی کے لئے اور اپنی کامیابی و کامرانی کے لئے دنیا میں غلط احادیث کی نشر و اشاعت کرنا چاہی، یہودیت اور عیسویت، اسرائیلیات، حدیث کے نام سے پیش کرنا چاہے، لیکن وہ اپنے مقصد میں بالکل کامیاب نہیں ہو سکے۔ فوراً ہی ائمہ جرح و تعدیل کی ایک جماعت پیدا ہوئی۔ اسمار الرجال سے بحث کرنے والا ایک گروہ ہوا اور اس نے ان لوگوں کے عزائم باطلہ کو تار تار کر کے رکھ دیا، اس نے ان کی پردہ دری کی، ان کے سوانح حیات قلمبند کئے، ان کے صدق و کذب کا امتحان کیا، ان کی دیانت و ثقاہت کو جانچا، ان کی صداقت اور راست گوئی کی پڑتال کی اور بالآخر انھیں بے نقاب کر کے چھوڑا، ان کے لئے ایک مستقل تاریخ بنائی جس میں ان کے پوست کندہ حالات ملتے ہیں۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ

قال سفیان الثوری لما استعمل الرواۃ الکذب استعملنا لہم التاریخ وقال حسان بن زید لم نستعن علی الکذابین بمثل التاریخ اقوال للشیخ کم سنہ وقی لے تاریخ ولد فان اقر بمولدہ عرفنا صدقہ من کذب وقال الحسن بن الربیع قدمت بغداد فلما خرجت شیعنی اصحاب الحدیث فلما برزت الی الخارج قالوا توقف فان احمد بن حنبل یجئی فقعدت واخرجت الواحی فلما جاء قال لی فی ای سنتہ مات عبداللہ بن المبارک فقلت سنتہ احدی وثمانین فقیل لہ ما ترید بہذا؟ فقال ارید الکذابین [۱]۔

سفیان ثوری کہتے ہیں کہ جب راویوں نے کذب کی آمیزش شروع کر دی تو ہم نے تاریخ سے کام لینا شروع کیا۔ اور حسان زید کہتے ہیں کہ کذابین کے لئے تاریخ سے بڑھ کر ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ میں شیخ سے اس کا سن دریافت کرتا ہوں اس کی تاریخ ولادت پوچھتا ہوں، اگر وہ سچ سچ کہہ دیتا ہے تو ہم اس کا صدق اس کے کذب سے پہچان لیتے ہیں۔ اور حسن بن الربیع کہتے ہیں کہ ایک بار میں بغداد گیا جب میں چلنے لگا تو اصحاب حدیث نے میری مشایعت کی جب میں باہر پہنچا تو انھوں نے کہا ذرا ٹھہر جائیے۔ احمد بن حنبل آرہے ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔
جب وہ آئے تو مجھ سے پوچھا کہ عبداللہ بن مبارک کا کس

---

(۱) ابن عساکر صفحہ ۲۶

سنہ میں انتقال ہوا تھا؟ میں نے کہا ۵۰ھ میں، پھر ان سے
دریافت کیا گیا کہ آپ کا اس سوال سے کیا مطلب تھا؟ فرمایا
میں کذابین کی شناخت اسی طرح کرتا ہوں۔

علامہ ابن حجر جو اساطین علم حدیث میں ہیں، فرماتے ہیں کہ

قد افرد اسماء المدلسین بالتصنیف من القدماء
الحسین بن علی الکرابیسی صاحب الامام الاعظم
الشافعی، ثم النسائی، ثم الدارقطنی، ثم نظم شیخ
شیوخنا الحافظ شمس الدین الذہبی فی ذلک ارجوزۃ
وتبعہ بعض تلامذتہ وہو الحافظ ابو محمد احمد بن
ابراہیم المقدسی فزاد علیہ من تصنیف العلائی
شیئا کثیرا مما فات الذہبی ذکرہ ثم ذیل شیخنا
حافظ العصر ابو الفضل بن الحسین فی ہوامش کتاب
العلائی اسماء وقعت لہ زائدۃ ثم جمعہما ولد العلامۃ
قاضی القضاۃ ولی الدین ابو زرعۃ الحافظ ابن
الحافظ الی من ذکرہ العلائی واخرج المدلسین
بالتصنیف من المتاخرین المحدث الکبیر المتقن
برہان الدین الحلبی سبط ابن العجمی غیر متقید بکتاب
العلائی فزاد علیہم قلیلا فجمیع ما فی کتاب العلائی
من الاسماء ثمانیۃ وستون نفسا وزاد علیہم ابن
العراقی ثلاثۃ عشر نفسا وزاد علیہ الحلبی اثنین وثلاثین
نفسا وزدت علیہا تسعۃ وثلاثین نفسا فجملۃ ما فی

قدما کی تصانیف میں مدلسین کی جو تفرید کی گئی ہے ان میں
حسین بن علی الکرابیسی صاحب امام شافعی ہیں پھر نسائی
پھر دارقطنی، پھر ہمارے استاد الاساتذہ علامہ ذہبی نے
کچھ اضافہ کیا ہے، پھر ان کے بعض تلامذہ نے اس باب میں
ان کی پیروی کی، ان میں حافظ ابو محمد احمد بن ابراہیم مقدسی
ہیں، علائی نے اپنی تصنیف میں وہ تمام چیزیں ایزاد کیں
جو علامہ ذہبی سے رہ گئی تھیں پھر ہمارے استاذ ابو الفضل
بن حسین کا ذیل ہے، علائی کی کتاب کے حاشیہ میں زیادہ
اسماء کا تذکرہ ہے۔ پھر ان کے فرزند ارجمند علامہ قاضی القضاۃ
ولی الدین ابو زرعہ نے ان چیزوں کو شامل کیا ہے جو علائی
نے ذکر کی ہیں۔
متاخرین میں جن لوگوں نے مدلسین کی تخریج کی ہے ان میں
جلیل القدر محدث برہان الدین الحلبی ہیں جنہوں نے علائی کی
پابندی نہیں کی، علائی کی کتاب میں کل اسماء جن کی تخریج ہوتی ہے ۶۸ ہیں
ابن عراقی نے اس پر ۱۳ ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔ حلبی نے ۳۲
نام اور ایزاد کئے ہیں اور میں نے ان پر ۳۹ نام اور
بڑھائے ہیں۔ پس میری کتاب میں کل ۱۵۲ نفوس

کتابی ہذا مانہ و اثنان وخمسون نفسا (۱) " کا تذکرہ ہے۔

یہ اتنی تحقیق آپ کو معلوم ہو کس چیز پر کی گئی ہے یہ وہ وضاعین وکذابین نہیں جو اُس "جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں "شناوری کر رہے ہوں، وہ بھی نہیں ہیں جن کا پیشہ حدیث کا گھڑنا ہو۔ وہ بھی نہیں ہیں جو اسرائیلیات کی اشاعت کر رہے ہوں، وہ بھی نہیں ہیں جن کا وظیفہ حیات کذب و دروغ کی نشر و ترقی ہو، بلکہ یہ لوگ مدلسین ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو حدیث بیان کرتے ہیں سلسلہ رواۃ بیان کرتے ہیں لیکن اپنے شیخ کا معروف نام نہیں ظاہر کرتے۔ بلکہ غیر معروف نام سے انتساب کرتے۔ یہ ایک قسم کی تدلیس ہوتی، یہ کیسے ممکن تھا کہ اسماء الرجال کے مبصرین کی نگاہ دوررس سے بچ جاتے ان پر بھی کتابیں تصنیف ہوئیں، ان پر اضافہ کیا گیا، ذیل لکھے گئے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان لوگوں کو منصہ شہود پر جلوہ گر کیا گیا۔ آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ جب مدلسین کے ساتھ اتنا شغف کیا گیا تو "وضاعین وکذابین" کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا گیا ہو گا، ان پر بھی دفتر کے دفتر سیاہ کئے گئے، کتابیں لکھی گئیں، تاریخیں ضبط تحریر میں آئیں اور بالآخر انھیں بے نقاب کر دیا گیا، علامہ ذہبی کی میزان الاعتدال اور علامہ ابن حجر کی تہذیب التہذیب اور تقریب التہذیب اس پر شاہد عادل ہیں۔ امام بخاری، امام نسائی وغیرہ نے مستقل تصنیفیں لکھیں جن میں، التاریخ الصغیر، کتاب الضعفا والمتروکین للبخاری اور کتاب الضعفا والمتروکین للنسائی زیادہ قابل ذکر ہیں۔

ان کتابوں میں اور اسماء الرجال کی دوسری کتابوں میں رواۃ پر مفصل بحث ملے گی، ان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ان کی زندگی کا ہر گوشہ بے نقاب کیا گیا ہے بخوف طوالت ان کتابوں سے میں کوئی تفصیلی اقتباس نہیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ضرورت ہوئی تو کسی آئندہ موقع پر تفصیل سے یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ان دفاتر میں کیا کیا ہے اور ہم حدیث کے حسن و قبح کی جانچ پرتال سے کس قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں، نیز یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ رواۃ حدیث نے

---

(۱) کتاب طبقات المدلسین لابن حجر

جمع حدیث میں کس قدر دقتیں اور مصیبتیں اٹھائی ہیں ؟ طاہر جزائری پر مولانا اسلم نے کافی اعتماد فرمایا ہے، وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

قد کان للصحابۃ رضی اللہ عنہم عنایۃ شدیدۃ فی معرفۃ الحدیث و فی نقلہ لمن لم یبلغہ فقد ذکر البخاری فی صحیحہ فی کتاب العلم ان جابر بن عبد اللہ رحل مسیرۃ شہر الی عبد اللہ بن انیس فی حدیث واحد (۱)۔

صحابہ رضی اللہ عنہم معرفت حدیث میں بہت توجہ فرماتے تھے اسی طرح نقل و ضبط میں بھی خصوصاً اس حدیث کے بارے میں جو کسی کو ابتک نہ پہنچی ہو، چنانچہ امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں کتاب العلم میں ذکر کیا ہے جابر بن عبد اللہ عبد اللہ بن انیس کے پاس ایک مہینہ کی مسافت طے کر کے صرف ایک حدیث کے لئے گئے۔

ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین حدیث کے بارے میں بہت سست تھے وہ خود بھی روایت بہت کم کرتے تھے اور دوسروں کو بھی کم کرنے دیتے تھے، اور حضرت ابو ہریرہ پر بھی یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کثیر الروایۃ تھے، چنانچہ حضرت عمر نے انھیں کثرت روایت سے روکا بھی ہے، اس کی صفائی خود حضرت ابو ہریرہ نے بایں الفاظ دی ہے کہ

ان الناس یقولون اکثر ابو ہریرۃ و لولا آیتان فی کتاب اللہ ما حدثت حدیثا ثم تیلو (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والہدی و الی قولہ الرحیم) ان اخواننا من المہاجرین کان یشغلہم الصفق فی الاسواق و ان اخواننا من الانصار کان یشغلہم العمل فی اموالہم و ان ابا ہریرۃ کان یلزم رسول اللہ یشبع بطنہ و یحضر ما لا یحضرون و یحفظ

لوگ کہتے ہیں ابو ہریرہ کثیر الروایت ہے اگر دو آیتیں میرے پیش نظر نہ ہوتیں تو میں کبھی حدیث بیان نہ کرتا (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والہدیٰ، الی قولہ الرحیم) ہمارے مہاجرین بھائی تجارت میں مشغول رہتے تھے، ہمارے انصار بھائی اپنے مال کی دیکھ بھال میں سرگرداں رہتے تھے لیکن ابو ہریرہ رسول اللہ کا دامن پکڑے ہوئے تھا کبھی آپ سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس وقت بھی حاضر رہتا تھا جس وقت

---

(۱) توجیہ النظر صفحہ ۱۰

مالا یحفظون[1]	لوگ غیر حاضر ہوتے تھے، وہ اسے بھی یاد رکھتا تھا جسے لوگ نہیں یاد رکھتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ نے اپنی صفائی میں خود یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں، اس جگہ یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ بعض صحابہ جو قلت روایت کے حامی تھے وہ ڈرتے تھے کہ

اذالاکثار مظنة للخطاء، والخطاء فی الحدیث عظیم الخطر[2]	کہیں کثرت روایت سے غلطی نہ سرزد ہو اور حدیث میں غلطی ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

برعکس اس کے حضرت ابوہریرہ قرآن شریف کی اس وعید سے ڈرتے تھے اور چاہتے تھے کہ جو کچھ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے وہ میں بیان کردوں تاکہ میں ان لوگوں میں نہ شمار کیا جاؤں جو حق وہدایت کو چھپاتے ہیں، لہٰذا جہاں تک ان کا حافظہ ان کی اعانت کرتا تھا وہ حدیثیں بیان فرماتے تھے اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتے تھے، لہٰذا یہ بات بالکل "ظاہر اور باہر" ہے کہ حضرت ابوہریرہ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کا مسلک میں اختلاف، اختلاف فی الاجتہاد کی حیثیت رکھتا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ یہی اختلاف مسلک امت کے لئے باعث رحمت ثابت ہوا، خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ اگر اس میں اتنا تشدد آغاز کار ہی میں نہ کرتے تو یقیناً تلبیس و تدلیس کا دروازہ کھل جاتا، لیکن ابتدا ہی میں ان کی اس احتیاط پسندی نے غور و تامل کے دروازے کھول دئے اور اب جو قدم اٹھتا تھا وہ سوچ سمجھ کر،

مولٰنا اسلم صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ

> "حضرت ابوبکر نے ایک مجموعہ احادیث بھی لکھا تھا جس میں تقریباً پانسو حدیثیں تھیں، مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہ سے لے کر آگ میں جلا دیا کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھ دی ہو اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو جامعہ صفحہ ۳۲"

---

(۱) توجیہ النظر صفحہ ۱۱ (۲) توجیہ النظر

خطوط کشیدہ الفاظ اس پر دال ہیں کہ یہ حضرت ابوبکر کا زیادہ سے زیادہ جذبۂ احتیاط پسندی تھا، ورنہ حدیث کو قبول کرنے میں اگر اس کی صداقت ثابت ہوگئی ہو انھوں نے کبھی انکار نہیں فرمایا بلکہ اسے تسلیم کیا، اور نافذ کیا، چنانچہ اسی تذکرۃ الحفاظ میں جس سے مولٰنا نے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے غالباً اسی صفحہ پر اور اس نقل شدہ واقعہ کے ذکر سے پہلے ایک دوسرا واقعہ بھی مذکور ہے جو بہر حال ہمارے لئے قابل غور ہے کہ

وکان اول من احتاط فی قبول الاخبار فروی ابن شہاب عن قبیصۃ بن ذویب ان الجدۃ جارت الی ابی بکر تلتمس ان تورث فقال ما اجد لک فی کتاب اللہ شیئاً وما علمت ان رسول اللہؐ ذکر لک شیئاً ثم سال الناس فقام المغیرۃ فقال سمعت رسول اللہؐ یعطیہا السدس، فقال لہ ہل معک احد؟ وشہد محمد بن مسلمۃ بمثل ذلک فانفذ لہا ابو بکر رضی اللہ عنہ(۱)

وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے حدیث کے قبول کرنے میں سب سے پہلے احتیاط برتی، ابن شہاب قبیصہ بن ذویب سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت آئی جو "جدہ" کا حق طلب کرتی تھی، حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ قرآن مجید میں تو میں تیرے لئے کچھ نہیں پاتا، اور نہ یہ جانتا ہوں کہ رسول اللہ نے اس بارے میں کچھ فرمایا ہے، پھر آپ نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہ اٹھے اور کہا کہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے وہ سدس عطا فرماتے تھے حضرت ابوبکر نے پوچھا کوئی شاہد؟ محمد بن مسلمۃ نے شہادت دی تو آپ نے اسے نافذ فرمادیا۔

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اگرچہ محتاط تھے لیکن بایں ہمہ اگر کوئی سچی حدیث انھیں مل گئی ہے تو انھوں نے اسے قبول کرلیا ہے جب انھوں نے قبول کرلیا تو امت کیوں نہ قبول کرے گی؟ رہا صحت کا معیار سو ارباب نظر نے ایسے ایسے اصول وضع کردیے کہ اب احادیث کی صداقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہئے، اس جگہ ایک "سخن گسترانہ" بات اور عرض کردوں کہ مولٰنا نے حضرت ابوبکر کا جو واقعہ نقل فرمایا ہے کہ انھوں نے احادیث کا ایک مجموعہ جلادیا اس کو خود صاحب

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبی ذکر ابی بکر۔

تذکرہ الحفاظ نے مراسیل میں شمار کیا ہے، اور مراسیل کا پایۂ استناد جتنا بلند ہے مولنا مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔

حضرت عمر کا تشدد اس بارہ میں بہت زیادہ واضح ہے ایکبار کثرت روایت پر وہ حضرت ابوہریرہؓ کو پیٹنے کی دھمکی بھی دے چکے ہیں لیکن اس کے باوجود اگر ان کے معیار کے مطابق انھیں کوئی صحیح حدیث مل گئی ہے تو انھوں نے بھی اسے تسلیم فرمالیا ہے امام ذہبی حضرت عمر کے بارے فرماتے ہیں کہ

وھو الذی سن للمحدثین التثبت فی النقل وربما کان یتوقف فی خبر الواحد اذا ارتاب فروی الجریری عن ابی نضرۃ عن ابی سعید ان ابا موسیٰ سلم علی عمر من وراء الباب ثلاث مرات فلم یؤذن لہ فرجع فارسل عمر فی اثرہ فقال لم رجعت قال سمعت رسول اللہ ؐ اذا سلم احدکم ثلاثا فلم یجب فلیرجع قال لتاتینی علی ذلک ببینۃ اولافعلن بک فجاءنا ابوموسیٰ منتقعا لونہ ونحن جلوس فقلنا ما شانک فاخبرنا فقال ھل سمع احد منکم؟ فقلنا نعم کلنا سمعہ فارسلوا معہ رجلا منھم حتی اتی عمر فاخبرہ (۱)

حضرت عمر وہ بزرگ ہیں جنھوں نے محدثین کے لئے تثبت فی النقل لازم کردیا، اگر آپ کو شک ہوتا تو خبر واحد میں کبھی کبھی آپ تامل فرماتے، حریری ابونضر سے اور وہ ابوسعید سے روایت کرتے ہیں کہ ابوموسیٰ نے دروازے کے پیچھے سے حضرت عمر کو تین بار سلام کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو وہ واپس آئے، حضرت عمر نے انھیں بلوایا اور کہا کہ تم واپس کیوں گئے انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ تم میں سے جب کوئی تین بار سلام کرے اور جواب نہ ملے تو اسے واپس ہوجانا چاہئے، حضرت عمر نے کہا کہ تمھیں اس قول پر دلیل لانا پڑے گی ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا، تو ابوموسیٰ ہمارے پاس آئے چہرہ کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا، ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے ہم نے پوچھا کیا حال ہے؟ انھوں نے اپنے واقعہ سے مطلع کیا۔ اور دریافت کیا کہ تم میں سے کسی نے اسے سنا ہے؟ ہم نے کہا ہاں ہم میں سے ہر شخص نے سنا ہے، تو ان کے ساتھ ایک آدمی کردیا اس نے حضرت عمر کو اس کی خبر دی۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمرؓ،

علامہ ذہبی اس واقعہ پر ذیل کی رائے ظاہر فرماتے ہیں جو بڑی حد تک قابل قبول ہے کہ

احب عمران یتأکد عن خبر ابی موسیٰ بقول صاحب
آخر ففی ہذا دلیل علی ان الخبر اذا رواہ ثقتان کان
اقوی وارجح مما انفرد بہ واحد، وفی ذلک حض
علی تکثیر طرق الحدیث لکی یرتقی عن درجۃ الظن الیٰ
درجۃ العلم اذ الواحد یجوز علیہ النسیان، والوہم ولا
یکاد یجوز ذلک علی ثقتین لم یخالفہما احد وقد کان
عمر من وجلہ یخطئی الصاحب علی رسول اللہ یامرہم
ان یقلوا الروایۃ عن نبیہم ولکلا یتشاغل الناس
بالاحادیث عن حفظ (۱)

حضرت یہ چاہتے تھے کہ ابو موسیٰ کی حدیث کسی دوسرے آدمی
سے اور زیادہ مؤکد ہوجائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
کسی حدیث کو جب دو ثقہ آدمی روایت کریں تو وہ بہت زیادہ
اقوی اور ارجح ہوجایا کرتی ہے بہ نسبت اس کے کہ منفرداً کسی
شخص سے روایت کی گئی ہو اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ
حضرت عمر طرق حدیث کی کثرت کی طرف لوگوں کو مائل کرنا چاہتے
تھے تاکہ حدیث درجۂ ظن سے درجۂ علم تک پہنچ جائے، کیونکہ
ایک آدمی کے لئے یہ ممکن ہو کہ اس پر نسیان و وہم کا غلبہ
ہو اور جب دو ثقہ آدمی روایت کریں تو یہ اندیشہ کم ہوجاتا ہے
حضرت عمر اس سے ڈرتے رہتے تھے کہ بیان حدیث میں کوئی
خطا سرزد ہوجائے، انھوں نے حکم دے رکھا تھا کہ روایۃ کم
کی جائے تاکہ لوگ حفظ حدیث سے غافل نہ ہوجائیں۔

علامہ ذہبی نے جو رائے ظاہر فرمائی ہے۔ وہ بہت صحیح ہے، اور یہی وہ جذبۂ احتیاط پسندی تھا
کہ جس سے حضرت عمر قلت روایت اور کثرت طرق کو پسند فرماتے تھے اور جب ایسا ہوتا تھا تو بلا تامل
وہ حدیث کو تسلیم کر لیتے تھے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے کہ

روی ہشام عن ابیہ المغیرہ بن شعبۃ ان عمر
استشارہم فی املاص المرأۃ یعنی السقط فقال لہ
المغیرۃ قضی فیہ رسول اللہ بغرۃ فقال لہ عمران
کنت صادقا فأت احدا یعلم ذلک قال فشہد

ہشام اپنے والد مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت
عمر نے سقط ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے بارے میں مشورہ کیا تو مغیرہ
نے کہا کہ رسول اللہ نے ایک لونڈی کے بارے میں یہ فیصلہ
کیا ہے تو حضرت عمر نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دوسرا آدمی

(۱) تذکرۃ الحفاظ۔

محمد بن مسلم ان رسول اللہ قضیٰ بہ (۱) | لاؤ جو اس سے واقف ہو، محمد بن مسلم نے شہادت دی کہ رسول اللہ نے ایسا فیصلہ کیا تھا۔

آگے چل کر دوسرا واقعہ جو پیش کیا جاتا ہے اس میں حضرت عمر نے اپنا مسلک اور واضح کر دیا ہے کہ جب حضرت عمر نے مسجد کی توسیع کے لئے حضرت عباس سے ان کی زمین چاہی تو انھوں نے انکار کیا اور حدیث بیان کی کہ تم زیادتی نہیں کر سکتے تو حضرت عمر نے کہا کہ اس پر دلیل لاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ پس انھوں نے ایک جماعت انصار سے اس کا تذکرہ کیا۔ انصار نے حضرت عمر سے تصدیق کی کہ ہاں یہ حدیث صحیح ہے پھر حضرت عمر نے فرمایا کہ

انی لم اتہمک ولکنی اجبت اتثبت (۲) | میں تمھیں غیر معتبر نہیں سمجھتا لیکن یہ چاہتا تھا کہ حدیث ثابت ہو جائے۔

اسی طرح حضرت علی بھی پورے اطمینان کے بعد حدیث قبول فرماتے تھے یہاں تک کہ وہ تو

انہ لیستحلف من یحدثہ بالحدیث (۳) | جو شخص حدیث بیان کرتا تھا اس سے قسم لے لیتے تھے۔

طاہر جزائری نے حضرت ابوبکر کے اس واقعہ پر جب آپ نے سدس دلایا تھا، بہت عمدہ بات لکھی ہے کہ

الا ترا ہ لما نزل بہ امر الجدۃ ولم یجدہ فی الکتاب کیف سال عنہ فی السنن فلما اخبرہ الثقۃ لم یکتف حتی استظہر بثقۃ آخر ولم یقل حسبنا کتاب اللہ کما تقولہ الخوارج (۴) | کیا تم اسے نہیں دیکھتے کہ اس عورت والے واقعہ میں جب حضرت ابوبکر نے قرآن میں اس کے متعلق کچھ نہیں پایا تو اس بارے میں سنن و حدیث کی طرف توجہ کی، اور جب ثقہ نے حدیث بیان کی تو آپ نے صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ایک دوسرے ثقہ سے اسے موکد کر لیا اور یہ نہیں کہا کہ ہمارے لئے تو "کتاب اللہ" کافی ہے۔ جیسا کہ خوارج کہا کرتے تھے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ۔ (۴) توجیہ النظر صفحہ ۱۲)

اور حضرت ابوبکرؓ یہ فرما کیسے سکتے تھے جب کہ اُن کے سامنے یہ بھی تھا کہ

فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لاتعلمون (قرآن مجید) | اگر تم کوئی چیز نہ جانتے ہو تو اہل ذکر سے دریافت کرو۔

اور اہل ذکر ان سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا جنھوں نے ایک ایک حدیث کے لئے دور دراز کی مسافتیں طے کیں، طرح طرح کے مصائب برداشت کئے، آفات و حوادث کا مقابلہ کیا، فاقے کئے، ہاتھے باندھے راستے کی لالٹینوں میں پڑھا، مسجد کے چراغ میں پڑھا۔ غرض اس نام سے جو مصیبت آئی اسے انگیز کیا۔ صرف اس لئے کہ اقوال رسول مدون ہو جائیں، ارشادات رسول منضبط ہو جائیں، اور سرکار رسالت کا کوئی فعل اور کوئی قول پردہ خفا میں نہ رہے۔

اور مولٰنا نے جو فرمایا ہے کہ

"صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اس کو مٹا ڈالو، جامعہ صفحہ ۳۲۶

تو جس کتاب سے مولٰنا نے یہ حدیث لی ہے اسی کتاب میں یہ حدیث بھی ملتی ہے کہ

عن ابن جریج عن عطا عن عبد اللہ بن عمرو قال قلت یا رسول اللہ اقید العلم؟ قال نعم قال وما تقییدہ قال کتابتہ	ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کیا علم قید کیا جا سکتا ہے؟ فرمایا، ہاں۔ میں نے پوچھا اس کی تقیید کیسے ہے فرمایا: کتابت

و | اور

عن حماد بن سلمۃ عن محمد بن اسحٰق عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال قلت یا رسول اللہ اکتب کل ما اسمع منک؟ قال نعم قلت فی الرضا والغضب قال نعم فانی لا اقول فی ذلک کلہ الا الحق	حماد بن سلمہ محمد بن اسحاق سے وہ عمرو بن شعیب سے وہ اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ میں وہ سب کچھ لکھ لیا کروں جو آپ سے سنوں؟ فرمایا، ہاں۔ انھوں نے کہا کہ آپ خوشی اور غصہ میں ہوتے ہیں؟ فرمایا سوا حق کے میں اور کچھ نہیں کہتا۔

اور سب سے بڑھ کر بخاری کی یہ حدیث کہ

عن ابی ہریرۃ انہ قال ما من احد من اصحاب النبیؐ اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبداللہ بن عمر فانہ کان یکتب ولا اکتب۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ اصحاب رسول میں باعتبار علم حدیث کے کوئی مجھ سے زیادہ نہیں ہو سوا ابن عمر کے اس لئے کہ وہ لکھ لیتے تھے، جو کچھ سنتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

اگر یہ حدیث کتابت حدیث کی مخالفت میں ہو تو ایک سے زائد اس کی تائید میں ہیں۔ یہ تناقض اور تباین کیونکر رفع ہوں؟ اور ان میں سے کسے صحیح سمجھا جائے اور کسے نا قابل عمل؟ اس کا جواب بجائے اس کے کہ میں اپنی طرف سے کچھ دوں مناسب ہوگا کہ اسی کتاب سے دوں جس کی بعض باتوں سے "وضع حدیث" کے نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ کہ

قال ابو محمد ونحن نقول ان فی ہذا معنیین احدہما ان یکون من منسوخ السنۃ بالسنۃ کانہ نہی فی اول الامر ان یکتب قولہ ثم رأی بعد لما علم ان السنن تکثر وتفوت الحفظ ان تکتب وتقید والمعنی الآخر ان یکون خص بہذا عبداللہ بن عمرو لانہ کان قارئا للکتب المتقدمۃ ویکتب بالسریانیۃ والعربیۃ وکان غیرہ من الصحابۃ امیین لا یکتب منہم الا الواحد والاثنان واذا کتب لم یتقن ولم یصب التہجی فلما خشی علیہم الغلط فیما یکتبون نہاہم ولما امن علی عبداللہ بن عمرو ذلک اذن لہ۔(۱)

ابو محمد کا اور خود ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اس باب میں جمع قول کی اور رفع تناقض و تخالف کی دو صورتیں ہیں پہلی تو یہ کہ سنت سنت سے منسوخ ہو گویا یوں ہوا کہ پہلی بار رسول اللہؐ نے اس سے منع فرمایا کہ آپ کے اقوال ضبط تحریر میں آئیں، اس کے بعد جب آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سنن کی کثرت ہو رہی ہے، ممکن ہے یہ چیزیں حافظہ سے نکل جائیں لہذا انھیں لکھ لیا جائے اور نقل کر لیا جائے اور دوسری صورت یہ ہو کہ یہ حکم عبداللہ بن عمرو کے لئے مخصوص ہوا اس لئے کہ وہ کتب قدیمہ کے عالم تھے، سریانی اور عربی لکھنا جانتے تھے، انکے علاوہ جو صحابہ تھے وہ باستثنا چند امی محض تھے اس لئے ان کی کتابت میں یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے کچھ غلطی ہو جائے، لہذا کتابت سے منع فرمایا، لیکن جب ان پر یقین ہو گیا کہ اب ایسا نہیں ہوگا تو اجازت دے دی۔

(۱) تاویل مختلف الحدیث

اب آپ کے سامنے دونوں حدیثیں اور دونوں صورتیں آگئیں کہ اگر سرکار رسالت نے منع بھی فرمایا تو بہ مصالح اور جب وہ مصالح رفع ہوگئے تو خود ہی کتابت کی اجازت دے دی، اب اس میں نہ کوئی تناقص ہے نہ تبائن نہ تخالف، اور اس کی مزید توثیق حضرت ابوہریرہ کی اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے عبداللہ بن عمر کو اپنے سے زیادہ عالم بالحدیث اس بنا پر تسلیم کیا ہے کہ وہ حدیث لکھ لیا کرتے تھے اور یہ نہیں لکھتے تھے، اور ظاہر ہے یہ فعل کتابت رسول اللہ کی زندگی ہی میں ہوتا تھا۔

لہذا جب احادیث وسنن کی کثرت ہوئی اور یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ انسانی حافظہ میں محفوظ رہ سکیں تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (جن کا زہد وورع، علم ودیانت، راستبازی اور حق پسندی، انصاف ومعدلت، خشیۃ فی اللہ اور استقامت علی الحق کا ہر فرد وبشر معترف ہے، اور انھیں اسباب کی بنا پر دنیا انھیں ثانی "عمر بن الخطاب" کے نام سے یاد کرتی ہے) کتابت حدیث کا حکم دیا، اس کی جمع وتدوین کی کوشش، اس کے ضبط واشاعت کے احکام صادر فرمائے، خدا ان پر اپنی بیشمار رحمت نازل فرمائے، کہ ان کی ایک بدعت حسنہ نے امت اسلامیہ کو ایسا خیر کثیر دیا کہ جب تک اس صفحہ ارض پر مسلمانوں کا وجود ہے اس وقت تک مسلمان ان کی اس مساعی حسنہ کا مشکور ہوگا۔

کتابت حدیث کی تائید میں میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ میں اس پہ کچھ گذارش کروں ایک بات پیش نظر رہنی ضروری، مولانا نے فرمایا ہے کہ

لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً فلیمحہ (حدیث)	مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو مٹا ڈالے،

لیکن پوری حدیث یوں ہے، جسے مسلم نے تخریج کیا ہے کہ

لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیر فلیمحہ وحدثوا عنی فلا حرج	مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو مٹا ڈالے، ہاں مجھ سے حدیث بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور اس کے مُعا بعد ارشاد ہوا کہ۔

ومن کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار	جس نے جان بوجھ کر میرے متعلق غلط بیانی کی اسے چاہئے کہ وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنائے۔

اور اس کے بعد طاہر جزائری فرماتے ہیں، کہ

قال کثیر من العلماء نہاہم عن کتابۃ الحدیث خشیۃ اختلاطہ بالقرآن، وہذا لاینافی جواز کتابتہ اذا امن اللبس وبذلک یحصل الجمع بین ہذا وبین قولہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فی مرضہ الذی توفی فیہ ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ۔[1]	بہت سے علماء کا یہ خیال ہے کہ کتابت حدیث سے اس لئے منع فرمایا کہ قرآن مجید اور حدیث میں اختلاط نہ ہو جائے اور یہ ممانعت جواز کتابت کے منافی نہیں ہے جبکہ لبس و اختلاط کا اندیشہ نہ رہے اور اس خیال کو مزید تقویت یوں ہوئی ہے کہ اپنے مرض الموت میں خود رسول اللہ نے کاغذ منگایا کہ میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھ دوں کہ تم اسکے بعد گمراہ نہ ہوسکو۔

طاہر جزائری کی ان تصریحات کے بعد یہ معاملہ اور زیادہ مستحکم ہوگیا ہے اور حالات و واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ لبس فی القرآن کے خوف سے منع فرمایا گیا اور جب یہ اندیشہ رفع ہو گیا تو ظاہر ہے پھر کسی قدغن کی ضرورت نہ تھی۔

ایک جگہ مولٰنا نے فرمایا ہے کہ

"جملہ اصولیین اور محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے یقینی نہیں کہا ہے بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے۔ انھوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول یا ضعیف، منکر، موضوع اور مردود، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے، ورنہ روایت کی صرف دو ہی صورتیں تھیں صحیح یا غلط، (جامعہ صفحہ ۲۳۶)

میں مولٰنا کے اس قول سے بھی اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہوں، محدثین نے احادیث پر

(۱) توجیہ النظر۔

جو احکام لگائے ہیں مثلاً ضعیف، موضوع، منکر، مردود، صحیح، حسن، مقبول وغیرہ "ان سے خود" یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ "وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے"، بلکہ ان سے "صرف یہ ظاہر ہوتا ہے"، کہ مثلاً محدثین حدیث متواتر کو قطعی اور یقینی مانتے ہیں تو ایک حدیث ہی جو اپنے شرائط کے اعتبار سے متواتر ہے لیکن چند "موضوع، منکر اور ضعیف" حدیثیں بھی ہیں جو اس حدیث متواتر کی تائید کرتی ہیں، تو ہم ان کو باصطلاح محدثین متابعات میں داخل کریں گے یعنی کسی "موضوع، منکر اور ضعیف" حدیث سے ہم استناد نہیں کریں گے لیکن اگر وہ کسی "صحیح، مشہور اور متواتر" حدیث کی تائید کرتی ہوں تو ان سچی حدیثوں کی وجہ سے ان مشتبہ حدیثوں کی صحت بھی پایہ یقین تک پہنچ جائے گی۔ چنانچہ بخاری میں جو بعض ضعیف رواۃ پائے جاتے ہیں یا علامہ ابن جوزی نے صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے، تو اس کا نہایت صاف واضح اور غیر مشتبہ جواب یہی ہے کہ وہ حدیثیں، یا وہ رواۃ، متابعات کے تحت میں ہیں نہ کہ اصل مسئلہ پر استنجاج کے لئے اور اس طریقہ پر ان رواۃ یا احادیث پر اعتماد کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، مثلاً زید ایک نہایت کذاب، مفتری، دروغ گو، اور بد باطن شخص ہے، وہ آپ سے کہتا ہے کہ فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو تو بسم اللہ کرلیا کرو، آپ بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ تو دروغ گو ہے، ہمیں تجھ پر اعتماد نہیں، لیکن عمرو، بکر، خالد کی صداقت، دیانت، راست بازی، زہد، تقویٰ، پاکبازی آپ کے نزدیک مسلم ہے، غیر مشتبہ ہے آپنے ان میں محامد کے سوا معائب کبھی نہ دیکھے نہ سنے، سوا اللہ کے غیر اللہ سے انھیں مرعوب ومتاثر ہوتے آپ نے کبھی نہ دیکھا، جھوٹ بولتے کبھی نہ سنا، غرض آپ کو ان پر پورا اعتماد ہے وہ آپ سے کہتے ہیں کہ "فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو تو بسم اللہ کرلیا کرو"، اب آپ یقیناً بلا پس وپیش ان کی بات پر اعتماد کریں گے، اور تسلیم کریں گے کہ انھوں نے جو کچھ کہا سچ کہا، ان لوگوں کے کہنے کے بعد اب وہی "زید" جو "نہایت کذاب، مفتری، دروغ گو، اور بد باطن شخص" ہے آپ کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ "فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو تو بسم اللہ کرلیا کرو" اب آپ اس کے بارے میں کیا ارشاد فرمائیں گے، اس کے اس قول کو

جھوٹا سمجھیں گے، یا سچا؟ لامحالہ آپ زید کو نہیں بلکہ زید کی اس بات کو سچ سمجھنا پڑے گا، بس یہی متابعات کی کیفیت ہے کہ چونکہ وہ متواتر حدیث کی متابعت میں ہوتی ہیں اس لئے انھیں صحیح سمجھا جاتا ہے۔

یہ جھگڑا تو خیر رواۃ کے متعلق تھا کہ حدیث کی بعض کتابوں میں سلسلۂ رواۃ ذرا طویل ہوتا ہے لیکن ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں اس قسم کا کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے، مثلاً موطا امام مالک اکثر و بیشتر وہ تین چار واسطوں سے رسول اللہ تک پہنچتے ہیں، مثلاً مالک، عن نافع، عن ابن عمر، عن النبی ص، امام مالک کی صداقت و دیانت میں جمہور امت کو اتفاق ہے، نافع ابن عمر کے مولیٰ ہیں، ان پر بھی زبان طعن دراز نہیں ہو سکتی، خود ابن عمر وہ ہیں کہ جن کے زہد اور شغف فی السنت کا سارا زمانہ قائل ہے، خود سرکار رسالت کے دربار سے خوشنودی مزاج کا تمغہ انھیں مل چکا ہے، ان کے بعد نبی کریم ہیں، اس سلسلۂ رواۃ کو محدثین کرام "سلسلۃ الذہب" کہتے ہیں، لہٰذا ان "سچائی کے قطروں" کو تو "اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب" سے الگ رکھنا ہی پڑے گا۔

اب میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں، آپ کو اختیار ہے کہ اس گفتگو کے بعد جو رائے چاہیں قائم کریں۔ لیکن یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنی بساط کے موافق جو کچھ عرض کر سکتا تھا، عرض کر چکا۔ تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام!

تنقید و تبصرہ

کتب :-

تفسیر سورۂ اخلاص ۔ سید الانبیاء ۔ ولی اللہ ۔ اسکول کی زندگی ۔ باغبانی پروجکٹ ۔ آسمانی گھڑی ۔ بس کا روکھ ۔ مثنوی ناسخ ۔ روح جذبات

تفسیر سورۂ اخلاص مولٰنا حمید الدین مرحوم فراہی جو اس دور آخر میں بہترین مفسر تھے ان کی لکھی ہوئی سورۂ قل ہو اللہ کی تفسیر چھوٹی تقطیع پر ۳۰ صفحوں میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے چھپ کر شائع ہوئی ہے قیمت ۵ ہے

مولٰنا فراہی مرحوم جو کچھ لکھتے تھے زیادہ تر عربی میں لکھتے تھے ۔ لیکن اس سورۃ کی تفسیر انھوں نے کسی دوست کی فرمائش سے اردو میں لکھی تھی جس کا ناتمام مسودہ پڑا ہوا تھا ۔ مولٰنا کے بھائی حاجی رشید الدین صاحب نے اس کو چھپوا کر اس غرض سے شائع کیا کہ اس کی فروخت سے اگر کچھ رقم جمع ہو جائے تو مولٰنا فراہی کی دیگر تصانیف شائع کی جائیں ۔ اس لئے اس تفسیر کا خریدنا نہ صرف اسی لحاظ سے مفید ہے کہ سورۂ اخلاص کی بہترین شرح آپ کے ہاتھ میں آجائے گی ۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ آپ کی دی ہوئی قیمت ایک اعلیٰ دینی اور علمی مصرف میں کام آئے گی

سید الانبیاء رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مقالے اور آپ کے سوانح غیر قوموں کے مختلف لوگوں نے لکھے ۔ مگر جس جرأت ، جوش ، حدت روح اور خوش بیانی کے ساتھ تھامس کارلائل انگریز فلسفی نے اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں حضور اکرم کے بارے میں اپنا لکچر ترتیب دیا ہے اور ان کی صداقت اور حقانیت کا اعتراف کیا ہے اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے الفاظ کے پیکر میں وہ زندہ معانی ہیں جو چشم بصیرت کے سامنے متحرک ہو کر رسول اعظم کی عظمت کے سامنے

والہانہ عقیدت مندی کے سجدے بجالاتے ہیں، اسی کتاب کے دوسرے لکچر کا ترجمہ محمد اعظم خاں نے نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اردو میں کردیا ہے تاکہ اُردو خواں جماعت اسکو پڑھے۔ چھوٹی تقطیع پر ۸۸ صفحوں میں تمام ہوا ہے۔ چھپائی لکھائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ قیمت فی نسخہ مجلد عہ، غیر مجلد ۱۲؍ ملنے کا پتہ۔ محمد اعظم خاں۔ نصرولد عثمان پورہ۔ حیدرآباد (دکن)

ولی اللہ | اس کتاب میں مولانا ابو العلاء محمد اسمٰعیل صاحب گودھروی نے محقق ہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے سبق آموز حالات اور ان کے اصلاحی و تعلیمی کارنامے جمع کئے ہیں۔ آخر حضرت شاہ صاحب موصوف کا وصیت نامہ بھی درج کیا ہے۔ مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی نے اپنے ایک مقدمہ کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔ تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ ضخامت ۵ جزو قیمت فی جلد ۱۰؍ ملنے کا پتہ۔ مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی۔ قرولباغ۔ دہلی۔ اس کتاب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کے حالات میں ایک کتاب "حیات ولی" کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ جس میں زیادہ تر ان کے خاندانی حالات جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن اس کتاب میں مولانا گودھروی صاحب نے ان کے علمی اور دینی کارناموں کو دکھانے کی خصوصیت کے ساتھ کوشش کی ہے۔ اور عمدگی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

اسکول کی زندگی | مصنفہ محمد عبدالغفار صاحب مدہولی۔ استاد جامعہ۔ ضخامت چھوٹی تقطیع پر ۵۶ صفحے لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ ۴؍ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ۔ دہلی

یہ ایک دلچسپ ڈرامہ ہے جس کو سال گذشتہ ہماری جامعہ کے چھوٹے لڑکوں نے کرکے دکھلایا تھا۔ اس میں اسکول کی زندگی کے مختلف شعبے دکھائے گئے ہیں۔ طالب علم کو علمی شوق دلانے اور صحیح راستہ دکھانے میں۔ یہ ڈرامہ ممد و معاون ہے۔ اہل جامعہ نے اس کو نہایت دلچسپی سے دیکھا اور طلبہ کے لئے مفید خیال کیا۔ چنانچہ عبدالغفار صاحب نے اس کو مرتب کرکے عام فائدے کیلئے شائع کردیا۔

باغبانی پروجکٹ | یہ بھی محمد عبدالغفار صاحب مدہولی کا دوسرا مرتب کردہ رسالہ ہے۔ جو چھوٹی تقطیع پرہ جزو میں ختم ہوتا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ ۸ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرولباغ دہلی

محمد عبدالغفار صاحب مدہولی جامعہ مرکز نمبر ۱ کے نگراں ہیں، ابتدائی چہارم تک چھوٹے بچوں کی تعلیم ان کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ وہ ایک دلکش استاد ہیں جو اپنی ساری قوت ذہنی تعلیم اور طریقہ تعلیم پر صرف کر رہے ہیں۔ انھوں نے چھوٹے بچوں کی دلچسپی کے لئے باغبانی کا سلسلہ بھی اپنے مرکز کے متصل شروع کیا ہے۔ جو کچھ اس باغبانی کی تعلیم میں ہو رہا ہے وہ اس رسالہ میں آپ دیکھ لیں گے۔

آسمانی گھڑی | مصنفہ ڈاکٹر احمد حسن صاحب ایل۔ایم۔پی۔ میڈیکل آفیسر۔ بی۔ایس۔ایم۔ایس نمبر سعادت گنج۔ لکھنو۔

ڈاکٹر صاحب نے اس میں وقت کی شناخت کی کیفیت لکھی ہے۔ یعنی رات کو قطب تارے سے ہر موسم میں وقت پہچانا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جس طرح دن کو آفتاب سے دوپہر، طلوع اور غروب کا وقت معلوم ہو سکتا ہے۔ انھوں نے خود اپنے مطالعۂ نجوم سے یہ باتیں دریافت کی ہیں۔ کل ۱۲ صفحہ کا رسالہ ہے مگر مفید اور دلچسپ ہے۔ قیمت ۴ر مذکورہ بالا پتہ سے مل سکے گا۔

بس کا روکھ | بنگال کے مشہور ناول نگار بنکم چندر چٹرجی کے ایک بے مثل ناول کا ترجمہ جس کو ندا علی خاں ایم اے (علیگ)، صدر شعبۂ فارسی و اردو ڈھاکہ یونیورسٹی نے محنت کے ساتھ اس زبان میں جو سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان ہو سکتی ہے ترجمہ کر کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ دفتر کتابستان الہ آباد نے اس کو چھوٹی تقطیع پر صاف ٹائپ میں چھپوایا ہے۔ ضخامت ۲۶۵ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عہ

ہم کو یہ کتاب نہ صرف اپنی معنوی دلچسپی بلکہ زبان کی خوبی کے لحاظ سے بھی پسند آئی۔ ہم اس مبارک کوشش کو پسند کرتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ایک ہی ہو۔ اور وہ وہی اردو ہو سکتی ہے جو نہایت سلیس

ہو اثقیل اور وزنی عربی اور فارسی کے الفاظ اس میں استعمال کیے گئے ہوں۔ یہ ترجمہ اسی قسم کا ہے۔ اس کے علاوہ "کتابستان" نے جو چھپائی کے لیے ٹائپ رکھا ہے یہ بھی اچھا کیا ہے۔ کیونکہ عنقریب وہ دن آنیوالا ہے جبکہ ہر ادارہ کتب کو ٹائپ ہی رکھنا ہوگا۔ دستی خطاطی اردو کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے بجالیکہ تمام دنیا جو عربی خط میں اپنی زبان لکھتی تھی ٹائپ کو اختیار کر چکی ہے۔

مثنوی ناسخ | مرتبہ حبیب اللہ خاں غضنفر ایم اے ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی۔

خاں صاحب موصوف نے "سلسلۂ مصنفین" اردو میں شیخ ناسخ کی سوانح عمری تیار کی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اسی ذیل میں شیخ ناسخ کی اس نایاب مثنوی کو شائع کر دیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں ان تمام روایات کو اصلی عبارتوں میں درج کر دیا ہے جن کے ترجمے شیخ ناسخ نے اس مثنوی میں کئے ہیں۔ یہ مثنوی بھی ٹائپ میں چھپی ہے۔ کاغذ عمدہ ہے اور کتابستان الہ آباد کے دفتر سے شائع ہوئی ہے۔ تقطیع خورد۔ حجم ۵ جزو قیمت ۱۲/۔ اس آغاز کو دیکھتے ہوئے ہم اس سلسلۂ مصنفین سے جو خاں صاحب موصوف نے شروع کیا ہے اچھی اچھی تصانیف کی توقع رکھتے ہیں۔

روح جذبات | کلام حضرت اکبر حیدری۔ حجم ۶ جز۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ عہ ملنے کا پتہ۔ عشرت رحمانی۔ اڈیٹر رسالہ نیرنگ۔ دہلی۔

اکبر حیدری نے اس کوچۂ شعر وشاعری کو قطعاً چھوڑ دیا ہے جو جذبات اور ہوس پرستی کا ہے۔ انکا دماغی تخیل حقائق فطرت کے جمالیاتی پہلوؤں کو بے نقاب کرنے میں مصروف ہے اور ان کا قلم چمنستان شاعری کی روشوں پر محو خرام ہے۔ جہاں لطائف فطرت پھول بن کر کھلتے ہیں اور بو بن کر مہکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاہراہ آپ پیدا کی ہے جو شعریت کے ساتھ حقیقت تک پہنچتی ہے۔ کاش ان کا اثر متعدی ہو اور پرانے بھٹکے ہوئے اس راہ پر آجائیں تو اردو شاعری کی زمین آسمان ہو جائے۔

شذرات

اگست کا پرچہ ستمبر کے تیسرے ہفتے میں قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ رہا ہے۔ ستمبر کا پرچہ انشاء اللہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں اور اکتوبر کا آخر اکتوبر تک پہنچ جائے گا۔ امید ہے کہ اس کے بعد وقت کی پوری پوری پابندی ہوا کرے گی۔

اکتوبر سے رسالہ کا حجم ۹۶ صفحے ہو جائے گا اور یہ کوشش کی جائے گی کہ مضامین بہتر اور زیادہ دلچسپ ہوں۔ اس میں حضرات قارئین کی مدد کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس حلقے میں اچھے اچھے اہل قلم موجود ہیں۔ اگر یہ سب بزرگ توجہ کریں تو مضامین کا معیار کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ علاوہ قلمی امداد کے ہم مفید مشوروں کے بھی طالب ہیں۔

ہمارے ملک میں یہ رسم ہے کہ رسالوں کے مدیر پڑھنے والوں سے اپنے اپنے رسالے کی ترقی اشاعت میں مدد مانگا کرتے ہیں۔ بعض لوگ اسے کاروبار کے اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ مطالبہ محض سینہ زوری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قانوناً رسالے کے مدیر کو کوئی حق نہیں کہ وہ معقول اور شریف آدمیوں کے سر یہ بیگار ڈالے۔ خریداروں کی بھرتی سپاہیوں کی بھرتی سے بھی زیادہ ناگوار اور تکلیف دہ کام ہے لیکن انصاف کی نظر سے دیکھئے تو اردو میں علمی رسالہ نکالنا کاروبار نہیں بلکہ ایک طرح کا جہاد ہے۔ حالت یہ ہے کہ لوگ علمی مضامین پڑھنا نہیں چاہتے۔ مگر علمی رسالے انھیں مجبور کر کے پڑھواتے ہیں۔ لکھنے والے لکھنا نہیں چاہتے مگر رسالوں کے مدیر ان کے پیچھے پڑ کے لکھواتے ہیں غرض اس کام کی بنیاد ہی جبر پر ہے۔ مگر اس جبر کے لئے شرط یہ ہے کہ جس پر کیا جائے وہ خفا نہ ہو بلکہ خوش ہو۔ منطق کی رو سے اس شرط کا پورا ہونا محال ہے لیکن واقعات کبھی کبھی منطق کا قانون بھول جاتے

ہیں۔ الحمدللہ یہ بھی ایک ہی واقعہ ہے کہ ہمارے قدر دان ہمارے تقاضوں کو خندہ پیشانی سے سنتے ہیں (یہ دوسری بات ہے کہ سن کر ٹال دیں)۔ بہرحال ان کے لطف و کرم نے ہمیں گستاخ کر دیا ہے اور ہم ان سے بہ اصرار ملتجی ہیں کہ رسالے کی اشاعت بڑھانے میں ہماری مدد کریں۔ انشاء اللہ اس ترقی کے بعد جو اکتوبر سے رسالے میں ہو رہی ہے لوگوں کو اس کا خریدار بننا پہلے سے آسان ہو جائے گا۔

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں بہت بڑے تغیرات ہونے والے ہیں۔ حکومت کا نظام بدلنے والا ہے۔ نیا دستور اساسی بن رہا ہے۔ بڑے بڑے مدبر سیاست اور حکومت کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس چیز پر جو تمدنی زندگی کی بنیاد ہے یعنی تعلیم کے مسئلے پر اب تک کسی کو غور کرنے کی توفیق نہیں ہوئی، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور تبدیلی ہو کر رہے گی لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ تغیر اضطراری حالت میں بجائے اصلاح کے تحریک کی صورت نہ اختیار کرلے۔ اب تک ہمارے ملک میں سرکاری تعلیم محض سطحی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ لوگوں کو مروجہ علوم کی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو جائے اور وہ دفتری یا انتظامی ملازمت کا کام انجام دے سکیں۔ نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل پر اس کا اثر بہت محدود ہے۔ سیاسی آزادی ملنے کے بعد رنگ بدل جائے گا۔ تعلیم میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو گی اور وہ نوجوانوں کی ذہنی زندگی کے ہر شعبے کی تربیت کرے گی۔ یہ آزادی کا لازمی نتیجہ ہے جو خود بخود ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے تعلیم کے مسئلے کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔

دستور اساسی کے بنانے میں ہماری یہ خواہش اور کوشش ہے کہ ملک میں ہم آہنگ قومی زندگی پیدا ہو لیکن اسی کے ساتھ مختلف فرقوں اور جماعتوں کے مدنی حقوق محفوظ رہیں اور ان کی تمدنی خصوصیات برقرار رہیں۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جو برسوں سر مغزی کرنے کے بعد اب تک حل نہیں ہوا۔

اس کے حل نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس پر اب تک بہت محدود نقطۂ نظر سے غور کیا گیا۔ اس کا سب سے اہم پہلو یعنی یہ سوال کہ ملک کی تعلیمی پالیسی کیا ہوگی بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مدنی اور تمدنی زندگی کی تشکیل زیادہ تر تعلیم سے ہوتی ہے۔ یورپ کے ملکوں میں خصوصاً جرمنی میں ہر سیاسی پارٹی اپنے سیاسی لائحہ عمل کے ساتھ ایک تعلیمی لائحہ عمل بھی رکھتی ہے اور جس طرح قومی حکومت کا نظام مختلف پارٹیوں کے سیاسی اصولوں کے امتزاج سے ترتیب دیا گیا ہے اسی طرح قومی تعلیم کی پالیسی بھی ان سب کے تعلیمی خیالات کو سمو کر بنائی گئی ہے۔ ہمارے یہاں ابھی تک کسی پارٹی کے پاس کوئی تعلیمی پروگرام نہیں ہے اور کسی نے اس بات کو محسوس کیا کہ سیاسی اور تمدنی حقوق کی محافظت میں طرز تعلیم کو بہت کچھ دخل ہے۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے تو دستور اساسی کی گتھی کو سلجھانے میں بہت مدد ملے۔

مسلمانوں نے اب سے پچاس برس پہلے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ تمدنی ترقی کے لئے تعلیمی اصلاح کی ضرورت ہے اور عرصے تک ان کی ساری کوشش یہ رہی کہ اپنی جماعت کے نظام تعلیم کو اپنی مخصوص مصلحتوں کے مطابق تشکیل دیں اور اس میں اتنا اہتمام کیا کہ سیاست کی طرف جتنی توجہ کرنی چاہئے تھی نہ کر سکے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کوشش بھی پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہماری جدوجہد اپنی مرکزی تعلیم گاہ (علی گڑھ کالج) اور اسلامیہ اسکولوں تک محدود رہی۔ سرکاری نظام تعلیم کو ہم نے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اصلاح کی کوشش درکنار موجودہ صورت میں اس سے جتنا فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا وہ بھی نہیں اٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی درسگاہوں نے حکومت کے تعلیمی ضابطوں کے شکنجے میں کسے ہونے کے باوجود ملتِ اسلامی کی بڑی خدمت کی لیکن وہ اس کُل تعلیمی ضرورتوں کی کفیل نہ ہوسکیں۔ اب دس بارہ سال سے ہم نے زمانے کی رفتار سے مجبور ہو کر سیاست کے میدان میں قدم بڑھایا تو تعلیم کو ایسا چھوڑا کہ کبھی بھول کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری اکثر تعلیم گاہوں کی حالت ابتر ہوگئی اور بدتر ہوتی جاتی ہے۔

ہم سیاست کی اہمیت کے منکر نہیں لیکن ہمارا یہ راسخ عقیدہ ہو کہ خود سیاست میں بھی ہماری کامیابی ہماری تعلیمی ترقی پر موقوف ہو۔ ہمارے نزدیک ملت اسلامی کی سب سے شدید ضرورت اس وقت یہ ہے کہ تعلیم کے ماہروں اور حامیوں کی ایک جماعت ہماری موجودہ تعلیمی حالت کا جائزہ لے اور اس بات پر غور کرے کہ ملک کی آئندہ تعلیمی پالیسی میں ملک کی مشترکہ مصلحتوں کے ساتھ ساتھ ہماری مخصوص مصلحتوں کو پیش نظر رکھنے کی کیا صورت ہونا چاہئے۔ سیاسی "تحفظات" اپنی جگہ پر ضروری ہیں مگر تعلیمی "تحفظات" ان سے کہیں زیادہ اہم ہیں گو اس شورش کے زمانے میں ہمیں ان کی اہمیت نظر نہ آئے۔ مسلمانوں کا ہندوستان کی قومی زندگی میں وہ حصہ پانا جو ہمارے شایاں شان ہے اور ملک کی وہ خدمت انجام دینا جو ہمارا حق اور ہمارا فرض ہے بہت بڑی حد تک اس پر موقوف ہو کہ ملک کی تعلیم ہمارے مذاق کی اور ہمارے کام کی ہو اور ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع ملے۔

کتبہ محمد نصیر

کمک آپہنچی تو مجبوراً ان دونوں نے محاصرہ اٹھا لیا۔ صمیل حصار سے نکل کر اہل کمک سے ملا اور ان لوگوں کو نہایت فیاضی کے ساتھ زر و مال دیا۔ ان میں سے نیک اور اچھے لوگوں کو پچاس پچاس دینار اور بڑے بڑے سرداروں کو دو دو سو دینار اور عوام کو دس دس اور ایک ایک تھان ریشم کا تقسیم کیا۔ یہ لوگ صمیل اور اس کا مال و دولت اور خدام کو ساتھ لئے ہوئے قرطبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ سرحد یعنی علاقہ سرقسطہ کو خالی کر دیا۔

ابن معاویہ کے متعلق صمیل سے مشورہ کچھ دور بڑھ کر تینوں اموی سردار صمیل کو تنہائی میں لے گئے اور پہلے ابو عثمان عبید اللہ نے اُس سے گفتگو کی اور ابن معاویہ کا خط اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ تم ہمارے امیر ہو بغیر تمہارے سیاہ و سفید کچھ نہ ہوگا تم بلا کسی ناگواری و ناخوشی کے اپنی رائے ظاہر کرو جس بات سے تم متفق ہوگے اسی سے ہم بھی اتفاق کریں گے جس کو تم ناپسند کرو گے ہم بھی ناپسند کریں گے۔ صمیل نے ان سے کہا "اچھا مجھے مہلت دو تاکہ میں غور و فکر کے بعد جواب دوں۔ پھر صمیل نے واپسی کی تیاری کی اور ابن معاویہ کے ایلچی کو دس دینار اور ایک ریشمی تھان انعام دے کر قرطبہ آیا۔ اموی اپنے اپنے مکانوں کو لوٹ آئے ان کے ساتھ بدر اور چار آدمی اور تھے اور سامان بھی ساتھ تھا۔ سرقسطہ کے حالات سن کر یوسف نے سرحد کی طرف چڑھائی کرنے میں بہت سختی سے کام لیا۔ یہ واقعات سنہ ۱۳۸ھ کے ہیں۔

فراہمی فوج کے لئے یوسف کا اضطراب اور اس کے ساتھیوں کا مخالفانہ رویہ جب یوسف تیار ہو کر جنگ کے لئے نکلا تو اس نے عبداللہ ابن خالد اور ابو عثمان کو بلا بھیجا جب وہ آئے تو اُن میں سے ایک کے پاس بیٹھ گیا اور کہا کہ ہمارے معاونین و موالی کو مدد کے لئے توجہ دلاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ ہماری قوم میں خروج کی استعداد نہیں ہے کیونکہ جو لوگ ہمت کے قوی تھے اور ابو جوشن (صمیل) کے ساتھ چلے گئے تھے وہ لڑائی میں سفر اور جاڑے کی مصیبتوں سے ہلاک ہو گئے۔ ساری سعی بیکار رہی، مشقت الگ رہی۔

بھرتی کے لئے روپے کی تقسیم یہ عذر سن کر یوسف نے ایک ہزار دینار ان دونوں کو دئے اور کہا کہ اس

رقم سے تم دونوں ان لوگوں کو مضبوط بنا کر مدد کے لئے لاؤ۔ انھوں نے کہا وہ تعداد میں پانچسو ہیں یہ رقم ان میں کیونکر تقسیم ہو سکتی ہے۔ یہ کہہ کر روپیہ لے لیا اور فوج کو ہموار کرنے کے لئے روانہ ہوگئے مگر جب آگے چلے تو انھیں خیال آیا کہ یہ روپیہ ہم کیوں نہ لے لیں تاکہ اس کی بدولت ابن معاویہ کے متعلق اپنا ارادہ مضبوطی کے ساتھ پورا کر سکیں غرض یہ سوچتے ہوئے منزل پر پہنچے اور اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ یوسف نکلا تو سیدھا جیان پہنچا۔ وہیں ابوعثمان و عبداللہ آگئے۔

یوسف کے روپے کا خودساختہ مصرف

جیان آنے سے پہلے ان دونوں نے یہ کارروائی کی تھی کہ جب دینار لے کر پہنچے تو دونوں نے ان دیناروں کو بنی امیہ پر تقسیم کر دیا۔ فی کس دس روپیہ سے زیادہ حصہ میں نہ آئے مگر ان لوگوں نے یہ تقسیم لڑنے کے لئے نہیں کی بلکہ اپنے مقصد کو پورا کرنے اور تالیف قلوب کے لئے کی تھی۔ جب جیان میں یوسف سے ملے تو یوسف مخاصۃ الفتح پر ٹھہرا ہوا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ یوسف نے جیان ہی میں اپنے لشکروں اور مختلف گروہوں کو تنخواہیں تقسیم کیں اور انعامات دیئے

فوج کے لئے یوسف کا تقاضا اور اس کا جواب

جب ابوعثمان نے سمجھ لیا کہ نہ یوسف آگے بڑھتا ہے نہ مستقل قیام کرتا ہے تو یوسف سے ملا۔ یوسف نے اس سے پوچھا۔ اے عبداللہ ہمارے مددگار کہاں ہیں ابوعثمان نے وعادے کر کہا "آپ کے مددگاران ۵۰۰ آدمیوں کے سوا یہاں اور کوئی نہیں ہے اور ان لوگوں نے امیر کے (آپ کے) طلیطلہ پہنچنے تک کی مہلت حاصل کر لی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ امیر کے طلیطلہ پہنچنے تک ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے اس طرح آنے سے انھیں کچھ نئی فصل جو کی آسانی سے مل جائے" یہ سال ۱۳۷ھ نہایت برا سال تھا لوگ قحط میں مبتلا تھے اسی سال ذیقعد کے مہینے میں یوسف نے سرقسطہ پر چڑھائی کی تھی۔

ابوعثمان کے اس جواب پر یوسف کو کوئی بدگمانی نہیں ہوئی اور ان کی بات کو سچ سمجھا اور ابوعثمان سے کہا اب تم پھر ہمارے مددگاروں کے پاس جاؤ اور اپنی طرف سے ان پر ایک دارد غہ مقرر کر دو یہ انتظام یوسف نے اپنی ضرورت کے لحاظ سے کیا تھا۔ جب یوسف جانے لگا تو ابوعثمان

بھی اس کے ساتھ ہو گیا تاکہ اسے رخصت کرکے صمیل سے بھی رخصت ہو لے۔

صمیل کی اخلاقی حالت

صمیل سے ابو عثمان وغیرہ کی ملاقات و گفت و شنید

صمیل اپنے لشکر ہی میں پڑا تھا اس نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت نہ کی وہ ہمیشہ شراب میں مست رہتا تھا کوئی رات ایسی نہ گزرتی تھی جس میں مدہوش نہ رہتا ہو۔ جب عبیداللہ ابو عثمان پہنچا اُس وقت بھی بیہوش تھا۔ ابو عثمان تھوڑی دیر منتظر رہا۔ اتنی مدت میں سب لوگ چلے گئے۔ صمیل اور اُس کے خادموں کے سوا کوئی نہ رہا جب صمیل خوابگاہ سے باہر آیا تو عبیداللہ ابو عثمان و عبداللہ ابن خالد دونوں اس کے پاس گئے صمیل نے اُن سے پوچھا "کیا خبر ہے اور تم کیسے آئے ہو" دونوں نے یوسف کی اجازت کے مطابق یہ بیان کیا کہ ہمیں طلیطلہ میں بنی امیہ کے ساتھ پہنچنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ صمیل نے اس بات کو پسند کیا پھر یہ لوگ ساتھ چلے اور صمیل کے قریب آکر کہا کہ "ہمیں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا ہے" یہ سن کر صمیل نے اپنے ساتھیوں کو ہٹا دیا۔

ابن معاویہ کے متعلق صمیل کا حوصلہ افزا جواب

اب ان دونوں نے صمیل سے کہا کہ ہم آپ سے عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے معاملے میں مشورہ چاہتے ہیں ابھی ان کا ایلچی واپس نہیں گیا ہے اور جواب کا منتظر ہے۔ صمیل نے کہا میں اس بات سے غافل نہیں ہوں میں نے ابن معاویہ کے معاملے میں غور کیا ہے اور استخارہ بھی کر چکا ہوں۔ اس کا خیال مجھے عرصہ سے ہے مگر میں نے اخفاء راز کے لئے کسی سے اس معاملے میں کبھی مشورہ نہیں کیا ہے۔ میری رائے میں ابن معاویہ میری مدد کا مستحق ہے اور حکومت کا بھی وہی اہل ہے اس لئے تم دونوں انھیں بسم اللہ کرکے اپنی رضامندی سے مطلع کر دو اور یہ لکھ دو کہ وہ اپنے اس معاملے کا انحصار مجھ پر رکھیں۔ میں یوسف کی بیٹی ام موسیٰ بیوہ قطن ابن عبدالملک سے عبدالرحمن ابن معاویہ کا نکاح کر دوں گا بشرطیکہ وہ ہم جلیسا ہو کر رہے۔ اگر امیر یوسف نے بھی منظور کر لیا تو کوئی مضائقہ نہیں ہم اس کے ممنون ہوں گے اور اگر انکار کر دیا تو یہ بہت آسان ہے کہ ہم اپنی تلواروں سے یوسف کا خاتمہ کر دیں۔ صمیل کا یہ جواب سن کر دونوں نے اُس کے ہاتھ چومے اور شکریہ ادا کیا۔

مزید غور و فکر کے بعد صمیل کا پہلی رائے بدل دینا ابو عثمان عبید اللہ ابن غثمان بیان کرتے ہیں کہ ہم صمیل سے رخصت ہو کر تقریباً ایک میل گئے ہوں گے اور دل میں خوش ہو رہے تھے کہ ہمارا کام بن گیا کہ پیچھے سے کسی شخص کی آواز آئی جو ابو عثمان کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ ہم نے دیکھا تو صمیل کا خادم تھا جو گھوڑا بڑھائے ہماری طرف چلا آ رہا تھا ہم ٹھہر گئے اس نے ہم سے کہا "ابو جوشن کہتے ہیں تم دونوں ہمارے آنے تک ٹھہر جاؤ" ہمیں اس کے بے موقع آنے سے خطرہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مصیبت میں پڑ جائیں، مگر خدا پر بھروسہ کر کے استقبال کو آگے بڑھے دیکھا تو وہ اپنے سفید خچر کوکب پر سوار چلا آ رہا ہے ہم صمیل کو تنہا دیکھ کر مطمئن ہوئے کہ اگر اس کی نیت بری ہوتی تو اس کے ساتھ اس کے مددگار بھی ہوتے ہمیں دیکھ کر صمیل نے قریب بلایا اور کہا جب سے تم نے ابن معاویہ کے خط اور اس کے ایلچی کا تذکرہ کیا ہے میں اسی فکر میں ہوں میں تمہاری رائے کو پسند کرتا ہوں میں جو کچھ جواب دے چکا ہوں تمہیں معلوم ہے۔ مگر جب تم مجھ سے جدا ہوئے تو میں نے ابن معاویہ کے متعلق مزید غور و تدبر سے کام لیا اور سمجھ لیا کہ وہ اس قوم سے تعلق رکھتا ہے کہ اگر ان میں کا کوئی اس جزیرہ میں پیشاب کر دے تو ہم تم سب اس کے پیشاب میں غرق ہو جائیں، ادھر یوسف کا بھی مالی احسان ہم پر اتنا ہے کہ ہم گردن نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے میں نے اپنی رائے بدل دی ہے بخدا اگر تم دونوں اپنے گھر پہنچ جاتے تب بھی میں تم کو اپنی جدید رائے سے مطلع کر کے رہتا۔ مبادا تم دھوکے میں پڑ جاؤ اور اب میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ سب سے پہلے جو شخص ابن معاویہ پر تلوار اٹھائے گا وہ میں ہوں گا۔ اللہ تمہاری رائے میں برکت دے اور تمہارے آقا کو بھی برکت عطا کرے۔

ابو عثمان کہتے ہیں میں نے صمیل کو جواب دیا کہ اللہ تمہارا بھلا کرے ہم تو تمہاری ہی رائے کے پابند ہیں۔ صمیل نے کہا نہیں ایسا نہ کہو کیونکہ تمہارا تو مقصد ہی ابن معاویہ کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اور اگر ابن معاویہ حکومت کے سوا کچھ اور چاہیں تو میرے نزدیک یہ بہتر ہے کہ یوسف ان کی غمخواری کرے اور ان کو اپنا داماد بنا لے۔

اس گفتگو کے بعد یہ دونوں آگے روانہ ہوئے۔ صمیل ان سے رخصت ہو کر اپنے ڈیرا پر پہنچا۔

ابن معاویہ کے طرفداروں کی قبائل مضر و ربیعہ سے مایوسی اور یمنی قبائل سے تحریک دعوت ابوعثمان کا بیان

ابوعثمان کا بیان ہے کہ مضر و ربیعہ کے تمام قبائل سے ہماری امید منقطع ہوگئی کیونکہ صمیل ابن معاویہ کے خلاف ہوگیا تھا اور اب یہ رائے ہوئی کہ اہل یمن سے تحریک کر کے ان کو اپنی رائے میں شریک کرلیا جائے۔" ہم نے فوراً یہی کیا۔ جس یمنی کو قابل اعتماد و دانشمند پاتے اس سے ابن معاویہ کا ذکر کر کے اس تحریک میں شریک ہونے کی دعوت دیتے۔ انھیں میں ہمیں ایک قوم ایسی ملی جن کے سینے مضر کی دشمنی سے معمور تھے اور وہ خود کسی ایسے حیلہ کے خواہاں تھے جس سے انھیں بنی مضر سے بدلہ لینے کا موقع مل سکے اس لئے اندلس میں بنی امیہ کی حکومت کے دل سے خواہاں تھے بعدازاں ہم اپنے لشکر میں پہنچے چونکہ بنی مضر سے مایوس ہوچکے تھے اس لئے ان سے کوئی تعرض نہ کیا اور ایک جہاز خرید کر ہم گیارہ آدمی سوار ہوئے جن میں بدر بھی تھا۔ ان گیارہوں آدمیوں کے نام اچھی طرح یاد نہیں رہے بعض کے یاد ہیں۔ ان میں سے ایک ہشام کا غلام شاکر تھا ایک تمام ابن علقمہ ثقفی ہم نے تمام کو پانچسو دینار دیئے تھے تاکہ اس کے ضروری مصارف کے لئے کافی ہوں اور بربریوں کو تقسیم کئے جاسکیں۔ جب ہمارا جہاز ساحل پہ پہنچا تو ابن معاویہ مقام مغیلہ میں جو ابن قرہ مغیلی کی زیر حکومت تھا۔ اپنے غلام بدر کے منتظر تھے۔ ہم لوگ جہاز میں بیٹھے ہوئے ادھر سے گزرے تو انھیں خبر ہوئی اور وہ مغرب کی نماز پڑھنے لگے۔ ابن معاویہ نے نماز سے فارغ ہو کر اس طرف دیکھا تو جہاز لنگر انداز ہوچکا تھا۔ اور بدر ان کی طرف تیرتا ہوا آرہا تھا۔ بدر نے آتے ہی اندلس کی ساری کارروائی بیان کر کے کامیابی کا مژدہ سنایا اور ابوعثمان و عبداللہ ابن خالد وغیرہ اہل اندلس کی کوشش و رضامندی کا ذکر کر کے جہاز کی حقیقت بیان کی جو لوگ اس میں سوار تھے ان کے نام بتائے اور خرچ کے لئے جو کچھ مال و دولت اس میں تھی اس کی تفصیل کہی۔ پھر عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے پاس تمام ابن علقمہ پہنچے تو ان سے پوچھا تمھارا کیا نام ہے انھوں نے کہا "تمام"، پھر پوچھا تمھاری کنیت کیا ہے تمام نے کہا "ابو غالب" یہ سنتے ہی عبدالرحمٰن بولے اب ہمارا کام ہوگیا۔ ہم اپنے دشمن پر غالب ہوگئے۔ اس نیک فالی کے صلہ میں عبدالرحمٰن نے امیر اندلس ہونے کے بعد ان کو اپنا حاجب مقرر کرلیا تھا اور تمام اپنے آخر دم

تک اسی خدمت پر رہے۔

روانگی کے موقع پر ایک بربری سے آویزش ان حالات کے بعد جب عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے چاہا کہ جہاز پر بیٹھ کر روانہ ہوں تو بربریوں نے بڑھ کر تعرض کیا۔ ان کو ہموار کرنے کے لئے تمام نے ان کے مرتبہ کے اعتبار سے ہر ایک کو زر و مال تقسیم کیا۔ بظاہر ان لوگوں میں سے کوئی ایسا باقی نہ رہا۔ جسے کچھ نہ ملا ہو مگر جب جہاز میں بیٹھنے لگے تو ان میں کا ایک بربری جو اس وقت موجود نہ تھا اور اسے کچھ نہ ملا تھا آگے بڑھا اور جہاز کی رسی سے لٹک گیا۔ یہ دیکھ کر شاکر نے اس کے ہاتھ پر تلوار ماری۔ اس کا ہاتھ کٹ گیا۔ اور وہ آدمی سمندر میں جا گرا اور جہاز روانہ ہو گیا۔

عبدالرحمٰن الداخل کی امارت کی تاسیس

منکب میں داخلہ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کا آغاز یہ جماعت ماہ ربیع الثانی ۱۳۸ھ میں مقام منکب پر اتری عبداللہ ابن خالد اور ابو عثمان نے عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو قصبہ طروش میں ابوالحجاج کے مکان پر پہنچایا ابوالحجاج (یعنی یوسف ابن بخت) اور تمام بنی امیہ عبدالرحمٰن سے ملے۔ ریہ کے باشندے جدآو ابن عمرو مذحجی بھی آئے جو بعد میں عبدالرحمٰن کے عساکر میں قاضی کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ عاصم ابن مسلم ثقفی اور ابو عبدہ حسان نے بھی یہیں بیعت کی موخر الذکر کو عبدالرحمٰن نے اپنا وزیر بنایا۔ پھر عبدی ابوبکر بن طفیل اور اطراف و نواح کے تمام لوگ اکٹھا ہوتے اور عبدالرحمٰن کے گروہ میں شامل ہوتے۔

یوسف کو اپنے طرفداروں کی طرف سے پریشانی عامر و زہری وغیرہ کی گرفتاری اور ان کے قتل کا مشورہ راوی کا بیان ہے کہ یوسف فہری جب طلیطلہ پہنچا تو کہا "کیا بات ہے کہ ہمارے مددگار اب تک نہیں آئے" جب اس نے کئی بار یہی کہا تو صمیل نے جواب دیا یہاں سے چلو یہ لوگ نہ تم جیسوں کی مدد کریں گے نہ تمھیں ان کا انتظار کرنا چاہئے۔ بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وقت ہی ہاتھ سے نہ نکل جائے اس لئے یوسف سرقسطہ روانہ ہوا وہاں سرقسطہ والوں نے لشکروں کی ایذا سے ڈر کر عامر اور اُن کے بیٹے وہب ابن عامر اور زہری کو یوسف کے سپرد کر دیا۔ یوسف نے انھیں گرفتار کر کے قتل کرنا چاہا۔ اور قبیلہ قیس کے سرداروں سے مشورہ کیا تو سب نے نفی میں جواب دیا۔ بلکہ سلیمان ابن شہاب اور حصین

ابن وجن بہت سختی سے ان کے قتل کے خلاف ہو گئے۔ جب یوسف نے تمام لشکر کو خلاف پایا تو انھیں قید کر دیا۔

امیر یوسف سلیمان ابن شہاب کو ایک خطرناک مہم پر مقرر کر کے کمینہ نکالتا ہے۔ سلیمان کا قتل عامر و زہری وغیرہ کا خاتمہ

پھر یوسف کو مناسب معلوم ہوا کہ ایک لشکر شلنش والوں کی طرف بنبلونہ روانہ کرے کیونکہ بنبلونہ کے لوگ بھی جلیقیہ والوں کی طرح خلاف معاہدگی کر چکے تھے اس لئے اس نے ایک لشکر تیار کر کے سلیمان ابن شہاب کی سرداری میں بنبلونہ بھیجا کیونکہ وہ سلیمان ابن شہاب کو اپنے پاس سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ سوار فوج اور مقدمہ پر حصین ابن وجن کو افسر مقرر کیا۔ پھر اسی فوج کو ایسی کمزور حالت میں بے سوچے سمجھے مقابلہ پر روانہ کر دیا۔ ان کی تباہی کا کچھ خیال نہ کیا جب یہ لشکر اس مہم پر پہنچ گیا تو یوسف تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ وادی شرنبہ پہنچا۔ یہاں یوسف کو وہ ایلچی ملا جو سلیمان ابن شہاب کے شکست، اس کے قتل اور عامۃ الناس کی خونریزی کی خبر لایا تھا، اس نے یہ بھی اطلاع دی کہ "ہزیمت خوردہ فوج میں سے جو لوگ بچ گئے تھے ان میں سے حصین ابن وجن کے ہمراہی ابوزید عبدالرحمٰن ابن یوسف کے پاس سرقسطہ میں ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کو امیر یوسف نے سرحد پر چھوڑا تھا۔ یوسف کو اس خبر سے خوشی ہوئی۔ اب یوسف نے عامر اُس کے بیٹے وہب اور زہری کو بلایا جو اس کے قیدی تھے۔ اس وقت صمیل نے یوسف سے کہا "ابن شہاب کا تو کام تمام ہو ہی چکا ہے۔ میں اب ان لوگوں کی بھی گردن ماردو۔ چاشت کا وقت تھا اور یوسف و صمیل دونوں وادی شرنبہ میں قیدیوں کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک دن پہلے سے مقیم تھے یوسف نے صمیل کے کہنے پر عمل کیا اور تینوں کے قتل کا حکم دے دیا۔

جب اس کام سے فرصت ہو گئی تو یوسف اور صمیل نے مل کر کھانا کھایا۔ اس موقع پر صمیل نے یوسف سے کہا سلیمان ابن شہاب مارا گیا اور عامر اور زہری کو تم نے مار ڈالا بخدا اب تم اور تمھاری اولاد دجال کے خروج تک محفوظ رہے گی اور اب تم سے کوئی جھگڑا کرنے والا نہیں رہا۔

قرطبہ کے ایلچی کی آمد

یوسف وہاں سے اٹھ کر اپنے بیٹوں کے پاس آرام کی غرض سے چلا اور گھر میں جا کر

اپنا دایاں پاؤں بائیں پاؤں پر رکھ کر فکر کے عالم میں لیٹ گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کا دایاں پاؤں بائیں پاؤں پر اسی طرح رکھا تھا کہ اہل لشکر نے قرطبہ کے ایلچی کی آمد کا نعرہ لگایا۔ یہ سن کر یوسف اٹھ بیٹھا۔ لوگوں نے کہا بخدا افلاں کا غلام ام عثمان کے خچر پر بیٹھا ہوا ہے۔ ام عثمان یوسف کی ام ولد یعنی اس کی مدخولہ لونڈی تھی اور اس کی حکومت کے شریک ان دنوں ڈاک کے ہرکارے قحط سالی کی وجہ سے نہ ملتے تھے اور ڈاک کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں ایلچی آگیا اور اس کے پاس ایک رقعہ نکلا جس میں عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے داخل ہونے اور طردش میں غدار عبیداللہ ابن عثمان کے پاس مقیم ہونے کی خبر درج تھی اور یوسف کو لکھا تھا کہ بنی امیہ ابن معاویہ کی امارت پر متفق ہوگئے ہیں۔ تمہارا نائب متعینہ البیرہ اہل طاعت (غیر مسلم رعایا) کی جماعت لے کر ابن معاویہ پر حملہ آور ہوا تھا تاکہ اسے یہاں سے نکال دے مگر نائب کو شکست ہوئی اور اس کے ساتھی زخمی ہوئے لیکن کوئی قتل نہیں ہوا۔ اب جیسی مصلحت ہو۔

قرطبہ کے حالات پر صمیل سے مشورہ
افشائے راز پر یوسف کے لشکر میں شورش

یوسف نے مشورہ کے لئے صمیل کو بلایا وہ اس ناوقت طلبی سے خوفزدہ سا ہوگیا۔ اگرچہ اسے ایلچی کے آنے کی خبر مل چکی تھی لیکن اصل معاملہ سے بےخبر تھا اس نے یوسف سے کہا اصلح اللہ الامیر۔ آپ اس وقت کیوں ملول ہیں کیا کوئی حادثہ ہوا ہے یوسف نے کہا "بیشک بڑا حادثہ ہے" میں اللہ سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آج کے واقعہ قتل پر خدا کا عذاب ہم پر نہ آتا ہو۔" صمیل نے کہا انھیں کا نہیں بلکہ سب کا انتقام اللہ کے لئے آسان ہے۔" خیر کہئے کیا بات ہے یوسف نے خالد سے کہا کہ صمیل کو ام عثمان کا خط پڑھ کر سنا دو یہ خط سن کر صمیل نے کہا معاملہ سخت ہے اور ہماری رائے یہی ہے کہ ہم فوراً اپنی موجودہ جمعیت کے ساتھ ابن معاویہ کا مقابلہ کریں۔ اس کو قتل کرلیں گے یا پسپا کر دیں گے اگر وہ پسپا ہو کر بھاگ گیا تو حکومت اس کی کبھی نہیں ہوسکتی۔ یوسف اور صمیل وغیرہ اس رائے سے متفق ہوگئے مگر نائب کی شکست کی خبر عام فوج میں پھیل گئی اور راز محفوظ نہ رہ سکا۔ اس شہرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر والوں میں برہمی پیدا ہوگئی کیونکہ یوسف کے آدمیوں میں سے پہلے ہی بہت سے لوگ بنباونہ کی مہم میں سلیمان ابن شہاب کے ساتھ قتل ہو چکے تھے جو ان میں

سے بچ آئے تھے وہ اس وقت سرقسطہ میں مقیم تھے اس لئے لوگوں نے شورش مچا کر اپنے گروہوں سے کہنا شروع کیا کہ ابھی تو ہم ایک لڑائی سے آ رہے ہیں۔ اب دوسری کی فکر ہو رہی ہے" یہ ایک ہی موقع پر دو دو لڑائیاں کیسی"

فوج کا جائزہ اور یمنی سپاہیوں کی علاحدگی | اس کے بعد جب شام کو یوسف کی فوج میں جائزہ ہوا تو یمنی سپاہیوں میں سے دس آدمی بھی نہ ملے صرف وہی لوگ رہ گئے جو نہ اپنی قوم کا ساتھ دے سکتے تھے نہ افسری سے ہاتھ اٹھا سکتے تھے۔ البتہ قبیلہ قیس کے لوگ تھے اور کچھ قبائل مضر کے رہ گئے تھے جو تعداد میں تھوڑے اور سفر کے تکان کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ان لوگوں نے یوسف کو تسلی دی اور قرطبہ چلنے کا مشورہ دیا مگر صمیل اس وقت تک ابن معاویہ سے لڑنے ہی پر مصر تھا۔ انھیں مشوروں میں بارش شروع ہو گئی اور سردی کا موسم آنے کی وجہ سے دریاؤں میں طغیانی آ گئی مجبوراً یوسف عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر کے قرطبہ روانہ ہوا۔

امیر یوسف ابن معاویہ کے پاس وفد بھیجتا ہے | راستہ میں ایک شخص نے یوسف سے کہا ابھی تک عبدالرحمٰن ابن معاویہ کا ارادہ حصول ملک کی نسبت معلوم نہیں ہوا وہ تو حصول معاش اور پناہ لینے کی غرض سے آیا ہے اگر تم اس کو اپنا داماد بنانا چاہو گے اور رعایت و سلوک سے پیش آؤ گے تو یقین ہے کہ وہ اسے منظور کر لے گا اس لئے مناسب تو یہ ہے کہ اس کے پاس ایک وفد بھیجو یوسف نے قرطبہ پہنچ کر عبید بن علی، خالد بن زید اپنے کاتب اور مولی اور عیسیٰ ابن عبدالرحمٰن اموی منتظم ذخائر رسد و افسر فوج خاصہ (باڈی گارڈ) کا ایک وفد بھیجا اور تحائف میں کچھ سامان دو گھوڑے دو خچر دو غلام اور ایک ہزار دینار ساتھ کئے اور عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو لکھا کہ آپ کے اجداد نے ہمارے دادا عقبہ ابن نافع اور ان کے خاندان کے ساتھ سلوک کئے ہیں وہ بھولنے کے قابل نہیں۔ اس عبارت کے بعد عبدالرحمٰن کو اپنا داماد بنانے اور رشتہ قبول کرنے کے لئے بھی لکھا تھا۔

ارکان وفد کی ہوشیاری | یہ وفد یوسف سے رخصت ہو کر [illegible] پہنچا جو قرطبہ کے قریب واقع ہے یہاں عیسیٰ ابن عبدالرحمٰن ملقب بہ تارک الفرس نے دوسرے ارکان وفد سے کہا کہ اپنی عقل [illegible]

یوسف اور صمیل زندہ ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ اگر ہم اس ہدیہ کو لے کر پہنچے اور عبدالرحمن ابن معاویہ کو ناگواری ہوئی تو کیا وہ ہمارے پاس کا سارا مال و دولت لے کر اور مضبوط و قوی نہ ہو جائے گا۔ اور اس سے ہمارے امیر کو نقصان نہ پہنچے گا۔ لوگوں نے غور کیا تو اپنی رائے کی غلطی معلوم ہوئی اس لئے ان میں سے بعض نے کہا "تم اس سامان کے ساتھ یہیں ٹھہرو ہم ابن معاویہ کے پاس جاتے ہیں اگر ہم نے عبدالرحمن ابن معاویہ کو راضی پایا تو اپنے کسی آدمی کو بھیج کر تم کو بلالیں گے تم یہ سب کچھ لے کر آجانا اور اگر اس کے سوا کچھ ہوا تو امیر یوسف کے پاس مع ان اشیا کے واپس ہو جانا۔ کیونکہ اپنے مال کا وہی زیادہ مستحق ہے" اس مشورہ کے بعد عبید و خالد طروش میں ابن معاویہ کے پاس پہنچے جو ابو عبداللہ کے یہاں تھے ابوعثمان کے پاس اس وقت بنی امیہ کی جماعت مقیم تھی اور یمن کے لوگ برابر آتے رہتے تھے اور اپنا مرتبہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں دمشقی یعنی البیرہ والے، اردنی یعنی مالقہ والے اور قنسرین یعنی جیان والے بھی تھے۔ ان دونوں عبید ابن علی اور خالد ابن زید نے جدا گانہ اپنے آقا امیر یوسف کا مدعا بیان کیا اور محبت و تعلقات کی دعوت دی اور یوسف کے ساتھ رشتہ کا ذکر کر کے حق سفارت ادا کیا پھر دونوں بیٹھ گئے

خالد ابن زید کی بیجا جسارت اور اسکا نتیجہ اب خالد ابن زید نے خط پیش کیا اس سے ابن معاویہ نے خط لے کر ابوعثمان کی طرف بڑھا دیا اور کہا "اسے پڑھو اور جو کچھ ہماری رائے تمھیں معلوم ہے اس کے مطابق جواب لکھو" لوگ پہلے ہی وفد کے اغراض سے ہمدردی رکھتے تھے یہ سن کر لوگوں نے ایلچیوں سے کہا کہ "تمھاری تحریک بہت اچھی ہے مگر عبدالرحمن ابن معاویہ تو اپنے ورثہ کے طالب ہیں" جب ابوعثمان نے خط لیا تو اس سے خالد نے کہا "اے ابوعثمان کس خیال میں ہو جواب لکھنے سے پہلے بغل سے پسینہ آجائیگا" خالد بڑا ادیب و دانا تھا اس خط کا مضمون اسی کا مرتب کیا ہوا تھا مگر عجب و خود بینی کی ترنگ میں اس موقع پر لغزش کھا گیا۔ ابوعثمان کو خالد کے یہ الفاظ ناگوار گزرے۔ اس نے خالد کو گالی دے کر خط اس کے منہ پر پھینک مارا اور کہا "نہ میں لکھوں گا نہ میری بغل سے پسینہ آئے گا" پھر لوگوں کو حکم دیا کہ خالد کو گرفتار کر لو خالد فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے عبدالرحمن ابن معاویہ سے کہا "یہ پہلی فتح ہے" یوسف کی کائنات

حکومت معلوم ہوگئی۔ خالد کے ساتھی عبید ابن علی نے کہا کہ "خالد ابھی ہے اور ابھی کو زوال نہیں" لوگوں نے جواب دیا "یہ کافر بچہ(۱) اپنی حد سے بڑھ گیا تھا تم بھی تو ابھی ہو تمھیں کسی نے کچھ نہیں کہا اگر وہ دشنام و بدگوئی کی ابتدا نہ کرتا تو ایسا کیوں ہوتا۔ بعد ازاں ان سب نے عبید کو جانے دیا اور خالد کو قید میں رہنے دیا

وفد کے اموال پر قبضہ کی کوشش

وفد کا جو مال ارش میں رہ گیا تھا۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے لوگوں کو اُس کی اطلاع مل گئی۔ انھوں نے اس پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے تیس سوار بھیجے مگر عیسیٰ کو پہلے ہی خالد کے گرفتار ہوجانے کا علم ہوچکا تھا اس لئے وہ سب سامان لے کر قرطبہ واپس ہوگیا۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے اس واقعہ کے بعد جب وہ امیر اندلس ہوگئے عیسیٰ کو اپنے یہاں رکھ لیا۔ وہ عیسیٰ سے اکثر کہا کرتے تھے "تمھارے تقرب و محبت میں کوئی شک نہیں مگر تم نے جو کچھ کیا کیا اب اس کا کیا ذکر کریں" وہ یہ عذر کر دیا کرتے تھے کہ "وفاداری کا تقاضا تھا اس لئے مجبوراً ایسا کرنا پڑا"، ابن معاویہ چونکہ عموماً اپنے موالی (مددگاروں) کا خیال کرتے تھے اس لئے انھوں نے امیر اندلس ہوکر عیسیٰ کی یہ خطا معاف کردی اور جیسا سلوک اپنے دوسرے موالی کے ساتھ اس قسم کی خطا پر کیا تھا ویسا اُن کے ساتھ نہیں کیا۔

ابن معاویہ کے لشکر کی تنظیم اور یوسف کی فوج میں تفریق

ابن معاویہ سے رخصت ہوکر عبید ابن علی یوسف کے پاس پہنچا اور یوسف کو خالد کی سرگزشت سے مطلع کیا یہ سن کر یوسف و صمیل کو سخت ناگواری ہوئی اور صمیل نے یوسف کو ملامت کی تم نے میری رائے پر عمل کیوں نہ کیا اور عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی خبر پہنچتے ہی میرے مشورہ کے مطابق اس پر حملہ کیوں نہ کر دیا۔

غرض اس زمانے میں شدت سرما کی وجہ سے فریقین میں سے کوئی حرکت نہ کرسکا۔ جاڑے ختم ہونے تک ابن معاویہ تمام لشکروں اور بربریوں سے خط و کتابت کرچکے تھے۔ یعنی سب بالاتفاق

---

(۱) خالد کا باپ عیسائی تھا اور خالد نے یوسف کے یہاں پرورش پائی تھی اس لئے اس پر یہ چوٹ کی گئی۔

ابن معاویہ کے ساتھ ہوگئے قبیلہ قیس میں سے جابر ابن علاء، ابن شہاب اور ابوبکر بن ہلال عبدی اور
حصین ابن دجن کے سوا کوئی ابن معاویہ کی طرفداری پر آمادہ نہیں ہوا۔ یہ تینوں بھی اس لئے طرفدار
ہوگئے تھے کہ یوسف اور صمیل نے ابن شہاب کو قتل کرا کے جو بدسلوکی کی تھی یہ لوگ یوسف و صمیل
سے اس کا انتقام چاہتے تھے علاوہ ازیں ان کی ناراضگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صمیل نے عبدی
ہلال اور بعض بنی ثقیف اور بنی امیہ کے تین سردار تمام بن علقمہ، عاصم عریان اور اس کے بھائی عمران
کو زک پہنچائی تھی۔ الغرض جملہ اہل یمن اور تین سردار بنی قیس کے ابن معاویہ کے ساتھ اور باقی
بنی قیس اور کل بنی مضر یوسف کے ساتھ ہوئے۔ اب یوسف نے اپنے لشکر کو شقندہ ضلع قرطبہ میں
مجتمع کیا تاکہ البیرہ پر حملہ کر سکے۔ چنانچہ مضر اور یوسف کے حمایتی بنی قیس جمع ہو کر یوسف کا انتظار کرنے
لگے۔ یمنی اور اموی ابن معاویہ کے پاس آگئے۔

ابن معاویہ کی فوج میں اہل یمن و بنی قضاعہ کی شرکت

راوی کہتا ہے کہ جب عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو اپنے خلاف یوسف کی
تیاری کا علم ہوا اور لوگوں نے ان سے کہا کہ البیرہ میں جو یمنی اور بنی
امیہ ہیں ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کی ذریعہ سے ہم قیس کی عداوت اور یوسف کی جمع کی
ہوئی فوج کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لئے ہمیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یمنی لشکروں سے مل جائیں
جو حمص یعنی اشبیلیہ، فلسطین یعنی مدینہ شذونہ، اردن یعنی مالقہ میں ہیں۔ اور ان کو لے کر یوسف کے
لشکر پر حملہ کریں۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے اس رائے پر عمل کیا۔ سب سے پہلے اہل اردن یعنی
مالقہ والے عرب جو زیادہ قریب تھے ملے پھر تمام اہل یمن و قضاعہ شامل ہوئے اور ان لوگوں نے دوسری
فوجوں کی بھی توقع دلائی۔ اہل اردن یعنی مالقہ والوں میں ان کے سردار کلم شریک تھے۔ یہاں سے
عبدالرحمٰن ابن معاویہ شذونہ کی طرف آئے جہاں لشکر فلسطین کے عرب رہتے تھے۔ شذونہ میں قوم
کے سرداروں اور لشکر کے مددگاروں نے بہت جلد تیار ہو کر عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی رفاقت اختیار
کر لی لیکن یہاں وہ لوگ جو بنی کنانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے سرداروں کے ساتھ کنانہ ابن
کنانہ کی سرکردگی میں یوسف کی امداد کے لئے پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔

اشبیلیہ کے لشکر کی شرکت

عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے شذونہ پر اپنے تسلط کے بعد بنی کنانہ کی باقیادہ اولاد و اقارب سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آگے بڑھا تو اشبیلیہ کا لشکر بھی ملا جس میں حمص کے لشکری تھے۔ اس موقع پر چیدہ چیدہ لوگوں نے جس میں شامی اور بلدی عرب تھے۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ سے ملاقات کی۔ یوسف کو عبدالرحمٰن کی آمد معلوم ہوئی تو وہ بھی پوری طرح تیاری کر کے حملہ آوروں کے مقابلہ کو چلا۔ اس سلسلہ میں جو گروہ جس فریق سے ہمدردی رکھتا تھا اسکی امداد کے لئے اس کے لشکروں میں شامل ہوگیا۔

ابن معاویہ کے لشکر کا علم اور اسکی کیفیت

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے پاس اُس وقت تک کوئی جھنڈا نہ تھا۔ امدادی فوجوں کے پاس اپنے اپنے جھنڈے تھے۔ ان لشکروں نے آپس میں کہا کہ ہمارا کام بھی کتنا الٹا ہے، ہمارے پاس تو جھنڈے ہیں مگر ہمارے امیر کے پاس نہیں یہ سن کر ابو الصباح یحیٰی یحصبی ایک نیزہ اور ایک عمامہ لے آئے۔ نیزہ حضرت موت کے ایک شخص کا تھا۔ پھر ان لوگوں نے انصار کے ایک نامعلوم شخص کو بلا کر اس کے نام و نسب سے فال لے اور قریہ قلنبسرہ ضلع طشانہ علوبہ اشبیلیہ میں یہ جھنڈا اس کے سپرد کیا۔ مجھ سے کئی بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ یہ نامعلوم شخص حقیقت میں ابو الفتح صدفوری مشہور عابد تھے۔

ابو الفتح صدفوری اور فرقد العالم

ابو الفتح صدفوری پر شوق جہاد غالب تھا۔ یہ کبھی کبھی جہاد ہی کے لئے سرقسطہ کی سرحد پر پڑاؤ ڈالتے تھے اور کبھی اپنے مسکونہ سرحد قلنبسر پر قیام کرتے تھے۔ ان کے تعلقات دونوں زمانوں میں فرقد العالم کے ساتھ دوستانہ رہے جس سرحد میں جاتے فرقد ان کے ساتھ ہوتے تھے، جب فرقد چلے جاتے تو یہ قلنبیرہ میں منتقل ہوجاتے تھے غرض یہ دونوں تقریباً ہر زمانے میں ساتھ رہے۔

علم کے متعلق فرقد العالم کی پیشگوئی

ابو الفتح کہا کرتے تھے کہ ایک بار فرقد ہمارے ساتھ جا رہے تھے جب شہر قسطونہ کے ضلع جیان میں پہنچے تو فرقد العالم نے کہا مجھے اس شہر کی نسبت ایک بری خبر کا خطرہ ہوا ہے۔ میرے پاس آؤ تو کہوں،، میں ان کے قریب ہولیا۔ اُس وقت انھوں نے مجھ سے اسی واقعہ کی پیشین گوئی کی جو امیر ابن معاویہ اور امیر ابو الاسود ابن یوسف کے درمیان پیش آنے والا تھا چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ پھر فرقد العالم نے ابن معاویہ کی آمد

کا حال بیان کیا اور کہا جب ہم صوبہ اشبیلیہ میں پہنچیں گے تو تمھیں وہ جگہ دکھائیں گے جہاں عبدالرحمٰن ابن معاویہ کا جھنڈا باندھا جائے گا اور اس کے پاس ایک فرشتہ اُن فرشتوں میں کا آئے گا جو جھنڈوں کی فتح ونصرت پر مقرر ہیں اور اس کے ساتھ چالیس ہزار فرشتے ہوں گے جن کے پیش پیش فتح ونصرت چلتی ہے اور چالیس دن کے اندر دشمن مقہور ہو جاتے ہیں اور فتح کامل ہو جاتی ہے۔

علم کا احترام اور اس کا خاتمہ امیر ہونے کے بعد عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس عمامہ کی اتنی عزت کی کہ جب اس کا کوئی حصہ پرانا ہو جاتا یا پھٹ جاتا تو اس پر دوسرا کپڑا چڑھا دیتے اور پیوند پر پیوند لگا کر اسی طرح پھر نیزہ پر باندھ دیتے تھے۔ ہشام و حکم و عبدالرحمٰن کے زمانہ تک جنگ ہائے مارہ میں اس نیزہ کا احترام اسی طرح ہوتا رہا۔ جب عبدالرحمٰن ثانی کے زمانہ میں لوگوں نے عمامہ کو بدلنا چاہا تو اس میں بہت سے پرانے پیوند لگے ہوئے دیکھے۔ عبدالرحمٰن ابن غانم اور اسکندرانی نے ان کو نیزہ سے اتار کر پھینک دیا اور ان دونوں نے اس کے بدلے ایک نیا عمامہ باندھا اس وقت جمہور وہاں موجود نہ تھے جب آئے تو انھوں نے اس حرکت کی مخالفت کی اور ان چیتھڑوں کے اوصاف بیان کر کے ان کو منگوالیا مگر وہ تلاش کرنے پر بھی کسی کو نہ ملے۔

قرطبہ پہنچنے میں تعجیل کی کوشش اس زمانے میں یوسف مدور صدف میں تھا جب فریقین کی فوجیں حرکت میں آئیں تو دونوں کے درمیان ایک دریا حائل تھا۔ ابن معاویہ طشانہ میں اتر گئے یہ واقعہ ابتدائی ذی الحجہ ۱۳۸ھ کا ہے چونکہ دریا طغیانی پر تھا پانی بہت تھا اس لئے عبور کی کوئی سبیل نہ نکلی۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے دریا کا زور کم ہو جانے کے خیال سے تھوڑے دن اور انتظار کیا کیا۔ پھر ابن معاویہ نے چاہا کہ قرطبہ پہنچنے میں یوسف سے سبقت کریں کیونکہ ان سے یہ کہا گیا تھا کہ وہاں عموماً آپ کے موالی رہتے ہیں جو بکثرت ہیں اس لئے عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے راتوں رات تیاری کر کے کوچ کر دیا تاکہ یوسف سے پہلے قرطبہ پہنچ جائیں۔ قرطبہ کا فاصلہ طشانہ سے پینتالیس میل تھا۔

ابن معاویہ کے ارادہ سے واقف ہو کر یوسف کا سبقت کی سعی کرنا عبدالرحمٰن ایک میل بھی نہ چلے تھے کہ یوسف کو ایک واقف کار نے عبدالرحمٰن کے ارادہ سے مطلع کیا اور یوسف بھی قرطبہ کی طرف

چل پڑا۔ اب یہ دونوں گھوڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کی طرح تیز تیز چل رہے تھے۔ دریا ان کے درمیان حائل تھا۔ دریا کے ایک جانب ابن معاویہ اور دوسری جانب یوسف اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ اس گھوڑ دوڑ میں مصروف تھے اور دونوں کی منزل قرطبہ پر ختم ہوتی تھی۔ ابن معاویہ نے یوسف کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ میرے ارادے سے واقف ہوگیا ہے اس لئے آگے نہ بڑھے اور اب یوسف بھی دریا پار وہیں ٹھہر گیا۔ اس کے بعد پھر یہ دونوں سفر کرتے رہے آخر یوسف مسارہ میں اترا اور ابن معاویہ دریا کے اس پار ہلش میں ٹھہر گئے۔

اس وقت ابن معاویہ کے ہمراہیوں میں سے جو لوگ کم ظرف اور ان کے رتبۂ امارت سے ناواقف تھے وہ ان سے علیحدہ ہوگئے یہ لوگ صرف اس امید پر ساتھ ہوگئے تھے کہ عبدالرحمٰن قرطبہ آئیں گے تو ہماری معاش وسیع ہوجائے گی اور اہل قرطبہ کو بھی مدد پہنچے گی۔ درحقیقت یہ لوگ معاش کی طرف سے سخت مصیبت میں تھے۔ صرف ساگ پات پر بسر کرتے تھے۔ چونکہ یوسف کی وجہ سے ان لوگوں کو فی الحال یہ امید پوری ہوتی نظر نہ آئی۔ اس لئے یہ لوگ عبدالرحمٰن ابن معاویہ سے علیحدہ ہوگئے۔ برخلاف ابن معاویہ کے یوسف نہایت آرام سے اپنی منزل پر پہنچا۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے جہاں چاہا قیام کیا۔

مقابلہ کے لئے ابن معاویہ کے لشکر کی تیاری اور ترتیب عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی جماعت برابر ترقی پر تھی۔ جن لوگوں کے دل ذرا بھی مضبوط تھے وہ سب مثلاً قرطبہ کے بنی امیہ اور یمنی۔ عبدالرحمٰن کے گروہ میں شامل ہوگئے۔ یوم پنج شنبہ ۹ ذی الحجہ کو یعنی عرفہ کے دن دریا کا زور کم ہوگیا۔ عبدالرحمٰن نے اپنی جماعت سے کہا اے لوگو ہم یہاں ٹھہرنے کے لئے نہیں آئے ہیں اور یہ تم جانتے ہو کہ ہم کو یوسف نے کس بات پر توجہ دلائی ہے اور ہم سے کیا چاہا ہے۔ اب میں تمہاری رائے میں متفق ہوں جیسا تم مشورہ دو گے اس پر عمل کروں گا۔ اگر تم مضبوط و قوی ہمت ہو اور مقابلہ کو پسند کرتے ہو تو مجھے مطلع کردو اور اگر امن و صلح کی طرف مائل ہو تو ویسا کہدو۔ تمام یمنی قبائل نے متفق ہو کر جنگ پر آمادگی ظاہر کی بنی امیہ نے بھی یہ دیکھ کر علیحدہ علیحدہ لشکر ترتیب دئے اور اہل شام کے سوار فوج پر عبدالرحمٰن ابن نعیم

کلبی اور یمنی پیادوں پر بلوسہ لخمی جو اہل فلسطین سے تھا۔ اور بنی لمہ کے پیادوں اور بربری سپاہیوں پر عاصم العریان سردار بنائے گئے۔ عاصم کو عریاں اس لئے کہتے ہیں کہ ایک موقع پر وہ صرف

عاصم العریان

پائجامہ پہن کر لڑا اور اللہ نے اسے فتح دی بنی امیہ کی سوار فوج پر حبیب ابن عبدالملک قرشی جو عمر بن عبدالولید کی اولاد سے تھا سردار مقرر ہوا۔ بربریوں کی سوار فوج میں سے جو لوگ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے ان پر ابراہیم ابن ہجرہ اودی افسر بنایا گیا۔ جھنڈا ابوعثمان کو تفویض ہوا۔ اس وقت عبدالرحمٰن ابن معاویہ بنی امیہ کے گروہ میں گھرے ہوئے کھڑے تھے اور کمان ہاتھ میں لئے ہوئے ایک اشقر گھوڑے پر سوار تھے۔

صلح کی امید موہوم پر یوسف کے یہاں دعوت کا انتظام

اس تمام تیاری کے بعد حملہ آوروں نے دریا کو عبور کیا۔ مگر یوسف نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اسی شام کو اپنے مخالفوں سے صلح کے لئے مراسلت شروع کی قریب تھا کہ تمام مراحل طے ہوجائیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بعض بنی امیہ صلح پر حریص تھے۔ اس لئے یوسف نے بکریاں اور گائیں ذبح کرا کے سب کے لئے راتوں رات کھانا پکوایا تاکہ دونوں لشکروں کو دعوت دے کیونکہ اس کے نزدیک فیصلہ صلح میں کوئی شک نہ تھا برخلاف اس کے ہمارا گمان یہ ہے کہ ابن معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے یوسف کو صلح کی امید اس لئے دلائی تھی کہ وہ ابن معاویہ کی فوجوں کے دریا سے اترنے میں مزاحمت نہ کریں۔

ابن معاویہ اور یوسف کی فوجوں کا مقابلہ یوسف کی فوج کا انتظام

جمعہ کی صبح کو جب کہ عیدالضحیٰ کی صبح بھی تھی صلح کی توقعات موہوم ثابت ہوئیں اور دفعۃً جنگ شروع ہوگئی۔ یوسف کی فوج کا انتظام یہ تھا۔ تمام اہل شام اور اہل مضر کی سوار فوج پر عبید ابن علی اور پیادہ فوج پر کنانہ ابن کنانہ کنانی اور جوش بن صمیل افسر تھے۔ پیادہ فوج پر یوسف نے اپنے بیٹے عبداللہ کو بھی مقرر کیا تھا اور اپنے غلاموں اور پروردوں کے گروہ پر اپنے غلام خالد سودی کو نگران بنایا تھا۔ خالد کی زیر کمان فوج میں یوسف کے موالی اور بربری اور عوام کثرت سے تھے۔ عبید بن علی کے ساتھ میسرہ میں بنی قیس کے سوار تھے۔

(باقی)

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے ناآشنا تھے آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشئی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں، پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشئی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اسکو لیجانیکی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گٹھیا، ورم۔ درد، پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بے مثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے۔ جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشئی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہلانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۸۔ دہلی

صحت کی تیر بہدف گولیاں

OKASA

جرمنی کی جادو اثر طبی ایجاد

کون ہے جس نے تجدید کی شہرہ آفاق، ہر پروفیسران درناف اور اسٹنکاہ کی حیرت انگیز تدابیر جراحی کا حال نہ سنا ہو۔ صرف بعض غدودوں کے بدل دینے سے بوڑھے سے بوڑھا آدمی تندرست جوان بنجاتا ہے) ان تدابیر پر دنیا ہنوز انگشت بدنداں تھی کہ جرمنی کے نامور ماہر طبیعات ڈاکٹر لاہوسین (ایم۔ ڈی) پروفیسر برلن یونیورسٹی نے اپنی اس دوا کے انکشاف سے ہل چل پیدا کردی ہے جو کثیر المصارف عمل جراحی کے عذاب اور خطرہ میں ڈالے بغیر از سرِ نو صحت کو بحال کردیتی ہے۔

اس عظیم الشان انکشاف پر اوکاسا کمپنی (برلین) کو بین الاقوامی نمائش پیرس اور اطالوی نمائش (فلورنس) میں گرینڈ پرکس طلائی تمغے اور مشہور و معروف "کراس آف آنر" بطور سند ملی ہیں ان کی نقلیں ہمارے دفتر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔ جھریاں اور سپید بال نیست نابود ہو جاتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اضمحلال چڑچڑاپن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں

اوکاسا کا استعمال شروع کردیجئے، اس سے پہلے کہ بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے۔ یہ دوا ہر دوا فروش کے یہاں سے مل سکتی ہے۔ ذیل کے پتے سے بھی منگا سکتے ہیں۔

Sole Agency Okasa co; Ltd; (Berlin)
22, Apollo street, P. O. Box No. 396,
Bombay.

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا۔

منکرین حدیث

جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی اسی وقت سے اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی جو اس کی دینی حیثیت کی منکر رہی یعنی ان کے انکار کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حدیث کے وجود یا اس کی حقیقت ہی کو نہیں مانتے یا اس کو بالکل جھوٹ جانتے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس کو دینی حجت نہیں تسلیم کرتے۔ دین خالص ان کے نزدیک سوائے قرآن کریم کے اور کچھ نہیں۔ حدیث کو وہ صرف دینی تاریخ قرار دیتے ہیں جس سے عہد رسالت اور زمانہ صحابہ میں قرآن پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اور بس۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے، بلکہ ان میں سے ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے۔ اس نے امام موصوف سے سوال کیا جو مختصراً یہ تھا۔

> "قرآن میں جو فرائض مسلمانوں پر عائد کئے گئے ہیں ان میں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو، کسی کو خاص، اور کسی کو صرف مباح، اور یہ سب کچھ ان روایات کی بنیاد پر کرتے ہو جو ان لوگوں سے مروی ہیں جن میں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا نہ ان سے ملے اور باوجود اس کے کہ ان رواۃ حدیث میں سے جن کی عدالت اور ثقاہت تمہارے نزدیک مسلم ہے تم کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہے، پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ کتاب الٰہی کے احکام اور فرائض میں ان کے ذریعے سے تفریق کر ڈالتے ہو"

امام صاحب نے اس کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے، اور سنت وہی ہے جس کو قرآن نے "الحکمۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ [1] ۳/۱۵۹

مومنوں پر اللہ نے احسان کیا جو ان کے اندر انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا جو آن کو اللہ کی آیتیں سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

دوسری آیت ہے

ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا ۵۹/۷

رسول جو تم کو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

اس سے سنت کی دینی حیثیت ثابت ہے۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سن کر اس منکر نے اپنے قول سے رجوع کرلیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر کے قائل کر دیئے کو ہم امام شافعی کی کرامت ہی سمجھتے ہیں ورنہ ان سے تو اس کے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کا اعتراض روایت اور ذریعۂ خبر کے متعلق تھا کہ مشتبہ ہے اس لئے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے قابل نہیں۔ علاوہ بریں "الحکمۃ" سے جو انھوں نے سنت مراد لی ہے کسی طرح صحیح نہیں۔ حکمت قرآن ہی میں شامل اور منزل من اللہ ہے، جیساکہ دوسری آیات میں جابجا تصریح ہے۔

وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ ۴/۱۱۳

اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت نازل کی

سورۂ بنی اسرائیل میں توریت کے احکام عشرہ کے مقابل احکام سیزدہ گانہ نازل کرنے کے بعد اللہ فرماتا ہے

ذالک مما اوحیٰ الیک ربک من الحکمۃ ۱۷/۴۲

یہ اس حکمت (دانشمندی) کی باتوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہے

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا کہ

---

(۱) ہر آیت کے ساتھ اوپر شمار سورہ کا ہے نیچے آیت کا۔

واذکرن مایتلیٰ فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ ۳۴	تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت جو تلاوت کی جاتی ہیں ان کو یاد کرو۔

سے معلوم ہوا کہ "الحکمۃ" بھی قرآن ہی ہے ورنہ سنت کی کون تلاوت کرتا ہے، مگر باوجود اس کے شافعی جیسے امام نے جو ائمہ مذاہب میں نہایت ذہین اور قرآن کے ماہر تھے توجہ نہ کی اور اپنی ہی تفسیر پر مصر رہے، حالانکہ ان کا خود قول ہے کہ سنت منزل من اللہ نہیں ہے بلکہ استنباطات نبویہ کا نام ہے۔ پھر جب الحکمۃ کا قرآن سے منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ سنت کیسے ہوسکتی ہے۔

دوسری آیت "ما آتاکم الرسول" مال فیئ کی تقسیم کے متعلق ہے اس کو سنت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

امام شافعی کی ان دونوں دلیلوں کو نجدی اور اہل حدیث علما آج تک سنت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں اور کبھی یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے۔

شیخ طاہر جزائری نے بھی اپنی کتاب توجیہ النظر الیٰ اصول الاثر میں منکرین کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔

وقد ثبت توقف کثیر من الصحابۃ فی قبول کثیر من الاخبار وقد استدل بذالک من یقول بعدم الاعتماد علیہا فی الدین	بہت سی حدیثوں کے قبول کرنے میں بہت سے صحابہ کا توقف کرنا ثابت ہوچکا ہے۔ اس سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جو دین میں حدیثوں پر اعتماد نہ کرنے کے قائل ہیں۔

الغرض منکرین حدیث کی ایک جماعت اسلام میں رہی ہے، مگر ان کا کوئی جدا گانہ فرقہ کبھی نہ تھا، بلکہ یہ ارباب فکر میں سے وہ لوگ تھے جو غور کرتے کرتے اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ حدیثیں دینی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اصل دین قرآن ہی ہے۔

ان منکرین کے اقوال و افکار کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور ان کے دلائل و براہین دیکھے ہیں جو اس کثرت سے ہیں کہ ان کے لکھنے کے لئے ایک ضخیم دفتر درکار ہے۔ اس لئے میں ان کی جملہ فرعی باتوں کو چھوڑ کر صرف سات اصولی دلائل اپنے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

قائلین حدیث کو ان کا جواب یا حدیث کی دینی حیثیت کا ثبوت قرآن ہی سے دینا چاہئے کیونکہ وہی فریقین کی مسلم کتاب ہو۔ جو آیات سند میں لکھی جائیں ان کی تفسیر بھی آیات ہی سے ہونی چاہئے نہ کہ روایات سے۔

(۱) گزشتہ رسولوں کی امتوں کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب ہی پر ایمان رکھنے کا حکم دیا تھا، اور مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا ہے۔

قولوا امنا باللہ و ما انزل الینا الایہ ۲/۱۳۰ — کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی۔

آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون ۲/۲۸۵ — رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی، اور مومنین بھی

وقل آمنت بما انزل اللہ من کتاب ۴۲/۱۵ — اور کہدو کہ میں ایمان لایا اس پر جو اللہ نے اتارا یعنی کتاب

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت اور کسی حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے۔ بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

فبای حدیث بعدہ یومنون ۷۷/۵۰ — اس (قرآن) کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے؟

فبای حدیث بعد اللہ و آیاتہ یومنون ۴۵/۶ — اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کس حدیث پر وہ ایمان لائیں گے؟

زیادہ تصریح اس آیت میں ہو۔

ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم و یتخذہا ہزوا۔ اولئک لہم عذاب مہین ۳۱/۶ — بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلا علم (یقین) کے۔ اور اس کو مذاق بنالیں۔ یہ لوگ ہیں جن کے لئے ذ

کرنے والا عذاب ہے۔

اس آیت میں "لہو الحدیث" کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنار کی ہے یعنی گانا۔ اور اس کی روایت حضرت ابن عباس تک پہنچائی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غنار کہنے میں کیا دشواری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں لہو الحدیث کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے والی ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی بنیاد علم پر نہیں ہے۔ غنار کی غرض نشاط و طرب ہے۔ اس کا مقصد نہ گمراہ کرنا ہے نہ اللہ کی راہ کو مذاق بنانا ہے اور نہ اس کو علم یعنی یقین یا غیر یقین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف قصص اور روایات ہی ہیں جو لہو الحدیث ہیں۔

کہا گیا ہے کہ رسول پر بھی تو ایمان لانے کا حکم قرآن میں ہے، اس لئے اس کے اقوال و اعمال جن کا نام حدیث ہے خود بخود جزو ایمان بن گئے۔ جواب دیا گیا ہے کہ بے شک ہمارے رسول بلکہ جملہ رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ٢٨٥/٢ | اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی ہم فرق نہیں کرتے (ایمان لانے میں)

مگر ساری بحث تو یہی ہے کہ رسول کا پیغام امت کے لئے قرآن ہے یا حدیث۔ رسول پر قرآن نازل کیا گیا۔ اُسی کی اتباع۔ اُسی کی تلاوت۔ اسی کی تبلیغ اور اسی کی تعلیم کا حکم دیا گیا۔ رسول نے اُسی کو سنایا۔ اسی کو لکھوایا۔ اسی کو یاد کرایا اور اسی پر عمل کیا۔ اس کے اتارنے والے نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لے لیا کیا حدیثوں کے لئے ان میں سے کوئی ایک بات بھی تم ثابت کر سکتے ہو؟۔ حدیثوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ جس نے جو دیکھا یا سنا اس کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہی باتیں سلسلہ بسلسلہ امت میں پھیلیں۔ ایک زمانہ کے بعد تم نے اصول مقرر کر کے ان میں سے کسی کو قابل تسلیم قرار دیا اور کسی کو مسترد کر دیا۔ کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے ان کے اوپر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود رسول اللہ کے سامنے پیش کر کے ان کی تصدیق کرائی گئی ہے؟ پھر کس طرح ان کو جزو ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو درانحالیکہ وہ اصول بھی جن کے اوپر حدیث کی

صحت کا دارو مدار تم نے رکھا ہے یقینی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں۔ رسول اللہ نے صرف قرآن ہی پر عمل کیا ہے اور بحیثیت رسالت وہی امت کے لئے ان کا پیغام ہے۔

واوحیٰ الی ہذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ۶/۱۹

مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس سے تم کو آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور بہ ہے۔

اَطِیْعُوا اللہ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُم فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللہ وَالرَّسُوْل ۴/۶۲

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور امیروں کی جو تم میں سے ہوں۔ اگر کسی معاملہ میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

اور جب اطاعت رسول فرض ہے تو لازم ہے کہ اس کے اقوال و اعمال جمع کئے جائیں تاکہ امت اس کی اطاعت کرے۔

اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جس قدر امرا ہوئے ہیں ان میں سے بھی ہر ایک کا ایک ایک مجموعہ احادیث ہونا چاہئے ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی۔ کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے جس میں رسول اور امرا، دونوں داخل کئے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی اطاعت، باذن الٰہی، اور بحیثیت رسالت فرض ہے جیسا کہ اللہ نے کہا ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۴/۶۴

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ باذن الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔

بلکہ چونکہ رسول اللہ ہی کا پیغام لاتے ہیں اور اسی کی اطاعت چاہتے ہیں اس لئے ان کی اطاعت اور اللہ کی اطاعت ایک ہی ہوتی ہے۔

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۰

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

لیکن اطاعت رسول سے عملی اور بالمشافہہ اطاعت مراد ہے۔ اس کے لئے دفاتر تیار کرنے کی

کرنے والا عذاب ہے۔

اس آیت میں "لہو الحدیث" کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے یعنی گانا۔ اور اس کی روایت حضرت ابن عباس تک پہنچائی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں لہو الحدیث کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے والی ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی بنیاد علم پر نہیں ہے۔ غنا کی غرض نشاط وطرب ہے۔ اس کا مقصد نہ گمراہ کرنا ہے نہ اللہ کی راہ کو مذاق بنانا ہے اور نہ اس کو علم یعنی یقین یا غیر یقین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف قصص اور روایات ہی ہیں جو لہو الحدیث ہیں۔

کہا گیا ہے کہ رسول پر بھی تو ایمان لانے کا حکم قرآن میں ہے، اس لئے اس کے اقوال و اعمال جن کا نام حدیث ہے خود بخود جزو ایمان بن گئے۔ جواب دیا گیا ہے کہ بے شک ہمارے رسول بلکہ جملہ رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ۲۸۵/۲ | اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی ہم فرق نہیں کرتے (ایمان لانے میں)

مگر ساری بحث تو یہی ہے کہ رسول کا پیغام امت کے لئے قرآن ہے یا حدیث۔ رسول پر قرآن نازل کیا گیا۔ اُسی کی اتباع۔ اُسی کی تلاوت۔ اسی کی تبلیغ اور اسی کی تعلیم کا حکم دیا گیا۔ رسول نے اُسی کو سنایا۔ اسی کو لکھوایا۔ اسی کو یاد کرایا اور اسی پر عمل کیا۔ اس کے اتارنے والے نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا۔ کیا حدیثوں کے لئے ان میں سے کوئی ایک بات بھی تم ثابت کر سکتے ہو؟ حدیثوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ جس نے جو دیکھا یا سنا اس کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہی باتیں سلسلہ بسلسلہ امت میں پھیلیں۔ ایک زمانہ کے بعد تم نے اصول مقرر کرکے ان میں سے کسی کو قابل تسلیم قرار دیا اور کسی کو مسترد کر دیا۔ کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے ان کے اوپر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود رسول اللہ کے سامنے پیش کرکے ان کی تصدیق کرائی گئی ہے؟ پھر کس طرح ان کو جزو ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو درانحالیکہ وہ اصول بھی جن کے اوپر حدیث کی

صحت کا دار و مدار تم نے رکھا ہے یقینی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں۔ رسول اللہ نے صرف قرآن ہی پر عمل کیا ہے اور بحیثیت رسالت وہی امت کے لئے ان کا پیغام ہے۔

واوحیٰ الی ہذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ۶/۱۹	مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس سے تم کو آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور ہے۔

اَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُم فَاِنْ تَنَازَعْتُم فِی شَیٍٔ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللہِ وَالرَّسُوْلِ ۴/۶۲	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور امیروں کی جو تم میں سے ہوں۔ اگر کسی معاملہ میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

اور جب اطاعت رسول فرض ہے تو لازم ہے کہ اس کے اقوال و اعمال جمع کئے جائیں تاکہ امت اس کی اطاعت کرے۔

اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جس قدر امرا ہوئے ہیں ان میں سے بھی ہر ایک کا ایک ایک مجموعہ احادیث ہونا چاہئے ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی۔ کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے جس میں رسول اور امرا، دونوں داخل کئے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی اطاعت، باذن الٰہی، اور بحیثیت رسالت فرض ہے جیسا کہ اللہ نے کہا ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۴/۶۴	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ باذن الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔

بلکہ چونکہ رسول اللہ ہی کا پیغام لاتے ہیں اور اسی کی اطاعت چاہتے ہیں اس لئے ان کی اطاعت اور اللہ کی اطاعت ایک ہی ہوتی ہے۔

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۰	جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

لیکن اطاعت رسول سے عملی اور بالمشافہہ اطاعت مراد ہے۔ اس کے لئے دفاتر تیار کرنے کی

ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون ۸/۲۰	اے مومنو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اس کی اطاعت ہوگی اولوالامر کی اطاعت کے حکم سے حل ہوجاتا ہے جو اس کی جانشینی کریں گے۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے یعنی بصورت تنازع معاملہ کو رسول کی طرف رد کرنے کے حکم سے حدیث کے بعض حامی اس کی دینی حیثیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس صورت میں رسول کو کیا کرنے کا حکم ہے۔ سنئے۔

فاحکم بینہم بما انزل اللہ ۵/۴۸	ان کے درمیان قرآن کے مطابق فیصلہ کر
انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ۴/۱۰۵	ہم نے تیری طرف قرآن اتارا حق کے ساتھ کہ جو اللہ تجکو سجھائے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کر۔

دراصل حَکَم کتاب اللہ ہی ہے۔ رسول یا امیر اسی سے اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پہ مامور ہیں اسی لئے فرمایا۔

ان اختلفتم فی شیٔ فحکمہ الی اللہ ۴۲/۱۰	اگر تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے

اللہ کے فیصلہ کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب کی رو سے فیصلہ کیا جائے۔

افغیر اللہ ابتغی حکما وہو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلاً ۶/۱۱۵	کیا اللہ کے سوا کوئی حکم تلاش کروں اور وہ تو وہ ہے جس نے تمھاری طرف مفصل کتاب اتار دی
ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الفاسقون ۵/۴۷	جو اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں

(۲) اتباع کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قطعی حکم یہ ہے۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ	اس کی پیروی کرو جو تمھاری طرف تمھارے رب کے یہاں

اولیاء ۳/۷ | سے اتار آگیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں حصر ہے کہ قرآن ہی کی پیروی کرو اور اس کے سوا کسی دوسرے کی پیروی نہ کرو۔ درحقیقت یہ آیت اس امر میں نص صریح ہے کہ بجز کتاب اللہ کے کسی کی پیروی جائز نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسی قرآن میں رسول کی اتباع کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

قُل اِن کُنتُم تُحِبّونَ اللہَ فَاتَّبِعُونِی ۳/۳۱ | کہدے کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔

لیکن خود رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے؟ اس کی بھی تصریح قرآن میں ہے۔

اِتَّبِع مَا اُوحِیَ اِلَیکَ مِن رَبِّکَ ۶/۱۰۶ | پیروی کر اس کی جو تیرے رب کے پاس سے تیری طرف وحی کی گئی

پھر رسول کو اعلان کر دینے کا حکم دیا جاتا ہے

قُل اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا یُوحیٰ اِلَیَّ مِن رَبِّی ۷/۲۰۳ | کہدے کہ میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔

لہذا رسول بجز وحی کے کسی چیز کا پیرو نہیں تھا۔ اس لئے اس کی پیروی بعینہ قرآن کی پیروی ہے۔

یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلتا تھا سب وحی تھا جس کے ثبوت میں آیت

مَا یَنطِقُ عَنِ الھَویٰ اِن ھُوَ اِلَّا وَحیٌ یُوحیٰ ۵۳/۳ | وہ نفس کی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔

پیش کی جاتی ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کفار کو جو انکار تھا وہ قرآن کے متعلق تھا اسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے۔ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اس کے متعلق نہ کوئی انکار تھا نہ کوئی بحث تھی۔ چنانچہ دوسری آیات میں تصریح ہے کہ وحی قرآن ہی ہے۔

وَاتلُ مَا اُوحِیَ اِلَیکَ مِن کِتَابِ رَبِّکَ ۱۸/۲۷ | اور پڑھ کر سنا دے جو وحی کی گئی ہے تیری طرف یعنی اپنے رب کی کتاب۔

وَاُوحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا القُراٰنُ لِاُنذِرَکُم بِہٖ وَمَن بَلَغَ ۶/۱۹ | اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تا کہ میں تم کو اس کے ذریعے آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک وہ پہنچے۔

قل انما انذرکم بالوحی ۲۱/۴۵	کہدے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایہ انذار قرآن ہی ہے۔ اور وہی قرآن لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے مجھ پر وحی کیا گیا ہے۔
جو لوگ وحی کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں، متلو اور غیر متلو جن میں پہلی کو قرآن اور دوسری کو حدیث کہتے ہیں وہ محض ان کی خیالی تقسیم ہے۔ بعضوں نے وحی کی دو قسمیں خفی اور جلی کی ہیں لیکن ہمارے رسول کی وحی تو سب خفی تھی۔ وحی کی کیفیت خود قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔

نزل به الروح الامین علی قلبک ۲۶/۱۹۵	روح الامین اس کو لے کر تیرے قلب پر اترا ہے

(۴) قرآن خالص اور دائمی حق ہے۔

ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک هو الحق ۳۴/۶	اور اہل علم جانتے ہیں کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر اترا ہے وہی حق ہے

یقینی ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے۔

ذالک الکتاب لاریب فیه ۲/۲	یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔

روح الامین اس کو لاتا ہے اور رسول امین پر اتارتا ہے۔ شہاب ثاقب کے پہرے لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ کسی قسم کی شیطانی آمیزش نہ ہو سکے چنانچہ وہ جن جنھوں نے قرآن سنا تھا کہتے ہیں۔

کنا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یستمع الان یجد له شهابا رصدا ۷۲/۹	ہم بیٹھا کرتے تھے سننے کے ٹھکانوں پر مگر اب جو سنتا ہے تو شہاب کو اپنی تاک میں پاتا ہے۔

اتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی کو اس کے خود پڑھانے اور یاد کرانے کا ذمہ لیتا ہے

ان علینا جمعه وقرآنه ۷۵/۱۷	یقیناً ہمارا ذمہ ہے کہ ہم اس کو یاد کرا دیں گے اور پڑھا دیں گے

اس بات کی بھی ذمہ داری لیتا ہے کہ یاد کرا دینے کے بعد تم اس کو بھولو گے نہیں۔

سنقرئک فلا تنسیٰ ۸۷/۶	ہم تمھیں پڑھا دیں گے پھر تم اس کو نہ بھولو گے۔

پھر اس کتاب کی ابد تک حفاظت کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون ۱۵/۹	ہم ہیں کہ ہم نے قرآن کو اتارا اور ہم ہیں کہ اس کے نگہبان

ہیں ۔

وہ اس کے لفظ لفظ کا محافظ ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے کلمات کو بدل سکے۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلماتہ ولن تجد من دونہ ملتحدا (۱۸/۲۷)	اور سنا جو کچھ تیری طرف وحی کی گئی ہے یعنی اپنے رب کی کتاب۔ کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں۔ اور اس کے سوا ہرگز تجھے کوئی پناہ نہیں ملے گی۔

اور حدیثیں بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے باتفاق ائمہ حدیث تمام تر ظنی ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں۔

خبر الواحد لا یفید العلم (المستصفیٰ جزو اول صفحہ ۱۴۱)	خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی

خبر واحد کی تعریف بھی اسی میں ہے

انا نرید بخبر الواحد فی ہذا المقام ما لا ینتہی من الاخبار الی حد المتواتر المفید للعلم فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فہو خبر الواحد	ہم اس مقام پر خبر واحد سے وہ خبر مراد لیتے ہیں جو حد متواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے۔ مثلاً جس خبر کو ایک جماعت پانچ چھ آدمیوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ظن کا روادار نہیں۔

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ہُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (۶/۱۱۶)	روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہی ہیں کہ اگر تو ان کی اطاعت کرے گا تو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکل دوڑاتے ہیں۔
وَمَا یَتَّبِعُ اَکْثَرُہُمْ اِلَّا ظَنًّا۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ	اکثر ان میں سے نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی اور ظن حق

---

(۱) جن حدیثوں کی بابت بعض علماء حدیث نے تواتر لفظی کا دعوے کیا ہے ان کی تعداد تین چار سے زائد نہیں۔ ان میں بھی دین کی کوئی اہم بات نہیں ہے اور ان کا تواتر بھی قصداً ظہور میں نہیں آیا بلکہ اتفاقی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ایک حدیث بھی متواتر موجود نہیں۔

شیئاً ۳۶/۵۳ | کا کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

ولا تقف مالیس لک بہ علم ۱۷/۳۶ | اور اس کے پیچھے نہ چل جسکا تجکو علم نہیں۔

اس لئے حدیثیں دینی امور میں کارآمد نہیں۔ صرف تاریخ دین کا کام دے سکتی ہیں۔

(۴) سرچشمۂ دین اللہ ہی ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک ۴۲/۱۳ | اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جس کی وصیت اس نے نوح کو کی تھی اور جس کو ہم نے تیری طرف وحی کیا۔

یعنی اولین رسل حضرت نوح علیہ السلام سے خاتم رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک وہی دین ہے جو اللہ نے مشروع کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔

ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعہا ۴۵/۱۸ | پھر ہم نے تجکو (عالم[1]) امر کی شریعت پر لگا دیا ہے۔ اسی کی اتباع کر۔

قرآن اتار کر اس نے اپنے دین کو مکمل کر دیا اور اعلان فرمایا

---

(۱) عالم امر جس کے ماتحت عالم خلق میں جملہ طبیعی اور حیاتی حرکات کا صدور ہوتا ہے۔ قرآن کی تعلیمات مہمہ میں سے ہے۔ اسکے سمجھ لینے سے عرش۔ ملائکہ۔ روح۔ وحی۔ دین اور شریعت وغیرہ کے حقائق واضح ہوجاتے ہیں لیکن یہ مسئلہ بھی دیگر اہم قرآنی مسائل کی طرح مسلمانوں میں محروم توجہ رہا۔ جس کے وجہ سے بہت سے اختلافات پڑے اور نزاعین واقع ہوئیں منجملہ انکے فتنۂ خلق قرآن تھا جس میں علماء و صلحاء مصیبت میں ڈالے گئے۔ خاص کر امام احمد ابن حنبل جیسے بزرگ اٹھائیس مہینے تک قید و ضرب کی سختی جھیلتے رہے۔ اگر اس وقت عالم امر کی حقیقت واضح ہوتی تو فریقین کو اپنی اپنی غلطی کا علم ہوجاتا اور نزاع نہ ہوتی نہ علماء کو ضرورت پڑتی کہ قرآن کو غیر مخلوق اور قدیم ثابت کرنے کے لئے حدیثیں بنائیں۔ کیونکہ اس رسول اعظم و مہبط وحی سے جس کی رسائی افق اعلیٰ تک تھی اور جو اپنی نورانی چشم بصیرت سے صاف دیکھ رہا تھا کہ وحی کا فیضان عالم امر سے ہے جو سراسر حادث ہے قطعاً ناممکن تھا کہ اس کو قدیم کہدے۔ اسی طرح استواء علی العرش کی بحث ہے جو صدیوں رہی بلکہ آجتک ہے اور علماء کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ۔ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۵/۱۷۵	لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے دلیل آگئی اور ہم نے نور مبین تمھاری طرف اتار دیا اب جو اللہ پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو وہ ان کو اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کرے گا اور اپنی طرف سیدھے راستہ کی ہدایت دے گا۔

یہی نور مبین یعنی قرآن ہے جس کی روشنی میں نبی خود چلتا تھا اور سب کو چلاتا تھا۔ اسی آفتاب حقیقت نے اس کے افق قلب پر طلوع ہو کر اس کو سراج منیر بنایا تھا۔ یہی اس کا سرمایۂ تعلیم و تبلیغ اور سامان بشارت و انذار تھا۔ اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا یعنی ان کو کفر و شرک کی ظلمت سے نکال کر اسلام اور صراط مستقیم کی روشنی میں لاتا تھا۔

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۱۴/۱	کتاب ہم نے تیری طرف اتار دی ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اسی کی تلاوت کرتا۔ اسی کو سناتا اسی کو لکھاتا، اسی کو یاد کراتا۔ اسی کو سکھاتا اور اسی پر عمل کر کے امت کے لئے نمونہ قائم کرتا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۳۳/۲۱	تمھارے لئے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ نکاح و طلاق۔ جنگ و صلح وغیرہ تقریباً جملہ اوامر و نواہی کتاب پر عمل کر کے طریقہ بتا دیا جو امت میں نسلاً بعد نسل متواتر متوارث چلا آرہا ہے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب تعامل امت جو تواتر کے ساتھ چلا آرہا ہے تمھارے نزدیک یقینی اور دینی ہے تو پھر حدیثوں کے دین ہونے میں کیا قباحت ہے۔ آخر وہی اعمال تو ہیں جو دفاتر حدیث میں مدون کئے گئے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ دونوں ایک نہیں ہیں بلکہ تعامل اور حدیث میں آسمان و زمین کا فرق ہے تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی ہے۔ تعامل احکام قرآن پر عمل کی صورت ہے اور حدیثیں اس سے

دس گنی بلکہ سو گنی باتیں زیادہ شامل رکھتی ہیں اور قرآنی حدود سے آگے بڑھ کر زندگی کے ہر شعبہ میں انسانیت کو ایسے امور کی پابند بناتی ہیں جو صرف ہنگامی یا مقامی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن نے وضع اور لباس میں انسان کو آزاد چھوڑا ہے اور اسلام جیسے عالمگیر فطرتی دین کو جو ہر ملک اور ہر قوم کو اپنے جھنڈے کے نیچے لانا چاہتا ہے ایسا ہی وسیع ہونا بھی چاہئے۔ مگر حدیثیں مسلمان کے لئے ایک مخصوص ہیئت اور وضع معین کرتی ہیں۔ انھوں نے بال بال تک جکڑ رکھا ہے کہ اس کو چھوڑ دو اور اس کو منڈا دو۔ بعض جگہ وہ قرآن کے بالکل خلاف جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے علما قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً اللہ نے مالدار مسلمان پر مرنے سے پہلے والدین اور اقربا کے لئے وصیت فرض کی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۱۸۰

تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آجائے اور وہ مال چھوڑے تو والدین اور اقربا کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔ اہل تقوے پر یہ ایک حق ہے۔

مگر حدیث کہتی ہے۔

لا وصیۃ لوارث — کسی وارث کے لئے وصیت نہیں۔

علما نے اس ظنی حدیث کی وجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے بہت سے عائلی مصالح کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جس کو اہل تقوے پر ایک حق قرار دیا ہے۔ منسوخ کر ڈالی۔

حدیثوں کا تو یہ حال ہے کہ جو روایات قرآن کی تفسیر میں ہیں وہی خود بعض جگہ اس کے برخلاف ہیں۔ مثلاً۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسٰى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ الآیہ ۱۰۱ — ہم نے موسیٰ کو نو کھلی کھلی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر حدیث کی زبان سے سنئے:

"صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم تشریف فرما تھے۔ سامنے سے

دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا "چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں" دوسر نے کہا پیغمبر نہ کہو سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کونسی دی گئیں۔ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زنا نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگاؤ۔ اور میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود یہ دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔[1]

یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی۔ مسند احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ابن جریر میں ہے امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسری "باب ماجاء فی قبلۃ الید والرجل"۔ اور دونوں جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح"۔ (سیرۃ النبی جلد سوم طبع دوم صفحہ ۱۳۴)

حضرت موسیٰ کی تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن کی رو سے اس کا صحیح ہونا قطعاً محال ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ کو یہ نشانیاں اس وقت ملیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو رسول بنا کر فرعون کی طرف بھیجا۔ اور اس وقت تک توریت نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔

ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ خود آیت مذکورہ

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَاسْأَلْ بَنِي	موسیٰ کو ہم نے کھلی کھلی نشانیاں دیں تو بنی اسرائیل سے

---

(۱) نہ صرف دسواں بلکہ توریت کے احکام عشرہ کل کے کل یہود کے لئے تھے۔ توریت دینے کے بعد حضرت موسیٰ کو اللہ نے حکم دیا وامر قومک یاخذوا باحسنہا یعنی اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کو بہترین طریقہ سے لیں۔

اسرائیل، اذ جاءهم فقال له فرعون انی لاظنک یاموسیٰ مسحورا۔ قال لقد علمت ما انزل هؤلاء الا رب السموٰت والارض بصائر ۱۷-۱۰۲	پوچھ لے، جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں خیال کرتا ہوں کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے اس نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ ان کو نہیں اتارا آسمان اور زمین کے رب نے مگر نشانیاں۔

سے ثابت ہے کہ یہ نشانیاں لے کر حضرت موسیٰ فرعون ہی کے پاس گئے تھے۔ مزید تصریح سورۂ نمل میں ہے۔

فی تسع آیات الیٰ فرعون وقومه	نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔

سورۂ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ کا قصہ مسلسل بیان کیا گیا ہے ان نشانیوں کی تفصیل کر دی گئی ہے۔

فالقیٰ عصاه فاذا هی ثعبان مبین ونزع یده فاذا هی بیضاء للناظرین ۷-۱۰۸	موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا وہ کھلا ہوا اژدہا ہو گیا۔ اور اپنا ہاتھ نکالا وہ دیکھنے والوں کے لئے سفید تھا۔
ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات ۷-۱۳۰	آل فرعون کو ہم نے قحط اور پھلوں کی کمی میں گرفتار کیا۔
فارسلنا علیهم الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم آیات مفصلات ۷-۱۳۳	پھر ہم نے بھیجا طوفان۔ ٹڈی۔ چچڑیاں۔ مینڈک اور خون الگ الگ نشانیاں۔

اس تفصیل کے مطابق وہ نو نشانیاں جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھیں یہ ہوئیں۔

عصا[۱]۔ ید بیضا[۲]۔ قحط[۳]۔ نقص ثمر[۴]۔ طوفان[۵]۔ ٹڈی[۶]۔ جوں[۷]۔ مینڈک[۸]۔ خون[۹]

اس کے مدتوں بعد فرعونی ہلاک کئے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے طور ایمن کی طرف پہنچتے ہیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ ان کو توریت عطا کرتا ہے۔

یاموسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسالاتی وبکلامی فخذ ما آتیتک وکن من الشاکرین وکتبنا له فی الالواح	اے موسیٰ! میں نے تجھکو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور کلام کے لئے چن لیا۔ جو میں تجھکو دیتا ہوں لے اور شکر ادا کر۔ اور ہم

مِن کُلِّ شَیۡءٍ موۡعِظَۃً وَّتَفۡصِیۡلاً لِّکُلِّ شَیۡءٍ ۱۴۵	نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی۔

یہ تمام تفصیلات اس قدر مصرح ہیں کہ ان میں نہ کسی شک کی گنجائش ہے نہ کسی تاویل کی۔ مگر پھر بھی ان کے خلاف یہ "چار آنکھوں والی" حدیث جو صحاح ستہ کی ہے بتلاتی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ کی۔ کوئی عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے؟ چنانچہ بعض مفسرین نے باوجود حدیث مذکورہ کے بھی یہ تفسیر قبول نہیں کی۔ اسی پر یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ چونکہ ان یہودیوں نے خوش ہو کر آنحضرتؐ کے دست و پا کو بوسہ دیا تھا اس لئے حدیث میں ایک باب "قبلۃ الید والرجل" کا اور اضافہ ہو جاتا ہے جس سے علماء کے ہاتھ پاؤں چومنے کا جواز نکالا جاتا ہے۔ اس روایت سے کئی باتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ارباب صحاح ستہ نے جو شرطیں حدیث کی صحت کے لئے مقرر کی ہیں وہ کس حد تک اس کی ضمانت کرتی ہیں۔

۲۔ ان ائمہ کے حسن و صحیح کہنے کی قدر و قیمت کیا ہے۔

۳۔ جو لوگ ایسی حدیثوں پر ایمان رکھنے کو دین اور قرآن جیسے آسمانی نور اور عبادہ دائی حق کے خالص دین ماننے کو الحاد و بیدینی قرار دیتے ہیں وہ کہاں تک دین کی حقیقت سے آشنا ہیں۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کی حفاظت کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا۔

لَا تَکۡتُبُوۡا عَنِّیۡ شَیۡئًا غَیۡرَ الۡقُرۡاٰنِ الخ	مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو۔

اگر بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے دن کا خطبہ ابو شاہ کو لکھوا دیا یا کسی خاص صحابی کو لکھنے کی اجازت دے دی تو یہ مستثنیات میں شمار ہوگا۔ عام حکم یہی تھا کہ سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھا جائے۔ اور یہی صحابۂ کرام نے سمجھا تھا۔ چنانچہ ابو داؤد کتاب العلم میں ہے۔

وفد زید بن ثابت علی معاویۃ فسالہ عن حدیث حضرت زید بن ثابت امیر معاویہ کے پاس گئے تھے انہوں

فامرنا ان نکتبہ فقال لہ زید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنا ان لانکتب من حدیثہ فمحاہ

نے ایک حدیث دریافت کی پھر ایک آدمی کو حکم دیا کہ اس کو لکھے زید نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم ان کی حدیث نہ لکھیں۔ اس لئے اس کو مٹا دیا۔

اس سے علمار حدیث کی وہ توجیہ بھی غلط ہو جاتی ہے جو انھوں نے کی ہے کہ ممانعت کتابت حدیث کا حکم صرف اس لئے تھا کہ حدیثیں آیات کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائیں۔

بے شک روایات کو بیان کرنے کی اجازت حدیثوں سے نکلتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم روایت کو روایت ہی رکھنا چاہتے تھے اور دین یعنی قرآن کی طرح اس کو محفوظ بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کر دیا۔ جب لوگوں کو دیکھا کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں تو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم اختلاف کرتے ہو، آیندہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو۔[1]

انھوں نے خود تقریباً پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی لکھ رکھا تھا۔ اس کو بھی آگ میں جلا دیا۔[2]

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اور بھی زیادہ سختی برتی۔ اگر کوئی روایت کرتا تو درہ لے کر اس کو مارنے کو تیار ہو جاتے اور جب تک گواہ اور شاہد نہ لے لیتے نہ چھوڑتے۔ لکھنے کی مطلق اجازت نہ دیتے۔

قال عبداللہ بن علا، سالت القاسم بن محمد بن ابی بکر ان یملی علی الحدیث۔ فقال ان الاحادیث قد کثرت علی عہد عمر بن الخطاب فانشد الناس ان یاتوہ بہا۔ فلما اتوہ بہا امر بتحریقہا۔ ثم

عبداللہ بن علا کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ سے کہا کہ مجھ کو حدیث لکھوائیے، انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثیں زیادہ ہو گئی تھیں، انھوں نے منادی کرائی کہ لوگ حدیثیں ان کے پاس لائیں، جب لائے تو حکم دیا کہ ان کو جلا

(۱) تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ترجمہ ابوبکر۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ۔

قال مثناۃ کمثناۃ اہل الکتاب۔ قال فمنعی القاسم یومئذ ان اکتب حدیثاً (طبقات ابن سعد جزء خامس صفحہ ۱۱)	پھر فرمایا کہ سنت جیسے اہل کتاب کی سنت [1]! علماء کہتے ہیں کہ اس دن سے مجھے قاسم نے روک دیا کہ میں ایک حدیث بھی لکھوں۔

حضرت عثمانؓ کے پاس محمد بن علی ایک نوشتہ لے گئے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم لکھا ہوا تھا جو زکوٰۃ کے بارے میں تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس سے معاف کرو[2]۔ حضرت علیؓ سے جب کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو اس سے حلف لے لیتے تھے[3]۔

حضرت ابن عباس نے بھی حضرت ابو ہریرہ کی حدیث "الوضوء مما مسته النار"، اور حضرت علی کی حدیث "نہی عن المتعہ"، اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا[4]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو دین نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ قرآن کی طرح اس کی بھی حفاظت کرتے۔ بے شک احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے شہادت لینے کے بعد روایتیں قبول کی ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو عینی گواہ مل جاتے تھے جو شہادت دیتے تھے کہ ہم نے اپنے کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس کو سنا ہے۔ مگر عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہوگیا اور شہادت در شہادت در شہادت عقلاً۔ عرفاً یا قانوناً کسی لحاظ سے قابل سماعت نہیں۔ ایسی شہادت کی بنیاد پر آپ کسی عدالت سے ایک پیسہ کا بھی فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔

(۲) روایت کی صحت کا معیار ائمہ حدیث نے راویوں کی ثقاہت اور عدالت کو قرار دیا ہے۔ حدیث کے جانچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ان کے پاس یہی ہے۔ ارباب صحاح ستہ میں سے ہر ایک نے جو شرطیں رکھی ہیں ان میں جو فرق مراتب ہے وہ رواۃ کی ثقاہت ہی کا ہے۔

---

(۱) یہود نے انبیاء کی روایات کتاب میں جمع کی تھیں جس کا نام مثناۃ رکھا تھا۔

(۲) توجیہ النظر صفحہ ۱۰۔ (۳) توجیہ النظر صفحہ ۱۱ (۴) توجیہ النظر صفحہ ۱۰۔

امام بخاری صرف اول درجہ کے ثقہ راویوں کی روایت لیتے ہیں[1]۔ امام مسلم کہیں کہیں درجہ دوم والوں کی بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ارباب سنن ان سے بھی کچھ نرم ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ثقاہت کو تولنے کی کونسی میزان ہے۔ کیا یہی کہ ثقہ لوگ ان کو ثقہ کہیں؛ پھر ان ثقہ کہنے والوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ثقاہت یا عدالت خود ائمہ حدیث کی تعریف کے مطابق ایک باطنی[2] وصف ہے جس کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی قطعی شہادت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا سارا دارومدار حدیث کا شروع سے آخر تک ظن پر ہے۔

رواۃ میں طبقہ اول صحابۂ کرام کا ہے۔ ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں۔ علامہ ابن صلاح کہتے ہیں۔

للصحابۃ باسرہم خصیصۃ، وہی ان لایسال عن عدالۃ احد منہم بل ذلک امر مفروغ عنہ (مقدمہ ابن صلاح صفحہ ۱۴۹)	جملہ صحابہ کی ایک خصوصیت ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت کا سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔ بلکہ ایسا امر ہے کہ طے شدہ ہے۔

پھر اسی صفحہ میں ہے۔

ان الامۃ مجمعۃ علی تعدیل جمیع الصحابۃ ومن لابس الفتن منہم کذالک۔	تمام صحابہ کی تعدیل پر امت کا اجماع ہے۔ ان میں سے جو فتنوں میں شریک ہوئے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔

صحابہ کی تعریف بھی انہیں کی زبان سے سن لیجئے۔

المعروف من طریقۃ اہل الحدیث ان کل مسلم رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فہو من الصحابۃ	طریقۂ اہل حدیث کے مطابق مشہور یہی ہے کہ ہر مسلم جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا وہ صحابی ہے۔ (مقدمہ ابن صلاح صفحہ ۱۴۲)

---

(۱) امام بخاری نے جب اپنی کتاب صحیح لکھنی شروع کی تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں صرف ۷۲۷۵ شرط کے مطابق ملیں جو انھوں نے درج کیں۔ ان میں سے اگر مکررات نکال دی جائیں تو یہ تعداد چار ہزار سے بھی کم ہوجاتی ہے (مقدمہ صحیح بخاری)

(۲) عدالت محدثین کے نزدیک وہ ملکہ راسخہ ہے جو عقل علم دینداری اور تقوے سے پیدا ہو کر جھوٹ سے باز رکھے۔

صحابہ کرام کی عظمت و جلالت شان کی وجہ سے ہم اس اصول پر جو غیر صحیح، قرآن کے خلاف اور محض عقیدت مندی کا فیصلہ ہے بحث کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس امر پر اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک طرف تو یہ فیاضی کہ ہر ایک صحابی کو عدالت اور ثقاہت کا پورا پورا حصہ دے دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بخل کہ ان کی تعریف میں مومن بھی نہیں صرف مسلم کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن میں ہے

وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۹/۱۰۱	اور کچھ لوگ مدینہ کے نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان کو تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔

مسلمان ہی کہلاتے تھے اور رسول اللہ تک کو ان کے نفاق کا علم نہ تھا۔ نیز واقعہ "افک" میں جو لوگ شریک تھے جن پر حد قذف پڑی جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

لا تقبلوا لهم شهادة ابدا ۲۴/۴	نہ قبول کرو ان کی کوئی گواہی کبھی

وہ بھی مسلمان ہی کہے جاتے تھے۔ علاوہ بریں ایک طرف تو یہ روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا۔

لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض	میرے بعد پلٹ کر کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑ کر باہمی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا ان کو بھی ابوبکر و عمر کے ساتھ ثقاہت کے پلہ میں ہم وزن رکھ دیا جاتا ہے۔

صحابہ کے بعد ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کر کے جرح و تعدیل کے مسلخ میں لائے جاتے ہیں اور ان کی پوست کشی کی جاتی ہے۔ بہت سے کذاب، خبیث اور دجال وغیرہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے۔ پھر ان ثقاۃ میں سے بھی کمتر ایسے ہیں جو جرح کی تیغ سے زخمی نہ ہوں۔ ایک کو ایک اگر صادق کہتا ہے تو دوسرا اسی کو کاذب بتاتا ہے[۱]۔ اور یہ سب

(۱) کوئی خوش قسمتی سے اگر بالکل بلاداغ نکل گیا تو مدلس کے بے پناہ تیروں سے بچنا مشکل تھا۔ بڑے بڑے ائمہ

کچھ محض ظن، نری تخمین۔ اللہ نے فرمایا ہے۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۵۱/۱ | اٹکل دوڑانے والے مارے پڑے

آپ کہیں گے کہ شک کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔ مگر منکرین کو شک کی بیماری نہیں ہے۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ دین کا راستہ ہی نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا۔ دین کو براہ راست اللہ اپنے نبی پر نازل کر دیتا ہے۔ اس علیم و حکیم نے اپنے بندوں کو اس بات کا محتاج نہیں چھوڑا ہے کہ عقل اور انسانیت کے خلاف پہلے وہ لاکھوں مردہ بزرگوں کو جرح و تعدیل کی بھٹی میں جلا کر کھرا کھوٹا الگ کریں(۱) پھر دین کا پتہ لگائیں۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۵/۱۹	لوگو! اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور کتاب مبین آچکی۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے پیرو ہیں ان کو اللہ اس کے ذریعہ سے سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے ان کو تاریکی سے روشنی میں نکالتا ہے اور سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

(۷) قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے۔ اس کا پیغام ایک۔ اس کی راہ عمل ایک اور اس کی منزل مقصود ایک ہی ہے۔ وہ کوئی فرقہ بنانے نہیں آیا ہے بلکہ اقوام عالم میں حق کو ذریعۂ وحدت بنانا چاہتا ہے۔ اس نے جملہ انبیاء و رسل کی امتوں کو ایک ہی امت قرار دیا ہے۔

اِنَّ ھٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۲۱/۹۲	یہ تم سب کی امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں مجھی کو پوجو۔

مثلاً حسن بصری۔ مکحول شامی۔ سفیان ثوری۔ مالک بن انس اور دارقطنی وغیرہ اس کا نشانہ بنے ہوئے ہیں حافظ ابن مندہ نے تو امام بخاری و مسلم پر بھی وار کیا تھا مگر علماء حدیث نے بیچ میں پڑ کر روک لیا۔ (طبقات المدلسین ابن حجر)

(۱) مذہبی جماعتوں میں ہم خیالی بڑی چیز ہے۔ تعدیل میں زیادہ کار فرما یہی جذبہ تھا۔ ذرا بھی کوئی مخالف نکلا کہ مجروح ہوا۔ جرح و تعدیل کا منظر بھی ایک مضمون میں بسط کے ساتھ دکھلانے کے قابل ہے۔

فرقہ بندی کو وہ کفر وضلالت بلکہ شرک قرار دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْہُمْ فِیْ شَیْءٍ ۱۶۰/۶	جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا کرلیا اور گروہ گروہ ہوگئے ان سے (اے محمد) تجھکو کوئی واسطہ نہیں۔
وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَہُمُ الْبَیِّنٰتُ وَاُولٰٓئِکَ لَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۱۰۵/۳	ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنھوں نے نشانیوں کے آجانے کے بعد تفریق ڈالی۔ وہ لوگ تو وہ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے
وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْہِمْ فَرِحُوْنَ ۳۲/۳۰	تم مشرک نہ ہو۔ یعنی وہ جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہوگئے اور ہر جماعت اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے

یہ حتمی ہے کہ مسلمانوں میں جو جو فرقے پیدا ہوئے ان کی بنیادیں خاص خاص روایتوں ہی پر تھیں اور آج تک ہیں۔ جملہ مذاہب اسلامی کی بنیادی سندیں جو روایات ہیں گنائی جاسکتی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر فقہائے اسلامی کے مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں گنائی بھی ہیں علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق بہت سے فرقوں نے حدیثیں بنا بنا کر اپنے اصول مضبوط کئے ہیں۔ اس لئے روایات تفرق و تشتت کا موجب ہوئیں جن سے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ اگر قرآن پر جملہ اختلافات کا فیصلہ رکھا جاتا تو یقیناً کوئی تفریق نہیں ہوسکتی تھی۔ ہر چند کہ انسانوں میں اختلاف ہمیشہ رہے گا۔

لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ ۱۱/۱۱	ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر تیرا رب مہربانی کرے۔

مگر ہمارا مقصد جملہ بنی نوع انسان سے نہیں بلکہ "مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ" یعنی اہل حق اور مسلمانوں سے ہے کہ ان میں وحدت قائم رہتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ حدیثوں کے دین نہ ماننے پر بھی فہم قرآن میں اختلافات ممکن ہیں اس لئے پھر بھی فرقے پیدا ہوسکتے ہیں۔ بے شک فہم معانی میں اختلافات ہونگے لیکن ان کے اوپر فرقہ کی تعمیر نہ ہوسکے گی۔ کیونکہ قرآن کی حقیقت ایک۔ تعلیم ایک۔ مفہوم ایک۔ اور غرض اور منتہائے نظر ایک ہے۔ جو شخص کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم کرے گا۔ علمائے قرآن کے مسلسل غور و فکر کے بعد گر

وہ صحیح ثابت ہو گی تو تسلیم کر لی جائے گی ورنہ مسترد۔ بجنسہ اسی طرح جس طرح اس عالم مادی میں علمائے طبیعی وغیرہ الگ الگ نظریے قائم کرتے ہیں پھر ایک مدت تک غور و فکر کرتے کرتے ان پر اس کی صحت یا غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔ قرآن میں کامل صلاحیت اس بات کی موجود ہے کہ جملہ اختلافات کا قطعی فیصلہ کر سکے۔ وہ کتاب "مفصل" اور "تبیاناً لکل شیئ" ہے۔

یہ تو علمی پہلو ہے اور عملی پہلو سے تو قرآنی جمہوریت اس قدر وسیع اور روشن ہے کہ اس میں سوائے وحدت کے تفریق ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلام کا ابتدائی عہد یعنی قرن اول جس میں نہ حدیثیں مدون ہوئی تھیں نہ انھوں نے دینی حیثیت حاصل کی تھی خالص عمل بالقرآن کا دور تھا۔ جس نے ہر لحاظ سے اس کو خیر القرون بنا دیا تھا۔ تفرقے اسی وقت سے پیدا ہوئے جب سے روایت اور شخصیت پرستی آئی۔

کہا جاتا ہے کہ حدیثوں کو تمام امت نے شرق سے غرب تک دینی حجت تسلیم کر لیا پھر اس میں تمہارے لئے بحث کی گنجائش کہاں رہی، جواب یہ ہے کہ تمھارے نزدیک چار دلیلیں ہیں۔ کتاب، سنت اجماع اور قیاس۔ اور اسی ترتیب سے انکے مدارج ہیں۔ کیا تم حدیث کو جو بلند تر حجت ہے اجماع سے جو فرو تر حجت ہے۔ ثابت کرنا چاہتے ہو یعنی اپنے مشعل کو چراغ کی روشنی سے دکھانا چاہتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمھارا مشعل تاریک ہے۔ اجماع سارے عالم کے نزدیک صرف ایک ہنگامی چیز ہے۔ یہ مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اس کو دینی حجت اور دائمی حق بنا رکھا ہے۔

ان دلائل کے علاوہ منکرین حدیث نے ان مضر اثرات اور نتائج پر بھی بسط کے ساتھ بحثیں کی ہیں جو روایت پرستی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ انھوں نے حدیثوں کی بے اعتباری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں نے اس مضمون میں ان باتوں کو قصداً چھوڑ دیا۔ کیونکہ موضوع بحث یعنی حدیثوں کے دینی حجت ہونے یا نہ ہونے سے ان کو زیادہ تعلق نہیں۔

طالب العلم کی دعا

محبت سے تری یارب، یہ دل معمور ہو جائے
سراسر ہے یہ تاریکی، سراسر نور ہو جائے

مرے سوزِ دروں کو وہ تجلی زارِ عرفاں کر
کہ اس کا ہر شرارہ اک چراغِ طور ہو جائے

تجھے چشمِ بصیرت سے میں دیکھوں خانۂ دل میں
ترے جلوے سے یہ جانِ حزیں مسرور ہو جائے

فروغِ زندگی وہ لے کے اٹھوں بزمِ ہستی میں
کہ جس کے نور سے دنیا کی ظلمت دور ہو جائے

گلستانِ عمل میرا پھلے پھولے زمانے میں
ترے ابرِ کرم سے یہ چمن مشہور ہو جائے

بہارِ تازہ باغِ آفرینش میں کروں پیدا
متاعِ زندگی خلد و قصور و حور ہو جائے

تمنائے دلی یارب دعا بن کر نکلتی ہے
عجب کیا ہے تری درگاہ میں منظور ہو جائے

ستاروں کا بعد

ہم جب تاروں بھری رات میں آسمان کو دیکھتے ہیں تو ہمکو ہزاروں ستارے آسمان پر بکھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جن میں بظاہر نہ کوئی ترتیب معلوم ہوتی ہے اور نہ نظام۔ اور بقول غالب "بے مشورہ کا کام ایسا ہی ہوتا ہے" ہم کو بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ستارے ایک ہی فاصلہ پر ہونگے۔ مگر ہم ان کے فاصلوں کا تعین اس وقت تک نہیں کرسکتے جب تک ہمارے پاس موجودہ سائنس کے اور رصد خانے کے آلات نہ ہوں اور ہم ان ریاضی کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہ ہوں جن کے ذریعہ سے اُن استادوں کا بعد امکانی صحت کیساتھ ناپا جاسکتا ہے۔

ایک مضمون میں ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ یہ کل روشن ستارے جو ہمکو نظر آتے ہیں تین قسموں پر تقسیم ہوتے ہیں (۱) ثوابت۔ (۲) سیارے۔ (۳) اقمار۔ (یہاں ہم سحابیوں سے بحث نہیں کرتے) مزید وضاحت کے لئے ان کی مختصر تعریف پھر ایک دفعہ کئے دیتے ہیں

(۱) ثابت جمع ثوابت۔ وہ بعید ترین اجسام فلکی ہیں جو اپنی انتہائی بعد کی وجہ سے ایک ہی جگہ قائم نظر آتے ہیں۔ ان میں ذاتی روشنی اور حرارت ہے انہیں ستارے بھی کہتے ہیں

(۲) سیارہ وہ جسم ہے جو کسی ثابت کے گرد گھومتا ہے اور ثابت سے روشنی لیکر منور ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں اسمیں ذاتی روشنی بھی ہوتی ہے۔ جیسے مشتری میں۔ مگر علی العموم یہ بذاتہ سیاہ ہوتے ہیں یعنی ان کی ذاتی روشنی ضائع ہوچکی ہے۔ یا بہت کم ہوگئی ہے۔

(۳) قمر جمع اقمار:۔ وہ اجسام فلکی جو کسی سیارے کے گرد گھومتے۔ اور اس ثابت

سے روشنی لیتے ہیں جس کے گرد وہ سیارہ گھوم رہا ہے جس کے تابع یہ قمر ہو۔ بعض وقت اپنے سیارے کی روشنی سے بھی منور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پہلی اور دوسری تاریخ کا چاند۔ اس میں دو حصے منور ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ باریک زیادہ منور ہلالی خط جسے پہلی یا دوسری تاریخ کا چاند کہتے ہیں۔ یہ تو سورج سے منور ہوتا ہے۔ اور دوسرا وہ حلقہ جو کم منور ہوتا ہے۔ اور ہلال کے ایک جانب گول دائرہ کی شکل میں نظر آتا ہے یہ حصہ زمین کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔

زمین سے قریب ترین ستارہ اور اسوقت تک جتنے ستارے دریافت ہوئے ہیں ان میں سب سے چھوٹا ستارہ سورج ہے۔ یہ محض اپنی نزدیکی کی وجہ سے ہمکو اسقدر بڑا معلوم ہو رہا ہے۔ اور گرم ہے۔ اسکا قطر آٹھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار میل کا ہے۔ زمین کا صرف آٹھ ہزار میل کا ہے۔ بظاہر چاند اور سورج ایک ہی جسامت کے معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ سورج زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ اور چاند کا قطر صرف سوا دو ہزار میل کا ہے اور زمین کی جسامت اس سے تقریباً ۴۹ گنی زیادہ ہے۔ یعنی سورج سے تقریباً پانچ کروڑ پچاس لاکھ گنا چھوٹا ہے مگر پھر بھی بظاہر دونوں برابر معلوم ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ سورج زمین سے ۹ کروڑ بیس لاکھ میل کے فاصلہ پر ہے اور چاند صرف دو لاکھ چالیس ہزار میل پر۔ اس لئے کسی ستارہ کا چھوٹا بڑا نظر آنا اس کے بعد کو نہیں بتا سکتا۔ اسی طرح بہت سے ستارے ایسے ہیں جو سورج سے کئی کروڑ گنے بڑے ہیں، اور گرم تر ہیں۔ مگر اپنے بعد کی وجہ سے چھوٹے اور سرد معلوم ہوتے ہیں۔

معروف ادیب مسٹر ولز Mr. Wells' کی مشہور تاریخ Outlines of History سے ذیل کی مثال لیکر ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اس مثال سے سیارے اور ستارے کا بعد معلوم ہو سکے گا۔

فرض کیجئے۔ ایک بہت بڑے وسیع میدان میں جو صحرائے اعظم افریقہ سے

کئی ہزار گنا بڑا ہے۔ ایک گیند ایک انچ کے قطر کی رکھی ہے۔ یہ زمین ہو۔ اس سے تین
سو تیں گز کے فاصلہ پر ایک گولہ نو فٹ کے قطر کا ہے وہ سورج ہے۔ زمین سے ۲۴
انچ کے فاصلہ پر ایک مٹر کا دانہ ہے۔ یہ چاند ہے۔ زمین سو سو گز کے فاصلہ پر عطارد
ہے۔ اور دو سو گز کے فاصلہ پر زہرہ۔ پانسو گز کے فاصلہ پر مریخ۔ آٹھ سو پچاس گز پر
مشتری۔ تین ہزار گز کے فاصلہ پر یورینس۔ دس ہزار گز کے فاصلہ پر نیپچون۔ اور چودہ
ہزار دو سو گز یا تقریباً ۸ میل کے فاصلہ پر پلوٹو (نو دریافت شدہ سیارہ) ہوگا۔ گویا نظام
شمسی کی انتہائی حد ۸ میل ہے۔ اب آگے اگر ہم دیکھنا چاہیں گے تو دس بارہ میل یا سو دو سو
میل نہیں بلکہ نزدیک ترین ستارہ جو ہم کو نظر آئیگا وہ اسی نسبت سے جو پہلے ہم قائم کر چکے ہیں۔
چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر نظر آئیگا۔ اب ایک طرف ان فاصلوں کو دیکھئے جو نظام شمسی کے دوسرے
ارکان سے اس کو حاصل ہیں اور دوسری طرف اس ستارہ کو دیکھیے۔ اور وہ بھی سورج کے بعد نزدیک ترین ستارہ ہے

اب فرض کیا اس فضا میں بیس ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلیں تو بارہ سکنڈ میں
ہم چاند سے گزر جائیں گے۔ اور سوا گھنٹہ میں سورج پر پہنچ جائیں گے۔ اور ۲۵ گھنٹہ کے
بعد نظام شمسی کی حد کے باہر ہو جائیں گے۔ اور اسی رفتار سے چلے جائیں تو ۴۰ برس کے
بعد سب سے نزدیک ستارہ پر پہونچیں گے۔ اس کے بعد ابھی فضا میں اور چلیں تو ہم کو معلوم ہوگا
کہ بعض ستارے اسقدر بعید فاصلہ پر ہیں کہ ہم انہیں میلوں میں نہیں ناپ سکتے بلکہ سال
میں ناپیں گے یعنی جو فاصلہ روشنی ایک سال میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے
ایک سال میں طے کرتی ہو وہ سال نور کہلاتا ہے۔ اور یہ سال نور ۶۰ کھرب میل کے برابر
ہوتا ہے۔ یہاں سے جو فاصلہ ستاروں کا ناپا جائیگا وہ سال نور سے ناپا جائے گا مثلاً
قطب تارہ پچاس سال نور کے فاصلہ پر ہے کہکشاں میں بعض سحابیہ ہیں جن کی روشنی
کئی کروڑ برس میں یہاں تک پہونچتی ہے یعنی یہ سحابیہ کئی کروڑ برس پہلے سحابیہ تھے اسوقت
ممکن ہو کہ یہ ستارہ بن گئے ہوں مگر زمین والوں کو کئی کروڑ برس گزر جانے کے بعد یہ خبر ہوگی

کہ یہ ستارے بنے۔

جنکو ہم ستارہ کہہ رہے ہیں یہ خود قائم نہیں ہیں۔ ان میں بعض ستارے ہزار میل اور بعض کم و بیش رفتار سے فضائے عالم میں متحرک ہیں مگر ان کا فاصلہ اسقدر بڑا ہے کہ یہ ستارے بادی النظر میں ہمکو ایک ہی جگہ قائم نظر آتے ہیں۔ اس کل فضا میں ہمکو یہ معلوم ہوگا کہ سیارے اور خود زمین سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا فاصلہ ہم سے زیادہ سے زیادہ آٹھ میل ہو۔ مگر اس نزدیک ستارہ کا اندازہ کرو جس کا فاصلہ اسی نسبت سے چالیس ہزار میل ہوگا بعض ایسے ہیں اسی نسبت سے ان کا بعد کروروں میل ہو۔

رفتار کے متعلق ہم کو ایک مثال اور سمجھ لینی چاہئے۔ اگر ایک چیز ایک ہی رفتار سے متحرک ہو۔ تو بادی النظر میں اگر وہ چیز قریب ہو تو ہم کو زیادہ تیز چلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اور اگر زیادہ دور ہے تو وہ سست چلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ حالانکہ رفتار یکساں ہی رہی۔ یہی مثال سیاروں اور ستاروں کی ہے جو سیارے ہم سے قریب ہیں وہ ہم کو زیادہ تیز چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً زہرہ۔ عطارد۔ چاند۔ مشتری سست معلوم ہوتا ہے۔ اور نیپچون اور پلوٹو کی رفتار معلوم کرنے کے لئے تو کئی مہینے چاہئیں۔ چہ جائیکہ ان ستاروں کی چال جو کئی کئی ہزار سال نور کے فاصلہ پر ہوں۔ اسی وجہ سے وہ ہم کو قائم معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کو ہم ثوابت کہتے ہیں۔ ورنہ ان میں بعض ستارے ایسے ہیں جو کئی کئی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں ایک ستارہ ذنب الدجاجہ (Cygnus) ہے جسے فلکی اڑنے والا ستارہ کہتے ہیں۔ یہ دو سو میل فی سکنڈ کی رفتار سے متحرک ہو۔ خود سورج معہ اپنے کل نظام کے مجمع النجوم نسر واقع (Lyra) کی طرف چلا جا رہا ہے۔ مگر یہ حرکتیں رصد گاہوں کی اعلیٰ دوربینوں اور بہت صحیح آلات حساب کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں۔

ابھی ہم بیان کر آئے ہیں کہ نظام شمسی نسر واقع کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں یہ اعتراض ہوگا کہ جب ستارے اسقدر بعید ہیں اور کل مجمع النجوم ایک ہی حالت میں نظر آ رہے ہیں اور نہ

معلوم کتنے زمانہ دراز سے نظر آ رہے ہیں اور نہ معلوم کبتک نظر آتے رہیں گے تو ہم کو کیسے
معلوم ہوا کہ نظام شمسی نسر واقع کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے بعید ترین ستاروں کی دوری معلوم
کرنے میں اسوقت اور زیادہ دقت ہوتی ہے جب وہ حرکت کے رخ سے خط مستقیم میں ہوں
خواہ حرکت اس مجمع النجوم کی سمت میں ہو رہی ہو۔ یا مخالف سمت میں۔ اگر حرکت زاویہ بنائیگی
تو فاصلہ معلوم کرنے کا امکان زیادہ قرین قیاس ہے۔

مگر اسے معلوم کرنیکا ایک بہت عمدہ طریقہ ہے۔ جسے ہم پہلے ذیل کی مثال سے سمجھاتے ہیں
فرض کیجئے آپ ایک وسیع میدان میں ہیں جس کے کنارے پر درخت لگے ہوئے ہیں۔ آپ
ایک سمت روانہ ہوئے جس طرف آپ جائیں گے اس سمت کے درخت پھیلتے ہوئے معلوم ہونگے
یہ معلوم ہوگا کہ ان کے درمیان کا فاصلہ زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور آپ کے پیچھے کے درخت
سکڑتے ہوئے معلوم ہوں گے۔ حالانکہ یہ یقینی امر ہے کہ درخت سب اپنی جگہ قائم ہیں اور وہ
متحرک نہیں ہیں اسی طرح سالانہ ارتصاد سے ہمکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسر واقع کے ستارے ایک
دوسرے سے پھیل رہے ہیں۔ اور اس کے مقابلہ کی سمت میں جو مجمع النجوم مثلاً الجبار (Orion)
ہے۔ وہ اس کے ستارے ملتے جا رہے ہیں۔ مگر نسر واقع کا فاصلہ اسقدر بعید ہے کہ نہ معلوم
کتنے لاکھ یا کرور برس میں ہمارا سورج مع اپنے نظام کے وہاں تک پہونچے گا۔

اس نظریہ کو Doppler نے ایک اور مثال سے سمجھایا۔ اور طیف نما
Spectroscope کے ذریعے ثابت کر دیا کہ واقعی سورج مع اپنے نظام کے پرے
جا رہا ہے۔ اور طیفی خطوط سے رفتار کا بھی اندازہ لگا لیا۔ ڈوپلر کا طریقہ یہ ہے کہ جو اجسام تم سے
پرے جا رہے ہوں ان کی روشنی یا طیفی رنگ سرخ زیادہ معلوم ہوگا۔ اور جو جسم تمہاری طرف
بڑھ رہا ہو اس کے طیفی خطوط بنفشئی کے قریب قریب معلوم ہوں گے۔ اس طیف نما سے اور
رصدگاہ جبل ولسن (امریکہ) میں پروفیسر ہبل (Hubble) اور پروفیسر ہوماسن
Dr. Humason نے بہت سے ستاروں کی رفتاریں معلوم کر لی ہیں۔

ہم کو اب یہاں سے یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر ایسے بعید ترین فاصلوں کو یہاں سے
بیٹھے بیٹھے تم نے کس طرح ناپ لیا جب کہ سب کو معلوم ہے کہ عرصہ تک نظام بطلیموس
Ptolemy یورپ میں رائج تھا اور ہندوستان میں اب تک بعض عربی مدارس میں مانا جاتا ہے
اس میں زمین کو مرکز عالم بتایا جاتا ہے، اور سورج کو صرف ایک سیارہ کے مانند مانتے ہیں
اس نظام بطلیموسی کے خلاف نظام فیثاغورث Pythagoras تھا جس میں سورج
کو مرکز مانا جاتا ہے۔ اس کی تجدید مسلمانوں میں حکیم بو علی سینا نے اور یورپ میں ایک
راہب کوپر نیکس Copen icus نے کی۔ کوپر نیکس اور بعد کے حکما کے اقوال سے پتہ لگتا ہے
کہ وہ شیخ ابن سینا کی تعلیم سے فائدہ اٹھا چکے تھے۔ جب گلیلیو نے دوربین ایجاد کی تو نظام
شمسی فیثاغورث کا ثبوت عینی مل گیا۔ اسوقت سب سے پہلے آفتاب کے بعد کا اندازہ لگایا گیا
پہلے کسی نے پچاس لاکھ میل لگایا۔ ٹائیکو براہے Tycho-Brahe اور کیپلر Kepler
ایک کروڑ تیس لاکھ میل کا اندازہ لگایا۔ ۱۶۲۰ء میں کاسینی نے آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل
کا حساب لگایا۔ مگر ۳ جون ۱۷۶۹ء کو جب زہرہ کو گہن لگا تو چونکہ اس کا علم پہلے ہو چکا تھا۔
اس لئے امریکہ، ایشیا، افریقہ فلکیوں کی مہمیں روانہ ہوئیں۔ تاکہ اس گہن کو دیکھیں اور اس
سے نتائج اخذ کریں۔ اس گہن سے اور بعد کو بہت سے فلکیوں نے اور طبیعیوں نے پوری
ایک صدی کی محنت کے بعد اب نو کروڑ تیس لاکھ میل فاصلہ متعین کیا ہے جب ہم کو نزدیک
ترین ستارے کا علم ہو گیا تو ہم اسی نسبت سے اور فاصلے بھی متعین کر سکتے ہیں۔
سب سے پہلے ناقص تدبیر روشنی پیما (Photometer) سے کی گئی مگر اسے
فوراً ہی مسترد کر دیا گیا۔ کیونکہ بہت سے ستارے سورج سے لاکھوں مرتبہ زیادہ روشن ہیں
اور بالکل ایک نقطہ کے مانند بوجہ اپنے بعد کے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسری ترکیب سے گلیلیو نے
بتائی۔ اور اس پر عمل ہرشل نے کیا۔ یعنی دوربین کی ایک ہی فضا میں دو ستاروں کو دیکھ کر ان کا
زاویوی فاصلہ دیکھ لیا اور کچھ عرصہ کے بعد پھر فاصلہ دیکھا۔ اگر زاویوی فاصلہ میں

کچھ فرق معلوم ہوا تو سمجھ لیا کہ ان کا فاصلہ بھی کم و بیش ہے۔ ورنہ ایک ہی فاصلہ پر ہیں۔ میونک (Munich) کے عینک ساز فراون ہافر Frauenhoffer نے ہیلیومیٹر (Heliometer) ایجاد کیا۔ ان ترکیبوں اور آلات نے ثوابت کے فاصلے ناپنے میں مدد کی۔ مگر یہاں سے اب ہم عام فہم ریاضی کے اصول بتا کر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

ہر اسکول کا بچہ زاویہ پیما Protractor کو جانتا ہے۔ یہ ایک نصف دائرہ کی شکل ٹین یا لکڑی کی پٹی ہوتی ہے جس پر ایک سو اسی ۱۸۰ درجے کٹے ہوئے ہوتے ہیں جہاں اس کی تنصیف ہوتی ہے۔ اسے زاویہ قائمہ کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے ہم زاویہ کو ناپ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ زاویہ اتنے درجے کا ہے۔ اسی طرح پیمایش والوں کے پاس اور رصدگاہوں میں ایک آلہ Theodolite ہوتا ہے جس کے ذریعہ دو نقطوں کے درمیان کا زاویہ ناپ سکتے ہیں۔

اب فرض کرو ایک نقطہ الف ہے جس کا فاصلہ ہم کا ب سے کھڑے ہو کر ناپنا چاہتے ہیں۔ الف تک نہیں پہونچ سکتے۔ اگر کاغذ پر ہے تو پہلے زاویہ ج الف ب ناپ لیں گے ج۔ ایک اور نقطہ افق پر خط مستقیم میں ہے۔ ب اور ج کا فاصلہ ناپنے سے ہم کو ب الف کا فاصلہ معلوم ہوجائیگا۔
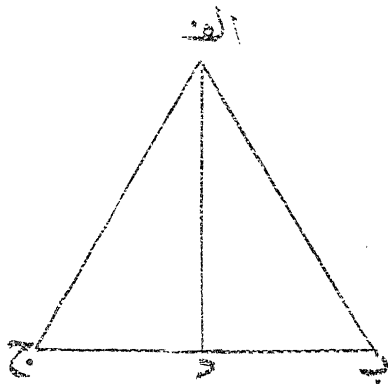
اس فاصلہ ناپنے کے لئے ب ج کی د پر تنصیف کر لو تو زاویہ الف بھی دو حصوں میں برابر تقسیم ہو گیا ہے۔ اصول علم مثلث Trignometry کے تحت میں ب د / د الف زاویہ ب الف د کا ماس Tangent کہلاتا ہے۔

اور اصطلاحًا اس طرح لکھتے ہیں مس د ا ب جسقدر زاویہ ہیں سب کی مماس کی ایک جدول ریاضی دانوں نے بنادی ہے۔ ناظرین کی آگاہی کے لئے اور اس لئے کہ جسے شوق ہو زاویہ پیما سے ناپ کر دیکھ لے اور اس جدول سے اس کی قیمت معلوم کرکے صرف فاصلہ ب د ناپ کر اس ضابطہ سے د الف اول ریاضی کے اصول سے نکال لے۔ اور پھر پیانہ سے ناپ کر تطبیق کرلے ایسے کئی مثلث بناکر مشق کرے تو یہ ضابطہ زیادہ مستحضر ہوجائے گا۔ چونکہ بخوف طوالت ہم نے یہ جدول تین تین درجہ چھوڑ کر دی ہے۔ اس لئے تھوڑی سی غلطی کا احتمال رہے گا جسقدر زاویہ صحت کے ساتھ ناپا جائیگا۔ اور چھوٹے درجہ کا مماس لیا جائے گا یعنی درجہ دقیقہ اور ثانیہ تک اسی صحت کیساتھ ب د کا فاصلہ صحت سے ناپا جائیگا۔

اب فرض کیجئے مماس زاویہ ب الف د = ب د/الف د ہے۔ لہذا د الف = ب د/مماس ب الف د۔ ب د تو ہم ناپ سکتے ہیں اور زاویہ کا مماس ہم کو مندرجہ ذیل جدول سے معلوم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ہم خواہ الف تک نہ پہونچ سکیں۔ مگر ہم زاویہ ب د ناپ سکتے ہیں۔ فی الحال اسے آپ زاویہ پیما سے ناپئے۔ تو اس ضابطہ کی رو سے آپ فاصلہ الف د معلوم کرسکتے ہیں۔

جدول یہ ہے

زاویہ	مماس	زاویہ	مماس
۰ صفر	۰ صفر	۱۹	٫۳۴۴۳
۱	٫۰۱۷۵	۲۲	٫۴۰۴۰
۴	٫۰۶۹۹	۲۵	٫۴۶۶۳
۷	٫۱۲۲۸	۲۸	٫۵۳۱۷
۱۰	٫۱۷۶۳	۳۱	٫۶۰۰۹
۱۳	٫۲۳۰۹	۳۴	٫۶۷۴۵
۱۶	٫۲۸۶۷	۳۷	٫۷۵۳۶
		۴۰	٫۸۳۹۱
		۴۳	٫۹۳۲۵
		۴۵	۱٫۰۰۰۰

فرض کیجئے آپ نے ایک مثلث بنایا جس میں آپ نے ب د تین انچ کا بنایا اور زاویہ ب الف د ۳۶ درجہ کا بنایا۔ آپ کے پاس جدول میں ۰۷۳ ہے۔ فی الحال ۰۷۳ ہی لے لیجئے۔ اگر زیادہ صحت منظور ہو تو ۳۶ درجہ کا مماس بھی کہیں کتاب میں مل جائیگا۔ اب جدول میں ۷۳ کا مماس دیکھا۔ تو ۰۷۲۶۵۴ نکلا۔ لہذا د الف فاصلہ برابر ہے

$\frac{۳}{۰۷۲۶۵۴}$ = تقریباً چار انچ کے۔ یہ فاصلہ ہم بغیر ناپے بتا سکتے ہیں۔ اب ناپ کر صحت کر لیجئے

یہ اصول ریاضی کا سب سے آسان طریقہ ہے جس سے ہم کسی ناقابل گزر فاصلہ کو ناپ سکتے ہیں۔

اب فرض کیجئے ایک ستارہ ہے۔ اس کا ہم صرف زاویہ ناپ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس کا زاویہ ب سے ناپ لیا۔ اور چھ مہینہ کے بعد جب زمین دوسرے سرے ج پر پہونچ گئی۔ تو پھر اس کا زاویہ ناپا۔ یا تین مہینہ کے بعد سے ہم نے بالکل سمت راس پر دیکھا۔ اب ہم کو علم ہے کہ ب ج کا فاصلہ نو کروڑ تیس لاکھ میل کا دوگنا ہے کیونکہ زمین زیادہ سے زیادہ اسی قدر فاصلہ طے کر سکتی ہے اس کے بعد وہ اپنے مدار پر لوٹ کر بعد چھ ماہ اسی جگہ ب پر آجائے گی اگرچہ اسوقت اس کی شکل اس طرح کی ہوگی۔ مگر غور سے دیکھا جائے گا تو مثلث پھر بھی بنجاتا ہے منقوطہ خطوط ہمارا مثلث ہے۔
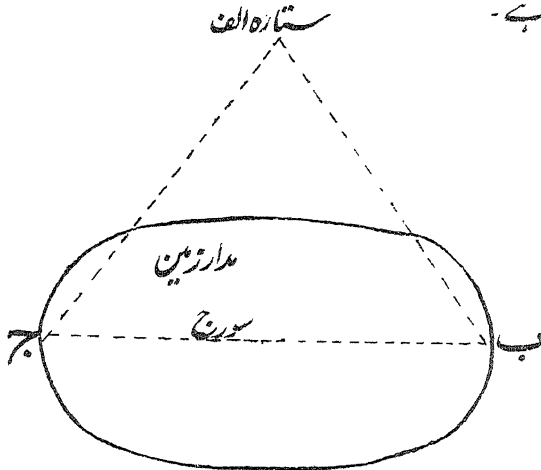
اگر آپ پانچ چھ مرتبہ مختلف مثلث بنا کر ناپیں گے تو معلوم ہوگا کہ جیسے جیسے زاویہ چھوٹا ہوتا جائے گا فاصلہ زیادہ ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر صفر ہو جائے یعنی زاویہ کی کوئی قدر نہ رہے تو فاصلہ لامتناہی بڑا ہو جائے گا۔ مگر اسوقت تک کوئی ستارہ نظر نہیں آیا ہے جس کا زاویہ صفر ہو۔ یہاں تک کہ کہکشاں کے بعض سحابیہ (Nebula) جو بکھرے ہوئے دھند کی طرح ہمکو نظر آتے ہیں ان کی روشنی زمین تک کئی کئی لاکھ برس میں آتی ہے ان کا زاویہ بھی کچھ قدر ضرور رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا امثال میں ہم نے کوشش کی ہو کہ آسان طریقہ سے سمجھا دیں کہ جو لوگ ریاضی نہیں جانتے ہیں وہ بھی ایک فٹ رول اور زاویہ پیما لیکر مختلف مثلث بنا کر فاصلہ ناپ کر سمجھ لیں۔ اسے اختلاف منظر (Parallax) بھی کہتے ہیں۔ یہ اختلاف منظر اس مثال سے اور واضح ہو جائے گا

ریل میں سفر کرتے وقت جو درخت قریب ہیں وہ ریل کے خلاف سمت میں بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے پیچھے کے درخت ریل کے ساتھ ساتھ آتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے کے خلاف سمت وغیرہ علی ہذا القیاس حقیقت میں درخت نہیں دوڑتے ہیں بلکہ اختلاف منظر سے ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ کمرہ میں بیٹھکر کر لو۔ ایک پنسل ہاتھ میں لیکر دو فٹ کے فاصلہ پر کھڑی کرو۔ اور ایک آنکھ سے یہ دیکھو کہ سامنے دیوار پر یہ کسی نقطہ الف کو چھپائے ہے۔ بغیر ہاتھ ہلائے یا سر ہلائے دوسری آنکھ کھول کر پہلی آنکھ بند کر لو۔ اور اب دیکھو کہ وہی پنسل بجائے نقطہ الف کے چھپائے ہوئے نقطہ ب کو چھپاتی ہے۔ اور یہ نقطہ الف سے بہت ہٹ گیا ہے جو اس شکل سے واضح ہوگی۔ آنکھ بند کرتے ہی دوسری آنکھ سے یہ معلوم ہوگا کہ پنسل فوراً ہٹ گئی اور اس نے فوراً جگہ چھوڑ دی تھوڑے تجربہ اور ناپنے سے ہمکو یہ معلوم ہو جائے گا۔
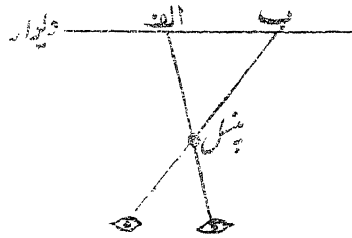
دیوار — الف — ب

پنسل

کہ الف اور ب کا فاصلہ پنسل کے فاصلہ اور آنکھ کے فاصلہ کی تناسب پر موقوف ہے۔ اگر بجائے آنکھ کے ہم ذرا ایک آدھ قدم آگے پیچھے بڑھکر ناپیں تو ہم کو اور فرق معلوم ہوگا جیسے جیسے پنسل دور ہوتی جائے گی۔ زاویہ پنسل چھوٹا ہوتا جائے گا۔ یہ تجربہ کمرہ میں اچھی طرح کرلو یا کاغذ پر مختلف شکلیں بناکر اسے خوب سمجھ لو۔ اب فرض کرو کہ بجائے پنسل کے ایک ستارہ ہے جو فضائے آسمان پر ایک نقطہ کو چھپائے ہوئے نظر آرہا ہے یا کسی دوسرے ستارے سے ایک نسبت فاصلہ پر نظر آرہا ہے۔ اسے ہمنے جنوری میں دیکھا اور ہر تین تین ہفتہ کے فاصلہ پر اس کا ارتصاد کرتے رہے تو جس طرح ہم بیضاوی شکل میں سورج کے گرد گھومتے جائیں گے۔ یہ ستارے بھی ہم کو مخالف سمت میں وہی بیضاوی شکل میں نظر آتا جائیگا۔ اور ہم کو اب معلوم ہوگا کہ فضا میں یہ بھی ایک بیضاوی شکل بنا رہا ہے۔ حالانکہ وہ قائم ہے جیسے جیسے یہ ستارہ دور ہوگا اس کا زاویہ چھوٹا ہوگا پھر دیکھو پنسل والے تجربہ کو۔ اس وقت اس کی شکل ایسی نظر آئے گی۔ ایک وقت میں چونکہ کئی کئی ستاروں ارتصاد کرتے ہیں۔ لہذا اسوقت دو ستاروں کی فرضی شکلیں بناکر ہم ناظرین پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں۔ بعید تر ستارہ کا زاویہ چھوٹا ہوگا۔ اگر کسی ایک ستارہ کا فاصلہ معلوم ہو تو دوسرے ستارے کا فاصلہ بآسانی معلوم کرسکتے ہیں۔
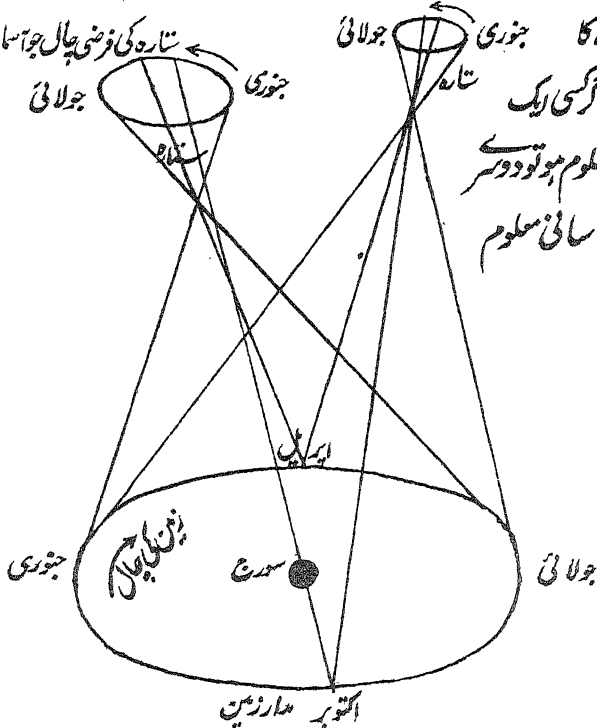
اسی طرح ہم بہت سے ستاروں کو دیکھتے ہیں اور ان کا زاویہ ناپتے رہیں تو چھ مہینہ کے بعد بآسانی ان کا فاصلہ زمین سے بتا سکتے ہیں۔ اگر ہماری زمین کا مدار بجائے ۱۸ کروڑ پچاس لاکھ انتہائی بعد کے برابر دور ہو۔ یا ہم اسوقت نپچیوں یا پلوٹو (نو دریافت شدہ سیارہ) سے ناپیں تو ان فاصلوں میں زیادہ صحت ہم کو معلوم ہوگی۔ ان زاویوں کے ناپنے کے نسبت صحیح آلات رصدگاہوں میں ہوتے ہیں اور یہ ہماری مضمون کی حد سے باہر ہیں اس لئے ہم اسے نظرانداز کرتے ہیں۔

قدیم فلکیوں نے تقریباً خاصی صحت کے ساتھ بغیر کسی آلات کے بھی محض بعض سیاروں کی چال سے مختلف اجرام فلکی کے فاصلے ناپ لئے تھے۔ زحل کو سب سے بلند سیارہ سمجھتے تھے اسوقت یورینس کہاں تھا۔ چاند کو سب سے قریب سمجھتے تھے۔ اور اسی اعتبار سے ان کے آسمان مقرر کر دئے تھے۔ سورج کو چوتھے آسمان پر رکھا تھا۔

ہم اس مضمون کو ایک ضابطہ پر ختم کرتے ہیں۔ اگر ناظرین اسے یاد رکھیں گے تو یہ کام دیگا۔ ہر رصدگاہ میں ہر ستارہ کی زاویہ اختلاف منظر (Parallax) کی ایک جدول رہتی ہے جسے وقتاً فوقتاً ناپتے رہتے ہیں۔ اگر زاویہ معلوم ہو تو فاصلہ اس ضابطہ سے معلوم ہو جائیگا۔

$$\text{فاصلہ میلوں میں} = \frac{93000000 \times 206265}{\text{زاویہ اختلاف منظر}}$$

اس فاصلہ کو اگر سال نور میں جو تقریباً ۶۰ کھرب میل کے برابر ہوتا ہے تحویل کریں تو یہ ضابطہ ہوگا۔

$$\text{سال نور} = \frac{3026}{\text{زاویہ اختلاف منظر}}$$

جیسے جیسے زاویہ اختلاف منظر چھوٹا ہوتا جائیگا یہ قدر بڑھتی جائے گی۔ اس طرح

ہم دوسرے دور ستارہ کا فاصلہ خواہ میلوں میں خواہ سال نور میں بتا سکتے ہیں۔

طلبا سے ہم ضرور درخواست کریں گے کہ وہ مثلث کئی کئی بنا کر یہ دیکھیں کہ پیمائش
سے اور اصلی ناپ سے کسقدر فیصدی کا فرق پڑتا ہے۔ اگر انہیں زیادہ صحت منظور ہو تو
مماس کی جدول اپنے اسکول کی لائبریری یا ریاضی کے استاد سے لیکر یہ دلچسپ مشغلہ کریں
اور صحت کا نشان لگائیں جس قدر صحت کے ساتھ زاویہ اور قاعدہ ناپیں گے۔ اور مماس
کو تقسیم کریں گے اتنے ہی صحت کے ساتھ فاصلہ معلوم ہوگا۔ بعض صورتوں میں ہزار میں
ایک درجہ غلطی کا ہوگا۔ اسی نسبت سے ستاروں کا فاصلہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ لاکھ میل
ادھر یا ادھر کچھ قدر نہیں رکھتے۔ فقط

قیس و لبنیٰ

لیلیٰ مجنوں قیس و لبنیٰ شیریں فرہاد اور وامق و عذرا کا ذکر اتنی بار ہمارے لٹریچر
میں آیا ہے کہ اب یہ قصے تقریباً ہمارے ادب کا ایک جزو بن گئے ہیں تلمیحات سے
گذر کر ان پر مستقل افسانے اور ناول تصنیف ہو چکے ہیں۔ بیجا نہ ہوگا اگر ان پر نقد و نظر کا سلسلہ
شروع کیا جائے۔

علمی حلقے مصر کے نقاد اور منکر قدامت "ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے نام سے نا آشنا نہ ہوں گے
مدت ہوئی السیاسۃ اور دوسرے مصری جرائد میں ان کے مقالات تنقیدی شائع
ہوتے تھے جس میں بہت سے مشہور قدیم اور زبان زد خاص و عام حقائق سے انکار
کیا گیا تھا۔ بعد میں یہی مقالات حدیث الاولیاء کے نام سے کتابی صورت میں جمع کردئے
گئے ہیں۔ الہلال کلکتہ دور جدید کے کسی نمبر میں لیلیٰ و مجنوں کے متعلق ایک حصہ شائع
ہوا تھا۔ اب میں اس سلسلہ کا دوسرا مضمون قیس و لبنیٰ پیش خدمت کر رہا ہوں اس
مرتبہ صاحب مضمون سے اتفاق یا اختلاف رائے مقصود نہیں ہے اس کے
لئے کسی آیندہ فرصت کا منتظر ہوں۔

عبدالمجیب ندوی

قیس و لبنیٰ کی داستان حسن و عشق میں بھی لیلیٰ و مجنون، اور جمیل و ثبینہ کی طرح آغاز محبت کی دلچسپیوں، آتش عشق کی شرر باریوں، لطف صحبت اور غم ہجر، روز وصل اور شب فراق، جور اعدا اور گردش زمانہ اعزا کی ریشہ دوانیوں، لوگوں کی نکتہ چینیوں، دل کی بے تابیوں اور پھر ان حوصلہ شکن اور جاں گسل تکالیف سے عاجز آکر اس بے کیف زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس اشتراک کی وجہ سے قیس و لبنیٰ کا فسانہ لیلیٰ مجنون کا مثیل خیال کیا جاتا ہے لیکن باوجود اس کے لیلیٰ مجنون اور قیس و لبنیٰ کے قصہ میں عظیم الشان فرق ہے وہ محض ایک پر درد فسانہ اور عشقیہ قصہ ہے جس کے اندر ایسے واقعات ہیں جن کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے دور کا بھی نہیں۔ ان واقعات کو اگر عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یقیناً اس کا فیصلہ بالکل ان کے خلاف ہوگا۔ اگرچہ قیس و لبنیٰ کا قصہ کوئی واقعی اور حقیقی قصہ نہیں ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے تمام واقعات حقیقت پر مبنی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ وہ دور از کار اور بعید از عقل قصے ہیں جن میں حقائق سے قطع نظر کر لی گئی ہے لیکن قیس و لبنیٰ کی خصوصیت ہے کہ اس میں واقعات حقیقت کے رنگ میں پیش کئے گئے ہیں۔ رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا۔ انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی گھڑا ہوا قصہ یا فسانہ ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی کا مرقع کھینچا گیا ہے اور انہیں واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو آئے دن ہمیں پیش آیا کرتے ہیں۔ کیا ساس بہوؤں کی نوک جھونک کوئی نئی بات ہے۔ اگر کسی ماں نے لاڈ دلار سے پال پوس کر بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ اپنے بیٹے کو بیاہا تو اب اس کی بے اعتنائی اور بے التفاتی پر اس جان نثار ماں کا بیٹے سے خفا ہونا اور بہو کو اس بے التفاتی کا باعث سمجھنا اور اس کے درپے ہونا کوئی خلاف عادت اور نادر الوقوع امر نہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے پیارے بیٹے کی تمام توجہات کا مرکز بنی رہے اور اس کی محبت میں کوئی شریک و سہیم نہ ہو۔ لیکن بہو کا وجود اس کی

میں حائل ہوتا ہے اور یہی بنیاد ہوتی ہے اس کشمکش کی جو آج تک ساس بہوؤں میں چلی آرہی ہے۔ بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جو ماں اور بیوی دونوں کے خوش رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں ورنہ اکثر و بیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی نے والدین کی جذبات خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کی تو مجبورًا اسے بیوی کی حق تلفی کرنی پڑی اور جس نے بیوی کی رضامندی کا خیال کیا اسکو والدین کے خواہشات کو نظر انداز کرنا پڑا۔ ہمارے ہیرو قیس کو بھی یہ کٹھن منزل پیش آئی لیکن وہ باوجود انتہائی جدو جہد کے عدل و انصاف کے ساتھ اس منزل کو طے نہ کر سکا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیس لبنیٰ کا فسانہ بنانیوالے نے اپنی وسعت معلومات اور جدت طبع سے اس قصہ کو عام عشقیہ قصوں سے بہت ممتاز اور بلند کر دیا ہے۔ اس کے مصنف نے نہ تو مبالغہ اور تعلی سے کام لیکر قصہ کو حقیقت سے دور ہونے دیا ہے اور نہ بعید از قیاس واقعات بیان کر کے حیرت و استعجاب میں ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن نہیں معلوم کیوں شرفائے قریش اور امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما جیسی شخصیتوں کو طلاق کے بارے میں بیچ میں لایا گیا ہے اس سے بجائے اس کے کہ ان بلند مرتبت شخصیتوں کی وجہ سے قصہ کی اہمیت میں کچھ اضافہ ہو اس کی واقعیت میں شبہہ ہوتا ہے اس لئے کہ شرفائے قریش اور امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کا اس معاملہ میں پڑنا ان کے مراتب سے کہیں فروتر معلوم ہوتا ہے۔

دوران سفر میں قیس کو لبنیٰ سے شرف تکلم حاصل ہوا باتوں ہی باتوں میں پیمان محبت مستحکم ہو گیا۔ اور قیس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس کو اپنی رفیقۂ حیات بنائے گا لیکن اس کے والد نے اس کی سخت مخالفت کی اس لئے کہ وہ ایک دولتمند شخص تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے پیارے بیٹے کی شادی اپنے ہی قبیلہ کی کسی لڑکی سے کرے تاکہ گھر کی دولت گھر ہی میں رہے جب قیس والد کی مخالفت سے مایوس ہو گیا تو وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جو اس کے دودھ شریک بھائی تھے انکی خدمت میں حاضر ہوا اور

اپنا فسانۂ غم سنا کر سفارش کی استدعا کی۔ آپ نے اس کی درخواست قبول کی اور دیار لبنیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ لبنیٰ کا باپ آپ کو دیکھتے ہی آپ کے استقبال کے لئے بڑھا اور بہت عزت و احترام سے پیش آیا۔ آپ نے اپنے آنے کا مقصد ظاہر کیا اس نے بلا تامل جو آپ نے فرمایا قبول کرلیا لیکن اس نے عرض کیا کہ میں عربی ہوں اور عربوں کے مخصوص رسوم و عادات ہوتے ہیں جن سے تجاوز کرنا ناپسندیدہ خیال کیا جاتا ہے اس لئے نکاح کے وقت قیس کے والد کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ وہ اسے نامناسب سمجھتا تھا کہ کسی مالدار نوجوان سے بلا اس کے والدین کی رضامندی کے اپنی بیٹی بیاہ دے۔ آپ نے اس کے عذر معقول کو قبول فرمایا۔ اور قیس کے ہمراہ اس کے والد کی طرف روانہ ہوئے قیس کا والد آپ کو آتے دیکھکر سرو قد کھڑا ہوگیا۔ اور نہایت تعظیم و تکریم کی آپ نے قیس کی شادی کے متعلق اس سے کہا آپ کے فرمانے کے بعد اسے لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی اور فوراً سامان سفر درست کرکے لبنیٰ کے یہاں جاکر شادی کی رسم ادا کی۔

قیس کے لئے یہ شادی ایک سعادت ابدی اور مسرت دائمی تھی۔ وہ مجنون اور جمیل اور اسی قسم کے عاشقان ناکام سے کہیں زیادہ کامیاب ہوا زمانہ نے اس کے لئے وہ آسانی پیدا کردی تھی۔ جو اُن مریضان عشق کو حاصل نہ تھی۔ فلک کج رفتار نے اس کی پاکیزہ محبت میں کوئی رخنہ اندازی نہ کی اور نہ لبنیٰ کے قبیلہ والے لیلیٰ اور بثینہ کے قبیلہ والوں کی طرح چہ میگوئیوں کا موقع پا سکے۔ ان متضاد اور متغائر باتوں کو ہم کیونکر تطبیق دے سکتے ہیں کہ ایک طرف عرب اپنی بدویانہ زندگی کے رسم و رواج کے اسقدر پابند کہ عاشق و معشوق کی شادی اپنے لئے ننگ و عار خیال کرتے تھے اور وہ چاہنے والوں کی آپس میں شادی ذلت و خواری کا باعث تصور کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ لوگوں کی انگشت نمائی اور ہم چشموں کے سامنے سر نیچا ہونے کے خیال سے دونوں کے درمیان قطع محبت کی غرض سے مداخلت کے لئے طیار ہوجاتے تھے۔ اور انتہائی کوشش کرتے تھے۔ کہ

دونوں اپنی محبت سے باز آجاہیں۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لبنیٰ کے قبیلے والے
بغیر کسی تامل و تکلف کے اور بغیر کسی عذر و معذرت کے بطیب خاطر شادی کرنے کے لئے
طیار ہو جاتے ہیں لیکن اس قصہ کے مصنف نے اپنی طبع اختراع پسند اور کمال قابلیت
کی بنا پر امام حسین رضی اللہ عنہ جیسی اعلیٰ و ارفع شخصیت کو درمیان میں لا کر اس تضاد کی
گتھی کو بالکل سلجھا دیا ہے حسین ابن علی کی سفارش کے بعد رسول کے نواسے کے ارشاد
کے بعد کون ہے جسے تاب مجال اور طاقت انکار ہو۔ اسی طرح قیس کو اپنی مقصد میں کامیاب
اور اپنی آرزو کے پورا کرنے میں کامران دکھا کر قدیم طرز اور پرانی روایات سے انحراف کی
کوشش اور اپنے قصے کو ان عام قصوں اور فسانوں سے ممتاز کرنے کی سعی کی ہے
جن میں آج تک ناکامیابی و مایوسی دکھاتے چلے آئے ہیں، جن کی وجہ سے محبت کی
کامیابی چاہنے والوں کا وصال غیر مستحسن اور ناپسندیدہ سمجھا جانے لگا اور یہ رنگ قصوں
اور فسانوں کا ایک جزو لاینفک قرار پا گیا قیس اپنی اس مناسب اور خواہش کے مطابق
شادی سے حد درجہ مسرور تھا۔ اس لئے اب دنیا کی ہر مسرت و شادمانی اس کے
مقابلہ میں بے وقعت اور ہیچ تھی۔ ایسی ہی لبنیٰ بھی اپنے گوہر مقصود اور سرمایۂ حیات کے
پا لینے کے بعد تمام چیزوں سے مستغنی ہو گئی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے محبت تھی بے
لوث و بے غرض، دونوں میں عشق تھا۔ سچا اور پاکیزہ جیسا کہ لیلیٰ و مجنوں اور جمیل و ثبینہ میں۔
لیکن افسوس کہ وہ ناکام رہے۔ ان کی آرزوئیں پوری نہ ہوئیں، ان کی تمنائیں بر نہ آئیں۔
اور اسی کی حسرت دل میں لئے ہوئے وہ مریضان عشق محبت پر قربان ہو گئے لیکن قیس
و لبنیٰ نے اپنی مطلوب کو پا لیا۔ ان کے نالۂ نیم شبی رائگاں نہ گئے۔ ان کی آہ بے اثر نہ رہی
ان کا عشق محض حزن و ملال ہی ثابت نہ ہوا وہ شادی کر کے دنیا کی تمام چیزوں سے بے نیاز
ہو گئے اور وہ ایک دوسرے سے ملکر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ شادی قیس کے قبیلے اور گھرانے کی مرضی کے خلاف ہوئی

تھی ۔ وہ کبھی بھی اس کو پسند نہ کرتے تھے کہ ان کا مال واسباب غیر قبیلہ میں جائے۔
پھر لبنیٰ کے ساتھ ان کا معاندانہ برتاؤ کچھ خلاف امید نہ تھا۔ ساس بہوؤں کی لڑائی یوں ہی
مشہور ہے اس پر لطف یہ کہ اب قیس کو لبنیٰ کی محبت نے ایسا سرشار کر دیا تھا کہ اب اس
کی توجہ اپنی ماں کی طرف اتنی نہ رہی تھی جتنی کہ شادی کے قبل تھی۔ یہ چیز لبنیٰ کی طرف سے
اس کی ساس کی بیزاری اور نفرت سمجھنے کے لئے کافی تھی۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ
وہ لبنیٰ کو نکال کر رہے گی۔ اس نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ اپنی تمام کوششیں اس کے خلاف
صرف کر دے گی اور عزم مصمم کر لیا تھا کہ اس کے وجود کو اپنی راہ سے الگ کر کے رہے
گی۔ وہ عورت تھی اور عورتوں کا مکر و فریب مشہور ہے اس نے اپنی ناراضگی و خفگی کا اظہار
قیس سے نہ کیا اس لئے کہ وہ سمجھتی تھی کہ اس سے زیادہ سے زیادہ وہ یہی ہو سکتا ہے
کہ قیس اس کی طرف توجہ کرے اور اپنی بے اعتنائی اور بے التفاتی پر نادم ہو۔ یا پھر
اس کی مرضی اور مقصد کے بالکل برعکس اس شکوہ شکایت سے قیس پر برا اثر پڑے اور
بجائے اس کے کہ لبنیٰ کی طرف سے بے التفاتی برتے اس کی محبت کی چنگاری شعلہ زن
ہو جائے اور ماں کی رہی سہی محبت بھی خاک میں مل جائے اس لئے قیس سے اسکا
اظہار اس نے نامناسب خیال کیا۔ اس کی دلی تمنا تو یہ تھی کہ قیس لبنیٰ کو طلاق دیدے
اور یہ مقصد عالی اس شکوہ شکایت سے پورا نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے شوہر
یعنی قیس کے والد کو ابھارنا اور اس کے کان بھرنا شروع کیا۔ اس نے اس کو یہ بات
سجھائی کہ تمہارے سوائے قیس کے کوئی اور بیٹا نہیں اور لبنیٰ بانجھ ہے اس کے معنی
یہ ہیں کہ قیس کے بعد تمہارا نام مٹ جائے اور تمہاری نسل منقطع ہو جائے اور نہ صرف یہ
بلکہ گھر کا تمام مال واسباب لبنیٰ کے گھر والوں میں منتقل ہو جائے۔ اس لئے قیس کو چاہئے
کہ لبنیٰ کو طلاق دیکر دوسری شادی کرے لیکن اگر اس کو محبت نے اس قدر از خود رفتہ
کر دیا ہے کہ وہ طلاق دینے کے لئے نہیں طیار ہو سکتا تو خیر اس کو بھی رکھے لیکن اس کے

ساتھ ساتھ دوسری شادی بھی ضرور کرے تاکہ اس کے بعد نسل قائم رہے، نام باقی رہے اور مال و دولت بھی اپنے ہی گھر میں رہے۔ شیخ نے اپنی بیوی کی اس رائے سے پورا اتفاق ظاہر کیا اور وہ کیوں نہ اس سے متفق ہوتا۔ اس لئے کہ انسان اپنی نسل کی بقا اپنی دولت کے استحکام اور اپنی یادگار کا طبعاً خواہش مند اور طلب گار ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس بات کو پسند کیا۔ اور تمام بزرگان قوم کو جمع کر کے قیس کے سامنے یہ تجویز پیش کی قیس کی تو یہ حالت تھی کہ لبنیٰ کی محبت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز خیال کرتا تھا اس کو اپنا سرمایہ حیات سمجھتا تھا۔ بغیر لبنیٰ کے اس کی زندگی بے کیف اور بے مزہ تھی ایسی صورت میں لبنیٰ کو طلاق دینا یا اس کی سوکن لانا قیس کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے اس تجویز کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے والد نے کہا اچھا اگر تم اس کو گوارا نہیں کر سکتے تو ایک سے ایک خوبصورت لونڈیاں ہیں لیکن قیس نے کہا کہ کیا میں اس کو گوارا کر سکتا ہوں کہ میں لبنیٰ کے علاوہ کسی عورت پر ایک نظر غلط انداز بھی ڈالوں۔ اس پیہم انکار سے قیس کا والد بڑا افروختہ ہو گیا اور اس نے بگڑ کر کہا کہ اب تجھے صرف لبنیٰ کو طلاق دینا ہوگا اس کے علاوہ اور تمام صورتیں مسترد۔ اس پر قیس نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ طلاق پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نے اپنے والد کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یہ تین صورتیں میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ان میں سے جو چاہیں آپ منظور فرمالیں۔ اول تو یہ کہ آپ اپنی دوسری شادی کر لیں۔ تاکہ شاید خدا آپ کو کوئی دوسری اولاد دے اور وہ آپ کے گھر بار کی مالک ہو اور اگر یہ نہیں تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں لبنیٰ کو لیکر کسی طرف نکل جاؤں اور اگر یہ بھی نہیں تو پھر مجھے میری حالت پر چھوڑ دیجئے شاید اس طرح میں لبنیٰ کی محبت کو اپنے دل سے دور کر سکوں۔ اور آپ یہ سمجھ لیجئے گا کہ قیس مر گیا لیکن قیس کے والد نے ان تینوں صورتوں کو نامنظور کیا اور قسم کھائی کہ جب تک قیس لبنیٰ کو طلاق نہ دیدیگا۔ اس وقت تک میرے لئے سایہ میں بیٹھنا حرام ہے جب صبح ہوئی سورج نکلا اور دھوپ پھیلنے لگی تو قیس چادر لیکر اپنے والد

پر سایہ کرنے کی غرض سے کھڑا ہو گیا اور جب تک سورج ڈھل نہ گیا وہ اسی طرح کھڑا رہا۔
سورج ڈھلنے کے بعد قیس لبنیٰ کے پاس آیا گلے ملکر دونوں خوب روئے۔ اس کے بعد لبنیٰ نے
کہا کہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری بالکل صحیح ہے لیکن اس وقت جہاں تک اپنی جان
کا خطرہ نہ ہو مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں اس طرح اپنی جان نہ کھو بیٹھو۔ اس کا جواب قیس نے
صرف اسقدر دیا کہ جہاں تک ہو سکے ہمیں صبر و استقامت سے کام لینا چاہیئے اور پھر اسی
طرح روزانہ چادر تانے کھڑا رہنا۔ اس بارے میں مختلف روایتیں ہیں کہ صورت حال کب
تک قائم رہی بعض کا خیال ہے کہ یہ سنیہ گرہ چالیس روز تک ہوتی رہی لیکن ابو الفرج اس سے متفق
نہیں وہ کہتا ہے کہ چالیس دن کا کہیں بھی ذکر نہیں اس کے متعلق صرف دو روایتیں ہیں ایک
ایک سال کی اور ایک سات سال کی۔ لیکن ہمیں تو قرین قیاس چالیس ہی دن کی روایت
معلوم ہوتی ہے بہر حال ایک مدت کے بعد آخر کار قیس کو حقوق والدین اور بر بالوالدین کے
صاف و صریح احکامات نے اپنے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ دینی احکامات اور نوامیس
اسلام کے احترام کا خیال قیس کے دل میں بچپن ہی سے راسخ ہو گیا۔ اس کا عہد طفلی نبیرہ رسول
حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی پاکیزہ صحبت میں گذرا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ والد کو ایسی
حالت میں چھوڑ کر اس کی مرضی کے خلاف کرتا۔ اور اس کی ہلاکت کا باعث ہوتا۔ بادل نخواستہ
والدین کی خاطر وہ اس چیز کے کرنے کے لئے طیار ہو گیا جس پر وہ موت کو ترجیح دیتا تھا۔
اس نے جان بوجھ کر لبنیٰ کو والدین کے احترام پر قربان کر دیا۔ اس نے جان بوجھ کر لبنیٰ کی گردن
پر چھری پھیر دی یہ صحیح ہے کہ اسوقت کو شکست اور والدین کے جذبہ احترام کو فتح حاصل ہوئی
لیکن دراصل یہ فتح نہیں شکست تھی، کامیابی نہیں ناکامیابی تھی جس نے قیس کے قوائے عقلی کو برباد
کر دیا۔ اور اس کی قوت حافظہ کو تباہ کر دیا۔ اب اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے اپنی اقلیم دل کی ملکہ
کو تخت سے اتار دیا ہے۔ اپنے سرمایۂ حیات کو خود ہی لٹا دیا ہے جب لبنیٰ ایام عدت گذار چکی اور
اس کے گھر والے اس کو لینے آئے تو اس سرشار محبت نے اُن کی مزاحمت کرنی چاہی اور جب

وہ دولہن کا ڈولا نہیں کشتۂ محبت کا جنازہ لے کر چلے تو ان کے ساتھ جانا چاہا لیکن جب اس سے بھی روکا گیا تو وہ دیوانہ محبت جب تک لبنیٰ کا ناقہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا اپنی نظروں سے اس کی مشایعت کرتا رہا اور جب اس سے بھی محروم ہو گیا تو نقش قدم کو آنکھوں سے لگاتا اس کی مٹی اٹھا کر منہ میں ملتا۔ گھر میں اس کی چیزیں دیکھ کر سینہ سے لگاتا اور اپنی حسرت نصیبی پر چیخیں مار مار کر روتا۔ جگر شق ہو جانے والے اشعار پڑھتا۔ اس جگہ سے یہ قصہ لیلیٰ و مجنوں اور جمیل بثینہ کے مشابہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ لیلیٰ مجنوں کے قصہ کی طرح اس میں بھی دور از کار باتوں اور محال و مستبعد واقعات سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے یا جمیل و بثینہ کی طرح تکلف و تصنع، مبالغہ و تعلّی سے قصہ کو واقعیت سے دور کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک حسرت ناک، پر درد انسانی قصہ ہے جس کے سننے کے بعد بجائے حیرت و استعجاب کے دل میں ایک درد اور جگر میں ایک خلش محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں وہی واقعات و حادثات اور وہی جذبات و واردات ہمارے سامنے ایک موثر انداز میں پیش کئے گئے ہیں جو ہم بسا اوقات خود اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ ایک شخص جان سے زیادہ عزیز اور دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ پسندیدہ چیز کے چھوڑ دینے پر مجبور کیا جاتا ہے پھر اگر اس سے دست کش ہونے کے بعد اور وہ اپنی عقل و خرد، اپنے ہوش و حواس اور اپنی دماغی قوت کھو بیٹھتا ہے تو اس میں کون سی حیرت و استعجاب کی بات ہے۔ لبنیٰ کو طلاق دینے کے بعد قیس کے ہاتھ سے بھی دامن عقل و ہوش چھوٹ گیا۔ وہ گریہ و زاری کرتا آہ و نالے بھرتا، سینہ کوبی و سرگردانی کرتا، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ صبر و سکون، تسکین اطمینان اور راحت و آرام اب اس دنیا میں حاصل ہونے کا نہیں پھر بھی اس کی سعی لاحاصل کرتا۔ مگر محبت کہیں چین لینے دیتی ہے۔ اگر کسی بات سے کچھ سکون حاصل ہوا تو کسی نئے خیال نے آ کر فوراً اس کو بے چین کر دیا۔ اگر ایک مصیبت سے کچھ چھٹکارا ملا تو دوسری مصیبت فوراً آن کھڑی ہوئی۔ ان ہی مصائب و آلام حسرت آگیں طرز پر ان اشعار میں ظاہر کرتا ہے۔

اُحبک اصنافاً من الحب لم اجد ۔۔۔ لہا مثلہ فی سائر الناس یوصف

فمنہن حب للحبیب ورحمۃ ۔۔۔ بمعرفتی منہ بما یتکلف

وحب بدا بالجسم واللون ظاہر ۔۔۔ وحب لدی نفسی من الروح الطف

گرچہ میرا بھی خیال ہے کہ ان اشعار میں تصنع ہے لیکن دلکشی ان کو مصنوعی کہنے سے روکتی ہے اور کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے یوں تو پھر سارا کا سارا قصہ ہی مصنوعی ہے۔ جیسا کہ مجنون وجمیل اور تمام رہروان راہ عشق کو پیش آتا رہا ہے کہ گھر والے اس کی محبت پر معترض اور اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اس پر پابندیاں عائد کرتے ہیں اور اس کو مقید رکھنا چاہتے ہیں حتیٰ کہ اس کو جان سے بیزار اور زندگی سے عاجز کر دیتے ہیں۔ ہمارے قیس کو بھی یہ مرحلہ پیش آیا۔ لیکن اگر وہ مجنون کی طرح ان تکالیف و مصائب سے دیوانہ نہیں ہوا تو کم ازکم وہ مرنے کے قریب تو ہو ہی گیا۔ اس کی دگرگوں اور خطرناک حالت دیکھ کر چارہ گروں نے اطبار کیطرف رجوع کیا۔ لڑکیوں سے طبیعت بہلانے کی کوششیں کیں۔ سیر وسیاحت سے لبنیٰ کی محبت بھلانے کی سعی کی گئی لیکن تمام سعی بیکار اور تمام کوششیں بے سود۔ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ خود قیس نے یا مجنون وجمیل میں سے کسی نے اس مفہوم کو اس شعر میں ادا کیا ہے

اُرِیدُ لِاَنسیٰ ذکرہا فکانما ۔۔۔ تمثل لی لیلیٰ بکل سبیل

آخر کار قیس نے دیار لبنیٰ کے چکر لگانا اور تلاش یار میں سرگرداں رہنا شروع کر دیا۔ لبنیٰ کے قبیلہ والوں کو اپنا فسانۂ غم سناتا اور لبنیٰ کا حال دریافت کرتا۔ لبنیٰ کے گھر والوں کو دیوانۂ محبت کا یہ دیوانہ پن برا معلوم ہوا اور انہوں نے وہی کیا جو لیلیٰ کے قبیلہ والوں نے مجنوں کے ساتھ کیا تھا۔ وہ دربار شاہی میں جاکر فریادی ہوئے اور انہوں نے قیس کے خون کی معافی کا حکم دربار خلافت سے صادر کرا دیا لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی وارفتگان عشق کے ساتھ اس سے قبل ایسے ہی برتاؤ کیا جا چکا ہے قیس بن ملوح اور جمیل کا خون بھی اسی طرح مباح کر دیا گیا تھا۔

اس جگہ سے قیس کا فسانہ جمیل و مجنوں کے قصہ سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے مجنوں اور جمیل اور اسی قسم کے دوسرے عشقیہ قصوں میں عام طور پر ایک عجیب و غریب بات دکھلائی جاتی ہے وہی وفا شعار اور جان نثار عورت جس نے محبت کی خاطر لوگوں کی انگشت نمائی ہمجولیوں کے طعن و تشنیع، گھر والوں کی زجر و توبیخ، گھرانے کی عزت اور قبیلہ کے ناموس غرض دنیا کی کسی چیز کی پروانہ کی کس کے لئے صرف ایک ذات کے لیے محض اس شخص کے لیے جس سے پیمان محبت بندھ چکا تھا۔ اور جس کی محبت کے کہربائی اثر نے دل کو بے قابو کر دیا تھا، اب وہی پیکر محبت عذاری پر اتر آتی ہے پیمان محبت اور عہد وفا کو توڑ کر دوسرے سے رشتہ محبت جوڑتی ہے اس کی محبت کا دم بھرتی ہے اس پر جان نثار کرتی ہے محبوب کی اس بیوفائی پر گرفتار عشق اور فریب خوردہ محبت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ طعنہ زنی کیجاتی ہے اور اس طرح اس کے زخموں کے لیے سامان نمک پاشی فراہم کیا جاتا ہے اسی موقع پر تو مجنوں کہتا ہے۔

قضاہا لغیری وابتلانی بحبہا   فہلا بشئ غیر لیلی ابتلانیا

قیس کا قصہ عام المیہ قصوں کی طرح یہیں ختم نہیں ہو جاتا کہ لبنیٰ کی شادی کسی دوسرے کے ساتھ ہو جائے اور قیس بھی جمیل اور مجنوں کی طرح درد فراق اور غم جدائی کی صبر آزما تکلیف سے اپنی تمام حسرتوں اور تمناؤں کے ساتھ راہ محبت میں جان بحق ہو جائے۔ اس قصے کا واضع اپنی جدت طراز اور اختراع پسند طبیعت کیوجہ سے مجنوں اور جمیل کے قصوں کے واضعین سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس جگہ سے اس نے کس خوبی سے قصہ کا رخ بدلا ہے۔

شاہی حکم کی بنا پر قیس کا خون مباح ہو ہی گیا تھا۔ وہ سرگردان و پریشان لبنیٰ کی تلاش میں اور اپنی کھوئی ہوئی دولت کی جستجو میں قریہ قریہ اور قبیلہ قبیلہ پھرتا رہتا۔ ایک مرتبہ کہیں قبیلہ فزارہ میں جانکلا بنی فزارہ کی ایک دوشیزہ جو لبنیٰ سے بہت مشابہ تھی اسطرف

سے نکلی قیس سے بھلا کب رہا جاتا۔ اس کے قلب مضطر نے اس کا نام دریافت کرنے پر مجبور کر دیا۔ حسن اتفاق سے اس کا نام بھی لیلیٰ تھا قیس نام سنتے ہی بے خود و از خود رفتہ ہو گیا لڑکی بھی اس کی اس ادائے دیوانگی سے متاثر ہوئی۔ لڑکی کے بھائی کو جب معلوم ہوا کہ یہ قیس بن ذریح ہے تو اس نے اس کی بڑی دلدہی کی۔ اور انتہائی کوشش کی کہ وہ اس کی بہن سے شادی کرے قیس اس کے اصرار نیز لیلیٰ کی مشابہت سے بہت کچھ متاثر ہوا۔ اور آخر کار شادی پر رضا مند ہو گیا۔ شب عروس میں جب کہ قیس کے روبرو لباس عروس میں ملبوس نئی لیلیٰ جلوہ آرا تھی سوگوار لیلیٰ کی خیالی تصویر ماتمی لباس میں قیس کی آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی قیس کو تاب دیدار اور یارائے ضبط نہ رہا۔ جو چنگاری دب گئی تھی پھر شعلہ زن ہو گئی، جو زخم رو بہ اندمال ہونے لگے تھے پھر ہرے ہو گئے۔ اور جو خوشگوار خواب وہ دیکھ رہا تھا اسے کسی نے جھنجھوڑ دیا۔ پھر آنے کا وعدہ کر کے فوراً وہاں سے چل کھڑا ہوا اور کبھی اس طرف کا رخ نہ کیا۔ قبل اس کے کہ ہم آگے چلیں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات کا دکھانا فنی حیثیت سے کوئی غریب اور نادر چیز نہیں۔ اکثر و بیشتر قصوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مشابہ و مماثل دکھا کر قصہ کو زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیلیٰ کا والد جب دربار شاہی میں گیا تھا اور وہاں سے خون کے معافی کا حکم لایا تھا اسوقت خلیفہ وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس شخص کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ اس کے ساتھ لیلیٰ کی شادی کر دو لیکن اس وقت لیلیٰ شادی کے لئے کسی طرح رضا مند نہ ہوئی تھی۔ البتہ جب اسے قیس کی شادی کی خبر معلوم ہوئی تو اس کو بہت رنج و افسوس ہوا اور اس نے بھی قیس کو جواب بالمثل دینے کا ارادہ کر لیا معاملات طے شدنی صرف لیلیٰ کی رضا مندی کی ضرورت تھی اتفاق سے وہ بھی حاصل ہو گئی اور اب لیلیٰ اپنے شوہر کے ساتھ مدینہ میں زندگی بسر کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کی خبر قیس کے کانوں تک پہونچی۔ اس خبر سے اس کو روحانی صدمہ ہوا۔ وہ غمگین و افسردہ، مغموم و محزون تو پہلے ہی سے تھا

لیکن اس غم میں ایک لطف تھا۔ اس درد میں ایک لذت تھی۔ اور اس کرب میں مزہ تھا۔ مگر
اب غم تھا اس سے زیادہ اور درد تھا اس سے سخت لیکن لذت سے خالی اور لطف سے معرّی۔
قصہ کے واضع نے آخر میں اس قصہ کو بھی تقریباً اسی رنگ میں لاکر نمایاں کیا ہے لیکن ایک
مخصوص انداز کے ساتھ۔ اور ایک امتیازی پہلو لئے ہوئے لبنیٰ کی شادی کا حال معلوم ہونے
کے بعد قیس نے بجائے صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کے کوچہ نوردی اور مدینہ کی گلیوں کی
خاک چھاننا شروع کردیا۔ اس کے بعد سے مختلف دلچسپ قصے مشہور ہیں۔ منجملہ ان کے اونٹوں
کا قصہ بھی ہے۔ مدینہ اب قیس کی منزل مقصود اور اس کے تمام توجہات کا مرکز تھا وہ اب
اس سرزمین میں ایک کشش جاذبیت محسوس کرتا تھا اس نے اپنے والد کے اونٹ لئے۔ اور
یہ ظاہر کیا کہ وہ انہیں مدینہ بیچنے کی غرض سے لئے جارہا ہے لیکن اس کا یہ فقرہ چل نہ سکا
اور اس کا والد حقیقت واقعہ سے واقف ہوگیا لیکن اس سے قیس کے ارادہ میں کوئی تزلزل
پیدا نہ ہوا اور وہ اونٹ لیکر مدینہ کیطرف روانہ ہوگیا۔ مدینہ پہونچکر بازار میں ایک شخص سے
اونٹوں کی خریداری کے متعلق بات چیت ہوئی معاملہ طے ہوگیا۔ اور اس شخص نے وعدہ کیا کہ
صبح تم میرے گھر پر آکر ان کی قیمت لے جانا قیس کو کیا معلوم کہ وہ کس سے معاملہ طے کررہا ہے
اسے کیا علم کہ وہ اپنے رقیب سے گفتگو کررہا ہے۔ یہ معاملہ جس سے طے ہوا تھا وہ لبنیٰ کا
شوہر تھا لیکن ایک دوسرے سے ناواقف تھے قیس حسب وعدہ صبح اس کے مکان پر گیا
اور لونڈی سے پکار کر کہا کہ اندر جاکر میرے آنے کی خبر اپنے آقا سے کردے لبنیٰ کے کانوں
میں جب یہ آواز پہونچی تو اس نے محسوس کیا کہ اس آواز سے تو کان آشنا ہیں لونڈی اندر
گئی تو لبنیٰ نے اس سے کہا کہ اس شخص سے جاکر دریافت کرو کہ تم اسقدر پریشان حال کیوں
ہو۔ لونڈی کے اس سوال پر قیس نے کہا کہ فراق یار نے یہ حالت کردی ہے لبنیٰ نے پھر لونڈی
سے کہلا بھیجا کہ وہ ہمیں اپنا فسانہ غم سنائے قیس اپنی داستان سنا ہی رہا تھا کہ یکایک پردہ
اٹھا اور لبنیٰ سامنے کھڑی تھی لبنیٰ نے کہا کہ بس کافی ہے۔ اب اپنا فسانہ غم رہنے دے۔

قیس یہ منظر دیکھکر مبہوت سا ہوگیا۔ زار و قطار رونے لگا اور پھر تاب نہ لاکر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ صاحب خانہ ہر چند بلاتا اور پکارتا رہا لیکن نہ اس نے کوئی جواب دیا اور نہ مڑکر اس طرف دیکھا لبنیٰ نے اپنے شوہر سے کہا حیف تجھے نہیں معلوم یہ قیس تھا۔ اس نے کہا۔ کیا کہوں افسوس کہ میں نے نہیں پہچانا۔ انہیں قصوں میں سے بُریکہ نامی ایک عورت کا قصہ ہے یہ شرفاء قریش میں سے ایک شخص کی بیوی تھی قیس نے چاہا کہ اس کے ذریعے سے لبنیٰ سے ملنے کی کوشش کرے یہ عورت اس معاملے میں بہت ہوشیار تھی قیس کے کہنے سے وہ طیار ہوگئی اور اس نے ایک دن دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ پہلے تو شکوہ شکایت کا سلسلہ رہا اسی سلسلہ میں قیس کی شادی کا بھی ذکر آیا قیس نے قسم کھاکر کہا کہ میں نے لبنیٰ فرازیہ کو آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا اور نہ حقیقتاً مجھے اس سے محبت تھی۔ اور اگر کچھ انس تھا بھی تو صرف ع

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسی داری

کی بنا پر۔ یہ خوشگوار صحبت اس وعدے پر ختم ہوئی کہ لبنیٰ پھر یہیں آکر ملے گی۔ لیکن نہیں معلوم کیوں پھر وہ نہیں آئی۔ ۔ قیس اپنی ناکامی و نامرادی کیساتھ مدینہ سے واپس آیا۔

اسی قسم کی اور بہت سی روائتیں مشہور ہیں لیکن اب ہم صرف ایک واقعہ بیان کریں گے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لبنیٰ شادی کے بعد بھی ویسی ہی وفا شعار و جاں نثار رہی جیسی کہ شادی کے قبل تھی۔

قیس عالم بےخودی اور از خود رفتگی میں اپنے واردات قلب، اپنے جذبات محزون اور اپنے پر درد خیالات ایک نغمۂ موزوں کی صورت میں عجیب والہانہ طرز پر ادا کرتا جو دل سے نکلتا اور دل ہی میں اتر جاتا۔ ایک دُکھے ہوئے دل کی صدا تھی، ایک ستم رسیدہ کی آہ دلدوز تھی اور ایک زخم خوردہ کی کراہ تھی جو دلوں کو بغیر شق کئے نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے اشعار ہر خاص و عام کی زبان پر تھے۔ قوال اور گویئے محفل رقص و سرود میں اس کے اشعار سے ماتم بپا کر دیتے، عورتیں اور لڑکیاں گھروں میں گاتیں اور دلوں کو تڑپا دیتیں۔ اس مجذوب محبت کی ٹر اس قدر مقبول ہوئی

کہ مدینہ کے ہر در و دیوار سے اسی کی صدائے پر درد نکلتی لبنیٰ کے شوہر کو فطری طور پر برا معلوم ہونا چاہیے تھا اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنی ناراضگی کا اظہار لبنیٰ سے بھی کیا لبنیٰ نے اس کا جواب نہایت صفائی اور جرأت سے دیا۔ اس نے کہا کہ میں نے تمہارے ساتھ شادی نہ مال و دولت کے لالچ میں اور نہ کسی دلچسپی اور انس کی بنا پر کی ہے بلکہ شادی کرنے سے میرا مقصد محض یہ تھا کہ مجھے خطرہ تھا کہ قیس اپنی دیوانگی میں میرے قبیلہ والوں سے پھر کوئی معارضہ نہ کرے جس کے بدلے اس کی جان زار ہلاک ہو جائے اس لئے کہ بادشاہ وقت نے اسکا خون مباح کر دیا تھا۔ اور پھر میں اس کے دیوانہ پن کی اداؤں سے بھی محروم ہو جاؤں۔ تمہیں اختیار ہے۔ تمہارا جس وقت دل چاہے تم مجھ سے کنارہ کش اور دست بردار ہو جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اب مجھے دنیا کی کسی چیز کی پروا نہیں ہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ اس گفتگو کے بعد اس کے شوہر کا برتاؤ لبنیٰ کے ساتھ بہت ہمدردانہ اور غمگسارانہ رہنے لگا۔ بسا اوقات وہ خود گانے والیوں کو بلوا کر لبنیٰ کے سامنے قیس کے اشعار سنتا۔ اسوقت تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قیس بن ذریح کا قصہ کیا باعتبار جدت اور کیا باعتبار پاکیزگی اور کیا باعتبار دلچسپی ہر حیثیت سے تمام قصوں سے ممتاز اور بلند ہے اس کی بنیاد مستحکم ہے اس لئے اس کا آغاز شاندار، اس کا طرز سادہ اور دور از کار باتوں سے پاک اس لئے اس کا سیاق دلنشین۔ اب رہا اس کا انجام اس کے متعلق دو قول ہیں بعضوں کا خیال ہے کہ قیس کا انجام بھی ناکامی و نامرادی پر ہوا جیسا کہ جمیل و مجنون کا مجنون نے صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کی حالت میں اپنی تمناؤں اور حسرتوں کا مدفن کسی وادی کو قرار دیا۔ اور جمیل مصر میں غربت اور مسافرت کی حالت میں شہیدان محبت کی صف میں داخل ہوا۔ اسی طرح قیس بھی راہ محبت میں خاک راہ ہو گیا لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ قیس کا انجام جمیل و مجنون کے انجام سے بالکل مختلف ہے وہ ناکام محبت نہیں کامران محبت ہے، وہ اپنے عشق صادق اور پاکیزہ محبت میں کامیاب رہا۔ اس کی زندگی محض حزن و ملال ہی نہیں۔ اس کی حیات محض غم و الم کا مجموعہ

ہی نہیں، اُس کا عشق محض ناپسندیدگیوں اور غم انگیزیوں ہی سے مملو نہیں۔ بلکہ اس کی مجموعی زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشق و محبت ناخوشگواریوں اور سختیوں بے لطفیوں اور مصیبتوں ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں مصیبت و تکلیف بھی ہے لطف و مسرت بھی۔ بے چینی و اضطراب بھی ہے سکون و راحت بھی۔

یہاں تک سب متفق ہیں کہ قیس لبنٰی سے ملکر جب مدینہ سے واپس آیا تو وہ شام اپنے خون کی معافی کے حکم کو منسوخ کرانے کی غرض سے گیا وہاں یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو وہ بڑی مہربانی سے پیش آیا، اس نے خلیفۂ وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس کی سفارش کر کے حکم کو منسوخ کرا دیا۔ اب قیس کو آزادی مل گئی کہ جہاں چاہے جائے اور جس جگہ چاہے رہے کوئی مزاحمت نہیں کرسکتا بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یزید قیس کے حال زار پر اسقدر مہربان ہوا کہ وہ چاہتا تھا کہ والی مدینہ کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ لبنٰی کے شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ کرے۔ لیکن قیس نے اس عنایت بے پایاں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ زیادہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتنی ہی عنایت کیا کم ہے۔ اور صرف تنسیخ کا حکم لیکر چلا آیا۔ اس جگہ پر متعدد روایتیں ہیں بعضوں کا خیال ہے کہ اس کی آئندہ زندگی مدینہ کی گلیوں کی خاک چھاننے اور لبنٰی کے فراق میں تڑپنے میں صرف ہوئی۔ وہ مدینہ آتا، لبنٰی کے مکان پر حسرت بھری نگاہیں ڈالتا، آہ و فغاں، نالہ و شیون کرتا، اور پھر واپس جاتا حتیٰ کہ دست اجل نے یا تو لبنٰی کی زندگی ہی میں قید حیات سے رہائی دلا دی یا لبنٰی کے انتقال کے بعد وہ اس صدمہ جانکاہ سے جانبر نہ ہو سکا۔

لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ جب قیس دربار خلافت سے تنسیخ کا حکم لے آیا تھا تو اس کا دوست ابو عتیق، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم اور شرفائے قریش کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ لوگوں سے میری

ایک گذارش ہو اگر کامیابی کی امید ہو تو اظہار کی جرأت کروں اجازت پانیکے بعد اس نے کہا کہ مجھے ایک شخص سے ایک امر کی استدعا کرنی ہے۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اگر میں نے بلا سفارش اس سے کہا تو وہ انکار کر دے گا اس لئے میں آپ کے وقار، و احترام اور آپ کی وجاہت و عظمت کو اپنی کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں۔ تمام حضرات نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر تمہارا کوئی کام ہمارے ذریعہ سے نکل سکتا ہے تو ہمیں کوئی عذر نہیں۔ اسی وقت ایک دن متعین کر دیا گیا۔ کہ اس روز سب لوگ ابو عتیق کے ہمراہ جاکر اس کی سفارش کر دیں۔ لیکن اب تک کسی کو یہ علم نہ تھا کہ کس معاملہ میں سفارش کے لئے یہ ہم لوگوں کو لئے جا رہا ہے۔ جب وعدہ وقت معینہ پر سب لوگ جمع ہو گئے۔ اور ابو عتیق کے ہمراہ مدینہ میں لبنیٰ کے شوہر کے یہاں پہونچے۔ وہ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ اس سے ان لوگوں نے ابو عتیق کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس شخص کا تم سے ایک کام ہے اور اسی غرض سے یہ ہم لوگوں کو تمہارے پاس لایا ہے۔ اس نے عرض کیا وہ کام سر آنکھوں پر اور اُسکا پورا ہونا یقینی جب ابو عتیق کو پورا اطمینان ہو گیا۔ تب اس نے لبنیٰ کے شوہر کی طرف مخاطب ہو کر کہا میرا اور کوئی کام نہیں، صرف ایک خواہش ہے وہ بھی اپنے لئے نہیں بلکہ ایک گرفتار محبت کے لئے۔ وہ یہ کہ تم لبنیٰ کو طلاق دے دو۔ اس نے فوراً بلا تامل طلاق دے دی لیکن اس واقعہ سے شرفاء قریش اور وہ تمام معزز حضرات جو اس معاملہ میں گئے تھے۔ بہت شرمندہ اور نادم ہوئے۔ وہ طلاق کے معاملہ میں پڑنا کبھی بھی گوارا نہ کر سکتے تھے

ابو عتیق کی سعی پیہم اور ایک مدت کے بعد بچھڑے ہوئے ایک دوسرے سے ملے۔ اور نہایت لطف و مسرت کے ساتھ پھر دولہا اور دولہن کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے قیس نے اس کے شکریہ میں ابو عتیق کی مدح

میں یہ اشعار کہے۔

جزی الرحمان افضل ما یجازی — علی الاحسان خیر من صدیق

فقد جربت اخوانی جمیعاً — فما الفیت کابن ابی عتیق

سعی فی جمع شملی بعد صدع — ورائی بعد حدت فیہ عن الطریق

واطفا لوعۃً کانت بقلبی — اغصتنی حرارتہا بریقی

اس تعریف کو سن کر ابو عتیق نے کہا اے دوست تعریف و توصیف رہنے دے ورنہ جو شخص سنے گا مجھے دلال کہے گا۔

مژدہ

یہ خیال کرتے ہوئے کہ ہمدردان جامعہ رسالہ جامعہ و پیام تعلیم کے خریدار بنانے میں پوری کوشش سے کام لیں گے، حسب ذیل انعامات مقرر کئے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ہر ایک شخص ان انعامات کے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

(۱) "جامعہ" کے دو خریدار یا پیام تعلیم کے پانچ خریدار بنانے کے لئے	"پردۂ غفلت" یا مطبوعات جامعہ میں سے اسی قیمت کی کوئی چیز
(۲) "جامعہ" کے چار خریدار یا پیام تعلیم کے دس خریدار بنانے والے کے لئے۔	"دیوان شیدا" " " " " " "
(۳) جامعہ کے پانچ خریدار یا پیام تعلیم کے بارہ خریدار بنانے والے کے لئے۔	"دیوان غالب" " " " " " "

اس سے زیادہ قیمت کے لحاظ سے ۲۵ فیصدی قیمت کی کتابیں مطبوعات جامعہ سے دیجائیں گی خاص صورتوں میں نقد کمیشن بھی دیا جاسکتا ہے۔

مینیجر رسالہ "جامعہ" و پیام تعلیم۔ قرول باغ۔ دہلی۔

سزائے موت

بادشاہ خود مختار مگر نرم دل تھا۔ انصاف اور عدل کے اصول مستحکم مگر سخت گیر نہ تھے۔ سخت سے سخت شاہی احکام میں رحم کی گنجائش اور لچک باقی رہتی تھی۔

اس ملک میں کبھی کسی نے سزائے موت کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نہ کبھی کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوا تھا، قانونی سزاؤں میں انتہائی سزا جلاوطنی کی تھی۔ وہ بھی کبھی شاذ و نادر، دس بیس برس میں کسی ایک مجرم کو، ایک دفعہ۔ لیکن اس انتہائی سزا میں بھی رعایت اور رحم کی لچک باقی رہتی تھی۔

فرض کیجیے کہ بادشاہ نے زید کو ملک بدر کر دیا۔ زید وطن سے دور کیونکر رہ سکتا تھا، وہ کچھ روز وطن کی سرحد کے پاس آوارہ گردی کرتا رہا، پھر کچھ روز بعد کبھی کبھی سرحد کے اندر بھی آنے لگا۔ دو چار روز سلطنت کی حدود کے اندر پھرا چلا اور پھر واپس ہو گیا، پولیس کا بھی کچھ خوف تھا، چوکیداروں کا بھی کچھ اندیشہ تھا۔ (فوج اس ملک میں نام کو نہ تھی، ضرورت ہی کیا تھی، چوکیدار اور پولیس کے سپاہی قانون کے محافظ تھے اور بس!) کچھ روز آوارہ گردی کے بعد زید کو کسی نے نہ ٹوکا تو وہ دارالسلطنت کے اندر بھی آنے جانے لگا۔ کبھی کسی قہوہ خانہ میں جا بیٹھتا، کبھی باغ عامہ میں چہل قدمی کرتا، کون جانے کون ہو، مگر ایک دن باغ عامہ کے دروازہ پر پولیس کے افسر نے پہچان لیا۔ راستہ روک کر اس نے کہا:-

"جناب من! آپ تو شاید ملک بدر کئے جا چکے ہیں؟"

"جی ہاں! مگر میں صبح ہی تو آیا تھا اور شام کو ضرور چلا جاؤں گا۔"

"ہاں! یہ صورت ہے؟ یہ صورت ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔"

عمر بھر زید یوں ہی پولیس والوں سے صبح کا آنا اور شام کا جانا بیان کرتا رہا، جلاوطنی کا حکم بھی اس کے خلاف قائم اور حکم شاہی کا احترام بھی برقرار رہا مگر زید کی آزادی میں بھی کوئی تخفیف

نہ ہوسکی!

مگر ایک دفعہ بادشاہ کے ملک میں ایک سخت حادثہ پیش آیا، ایک بہت ہی سخت حادثہ جیسا کبھی پہلے پیش نہ آیا تھا، یعنی بادشاہ کی رعایا میں سے ایک نے، اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ ایسا واقعہ اس ملک کے باشندوں نے کبھی پہلے نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا، عدالت میں ہزارہا اشخاص کا مجمع تھا، ملزم کے خلاف عام طور پر نفرت کا اظہار کیا جا رہا تھا، عدالت کے جج صاحبان سخت غصے اور رنج کی حالت میں مقدمہ کی سماعت کے لئے اپنی کرسیوں پر آکر بیٹھے۔ بادشاہ بھی اس حادثے کی وجہ سے بہت مغموم تھا ججوں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ خون کا بدلہ خون ہونا چاہیئے، نہ ایسا جرم کبھی کسی نے پہلے سنا تھا نہ ایسی سزا! لوگ حیران بھی تھے، ناراض بھی تھے، مغموم بھی تھے!

پولیس نے ملزم کو اپنی حراست میں لے لیا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کو قتل کس طرح کیا جائے۔ سلطنت کے طول و عرض میں نہ کوئی جلاد تھا نہ کسی کو پھانسی دینا آتی تھی۔ بہت سے طویل مشوروں کے بعد وزرائے شاہی نے ہمسایہ سلطنت کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ پھانسی دینے کا سامان اور ایک پھانسی دینے والا بھیج دیا جائے، بہت سی خط و کتابت کے بعد ہمسایہ سلطنت نے آمادگی ظاہر تو کی مگر اس شرط پر کہ اس خدمت کے معاوضہ میں ایک ہزار سکے دے جائیں۔ جب اس کا یہ جواب وصول ہوا تو بادشاہ اور اس کے وزراء کو عرصہ تک اس سوال پر غور کرنا پڑا، لیکن کسی طرح معاوضہ دے کر مجرم کو قتل کرانے پر آمادہ نہ ہوسکے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک انسان کی جان جسم سے نکالنے کے لئے ایک ہزار سکوں کو خرچ کر دینا محض حماقت ہے۔ آخر کار ہمسایہ سلطنت سے امداد لینے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اور مجرم ۶ ماہ بعد بھی پولیس کی نگرانی میں آزاد اور زندہ تھا!

پھر ایک دفعہ مجلس وزراء نے اس مسئلہ پر غور کیا، اور پھر ایک دفعہ کسی دوسری سلطنت کو لکھا گیا کہ وہ پھانسی دینے کا سامان بھیج دے۔ وہاں سے بھی ہزار تو نہیں مگر سو سکوں کا حساب بن کر

آیا، بادشاہ کی کابینہ نے پھر راتوں اور دنوں اس گتھی کو سلجھانے کے لئے اپنے دماغوں پر زور ڈالا۔ آخر کار وہی فیصلہ ہوا جو پہلے ہو چکا تھا، "سو روپیہ، محض ایک مجرم کا گلا دبا کر اس کی جان نکالنے کے لئے، کیا حماقت ہے، نہیں ہو سکتا!"، بادشاہ نے فرمایا، "یہ تو نہیں ہو سکتا"، اور وزرا نے بھی یک زبان ہو کر کہا، "یہ تو نہیں ہو سکتا"، جب شہر میں کابینہ کے اس فیصلہ کی خبر پہنچی تو وہاں بھی ہر چھوٹے بڑے نے یہی کہا کہ "یہ تو نہیں ہو سکتا"!

پھر کیا ہوا؟ کم و بیش ایک سال تک مجلس وزرا کے جلسوں میں اس سوال پر بحث ہوتی رہی!

اور مجرم ہنوز زندہ رہنے پر مجبور تھا!

دو سال گزر گئے، بادشاہ اور وزرا کا ناخن عقل اس گرہ کو نہ کھول سکا، بالآخر حکم ہوا کہ پولیس کا ایک سپاہی تلوار سے مجرم کی گردن کاٹ دے، بڑی بات یہ تھی کہ اس صورت میں سلطنت بہت سے ناواجب اخراجات سے بچ جائے گی، چنانچہ پولیس کے افسر کو حکم دیا گیا کہ ایک سپاہی کو اس غیر معمولی کام کے لئے نامزد کر دے۔ مگر افسر نے عذر کیا اور اس کے سپاہیوں کو اس طرح تلوار استعمال کرنے کی بالکل عادت نہیں، افسر کا جواب ناقابل جواب تھا!

مگر اب کیا کیا جائے؟ ہفتوں مجلس وزرا کے جلسے صبح شام ہوتے رہے مگر اس سوال کا جواب میسر نہ آتا تھا! اور مجرم ہنوز نہ زندگی کی امیدوں سے دور نہ موت سے قریب تھا!

ایک دن اُن وزرا میں سے ایک نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "کیوں نہ ہم سزائے موت کو حبس دوام سے بدل دیں"، تمام اراکین مجلس اس تجویز کی معقولیت کے معترف ہوئے اور بادشاہ نے بھی اس کو مناسب اور بہتر تجویز سمجھ کر منظوری دے دی۔ مگر یہ تجویز بھی دشواریوں سے خالی نہ تھی۔

مجرم حبس دوام کی سزا کو پسند بھی کرے گا یا نہیں؟

جیل خانہ کہاں ہے جس میں وہ عمر بھر رکھا جائے؟

اور جیلر کا کیا انتظام ہوگا؟

اور مجرم کو زندہ رکھنے کے لئے خورد و نوش کا خرچ کون برداشت کرے گا؟

سلطنت کو آج تک جیلخانے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ لہٰذا سرکاری جیلخانہ موجود نہ تھا، نہ جیلر تھا، پھر ہفتوں مشورے ہوئے اور بالآخر ایک مکان کرایہ پر لے کر جیل خانہ بنایا گیا، ایک شخص کو نوکر رکھا گیا کہ وہ جیلر بن کر قیدی کی حفاظت کیا کرے۔ شاہی باورچی خانے سے قیدی کے کھانے کا انتظام منظور ہوا، کہہ سن کر قیدی کو بھی راضی کر لیا گیا کہ وہ اپنی سزا کی نوعیت بدل جانے پر نارضامندی کا اظہار نہ کرے، دو تین سال کی کشمکش کے بعد اب قیدی اپنے جیل خانے میں آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے!

چھ مہینے تک یہ دستور رہا کہ قیدی اپنے گھاس کے بستر پر لیٹا رہتا تھا جیلر صبح آتا تھا اور دروازے پر ایک کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ شام تک یا تو قیدی سے باتیں کرتا رہتا تھا، یا شطرنج کھیلتا رہتا تھا، دونوں وقت شاہی باورچی خانے کا ایک غلام قیدی اور جیلر کا کھانا پہنچا دیا کرتا تھا۔ شام کو جیلر مکان کا دروازہ باہر سے بند کر کے اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اب حکام اعلیٰ کو اس قیدی کے متعلق کوئی تردد باقی نہ رہا ہوگا، مگر بادشاہ خود ابھی تک متردد تھا، وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ملک کے بجٹ پر اس مستقل خرچ کا بار کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے، قیدی ابھی نوجوان ہے، سالہا سال زندہ رہے گا، پھر یہ مکان کا کرایہ، جیلر کی تنخواہ، قیدی کا کھانا، یہ تو گویا ساری عمر کا خرچ پیچھے لگ گیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ بادشاہ کا تردد کچھ بیجا نہ تھا۔ چنانچہ پھر ایک دن مجلس وزرا نے بادشاہ کے اس سوال پر غور کرنا شروع کیا، ہفتوں کے بعد شاہی کونسل بالآخر اس فیصلہ پر پہنچی کہ اگر قیدی اپنی حفاظت خود کرنے پر آمادہ کیا جا سکے تو جیلر کو برخاست کر دیا جائے، اس کی تنخواہ کے بقدر اخراجات میں تخفیف ہو جائے گی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ قیدی کوئی ضدی آدمی نہ تھا، اس نے اپنی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی اور اب وہ تنہا اپنے جیلخانے میں صبح سے شام تک زندگی بسر کرتا تھا۔ البتہ دو دفعہ جب شاہی باورچی اس کا کھانا لے کر آتا تھا تو ایک دو گھنٹے شطرنج کی کوئی بازی قیدی کے ساتھ کھیل جاتا تھا۔ کچھ عرصے تک قیدی کی زندگی کا یہ راستہ بالکل ہموار رہا، لیکن ایک دن شاہی باورچی بھول گیا، یا مصروف زیادہ تھا، یا بیمار ہو گیا، غرض یہ کہ قیدی کا کھانا وقت پر نہ آ سکا

بھوک نے شاہی قوانین کی پابندی سے انکار کر دیا۔ اور قیدی خود ہی قید خانے سے نکل کر شاہی باورچی خانے تک پہنچ گیا، جب ایک دفعہ قیدی اپنا کھانا لینے خود جا سکتا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہر دفعہ وہی نہ جایا کرے۔ مجلس وزرا نے بھی مزید کفایت کے اس پہلو کو پسند کیا اور اب یہ دستور ہو گیا کہ قیدی دونوں وقت خود ہی اپنا کھانا لے آتا تھا اور رات کو قید خانے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہتا تھا۔ کھانا لانے اور شاہی باورچی خانے تک جانے آنے کے سلسلہ میں کبھی باغ عامہ میں دو چار گھنٹے سیر و تفریح، یا کبھی کسی قہوہ خانے میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ کا وقفہ ایک ایسی معمولی بات تھی جس کے متعلق قیدی سے نہ کبھی باز پرس ہوئی نہ ہو سکتی۔ وہ خود ہی اتنا ایماندار اور قانون سلطنت کا پابند تھا کہ دن بھر باہر رہنے کے بعد بھی شب کو کبھی اپنے جیل خانے سے غیر حاضر نہ ہوتا اس طرح کئی سال گزر گئے، قیدی اپنی سزا بھگت رہا تھا اور حکومت کا ضمیر بھی مطمئن تھا کہ خطاوار کو کافی سزا دے کر قانون کی عزت برقرار رکھی گئی!

لیکن بادشاہ ہر سال اپنے بجٹ میں جیل خانے کے اخراجات کی مد کو دیکھ کر بہت فکرمند ہوتے تھے، ان کی رائے میں جیل خانہ کا کرایہ اور قیدی کی خوراک کا خرچ ملک کے بجٹ پر ایک بیجا بار تھا، رفتہ رفتہ ایک دن پھر اخراجات کا یہ سوال مجلس وزرا کے سامنے آ گیا۔ کسی نے یہ تجویز پیش کی قیدی کی سزا کو حبس دوام کے بجائے جلاوطنی کر دیا جائے اور اس طرح جیل خانے کے اخراجات سے ملک کو بچانا چاہئے۔ تجویز معقول تھی، اُس پر مجلس متفق ہو گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ قیدی بھی سزا کی اس ترمیم پر راضی کیا جا سکیگا؟ مجلس کے روبرو قیدی حاضر کیا گیا اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی، پہلی دفعہ، اپنی طویل مدت قید میں جب وہ تمام احکام کو اطاعت اور بندگی کے ساتھ قبول کرتا رہا تھا، پہلی دفعہ قیدی نے وزرا کی اس تجویز پر سخت اعتراض کیا اس نے کہا:-

”جناب آپ نے قتل کا حکم دیا، میں نے عذر نہ کیا، آپ نے حبس دوام کا حکم دیا میں اس پر بھی رضامند ہو گیا، آپ نے میرے جیلر کو موقوف کر دیا میں نے شکایت نہیں کی، آپ نے میری حفاظت کا فرض مجھ ہی پر عاید کر دیا۔ میں نے اسکو بھی

گوارا کر لیا پھر آپ نے مجھی کو مجبور کیا کہ باورچی خانے سے اپنا کھانا لایا کروں، یہ بھی میں نے آپ کی خاطر منظور کیا۔ اب آپ مجھے ملک سے نکالتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کھاؤں گا کیا؟ میری وجہ معاش کیا ہوگی، میں آپ کا قیدی ہوں، آپ نے مجھے قید کیا، اور میں نے آپ کے تمام احکام کی تعمیل کی، لہٰذا اب میری پرورش آپ کے ذمے نہیں تو کس کے ذمے ہے؟"

قیدی نے جس قدر عذر پیش کئے سب معقول تھے! شاہی کونسل لاجواب ہوگئی، جلسہ برخاست ہو گیا اور شاہی محل کے بڑے کمرے میں پھر عرصے تک اس سوال پر مشورے ہوتے رہے کہ جو کچھ کیا ہو، کریں تو کیا کریں، قیدی جلاوطنی پر رضامند نہیں ہوتا، قتل کیا نہیں جا سکتا، حبس دوام کے اخراجات بہت ہیں، پھر کیا سمجھوتا کیا جائے؟ اس وقت تک قیدی کے اخراجات کا اوسط ایک ہزار روپیہ سال کے قریب تھا۔ اگر یہ رقم نہیں بچائی جا سکتی تو نصف ہی بچالی جائے۔ اس طرح کہ قیدی کو اس بات پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ پانچسو روپیہ سال لے لیا کرے اور اس ملک سے چلا جائے جب اس تجویز میں بادشاہ اور اس کے وزرا متفق ہو گئے تو پھر قیدی کونسل کے سامنے طلب کیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ

"تم کو پانسو روپیہ سال پنشن ملے گی بشرطیکہ تم اس ملک سے چلے جاؤ"

گو کہ قیدی اس تجویز کو انصاف اور قانون کے خلاف سمجھتا تھا لیکن لوگوں کے سمجھانے سے وہ بالآخر اس پر راضی ہو گیا چنانچہ وہ اب سرحد کے قریب ایک چھوٹے سے باغ میں رہتا ہے، ہر تیسرے مہینے بادشاہ کا ہرکارہ اس کی پنشن اس کو دے جاتا ہے، اس طرح اس کے حبس دوام کی طویل مدت گزر رہی ہے!

جو تکلیفیں اور پریشانیاں اس قیدی کے متعلق وزرائے سلطنت کو ہوئیں اس کا لحاظ کر کے ملک کے قانون میں اب اس قدر ترمیم کر دی گئی ہے کہ آئندہ مجرموں کو سزا کے بعد جیلخانے میں رکھنے کے بجائے پنشن دے کر ملک بدر کر دیا جاتا ہے اور وہ ہمسایہ ممالک میں سرکاری پنشن پر اپنی سزا کا زمانہ بسر کر لیتے ہیں!

زخم آخری کی آرزو

ایک نگاہ لطف تیرے کماں میرے لئے　　ایک ادائے ناز زخم بے نشاں میرے لئے
زخم دل میرے لئے داغ نہاں میرے لئے　　تھے دیارِ عشق میں کیا کیا نشاں میرے لئے

آج میری ہستی ہنگامہ زا خاموش ہے
آرزوئے مردہ کا تابوت بار دوش ہے

اس بساط عشق پر ہاری ہوئی بازی ہوں میں　　اور فریب حسن کا ایک قصہ ماضی ہوں میں
فیض داغ عشق کا ممنون فیاضی ہوں میں　　مرگ امید وفا پر ہر طرح راضی ہوں میں

دیدۂ بے نور محروم تماشا چاہیئے
اے دل بے مدعا آخر تجھے کیا چاہیئے!

ہے حیات دنیوی ایک عہد مجبوری کا نام　　دار و گیر زندگی ہے ایک معذوری کا نام
کیف وصل یار ہے فی الواقعہ دوری کا نام　　عیش رکھا انہاںئے دردِ مہجوری کا نام!

دیکھنا تو زندگی کی یہ غلط اندیشیاں
اور ناکام فریب عشق کی دل ریشیاں!

جستجوئے علت اجزائے فانی کس لئے　　سوزش جہد بقائے زندگانی کس لئے
ہستیٔ بے ربط عالم کی کہانی کس لئے　　نقطۂ موہوم پر جادو بیانی کس لئے

مدعائے ہستی باطل رہے گا بے نشاں
فہم خود بیں کی اگر اڑتی رہیں گی دھجیاں

قطرۂ شبنم ہے تصویر طلسم روزگار　　برگ گل پر ایک ساعت بھی نہیں ممکن قرار
ہر نفس لاتا ہے یک صبح خزاں شام بہار　　موج بوئے گل کا کیا آغاز کیا انجام کار

ہے چمن کی آبرو ممنونِ یک موجِ نسیم
بلبلِ رنگیں ہے کیوں پابندِ صد امید و بیم؟

''ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے''(۱) اور خود تقدیر بھی اک خواب بے تعبیر ہے
اس کتابِ زندگی کی زخمِ دل تفسیر ہے ہر نفس نکلا ہوا گویا کماں سے تیر ہے

جب یہ عالم ہے تو پھر ہنگامۂ ہستی ہے کیا
امتیازِ باطل ہشیاری و مستی ہے کیا؟

زندگی کے چہرۂ اصلی پہ ہے ہلکا نقاب پردۂ غفلت میں ہے پوشیدہ پیری و شباب
اصل کارِ زندگی ہے جلوۂ نقشِ سراب ایک ہی ہے خندۂ مسرور اور چشمِ پر آب

اس فریبِ زندگی پر کیوں مٹے جاتے ہیں ہم
عقلِ بے بنیاد کے بوتے پہ اتراتے ہیں ہم!

ہمنوا تیری نظر مصروفِ سیرِ آب ہے محوِ رقصِ موج ہے اور کس قدر بیتاب ہے
تو نہ سمجھے گا کہ یاں ہر قطرہ اک گرداب ہے جنسِ عشرت اس تماشاگاہ میں نایاب ہے

کشتیٔ پارینۂ لرزاں قلزمِ ہستی پہ ہے
موجِ چشم آگیں آمادہ زبردستی پہ ہے

دل کہ ہے سوزِ جراحت کا مزا پائے ہوئے ہر قدم پر عمر کے اک زخمِ نو کھائے ہوئے
جستجوئے عیشِ بے معنی سے پچھتائے ہوئے بھول کر سب زندگی کے خواب دکھلائے ہوئے

شیوۂ ناز و نیازِ عشق و شانِ دلبری
مانگتا ہے سب کے بدلے ایک زخمِ آخری!

---

(۱) ''اقبال''

غزل

از جناب دل شاہجہاں پوری

حسنِ ازل ہے جلوہ گر آئینۂ مجاز میں
عشق نے روح پھونکدی جذبۂ امتیاز میں

عشق جنوں نواز نے پردۂ سوز و ساز میں
درد و غضب کا بھر دیا نالۂ دل گداز میں

دل کا نشان اب کہاں بزم نیاز و ناز میں
عشق تو جذب ہو گیا حسنِ کرشمہ ساز میں

اہل نظر سے تھا نہاں شاہدِ خلوت آشنا
پردہ اُٹھا کے آگیا انجمنِ مجاز میں

بیٹھے تو گرد کی طرح اُٹھے تو درد کی طرح
عمر یوں ہی گذار دی دشتِ جنوں نواز میں

کج نگہی کی ہر ادا۔ آہ عذابِ جاں ہوئی
فتنۂ حشر تھا نہاں چشمِ فسوں طراز میں

چشمِ وفا نواز سے شانِ نیاز دیکھئے
پست ہے رعبِ غزنوی بارگہِ ایاز میں

عشقِ رسولِ پاک سے ہو یہ اثر پذیر دل
نالہ کریں جو ہند میں گونج اٹھے حجاز میں

بندۂ عشق تا کجا دید کی آرزو کرے
اس نے تو منہ چھپا لیا پردۂ کبر و ناز میں

حاصل انتہائے غم پوچھئے اس غریب سے
عرصۂ حشر ہے نہاں جسکی شبِ دراز میں

جوشِ فنا عطا کیا نقشِ دوئی مٹا دیا
شمع جمالِ یار نے خلوتِ سوز و ساز میں

سنگِ درِ حبیب کو حسن نہ ہی قبول کی
فرق نہ آئے اے جبین حوصلۂ نیاز میں

عشقِ وفا پرست کی شان یہی جنابِ دل
ہستیِ دل مٹایئے رہ گذرِ نیاز میں

تنقید و تبصرہ

رسائل :-

سعید - تربیت - ندیم

سعید | ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی کا نام نامی دنیائے ادب میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے دل بھی پایا ہے اور دماغ بھی۔ قلم بھی پایا ہے اور خیال بھی۔ مدت سے اخبار نویسی کرتے ہیں، ہمدرد کے اڈیٹوریل اسٹاف میں رہ چکے ہیں اور رسالہ کامیابی کو ایک مدت تک چلاتے رہے ہیں۔ اب انھوں نے اپنا یہ ذاتی رسالہ نکالا ہے۔ جس کا حجم کراؤن سائز پر چار جزو ماہانہ ہے اور جو نہ صرف مفید اور لطیف مضامین بلکہ تصاویر سے بھی مزین ہے۔ قیمت سالانہ سے، اور مقام اشاعت کوچہ چیلان دہلی ہے۔

تربیت | یہ رسالہ مہینے میں دو بار مقام قلعہ۔ بہار شریف ضلع پٹنہ سے مولوی مسعود عالم صاحب کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ بہار جیسے مقام سے اُردو کے لئے جو کوشش ہو وہ قابل احترام ہے یہ رسالہ ابھی نیا نیا عالم وجود میں آیا ہے اس لئے اس کی چھپائی لکھائی اور ترتیب میں جو خامیاں ہیں ان کو ہم نظر انداز کرتے ہیں اور اس کے مدیر کو مشورہ دیتے ہیں کہ کاغذ اور چھپائی کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھیں ورنہ رسالہ کبھی مقبول عام نہ ہو سکے گا۔

رسالہ کا حجم ۴۴ صفحے ہے۔ اور قیمت سالانہ ہے

ندیم | یہ ماہانہ رسالہ گیا سے مولانا انجم اور عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی کی ادارت میں کراؤن سائز پر ساڑھے ۲ جزو کا مصور نکلنا شروع ہوا ہے۔ زیر تنقید رسالہ تیسرا نمبر اگست ۱۹۳۱ء کا ہے۔

مضامین عمدہ ہیں۔ زبان شستہ ہو اور چھپائی لکھائی اچھی ہے۔ ہم کو توقع ہوتی ہے کہ یہ رسالہ صوبہ بہار میں اُردو زبان کی اچھی خدمت کرے گا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اس کو چلانے والوں کو استقلال نصیب ہو تاکہ اس کو برابر ترقی دیتے ہوئے چلے جائیں۔

اس کی سالانہ قیمت للعہ ہے اور ملنے کا پتہ دفتر ندیم محلہ پنچایتی اکھاڑہ۔ شہر گیا۔

کتب :-

مرزاجی۔

مرزاجی | از ایم اسلم صاحب، تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۳۱۲ صفحے کتابت معمولی، کاغذ نفیس، طباعت عمدہ، قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ نسیم بک ڈپو، بازار بارود خانہ، لاہور

مصنف کے ظریفانہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس پر پروفیسر تاثیر صاحب نے ایک مختصر اور پرمغز دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے "گذارشات" کے نام سے اپنی ادبی زندگی کی مختصر تاریخ اور ہر مضمون کی شان نزول لکھی ہے، جس کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ اصل کتاب میں اکیس مضامین ہیں اور ایک تمہ جو بقول مصنف کے دو خالی صفحے بھرنے کے لئے لکھا گیا۔ تیرہ مضامین میں "مرزاجی" کو تختۂ مشق بناکر مختلف قسم کے مضحک کیرکٹروں کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ اور آٹھ مضامین متفرق موضوعوں پر ہیں۔

زبان کے متعلق مصنف نے خود عذر کیا ہے اس لئے ہمیں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ مضامین کی عبارت کو جو مجموعی حیثیت سے سلیس و دلنشیں اور شوخ ہے بھونڈی غلطیوں نے داغ دار کردیا ہے۔ یہ عیب تھوڑی سی توجہ سے دور ہوسکتا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ مصنف آئندہ ایڈیشن میں اس کا خیال رکھیں گے۔

کتاب کے چار مضمون "مرزاجی بندوقچی"، "مرزا نجریا"، "دعوتی رقعہ" اور "مرزاجی"

ستھری ظرافت کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ انھیں پڑھ کر جسے ہنسی نہ آئے اور لطف نہ آئے اسے "مرزاجی" سے کم نہ سمجھنا چاہئے، خصوصاً "مرزاجی بندوقچی" بڑے مزے کی چیز ہے۔ بقیہ مضامین عجلت میں سرسری طور پر لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جن میں بعض اچھی پھبتیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر ان میں ادبی ظرافت اور طنز کے اس قانون کی صریحی خلاف ورزی ہے کہ لکھنے والے کو ذاتی بغض و عداوت اور مذہبی اور سیاسی تعصب کے اظہار سے بچنا چاہئے یا کم سے کم ان جذبات کو لطف بیان اور شوخی گفتار کا پابند رکھنا چاہئے۔ جلی کٹی باتوں میں کوئی ظرافت نہیں ہوتی۔ زہرخند پر کسی کو ہنسی نہیں آتی۔ افسوس کی بات ہے کہ مصنف نے اکثر مقامات پر اس بارے میں ذاتی عناد اور عوام کے تعصبات کی رعائت مدنظر رکھی ہے اور ادبی مقصد کو فراموش کر دیا ہے۔

بہرحال ان چار مضامین کی وجہ سے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور بہت سے گرما گرم اور چبھتے فقروں کی خاطر ہر ظرافت پسند شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شذرات

ہمارے رسالے کے قلمی معاون اور جامعہ کے استاد تاریخ سید نذیر نیازی صاحب بی اے کو پچھلے مہینے حکم قضا سے اپنے عزیز بھائی شبیر احمد کی جواں مرگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم جامعہ کا ہونہار طالب علم تھا اور برادران جامعہ میں ہر دلعزیز تھا۔ خداوند تعالیٰ اسے غریق رحمت فرمائے اور نیازی صاحب انکے والد ماجد اور والدہ ماجدہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اس نمبر میں ہم ایک مضمون منکرین حدیث کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق چند باتیں قابل گذارش ہیں۔

چونکہ فاضل مقالہ نگار رسالہ جامعہ کی ادارت کے رکن ہیں اس لئے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ان کے مضامین میں اہل جامعہ کے خیالات کی نمائندگی کی جاتی ہے ہم چاہتے ہیں کہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ موصوف جو مضمون لکھتے ہیں ذاتی حیثیت سے لکھتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ان کے خیالات سے جامعہ کے لوگوں کو اختلاف بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً حدیث کے متعلق انھوں نے جو مضامین دو اشاعتوں میں لکھے ان میں بعض واقعات اور اکثر نتائج جہاں تک ہمیں علم ہے یہاں کوئی بھی قابل تسلیم نہیں سمجھتا۔ چنانچہ فاضل مقالہ نگار کے پچھلے مضمون کی تردید میں جامعہ کے ایک مستعد طالب علم نے مضمون لکھا تھا اور اس مرتبہ پھر لکھیں گے۔ ایک اور بزرگ نے بھی حدیث کی اہمیت پر ایک مدلل مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور جو حضرات اس موضوع پر خامہ فرسائی فرمائیں گے ان کے رشحات قلم کو ہم شکریے کے ساتھ رسالے میں درج کریں گے بہ شرطیکہ ان میں ذاتیات کا رنگ مطلق نہ ہو اور علمی بحث کے آداب کا خیال رکھا جائے۔

ہمارے رسالے کا یہ اصول ہے اور رہے گا کہ ہر سنجیدہ مضمون خواہ اس کے خیالات سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو رسالے میں درج کیا جائے اور اگر ضرورت ہو تو اس کی تردید بھی شائع کی جائے۔ علوم کی ترقی کے لئے بھی اور مذہبی عقائد کی پختگی کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ جو شبہات دلوں میں رہتے ہیں وہ زبان پر آئیں اور مدلل جوابوں کے ذریعے سے رد کئے جائیں۔ تعلیم کا ایک لازمی جزو یہ ہے کہ طالب علم کو مخالف رائے سننے کی اور اس کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑے۔ جامعہ کے جوان اور بوڑھے اور رسالہ جامعہ کے قارئین سب کے سب خدا کے فضل سے سچے طالب علم ہیں یا ہونا چاہتے ہیں اور اتنا سواد اور اتنی تمیز رکھتے ہیں کہ مختلف اقوال اور دلائل میں سے قول صحیح اور دلیل محکم کو پہچان لیں، اس لئے وہ اختلاف رائے کو صبر سے برداشت کرتے ہیں۔ اگر اس کا اظہار نیک نیتی اور تہذیب کے ساتھ کیا جائے۔ انھیں کے مذاق کا اتباع رسالہ جامعہ میں کیا جاتا ہے۔

کئی سال سے جامعہ میں مالی مشکلات اور دوسری پریشانیوں کی وجہ سے یوم تاسیس نہیں منایا جا سکا۔ اس سال جناب شیخ الجامعہ صاحب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس رسم کو پھر تازہ کرنا چاہئے تاکہ اہل جامعہ کے دل میں جامعہ کے بانیوں کی یاد قائم رہے اور انھیں سال میں ایک دن اپنے کاموں کے احتساب اور اپنے مقاصد کی تنقید کا موقع ملے۔ چنانچہ ۲۹ اکتوبر کو یوم تاسیس کا جلسہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک اصلاحی تمثیل اور جدید طرز کے مشاعرے کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے جس میں کوئی طرح نہیں ہوگی اور شعر پڑھنے کی عام اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ صرف ہندوستان کے چند باکمال شعرا اپنا منتخب کلام سنائیں گے۔ اس طرح کا مشاعرہ ۱۹۲۶ء میں ہمارے یہاں نہایت کامیابی سے ہو چکا ہے۔ امید ہے کہ اس بار اس سے بھی زیادہ کامیاب ہوگا۔ مفصل پیش نامہ ۳۰ اکتوبر کے بعد اخباروں میں شائع ہو جائے گا۔ امید ہے کہ جامعہ کے قدیم طلبہ اور اس کے دوسرے ہمدرد جو آسانی سے دہلی تشریف لا سکتے ہیں شرکت کر کے اہل جامعہ کو زیر بار احسان فرمائیں گے۔

جو حضرات ہمارے رسالے کو اپنے مضامین بغرض اشاعت عنایت فرماتے ہیں اُن سے درخواست ہے کہ مضمون کا مسودہ صاف خط میں ایک سطر چھوڑ کر لکھا کریں اور اُسے بہت غور سے پڑھ لیا کریں تاکہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ خصوصاً اشخاص اور مقامات کے ناموں اور سنین و اعداد کے لکھنے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس سے مدیر اور کاتب کے کام میں بہت سہولت ہو جائے گی۔ اور مضامین پوری صحت کے ساتھ چھپ سکیں گے۔

ہم کئی سال سے اس کی پابندی کر رہے ہیں کہ ہر نمبر میں ایک افسانہ ضرور چھپے۔ معقول افسانوں کے فراہم کرنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان سے رسالوں کے مدیر اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم ان کا جو معیار اپنے رسالے کے لئے قائم کیا ہے اس کی وجہ سے ان دقتوں میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ پچھلے دو مہینے کے پرچوں میں ہم کوئی افسانہ شائع نہیں کر سکے۔ ہمارے ملک کے ادیبوں کو ابھی اس صنف سے ذوق نہیں ہوا ہے۔ ہمارے رسالوں میں عموماً یورپی زبانوں کے افسانوں کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ جامعہ میں بھی سوائے پروفیسر محمد مجیب صاحب اور حیات اللہ صاحب انصاری کے طبعزاد افسانوں کے، عموماً ترجمے ہی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہم ادبی چیزوں کے ترجموں کی قدر و قیمت کے منکر نہیں مگر ہماری زبان و ادب کی ترقی کے لئے اور ہماری معاشرتی اور تمدنی اصلاح کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کی زندگی کے متعلق طبعزاد افسانے بھی لکھے جائیں، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی زبان کے ادیبوں کو اس طرف توجہ دلانے کے لئے کبھی کبھی انھیں عمدہ افسانوں کے انعامی مقابلے میں شرکت کی دعوت دیا کریں۔ چنانچہ ہم اس قسم کا پہلا مقابلہ امتحاناً نومبر میں رکھتے ہیں اور عام اطلاع کی غرض سے ذیل کا اعلان درج کرتے ہیں، اُردو کے اخبارات و رسائل سے درخواست ہے کہ کم سے کم ایک بار اس کی نقل شائع کر دیں۔

رسالہ جامعہ کی طرف سے افسانہ نویسی کا ایک مقابلہ مقرر کیا گیا ہے جس کی شرائط حسب ذیل

ہیں :-

۱- افسانہ طبعزاد ہو اور ہندوستان کی زندگی کے متعلق خواہ تاریخی ہو خواہ خیالی۔

۲- اس کا مضمون کم سے کم رسالہ جامعہ کے ۸ صفحے کے برابر ہو اور زیادہ سے زیادہ ۱۶ صفحے کے برابر۔

۳- عبارت سلیس اور شگفتہ ہو اور خیالات مذہبی اور سیاسی تعصبات سے پاک ہوں۔

۴- ۳۰ر نومبر ۱۹۳۱ء تک دفتر رسالہ جامعہ میں پہنچ جائے۔

۵- ایک کمیٹی جو حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہوگی انعامی افسانے کا انتخاب کرے گی۔

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ

(۲) پروفیسر محمد مجیب صاحب

(۳) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

۶- جن صاحب کا افسانہ بہترین سمجھا جائے گا۔ ان کی خدمت میں ۲۵ عـ نقد یا اگر وہ پسند کریں گے تو اس قیمت کی کتابیں پیش کی جائیں گی۔

۷- انعامی افسانہ اور بقیہ افسانوں میں سے جو مدیر رسالہ جامعہ کے نزدیک قابل اشاعت ہوں گے وہ مختلف اوقات میں رسالہ جامعہ میں شائع کئے جائیں گے۔ جن افسانوں کی اشاعت منظور نہ ہوگی وہ لکھنے والوں کو واپس کر دئے جائیں گے۔

دوران جنگ میں ابن معاویہ کے یمنی لشکر کا اضطراب اور ابن معاویہ سے بدگمانی اس سلسلہ کا ایک اہم واقعہ

غرض دونوں طرف کی فوجیں باقاعدہ تھیں جنگ ہوئی تو خوب لڑیں۔ ابن معاویہ کی فوج نے جب جنگ کی حالت نازک دیکھی تو اہل یمن گھبرا سے گئے اور ابن معاویہ کی طرف دیکھنے لگے جو اس وقت گھوڑے پر سوار تھے اور آپس میں کہنے لگے "یہ تو ایک کمسن لڑکا ہے اگر اس گھوڑے پر سے گر جائے تو ہم کیا کریں گے آخر کار ہلاک ہوں گے۔" ابن معاویہ کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ انھوں نے بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے ایسا کہا ہے، ان لوگوں نے اقبال کیا۔ اس پر ابن معاویہ نے ابوالصباح کو بلا کر کہا "کیا ہمارے لشکر میں تمہارے خچر سے اچھا کوئی خچر نہیں ہے اور یہ گھوڑا تو مجھے تکلیف دیتا ہے اور میں اس پر سے تیر نہیں چلا سکتا۔ تم میرا یہ گھوڑا لے لو اور مجھے اپنا خچر دے دو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایسی سواری پر ہوں کہ اگر کہیں گھر جاؤں تو آسانی سے بچا یا جا سکوں۔" ابوالصباح کا خچر سفیدی مائل اشہب رنگ کا تھا ابوالصباح عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی گفتگو سے کچھ شرمندہ سے ہو گئے کیونکہ وہ یمنی تھے اور کہا "کیا امیر اپنے گھوڑے پر قائم نہیں رہ سکتے۔" عبدالرحمٰن نے نفی میں جواب دے کر ابوالصباح سے خچر لے لیا۔ اور اُس پر سوار ہوئے یہ دیکھ کر یمن والے مطمئن ہو گئے اور اپنے گھوڑوں پر سے اتر کر پھر لڑائی میں مصروف ہو گئے۔

ابن معاویہ کی فتح اور یوسف کی ہزیمت

اب جنگ نے پھر سختی سے رنگ بدلا۔ ابن معاویہ کی فوج میں سے حبیب ابن عبدالملک اپنے سواروں کو لے کر یوسف کی سوار فوج کے میمنہ وقلب پر حملہ آور ہوا اور اسے شکست دی۔ خالد سودی اور اُس کے ہمراہی بھاگ گئے۔ عبید ابن علی (سردار فوج یوسف) نے اسے بھاگتے دیکھ کر خود بھی راہ فرار اختیار کی۔ پھر حبیب اور ابن نعیم نے اہل شام کے سواروں کے ساتھ یوسف کے قلب پر حملہ کیا اس حملہ میں یوسف کی فوج سے کنانہ ابن کنانہ، عبداللہ ابن یوسف اور جوش ابن صمیل کام آئے۔ یوسف وصمیل کے قدم اکھڑ گئے۔ یوسف کی فوج میسرہ میں عبید اور قیس کی جماعت اپنی فوج کے ساتھ لڑتی رہی یہ جنگ دوپہر تک زور پر رہی پھر یوسف کی میسرہ کو بھی شکست ہوئی اور یہ لوگ نہایت بری طرح مارے گئے۔ عبید بن علی اور قیس کے سردار کام آئے۔ جنید بھوبلی

لوگوں کے سوا کوئی باقی نہ رہا۔

یوسف کا خوان یغما اور ابن معاویہ کی فوج | فتح پاکر ابن معاویہ یوسف کے قصر میں آئے تو اس میں کوئی نہ ملا۔
اس کے بعد ابن معاویہ کا لشکر میدان سے پلٹا تو یوسف کے لشکر گاہ پر پہنچا یہاں ان لوگوں کو یوسف کا تیار کرایا ہوا کھانا اور تمام اشیاء متروکہ ملیں۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ابن معاویہ نے خالد ابن زید کو قید کر کے بنی امیہ کے بوڑھوں کی حراست میں دے دیا تھا اور حکم دے دیا تھا کہ اگر لوگ مزاحم ہوں تو اُسے قتل کر دیا جائے (بقول مولف) خالد کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنے لئے اتنی دعا کبھی نہ کی تھی جتنی اس موقع پر کی۔ میں یوسف کی فتح کے لئے دعا مانگا کرتا تھا پھر یہ بھی کہتا تھا کہ وہ کامیاب ہوا تو اور ابن معاویہ کو فتح ہوئی تو میں بہر حال مارا جاؤں گا"۔ غرض خالد صلح ہو جانے تک قید ہی میں رہا۔

یوسف کے اہل وعیال کے ساتھ ابن معاویہ کا حسن سلوک اور اہل یمن کا اشتعال۔ | جب ابن معاویہ قصر میں آئے تو انھیں کوئی نہ ملا۔ جلد باز لوگ یوسف کے عیال و مال وغیرہ پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ ابن معاویہ نے انھیں دیکھا تو بھگا دیا اور یوسف کے اہل وعیال میں سے جو لوگ بے لباس ہو رہے تھے انھیں کپڑے پہنائے اور ان کی طرف سے جتنی مدافعت ممکن تھی کی۔ یمن کے لوگ اس بات پر بگڑ گئے کیونکہ یوسف کی اولاد و ناموس کو رسوا کرنے کی نسبت جو اُن کا ارادہ تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ اس لئے ابن معاویہ کو برا بھلا کہنے لگے مگر ابن معاویہ کا یہ سلوک ان میں سے سمجھ دار لوگوں کو زیادہ گراں نہیں گزرا اول میں ابن معاویہ کی اس طرفداری سے ناراض ضرور ہوئے مگر ظاہر میں تعریف کرتے رہے۔ مگر بعض ان میں سے ایسے بھی تھے جنھوں نے آپس میں اظہار ناراضگی کرتے ہوئے کہا" اب تم اپنے دشمن بنی مضر سے تو فارغ ہو ہی چکے ہو یہ شخص (ابن معاویہ) اور اس کے ساتھی بھی حقیقت میں مضر ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آؤ ایسے میں ان سے بھی فرصت پالیں تاکہ ہمیں ایک دن میں دو فتحیں حاصل ہوں"

ثعلبہ ابن عبد... کی بروقت خیر اندیشی و امداد | ان میں کے بعض لوگ اس تحریک سے خوش ہوئے بعض ناراض، قبیلہ قضاعہ نے بالاتفاق اس تحریک کو ناپسند کیا۔ یہ رنگ دیکھ کر ثعلبہ ابن عبد... جذامی جو فلسطین والے قبیلہ جذام کے ممتاز لوگوں میں تھا اگرچہ ان کے سرداروں سے نہ تھا ابن معاویہ

کے پاس آیا اور انھیں ازراہ خیر خواہی اس گفتگو سے مطلع کیا جو ان کی اور ان کی اولاد و وابستگان کے قتل کے متعلق ہوئی تھی اور یہ باور کرایا کہ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو اس تحریک کو ناپسند کرتے ہیں اور اس تحریک سے قبیلہ قضاعہ کی بیزاری و ناراضگی سے بھی خبردار کیا۔ پھر ابن معاویہ سے کہا کہ آپ ہوشیار رہیں اور اپنی خیر خواہی کو اپنے پاس رکھیں۔ آپ کے قتل کی جس نے صلاح دی تھی وہ سب سے زیادہ سخت آدمی ہے اس سے اس کا اشارہ ابوالصباح کی طرف تھا۔

ابن معاویہ کا مخصوص باڈی گارڈ ثعلبہ کی اس کارروائی کا یہ اثر ہوا کہ عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے اس کا بہت خیال رکھا اور اس کی بہت عزت افزائی کی اور اسی دن عبدالرحمٰن ابن نعیم کو اپنا محافظ بنایا اور اپنے غلاموں اور جان نثاروں کو بلا کر اپنی حفاظت پر مقرر کیا

اب قرطبہ میں بنی امیہ ابن معاویہ کے پاس اکٹھا ہو گئے تھے اس وقت قرطبہ میں بنی امیہ کے بہت سے ذی ثروت خاندان تھے۔

جب ابن معاویہ نے یوسف کا قصد کیا تھا تو یوسف نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو لکھ دیا کہ سرقسطہ سے پانچسو سوار لے کر آئے اور ابن معاویہ سے مقابلہ کرے چنانچہ شکست قرطبہ کے دن عبدالرحمٰن ابن یوسف ہی نے ابن معاویہ سے جنگ کی تھی۔

طلیطلہ میں یوسف کا فوجیں جمع کرنا پھر یوسف طلیطلہ پہنچا اور صمیل اپنے پڑاؤ پر واپس آیا۔ یوسف نے اہل طلیطلہ میں سے جن لوگوں کو جھگڑوں سے خالی اور ایک حد تک مطمئن پایا ان کو اکھٹا کر لیا۔ اس زمانہ میں طلیطلہ کا عامل ہشام بن عروہ فہری تھا۔ اس نے بھی اپنی جمعیت سے یوسف کی مدد کی مگر خود وہیں رہا پھر صمیل آیا تو اس نے مضر کے باقیماندہ لوگوں میں سے جتنے آدمی عروہ اور یوسف کے پاس قابل انتخاب ملے چن لئے تھے۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے جیآن کے حاکم حصین ابن دجن کو اور البیرہ کا جابر ابن علاء ابن نہاب کو مقرر کیا تھا جب یوسف اور صمیل جیآن کی طرف بڑھے تو حصین ابن دجن تیلتہ کے قلعہ میں میں جا چھپا۔ جب یوسف و صمیل جیآن سے البیرہ گئے تو جابر ابن علاء البیرہ چھوڑ کر پہاڑوں میں

چلا گیا

یوسف کے مقابلہ کے لئے البیرہ کی طرف پیشقدمی | جب ابن معاویہ کو یوسف کا البیرہ پہنچنا معلوم ہوا تو وہ بھی لشکر اکھٹا کر کے یوسف کی طرف بڑھے اور قرطبہ میں ابو عثمان کو نائب مقرر کر کے چند لیثیوں اور بنی امیہ کے ساتھ وہیں چھوڑا۔

ابن معاویہ کی لونڈیوں کا معاملہ | کسی موقع پر ابن معاویہ کو دو لونڈیاں ہدیئے میں دی گئی تھیں تیسری لونڈی اور چند غلام انھوں نے خود خریدے تھے اور ان سب کو اپنی ذات کے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ البیرہ جانے سے پہلے جب یوسف جیان ہی میں تھا اور اسے ابن معاویہ کے ارادہ آمد کی اطلاع ہو چکی تھی

قرطبہ پر عبدالرحمٰن ابن یوسف کی چڑھائی | اس وقت یوسف نے اپنے بیٹے ابو زید عبدالرحمٰن کو حکم دیا تھا کہ تم دوسری طرف سے چڑھائی کر کے قرطبہ پر حملہ کر دو۔ ادھر ابن معاویہ یوسف کے ارادہ سے البیرہ روانہ ہو چکے تھے۔ ابو زید عبدالرحمٰن ابن یوسف نے باپ کے حکم کی تعمیل میں دوسری طرف سے قرطبہ پہ دھاوا بول دیا۔

لونڈیوں پر عبدالرحمٰن ابن یوسف کا تصرف | ابو عثمان عبیداللہ جن کو ابن معاویہ نے قرطبہ کا نائب مقرر کیا تھا اسی حملے کے وقت قصر کی جامع مسجد میں محصور ہو گئے ابو زید نے ان کو یہ وعدہ کر کے حصار سے نکالا کہ تمھیں قتل نہ کریں گے اور قید کر کے لے چلا۔ اس سلسلے میں ابو زید عبدالرحمٰن ابن یوسف کو ابن معاویہ کی دو لونڈیاں ہاتھ آئیں، تیسری لونڈی جسے ابن معاویہ نے عرب کے کسی خاندان سے مول لیا تھا بھاگ گئی یا جب اس خاندان والوں کو ضرورت پیش آئی تو وہ اسے اپنے ساتھ بھگا لے گئے۔ اس وقت یہ لونڈی حاملہ تھی اور اس سے جو لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام عائشہ تھا۔

ابو زید عبدالرحمٰن کی حرکت پر اس کے ایک رفیق کا اعتراض۔ | ابو زید ابو عثمان اور ان دونوں لونڈیوں کو لے کر چلا تو اس کے کسی دانشمند ساتھی نے اس سے کہا " تو نے اتنا بڑا کام نہیں کیا جتنا عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے کیا۔ عبدالرحمٰن کے بس میں جب تیری مائیں اور بہنیں تھیں تو اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، ان کو پناہ دی اور کپڑے پہنائے مگر تو نے اسکی دو کنیزوں پر قابو پا کر قبضہ کر لیا "

ابوزید نے اس شخص کی نسبت بری رائے قائم کی اور اس سے کینہ رکھنے لگا۔

پھر ابوزید نے قلعہ تدمین میں جو شہر قرطبہ سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا خیمے لگانے کا حکم دیا اور اس خیمے میں ان دونوں لونڈیوں کو اتارا اور ان کا مال و متاع اپنے تصرف میں لے کر لونڈیوں کو وہیں چھوڑا اور خود ابوعثمان کو قید کئے ہوئے اپنے باپ کے پاس البیرہ پہنچا۔

فریقین میں صلح کی تکمیل | ابن معاویہ جو البیرہ کے ارادے سے چلے تو انھوں نے کہیں مڑ کے بھی نہ دیکھا یہاں تک کہ صوبہ البیرہ میں آ پہنچے اور موضع ارملہ میں قیام کیا۔ یہاں سے فریقین میں پھر مراسلت شروع ہوئی۔ یوسف و صمیل نے ابن معاویہ سے تحریک کی کہ اگر ہماری جانیں اور مال و جائداد محفوظ رہے تو ہم حکومت سے دست بردار ہو جائیں اور سارے ملک و رعایا کو بھی امان حاصل ہو جائے۔

ابن معاویہ نے منظور کر لیا اور سنہ ۱۴۰ھ میں دونوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ اسی سلسلے میں ابن معاویہ نے خالد بن زید کو چھوڑ دیا۔ اور یوسف نے ابوعثمان کو رہائی دی۔ ابن معاویہ نے یوسف سے معاہدہ کر لیا کہ ہم تمہارے بیٹے عبدالرحمٰن ابوزید اور محمد ابوالاسود کو ضمانت صلح کے طور پر رہن رکھیں گے چنانچہ ان دونوں کو یہ وعدہ کر کے حراست میں لے لیا کہ ہم انھیں ملکی معاملات کے اصلاح پر آنے تک قصر قرطبہ میں نہایت اچھی طرح نظربند رکھیں گے اور کسی طرح کی سختی نہ کریں گے۔ اور امن پر قابو پانے کے بعد ان دونوں کو واپس کر دیا جائے گا۔

صمیل کے متعلق ابن معاویہ کا حسن خیال | صلح ہو جانے کے بعد جب ابن معاویہ صمیل کا ذکر کرتے تو کہتے "حکومت تو صرف اللہ ہی کو زیبا ہے مگر صمیل کی سلیقہ مندی میں کوئی شک نہیں وہ میرے ساتھ البیرہ سے قرطبہ تک گیا۔ اس کے زانو میرے زانو سے نہ ہٹے نہ اس کے خچر کا سر میرے خچر کے سر کے برابر ہوا۔ وہ اتنا باادب تھا کہ اس نے مجھ سے کسی بات کو نہ پوچھا اور نہ بغیر پوچھے بے ضرورت گفتگو کی" لیکن ابن معاویہ یوسف کی نسبت ایسا کوئی ذکر نہ کرتے تھے یہ بات اس لئے تھی کہ جب صلح ہو گئی تو یوسف ابن معاویہ کے دائیں جانب تھے اور صمیل[1] بائیں جانب۔ اسی حالت میں

---

(۱) صمیل کے متعلق ابن معاویہ نے جو رائے قائم کی تھی وہ اسی موقع سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ تینوں قرطبہ میں داخل ہو گئے۔ ابن معاویہ نے قصر قرطبہ میں قیام کیا اور یوسف اپنے محل بلاط الحر میں اترے جو اس سے پہلے حر بن عبدالرحمٰن ثقفی والی اندلس کا محل تھا۔

قصر بلاط الحر کا قضیہ اور یوسف کے خلاف شکایتیں | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یوسف نے ابن حر پر ظلم کر کے اسے قتل کر ڈالا اور محل پر قبضہ کر لیا تھا اور بعض کہتے ہیں اس سے خرید لیا واللہ اعلم۔ غرض جب یہ لوگ قرطبہ آئے تو لوگ یوسف کے خلاف شکایتیں کرنے لگے اور انھیں یہ توقع ہوئی کہ ابن معاویہ ان کے موافق ہو کر یوسف پر سختی کریں گے اور اس خیال سے یوسف کے بعض اموال و اراضی پر یوسف کا ناجائز قبضہ ظاہر کرتے ہوئے دعوے کیا کہ اس کے اصل مالک ہم ہیں اس پر ہمارا قبضہ ہونا چاہئے۔ آخر یہ جھگڑا قاضی تک پہنچا۔

قاضی یزید یحییٰ | اس زمانے میں یزید ابن یحییٰ قضا کے عہدہ پر مامور تھے۔ مدعیوں کو قاضی سے بھی یہ امید تھی کہ قاضی اپنے ذاتی کاوش کی وجہ سے یوسف کے خلاف ہماری طرفداری کریں گے کیونکہ یوسف وصمیل نے شقندہ میں یمنیوں کو قتل کر کے ساری قوم سے عداوت مول لے لی تھی۔ یزید ابن یحییٰ دربار خلافت سے باقاعدہ فرمان کے ساتھ قاضی ہو کر آئے تھے۔ یوسف اگرچہ ان سے خوش نہ تھا مگر اہل اندلس کی رضامندی کی وجہ سے اعتراض نہ کر سکا۔ اس موقع پر یوسف وصمیل اور مدعی قاضی کے یہاں پیش ہوئے لیکن مدعیوں کو بڑی مایوسی ہوئی جب قاضی نے یوسف وصمیل کے خلاف کوئی خاص کارروائی نہ کر کے مدعیوں کو پریشان کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی نے بعض مدعیوں کو دس دس دن تک پریشان رکھا۔ جو زیادہ ثروت والے تھے وہ تین پیشیوں میں تین تین دن سے زیادہ نہ رہ سکے۔ اس مقدمے کے بعد بھی یوسف و صمیل نہایت آزادی و اطمینان کے ساتھ ابن معاویہ کے پاس آتے رہے اور وہ بھی ان دونوں کو وقتاً فوقتاً شریک رائے کرتے رہے۔

عبدالملک ابن عمر اور حزمی ابن عبدالعزیز کی آمد | راوی کا بیان ہے کہ اس سال عبدالملک[1] ابن عمر ابن

(۱) عبدالملک عرف مروانی اور حزمی ابن عبدالعزیز دونوں عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے دادا ہشام کے چچیرے بھائی

مروان جن کو مروانی بھی کہتے ہیں اور جزی بن عبدالعزیز ابن مروان اپنی اولاد و موالی اور چند بنی امیہ کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے اور تھوڑے دن میں خاصی تعداد بڑھالی ۔

موالی بنی ہاشم اور قبائل قریش وغیرہ کی یوسف کے ساتھ سازش اور یوسف کا فرار

قرطبہ میں موالی بنی ہاشم و بنی فہر اور قبائل قریش وغیرہ کے کئی خاندان تھے ان لوگوں نے یوسف کی بدولت بڑے بڑے مرتبے حاصل کئے تھے اب چونکہ ابن معاویہ کے تسلط سے یہ بات باقی نہ تھی اس لئے یہ لوگ یوسف کے پاس آآکر سازشیں کرتے اور اس کو موجودہ حالت پر شرمندہ کرکے ابن معاویہ کے خلاف اُکساتے تھے آخر یوسف نے ان کے کہنے میں آکر لوگوں سے خط و کتابت شروع کی۔ لشکر والوں نے تو یوسف کو جواب دے دیا کہ "ہم صلح کے بعد پھر جنگ پر تیار نہیں ہیں صمیل اور قبیلہ قیس والوں کو بھی یوسف کی یہ بات ناگوار ہوئی اور انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ جو کچھ ہو گیا ہے ہم اسی پر راضی ہیں اور اب ہم ابن معاویہ سے خلع نہ کریں گے ۔ جب یوسف کو ان لوگوں سے مایوسی ہوئی تو اس نے بلدیوں[1] خصوصاً ماردہ اور لقنت والوں کو ہموار کرنا شروع کیا یہ لوگ یوسف کا ساتھ دینے پر بخوشی آمادہ ہوگئے۔ ان میں زیادہ تر یوسف کے خاندان کے لوگ تھے جو جنگ مسارہ کے دن لقنت و طلیطلہ میں آباد ہوگئے تھے جب عبدالرحمن ابن معاویہ سے صلح ہوئی تو ابن معاویہ نے یوسف کے گھرانے کے بعض لوگ یوسف کو دے دئے اور اُس کی بعض بیٹیوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ چھوڑا اور کچھ لوگوں کو جو جہاں رہتے تھے وہیں رہنے دیا اور ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔ صلح کے کچھ مدت بعد جب یہ موقع آیا تو ان لوگوں کے دعوتی خطوط بھی یوسف کے پاس آئے اور یوسف سنہ ۱۴۱ھ میں بھاگ کر ماردہ پہنچا۔

صمیل اور یوسف کے بیٹوں کی گرفتاری

جب ابن معاویہ کو یوسف کا بھاگنا معلوم ہوا تو ابن معاویہ نے اس کا تعاقب مگر وہ چھپ گیا اُس کے دو بیٹے البتہ گرفتار ہوگئے جنھیں ابن معاویہ نے

تھے اس لئے رشتہ میں عبدالرحمن ابن معاویہ کے دادا ہوئے۔ (مترجم)

(۱) اس کتاب میں بلدیوں یا بلدیین سے وہ عرب مراد ہیں جو بلج کے آنے سے پہلے اندلس میں آباد ہوئے تھے انکی آمد کا زمانہ سنہ ۹۲ھ اور سنہ ۱۲۳ھ کے مابین سمجھنا چاہئے ۔

(۲) اس جنگ سے ثعلبہ ابن سلامہ عاملی والی جنگ مراد ہے جس میں بلدی عرب اور بربری اس کے حریف تھے (مترجم)

قتل کر ڈالا صمیل قرطبہ میں پکڑ لیا گیا صمیل نے حجت کی کہ " میرا کوئی گناہ نہیں ہے اگر میں مجرم ہوتا تو میں اس کے ساتھ بھاگ جاتا " ابن معاویہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ وہ بغیر تیرے مشورہ کے نہیں بھاگا۔ ہم بھی تیرے خیر خواہ تھے مگر تو نے ہم سے غداری کی، غرض ابن معاویہ نے صمیل کو قید میں رکھا۔

جنگ کے ارادہ سے یوسف کی پیشقدمی اور اشبیلیہ پر حملہ

یوسف ماردہ میں آیا تو اس نے وہاں کے لوگوں میں عربوں اور بربریوں کو جمع کیا پھر لقنت پہنچا یہاں اس کے اہل بھی مل گئے پھر یوسف اشبیلیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت اشبیلیہ میں عبدالملک ابن عمر مروانی کی حکومت تھی یوسف کے آنے پر اشبیلیہ میں حمص کے کچھ عرب عبدالملک کی طرف ہو گئے اور بلدی سب کے سب سوائے چند آدمیوں کے عبدالملک سے علٰحدہ ہو کر یوسف کے حامی ہو گئے اس لئے اشبیلیہ میں یوسف کا لشکر بہت بڑھ گیا اور بیس ہزار سے زائد اس کی جمعیت ہو گئی۔ اس جمعیت کے ساتھ یوسف نے اشبیلیہ میں عبدالملک ابن عمر مروانی پر حملہ کیا۔ جو عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی طرف سے اشبیلیہ کے حاکم تھے۔

یوسف اشبیلیہ کی طرف سے مطمئن ہو کر ابن معاویہ کے لئے بڑھا اور عبداللہ ابن مروانی کی اشبیلیہ میں آمد

عبدالرحمٰن ابن معاویہ قرطبہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے لشکروں کا انتظار کر رہے تھے تاکہ سب جمع ہو جائیں تو آگے بڑھیں راوی کہتا ہے کہ جب یوسف کی فوجیں جمع ہو گئیں تو یوسف مروانی پر چڑھائی کے ارادہ سے بڑھا۔ مروانی کے ساتھ کچھ شامی فوج تھی اور وہ کم تھی۔ اسی فوج کے ساتھ وہ اشبیلیہ کی حفاظت کر رہا تھا۔ جب یوسف نے مروانی کی جمعیت بہت تھوڑی دیکھی تو وہ ان کی طرف سے بے خطر ہو گیا۔ اور اشبیلیہ کو اسی حال میں چھوڑ کر ماردہ کے عربوں، بربریوں اور لقنت والوں اور چند اہل اشبیلیہ کی فوجوں کے ساتھ ابن معاویہ کے مقابلہ کے لئے چلا۔ ادھر ابن معاویہ کے لشکر بھی قرطبہ میں جمع ہو چکے تھے وہ بھی آگے بڑھے اور اس جگہ قیام کیا جسے برج اسامہ کہتے ہیں۔ یوسف اپنی عاقبت سے بے پروا ابن معاویہ کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ مروانی اپنے دارالحکومت اشبیلیہ میں اپنے

بیٹے کا منتظر تھا جب مروانی کا بیٹا عبداللہ والی ملک مورور آگیا تو اس نے اپنے باپ کو محصور سمجھ کر اپنے محکوموں کو جمع کیا اور اپنے باپ کے پاس اشبیلیہ پہنچا۔ اشبیلیہ میں عبداللہ کے داخل ہونے تک مروانی پر سے محاصرہ اٹھ چکا تھا۔ عبداللہ نے اُسے یوسف کی آمد و واپسی سے باخبر کیا پھر لوگوں کو بلا کر رائے طلب کی۔ ان کے سرداروں نے کہا کہ ہم تمہارے باپ کے تابع فرمان ہیں جب تمہارا جی چاہے یوسف پر حملے کے لئے چلو۔ اس مشورہ پر مروانی اور اس کے ساتھ اس کا بیٹا عبداللہ اہل اشبیلیہ و مورور وغیرہ کے ساتھ یوسف پر حملے کے قصد سے روانہ ہوئے۔

جب امیر ابن معاویہ کو یہ معلوم ہوا کہ یوسف مروانی کو چھوڑ کر میری طرف حملے کے ارادے سے بڑھ رہا ہے تو وہ بھی آگے بڑھ کر حصن مدور میں جا اترے۔ اس وقت یوسف وادی کذا میں تھا۔

یوسف اور مروانی کی فوجوں کا مقابلہ یہاں جب لوگوں نے یوسف کو اطلاع دی کہ مروانی آپہنچا تو یوسف اس اندیشے سے کہ کہیں ایسا نہ ہو عبدالرحمن ابن معاویہ بھی آجائے اور میں دونوں طرف سے دشمنوں میں گھر جاؤں مروانی کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھر مروانی خود اس فکر میں تھا کہ فی الحال جہاں تک ممکن ہو مقابلے کی نوبت نہ آئے اور قلت فوج کے خیال سے جنگ سے بچنا چاہتا تھا مگر یوسف کی سبقت کی وجہ سے اس ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکا اور آخر کار ایک مقام پر مروانی اور یوسف کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر آگئیں۔ یہاں بنی فہر کے موالی میں سے لقنت یا ماردہ کے رہنے والے ایک بربری نے مروانی کے لشکر سے مقابلہ کے لئے مبارز طلبی کی۔ یہ بربری بڑا بہادر اور دلاوری میں بہت مشہور تھا اس لئے مروانی کے لشکر سے کوئی شخص اس کے مقابلے کے لئے نہ نکلا۔ آخر مروانی نے اپنے بیٹے عبداللہ سے مخاطب ہو کر کہا "یہ شرارت کی ابتدا ہے۔ اور ہماری قلت فوج سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے بیٹا اب تم خدا پر بھروسہ کر کے ہماری مدد کرو" یہ سن کر عبداللہ خود مقابلے کے لئے نکلا۔ اس نے ساتھ اس کا ایک حبشی غلام بھی چلا جو پہلے آل مروان میں الحکم کا غلام تھا اور ابوالبصری اس کی کنیت تھی۔ اس غلام نے عبداللہ سے پوچھا کہ آپ کیوں

نکلے ہیں اور کیا ارادہ ہے۔ عبداللہ نے کہا اس شخص کے مقابلے کے لئے۔ غلام نے کہا اس کے لئے تو میں کافی ہوں اور یہ کہہ کر ابوبصری تنہا بربری کے مقابلے پر آیا۔ اس وقت آسمان سے خفیف سا ترشح ہو رہا تھا دیر تک دونوں میں کشمکش رہی۔ خوب جنگی کرتب دکھائے گئے کیونکہ دونوں دلاور اور قوی و تنومند تھے۔ اتفاق سے بربری کا پیر پھسل گیا اور وہ گر گیا ابوبصری نے فوراً حملہ کر کے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ یہ دیکھتے ہی مروانی کے لشکر والوں نے زور سے تکبیر کہی اور ایک دم حملہ کر دیا۔ دم کے دم میں یوسف کو شکست ہو گئی۔ اس کے اکثر لوگ میدان چھوڑ کر منتشر ہو گئے مگر قتل بہت تھوڑے ہوئے۔ مروانی کی فوج نے اپنی قلت کی وجہ سے دشمن کے تعاقب میں بہت کم حصہ لیا۔ صرف وہ لوگ جو یوسف کے لشکر سے الگ رہ گئے تھے وہی مروانی کی سپاہ کے ہاتھوں میں پڑ کر لوٹے گئے اور قتل ہوئے۔

عبداللہ ابن مروانی کی ابن معاویہ سے ملاقات اس جنگ کے وقت امیر ابن معاویہ مدور میں موجود تھے عبداللہ ابن عبدالملک مروانی اپنی فوج سے علیحدہ ہو کر یوسف کی شکست کی خبر اور مقتولوں کے سر لے کر امیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیر نے اس سے ملاقات کی۔ اس فتح پر خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فوراً ایک قاصد اپنے غلام بدر کے پاس روانہ کیا اور لکھا کہ "مروانی کی مدارات اور دلجوئی کا کافی خیال رکھو اور ہم سے دو چند ان کی مہمانداری میں حصہ لو"۔ عبداللہ نے اس موقع پر امیر کو جنگ کے تمام حالات سے مطلع کر دیا تھا اور امیر کی نظر میں اپنی عزت وو قار بڑھا کر کافی امتیاز حاصل کر لیا تھا۔

یوسف کا آخری وقت یوسف اس جنگ سے فرار ہو کر قرلیش کی طرف گیا اور وہاں سے فحص البلوط کی طرف ہوتا ہوا طلیطلہ کے راستے پر ہو لیا تا کہ ابن عروہ کے پاس جا کر پناہ لے۔ اب طلیطلہ صرف دس میل رہ گیا تھا کہ یوسف کا گزر عبداللہ ابن عمر انصاری کی طرف ہوا جو ضلع طلیطلہ کے کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ کسی نے عبداللہ ابن عمر کو اطلاع دی کہ یہاں سے یوسف شکست خوردہ گزر رہا ہے عبداللہ نے لوگوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ آؤ آگے چل کے یوسف کو قتل کر ڈالیں تا کہ دنیا کو اس کے

شہر سے نجات مل جائے اور وہ بھی دنیا سے نجات پا جائے" چنانچہ یہ لوگ حملے کے لئے تیار ہو کر بڑھے اتنے میں یوسف آگے نکل چکا تھا جب عبداللہ ابن عمر تعاقب کرتے ہوئے یوسف کے پاس پہنچے ہیں تو طلیطلہ صرف چار میل رہ گیا تھا۔ اور اس وقت یوسف کے ساتھ بنی تمیم کے ایک مولیٰ سابق نامی سوار اور ایک خدمتگار کے سوا کوئی نہ تھا۔ جو لوگ ناواقف ہیں ان کا بیان ہے کہ "صرف یوسف کا غلام تھا اور اس کے باقی لوگ بیچارگی کی حالت میں سرقسطہ میں پڑے تھے یا سختی راہ کی تاب نہ لا کر مر چکے تھے" غرض یوسف الفہری اور سوار دونوں عبداللہ ابن عمر انصاری کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ غلام فرار ہو کر طلیطلہ پہنچ گیا۔

ابو زید ابن یوسف کا قتل اب عبداللہ ابن عمر انصاری یوسف کا سر لے کر امیر کی طرف چلا جب امیر کو عبداللہ ابن عمر کے اس شان سے آنے کی خبر ملی تو اس نے عبدالرحمٰن ابن یوسف کو قتل کرا دیا جس کی کنیت ابو زید تھی۔ امیر ابو زید سے ناراض تھا کیونکہ اس نے امیر کی لونڈیوں کے ساتھ بدسلوکی کی تھی جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے عبداللہ ابن عمر کے آنے پر عبدالرحمٰن ابن یوسف کا سر یوسف کے سر کے ساتھ باہر نکالا اور دونوں کو پھنکوا دیا۔

ابو زید کے ساتھ ہی یوسف کا دوسرا بیٹا ابوالاسود بھی امیر کے قبضے میں تھا۔ تعجب ہے کہ امیر نے اس کی طرف التفات نہ کیا اور حقیر جان کر درگزر سے کام لیا۔ صرف قید کرنے پر اکتفا کی اتفاق سے وہ قید سے نکل بھاگا اور پھر قوت پکڑ کے ۲۰ سال تک امیر پر متواتر حملے کرتا رہا۔ اس کی یہ لڑائیاں حرب قسطلونہ کے نام سے مشہور ہیں جن کا مفصل بیان آگے آئے گا۔

امیر عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی لونڈیوں کے ساتھ ابو زید نے جو کچھ بدسلوکی کی تھی اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ یہ لونڈیاں ابو زید نے چھوڑ دی تھیں۔ مگر امیر کو ان سے نفرت تھی۔ اس نفرت کی وجہ سے ایک کنیز اس نے عبدالحمید ابن غانم اپنے غلام کو دے دی جو عبدالرحمٰن ابن عبدالحمید ابن غانم کی ماں بنی۔ اس کا نام کلثوم تھا اور دوسری ایک اور شخص کو عنایت کر دی۔ یہ واقعہ اس قسم کے حالات میں بہ سلسلہ ترتیب لکھ دیا گیا ورنہ ایسے واقعات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا

احاطہ دشوار ہے۔

صمیل کا انجام | عبدالرحمٰن ابن یوسف کے قتل کے بعد اسی رات کو صمیل بھی قید خانے میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ صبح کو اس کی لاش قید خانے سے نکال کر اس کے اعزہ کو دے دی گئی جنھوں نے اسے دفن کر دیا۔ جب صمیل، یوسف اور اس کے بیٹے عبدالرحمٰن کا قصہ تمام ہو گیا تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، صرف محمد ابوالاسود کا قضیہ باقی رہ گیا جو قید سے نکل کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔

رزق غسانی و ابن عروہ وغیرہ کی بغاوتیں | یوسف و صمیل کے بعد رزق ابن نعمان غسانی نے سر اٹھایا اور ایک سال چار ماہ تک امیر سے لڑا اس کے قتل کے بعد ہشام ابن عروہ فہری نے لڑائی جاری رکھی۔ حیوہ ابن ولید تجیبی اور عمری بھی جو حضرت ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے اس کے ہمراہ تھے اس جنگ پر امیر خود روانہ ہوئے اور طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک دفعہ عین گرمی جنگ میں جب کہ امیر قلعے تک پہنچنے ہی والے تھے ہشام نے صلح کی درخواست کر دی اور اپنے بیٹے کو بطور یرغمال امیر کے ہمراہ کر دیا۔ امیر اسے لے کر واپس ہو گئے تو ہشام نے پھر سر اٹھایا اور امیر کی بیعت توڑ کر بغاوت پر کمر باندھی۔ امیر نے دوسرے سال پھر طلیطلہ پر چڑھائی کی اور جنگ میں مصروف ہوئے۔ اس مہم پر امیر نے چاہا کہ ہشام پھر اطاعت قبول کر لے اور جنگ نہ کرے مگر وہ نہیں مانا۔ امیر نے کچھ دن انتظار کیا کہ شاید اب ہشام کی اصلاح ہو جائے اور وہ صلح کر کے میری بیعت تسلیم کر لے۔ مگر نتیجے میں مایوسی ہوئی آخر کو امیر نے ہشام کے بیٹے کو جو ضمانت صلح میں ان کے پاس یرغمال کے طور پر تھا طلب کر کے قتل کرا دیا اور اس کا سر منجنیق میں رکھ کر شہر میں پھکوا دیا۔ بعد ازاں امیر اسی سال وہاں سے واپس ہو گئے۔

علاء ابن مغیث کی بغاوت | امیر کو تھوڑے ہی دن سکون سے گزرے تھے کہ علاء بن مغیث یحصبی نے امیر کے خلاف سر اٹھایا۔ بعض کہتے ہیں کہ علاء باجہ کا حضرمی تھا اس نے لوگوں کو ہموار کرنے کے لئے مراسلت کی اور لوگوں کو ابوجعفر منصور کی اطاعت پر توجہ دلائی۔ ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ نے اپنی خلافت کا ایک سیاہ نشان علاء کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس موقعہ پر علاء نے اس نشان کو نکال کر اسے ایک نیزے میں باندھا اور مصر کے لشکروں میں سے لے کر اسے نکلا۔

اس بغاوت میں علار کا ساتھ واسطہ بن مغیث اور امیہ ابن قطن فہری نے بھی دیا۔ باغی فرقے بڑھ کر اشبیلیہ پہنچے اور وہاں ان لوگوں نے امیہ بن قطن پر تہمت لگا کر اسے گرفتار کرلیا۔ یہ حالات سن کر امیر نے بھی فوجیں جمع کیں۔ باغیوں کی سرکوبی کے لئے بڑھے اور قلعہ رعواق میں پڑاؤ ڈال دیا۔

غیاث ابن علقمہ کی کمک | غیاث ابن علقمہ لخمی شذونہ سے باغیوں کی مدد کے لئے آرہا تھا۔ امیر کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے غلام بدر کو ایک چھوٹا سا لشکر دے کر غیاث سے لڑنے کے لئے بھیجا۔ بدر سفر کرتا ہوا واجہ میں وادی ابرہ اور دریائے اعظم کے درمیان مقیم ہوا۔ ابھی جنگ کا آغاز نہ ہوا تھا کہ دونوں کے درمیان مراسلت ہوتے ہوتے صلح کی ٹھہر گئی اور غیاث ابن علقمہ لخمی لڑائی سے ہاتھ کھینچ کر اپنے شہر کو واپس ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بدر بھی امیر کے پاس چلا آیا۔

باغیوں کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے آپس میں کہا کہ "اب ہمارے لئے صرف قرمونہ ہی رہ گیا ہے" اور یہ سوچ کر رات کو قرمونہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ امیر نے یہ سن کر بدر کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ جلد سے جلد قرمونہ روانہ ہو جاؤ اور قرمونہ کے دروازے پر اپنے ڈیرے لگا دو اور صبح کو ہمارے پہنچنے تک غیر مسلم رعایا کو اپنے پاس جمع کرلو۔

باغیوں کا عبرتناک انجام | بدر کو روانہ کرکے امیر بہت سویرے قرمونہ کی سمت چلا اور ظہر تک وہاں پہنچ گیا باغیوں کو وہاں تک پہنچنے میں دیر ہوئی وہ قرمونہ کے ایک گاؤں شعرا تک پہنچے تھے کہ انھیں قرمونہ کے دروازے پر ڈیرے لگے ہوئے نظر آئے جنھیں دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ امیر ہم سے پہلے آپہنچا۔ تاہم باغیوں نے مقابلے میں سبقت کی۔ امیر کی طرف کے سوار بھی بڑھے۔ فریقین میں خوب مقابلہ ہوا مگر آخر میں باغی بری طرح پسپا ہو کر قتل ہوئے۔ امیہ بن قطن بحالت قید امیر کے لشکریوں کے ساتھ آیا۔ امیر نے اس پر احسان رکھ کر اسے آزاد کر دیا۔ نتائج جنگ کا جب اندازہ کیا گیا تو دشمنوں کے سات ہزار سر شمار میں آئے۔ جن میں سے امیر نے ممتاز مقتولوں کے سر اور علار کا سر علیحدہ کرلیا۔ علار کے ناک کان بھی کاٹ لیے۔ پھر ہر مقتول کے نام کا ایک پرچہ لکھوا کر اس مقتول کے کان میں لٹکا دیا۔ پھر ان سروں کو افریقیہ پہنچانے والے کے لئے انعام مقرر کیا۔ ایک شخص آمادہ ہوگیا اور اس نے تمام سروں کو خرجیوں میں رکھ کر جہاز کے

ذریعے سے قیروان کی راہ لی وہاں پہنچ کر اس شخص نے رات کے وقت یہ تمام سر بازار میں پھینک دئے۔
صبح کو جب لوگوں نے بازار میں سر ادھر اُدھر پڑے دیکھے اور ان کے ساتھ ایک ایک پرچہ بھی دیکھا تو
بڑی ہلچل مچ گئی اور یہ خبر ابو جعفر منصور تک پہنچی۔

هشام عمری اور حیوہ وغیرہ کا انجام | اس واقعہ کے بعد امیر نے پھر ہشام ابن عروہ کی طرف توجہ کی اور تمام
ابن علقمہ اور اپنے غلام بدر کو کچھ فوج کے ساتھ طلیطلہ بھیجا جہاں ان دونوں نے ہشام ابن عروہ کو
گھیر لیا۔ بدر و تمام کو روانہ کر کے امیر نے طلیطلہ کی مہم پر اور فوجیں بھیجیں اور ہر چھٹے مہینے ایک تازہ
دم فوج امداد کے لئے بھیجتا رہا۔ آخر اہل شہر طول محاصرہ کی تاب نہ لا سکے اور انھوں نے لڑائی
کی صعوبت ناقابل برداشت سمجھ کر امیر کی فوج سے سازش کرنا شروع کی۔ تمام و بدر سے معاملات
طے ہوگئے اور شہر والوں نے ہشام عمری اور حیوہ سے بیزار ہو کر انھیں امیر کی فوج کے سپرد کر دیا۔
تمام ان لوگوں کو قید کر کے انھیں قرطبہ پہنچانے کے ارادے سے روانہ ہو گیا۔ بدر شہر میں اپنی
جگہ قائم رہا تاکہ امیر کا حکم حاصل کر کے تعمیل کرے۔ تمام ان لوگوں کو لئے ہوئے اوریط تک پہنچا تھا کہ
عاصم ابن مسلم ثقفی سے ملا۔ عاصم نے امیر کے حوالے سے اسے حکم دیا کہ تم طلیطلہ کے والی مقرر کئے گئے ہو۔
اب تم وہیں روانہ ہو جاؤ اور بدر کو واپس کر دو۔ تمام نے اس حکم کی تعمیل کی اور طلیطلہ واپس ہو گیا۔
عاصم ثقفی اسیروں کو لئے ہوئے قریہ حلوہ میں جا اترا۔ امیر نے ان کی اطلاع پا کر پولیس کے حاکم اعلیٰ
عبدی کو ان اسیروں کی سزا پر مامور کیا۔ عبدی نے ان کے لئے ایک ایک کمبل کا جبہ لیا اور اپنے
ساتھ ایک حجام اور چند گدھے لے کر ان کے پاس پہنچا۔ ان کے سر اور داڑھیاں منڈوائیں اور جبے
پہنا کر بیڑیاں پاؤں میں ڈلوائیں اور گدھوں پر بٹھا کر سب کو اپنے ساتھ لئے ہوئے قرطبہ پہنچا۔ اس عالم
میں عمری نے جو بہت ضعیف تھا حیوہ سے کہا کہ مجھے بہت تنگ جبہ پہنایا گیا ہے۔ حیوہ نے طنز کے لہجہ
میں جواب دیا۔ جی ہاں تم یونہیں چھوڑ دئے جاتے تو اچھا تھا۔ غرض امیر کے حکم سے اس بُرے حال
میں ان سب کو قتل کر کے سولی دے دی گئی۔

سعید یحصبی کی سرکشی | ان کے بعد سعید الیحصبی نے بغاوت کی اور لبلہ پر حملہ کیا۔ یہ سعید مطری کے نام سے

بھی مشہور رہی اور اس کے سر اٹھانے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک رات جبکہ وہ نشے میں تھا اس کے سامنے اہل یمن کے قتل کا ذکر ہوا اور علاء کے قتل کا بھی حال کہا گیا یہ سن کر اس نے اسی عالم مخموری میں اپنے نیزے میں نشان باندھ کر نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور اس جوش کی حالت میں گویا جنگ کے لئے آمادگی ظاہر کردی۔ جب نشے سے افاقہ ہوا تو اس نے دریافت کیا کہ نیزہ پر یہ نشان کیسا بندھا ہوا ہے۔ لوگوں نے جواب میں کہا "کل رات کو آپ ہی نے یہ نشان اپنی قوم کے قتل کا حال سن کر غصے میں باندھا تھا" اس نے حکم دیا قبل اس کے کہ یہ خبر مشہور ہو اس نشان کو کھول ڈالا جائے۔ مگر ساتھ ہی اسے ایک بات سوجھ گئی اور اس نے کہا "میں اپنی رائے سے نہیں پھروں گا"، کیونکہ وہ ایک بہادر اور جری شخص تھا۔ پھر اس نے اپنی قوم کو طلب کیا ایک جماعت اس کے ساتھ ہوگئی اور یہ سب قلعہ رعواق کی طرف بڑھے اور قلعے میں داخل ہوگئے

جب امیر کو اس کی اطلاع ملی تو وہ بھی اسی طرف روانہ ہو کر قلعے کے پاس جا پہنچا۔ اس کی آمد سن کر مطری قلعے سے باہر نکلا اور جنگ شروع ہوگئی۔ مطری کے ہمراہ سالم بن معاویہ کلاعی بھی تھا۔ خوب گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مگر اس میں زیادہ طول نہ ہوا کیونکہ مطری کی جماعت نے اپنا جنرل خلیفہ ابن مروان یحصبی کو بنا لیا جس نے امیر سے اپنے اور اپنی قوم کے لئے امان مانگی۔ امیر اسے امان دے کر واپس ہوگیا اور یہ لوگ بھی قلعہ خالی کرکے چلے گئے۔

ابو الصباح کی بغاوت | اب ابو الصباح نے سر اٹھایا۔ اس کی سرکشی کا سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے امیر نے ابو الصباح کو اشبیلیہ کا گورنر مقرر کیا تھا مگر کسی بات پر معزول کرکے ابو الصباح کو ناراض کردیا۔ یہ بغاوت اسی ناراضگی کی وجہ سے تھی۔

جب ابو الصباح نے بغاوت کے خیال سے ایک جگہ ٹھہر کر لشکروں سے خط و کتابت کی تو امیر کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ عبداللہ ابن خالد بھی اپنے کسی عہد کی وجہ سے ابو الصباح کی حمایت کے لئے بڑھ رہا ہے تو امیر نے چال سے کام لیا اور مختلف مقامات سے جعلی خطوط ابو الصباح کے پاس بھیجے۔ ان خطوط میں یہ لکھا ہوا تھا کہ "اگر تم قرطبہ کی طرف بڑھو گے تو کامیاب ہوگے"، ابو الصباح

اس چال میں آگیا اور امیر کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے قتل کے بعد عبداللہ ابن خالد خود حکومت کے کاموں سے دستکش ہوگیا اور فنتین میں سکونت اختیار کرکے وہیں مر گیا۔

اس واقعے کے متعلق ایک بیان یہ بھی ہے کہ تمام ابن علقمہ ابو الصباح کو بہلا پھسلا کر کوئی عہد کئے بغیر اپنے ساتھ لئے ہوئے قرطبہ آگیا۔ امیر کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے ابو الصباح کو اپنی خدمت میں باریاب کیا اس وقت ابو الصباح کے ساتھ اس کے لشکر کے چار سو آدمی بھی تھے ابو الصباح نے امیر سے کچھ شکایتیں کیں۔ ان کے جواب میں امیر اس سے سختی سے پیش آئے اور اسے دھمکایا مگر بعض امور میں اس سے مشورہ بھی لیا تاکہ وہ فوراً شبہ میں نہ پڑ جائے۔ پھر ایک سیاہ فام مدینہ کی رہنے والی لونڈی کو بلایا جو دوسری لونڈیوں پر دار وغہ تھی اور ان کی معلمہ تھی۔ وہ امیر کے پاس ایک خنجر لے کر حاضر ہوئی یہ دیکھ کر ابو الصباح چونک پڑا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ خنجر لے لے۔ مگر امیر نے فوراً خدام کو اشارہ کیا وہ جھپٹے اور ابو الصباح کی شہرگ پر خنجر چبھونے لگے۔ ابو الصباح بے بس ہوگیا اور خدام نے اسے قتل کر ڈالا۔

امیر نے ایک کمبل میں اس کی نعش کو لپٹوا کر وہاں سے علیحدہ کر دیا اور خون کے نشانات اس جگہ سے بالکل زائل کرا دئے۔ پھر اپنے وزرا کو مشورے کے لئے طلب کیا اور ان سے ابو الصباح کے قتل کی نسبت رائے لی۔ وزرا کو اس وقت تک یہی معلوم تھا کہ ابو الصباح امیر کے پاس قید ہے وہ اس کے قتل کے حال سے بے خبر تھے۔ اس جلسے میں کسی نے بھی ابو الصباح کے قتل کی رائے نہ دی اور یہی کہا کہ اس کے چار سو سوار دروازے پر موجود ہیں اور امیر کا لشکر اس وقت تیار نہیں ہے ہمیں خطرہ ہے کہ کہیں کوئی آفت نہ برپا ہو،، صرف مروانی نے البتہ قتل کی تائید کی۔ اور اشارۃً کچھ شعر پڑھے جن میں سے ایک شعر یہ ہے۔

لا يفلتنك فيأتينا بالقته   أشدد يديك به تبرأ من السقم

"ایسا نہ ہو کہ وہ تجھ سے نجات پاکر چلا جائے اور ہم پر کوئی آفت لائے اپنے دونوں ہاتھوں کو مضبوط کرکے اُسے روک اور بے خطر ہو جا"

(باقی)

جرمنی کے بہترین

یعنے

دنیا کے بہترین ٹائپ

بجو

ہلکے سفری ٹائپ رائٹر کا جدید ترین نمونہ
جو سہولتیں اس مشین میں ہیں کسی دوسرے ٹائپ رائٹر
میں نہیں، نہایت خوبصورت پائدار وزن کل ۷ سیر
قیمت انگریزی مبلغ ۱۸۰
،، اردو ،، ۲۱۰

آئیڈیل
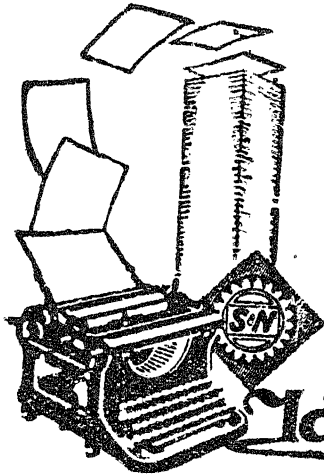
اسی کارخانے کی بڑی مشین۔ دفتر کے لئے اسے
رکھئے اور اپنے دفتر کی کارکردگی میں ۵۰ فیصدی
اضافہ کر لیجئے۔
قیمت انگریزی مبلغ ۳۵۰
،، اردو ،، [illegible]

Seidel & Numan (India)
Bruse Street, Fort
Bombay.

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے ناآشنا تھے آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشئی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں، پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشئی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اسکو لیجانیکی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت حسن شباب اور توسیع حیات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گٹھیا، ورم۔ درد، پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بے مثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے۔ جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشئی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہلانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زندگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۸ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی۔

جلد ۱۷ — بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء — نمبر ۴

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ "جامعہ" قرولباغ سے شائع کیا۔

مسیح الملک مرحوم کا پہلا سفر یورپ

ہم جناب قاضی عبدالغفار صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ جو جدید کتاب انھوں نے مسیح الملک مرحوم کے حالات زندگی میں لکھی ہے اس کا ایک ٹکڑا رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت کیا۔ کتاب کا پہلا مسودہ تیار ہے اور اب قاضی صاحب اس پر نظر ثانی فرما رہے ہیں۔ خدا کرے یہ جلد سے جلد شائع ہو اور سیرت اجمل کے مشتاقوں کی دلی آرزو بر آئے۔ امید ہے کہ مصنف اس کے کچھ اور حصے بھی ہمارے رسالے کو عنایت فرمائیں گے۔

پہلی دفعہ جب مئی ۱۹۱۱ء میں حکیم صاحب نے سفر یورپ کا ارادہ کیا تو کرزن گزٹ نے بہت حامیانہ طریقے پر مضحکہ اڑایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ حکیم صاحب محض نواب صاحب رامپور کے ہمرکاب ہو کر یورپ کی سیر کرنے جاتے ہیں، حکیم صاحب نے اخبار مشرق میں ایک خط شائع کرایا جس میں اپنے سفر کے اغراض کو بہ وضاحت بیان فرمایا۔ انھوں نے لکھا کہ "میرے ولایت جانے کے مندرجہ ذیل چند وجوہ ہیں، جن کے باعث مجھے مجبوراً یہ سفر اختیار کرنا پڑا ہے۔ غالباً آپ بھی ان وجوہ پر غور کرتے ہوئے اسے مصلحت آمیز تصور فرمائیں گے:۔

(۱) میرے اور ہز ہائینس نواب صاحب رام پور کے تعلقات مجھے اس امر پر مجبور کرتے ہیں کہ اس سفر میں ان کا ساتھ دوں۔

(۲) ایک عرصے تک قومی کاموں میں حد درجے کی مشغولیت کے بعد مجھے اپنی صحت قائم رکھنے اور قوائے دماغی کو آرام دینے کے لئے اس سفر کا اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

(۳) اس سفر کے ساتھ چند طبی امیدیں بھی وابستہ ہیں۔

لکھنؤ جانے سے پہلے میں نے تار کے ذریعے سے آپ کو بلایا تھا مگر افسوس ہے کہ آپ کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکے۔

اگرچہ وہاں اس کے متعلق ابھی بہت سی رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں تاہم امید ہے کہ انشاء اللہ کانفرنس کا دوسرا اجلاس وہیں ہوگا۔"

درحقیقت سفر کی سب سے بڑی غرض طبی تحریک سے وابستہ تھی، اور جب نواب صاحب رام پور نے جو دربار تاجپوشی کی شرکت کے لئے لندن جانے والے تھے بعض وجوہ سے اپنا قصد ملتوی کر دیا تو حکیم صاحب نے تنہا جانے کا ارادہ کر لیا اور باوجودیکہ وہ نہ یورپ کی زبانوں سے آشنا تھے نہ کوئی دوست اس سفر میں ساتھ تھا، اپنی دھن میں آمادۂ سفر ہو گئے، چنانچہ "خدا حافظ" کے عنوان سے ان کی جو تحریر اخبارات میں شائع ہوئی اُس سے ان کے اس ذوق شوق کا پتہ چلتا ہے جو طب یونانی کی ترقی کے متعلق ان کا ہم سفر تھا۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ:"میں چار مہینے کے لئے ولایت جا رہا ہوں۔ ۱۰ مئی ۱۹۱۱ء کو دہلی سے روانہ ہو کر رام پور ہوتا ہوا ۲۰ مئی کو جہاز آرابیہ پر انگلستان روانہ ہو جاؤنگا۔ میرے اور پبلک کے جو تعلقات ہیں ان کے لحاظ سے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ ان مہینوں میں جن لوگوں کو مجھ سے دہلی آکر علاج کرانے یا بذریعہ خط وکتابت طبی مشورہ حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے ان کے آرام کے لئے میں ذیل کا انتظام کر دوں۔ مطب میں نے اپنے بھائی حکیم محمد احمد سعید خانصاحب اور اپنے بھتیجے حکیم محمد احمد خاں کو سپرد کیا ہے جو خدا کے فضل سے اس خدمت کے ہر طرح اہل ہیں بیماروں کے خطوط بدستور دہلی آتے رہیں گے اور حکیم محمد احمد خاں کا یہ بھی کام ہوگا کہ وہ ان خطوط کو پڑھیں اور جیسا کہ میں جواب دیا کرتا ہوں التزام کے ساتھ ان کے جواب دیتے رہیں۔ نیز کے خطوط ہر ہفتے مجھے ولایت میں مل جایا کریں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس انتظام سے پبلک کو آرام پہنچے گا اور میرے برادرزادہ حکیم محمد احمد خاں کی خدمات خدا اور خلق کے نزدیک پسندیدہ ہوں گی۔ چار مہینے تک میرے ہندوستان میں موجود نہ ہونے سے میرے ہم وطنوں کو یقین ہے کہ تکلیف نہ ہوگی۔ یہ سفر میں نے تین وجوہ سے اختیار کیا ہے، ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ میں طب یونانی اور ویدک کی حفاظت اور ترقی کے لئے کچھ کام نئے چاہتا ہوں جو اس سفر کے بعد ہی اچھی طرح انجام پا سکتے ہیں۔ اب میں اپنے ہم وطنوں سے خدا حافظ کہتا ہوں اور چار مہینے کے لئے اُن سے رخصت ہوتا ہوں (نوٹ) ۔ مدرسہ طبیہ، مدرسہ طبیہ زنانہ

وشفا خانہ اور ہندوستانی دوا خانہ دہلی (کہ جس کا نفع ان انسٹی ٹیوشنوں کے لیے ہے) کا انتظام انجمن طبیہ کر رہی ہے اور یہ کام اچھے ہاتوں میں ہیں۔ طبی کانفرنس کا کام امید ہے کہ میری غیبت میں بھی برابر جاری رہے گا۔ اور کانفرنس اپنے دوسرے سال میں ملک کی بہتر خدمات ادا کر سکے گی۔"

جب تک اجمل خاں سیاسی میدان میں نہ آئے' ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ طبی تحریک تھی اور ان کا سفر و حضر کبھی اس فکر سے خالی نہ تھا۔ ۱۰ اپریل کو دہلی سے روانگی کا قصد تھا لیکن اسی زمانے میں سخت آشوب چشم میں مبتلا ہو گئے اور رہ گئے۔ اپریل کے ۱۵ کو دہلی سے روانہ ہو سکے اور ۲۰ مئی کو جہاز ایکسپٹ پر سوار ہو گئے۔

یورپ میں وہ کہاں کہاں گئے اور اپنے طبی مقاصد کو کہاں تک پورا کر سکے اس کی تفصیل پہلے خود ان ہی کی زبان سے سن لیجئے۔ واپسی سفر کے بعد ایک مضمون حکیم صاحب نے طبیہ کانفرنس میں پڑھا تھا اور اس کے اقتباسات میں اپنے سفر کے محض ضروری حالات بیان فرمائے تھے۔

"میں نے یورپ کے ملکوں سے انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا اور ٹرکی کی سیاحت کی اور ان ملکوں میں طبی کالج، شفاخانے، کتب خانے، آلات جراحی اور تشریحی سامان کے کارخانے اور دکانیں دیکھیں۔ میڈیکل کالجوں کے متعلق میں سوائے اس کے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ ان کی عمارتیں عالیشان ہیں اور ان میں ہر ایک مضمون پڑھانے کے لئے مخصوص کمرے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ایک کالج کے ساتھ نعشوں کا انتظام ہے جہاں خاص خاص اوقات میں طلبہ کو ان کے تشریحی سبق کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ اکثر کالجوں کے ساتھ ایک ایسی عمارت بھی ہے۔ جہاں امراض کے متعلق سیکڑوں ایسی مفید چیزیں رکھی ہیں جنھیں دیکھ کر ہر ایک شخص بہت سی اچھی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ بہت سے امراض کے حالات مومی تماثیل کے ذریعے سے دکھائے گئے ہیں۔ بہت سے مختلف وزن کی پتھریاں ایک لائن میں رکھی ہوئی ہیں۔ بہت سے امراض کی حالت فوٹوگراف یا انھیں مومی تماثیل کے ذریعے سے جراحی سے پہلے دکھائی گئی ہے' پھر جراحی کے بعد جو حالت پیدا ہوئی وہ دکھائی گئی ہے۔ اسی طرح بلا مبالغہ سیکڑوں حالتیں مختلف امراض کی اس

حصۂ عمارت میں معلوم ہوتی ہیں جنھیں تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اس وقت میرے لئے مشکل ہے۔ آلاتِ جراحی کے کارخانوں میں جب میں گیا تو وہاں دیکھا کہ سیکڑوں قسم کے آلات کو ان لوگوں نے کتنا صاف ستھرا کرکے دنیا سے روشناس کرایا ہے اور کس طرح وہ ہر ایک چیز کی درستی اور ترقی میں منہمک نظر آتے ہیں۔

لندن کے ایک کارخانے میں وہ آلاتِ جراحی بھی دیکھے جو آگرہ میڈیکل کالج، لاہور میڈیکل کالج کے ہاسپٹلوں سے اس میں درست کرنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ پیرس میں میں نے ایک بڑی دوکان تشریحی سامان کی دیکھی جہاں مومی تماثیل کے ذریعے سے انسانی جسم کی ساخت تقریباً اصل حالت میں دکھائی گئی ہے اور اکثر امراض کو بھی انھیں تماثیل کے ذریعے سے دکھایا ہے۔ اس قسم کی دوکان میں نے دوسری جگہ نہیں دیکھی جب تک میں اس دوکان میں رہا میرا برابر یہی دل چاہا کہ میں یہاں سے نہ نکلوں۔ اس دکان میں حوامل کی ابتدا سے لے کر جنین کے مکمل ہونے تک کی حالت اس خوبی کے ساتھ دکھائی تھی کہ بے اختیار صنّاع کی نازک خیالی اور ہاتھ کی صفائی پر آفریں کہنے کو دل چاہتا تھا۔ ان چیزوں کے علاوہ میں نے یورپ میں یہ بھی کوشش کی کہ وہاں کے دواسازی کے کارخانوں کو دیکھوں اور یہ معلوم کروں کہ مختلف قسم کی دوائیں کن آلات کے ذریعے سے بنائی جاتی ہیں۔ اس غرض کے پورا کرنے کے لئے میں نے سر چارلس ہولاک سے (جو شاہی ڈاکٹروں میں سے ہیں) ایک انٹروڈکشن لیٹر (تعارف کا خط) ایک مشہور فرم کے نام لیا جس کے منیجر نے خط کو پڑھکر یہ جواب دیا کہ ہماری تجارتی رازداری کے خلاف ہوگا اگر ہم بنتی ہوئی دوائیں دکھائیں گے۔ تقریباً یہی عذر ہر جگہ پیش کیا گیا جس سے مجھے مایوسی ہوئی اور میں اس خاص صیغے سے کوئی واقفیت حاصل نہ کرسکا۔

سب سے زیادہ یورپ میں دیکھنے کی چیز وہاں کے اعلیٰ شفاخانے ہیں۔ آپ یہاں بیٹھ کر اندازہ نہیں کرسکتے کہ ان شفاخانوں نے کہاں تک ترقی کی ہے اور اب وہ بڑھتے بڑھتے کس درجے تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ یورپ کے کسی اچھے شفاخانے کا حال بیان کرنے

کے لئے پوری ایک کتاب لکھنے کی ضرورت ہوگی تب آپ اس کی تصویر سننے والوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں
میں نے سب سے پہلے لندن کے شفاخانے دیکھے لیکن پیرس کے ہاسپٹل "دی لاپے ٹیئے"
کو دیکھنے کے بعد میں یہ سمجھا کہ غالباً تمام یورپ میں اس سے بہتر دوسرا شفاخانہ نہیں ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا
قصبہ ہے۔ اس کی عمارت نہایت صاف اور ستھری ہے۔ ایک بہت بڑا انجن اس شفاخانے کے
مختلف کاموں کے لئے ایک طرف لگا ہوا ہے۔ سیکڑوں آدمیوں کے لئے ایک عالیشان باورچی خانہ
دوسری طرف بنا ہوا ہے جس پر کئی لاکھ فرانک صرف ہوئے ہوں گے۔ بیماروں کے رہنے کے لئے مختلف
امراض کے لحاظ سے جدا جدا خوبصورت عالیشان وارڈ بنے ہوئے ہیں جنھیں دیکھ کر محلات کا شبہ ہوتا ہے۔
ان بیماروں کے لئے جو بستروں سے اٹھ سکتے ہیں وارڈ کے قریب ایک صاف اور ستھری گملوں سے
آراستہ نشستگاہ بنی ہوئی ہے جہاں وہ باہم بیٹھ کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہاسپٹل کے اسٹاف کے لئے خوبصورت
مکان بنے ہوئے ہیں جو اپنی خوشنمائی کی وجہ سے اس ہاسپٹل کی زینت کو دوبالا کر رہے ہیں۔ اس ہاسپٹل
میں جب میں آپریشن روم دیکھنے گیا تو میں نے ایک برابر کے کمرے کو دریافت کیا کہ یہ کس غرض سے
بنایا گیا ہے۔ اس کا جواب مجھے یہ دیا گیا کہ حال ہی میں جرمنی میں آگ سے جلے ہوئے اشخاص کے لئے
ایک باتھ (حمام) ایجاد کیا گیا ہے جو تجربے سے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ ہم نے اس طریقۂ علاج کو
بھی اس ہاسپٹل میں داخل کر لیا ہے اور اس کے علاوہ حال کے جتنے نئے نئے علاج کے طریقے ہیں
وہ سب اس ہاسپٹل میں لے لئے ہیں۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ فرانس اور جرمنی میں سیاسی اور قومی کشمکش کس حد تک پہنچی ہوئی ہے
اور ان کی باہمی عداوت کس درجے تک ترقی کر چکی ہے لیکن اس قومی مخالفت اور منافرت نے فرانس
کو جرمنی کی ایک اچھی چیز لینے سے نہیں روکا۔ وہاں یہ حالت ہے اور یہاں آپس کے بیکار قصے ہماری
مجالس کے لئے باعث زینت سمجھے گئے ہیں۔ غرض اس ہاسپٹل کو دیکھ کر میرے دل پر خاص اثر ہوا تھا،
لیکن جب میں برلن میں پہنچا اور ڈاکٹر (زخا) سے ملا جو برلن یونیورسٹی کے فادر خیال کئے جاتے ہیں،
تو انھوں نے مجھ سے کہا ممکن ہے تم برلن کے ورشاؤ کرنکن ہاؤس کو دنیا کے بڑے سے بڑے شفاخانوں

میں سے ایک پاؤگے اور ممکن ہے تم اُسے دیکھنے کے بعد پیرس کے ہاسپٹل پر ترجیح دوگے۔ دوسرے روز
میں اس شفاخانے کو دیکھنے گیا جو واقعی جرمنی کے لئے سرمایۂ ناز ہے۔ جس ڈاکٹر کے چارج میں یہ
شفاخانہ تھا اس نے بہت مہربانی کے ساتھ مجھے اس کے دکھانے میں مدد دی۔ واقعی یہ شفاخانہ
پیرس کے شفاخانے سے بھی جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے کئی درجے بہتر تھا۔ اس کی لاگت دو کروڑ
مارک کی تھی۔ اس کے حسن انتظام کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

یہ شفاخانہ بہت بڑے رقبۂ زمین پر واقع ہے۔ اس کی مختلف اور پھیلی ہوئی عمارتوں تک پہنچنے
کے لئے اچھی وسیع اور صاف سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ کمزور بیمار اگر اپنے وارڈ سے حمام لینے یا کسی اور
ضرورت کے لئے نکلتے ہیں تو ہاتھ کی ایسی خوبصورت گاڑیوں کے ذریعے سے نکلتے ہیں جو ایک طرف
ان کے بستروں تک پہنچتی ہیں تو دوسری طرف ٹھیک اس مقام تک پہنچ جاتی ہیں جہاں اُنھیں جانا ہو۔
اس طرح ایک کمزور بیمار کو گاڑی سے اُترنے اور ایک قدم بھی پیدل چلنے کی تکلیف نہیں ہوتی۔

میں نے اس شفاخانے کے اس حصے کو بھی دیکھا جس میں مختلف قسم کے حمام ہیں۔ گرم اور ٹھنڈے
پانی کے خوشنما حماموں کے علاوہ بھاپ کے حمام، بجلی کے حمام جہاں بیماروں کو ان گاڑیوں پر
لایا جاتا ہے جن کا ذکر ابھی میں نے کیا ہے۔

اس حصے کے علاوہ ایک اور اہم اور بالکل نیا حصہ اس شفاخانے میں دیکھا جو یورپ کے
دوسرے شفاخانوں میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس میں مختلف قسم کی ریاضت صرف مشینوں کے
ذریعے سے ہوتی ہے جو دخانی طاقت سے چلتی رہتی ہیں۔ اگر کسی کا معدہ اور جگر کمزور ہے (جس
کے لئے مشہور ہے کہ اونٹ کی سواری مفید ہوتی ہے) تو اُس کے لئے ایک مشین لگائی گئی ہے جس پر
بیمار ایک کاٹھی کے ذریعے سے بیٹھ جاتا ہے اور جب وہ حرکت کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی
اونٹ پر سفر کر رہا ہے۔ اسی حال میں ایک ایسی مشین بھی دیکھی جو دمہ کے لئے مفید ہے اور دمہ والے
کے سانس کو باقاعدہ بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے علاوہ پندرہ یا بیس قسم کی مشینیں اور بھی
ہیں جو چند قسم کی ریاضتوں کے لئے مفید ثابت ہوئی ہیں۔ ایک مشین کے ذریعے سے کمزور ہاتھ

اور کمزور پاؤں کو حرکت دلا کر قوت پہنچائی جاتی ہے۔ اس ہاسپٹل کے باورچی خانے کا ڈپارٹمنٹ اس قدر وسیع ہے کہ تین ہزار آدمیوں کے لئے اس میں روزانہ کھانا تیار ہوا کرتا ہے۔ بیماروں کے کپڑے، میزوں کی چادریں، تولیے اور بستروں کی چادریں غرض ان تین ہزار آدمیوں کے متعلق کپڑے جہاں تک مجھے یاد ہے روزانہ ایک جداگانہ مکان میں مشین کے ذریعے سے دھلتے ہیں۔ یہ حصہ عمارت بہت وسیع ہے اور تمام و کمال سفید چمکدار مسالے کی اینٹوں سے بنا ہوا ہے۔ جس قدر روپیہ اس حصۂ عمارت پر صرف ہوا ہے اس سے ہندوستان میں ایک ممتاز کالج تعمیر ہو سکتا ہے۔ بیماروں کو اس شفا خانے میں اس قدر آرام ملتا ہے کہ ایک تندرست آدمی کا بھی ممکن ہے کہ مریض کو دل چاہے۔ غرض اس شفا خانے میں وہ تمام چیزیں برتری کے ساتھ موجود ہیں جو پیرس کے نئے اور پرانے شفا خانے میں دیکھی جاتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ہیں جو صرف اسی شفا خانے کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اس شفا خانے میں بہت سے غریب بیمار بغیر کسی خرچ کے اس طرح علاج کراتے ہیں کہ وہ اپنی مزدوری میں سے ایک مارک ہفتہ وار کسی بنک میں داخل کرتے رہتے ہیں اور جب وہ بیمار پڑتے ہیں تو اس بنک کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ان کے تمام علاج کے مصارف وہ اپنی طرف سے ادا کرے خواہ علاج کا سلسلہ مہینوں تک جاری رہے۔ اس طریقے سے غریب طبقۂ رعایا کو علاج میں بہت سہولت ہوتی ہے اور ان کا علاج ایسا ہوتا ہے کہ امرا اپنے گھر پر بہت سا روپیہ صرف کر کے بھی ایسا علاج نہیں کرا سکتے۔

مجھے وقت ملا تو میں کبھی ان تمام چیزوں کو جو یورپ کی طبی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں اور جنھیں میں نے دیکھا ہے جداگانہ تفصیل کے ساتھ لکھوں گا لیکن میں نے محض اجمالی طور پر بیان اس لئے تذکرہ کیا ہے کہ ہم جد و جہد اور اس کے اچھے نتائج سے سبق لے کر خود بھی سعی کے لیے تیار ہو جائیں تاکہ اس کے بہتر نتائج چند برسوں کے بعد ہندوستان کی سطح پر متحرک نظر آنے لگیں۔"

لندن میں تاجپوشی کے موقع پر حکیم صاحب بھی ویسٹ منسٹر ایبی میں مدعو کئے گئے اور اُس زمانے کے لحاظ سے یہ ایک بڑی عزت تھی، چنانچہ ہندوستان کے اخبارات میں نہایت خوشی اور

فخر کے ساتھ اس واقعے کا ذکر کیا گیا۔ یا وہ زمانہ تھا یا یہ کہ اب درباروں کی شرکت سے زیادہ جلیانوں میں جانا باعث صد فخر و افتخار سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ "تفاوت راہ" قابل غور ہے۔ البتہ جیسا کہ اظہار فخر و مباہات کے بعد اس زمانے میں مجلۂ طبیہ میں لکھا گیا تھا اجمل خاں پہلے یونانی طبیب تھے جنھوں نے ممالک یورپ میں جا کر اپنے علم و فن کی خدمت انجام دی اور اس حیثیت سے وہ لندن، پیرس و برلن وغیرہ میں جس اعزاز کے مستحق سمجھے گئے وہ بلاشبہ اب بھی ہندوستانیوں کے لئے موجب افتخار ہے۔ مجلۂ طبیہ جولائی ۱۹۱۱ء میں لکھتا ہے کہ:۔

"وہ پہلے شخص ہیں جن کو یورپ کی سرزمین میں ایشیا کی قدیم طبوں کی زندگی کے لئے لوگوں نے کام کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جن کا بحیثیت اس کے کہ وہ ہندوستان کے طبیب اعظم ہیں یورپ میں جا بجا خیر مقدم ہوا اور انھوں نے نہ صرف رسمی ملاقاتوں بلکہ طبی مشوروں سے جا بجا یورپ والوں پر طب اسلامی اور طب ویدک کی قدر و وقعت کا حال آئینہ کر دیا۔ وہ پہلے فاضل طبیب ہندوستانی ہیں جن کو یورپ میں اتنی بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ بڑے بڑے اُمرا، علما ان سے ملاقات کرنے اُن کی فرودگاہ پر آتے رہے۔ صدہا لوگوں سے اُن کی ملاقاتیں اور گفتگوئیں ہوئیں۔ گورنمنٹ نے اُن کو اعزاز جدید بخشا اور ان کی شہرتیں بلاد مغرب میں نئے ساز و سامان کے ساتھ ہوئیں باوجودیکہ ان کو اتنی کامیابیاں حاصل ہوئیں وہ پہلے ہندوستانی ہیں جن کو یورپ میں جا کر اس بات سے اجتناب رہا کہ اخبارات کے قائم مقام ان سے ملیں اور اخباروں میں ان کے حالات چھپیں۔ اس امر میں انھوں نے یہاں تک انکسار فرمایا کہ خطوط میں اپنے احباب کو اپنی خیریت کے سوا ایک حرف کچھ ادر نہ لکھا اور یورپ کے جن باوقار اخبارات نے اپنے ادائے فرض کے لئے ان کے حالات شائع کئے، جن سے ایام سفر کے واقعات کی تفصیل ان احباب کو معلوم ہوتی ہے جو اس کے بے حد مشتاق رہتے ہیں

وہ اخبارات تک انھوں نے ہندوستان نہ بھیجے۔"

اس سفر میں ان کی صحت میں بہت ترقی کی اور ایک خاص واقعہ جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ دوران قیام لندن میں انھوں نے اپنی آیندہ سیاسی زندگی کے دو بہت ہی عزیز دوست پیدا کر لئے۔ جو محبتیں آیندہ سیاسی ہنگاموں کے گرم و سرد میں ان کی ہمدم و ہمساز ہونے والی تھیں اُن میں سے دو کا آغاز لندن میں ہوا جب وہ پہلی مرتبہ چیرنگ کراس ہسپتال دیکھنے گئے جس میں ڈاکٹر انصاری اُس وقت بحیثیت ہاؤس سرجن کے کام کرتے تھے اور ان کی ملاقات صاحب موصوف سے ہوئی۔ کون جانتا تھا کہ یہ سرسری ملاقات آئندہ سچی دوستی اور خالص محبت میں منتقل ہو کر تاریخ ہندوستان کے صفحات پر لکھی جائے گی۔ اُس وقت حکیم صاحب سرکار کے درباری اور ڈاکٹر صاحب اپنے فن کے علاوہ دنیا کی تمام دوسری چیزوں سے بے تعلق تھے۔ ایک بکسیر مشرقی علم و فن اور تہذیب و تمدن کا حامی اور پابند تھا اور دوسرا مغرب کی آب و ہوا میں رہ کر مغربی علوم و معاشرت کا دلدادہ، ایک کی نظر ماضی پر تھی اور دوسرے کی حال پر مستقبل سے دونوں کم و بیش بے پروا تھے۔ اس حالت میں یہ دو بظاہر متضاد اور روحانی حیثیت سے یک رنگ ہستیاں ایک دوسرے سے ملاقی ہوئیں۔ چیرنگ کراس ہسپتال ہی میں طب مشرقی کے لئے ایک سخت امتحان کا موقع پیش آیا جو ڈاکٹر انصاری ہی کی زبان سے بیان ہوتا ہے :۔

"حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات لندن میں جب میں چیرنگ کراس ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھا بوساطت ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بغرض سیر و سیاحت لندن تشریف لے گئے تھے، ان کو لندن کے مشہور ہسپتالوں کے معائنہ کا شوق تھا۔ چیرنگ کراس ہسپتال کا معائنہ نہایت گہری نگاہ، بہت چھان بین اور ہر شعبہ کی تحقیقات کے ساتھ میرے ہمراہ کیا۔ سب سے پہلی چیز جو اُن کے متعلق مجھ کو محسوس ہوئی وہ یہ کہ ان کی نگاہ نہایت نکتہ سنج اور عمیق تھی اور ہر بنیادی اور فروعی چیز پر واقفیت اور تحقیقات کئے بغیر وہ نہیں رہتے تھے۔ ہسپتال کے ہر شعبے کو انھوں نے اسی طریقے پر ملاحظہ کیا۔ مسٹر اسٹینلے بائیڈ چیرنگ کراس کے مشہور اور سینیئر سرجن تھے اور

بادشاہ کے بھی وہ آنریری سرجن تھے۔ تشخیص امراض اور فن سرجری میں لندن میں یہ مسلم استاد سمجھے جاتے تھے۔ میں انھیں کا ہاؤس سرجن تھا۔ حکیم صاحب سے میں نے ان کی ملاقات کرائی۔ انھوں نے حکیم صاحب کو ایک روز ہسپتال میں اپنے کلینکل سرجری کلاس میں جو کہ ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو چیرنگ کراس ہسپتال کے کسی ایک وارڈ میں طلبا کو عملی تعلیم دینے کے لئے ہوا کرتا تھا دعوت دی۔ ایک مریض کی تشخیص مرض کے متعلق مسٹر بائیڈ طلبا کو سمجھا رہے تھے۔ حکیم صاحب سے بھی انھوں نے مریض کو دیکھنے اور تشخیص کرنے کی خواہش کی۔ بعد معائنہ حکیم صاحب نے یہ تشخیص کی کہ مریض کی آنتوں کے ابتدائی حصے میں کہنہ زخم ہے جس کے باعث درد کی تکلیف، یرقان اور حرارت ہے۔ مسٹر بائیڈ کی رائے میں وہ پت کی تھیلی کا ورم تھا۔ اُنھوں نے حکیم صاحب کو نہایت خلق اور اصرار سے دوسرے روز صبح کو اس مریض کے آپریشن کے وقت بلایا اور ہنس کر یہ کہا کہ طب یونانی اور انگریزی طب کا امتحان ہے۔ آپریشن سے پتہ چل جائے گا کہ کونسی طب صحیح ہے۔ مجھ کو کسی قدر اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری دیسی طب کی بے عزتی ہو جائے۔ آپریشن کے وقت میں کسی قدر تشویش میں تھا لیکن شکم چاک کرنے پر حکیم صاحب کی تشخیص صحیح نکلی اور مسٹر بائیڈ نے نہایت فیاضی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ حکیم صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دی اور اس خوشی کے منانے کے لئے حکیم صاحب کو اور مجھ کو اپنے گھر پر ڈنر کے لئے اور اس کے بعد اپنے ہمراہ تھیٹر جانے کی دعوت دی۔ مسٹر بائیڈ کی بیوی لندن کے مشہور زنانہ ہسپتال کی سینیر سرجن تھیں۔ اُن سے حکیم صاحب کا تعارف کراتے وقت یہ کہا کہ ڈاکٹر انصاری کے ہموطن پہلوان جنھوں نے مجھے سر جیکل کشتی میں شکست دی، وہ یہ صاحب ہیں۔ حکیم صاحب اور مجھ پر مسٹر بائیڈ کی اس اس علم شناسی، قدر دانی، اعلیٰ حوصلگی اور خوش خلقی کا بہت اثر ہوا۔"

دوسرے آئندہ بننے والے عزیز دوست خواجہ عبدالمجید صاحب تھے جو اس زمانے میں لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حکیم صاحب کے سفر کے حالات خواجہ صاحب ہی کے ذریعے سے اس زمانے کے اخبارات میں شائع ہوتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ دوران قیام لندن میں ان سے اکثر

ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن وہ ملاقاتیں ایسی تھیں جیسے ایک معزز اور ممتاز ہم وطن سے ایک نوجوان طالب علم شرف نیاز حاصل کرتا ہے۔ یہ تو قضا و قدر ہی کو معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کا یہ نوجوان شریف منزل کی صحبتوں میں تحریک ترک موالات کے ہنگاموں میں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک میں اجمل خاں کا دست راست ہوگا۔ جن لوگوں نے اجمل خاں کو خواجہ عبدالمجید سے گلے ملتے اور ہنستے بولتے دیکھا ہے وہی بتا سکتے ہیں کہ اس بوڑھے اور اس جوان کے درمیان رابطۂ محبت کس قدر گہرا اور استوار تھا۔ اپنے سیاسی مستقبل کے لئے یہ دو بڑے دوست اجمل خاں نے لندن میں پیدا کئے۔

ممالک یورپ کے سفر سے واپس ہوتے ہوئے حکیم صاحب قسطنطنیہ تشریف لے گئے، اسی زمانے میں بیگم صاحب بھوپال (نواب سلطان جہاں بیگم) بھی یورپ کے سفر سے فارغ ہو کر قسطنطنیہ تشریف لائی تھیں۔ اس سفر میں زیادہ تر حکیم صاحب کا اور بیگم صاحبہ کا ساتھ رہا اور ارادہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ کے بعد عراق و شام و عرب کا سفر ہوگا اور غالباً یہ بھی طے تھا کہ سرکار عالیہ کے ساتھ ہی سفر کیا جائیگا لیکن دفعۃً دہلی سے ایک تار پہنچا کہ مکان پر چوری ہوگئی اور اس خبر کے پہنچتے ہی حکیم صاحب کو براہ راست ہندوستان واپس آنا پڑا۔ چلتے وقت انھوں نے اپنے قصد کی اطلاع سرکار عالیہ کو دی۔ انھوں نے ان کے خط کا جو جواب لکھا اس کی نقل ہدیۂ ناظرین ہے:-

"جناب حکیم صاحب! مجھ کو یہ معلوم ہو کر کہ آپ کی چوری ہوگئی سخت افسوس ہوا۔ آپ کی ضروریات خانگی کی وجہ سے میں آپ کو روک نہیں سکتی ورنہ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ آپ کو مدینہ منورہ اور بیت المقدس میں دیکھوں۔ آپ کی نہایت مشکور رہوں کہ آپ نے ہمارے ساتھ ہمدردیٔ اسلام کو ثابت کیا۔

میں آپ کو دوبارہ یقین دلاتی ہوں کہ آپ نے اس سفر میں مجھ کو بہت ہی ممنون و مشکور فرمایا۔ آخر میں یہ دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ ایسے اسباب مہیا کر دے کہ آپ مدینہ شریف اور بیت المقدس میں تشریف لے جائیں تاکہ وہاں بھی آپ

ہم سب کو دیکھ سکیں۔

سلطان جہاں "

محمد اکرام صاحب بیرسٹر جو لندن میں بہت زیادہ حکیم صاحب کی صحبت میں رہے تھے بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حکیم صاحب کسی تھیٹر میں تماشہ دیکھنے تشریف لے گئے، لیکن وہاں کے اوضاع واطوار اور تھیٹر کی بے حجابیوں سے اس درجہ متنفر ہوئے کہ پھر کبھی کسی تماشے میں جانا پسند نہ فرمایا۔

عراق وعرب وشام ومصر کے سفر کو ملتوی فرما کر حکیم صاحب قسطنطنیہ سے براہ راست ہندوستان واپس تشریف لائے اور اگست میں دہلی پہونچ گئے۔

غیب کی باتیں اور شعر اثیم ❖ ہاں! یہ تائید آسمانی ہے

شاعری

(۱)

علم ہے بحر، شاعری گوہر | علم گوہر، یہ آب گوہر ہے
روئے مقصود دیکھتے ہیں اثیم | علم آئینہ ہے، یہ جوہر ہے

(۲)

شاعری مہر علم کی ہے ضیا | وہ فلک ہے، یہ مہر انور ہے
علم محبوب ہے جہاں کا اثیم | شاہد علم کا یہ زیور ہے

(۳)

شاعری کیا ہے؟ جان قالب علم | کچھ عجب دلنواز و دلبر ہے
جسم میں پھونکتی ہے روح اثیم | سچ ہے با جاں بخش و روح پرور ہے

(۴)

شاعری ہی سے ہے بقائے زباں | بحر تحقیق کا یہ گوہر ہے
ہے یہی آخر العلوم اثیم | فہم و عقل و خرد کا جوہر ہے

(۵)

"شاعری ساحری ہے" کہتے ہیں | ہے فسوں گر بھی یہ فسون طراز
دیتی ہے غیب کی خبر یہ اثیم | ہے حقیقت میں شاعری اعجاز

(۶)

ترجمان حدیث و آیت ہیں | ان کا بڑھتا اسی سے ہے ایمان
قول ان کا نہیں ہے لغو اثیم | شعرا ہیں تلامذ الرحمٰن

(۷)

قدر انسان کی بڑھاتی ہے   اس سے بنتا ہے آدمی انسان
اہلِ معنیٰ کا قول ہے یہ اثیمؔ   علم ہے جسم شاعری ہے جان

(۸)

سیر ہوتے نہیں حریصِ سخن   شاعری بھی عجیب نعمت ہے
نہیں ہوتی زبان پر محسوس   اے اثیمؔ اس کی دلنشیں لذت ہے

(۹)

شاعری کیا ہے؟ برگزیدۂ علم   رنگِ روئے گلِ دمیدۂ علم
نافۂ آہوئے رمیدۂ علم   نکہتِ مشک و نورِ دیدۂ علم

(۱۰)

قدر کرتے ہیں اس کی اہلِ کمال   شاعری جسمِ علم کی ہے روح
کشف ہوتا ہے اے اثیمؔ اس سے   کاملوں کے لئے ہے وجہِ فتوح

(۱۱)

شاعری باغِ علم کا ہے وہ پھول   جس کی بو سے دماغ ہے تازہ
کیا حسیں ہے عروسِ علم اثیمؔ   اس دلھن کے ہے رخ کا یہ غازہ

(۱۲)

کبھی بے علم کو نہیں آتی   شاعری بھی ہے علم سے ممتاز
سرِ حق کرتی ہے عیاں یہ اثیمؔ   کھول دیتی ہے آسمانی راز

(۱۳)

شاعری کرتی ہے عیاں جو اثیمؔ   روح سے ہے تعلق اشیا کا
روح کو اس سے ہوتی ہے تفریح   یہ کھلونا خدا کا ہے گویا

غزل

(از حضرت ثاقب لکھنوی مدظلہ)

یہ اک معمورۂ غم ہے لہو کا ذکر ہی کیا ہے
مرا دل چیر کر دیکھو تمنا ہی تمنا ہے

فروغ حسن آنکھوں میں ہے پھر چھپنے سے کیا حاصل
ذرا سی اوٹ باقی ہے نہ حائل ہے نہ پردا ہے

تڑپتا ہوں شب غم میں جو وہ آئیں تو سمجھا دوں
کوئی یہ کہہ کے لے آئے چلو دیکھیں تماشا ہے

نہ ہوتا کچھ اثر دل پہ محبت کا تو پتھر تھا
جسے بیمار سمجھے ہو وہ ہر حالت میں اچھا ہے

کرو شبہہ نہ میری ناتوانی پر بناوٹ کا
اسی صورت پڑا ہوں میں کہ گریاں درد اٹھا ہے

چلے آنا وہیں جس جا ہر اک دم خاک اڑتی ہے
تمہیں معلوم کیا ہم بے نشانوں کا نشاں کیا ہے

قفس اور آشیاں کا فرق اے صیاد سن مجھ سے
یہ تیری دستکاری ہے اسے میں نے بنایا ہے

زمانے کی بھری محفل کی آبادی مٹانے کو
بہت کچھ حسن نے اس آفت جاں کو سنوارا ہے

یہ دل کی رازداری ہے کہ زور ناتوانی ہے
دھواں اٹھتا نہیں ہر چند اک مدت سے جلتا ہے

خراب بادۂ الفت ہے مجھ سا کون اے ساقی
سوا ہے کیف مستی اور پھر مے کا تقاضا ہے

وہی ثاقب جواب بھولا ہوا ہے یاد تھا کل تک
جسے ہم لوگ سنتے ہیں جسے تم نے بھی دیکھا ہے
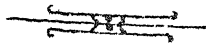
انکار حدیث

ستمبر کے جامعہ میں مولانا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کا ایک مضمون "منکرین حدیث" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، میں اپنے محترم پروفیسر سید عابد حسین صاحب مدیر جامعہ کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھے موقع مرحمت فرمایا کہ میں بھی اس موضوع پر کچھ عرض کر سکوں۔

لیکن قبل اس کے کہ اصل بحث پر گفتگو کا آغاز کیا جائے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں مخاطب محترم مقالہ نگار نہیں ہیں، بلکہ وہ "منکرین حدیث" ہیں، جن کی موصوف نے ترجمانی فرمائی ہے۔ منکرین حدیث کا خیال ہے کہ

"جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی ہے جو اس کی دینی حیثیت کی منکر رہی۔"

سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس غلط فہمی کی تصحیح کر دی جائے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ

لم اسمع احدا نسبہ الناس او نسب نفسہ الی علم یخالف فی ان فرض اللہ عزوجل اتباع امر رسول اللہ صلعم لحکمہ بان اللہ عزوجل لم یجعل لمن بعدہ الا اتباعہ۔ [1]

مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں جسے لوگ اہل علم کہتے ہوں یا وہ خود اپنے تئیں اہل علم سمجھتا ہو اور اس کی مخالفت کرے کہ اللہ نے کہا ہے کہ اطاعت کی جائے امر رسول کی اس کے حکم کے سبب کہ اللہ نے اپنے بعد صرف رسول کی اتباع بتائی۔

اس رفع غلط فہمی کے بعد، منکرین حدیث کے خیالات و دلائل اور ان کے جوابات بہ ترتیب پیش کئے جاتے ہیں، پہلا اعتراض منکرین حدیث کا یہ ہے کہ

"سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت، اور کسی

---

[1] کتاب الام صفحہ ۲۵۰۔

حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے، "فبای حدیث بعدہ یومنون" اس قرآن کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے؟ "فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون" اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے، زیادہ تصریح اس آیت میں ہے، "ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذہا ہزوا اولئک لہم عذاب مہین" بعض آدمی وہ ہیں جو خریدار ہوتے ہیں حدیث کے مشغلہ کے تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلا علم کے اور اس کو تمسخر بنالیں یہ لوگ ہیں جن کے لئے خوار کرنے والا عذاب ہے، اس آیت میں "لہو الحدیث" کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے۔ مجھے تعجب ہے پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی۔"

یہ ہے پہلی دلیل کا خلاصہ جسے میں نے بعینہٖ نقل کردیا ہے، غالباً محترم مقالہ نگار بھی اس باب میں متفق ہوں کہ اس دلیل میں منکرین حدیث نے عمداً درجہ تدلیس وتلبیس سے کام لیا ہے، پہلے یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن کے علاوہ "کسی سنت" اور کسی حدیث کی پیروی کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت ہے، پھر "فبای حدیث بعدہ یومنون" اور اسی قسم کی دوسری آیات میں "حدیث" کا ترجمہ "حدیث" کرنا، اتنی بڑی بددیانتی ہے کہ علماء جرح وتعدیل، اور ائمہ نقد وبحث نے ایسی تلبیس مبین کے لئے کوئی لفظ نہیں وضع کیا۔

عربی کا ہر ابجد خواں جانتا ہے، اور یقیناً منکرین حدیث کا ہر فرد جانتا ہے کہ حدیث کے معنی بات کے ہیں اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔ اگر فن حدیث مراد ہوتا تو اس کے ذکر کا اس جگہ موقع کیا تھا۔ کیا جب حضور سرور کائنات قرآن مجید پیش فرماتے، تو لوگ یہ کہتے تھے کہ حدیث قرآن سے اولیٰ وافضل ہے آپ قرآن کی دعوت کیوں دیتے ہیں "حدیث" کی دعوت دیجئے، تو ہم قبول کریں؟

ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہاں مخاطب کفار ومشرکین ہیں کہ خدا کی ان کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود، قرآن کے اعجاز، اور رسول کی غیر مشتبہ صداقت کے باوجود، کفر وشرک کے معائب ونقائص معلوم کرلینے کے باوجود، اگر قرآن پر نہیں تو آخر

فبای حدیث بعدہ یومنون	وہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں گے۔

اور کہا یہ جا رہا ہے کہ اس آیت سے اتباع حدیث کی ممانعت نکلتی ہے، محترم مقالہ نگار نے یقیناً بیجا رواداری سے کام لیا کہ منکرین حدیث کی اس تلبیس کو یونہی درج مضمون فرما دیا، مولٰنا کو فٹ نوٹ میں اس دجل و فریب کا پردہ فاش کر دینا چاہیے تھا۔

"لہو الحدیث" والی آیت کے ترجمہ میں بھی منکرین حدیث نے اسی طرح اپنی "فہم قرآن" کا نہایت نادر نمونہ پیش کیا ہے، جودت فہم، اور سخن فہمئ عالم بالا کا منکرین اگر یہی ثبوت پیش کرتے رہے تو "معلوم شد" اور دلیل کتنی معقول دی ہے کہ اگر اس جگہ حسب خیال مفسرین "غنا" مراد تھا تو اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی؟ اس کا جواب بجائے اس کے کہ ہم حدیث و روایت سے دوں بہتر ہے کہ قرآن مجید سے دوں، آیت قرآنی ہے

واعبد ربک حتی یاتیک الیقین	جب تک تمہیں موت نہ آجائے اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو،

اس جگہ "یقین" کے معنی "موت" کے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے زمانہ سے منکرین حدیث کے موجودہ زمانہ تک سب اس کے معنی یہی سمجھ رہے ہیں، خود منکرین حدیث بھی، یہ کوئی نہیں کہتا کہ

وعبد ربک حتی یاتیک الیقین	جب تک تمہیں یقین نہ آجائے اس وقت تک عبادت کرو

اور اس کے بعد چھوڑ دو، تو اگر اس جگہ یقین کے معنی "موت" کے ہیں، تو آخر خدا کو کیا دشواری تھی کہ "موت" کہہ دیتا؟ "یقین" کہہ کے خواہ مخواہ لوگوں کو شبہ میں ڈالنے کے کیا معنی؟

جواب بالکل "ظاہر و باہر" ہے، قرآن مجید کا ایک خاص پیرایۂ بیان ہے، ادائگی مفہوم کے لئے حسب موقع جو کنایہ، جو استعارہ، جو تشبیہ سب سے زیادہ بلیغ اور موثر ہوتی ہے وہ لائی جاتی ہے، اس پر اعتراض کرنا کہ اس جگہ یہ کیوں ہے اور وہ کیوں نہیں، کوئی بہتر طریق معارضہ نہیں۔

آگے چل کر کہا گیا ہے کہ

"کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے ان پر کوئی آسمانی مہر ہے؟ یا خود رسول کے سامنے پیش کر کے ان کی تصدیق کرائی گئی ہے؟ پھر کس طرح انھیں جزواً ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو؟"

جواب اثبات میں ہے، جن حدیثوں کو ہم نے تسلیم کیا ہے، ان پر آسمانی مہر یقیناً ہے، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ رسول کے حکم کے مطابق ہم ان پر عمل کرتے ہیں۔

آسمانی مہر تو ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ	تمہارے لئے رسول ایک اچھا نمونہ ہے،
و ماینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی	رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ دیتا بلکہ وہ جو کہتا ہے وہ وحی کیا ہوا ہوتا ہے۔

اور

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا	رسول جو کچھ دے اس کو لے لو، جس سے منع کرے باز رہو۔

وازیں قبیل اور بہت سی آیتیں ہیں، جن میں حکم رسول کی اطاعت فرض کی گئی ہے، اور ظاہر ہے قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر میں احکام رسول وارد ہیں، سنت رسول موجود ہے تو اسے ترک کیسے کیا جا سکتا ہے، جبکہ خود رسول اللہ ؐ بھی تاکید فرماتے ہیں کہ میری سنت کو پکڑے رہنا، کتاب اللہ کو پکڑے رہنا کبھی گمراہ نہیں ہوگے، خلفاء راشدین میں جو شخص بھی سریر آرائے خلافت ہوتا ہے، جمہور امت کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ میں کتاب اللہ کو دلیل راہ بناؤں گا، سنت رسول کو چراغ ہدایت سمجھوں گا، اگر اس میں کوتاہی کروں تو مجھ سے مواخذہ کرنا، تو آخر وہ کونسی "سنت" تھی جس کی پیروی کا اعلان ہو رہا ہے، جس کی اتباع کا دم بھرا جا رہا ہے، لامحالہ ماننا پڑیگا کہ وہی سنت، جو سلف سے خلف تک پہونچی ہے، جس کے متعلق ثابت ہے کہ رسول اللہ ؐ نے ایسا کیا، جس کے متعلق خود رسول نے کہا،

علیکم بسنتی	تم پر میری سنت واجب ہے۔

وقت آخر رسول اللہ قلم دوات مانگتے ہیں کہ میں تمہیں ایسی چیز لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو، حضرت عمر فرماتے ہیں، ہمارے لئے کتاب اللہ اور سنت رسول کافی ہے، حضور خاموش ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ قرآن نہیں تھا جس کے متعلق حضور کچھ تحریر فرماتے، اس لئے کہ اس کی تو آپ نے عمر بھر تبلیغ کی تھی، اس کے تو حفاظ موجود تھے، اور یہ پورے طور سے شائع ہو چکا تھا اس لئے اس کے متعلق

کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی، معلوم ہوتا ہے کوئی دوسری چیز بھی تھی جس کے اوپر ہدایت کا انحصار تھا، قرآن سے ہدایت بلاشبہ ہوتی تھی، لیکن اس ہدایت کا تکملہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک حضور کوئی دوسری چیز تحریر نہ فرماتے، لیکن حضرت عمر نے جب فرمایا کہ ہمارے لئے کتاب وسنت کافی ہے تو حضور خاموش رہے، گویا آپ نے اس سے اتفاق فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز آپ تحریر فرمانا چاہتے تھے وہ سنت نبوی ہی تھی۔

اس کے علاوہ اس کا تو ہر شخص کو اعتراف ہے کہ صحابۂ کرام نے مذہب خود رسول اللہ سے سیکھا تھا، انھوں نے رسول اللہ کی زبان سے سنا تھا، اپنے کانوں سے رسول اللہ کو حلال و حرام کا فتویٰ دیتے، چیزوں کو اچھا برا کہتے سنتے تھے۔ اگر کوئی شبہ ہوتا تھا تو وہ رسول اللہؐ سے پوچھ لیتے تھے اور وہ بتلا دیتے تھے، لہٰذا ان کا مذہب، ان کا فہم، ان کا تفقہ فی القرآن، ان کا اعتصام بالکتاب، اور ان کی رائے ہمارے مقابلے میں ارفع و اعلیٰ ہے۔ خلفاء راشدین کا عہد دیکھئے، ان میں بھی حضرت ابوبکر و حضرت عمر کو دیکھئے کہ ان حضرات کا مسلک کیا تھا۔ کیا وہ صرف تمسک بالکتاب کو کافی سمجھتے تھے؟ کیا انھیں ہر چیز قرآن میں مل جاتی تھی؟ حضرت ابوبکر کا یہ واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ایک عورت جدہ کا حق طلب کرتی ہوئی آپ کے پاس آئی۔ آپ نے کہا میں کتاب اللہ میں تیرا کوئی حق نہیں پاتا، تو مغیرہ اُٹھے اور کہا کہ رسالت پناہ نے سدس دلوایا ہے۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا کوئی گواہ بھی ہے؟ محمد بن مسلم نے شہادت دی تو حضرت ابوبکر نے بلا تامل اسے نافذ فرما دیا[۱]۔ اس پر ذہبی نے تذکرہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب قرآن میں حضرت ابوبکر نے کچھ نہیں پایا تو سنن کی جستجو فرمائی اور جب ثقہ سے خبر مل گئی تو آپ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے ثقہ سے اس کی تصدیق کی اور نافذ کرایا، خوارج کی طرح یہ نہیں کہا کہ ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے[۲]۔

اسی طرح حضرت عمرؓ بھی قلت روایت اور کثرت طرق کے حامی تھے، چنانچہ حضرت عباس کی زمین

---

[۱] و [۲] تذکرۃ الحفاظ ذکر ابی بکر۔

والے واقعہ میں شہادت لی، ویسا ہی فیصلہ کیا جیسا حدیث کے مطابق ہونا چاہیے تھا، اور پھر خود ہی فرما دیا کہ میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا ہوں، صرف تاکید مقصود تھی۔[۱]

خود رسول اللہ کے زمانے میں بھی حدیث کی "تاریخی" حیثیت نہیں تھی، بلکہ "دینی" حیثیت تھی۔ رسول اللہ نے جب معاذ بن جبل کو یمن بھیجا ہے تو فرمایا کہ اگر تمہارے پاس کوئی مقدمہ آیا تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ کہا، کتاب اللہ سے، فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ کہا سنت رسول سے، فرمایا اگر اس میں بھی نہ ہو تب؟ کہا تب میں اپنی رائے سے کام لوں گا۔[۲] اس پر رسول اللہ خوش ہوئے۔ اگر ان کی دینی حیثیت نہیں تھی، تو رسول اللہ کے خوش ہونے کے کیا معنی؟

حضرت ابن عمر کا یہ واقعہ بھی خاصی حیثیت رکھتا ہے:۔

حدثنا سلیمٰن بن حرب عن ایوب عن نافع ان ابن عمر کان یکری مزارعہ علی عہد النبیؐ و ابی بکر و عمر و عثمان، وصدرا من امارۃ معاویۃ ثم حدث عن رافع بن خدیج ان النبی نہی عن کراء المزارع فذہب ابن عمر الی رافع و ذہبت معہ فسالہ فقال نہی النبیؐ عن کراء المزارع فقال ابن عمر قد علمت انا کنا نکری مزارعنا علی عہد رسول اللہؐ؟

سلیمان بن حرب ایوب سے، وہ نافع سے بیان کرتے ہیں کہ ابن عمر اپنے کھیت کرایہ پر دیدیا کرتے تھے، رسول اللہؐ کے عہد میں بھی، حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے عہد میں بھی، اور جناب معاویہ کے عہد میں بھی کچھ عرصے تک، پھر ان سے رافع بن خدیج کی حدیث بیان کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کراء ارض سے منع فرمایا ہے، تو ابن عمر نے کہا تم جانتے ہو ہم رسول اللہ کے زمانے میں بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔

حدثنا یحیی بن بکیر ثنا اللیث عن عقیل عن ابن شہاب قال اخبرنی سالم ان عبد اللہ بن عمر قال کنت اعلم فی عہد رسول اللہؐ ان الارض

ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے سالم نے خبر دی کہ عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ میں رسول اللہ کے عہد میں یہ جانتا تھا کہ زمین کرایہ پر دی جاسکتی ہے، پھر عبد اللہ بن عمر ڈرے کہ مبادا رسول اللہ نے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمر۔

[۲] اس حدیث کی مشکوٰۃ نے ترمذی، ابو داؤد اور دارمی کے حوالے سے تخریج کی ہے۔

تکری ثم خشی عبداللہ ان یکون النبیؐ قد احدث فی ذلک شیئاً لم یکن علم فترک کراء الارض۔[1]	کچھ اس باب میں فرمایا ہو اور انھیں علم نہ ہو، اس خیال کے آتے ہی انھوں نے زمین کرایہ پر دینا چھوڑ دی۔

اس میں خاص طور سے غور طلب یہ امر ہے کہ عبداللہ بن عمر خود صحابی ہیں اور جلیل القدر صحابی ہیں، حاضر باش بزم رسول ہیں، ان کے زہد و تقویٰ، اور دیگر محامد و محاسن کی ایک دنیا قائل ہے، خود رسالتپناہ خوشنودی مزاج کا اظہار فرما چکے ہیں۔ رسول اللہ کے عہد میں، حضرت ابوبکر کے عہد میں، حضرت عمر کے عہد میں، حضرت عثمان کے عہد میں، اور جناب معاویہ کے عہد امارت میں کچھ عرصے تک وہ ایک کام کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھیں رافع بن خدیج کی حدیث پہونچتی ہے، خود تحقیق حال کے لئے رافع کے ہاں پہونچتے ہیں، وہ وہی جواب دیتے ہیں، خود صحابی ہیں، رسول کے زمانے سے اس وقت تک ایک کام کرتے آئے، کسی نے ٹوکا نہیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ممکن ہے رسول اللہ نے فرمایا ہو اور مجھے علم نہ ہو سکا ہو، لہذا اس کام کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر احادیث صرف تاریخی درجہ رکھتی تھیں دینی حیثیت کی مالک نہیں تھیں تو عبداللہ ابن عمر باوجود جلیل القدر صحابی ہونے کے کیوں ایک پرمنفعت کام چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر وہ حدیث کی دینی حیثیت کے قائل نہ ہوتے تو کیا قیامت تک وہ ایسا کر سکتے تھے؟ صرف یہی دینی حیثیت تھی جس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اسے چھوڑ دیں۔

حضرت ابن عمر ہی کا ایک دوسرا واقعہ بھی قابل تامل ہے،

قال ابن عمر لجابر بن زید انک من فقہاء البصرۃ فلا تفت الا بقرآن ناطق او سنۃ ماضیۃ فانک ان فعلت غیر ذلک ہلکت و اہلکت۔[2]	حضرت عبداللہ بن عمر نے جابر بن زید سے کہا کہ بیشک تم بصرہ کے فقہا میں سے ہو لیکن اپنی رائے سے کبھی فتویٰ نہ دینا سوا قرآن و سنت کے، اگر اس کے علاوہ تم نے کیا تو خود بھی ہلاک ہوگے اور دوسروں کو بھی ہلاک کروگے۔

---

[1] بخاری صفحہ ۳۱۵۔

[2] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۷۵ بحوالہ دارمی۔

اس کے علاوہ

قال ابو النصر لما قدم ابو سلمة البصرة اتيته انا والحسن فقال للحسن انت الحسن ما طان احد بالبصرة احب الی لقاء منک و ذلک انه بلغنی انک تفتی برائک فلا تفت برائک الا ان یکون سنة عن رسول اللہ او کتاب منزل [۱]	ابو النصر کہتے ہیں کہ جب ابو سلمہ بصرہ آئے تو میں حسن کے ساتھ وہاں گیا، انھوں نے حسن سے کہا کہ بصرہ میں تم سے زیادہ ملاقات کا اشتیاق مجھے کسی اور سے نہیں تھا لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو، اپنی رائے سے کبھی فتویٰ نہ دو یا سنت رسول سے یا کتاب الٰہی سے۔

اگر سنت کی کوئی دینی حیثیت صحابہ کی نظروں میں نہیں تھی عبداللہ بن عمر ابو سلمہ کو کیوں یہ نصیحت کر رہے ہیں کہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دو، بلکہ سنت سے دو، کتاب سے دو۔ اگر دینی حجت صرف کتاب تھی تو صرف کتاب پر زور دینا چاہئے تھا، لیکن صحابی ہونے کے باوجود وہ زور دے رہے ہیں بلکہ ڈرا رہے ہیں کہ دیکھو کہ اگر اپنی رائے سے فتویٰ دیا تو ہلاک ہوئے، کتاب الٰہی اور سنت رسول دونوں کو اپنے سامنے رکھو اور فتویٰ دو، صرف "تاریخی" چیز کی اتنی حیثیت تو نہیں ہو جاتی کہ وہ "دینی" چیز کے دوش بدوش، بہ ثبات "عقل و ہوش" رکھی جائے؟

علاوہ ازیں

قال الشعبی ما حدثوک من رسول اللہ فخذ به وما قالوه برائهم فالقه فی الحش۔ [۲]	شعبی کہتے ہیں کہ اگر لوگ تم سے حدیث بیان کریں تو تم اُسے لے لو، لیکن اگر اپنی رائے بیان کرنے لگیں تو اُسے غلاظت میں پھینک دو۔

یہ حدیث بھی قابل تامل ہے، اسے بھی شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک خاص عنوان کے ماتحت ذکر کیا ہے، اور شاہ صاحب کا پایۂ علم حدیث میں جتنا ارفع و اعلیٰ ہے اس سے سب واقف ہیں خیر، وہ حدیث یہ ہے،

---

[۱] و [۲] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۷۵ بحوالہ دارمی۔

لا الفین احدکم متکئا علی ارکیته، یاتیه الامر من امری مما امرت به او رغبت عنه فیقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعنا۔	نہ ہو کہ میں تم میں کسی کو ایسا پاؤں کہ وہ ٹیک لگائے ہوئے تکیہ پر بیٹھا ہو، اس کے پاس میری باتوں میں سے کوئی ایسی بات آئے جس کا میں نے حکم دیا ہو، یا منع کیا ہو اور وہ کہے کہ میں تو اسے نہیں جانتا، قرآن میں تو ہے نہیں کہ میں اس کی پیروی کروں۔

معلوم ہوتا ہے سرکار رسالت نے اپنی چشم بصیرت سے سب کچھ مطالعہ فرمالیا تھا ورنہ ایسی بات وہ کیوں فرماتے؟

شاہ ولی اللہ صاحب، جو اسرار و رموز شریعت کے ماہر خصوصی ہیں ایک اور بات فرماتے ہیں۔ جو ہر منکر حدیث کے لئے سرمایۂ تفکر ہے یعنی رسول اللہؐ سے جو کچھ مروی ہے اس کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کا بعض حصہ

مستند الی الوحی وبعضها مستند الی الاجتهاد و اجتهاده بمنزلة الوحی لان اللہ تعالیٰ عصمه من ان یتقرر رایه علی الخطاء۔ [1]	وحی سے مستند ہوگا، یا حضور کے اجتہاد سے اور آپ کا اجتہاد بھی بمنزلۂ وحی کے ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ و مصئون کر دیا ہے کہ آپ کی رائے گرامی غلط واقع ہو۔

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انبیا معصوم ہیں، لہٰذا ہمارے رسول بھی غلطی اور غلط روی سے معصوم تھے، محفوظ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص مرتبہ پر سرفراز فرمایا تھا، ان سے کسی غلطی کا صدور ناممکن تھا۔ پھر اس کے تسلیم کرنے کے بعد فرمودہ رسول ظاہر ہے ریب و شک سے پاک، اور اسی طرح واجب العمل اور واجب التسلیم ہے جس طرح کوئی منصوص امر جس پر نص وارد ہو، غرض اس قبیل کی بہت سی چیزیں مل سکتی ہیں جن سے حدیث کی دینی حیثیت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ خود عہد صحابہ میں اس کی دینی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے اور اس عہد سے آج تک امت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

اسے مانتی چلی آتی ہے۔ پھر اب یہ دعویٰ کہاں تک قابل پذیرائی ہے؟

ایک اور بات کہی گئی ہے:-

"یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں ماموریہ ہے، اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول، اور اطاعت رسول فرض ہے تو لازم آتا ہے کہ اس کے اقوال و اعمال جمع کئے جائیں تاکہ امت اس کی اطاعت کرے۔ اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جس قدر امرا ہوئے ہیں ان میں سے بھی ہر ایک کا مجموعۂ احادیث ہونا چاہئے، ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی! کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے جس میں رسول اور امرا دونوں داخل کئے گئے ہیں۔"

امعان نظر سے اگر اس دلیل کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ واقعہ یوں نہیں ہے۔ قرآن نے یقیناً خدا، رسول اور امیر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اور ہمیں اطاعت کرنی چاہئے، لیکن کیا رسول اور امیر کا درجہ ایک ہے؟ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں، اور کتنی معقول بات فرماتے ہیں کہ

اقول انتظام الدین یتوقف علی اتباع السنن النبیؐ وانتظام السیاسۃ الکبریٰ یتوقف علی الانقیاد للخلفا فیما یامرونہم۔ [1]	میرا خیال یہ ہے کہ انتظام دین سنن نبوی کی پیروی پر منحصر ہے، اور انتظام سیاستہ کبریٰ خلفا اور امرا کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے۔

شاہ صاحب کا یہ قول اتنا مبرہن ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، دین چونکہ ایک اٹل، اور نہ بدلنے والی چیز ہے اس لئے اس میں تو قرآن وسنت نبوی ہی کی پیروی ہوگی اور سیاست ایسی چیز ہے جو مصالح کے لحاظ سے ہر وقت بدلتی رہتی ہے اس لئے امرا اور خلفا کی اطاعت و انقیاد کا حکم ہے اس لئے کہ اسلام کے نزدیک،

الفساد اکبر من القتل	فساد قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

اسلام جماعت انسانی کو ایک نظام اور ضابطہ کے اندر رکھنا چاہتا ہے، اسی لئے اگر کوئی حبشی غلام بھی امیر ہو تو بھی اس کی اطاعت واجب ہے لیکن اگر وہ کتاب و سنت سے اعراض کرے تو خواہ وہ حبشی نہیں عمر فاروق ہو ایک بدو اسے تکلے کی طرح سیدھا کرنے کی دھمکی دے سکتا ہے۔ خود قرآن اور حدیث میں جابجا اس کی تفصیل ملے گی کہ امیر کی اطاعت اسی وقت تک فرض ہے جب تک وہ متبع کتاب و سنت ہے اور جب اس سے وہ اعراض کرے تو اس کی پیروی ساقط۔ مسلمان پر پڑوسی کا حق ہے، دوستوں کا حق ہے، والدین کا حق ہے، قرابت داروں کا حق ہے، امیر وقت کا حق ہے لیکن اگر کوئی بات خلاف سنت ہو خلاف کتاب ہو، تو یہ تمام حقوق ختم ہو جائیں گے، مسلمان ان تمام بندشوں سے آزاد ہو جائے گا، اور وہ صرف خدا کی اطاعت کرے گا، ارشاد رسول کی پیروی کرے گا۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ نظم و انتظام کے قائم رکھنے کے لئے امیر کی اطاعت واجب تو ہے لیکن اسی وقت تک جب تک وہ کتاب و سنت پر چلے، میرے اس دعوے کی دلیل قرآن ہی میں اور اسی آیت میں ملتی ہے کہ

وان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول | اگر کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ درپیش ہو تو خدا اور رسول کی طرف لوٹا دُ

اس جگہ "امیر" کا لفظ "ردوہ" میں اسی لئے نہیں داخل کیا کہ اگر وہ کتاب و سنت کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو خدا اور رسول کی طرف لوٹا دُ یعنی قرآن و حدیث میں اس کی جستجو کرو۔ لہذا اگر "ردوہ" میں امیر داخل ہوتا تو یقیناً امرار اسلام کے مجموعۂ احادیث تیار کرنے کی ضرورت تھی لیکن جب اس میں نہیں ہے صرف "اطیعوا" میں ہے تو ہم اس کی اطاعت کرینگے اور جب کوئی بات پیدا ہوگی تو خدا اور رسول کی طرف لوٹائیں گے اس وقت امیر کو پوچھیں گے بھی نہیں اور اسی کے مطابق عمل کریں گے، اب یقیناً یہ بات ثابت ہو گئی کہ امرار اسلام کے مجموعۂ احادیث تیار کرنے کی ضرورت کیوں نہیں ہے، اور رسول اللہ کے مجموعۂ حدیث کی ضرورت کیوں ہے؟

آگے کہا ہے کہ

"یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اطاعت ہوگی اولوالامر کی اطاعت کے حکم سے حل ہو جاتا ہے کہ جو اس کی جانشینی کریں گے۔"

اگر ایسا ہوتا تو "ردوہ" میں امیر کا لانا ضروری تھا، اور اس میں امیر اسی لئے نہیں لایا گیا کہ اس کا ہر وقت امکان ہے کہ کوئی امیر غاصب ہو، شرابی ہو، حکم خدا اور حکم رسول کی پروا نہ کرتا ہو، لہٰذا اگر ایسا ہو تو آخری فیصلہ "اولو الامر" پر نہیں، بلکہ ان کے "اولو الامر" یعنی خدا اور رسول پر رکھا گیا، مثلاً یوں سمجھئے کہ مصطفٰے کمال پاشا کی حکومت نے اگر بقول بعض مسجدیں مقفل کرا دیں، نماز غیر ضروری قرار دی، پارلیمنٹ کا کوئی مذہب نہیں رکھا، قوانین اسلام پر عمل کرنا چھوڑ دیا، اور ایک دوسرا دستور حکومت وضع کر لیا، تو کیا انھیں کوئی منکر حدیث "جانشین رسول" مان لے گا، نہیں اور یقیناً نہیں، تو ایسی صورت میں چارہ کار سوا اس کے اور کیا ہے کہ معاملہ خدا اور رسول کے سپرد کیا جائے، اس لئے کہ رسول کے متعلق تو کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اتنا "فنشلٹ" ہو جائے گا کہ قرآن کو چھوڑ کر یورپ اور اس کی دوسری نوآبادیوں کے اصول پر دستور حکومت وضع کرے، بتلایا جائے کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ کیا اس کی اتباع کی جائے؟ جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر لامحالہ ہمیں رجعت قہقری کر کے اسی طرف لوٹنا ہو گا جس نے "اولو الامر" کی اطاعت واجب کی ہے۔ اب یہ حکمت سمجھ میں آگئی ہو گی کہ "اطیعوا" میں امیر کا ذکر بقاء نظم و انتظام کے لئے ہے، اور "ردوہ" میں عمداً اور مصلحتاً نہیں ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو، تو اس کا تدارک کسی ایسے "جانشین رسول" سے نہیں ہو گا بلکہ صرف قرآن و حدیث سے۔

پہلی ہی دلیل کے ضمن میں کہا گیا ہے،

"کہ دراصل حکم کتاب اللہ ہے رسول یا امیر اس سے اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں، اسی لئے فرمایا ' وان اختلفتم فی شئ فحکمہ الی اللہ '۔"

اور اسی لئے فرمایا کہ " وان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول " اگر صرف "اللہ" مقصود تھا تو لفظ "رسول" کے نہ لانے میں یہاں کیا "دشواری" تھی؟ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے بعد اگر کوئی چیز مامور بہ ہے تو وہ رسول ہے، قرآن کے بعد اگر کوئی چیز واجب العمل ہے، تو وہ حدیث ہے۔

ان کھلی ہوئی آیتوں اور نشانیوں کے بعد آخر منکرین حدیث

"فبای حدیث بعدہ یؤمنون" | اور کس چیز پر ایمان لائیں گے،

دوسری دلیل ہے کہ

"کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں رسول کے حکم کے بھی اتباع کا تو حکم موجود ہے' قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی' لیکن خود رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا' اس کی بھی تصریح قرآن میں ہے اتبع ما اوحی الیک من ربک' پھر رسول کو اعلان کر دینے کا حکم دیا گیا قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی لہذا رسول بجز وحی کے کسی کا پیرو نہیں تھا اس لئے اس کی پیروی بعینہٖ قرآن کی پیروی ہے۔"

ثابت ہوا کہ حدیث کی پیروی بعینہٖ قرآن کی پیروی ہے' اس لئے کہ احادیث بھی تو آخر امورِ دین ہی کے متعلق ہیں' اور یہ "تاریخی" طور سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ میری پیروی کرو' صحابہ کی پیروی کرو' اگر ایسا کرو گے تو ہدایت یاب ہو گے' لہذا رسول کی پیروی عین قرآن کی پیروی ہے' لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ سب اس تفصیل سے قرآن میں موجود بھی ہے' اس لئے قرآن نے کہلوایا'

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی | اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری (رسول اللہ کی) پیروی کرو۔

اور اس کی پیروی موجب رضامندی خدا ہے' اور اس کی پیروی ہے کیا؟ وہی جس کے متعلق اُس نے حکم دیا' جس کے متعلق اس نے منع کیا' اور چونکہ رسول کی پیروی موجب رضامندی خدا ہے اس لئے یہ بھی کہدیا کہ

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی ۵ | فرمودۂ رسول وحی ہی ہے' اور ہے کیا؟

اس لئے کہ خدا نے اسے رسول بنایا' اس کی پیروی اپنی رضامندی کا سبب بتائی' تو پھر ظاہر ہے اس کا قول کوئی معمولی قول نہیں ہو سکتا بلکہ وہ وحی ہے' اور کچھ نہیں۔

آگے پھر کہا گیا ہے کہ

"یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا سب وحی تھا جس کے ثبوت میں آیت وما ینطق عن الھویٰ الخ پیش کی جاتی ہے صحیح نہیں کیونکہ کفار کو جو انکار

تھا وہ قرآن کے متعلق تھا، اسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے رسول اللہؐ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اس کے متعلق نہ انکار تھا نہ بحث، قل انما انذرکم بالوحی۔"

چنانچہ پہلی ہی آیت میں تصریح ہے کہ "نطق رسول" وحی ہے، اور یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ وہی نطق رسول وحی ہے جو امور دین میں ہو، اور وہی حدیثیں واجب العمل ہیں جو امور دین میں ہوں، "ورنہ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اس کے متعلق" نہ اصرار ہے نہ دعویٰ کہ وہ واجب العمل ہیں، یعنی اگر رسول اللہ نے حضرت عائشہؓ سے گھر میں کوئی بات کہی، یا حضرت فاطمہؓ سے کچھ فرمایا، تو امتیان محمد میں ہر شوہر یا باپ پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ بھی اپنی لڑکی سے وہی کہے، اور اسی طرح کہے، لیکن اگر رسول نے کہا کہ طواف یوں کرو، سعی یوں کرو، نماز میں یوں کھڑے ہو، یہ اور اسی قبیل کے اقوال و اعمال جو دین سے متعلق ہیں وہ تو وہ ہمارے لئے بلاشبہ واجب العمل ہیں، ان کی پیروی کی جائے گی، اور جو پیروی کرے گا خدا اس سے خوش ہوگا۔

تیسری دلیل میں احادیث کو ظنی بتلایا گیا ہے اور اس لئے ناقابل عمل، اس پر گفتگو بے کار ہے اس لئے کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے کہ وہ کہاں تک قابل عمل ہیں۔

چوتھی دلیل میں ایک بہت دلچسپ بات یہ کہی گئی ہے کہ تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی، اور پھر اس کو محکم یوں کیا گیا ہے کہ

> "بعض جگہ حدیثیں بالکل قرآن کے خلاف جاتی ہیں جن کی وجہ سے علما قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں مثلاً اللہ نے مالدار مسلمانوں پر مرنے سے پہلے والدین اور اقربا کے لئے وصیت فرض کی ہے کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین، مگر حدیث کہتی ہے، "لا وصیۃ لوارث"۔ علما نے اس حدیث کی وجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے عائلی مصالح کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا تھ

منسوخ کر ڈالی۔"

تعجب ہے کہ اس برہان قاطع پر جو منکرین حدیث نے پیش کی ہے کیا کہا جائے؟ اگر یہ منکرین حدیث سے اس قدر بیزار ہیں تو قرآن مجید پر تو پورے طور سے وسعت نظر ہونی چاہئے تھی، نہ یہ کہ ادھر ادھر کی کتابوں میں جو کچھ کسی نے لکھ دیا وہ سچ سمجھ لیا گیا، دعویٰ اور دلیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حدیث نے اتنا بڑا ظلم کیا ہے کہ لوگوں کو حق وصیت سے محروم کر دیا، اب وہ بیچارے کیا کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت اس وقت اتری جب تک قرآن مجید میں اعزا و اقربا کے حصص مقرر نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ پورا رکوع نازل ہوا جس میں باقاعدہ ہر شخص کے حصص مقرر کر دیے گئے ہیں تو اس کی ضرورت نہیں رہی اور بحث و اتفاق دیکھئے کہ اس میں بھی رسول کی پیروی فرض کی جا رہی ہے۔

یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساءً فوق اثنتین فلھن ثلثا ماترک، وان کانت واحدۃ فلھا النصف، ولابویہ لکل واحد منھما السدس مما ترک ان کان لہ ولد، فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابواہ فلامہ الثلث فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین آباؤکم وابناؤکم لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعا، فریضۃ من اللہ ان اللہ کان علیما حکیما ○ ولکم نصف ماترک ازواجکم ان لم یکن لھن ولد، فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن من بعد وصیۃ یوصین بھا او دین، ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد، فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیۃ توصون

اللہ تم کو وصیت کرتا ہے کہ تمہاری اولاد میں مرد کے لئے عورت سے دوگنا حصہ ہے اور اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو جو چیز وہ چھوڑ گیا ہے تو دو تہائی اس چیز کا ملے گا، اور ایک ہو تو اس کے لئے نصف ہے اور ماں باپ میں ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اس صورت میں کہ اس کے اولاد ہو، اور اگر نہ ہو تو والدین ہی وارث ہوں گے، اور ماں کو تیسرا حصہ ملے گا اور اگر اس کے بھائی ہوں تو چھٹا ملے گا اس وصیت کے بعد جو وہ کر جائے، یا قرض کے دینے کے بعد، تمہارے باپ اور تمہاری اولاد اس سے ناواقف ہیں کہ کس میں زیادہ نفع ہے ان میں، یہ تمہارے واسطے اللہ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور تمہاری بی بی جو چھوڑ کر مرے اس میں تمہارا نصف کا حصہ ہے اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اگر ہو تو تمہارے لئے چوتھائی حصہ ہے، وصیت یا قرض کے دینے کے بعد، اور اگر تمہارے اولاد نہ ہو تو تمہاری جائداد میں بی بی کا چوتھائی

بہا او دین، وان کان رجل یورث کللۃ او امرأۃ ولہ اخ او اخت فلکل واحد منہما السدس فان کانوا اکثر من ذلک فہم شرکاء فی الثلث من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین، غیر مضار، وصیۃ من اللہ واللہ علیم حکیم، تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہار خلدین فیہا، وذلک الفوز العظیم ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیہا ولہ عذاب مہین۔

(والمحصنت)

حصہ ہے اور اگر ہو تو پھر آٹھواں حصہ ہے بی بی کے لئے وصیت اور قرض کے بعد اور اگر کوئی ایسا آدمی ہو جس کی میراث کللہ ہے یا ایسی عورت کہ ہے اس کے واسطے بھائی یا بہن تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر اس سے بھی زیادہ ہوں، تو وہ سب ثلث میں شریک ہونگے وصیت یا قرض کے بعد، اس میں کسی کو ضرر نہیں ہے، یہ اللہ کی طرف سے ہے اور وہ علیم وحکیم ہے، یہ اللہ کے حدود ہیں، جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ہمیشہ رہے گا اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے اور جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی، حدود سے گزر گیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں داخل ہوگا اور اس کے واسطے ذلیل کرنیوالا عذاب ہے۔

اس پورے رکوع میں "عائلی مصالح" کو مدنظر رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت کریمہ "واذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین" کا اجمال کافی نہ سمجھ کر یہ پورا رکوع نازل فرمایا، اور اس میں باقاعدہ لڑکا، لڑکی، والدین، شوہر، بی بی، بھائی، بہن سب کے حقوق متعین کردئے، اب ہر مسلمان ان کی تعمیل پر مجبور ہے، اور ورثا کو بھی حصے ازروئے شرع شریف ملیں گے لہذا اس صورت میں وارث کے لئے، وصیت کی ضرورت ہی کیا باقی رہجاتی ہے؟ وصیت تو اس وقت کی جاتی ہے جب آدمی مر رہا ہو اور اسے یقین ہو کہ میرے مرنے کے بعد یہ کام ایسا نہیں ہوگا تو وہ وصیت کرکے اپنی آرزو محکم کر جاتا ہے اور پھر وہ پوری ہوتی ہے، لیکن جب اس کا اندیشہ ہی نہیں، وارث کو حق بہرحال ملے گا، چاہے وہ دینا چاہے چاہے نہ دینا چاہے تو پھر وارث کے لئے وصیت کی کیا حاجت رہ گئی ہے! لیکن اگر وصیت کرنے والا اپنی جائداد سے کار خیر کے لئے غریبوں اور یتیموں کے لئے کچھ وصیت کرنا چاہتا ہے کہ بطور صدقہ جاریہ کے وہ کام آئے، تو اس کا حق بھی شرع نے باقی رکھا ہے، وہ اپنی جائداد کے ثلث حصے میں جس قسم کی، جس کو چاہے وصیت کرسکتا ہے اور وہ اس کی وفات کے بعد نافذ ہوگی۔

لیکن ثلث سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا، اور اگر وہ کر بھی دے تو قاضی اسے منسوخ کردے گا اس لئے کہ حقوق اقربا باقی رہ جائیں گے، اور یا مالی حقوق مقصد خداوندی نہیں۔ وصیت ثلث میں نافذ رہے گی اور یہ جو کچھ ہوگا، قرآن مجید کے اس رکوع کو پیش نظر رکھ کے ہوگا۔

اور حدیث کے اوپر یہ الزام لگانا کہ وہ عائلی مصالح کو تباہ کررہی ہے، بہت بڑی زیادتی ہے، احادیث وسنن میں اکثر ایسے واقعے ملتے ہیں کہ کوئی صحابی اپنی سب سے زیادہ "عزیز و محبوب" چیز راہ خدا میں وقف کردینا چاہتے ہیں لیکن رسول خدا ﷺ "عائلی مصالح" کی بنا پر انھیں باز رکھتے ہیں، اور اسے ان کے اقربا میں بحصۂ رسدی تقسیم کرادیتے ہیں، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیث پر یہ الزام کیسے لگ سکتا ہے؟

اب یہ مسئلہ صاف ہوگیا کہ جب تک ذوی القربیٰ کے حقوق کی باقاعدہ تعیین نہیں ہوئی تھی اس وقت تک کے لئے وہ آیت کافی تھی جس میں والدین وغیرہ کے لئے وصیت کرنے کا حکم ہے، لیکن جب حقوق پر پورا ایک رکوع نازل ہوگیا، تو وہ اجمال اس تفصیل میں مدغم ہوگیا، اور اب امت کا اسی پر عمل ہے، اور چونکہ سب کے حقوق خود قرآن نے متعین کردئے ہیں، اب ان میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہوسکتی ہے۔ لہذا وارث کے لئے وصیت کرنا ایک بے معنی سی بات ہے، البتہ اس ثلث میں جس پر وصیت کرنے والے کو پورا اختیار رہے ہر قسم کی وصیت کرسکتا ہے، اور وہ نافذ ہوگی، لیکن اس کے بعد وصیت کا دروازہ بند ہے، اور گویا حکم قرآن سے بند ہے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ

"صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا لاتکتبوا عنی غیر القرآن الخ"

یہ "الخ" کیا چیز ہے؟ محترم مقالہ نگار نے اس جگہ بھی بے جا روا داری سے کام لیکر منکرین حدیث کو انتہائی تلبیس کا موقع دیا۔ پوری حدیث یوں ہے:۔

لاتکتبوا عنی القرآن وحدثوا عنی فلا حرج	مجھ سے سوا قرآن کے کچھ نہ لکھو ہاں حدیث بیان کرو۔

"حدثوا عنی فلا حرج" کو نہ لکھنا صرف "الخ" لکھ کے ٹال دینا بہت بڑی زیادتی ہے، جب

پوری حدیث اس طرح سامنے آجاتی ہے تو اعتراض کی صورت ہی بدل جاتی ہے، یعنی رسالت پناہ نے اس اندیشے سے کہ قرآن اور حدیث غلط ملط نہ ہو جائیں کتابت سے تو منع فرمایا اور حدیث بیان کرنے کی اجازت دیدی، اور بعد کو جب یہ اندیشہ رفع ہو گیا تو آپ نے کتابت کی اجازت بھی عبداللہ بن عمرو کو دے دی، جیسا کہ خود حضرت ابوہریرہ نے ایک مقام پر اعتراف فرمایا ہے کہ مجھ سے زیادہ عالم بالحدیث (ا) عبداللہ بن عمرو کے کوئی نہیں، اس لئے کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا[1]۔ کتابت کا یہ فعل ظاہر ہے آنحضرت کے زمانے ہی میں ہوتا تھا، خود طاہر جزائری نے اس کی توجیہ بھی کی ہے کہ جب لبس و اختلاط کا اندیشہ رفع ہو گیا تو آپ نے کتابت کی اجازت دیدی[2]، ورنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست زاہد و عابد شخص کتابت حدیث کا حکم اپنے عہد خلافت میں کیسے دے سکتا تھا، اور صحابہ اور تابعین اس کی پیروی کیسے کر سکتے تھے؟

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ

"حضرت ابوبکر نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کر دیا، اس لئے کہ اختلاف کا اندیشہ تھا، انھوں نے تقریباً پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی لکھ رکھا تھا اُسے بھی جلا دیا۔"

یہ بھی غلط ہے۔ یہ قول تذکرۃ الحفاظ سے لیا گیا ہے، اور خود صاحب تذکرۃ الحفاظ، علامہ ذہبی نے ان دونوں واقعات کو "مراسیل" میں شمار کیا ہے، اور مراسیل کا پایۂ استناد قطعاً ساقط ہے[3]۔ مراسیل ہمارے لئے حجت نہیں بن سکتے، نہ ہم ان سے احتجاج کر سکتے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد تعجب ہے کہ منکرین حدیث

---

[1] و [2] توجیہ النظر

[3] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابی بکرؓ۔ یہاں ایک بات اور عرض کر دی جائے کہ بعض لوگ مراسیل کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں لیکن جمہور محدثین کرام قطعاً اسے ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں، اور کبھی اس سے احتجاج نہیں کرتے، ہمیں جمہور محدثین کا مسلک پیش نظر رکھنا چاہئے۔ (رئیس احمد جعفری)

اسے کیسے پیش کرتے ہیں؟ یہ واقعہ تو خیر مراسیل میں سے ہے لیکن صاحب تذکرۃ الحفاظ نے بڑے زور شور سے حضرت ابوبکرؓ کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جب آپ نے جدہ کا حق حدیث سے دلوایا ہے، اور اُس کے بعد لکھا ہے کہ دیکھو حضرت ابوبکرؓ کو جب قرآن میں ایک چیز نہیں ملی تو سنن کی جستجو کی، اور جب سنن میں مل گئی تو اسے نافذ کر دیا، اور خوارج کی طرح یہ نہیں کہہ دیا کہ ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے[1]۔

خود حضرت عمرؓ کا یہ عالم تھا کہ وہ قلت روایت اور کثرت طرق کے حامی تھے، اس قلت روایت اور کثرت طرق کا مطلب سمجھ لینا چاہئے۔ قلت روایت کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہؐ سے یونہی اندھا دھند روایت نہ کر دی جائے، بلکہ خوب سوچ سمجھ کر، حزم و احتیاط کے ساتھ کرنا چاہئے، اور کثرت طرق کا مطلب یہ ہے کہ ایک حدیث متعدد راویوں سے اور متعدد طرق سے روایت کی جائے، تاکہ اس کی صداقت اور حقیقت غیر مشتبہ ہو جائے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے "املاص" کے متعلق قرآن مجید میں کچھ نہیں پایا تو حدیث کی طرف رجوع کیا اور جب حدیث مل گئی تو قبول کیا۔ اسی طرح حضرت عباسؓ کے واقعے میں جس کا ذکر آچکا ہے جب آپ کو شہادت مل گئی تو آپ نے قبول فرمالیا[2]۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ بھی، جب حدیث ملتی تھی تو حلف لے کے اسے قبول فرما لیتے تھے[3]۔ یہ کبھی نہیں فرماتے تھے کہ ان کی تو صرف "تاریخی" حیثیت ہے، دینی حیثیت سے ہم نہیں مانتے، نیز، حضرت علیؓ منکر حدیث کی روایت سے منع فرماتے تھے اور مشہور حدیث کی تحدیث کی ترغیب دیتے تھے[4]۔ ان باتوں کو پیش کرنے کے بعد ایک دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ

> "حضرت ابن عباسؓ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث "الوضوء مما مسته النار" اور حضرت علیؓ کی حدیث "نہی عن المتعہ" اور حضرت ابوسعید خدری کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا۔"

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابی بکرؓ۔

[2] تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمرؓ۔

[3] و [4] تذکرۃ الحفاظ، ذکر علیؓ۔

اس سے گویا یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس حدیث کے قائل نہیں تھے، حالانکہ یہ کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتا، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس ان تین حدیثوں کو قبول نہیں فرماتے تھے، جو گویا ان کے نزدیک پایۂ تحقیق تک نہیں پہونچی تھیں اور ان تین حدیثوں میں بھی پہلی حدیث منسوخ ہے۔ حدیث کی کتابوں میں متعدد روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں رسول اللہؐ نے اسے ترک فرمادیا تھا۔ آپ نے گوشت نوش فرمایا اور بلا وضو کے نماز پڑھی اور خود جابر کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے آخر میں "مماسۃ النار" سے وضو ترک کردیا تھا، اور اسی پر امت کا عمل بالا "تواتر" چلا آرہا ہے، تو اسے حضرت ابن عباس نے بہت اچھا کیا نہیں مانا، اس لئے کہ یہ ماننے کی چیز ہی نہیں تھی، رہی دوسری حدیث "نہی عن المتعہ" سے انکار کی، تو ممکن ہے حضرت علی کی اس حدیث میں انھیں کچھ شبہہ ہوا ہو، اس لئے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کیا، لیکن ان کے اس انکار کو خود صحابہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کو حضرت ابن عباس کے اس مسلک کا جب علم ہوا تو انھوں نے نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی کہ جس طرح وہ بصارت سے محروم ہیں اسی طرح بصیرت سے بھی، ذرا متعہ کرکے وہ دیکھیں تو، پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں؟ اور تیسری حدیث جس کا حضرت ابن عباس نے انکار فرمایا ہے اسے بیان کرنا چاہئے تھا کہ وہ کیا تھی، یوں تو اس کے متعلق کچھ نہیں عرض کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ

> "عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہوگیا، اور شہادت، در شہادت، در شہادت، در شہادت، عقلاً، عرفاً یا قانوناً کسی لحاظ سے قابل سماعت نہیں"

حیرت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ناممکن کون سی چیز ہوگئی؟ صحابہ سے تابعین روایت کرتے ہیں، تابعین سے تبع تابعین روایت کرتے ہیں، ان سے اور ثقہ لوگ۔ اگر ایک بات ایک سچا آدمی کہے تب تو وہ قابل قبول ہے اور اگر دس سچے آدمی اسی بات کو کہیں تو وہ ناقابل قبول؟ یہ استدلال بدیع تو یقیناً ناقابل فہم ہے۔ ہمارے پاس روایت کرنے والوں کی زندگی کا ایک ایک صفحہ محفوظ ہے، ان کے کردار، ان کی گفتار، ان کے عادات و اطوار سب ہمارے سامنے ہیں، ان کا بیٹھنا اٹھنا، ان کا کھانا پینا، ان کی

بات چیت، ان کے عیوب و فضائل، ان کے محامد و معائب سب ہماری نظر میں ہیں تو آخر وہ کونسی دلیل ہے جس کی بنا پر ہم انھیں ساقط الاعتبار سمجھ لیں؟ آخر "شہادت"، درشہادت، درشہادت، درشہادت "عقلاً"، عرفاً، یا قانوناً کس لحاظ سے قابل سماعت نہیں"؟ امام شافعی نے بتایا ہے کہ قبول حدیث کا معیار کیا ہے؟

اخبرنا ابو محمد الربیع بن سلیمان المرادی المؤذن صاحب الشافعی رحمۃ اللہ سالت الشافعی بای شیٔ تثبت معجز عن رسول اللہؐ فقال قد کتبت ھذہ الحجۃ فی کتاب جامع العلم فقلت اعد من ھذا مذھبک ولا تبال ان یکون فیہ فی ھذا الموضع فقال الشافعی اذا حدث الثقۃ عن الثقۃ حتی ینتھی الی رسول اللہؐ فھو ثابت عن رسول اللہ ولا ترک الرسول اللہ حدیثاً ابداً الا حدیثاً وجد عن رسول اللہؐ حدیث یخالفہ واذا اختلف الاحادیث عنہ فالاختلاف فیھا وجہان احدھما ان یکون بھا ناسخ ومنسوخ فنعمل بالناسخ ونترک المنسوخ والآخر ان تختلف ولا دلالۃ علی ایھا الناسخ فنذھب الی اثبت الروایتین الخ[1]

ابو محمد کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی سے دریافت کیا کہ رسول اللہ سے حدیث ثابت کس طرح ہوتی ہے؟ فرمایا میں اس مبحث پر "جامع العلم" میں کافی لکھ چکا ہوں۔ میں نے عرض کیا کچھ یہاں بھی دہرا دیجئے، تو انھوں نے فرمایا کہ جب ثقہ، ثقہ سے روایت کرکے رسول اللہ تک پہونچا دے تو وہ حدیث رسول ہے۔ پھر ہم کسی حدیث کو اس وقت تک نہیں چھوڑینگے جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ کوئی دوسری حدیث اس کی مخالف ہے، اور مخالفت کی بھی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ ایک ناسخ اور دوسری منسوخ ہو، اگر ایسا ہوا تو ہم ناسخ پر عمل کریں گے اور منسوخ کو ترک کر دیں گے، اور اگر احادیث میں اختلاف ہو اور اس پر کوئی دلیل نہ ہو کہ کون ناسخ ہے اور کون منسوخ تو ہم دونوں روایتوں میں سے جو روایت سب سے زیادہ اثبت ہوگی اسے تسلیم کریں گے۔

امام صاحب نے اس موضوع پر اپنے اور خیالات بھی ظاہر فرمائے ہیں، لیکن ان کا اس بحث سے زیادہ تعلق نہیں اس لئے انھیں ہم چھوڑتے ہیں، مذکورہ بالا اقوال میں امام صاحب نے قبول حدیث کا معیار روشن کر دیا ہے، اور یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ اگر احادیث میں اختلاف ہو تو ہمیں کیا طریقہ

---

[1] کتاب الام، جزء سابع، صفحہ ۱۷۷۔

کار اختیار کرنا چاہئے۔ غرض کہنا یہی ہے کہ اگرچہ "شہادت در شہادت" چار بار نہیں لاکھ بار ہو، لیکن اگر رواۃ ثابت ہوں، ثقہ ہوں، عدول ہوں، تو وہ بلا تامل و بلا تذبذب قبول کی جائیں گی۔ لیکن اگر حقیقۃً منکرین حدیث اس "شہادت، در شہادت، در شہادت" سے گھبراتے ہیں، تو ایک دوسری کتاب بھی ہے جس میں صرف "شہادت، در شہادت" ہے اور بس، یعنی موطا امام مالک۔ امام مالک تبع تابعی ہیں، وہ زہری سے روایت کرتے ہیں، جو تابعی ہیں، اور وہ صحابہ سے روایت کرتے ہیں، جو بلا ریب و شک عدول ہیں۔ امام مالک کی ثقاہت میں کسی کو شبہ ہی نہیں، اسی طرح زہری بھی غیر مشکوک ہیں، اور صحابہ پر زبان طعن دراز نہیں ہو سکتی۔ غرض موطا کے جتنے بھی طرق ہیں وہ تین یا چار سے نہیں بڑھتے اور وہ سرچشمۂ نبوت کے قطرے ہیں جن کی لطافت و پاکیزگی میں کون ہے جو شک کرے؟ موطا امام مالک کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اصح کتاب، بعد کتاب اللہ، موطا امام مالک ہی کو مانتے ہیں، پھر بخاری کو، پھر مسلم کو۔[1] لیکن اس کا کیا علاج کہ منکرین موطا کو بھی نہیں مانتے، آخر "فبای حدیث بعد اللہ و آیاتہ یومنون ۵" | اللہ اور اس کی ان نشانیوں کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے!

چھٹا اعتراض نہایت سنگین اور بہت زبردست ہے۔

> "ثقاہت کو تولنے کی کون سی میزان ہو سکتی ہے؟ کیا یہی کہ ثقہ لوگ ان کو ثقہ کہیں، پھر ان ثقہ کہنے والوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے جس کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی اور شہادت نہیں ہو سکتی لہٰذا حدیث کا سارا دار و مدار شروع سے آخر تک ظن پر ہے۔"

آخر اس کے علاوہ اور میزان ہو کیا سکتی ہے۔ کہ ثقہ کو ثقہ، ثقہ کہے؛ لیکن اس کے اس قول کی بنیاد ظن اور تخمین پر نہیں، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ پر ہوتی ہے، اسے جب یقین ہو جاتا ہے کہ جس کی ثقاہت کی میں تصدیق و توثیق کر رہا ہوں وہ وہ ہے جس نے عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں کہا، دروغ بیانی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب طبقات الحدیث۔

سے کام نہیں لیا، کذب و دجل اپنا پیشہ نہیں بنایا، اس کی ساری عمر حق پژوہی اور راست گوئی میں گزری، اس کی زندگی کا ایک ایک صفحہ اس کی دیانت، راستبازی اور صداقت شعاری کا زبان حال سے ترجمان ہے، تب اس نے شہادت دی کہ ہاں یہ ثقہ ہے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ ثقہ نہیں تسلیم کیا جا سکتا تو آخر اور معیار صداقت ہے کیا؟ رہا یہ سوال کہ اب خود اس توثیق کرنے والے کی ثقاہت معرض بحث میں آتی ہے، تو اس کا جواب بھی وہی ہے تا آنکہ یہ سلسلہ صحابہ تک پہونچ جائے، جو سب کے سب عدول ہیں اور ان سے رسول تک جس نے ان صحابہ کی توثیق کی، انھیں ستارہ بنایا کہ جو اس کی رہنمائی قبول کرے گا ہدایت پائے گا، اس طرح یہاں آکر یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

لیکن

"رواۃ میں طبقہ اول صحابہ کا ہے۔ ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں، صحابہ کرام کی عظمت وجلالت شان کی وجہ سے ہم اس اصول پر جو غیر صحیح، قرآن کے خلاف، اور محض عقیدت مندی کا فیصلہ ہے، بحث کرنا پسند نہیں کرتے لیکن اس امر پر اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے، حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن میں ہے 'ومن اہل المدینۃ مردوا علی النفاق لا تعلمہم نحن نعلمہم' مسلمان کہلاتے تھے اور رسول اللہ تک کو ان کے نفاق کا علم نہ تھا، نیز واقعہ افک میں جو لوگ شریک تھے، جن پر حد قذف پڑی جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا 'لا تقبلوا شہادۃً ابداً' وہ بھی مسلمان کہے جاتے تھے، علاوہ بریں ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا 'لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض' دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑکر باہمی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا، ان کو بھی ابوبکر و عمر کے ساتھ ثقاہت کے پلہ میں ہموزن رکھ دیا جاتا ہے۔"

پہلے اس "فتنہ" کے مسئلہ کو صاف ہو جانا چاہیے، پھر عدالت صحابہ پر گفتگو ہوگی، صحابہ کی باہمی لڑائیاں مثلاً حضرت علی اور حضرت عائشہ کی جنگ، درحقیقت کسی نفسانی جذبہ کے ماتحت نہیں تھیں بلکہ "حسن نیت"

کے ساتھ "غلط فہمی" کا نتیجہ تھیں' اور

الاعمال بالنیات	اعمال کا مدار نیت پر ہے۔

اس لئے ان بزرگان امت کی یہ اجتہادی غلطی نہ فتنہ تھی نہ "ایک دوسرے کا گلا کاٹنے" کے مرادف۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی حضرت عائشہ کا ہمیشہ احترام فرماتے رہے' کبھی آپ نے ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی' بلکہ ام المومنین' ام المومنین کہتے رہے' ورنہ اگر نفسانیت کی خاطر ہوتی' کسی مقصد نفس کے ماتحت ہوتی' تو دوسرے صحابہ اس میں کیوں آلودہ ہوتے' اور خود حضرت عائشہ جن کی برأت خود قرآن نے کی' اور حضرت علی جن کو رسالت پناہ نے بمنزلہ ہارون ؑ کے کہا' کیوں کر ایسی غلطی فرما سکتے تھے؟ کیا قرآن اس ہستی کی برأت کر سکتا تھا جو فتنہ و فساد میں ملوث ہونے والی ہو؟ کیا رسول اللہ اسے بمنزلہ ہارون علیہ السلام کہہ سکتے تھے جو جنگ و جدل کرے' نہیں اور یقیناً نہیں۔ یہ صرف ان بزرگان امت کی اجتہادی غلطی تھی' جس کا بعد میں ہر ایک کو اعتراف بھی تھا' اور ثبوت یہ ہے کہ حضرت علی نے حضرت عائشہ کو' اور حضرت عائشہ نے حضرت علی کو کبھی برا بھلا نہیں کہا' بلکہ اپنے اپنے ذمے سے درگزر فرمایا۔ اور اگر اسے فتنہ تسلیم کر لیا جائے' تو (معاذ اللہ) قرآن نے غلطی کی کہ برأت کی' اور (نعوذ باللہ) رسول اللہ نے بے جا کیا کہ حضرت علی کو بمنزلہ حضرت ہارونؑ سمجھا۔ خدا ہم پر رحم کرے' ہماری لغزشوں کو معاف کرے' حالانکہ ایسا نہیں تھا' قرآن کو تمام باتوں کا علم تھا' سرکار رسالت کی چشم بصیرت ہر چیز کا مطالعہ کر رہی تھی' قرآن نے جو کچھ کہا' سچ کہا' اور رسول نے جو کچھ فرمایا' صحیح فرمایا' والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ہم المتقون۔

اب صحابہ کی عدالت پر گفتگو آتی ہے' امت کا صحابہ کرام کی عدالت و ثقاہت پر جو اجماع ہے' اور ان کو نقد و بحث' اور جرح و تعدیل سے جو ماورا تصور کیا جاتا ہے اس کی وجہ "محض عقیدت مندی" نہیں ہے' بلکہ کچھ اور ہے۔ علامہ ابن حجر نے اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی پیش نظر رہے۔

اتفق اہل السنۃ علی ان الجمیع عدول ولم یخالف فی ذلک الا شذوذ من المبتدعۃ وقد ذکر الخطیب	حضرات اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ عدول ہیں' اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے سوا مبتدعہ کی ایک مختصر سی ٹولی کے

في الكفاية فصلاً نفيساً في ذلك فقال عدالة الصحابة
ثابتة معلومة بتعديل الله لهم واخباره عن طهارتهم واختياره
لهم فمن ذلك قوله تعالى "كنتم خير امة اخرجت للناس"
وقوله "وكذالك جعلناكم امة وسطا" وقوله "لقد رضي
الله عن المؤمنين اذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم
ما في قلوبهم" وقوله "السابقون الاولون من المهاجرين
والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضي الله عنهم و
رضوا عنه" وقوله "يا ايها النبي حسبك الله ومن اتبعك
من المؤمنين" وقوله "للفقراء والمهاجرين الذين
اخرجوا من ديارهم واموالهم يبتغون فضلا من الله
ورضوانا وينصرون الله ورسوله اولئك هم
الصادقون" الى قوله "انك رؤف الرحيم" في آيات
كثيرة يطول ذكرها واحاديث كثيرة يكثر تعدادها -
وجميع ذلك يقتضي القطع بتعديلهم ولا يحتاج احد منهم
مع تعديل الله له الى تعديل احد من الخلق على انه
لو لم يرد من الله ورسوله فيهم شيء مما ذكرناه لاوجبت
الحال التي كانوا عليها من الهجرة والجهاد ونصرة
الاسلام وبذل المهج والاموال وقتل الآباء والاولاد
والمناصحة في الدين وقوة الايمان واليقين القطع
على تعديلهم والاعتقاد لنزاهتهم وانهم افضل من
جميع المخالفين بعدهم والمعدلين الذين يجيئون

خطیب نے "کفایہ" میں نہایت نفیس بحث اس موضوع پر کی
ہے وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کی عدالت وثقاہت تو خود خدا کی
تعدیل کے بموجب ہم مانتے ہیں مثلاً "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس"
اور "کذلک جعلناکم امۃ وسطا" اور "لقد رضی اللہ عن المومنین
اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبہم" اور "السابقون الاولون
من المہاجرین والانصار والذین اتبعوہم باحسان رضی اللہ عنہم
ورضوا عنہ" اور "یا ایہا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین"
اور "للفقراء والمہاجرین الذین اخرجوا من دیارہم واموالہم یبتغون
فضلا من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ھم
الصادقون" - غرض بہت سی آیتوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ صحابہ
عادل ہیں ثقہ ہیں - ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی
تعدیل کے بعد اب وہ کسی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں، اور اگر
خدا و رسول کی طرف سے یہ کچھ نہ وارد ہوتا جو ہم نے ذکر کیا ہے
پھر بھی ان کے گراں قدر خدمت، ہجرت، جہاد، اسلام کی مدد،
جان کی قربانی، مال کی قربانی، آباء و اولاد کا قتل راہ اسلام
میں، مناصحۃ فی الدین، قوت ایمان، اور عزم و ثبات یہ سب اس
پر شاہد عادل ہیں کہ وہ عادل ہیں اور وہ اپنے تمام مخالفین سے
اعلیٰ وافضل ہیں، اور ان معدلین سے بھی جو ان کے بعد ان پر
جرح کرنے پر آمادہ ہیں، یہی تمام علماء کا مسلک ہے، ابو زرعہ
رازی کہتے ہیں کہ جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو صحابہ میں سے کسی
کی تنقیص کر رہا ہو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے، اور اس پر اپنا ایمان

من بعدہم - ہذا مذہب کافة العلماء ومن لقیہ قولہ
ثم روی بسندہ الی ابی زرعة الرازی قال اذا
رأیت الرجل ینتقص احدا من اصحاب رسول اللہ
فاعلم انہ زندیق، وذلک ان الرسول حق، والقرآن
حق وماجاء بہ حق وانما ادی الینا ذلک کلہ الصحابة
وہولاء یریدون ان یجرحوا شہودنا لیبطلوا الکتاب و
السنة والجرح بہم اولی وہم زنادقة۔ والاحادیث
الواردة فی تفضیل الصحابة کثیرة من ادلہا علی المقصود
مارواہ الترمذی وابن حبان فی صحیحہ من حدیث
عبداللہ بن مغفل قال قال رسول اللہ ﷺ اللہ،
اللہ، فی اصحابی لا تتخذوہم غرضا فمن احبہم فبحبی احبہم
ومن ابغضہم فببغضی ابغضہم ومن آذاہم فقد آذانی
ومن آذانی فقد آذی اللہ ومن آذی اللہ فیوشک
ان یاخذہ، قال عبداللہ بن ہاشم الطوسی حدثنا
وکیع قال سمعت سفیان یقول فی قولہ تعالیٰ قل
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی قال ہم
اصحاب محمد، والاخبار فی ہذا کثیرة جدا فلنقتصر علی
ہذا القدر ففیہ مقنع ۔ [1]

دکھو کہ رسول حق ہے، قرآن حق ہے اور جو کچھ وہ لایا برحق ہے اور
یہ کہ وہ تمام لوگ جو ان پر جرح کرنا چاہتے ہیں وہ کتاب وسنت کو
باطل کرنا چاہتے ہیں، اور بہتر یہ ہے کہ خود ان پر جرح کی جائے،
وہ سب کے سب زنادقہ ہیں۔ اور صحابہ کی تفضیل میں احادیث
بھی بہت کثرت سے وارد ہیں مثلاً ترمذی اور ابن حبان نے
اپنی "صحیح" میں عبداللہ بن مغفل کی حدیث ذکر کی ہے کہ میرے
اصحاب کو اپنے خرافات کی آڑ نہ بناؤ، جو ان سے محبت کرتا ہے
وہ میری وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے، جو ان سے بغض رکھتا
ہے، وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے
جس نے ان کو تکلیف پہونچائی، اس نے مجھے تکلیف پہونچائی اور
جس نے مجھے تکلیف پہونچائی اس نے اللہ کو اذیت دی، اور
جس نے اللہ کو اذیت دی تو اس سے بلاشبہ مواخذہ کیا جائیگا۔
عبداللہ ہاشم طوسی کہتے ہیں کہ مجھ سے وکیع نے کہا کہ میں نے
سفیان سے سنا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "اے رسول کہدے کہ
ان بندوں پر سلامتی ہو جو پاک وصاف کئے گئے" تو کہا کہ وہ اصحاب
محمد ہیں، جن کو اللہ نے پاک وصاف کیا، اور اس جگہ وہی مراد
ہیں، اس موضوع پر اور احادیث بھی بہت زیادہ مروی ہیں،
لیکن اس جگہ اتنا کافی ہے۔

ابن حجر کی یہ بات بہت زیادہ وزن رکھتی ہے کہ اگر قرآن وحدیث میں یہ کچھ نہ بھی وارد ہوتا تو بھی ان

---

[1] مقدمة الاصابة فی تمییز الصحابة صفحہ ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵۔

کی عدالت و ثقاہت غیر مشتبہ اور شک و شبہات سے پاک تھی اس لئے کہ جس جماعت نے ہجرت کے مصائب برداشت کئے ہوں وطن عزیز کو چھوڑا ہو، اعزا و اقربا کو چھوڑا ہو، جہاد کیا ہو، اپنی جانیں قربان کی ہوں، اپنا مال راہ خدا میں لٹایا ہو، غرض طرح طرح کے آفات و مصائب کا مقابلہ کیا ہو اور یہ سب محض دین کے لئے کیا ہو تو ان کو اگر عادل نہیں مانئے گا تو کسے مانئے گا؟ بلاتشبیہ یوں سمجھئے کہ مہاتما گاندھی جی کے جو حالات "نیشنلسٹ اور کانگرسی" حضرات کے سامنے ہیں ان کی بنا پر کون ہے جو انھیں غیر عادل قرار دے، اور اگر ایسا کرے تو یقیناً وہ نیشنلسٹ نہیں، کانگرسی نہیں۔ اسی طرح بلاتمثیل صحابہ کے حالات و واقعات کی موجودگی میں کون ہے جو ان پر زبان طعن دراز کرے اور اگر کرے تو وہ مسلمان نہیں، بقول ابن حجر کے زندیق ہے، اور پھر قرآن وحدیث کی توثیق مستزاد، نراظن نہیں بلکہ "آسمانی مہر" بھی ہے، اور پھر اس پر بھی نظر ڈالئے کہ صحابہ جب روایت کرتے تھے تو اپنی ذمہ داری کا وہ کس قدر خیال رکھتے تھے، اس لئے کہ ان کے سامنے یہ وعید بھی تھی کہ

من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار	مجھ پر جو دیدہ و دانستہ دروغ بیانی کرے اسے چاہئے کہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنائے۔

چنانچہ اس حدیث کے پیش نظر وہ حدیث بیان کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور جب بیان کرتے تھے تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی غلطی نقل قول میں ہو جائے، وہ لرزنے لگتے تھے، کانپنے لگتے تھے، ان کی گھگھی بندھ جاتی تھی مثلاً حضرت ابن مسعود صحابی جلیل القدر کا یہ واقعہ خاص طور سے غور طلب ہے کہ

عن ابی العلیس عن مسلم البطین عن ابی عمرو الشیبانی قال کنت اجلس الی ابن مسعود لا یقول، قال رسول اللہ، فاذا قال، قال رسول اللہ، استقلتہ الرعدۃ وقال ہٰکذا، او نحو ذا، او قریب من ذا، او، او[1]	عمرو بن الشیبانی کہتے ہیں کہ میں ابن مسعودؓ کے پاس بیٹھا کرتا تھا، وہ "قال رسول اللہ" کبھی نہیں کہتے تھے، اور جب "قال رسول اللہ" کہتے تھے تو مارے ڈر کے کانپنے لگتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ نے "اس طرح فرمایا" یا "ایسا ہی فرمایا" یا "تقریباً ایسا ہی فرمایا" یا، یا، یا،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابن مسعود الامام ربانی،

ڈر کا یہ عالم تھا، اپنی ذمہ داری کا یہ احساس تھا، رسول اکرم پر غلط گوئی سے بچنے کی اس درجہ احتیاط تھی، لیکن کرتے کیا؟ امت تک رسول کا "اسوۂ حسنہ" بھی پیش کرنا ضروری تھا، اس لئے حدیث بیان کرتے تھے لیکن پورے حزم و احتیاط کے ساتھ۔ اب اگر اس کے بعد بھی ان کی عدالت و ثقاہت غیر مشتبہ ہے تو مجھے نہیں معلوم دنیا میں ثقاہت اور عدالت کا معیار کیا ہے؟

اس جگہ ایک اور خیال کی تصحیح بھی ازبس ضروری ہے، کہ احادیث کی تدوین و اشاعت، اور ضبط و کتابت کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا۔ یہ سلسلہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا تھا، چنانچہ طاہر جزائری کہتے ہیں کہ لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ عصر صحابہ اور اوائل عہد تابعین میں سوائے قرآن کے اور کچھ ضبط کتابت میں نہیں آیا تھا، حالانکہ ثبوت اس کا بھی موجود ہے کہ کتابت کا کام خود عہد نبوی اور عصر صحابہ میں شروع ہو گیا تھا، چنانچہ زید بن ثابت نے "علم الفرائض" میں ایک کتاب تالیف کی تھی، اور بخاری نے اپنی "صحیح" میں وہ واقعہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابوہریرہ نے عبداللہ بن عمرو کو اپنے سے افضل بالحدیث اسلئے تسلیم کیا کہ وہ لکھ لیتے تھے۔[۱] چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کتابت کا جو حکم ابوبکر بن حزم کو دیا تھا، وہ خود جلیل القدر تابعی تھے اور وہ صحابہ میں سے، سائب بن یزید، عباد بن تمیم اور عمر بن سلیم الزرقی اور عمرۃ اور خالدہ بنت انس سے حدیث روایت کرتے تھے، اور اس حکم کے بعد انھوں نے اسے لکھ لیا۔[۲] اسی طرح زہری بھی جلیل القدر تابعی ہیں، انھوں نے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے حدیث لکھی اور مدون کی۔ زہری صحابہ میں سے ابن عمر، سہل بن سعد، انس بن مالک، محمود بن الربیع، سعید بن المسیب اور امامۃ ابن سہل سے اور دیگر صحابہ اور کبار تابعین سے روایت کرتے ہیں، ان کے شاگردوں میں بھی بڑے بڑے اساطین علم و فضل نظر آتے ہیں مثلاً معمر، اوزاعی، لیث، مالک اور ابن ابی ذئب وغیرہ۔[۳] غرض یہ معاملہ تو بالکل صاف ہے کہ حدیث کی اشاعت اور کتابت کا کام عہد نبوی میں کچھ کچھ، اور عہد صحابہ، اور عصر تابعین میں باقاعدہ شروع ہو گیا تھا، آگے چل کر ایک نہایت دردناک منظر پیش کیا ہے،

---

[۱] و [۲] و [۳] توجیہ النظر۔

جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ

"صحابہ کے بعد ہر ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کرکے جرح و تعدیل کے سلخ میں لائے جاتے ہیں اور ان کی پوست کشی کی جاتی ہے، بہت سے خبیث، کذاب اور دجال وغیرہ قرار دئے جاتے ہیں اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے اور یہ سب کچھ محض ظن زری تخمین۔"

اگر منکرین حدیث اس جرح و تعدیل کے نتائج کو جو قانون شہادت کی سخت سے سخت شرائط کو پوری کرتے ہیں، محض ظن زری تخمین قرار دیتے ہیں تو پھر منکرین قرآن کی زبان کیسے بند کریں گے شک جب بڑھتا ہے تو مرض بن جاتا ہے اور وہم کہلاتا ہے جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں۔

ساتواں اعتراض اور زیادہ اہم ہے کہ قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے اور حدیث تفریق۔ منکرین حدیث سے گزارش یہ ہے کہ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن موجودہ زمانہ میں تو "اہل قرآن" برعکس معاملہ پیش کر رہے ہیں۔ اچھا خاصا سکون تھا، اطمینان تھا، سب لوگ حدیث کو مانتے چلے آرہے تھے اور دفعۃً ان ارشادات عالیہ نے تفریق پیدا کردی ہے اور یہ بڑھتی جائے گی جب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ، وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ
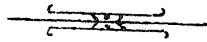
شام میں آثار قدیمہ کے عجائب خانے

(حضرت علامہ محمد کرد علی وزیر تعلیمات و صدر مجمع علمی عربی شام نے دمشق کے آثار قدیمہ پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ ناظرین جامعہ کی دلچسپی کے لئے اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ قدیم اشیاء کی موجودہ تمدن کو کیوں ضرورت ہے، نہایت معمولی چیز اپنی تاریخی اہمیت کے ساتھ کس قدر قیمتی ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں بھی قدیم اشیاء نہایت کثرت سے موجود ہیں۔ کاش ہم اپنی ان چیزوں کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور ان کو ضائع ہونے سے بچا سکیں۔) (مترجم)

مغرب میں عجائب خانوں کی تنظیم و ترتیب جو آج کل موجود ہے وہ زیادہ تر انیسویں صدی کی پیداوار سمجھی جاتی ہے خصوصاً آثار قدیمہ کی تقسیم و تفریق اس زمانے میں جس اصول پر کی گئی ہے وہ واقعی قابل داد ہے۔ مشرق میں بھی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قدیم الایام سے اس طرف کچھ نہ کچھ توجہ تھی۔ ایتھنز[1] دارالحکومت یونان میں ایک نگار خانہ عرصہ دراز سے تھا۔ اس میں قدیم چیزیں و تصاویر جمع کی گئی تھیں۔ روم کی بہترین چیزیں وہی ثابت ہوئیں جن کو اس نے یونانیوں سے لے کر اپنے عجائب خانوں میں رکھا تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں اس قسم کے عجائب خانے بنانے اور انہیں چیزیں رکھنے کا یورپ میں مذاق نہ تھا۔ البتہ ایسی نادر روزگار تاریخی چیزیں بادشاہوں کے محلوں، گرجوں میں یا یہود کے عبادت خانوں میں محفوظ تھیں۔ زمانۂ حال میں سب سے پہلے بڑے بڑے اٹلی کے مصوروں کو ایسے مکانات کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا کہ جہاں وہ اپنی تصاویر جو نادر زمانہ ہوں رکھ سکیں۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس طرح

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار بھی قدما کی تقلید میں یونان کا شمار مشرقی ممالک میں کرتے ہیں۔ (مدیر)

سے عجائب خانوں کی ابتدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ بڑے بڑے شہروں میں عجائب خانے لوازم تمدن میں شمار ہونے لگے۔ بادشاہوں اور بڑے بڑے امرا نے وہ بیش بہا اشیا جو انھوں نے تحفۃً یا قیمتاً حاصل کی تھیں انھیں دے دیں۔ نادر تصاویر، خطاطی کے بہترین نمونے، اسلحہ جنگ، زیورات و آلات موسیقی وغیرہ سب اس میں شامل تھے۔

عرب کے تہذیب و تمدن کے زمانے میں ہمیں تاریخ سے ایسے عجائب خانوں کا پتہ نہیں چلتا لیکن ان کی تہذیب و تمدن کے آثار ان عجائب خانوں کی جگہ ان کے بادشاہوں کے محلوں، ان کی جامع مسجدوں میں آج تک موجود ہیں خصوصاً جامع مسجد بنی امیہ کی یادگار دمشق میں بیت المقدس کی جامع مسجد اور قاہرہ و بغداد کی جامع مسجدیں ہیں۔

قصر حمرا و قصر زہرہ اندلس میں آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح خلفائے عباسیہ کے محلات بغداد میں، خلفائے فاطمیین کے قاہرہ میں، عثمانیہ کے قسطنطنیہ میں اور شاہان ہند کے دہلی وغیرہ میں ہیں اور وہ اُسی زمانہ کی تہذیب و تمدن کی یادگار ہیں۔ جس طرح آج کل امرا اور بادشاہ اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں فخر کرنے کے لئے ایسی عجائبات کا مجموعہ رکھنا پسند کرتے ہیں اسی طرح قدیم مشرقی امرا کو بھی اس کا شوق تھا۔ ان کے محلوں میں ان کی طبیعت کے اختلاف کے لحاظ سے اس قسم کی مختلف اشیا موجود رہتی تھیں۔ چنانچہ ملک شام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس وقت تک یہاں ایسے مکانات موجود ہیں جن میں اس قسم کے رنگا رنگ نوادر جمع ہیں۔ چنانچہ چینی و کاشانی سامان، قدیم زمانے کے جنگی ہتھیار اور اوزار، سونے چاندی کے قدیم زیورات و ظروف باوجود مختلف حادثات کے جو اس ملک پر زمانۂ ماضی میں گذرتے رہے اب بھی موجود ہیں۔ جس طرح نادر کتب کا جمع کرنا قرطبہ کا خاصہ تھا اسی طرح نایاب اشیا ملک شام میں جمع ہوتی رہیں۔ اور اس میں دمشق کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ حلب میں بھی ایسے عجائبات موجود ہیں۔

قرون وسطیٰ میں فاتحوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی چیزیں خصوصاً زیورات وغیرہ لوٹ میں لے جاتے تھے۔ چنانچہ تیمور لنگ بہت سی نادر چیزیں اور اس زمانے کی عجائب روزگار اشیا دمشق سے

لے گیا۔ سلطان سلیم فاتح مصر عثمانی بھی تیمور سے اس بارے میں کم نہیں رہا - بہترین اشیار جو وہ لے جا سکا
لے گیا۔ اور قسطنطنیہ کے محل ان سے آراستہ کیے گئے۔ بعض مورخین ذکر کرتے ہیں کہ اندلس کے
عربی الاصل بادشاہ اپنے محلوں کو نہایت نفیس اور خوبصورت تصاویر اور مجسموں سے مزین کرتے تھے اور
اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ تصاویر اور مجسمے انسان کے بھی ہوتے تھے اور جانوروں کے بھی۔
جنگ صلیبی کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی یورپی لوگ شامی ممالک کی اشیار اپنے مکانات اور گرجوں
میں رکھنا اور اپنے محلات کو ان سے مزین کرنا باعث فخر سمجھا کرتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اہل یورپ
نے وہ تمام چیزیں جو قدیم لوگوں کی بہترین دستکاری کا اعلیٰ نمونہ اور ان کی تہذیب و تمدن ترقی کی تاریخی
شہادت تھیں اپنے ملکوں میں پہنچا دیں اور وہاں کے عجائب خانوں میں داخل کر دیں۔ اس طرح انھوں
نے مشرق کو خود اس کے اسلاف کے خزانوں سے محروم کر دیا۔ پتھر کے کتبے، تصاویر، اصنام، نادر علمی
کتابیں، عہد حجری کی اشیار جو یمن و شام میں دستیاب ہو سکیں یہ سب آج پیرس، لندن و برلن کے
عجائب خانوں کی زینت ہیں۔

ہمارے علمار آثار قدیمہ نے سفر کر کے خود ان مقامات کو دیکھا ہے اور انھوں نے ثابت کیا ہے کہ
کیا کیا سامان ہمارے ملک میں موجود تھا جس کو یورپ ہم سے لے گیا اور ہم غفلت میں سوتے رہے -
ہم نے چپ چاپ یہ نقصان برداشت کر لیا اور احتجاج کی ایک آواز بھی نہ اُٹھی - جب یورپ و
امریکہ کے رسالوں نے ان پر مضامین لکھے تب ہم کو معلوم ہوا کہ ہمارے پاس کیا دولت تھی جو ہم نے کھو دی۔

اب ہم باشندگان شام نے ان اشیار کی برآمد تو جہاں تک ہو سکا ہے بند کر دی ہے اور اس کی حفاظت
کا خاص انتظام بھی کیا ہے۔ ہماری بے پروائی کی اب وہ حالت تو نہیں رہی جو زمانہ سلطنت عثمانیہ میں
تھی کہ یہ یادگار چیزیں یہاں سے جا رہی تھیں اور ہم خوش تھے، یورپ اپنی تہذیب و تمدن کی تاریخ
لکھ رہا تھا اور ہمیں ہوش تک نہ تھا کہ یہ کام ہمیں بھی کرنے کا ہے۔ تاہم ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ سلطنت
عثمانیہ کے زمانے میں بھی بہت نقصان ہو چکنے کے بعد آخر میں حکومت کو ادھر توجہ ہو گئی تھی اور اس نے
بعض بعض اشیار کی برآمد ممنوع قرار دیدی تھی۔ ترک خود وہ سامان جو صیدا و تدمر کے کھنڈروں وغیرہ سے

برآمد ہوا تھا لے گئے اور انھوں نے قسطنطنیہ کے عجائب خانے کو اس سے مزین کردیا۔ مسجد اقصیٰ میں صخرہ کے بعض غاروں کو انگریزی علمائ آثار قدیمہ نے عجیب طرح کھودا اور نہیں معلوم کیا کیا نادر اور قیمتی اشیا یہاں سے مغرب کو منتقل ہوگئیں۔ علمائے آثار کی بہت جماعتوں نے ہمارے ملک میں کھنڈروں کے کھودنے اور سامان نکال نکال کر یورپ لے جانے کا مدت تک مستقل طور پر کام جاری رکھا۔ حکومت عثمانیہ نے اپنا ذاتی حق بھی ان سے نہیں لیا۔ جو مال خود ہم نے اور ہمارے بھائیوں نے ضائع کیا ہے اس پر کہاں تک رنج والم کا اظہار کیا جائے۔ یہی غنیمت ہے کہ صلح کانفرنس منعقدہ پیرس میں ان نادر اشیا کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا جو جنگ عظیم کی حالت میں برلن و پیرس پہنچ گئی تھیں۔

ہم نے جنگ عمومی سے کچھ مدت قبل حکومت عثمانیہ کو بھی متوجہ کیا تھا کہ وہ دمشق میں ایک چھوٹا سا عجائب خانہ کھول کر نادر اشیا و آثار قدیمہ کی حفاظت کرے لیکن ارباب حکومت ترکی ہمیشہ یہی خیال پیش نظر رکھتے تھے کہ ہر طرح کی برتری و فوقیت شہر قسطنطنیہ کو حاصل رہے باقی تمام شہر اور قصبوں کی حالت نوآبادیات سے زائد نہ ہو۔ اس لئے ہماری تجویز پر عمل نہ ہوسکا۔

جب ملک شام میں عربی نظام حکومت قائم ہوا تو اہل ملک کی رائے پر مدرسہ عدلیہ میں جو قرون وسطیٰ کے عرب کی بہترین یادگار ہے ایک عجائب خانہ کھول دیا گیا۔ اس طرح ملک شام کا یہ پہلا عربی عجائب خانہ قائم ہوا۔ اس کے قائم کرنے والوں نے اس کا جدید نظام یورپی طرز پر رکھا ہے۔ اگر چند سال اسی طرح گذر گئے تو خدا تعالیٰ سے اُمید ہے کہ اس ملک کی نادر اشیا چار ہزار سال سے اس وقت تک کی اس عجائب خانے میں جمع کردی جائیں گی۔ اور عربوں کی اعانت سے اس عربی عجائب خانے کی زندگی پائدار ہوجائے گی۔ جن لوگوں کے پاس اس قسم کے تحائف و عجائبات تھے انھوں نے اسی خیال سے ان اشیا کو عجائب خانے میں منتقل کرکے بڑی فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عجائب خانہ اس ملک کی جدید تمدنی سرگرمیوں کا پہلا مرحلہ ہے اور یہ ثابت کردے گا کہ ہمارے بزرگ اُس زمانے میں تہذیب و تمدن کے کس مرتبے پر پہنچے ہوئے تھے، زمانۂ حاضرہ کو ان سے کیا تعلق ہے، یہ دور کس طرح ان کا شاگرد ہوا اور اس نے اپنے استادوں سے کیا کیا باتیں سیکھیں اور کن کن امور میں کیا کیا

اختراع کی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ قدمار کے ذہن کو ان امور سے کہاں تک مناسبت تھی۔

یورپی حکومتیں گزشتہ صدی میں مسلسل اپنے وفود ملک شام میں کھدائی کے لئے بھیجتی رہی ہیں تاکہ نادر و قدیم اشیاء برآمد کرکے انھیں اپنے ملک کی زینت بنائیں۔ ان جماعتوں نے بہت سے کھنڈر کھود کھود کر بہت کچھ قدیم اشیاء برآمد کرلیں خصوصاً فرانس نے ۱۸۶۰ء میں جو جماعت اس غرض کے لئے شام میں اور انگلستان نے فلسطین میں بھیجی تھی انھوں نے بہت سامان برآمد کیا اور اپنے اپنے ملکوں کو لے گئیں۔ اس کامیابی کا اثر یورپ میں یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اپنی کوشش اس بارہ میں دگنی چوگنی کردی۔ فرانس نے موسیو رنان، ڈلوک، موسیو دوسلسی، دوفوکوین، کلرمون گانو، دوسو و فانزان وغیرہ کی سرکردگی میں جماعتیں روانہ کیں۔ اس طرح انگلستان سے سٹرا ونیس، مادن، سایس، ولیسن، فارین وغیرہ کی جماعتیں آئیں جرمنی سے ٹوئیلیس کا وفد اور سوئٹسان والوں نے مارکس وان برشیم کو بھیجا۔ ان جماعتوں نے چوکیداری کا کام کیا۔ اس میں مخصوص مقامات حسب ذیل تھے:۔

تل الصی، تل زکریا، تل صافی، تل جدیدہ، تل جزر، تل تعناک، تل متسلم، عکہ، یافا، قدس، صیدا، صور، جبل، عمریت، جزیرہ ارواد اور بعلبک۔

ان کے علاوہ بہت سے مقامات شمالی شام کے بھی کھودے گئے تھے۔

یہ جماعتیں نہایت کوشش و جانفشانی سے اپنے کام میں مصروف تھیں اور انھوں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اس وقت حکومت عثمانی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ کیا کچھ اس کی ملکیت سے خارج ہو ہو کر دوسروں کے قبضے میں جا رہا ہے۔ اس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی کہ یہ قیمتی تاریخی سامان شام میں رکھا جائے اور اس کے لئے کوئی مناسب جگہ مخصوص کی جائے۔ حکومت عثمانیہ کی نظر میں ان اشیاء کی وہ وقعت ہی نہ تھی جو یورپ کی سلطنتوں کی نظر میں تھی۔ اگر حکومت کو کبھی توجہ دلائی بھی گئی تو اس نے ہمیشہ یہی دلیل پیش کی کہ ایک ہی مرکز ایسا ہونا چاہیے جہاں یہ نوادر سب جمع ہوں تاکہ لوگوں کو اپنی ترقی کے زمانے کا اور ایک دوسرے کی حالت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو، اس لئے بہت سے عجائب خانے کھولنے کی جگہ صرف مرکز میں ایک بڑا عجائب خانہ

ہونا کافی ہے اور اپنی دلیل کو قوی کرنے کے لئے یہ بھی کہدیا جاتا تھا کہ یورپ کے ممالک کی اور علمار آثار کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن افسوس وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مختلف قومیں مختلف زمانوں میں مختلف قسم کی ترقی و تمدن کی مالک رہی ہیں، وہ آج سلطنت عثمانیہ کے ماتحت زندگی گزار رہی ہیں۔ ان سب کے مختلف زمانوں کے کاموں کو ایک جگہ جمع کرنا اور خود ان کے ملکوں کو اس سے محروم کر دینا کہاں تک مناسب تھا۔

بہر حال سلطنت عثمانیہ نے اس امر میں کچھ کیا بھی تو وہ صرف قسطنطنیہ ہی کے لئے کیا۔ اور جب یورپ کے ممالک میں یہ نوادر پہنچیں اور ان کی اشاعت ہوئی تو اور لوگ بھی اس مال غنیمت کے حصول کے لئے دوڑے اور لوگوں نے تجارت کی غرض بھی شامل کر لی۔ یہ تجار اپنے اپنے ملکوں میں بڑے ذی اثر تھے۔ انھوں نے بہت کچھ ان امور میں کامیابی حاصل کی اور اپنے ملکوں کو خصوصاً اور دیگر یورپ کو عموماً ان نوادر سے مالا مال کر دیا۔

ایک عیسائی یونیورسٹی امریکہ کی ان سب تجار پر فضیلت لے گئی۔ اس کو بیروت میں قیام اور اپنا کام جاری کرنے کی اجازت حاصل تھی۔ اس نے اپنے کام کے ساتھ کھدائی کا اور نوادر نکالنے کا کام بھی جاری کر دیا۔ اس کے لائسنس میں اس کو یہ اختیار حکومت کی طرف سے حاصل تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فورڈ نے حماۃ اور حلب و دیگر مقامات میں بہت کامیاب کھدائی کی اور بہت سے نوادر اس نے برآمد کئے۔ شامی ان اشیار کی کوئی قدر و قیمت نہیں جانتے تھے اور اگر کوئی جانتا بھی تھا تو وہ کوئی پروا نہیں کرتا تھا، بلکہ لوگ بہت تھوڑے تھوڑے روپیہ کے عوض اپنی ذاتی و شخصی اشیار و نوادر کو یورپ و امریکہ کے تجار کے ہاتھ فروخت کر رہے تھے یہاں تک رفتہ رفتہ ملک ان نوادر سے خالی ہو گیا۔

ان کھدائیوں سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ ہمارے آثار ہمارے پڑوسی ممالک کے مقابلہ میں مختلف رہے ہیں اور ان کے دیکھنے سے ہر طرح یہ ثابت ہوتا رہا ہے کہ شامی ہر معاملہ میں سادگی کے زیادہ دلدادہ تھے اور ان کی اصلی طبیعت اور ان کے معتقدات کی بنا پر یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ چنانچہ ان کے فلسفے، مذہب اور مصنوعات سے بھی اس کا پتہ ہمیں چلتا رہا ہے لیکن اس سادگی کے ساتھ انھوں نے خوبصورتی کا اضافہ کر کے اپنی صنائع کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

تاہم جو کچھ مل سکا اس سے شامیوں کے ذوقِ سلیم اور ان کی صنعتی سادگی و خوبصورتی کا پتہ چلتا ہے۔ بہ خلاف اہل مصر کے شامی اپنے مُردوں کے ساتھ نفیس سامان بہت کم رکھتے تھے جس کا ایک سبب یہ تھا کہ شام کی زمین مرطوب ہوتی ہے اور اس میں جو چیز دفن کی جائے وہ محفوظ نہیں رہ سکتی تاہم وہ مختلف قسم کی سادہ چیزیں دفن کرتے تھے۔ بادشاہ تشمونزار کی قبر ایک مرتبہ کھل گئی تو اس میں سے صرف ایک کتبہ برآمد ہوا جو ایسے قبور کھودنے والوں ہی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا "قبر کھود کر میری توہین نہ کرو اس میں سونا چاندی کچھ نہیں ہے"۔ اس سے اہل شام کے خیالات کا اندازہ کافی ہو جائے گا کہ وہ مردوں کے ساتھ قیمتی زیورات دفن نہیں کرتے تھے۔ جب بادشاہوں کا یہ حال تھا تو رعایا کی قبروں میں تو اس کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت میں ان کی دانشمندی اور مضبوطیٔ عقیدہ کی دلیل ہے جو قدیم سے ان میں پائی جاتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مفکرین دانشمند لوگ قدیم سے بہت سی لغو و بیہودہ باتوں سے پرہیز کرتے تھے اور اپنی قوم و ملک کو لغویت سے بچایا کرتے تھے۔ شامیوں کا عقیدہ مثل دیگر سامی اقوام کے یہ تھا کہ جسم ایک مادی چیز ہے اور مرنے کے بعد اس کی عزت و احترام میں اتنے مبالغے کی ضرورت نہیں جتنا دیگر اقوام نے اپنے اپنے ممالک میں جاری کر رکھا ہے۔ باوجود ان امور کے بھی ہمیں بعض بعض قبروں میں اور بعض مقامات پر کچھ اشیاء ملی ہیں ان کے لئے ہمارے پاس یہی دلیل ہے کہ عموماً شامی اس سے پہلے اکثر تاریخی ادوار میں غیر ممالک کے زیر اثر ہی رہے ہیں، یہ ان کا اثر تھا۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سیاست کا اثر ان کے امور معاشرت میں بھی ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

شامی عرصے سے ان اشیاء نوادر کی جن کو ہر سہ مذاہب یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں نے محفوظ رکھا تھا حفاظت کرتے رہے ہیں کیونکہ یہ ملک ان تینوں مذہبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اسی وجہ سے آثار شام کی عظمت بمقابلہ دیگر ممالک کے بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ نظام اجتماعی کے ساتھ ان آثار کو گہرا تعلق ہے۔ اسی سبب سے جمعیۃ الاقوام نے ان اشیاء کی حفاظت کے لئے خاص طور سے ایک دفعہ (۱۴) منظور کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان اشیاء کی کامل حفاظت کی جائے گی اور اس سلطنت کو جو شام کی نگراں ہو یہ حق نہیں ہوگا کہ کھدائی کے وقت کسی ملک کے یا کسی قوم کے علماء آثار کو ان اشیاء سے محروم کر دے۔ اس

سے کل اقوام و مذاہب کے لیۓ اثری تحقیقات کا دروازہ کھل گیا۔

اس بنا پر ان اشیاء کی حفاظت کے لیۓ ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس نے ایک جلسے میں یہ تجویز منظور کر لی کہ جملہ اشیاء کی حفاظت کی جائے۔ جو اشیاء نوادر سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اتحادی لے گئے تھے وہ واپس ہوئیں۔ افسران لشکر نے آثار شام پر خصوصیت سے توجہ مبذول کی یہاں تک کہ اپنے لشکروں میں جو آثار قدیمہ کے ماہر تھے ان پر شام کے آثار کی معلومات حاصل کرنا لازمی قرار دیا اور جو لوگ ان قدیم اشیاء کو خراب کرتے تھے ان کے خلاف سخت ہدایات نافذ کیں جن سے ان اشیاء کی کافی حفاظت ہوگئی۔ اسی سلسلہ میں بمقام مارسیلز اہل فرانس کی ایک انجمن ملک شام کے عام آثار پر بحث کرنے کے لیۓ منعقد ہوئی جس کی قراردادوں میں سے سب سے اہم یہ مطالبہ ہے کہ حکومت فرانس آثار قدیمہ کا ایک دفتر شام میں کھولے اور حکومت عثمانیہ نے جو اشیاء حاصل کر لی ہیں شام کے لیۓ ان کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ حکومت فرانس نے شام میں دفتر قائم کرایا اور انگلستان نے بھی فلسطین و شرق اردن میں آثار قدیم کا محکمہ کھول کر اس کی تقلید کی۔ امیر فیصل کے مختصر دور میں بھی اہل شام اس طرف متوجہ رہے اور انھوں نے امیر فیصل سے ان آثار کی حفاظت کے لیۓ عرض کیا۔ اس معروضہ کو ایک وفد نے جس کے صدر خطط شام کے مؤلف تھے پیش کیا اور درخواست کی کہ دمشق میں ان اشیاء کی حفاظت کے لیۓ ایک عجائب خانہ کھولا جائے۔ یہ درخواست نہایت خوشی سے قبول فرمائی گئی اور صدر وفد ہی کو حکم ہوا کہ وہ ترتیب و تنظیم عجائب خانہ کا کام کریں چنانچہ فرانس کے زیر اثر شامی حکومت نے ایک عجائب خانہ حلب میں بھی کھول دیا۔ اس کے بعد حکومت لبنان، جبل دروز، علویوں کی حکومتوں نے بیروت سویدا اور طرسوس میں یکے بعد دیگرے عجائب خانے کھول دیۓ۔

حکومت فلسطین و شرق اردن نے بھی بیت المقدس میں اور عمان میں عجائب خانے بنوائے۔ بہت تھوڑی مدت میں یہ عجائب خانے درست ہوگئے۔ کچھ سامان تو کھدائی کے ذریعے سے، کچھ ہدیوں کے طور پر اور کچھ لوگوں کے خریدنے اور کچھ حکومت کی امداد سے آیا۔ غرض اس طرح یہ کام مکمل ہوگیا۔

اب فرانس نے حسب ذیل مقامات پر کھدائی کا کام جاری کرنے کو چند مستقل جماعتیں بھیج دی ہیں

جنھوں نے صیدا و ام العوامید، کفر الجبرہ، بیروت، جبل القریہ، لبیا (حکومت لبنانیہ) اور سویدا، قنوات، شہبا، (جبل دروز)، طرسوس (حکومت علویین)، تل النبی (قدش قدیمہ)، مشرفہ (قطنا قدیمہ)، نیرب، ارسلان طاش، وقصر احمر (ملک شام) میں کھدائی کا کام جاری کر رکھا ہے۔ دو جماعتیں مشترکہ طور پر کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے قلعہ صالحیہ و تدمر کے اطراف میں دور اسا، اور بوس میں کھدائی شروع کی ہے۔ یہ مقام دریائے فرات کے کنارے پر ہے جہاں ںگو سلوفیا نے بھی ایک وفد کھدائی کے لئے بھیجا ہے۔ اس نے آثار شیخ سعدو تل ارفاد میں کام شروع کیا ہے۔ جرمنی نے راس العین میں حکومت سوریہ کے ماتحت شمالی شام کے علاقے میں اپنی ایک جماعت کے ذریعے کھدائی شروع کی ہے۔ انگریز و امریکہ اپنا دائرہ عمل صرف فلسطین شرق عربی تک ہی محدود کئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تل تسلم (نجد و قدیمہ)، ہبیان و سبسطہ (سمرہ قدیمہ)، سیشم و بیت جبرین و قدس شریف اور اس کے اطراف میں تابغہ و جرش میں کھدائی جاری کر رکھی ہے۔

دمشق کا عجائب خانۂ آثار قدیمہ جو مختلف اشیاء کو مذکورہ بالا ذرائع سے حاصل کر کے ترتیب دیا گیا ہے اس میں مختلف تاریخی زمانوں کے مختلف نوادر جمع ہو چکے ہیں خصوصاً عہد اسلامی کے نوادر خاص غور سے جمع کئے گئے ہیں۔ دمشق ہی وہ شہر ہے جو امرائے حکومت کا دار السلطنت رہا ہے اور اسلامی عرب کے تمدن کا گہوارہ تھا۔ دمشق ہی کو دیکھ کر ہم کو اسلامی عرب کی ابتدائی شان و شوکت کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہاں اس عجائب خانے کا ہونا اور ایسی جگہ تمام نادرات کا جمع کرنا ضروری تھا۔ دمشق میں جو آثار قدیمہ جمع ہیں وہ دوسرے شامی عجائب خانوں سے مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دمشق پر بہ مقابلہ دوسرے بلاد شام کے اسلامی عہد میں حکومت کی توجہ زیادہ رہی ہے۔

اس عجائب خانے میں علاوہ قیمتی اشیائے قدیمہ کے مختلف اسلامی عہد کے سکہ جات بھی ہیں، اور مٹی اور چینی کے ٹوٹے ہوئے یا سالم برتن بھی موجود ہیں۔ قرآن مجید کی مختلف آیات مختلف خطوط میں جو دستیاب ہو سکیں اور بعض مخصوص کلام مجید بھی ہیں جن پر سونے اور چاندی کا کام ہے۔ بعض بعض تختیاں ہیں جن پر اس زمانے کی خطاطی کا بہترین نمونہ دکھایا گیا ہے۔ رومی زمانے کی تختیاں بھی

ہیں۔ ان رومی تختیوں پر بھی مسلمانوں نے اپنے زمانے میں عربی خطوط میں اپنے کمال ذوق وعقیدت سے آیات قرآنی لکھی ہیں۔ اس سے ان کی کمال خطاطی کا پتہ چلتا ہے۔ بعض بعض تختیاں صرف نقش ونگار سے آراستہ ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کس کس قسم کے نقش ونگار مروج تھے اور ان کے بنانے والے اپنے اس سامان سے جو ان کو اس وقت میسر تھا کیا کیا کمالات دکھایا کرتے تھے۔ خط کوفی جو اسی زمانے کی ایجاد ہے اس کے مخطوطے جو اپنے عہد بہ عہد کی ترقی وتغیر کی داستان ناظرین کو بتاتے ہیں نہایت خوشخط خط کوفی میں لکھے ہوئے ہیں۔ پرانے کتبے بھی ہیں تابوت بھی ہیں جن پر نہایت نفیس نقش ونگار بنے ہوئے ہیں۔

ان تمام تختیوں اور مخطوطوں میں دو پتھر کی لوحیں ہیں جو سلجوقی اور ایوبی زمانے کی یادگار ہیں۔ ان پر جامع اموی دمشق میں جو ترمیم ہوئی اس کا حال درج ہے۔ ایک پر ۴۷۵ھ کی اور دوسری میں ایوبی زمانے کی ترمیم ومرمت کا حال ہے جو ۵۵۰ھ میں ہوئی۔

ایسے کتبے جو زیادہ تر امرائے شام وعلماء کی قبروں پر نصب تھے اور اب کھدائی کے سلسلے میں برآمد ہوئے بہت ہیں۔ یہ عموماً ساتویں اور آٹھویں صدی کے لوگوں کی قبروں کے سنگ مرمر کے تعویذ ہیں۔ ان کے آخر میں تاریخ ضرور ہوتی ہے۔ عربی خط کی ترقی اور ہر ہر عہد کے تغیرات کا ان سے کافی پتہ چلتا ہے۔

دوسرے درجے کی اشیا میں عربی آثار ہیں جو آٹھویں صدی ہجری کے ہیں اور بعض مٹکے بھی ہیں جو پکائی ہوئی مٹی کے بنائے گئے ہیں اور ان پر انسان وحیوان وطیور وغیرہ کی تصاویر ہیں۔ ایسے ہی پتھر کے مٹکے بھی ہیں۔ یہ تیرھویں صدی عیسوی میں عراق میں تیار ہوتے تھے اور ان کی مثال کسی اور ملک میں نہیں پائی جاتی۔

اسلام سے پہلے کے آثار میں قابل ذکر اشیا زیادہ تر کانچ کے سامان پر مشتمل ہیں۔ اس زمانے کی دنیا کے سب ملکوں کی کانچ کی چیزیں اگر دیکھی جائیں تو شام کی مصنوعات ان سے بڑھی چڑھی نظر آتی ہیں خصوصاً جو سامان تدمیر کے کھنڈروں سے حاصل ہوا ہے۔ وہ اس وقت اپنا جواب

نہ رکھتا تھا - ایک کانچ کے بت کا صرف سر دستیاب ہو سکا ہے - وہ بت شام کے کسی بڑے آدمی کا
سمجھا گیا ہے جس کا زمانہ ڈیڑھ دو ہزار سال قبل مسیح تھا - فرعون اول کے زمانے کے بت بھی ہیں -
ان میں ان جنگوں کی تصویریں ہیں جن میں اس نے اہل شام سے انتقام لیا تھا - رومی اور یونانی زمانے
کی بت تراشی و سنگ تراشی کے نمونے بھی ہیں -

بیروت میں بھی ایک عجائب خانہ قدیم اشیا کا تیار ہو گیا ہے - اس میں زیادہ تر فینیقی قوم کے تمدن و
تہذیب کے آثار ہیں جن میں بڑا حصہ برتنوں اور زیوروں کا ہے جو جبیل کی قبروں سے اور بعض
ان کے معبدوں کے کھنڈروں سے برآمد ہوئے ہیں - ان میں سے بعض اشیا تو دو ڈھائی ہزار
سال قبل مسیح کی ہیں اور بعض اٹھارہ سو سال قبل مسیح کی ہیں - ایک لوح پر احیرام کے بادشاہ کی
تصویر ہے جس کا ۱۳۰۰ قبل مسیح میں انتقال ہوا - اس کے دونوں طرف ان بادشاہوں کی
تصویریں ہیں جو اس کے ماتحت تھے - وہ اپنے دینی رسوم ادا کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں -
خود یہ بادشاہ حبشیوں کے کندھوں پر کھڑا ہے - اس وقت تک جس قدر لوحیں دستیاب ہوئی ہیں
ان سب سے زیادہ قدیم اور صاف یہی لوح ہے جس سے فینیقی اقوام کی قدیم ترین کتابت ظاہر ہوتی
ہے - ایک مٹی کا برتن بھی ملا ہے جس پر فرعون آمنحعت ثالث کا نام لکھا ہے - اس کا زمانہ ۱۸۵۰ یا
۱۸۰۰ قبل مسیح تھا - دو مٹی کے برتن اور ہیں ان پر آمنحعت رابع کا نام ہے - ایک پتھر کا برتن بھی مع
سرپوش ہے جو نہایت خوبصورت اور کمال صنعت کا نمونہ ہے - اس پر (خدام معبود ابن شمس آمنحعت
ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے) ہیروغلافی خط میں لکھا ہوا ہے - ایک چھوٹا سا سیاہ پتھر کا صندوق ہے جو
زیورات رکھنے کے لیے مستعمل تھا - اس پر سونے کا کام ہے جو بہترین دستکاری کا نمونہ ہے -
یہاں بہت سے مٹی کے برتن بھی جمع کیے گئے ہیں - کفر جرہ سے جو برتن نکالے گئے ہیں وہ خاص
طور پر دیکھنے کے قابل ہیں - یہ دو ہزار سال قبل مسیح کے بنے ہوئے ہیں - جبیل سے جو سامان
برآمد ہوا ہے وہ تاریخی یادگار کے اعتبار سے سب سے زیادہ قدیم ہے -

عجائب خانہ سویدا | سویدا جبل دروز کا دارالسلطنت ہے - جبل دروز میں زیادہ تر پتھر کا بہت نفیس

سامان تھا۔ یہ سامان زیادہ تر یونانی و رومی زمانے کا تھا لیکن افسوس شامی ہنگاموں میں ضائع ہوگیا۔
طرسوس علویین کے دارالسلطنت میں جو جدید عجائب خانہ ہے اس میں کوئی قابل ذکر نادر چیز نہیں ہے۔
حلب کے عجائب خانے میں بھی کوئی خاص چیز قابل ذکر نہیں ہے البتہ ارسلان طاش وتل الاحمر وتل ارفاد و نیرب سے جو سامان نکل رہا ہے وہ ضرور قابل لحاظ ہے۔
قدس شریف میں جو عجائب خانہ ہے اس میں زیادہ تر مٹی کے برتن اور بعض بعض معدنی اشیا ہیں۔ ان سے عہد بہ عہد کی ترقی اور ترمیم ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک پر جو جو تاریخی زمانے گزرے ہیں انھوں نے اپنے اپنے وقت میں کیا کیا اثر ڈالا ہے۔ ایک لوح یونانی رومی عہد کی یہاں بھی عجیب وغریب ہے جس میں یونانیوں اور جنگجو خواتین کا مقابلہ دکھایا گیا ہے۔ کچھ کوہ آتش فشاں کے پتھروں کی یادگاریں فرعون اول ورعمسیس ثالث کے زمانے کی بھی ہیں جو بیسان میں دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک انسانی کھوپری کا ٹکڑا بھی نابغہ میں ملا ہے جو زمانۂ تاریخ سے قبل کا خیال کیا جاتا ہے۔
عمان کے عجائب خانے میں بھی کوئی چیز قابل ذکر نہیں ہے، کچھ ہیں تو یونانی اور بیزنطی زمانے کی یادگار ہیں اور بس۔
اجنبی ممالک کے وفود نے جو سامان کھود کر برآمد کیا اور اس میں سے جو حصہ ہمیں دیا اس کا ہمیں اعتراف ہے اور جو خود کھود کر لے گئے اور ہمیں کچھ نہیں دیا اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ یہ اشیا زیادہ تر عہد اسلامی سے اول کی ہیں۔ عہد اسلامی کی اشیا زیادہ تر مدارس و مقابر میں محفوظ ہیں جو ہمارے محکمۂ اوقاف کے زیر نگرانی ہیں اور حکومت نگراں بھی ان پر دست تصرف دراز نہیں کرسکتی۔ عام مسلمان ابھی تک ان قدیم اشیا کی قیمت و اہمیت نہیں جانتے ہیں اور ان کی وجہ سے بھی ہمیں نقصان پہنچتا رہا ہے۔ معمولی چیز سمجھ کر وہ ان نادرات تاریخی کو فروخت کردیتے ہیں اور جب وہ ہمارے ملک سے جاکر دوسری جگہ بڑی قیمت حاصل کرتے ہیں اور اخبارات سے ہم کو معلوم ہوتا ہے تو ہمیں اس نقصان کا اندازہ اور افسوس ہوا کرتا ہے۔ ان کی آگاہی کے لئے ہمیں یہ اطلاع دینا ہے کہ وہ ان اشیا کی قیمت کو سمجھیں۔ اگر نا واقفی کا یہی حال رہا اور یہ نادرات اسی طرح نکلتی رہیں تو ایک وقت آئے گا کہ ہمارا ملک ان اشیا سے خالی ہوجائے گا اور اغیار اپنے

خزانے ہمارے ہی نوادر سے پر کریں گے۔ ہمیں اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ جس طرح ملک مصر نے اپنی اشیاء نوادر کی حفاظت کی ہمیں بھی ان کی تقلید کرنا چاہیئے۔

جمہوریۂ فرانس نے ایک فرانسیسی کالج کھولا ہے جس میں آثار قدیمہ پر لکچر دئے جاتے ہیں خصوصاً اسلامی عہد کے آثار پر۔ قاہرہ کے فرانسیسی کالج کی طرح بیت المقدس میں بھی ایک کالج قائم ہوا ہے۔ یہ سب غیر ملکوں کے زیر اثر ہیں خصوصاً انگریزوں اور امریکیوں کے۔ بیت المقدس میں بھی حفاظتی تدابیر پر عمل ہو رہا ہے اور انگریزی و امریکی وفود نوادر برآمد کر کے انھیں محفوظ رکھتے ہیں۔ انگلستان اور فرانس اپنے اپنے حلقۂ اثر میں کوشش کر رہے ہیں کہ قدیم نوادر فراہم کر کے محفوظ رکھیں اور اگر اجنبی ممالک کے قبضے میں ایسے نوادر پہنچ گئے ہوں تو واپس لئے جائیں۔ چنانچہ ان اغراض و مقاصد کے تحت میں اپریل ۱۹۲۶ء کو جمعیت الاقوام کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور اس جلسے کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ ان آثار کی بدولت اب ہم دیکھتے ہیں کہ سیاحوں کی زیادہ تعداد اس ملک میں آتی ہے اور ہم ان کے خیالات و آراء سے استفادہ کرتے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو عنقریب شام اپنا صحیح مرتبہ اقوام عالم میں حاصل کر لے گا اور وہی وقت ہماری حقیقی کامیابی کا ہوگا۔

دنیا کی رفتار

ادارت جامعہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر مہینہ ممالک عالم کے اہم واقعات پر ایک مختصر سا تبصرہ ان صفحات میں شائع کیا جائے۔ دو حصوں میں عالم اسلامی اور ہندوستان پر جدا جدا تبصرہ ہوا کرے گا اور ایک حصے میں بقیہ ممالک پر۔ افسوس ہے کہ اس بار ہندوستان کے متعلق حصہ شائع نہیں ہو سکا۔ آیندہ مہینے انشاء اللہ اس کی تلافی ہو جائے گی۔

(الف) ممالک غیر

(۱)

اس سلسلے کے پہلے مضمون میں ملک وار تبصرے کی جگہ ہم اس بنیادی چیز کا تبصرہ ضروری سمجھتے ہیں جس کا اثر ساری دنیا کی سیاست پر پڑ رہا ہے یعنی اس معاشی تباہی کا جس میں دنیا مبتلا ہے اور جس کے اثرات کبھی ہندوستان کے کسانوں کی بے چینی اور یہاں کے تاجروں اور انتہاپسند ارباب سیاست کے اتحاد کی شکل میں رونما ہوتے ہیں، کبھی جرمنی میں انقلاب کی سی شکل پیدا کر دیتے ہیں، ادھر امریکہ کو اپنے اس قصد مصمم سے ہٹاتے ہیں کہ وہ یورپ کے معاملات میں کوئی حصہ نہ لے گا، تو ادھر انگلستان میں تبدیل حکومت اور جدید انتخاب کی وجہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جولائی ۱۹۳۱ء سے دنیا میں جو معاشی انتشار رونما ہوا ہے وہ اپنے جماعتی اور سیاسی نتائج و عواقب کے اعتبار سے یقیناً اس انتشار سیاسی سے کم اہم نہیں جس میں دنیا جولائی ۱۹۱۴ء میں مبتلا ہوئی تھی۔

آخر اس معاشی انتشار کی وجہ کیا ہے؟ جواب ملتا ہے کہ تمام اجناس خام اور مصنوعات کی قیمتوں کا بہت زیادہ گر جانا۔ اس کی وجہ؟ اس کا تفصیلی جواب نہایت دشوار ہے لیکن اہم وجوہ تین ہیں:

(۱) ضرورت سے زیادہ پیداوار اور اس کے باعث رسد کا طلب سے بڑھ جانا (۲) بین الاقوامی

تجارت میں سیاسی وجوہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتا اور اس لئے اضافۂ رسد کا تجارت میں اور بھی نہ کھپ سکنا۔
(۳) اسباب متعلق بہ زر، یعنی سونے کی غلط تقسیم کے سبب سے اکثر ممالک عالم میں زر اور اعتبار کی کمی اور اس کی وجہ سے زر کی قدر کا بڑھنا یعنی اجناس کی قیمتوں کا گھٹنا۔ ان تینوں اسباب کی مختصر سی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱)

جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے تقریباً ۱۹۲۵ء میں دنیا کے اکثر ممالک جنگ عظیم کے مضر اثرات سے پنپ چکے تھے۔ اور اس کے بعد سے برابر مقدار پیداوار میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ مختلف مغربی ممالک میں صنعتی پیداوار میں رفتہ رفتہ کتنا اضافہ ہوگیا تھا۔

سال	برطانیہ	کنیڈا	ریاستہائے متحدہ امریکہ	جرمنی	فرانس
	(اگر ۱۹۲۴ء کی پیداوار کو ۱۰۰ تسلیم کیا جائے)	(اگر ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء کا اوسط ۱۰۰ مانا جائے)	(اگر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۵ء تک کا اوسط ۱۰۰ مانا جائے)	(اگر ۱۹۲۸ء کی پیداوار ۱۰۰ مانی جائے)	(اگر ۱۹۱۳ء کی پیداوار ۱۰۰ مانی جائے)
۱۹۲۴ء	۱۰۰	۱۱۶	۹۵	۶۹	۱۰۸
۱۹۲۹ء	۱۱۲	۱۹۳	۱۱۸	۱۰۲	۱۳۹

اُدھر زراعت میں بھی کلوں کے استعمال اور نئے نئے ترقی یافتہ طریقوں کے رواج نے گیہوں، شکر، قہوہ وغیرہ کی پیداوار کو بازار کی مانگ سے کہیں بڑھا دیا تھا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک کے تین سال میں ہی کھانے کی چیزوں اور اجناس خام کی پیداوار میں ۸ فی صدی کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک گیہوں ہی پر نظر کیجئے جس سے ہندوستان کے کسانوں کو بھی بڑا تعلق ہے۔ اگر خاص خاص گیہوں پیدا کرنے والے ممالک کے زرعی اعداد کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک گیہوں کی سالانہ پیداوار کی جو مقدار تھی اس کے مقابلے میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک کی اوسط سالانہ مقدار کوئی پچاس فی صدی زیادہ تھی۔ اور اس زمانے میں آبادی ۱۰ فی صدی سے زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ اس کے علاوہ تبدیل مذاق کی وجہ سے برطانیہ اور امریکہ میں گیہوں بطور غذا کے بھی نسبتاً کم استعمال کیا جانے لگا تھا۔

اسی طرح مصنوعی ریشم کے عام رواج نے سوتی کپڑے کی مانگ میں معتدبہ کمی کردی تھی لیکن

روئی کی پیداوار بڑھ رہی تھی۔ یہی حال قہوہ، شکر، ربر، تانبہ، کوئلہ وغیرہ کا تھا۔ اس اضافہ رسد کے مقابلے میں طلب میں نہ تو یوں اضافہ ہوا کہ آبادی اسی تناسب سے بڑھی ہوتی اور نہ موجودہ آبادی کی قوت خرید ہی بڑھی۔ زراعت میں کلوں کے روزافزوں رواج نے آدمیوں کو زراعت سے ہٹاکر صنعت کی طرف بھیجا۔ لیکن ایسے وقت کہ صنعت میں خود کلوں کے ترقی پانے سے آدمیوں کی ضرورت کم ہوتی جاتی تھی۔ یعنی موجودہ آبادی کے لئے کمائی کے مواقع کچھ کم ہی ہوئے اور اس طرح ان کی قوت خرید میں کچھ تخفیف ہی ہوئی۔

غرض جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں اور اجناس خام کا تعلق ہے ۱۹۲۹ء ہی میں رسد اور طلب میں اچھا خاصہ عدم توازن پیدا ہو چکا تھا۔ قیمتیں اسی وقت خوب گرتیں لیکن انھیں گرنے سے روکا گیا۔ ساری پیداوار کو منڈی بھیجنے کے بجائے بااثر جماعتوں نے ان کے ذخیرے بڑھائے اور اس امید پر کہ آئندہ کوئی بہتر صورت حال پیدا ہوسکے گی رسد کو روک کر قیمتوں کو گرنے سے باز رکھا۔ لیکن یہ تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ ربر کے لئے اسٹی ونسن اسکیم (Stevenson Scheme) ناکام ہوئی۔ گیہوں کے لئے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے فیڈرل فارم بورڈ کی اسکیم (Federal Farm Board Scheme) اور بعد کی کئی کانفرنسیں ناکام رہیں۔ اور جب پتہ چلا کہ یہ تدابیر کارگر نہیں ہوتیں تو وہ تمام ذخائر جو اس زمانے میں برابر بڑھائے جارہے تھے بازار میں لاڈالے گئے اور قیمتیں یکایک نہایت تیزی سے گریں۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ ۱۹۲۶ء کے مقابلے میں ۱۹۳۱ء کے شروع میں بعض خام اجناس کے ذخائر کی کیا حالت تھی۔
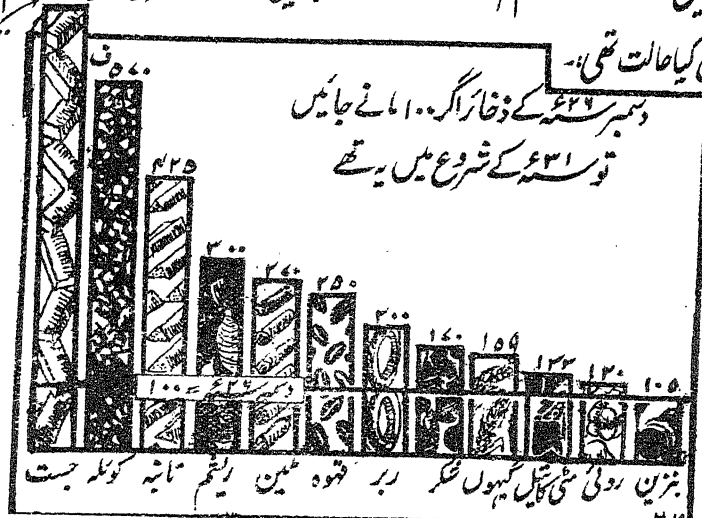
جنگ عظیم میں میکانکی ذرائع کے بکثرت استعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی چیزیں جنگ کے بعد بھی امن کے اغراض کے لئے برابر مستعمل رہیں اور انھوں نے معاشی روابط میں سہولت کے نئے نئے وسائل پیدا کر دئے۔ لاسلکی، ہوائی جہاز، ریڈیو، ترقی یافتہ طباعت ان سب نے دنیا کو سمیٹ کر بہت چھوٹا بنا دیا اور کاروبار معاشی میں سرعت کے امکانات پیدا کر دئے۔ دنیا صحیح معنوں میں ایک جسم ہو گئی۔ کہیں ذرا سا توازن بگڑا اور کل جسم مبتلا ہو گیا۔

لیکن سیاست نے اس معاشی رجحان کا ساتھ نہ دیا۔ قوم پرستی کے جائز و ناجائز جوش نے سیکڑوں سیاسی دیواریں کھڑی کر دیں اور روابط معاشی کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ یورپ میں جنگ کے بعد جو متعدد نئی ریاستیں وجود میں آئی ہیں انھوں نے اپنی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے دوسرے ممالک کے مال پر محصول بڑھائے اور ایسی صنعتوں تک کو محفوظ کرنے اور فروغ دینے کی کوشش کی جو ویسے کبھی نہ پنپ سکتیں۔ کنیڈا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا نے بھی یہی کیا۔ تاکہ اپنی مصنوعات کی منڈی تو خود اپنے لئے محفوظ کر لیں اور اپنی اجناس خام اسی طرح دنیا میں بھیجتے رہیں۔ یہی حال ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ہے۔ جنگ سے پہلے تو یہ ریاستیں یورپ کی مقروض تھیں اور قرض کا سود ادا کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ ان کے ملک کی برآمد ان کی درآمد سے زیادہ ہو۔ مگر جنگ کے بعد یہ قرض خواہ قوم ہو گئیں، لیکن پھر بھی سنہ ۲۲ء سے سنہ ۳۰ء تک درآمد کے مقابلے میں ان کی برآمد اتنی ہی زیادہ تھی جتنی جنگ سے پہلے سنہ ۱۳ء میں۔ اور اس تفاوت میں ان قرضوں کے سود کی وصولیابی سے اور اضافہ ہی ہو رہا ہے جو امریکہ نے دوسرے ملکوں کو دے رکھے ہیں۔ خود برطانوی سلطنت کی برادری میں مختلف "بھائیوں" نے اپنی زراعت یا صنعت کو بڑھانے کے لئے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں تابینی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ کنیڈا نے نیوزیستان کے مکھن پر محصول لگایا تو نیوزیستان نے کنیڈا کی موٹروں پر محصول لگا کر بدلہ لیا اور اب نہ نیوزیستان کا ایک تولہ مکھن کنیڈا جاتا ہے نہ کنیڈا کی ایک موٹر نیوزیستان پہنچتی ہے! فرانس اور جرمنی نے اپنے کسانوں کی خاطر زرعی پیداوار کی درآمد پر محصول

لگا کر اس ترقی یافتہ بازاروں کے زمانے میں یہ تماشا دکھایا کہ اپریل ۱۹۳۱ء میں جب دنیا کے کسان اپنے گیہوں تقریباً کسی دام نہیں بیچ سکتے تھے اور شکاگو میں گیہوں کے سو کیلو تین ڈالر میں ملتے تھے تو برلن کے لوگوں کو اسی مقدار کے لئے سات ڈالر اور پیرس میں ۵½ ڈالر دینے پڑ رہے تھے! اور لندن کے مقابلے میں برلن میں روٹی کی قیمت دوگنی تھی! اور اس طرح باوجود دنیا میں گیہوں کی کثرت کے جرمنی اور فرانس میں ان زمینوں پر بھی گیہوں پیدا کئے جاتے رہے جو مصارف پیدائش کی زیادتی کی وجہ سے معمولاً ہرگز اس قابل نہ سمجھی جاتیں۔ غرض ان رکاوٹوں نے کثرت پیداوار کے اثرات اور بھی بڑھادئے صنعتی برآمد والے ممالک کو پہنچنے سے روکا، غلہ اور اجناس خام پیدا کرنے والی قوموں کے مال کی مانگ کم کردی، بین الاقوامی ادائیگیوں کو مشکل بنادیا اور اس طرح دنیا میں سرمایہ کی بدنظمی کو بڑھایا۔ اور اس بدنظمی نے قیمتوں کے گرانے میں بڑی مدد دی۔ اسکی تفصیل آگے آتی ہے۔

(۳)

دنیا میں کاروبار کے فروغ کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب ملکوں کے پاس کام چلانے کے لئے یا تو خود اپنا روپیہ موجود ہو یا دوسروں سے قرض پر مل سکے۔ قوموں کو خود اپنے اندرونی کاروبار کے لئے نیز باہر والوں کو اعتبار پر کچھ دینے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے پاس کچھ سونا ہو۔ جنگ کے بعد سے دنیا میں سونے کی تقسیم میں معتدبہ تغیرات پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں دنیا کے تمام سونے کا ۶۳ فی صدی یورپ میں تھا۔ اور ۱۹۲۵ء میں ۳۵ فی صدی رہ گیا تھا! پہلے شمالی امریکہ میں ۲۴ فیصدی تھا اور بعد کو ۴۵ فی صدی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں دنیا کا ۷۰ فی صدی سونا صرف تین ملکوں کے قبضہ میں تھا یعنی برطانیہ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ان میں برطانیہ کے پاس کم تھا باقی دو کے پاس زیادہ۔ ادھر امریکہ میں قیمتوں کے بڑھنے سے زر کا بازار چڑھا، سود کا نرخ بڑھا اور یورپ سے نفع کمانے کے لئے سونا امریکہ کو ڈھلنے لگا۔ ادھر تاوان جنگ کی وصولی نے فرانس میں بھی سونے کے ذخائر کو برابر بڑھایا۔ اور اس طرح ان دو ملکوں میں دنیا کے سونے کا بڑا حصہ جمع ہوگیا۔
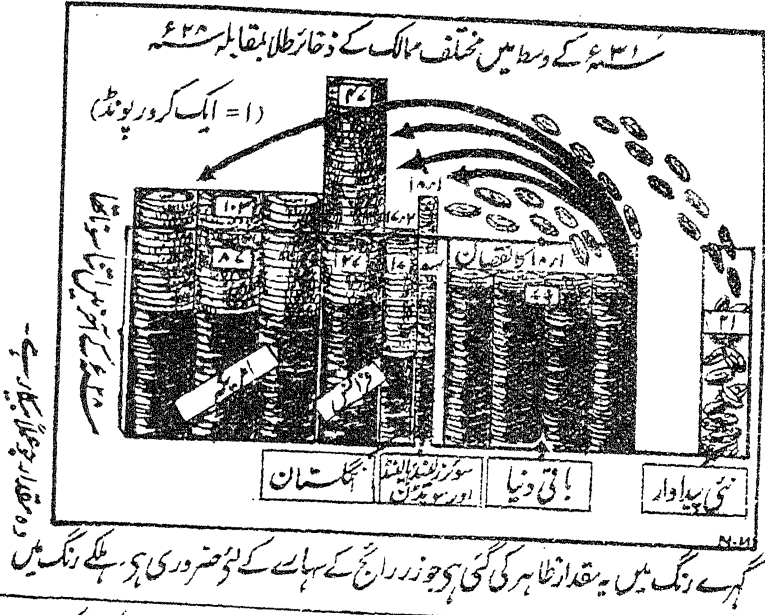
گہرے رنگ میں یہ مقدار ظاہر کی گئی ہے جو زر رائج کے سہارے کے لئے ضروری ہے۔ ہلکے رنگ میں

سونے کی کمی کے باعث دوسرے ممالک اپنے زر اور اعتبار میں اضافہ نہ کر سکے۔ قاعدہ ہے کہ اگر زر کی مقدار کم ہو اور وہ ضروریات تجارت کی مناسبت سے نہ بڑھے تو اس کی قدر بڑھتی ہے یعنی اگر روپیہ کم یاب ہو جائے تو اس کے بدلے اجناس زیادہ ملنے لگتی ہیں یعنی قیمتیں گرتی ہیں۔ چنانچہ دنیا میں نہایت وسیع پیمانے پر یہی صورت حال پیدا ہوئی۔

امریکہ اور جرمنی اگر اپنے عدیم المثال ذخائر طلا کی بنا پر دوسرے ضرورت مند ملکوں کو قرض دیتے رہتے تو کام چلتا۔ لیکن فرانس کو اپنے اس تمام سرمایہ کے ضائع ہونے کے بعد جو جنگ سے پہلے اس نے روس میں لگایا تھا باہر روپیہ لگانے کا زیادہ حوصلہ نہ تھا۔ امریکہ نے پہلے یورپ کو خوب قرض دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک یورپ نے امریکہ سے کوئی ایک ارب پونڈ قرض لئے۔ مگر خود ملک میں روپیہ کی مانگ بڑھنے سے امریکہ نے بھی باہر قرض دینے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو جن ملکوں کی معاشی زندگی امریکہ کے قرض پر چل رہی تھی وہ سخت مشکل میں پڑ گئے۔ انھیں میں ایک جرمنی تھا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک جرمنی سالانہ کوئی ۸ کروڑ پاؤنڈ قرض لیتا تھا اور اس میں سے زیادہ تر امریکہ سے۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں جرمنی کو اس کا چھٹا حصہ بھی قرض نہ مل سکا۔ جسم معاشی میں زرد

اعتبار بمنزلہ خون ہے، اس کی کمی ہوئی تو معاشی زندگی میں مرض کی کیفیت پیدا ہوئی، بیکاری بڑھنے لگی، مثل مشہور ہے دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ مارک کی تباہی کی سرگذشت لوگوں کو بھولی نہ تھی، لوگ گھبرا اُٹھے بے اعتباری عام ہوگئی۔ جرمنوں نے کثرت سے اپنا روپیہ پردیس کے بنکوں میں بھیجدیا اور امریکہ و برطانیہ نے تھوڑے عرصے کے لئے جو رقمیں جرمنی میں لگا رکھی تھیں انھیں واپس لینا شروع کیا۔ اس سب پر مستزاد قیمتوں کی کمی، اس نے گویا جرمنی کا کام ہی تمام سا کر دیا۔ اس لئے کہ قیمتوں کے گرنے کے معنی ہیں زر کی قیمت کا بڑھنا۔ جیسا غریب گویا کو ہم کروڑ پاؤنڈ سالانہ اپنے قرض کا سود ہی ادا کرنا پڑتا ہو اور کوئی ½ ۸ کروڑ پاؤنڈ تاوان جنگ اس کے لئے قیمتوں کا ذرا سا اُتار قرض کے بوجھ کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء کے بالمقابل ۱۹۳۱ء میں جرمنی کی معاشی زندگی کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہو سکتا ہے
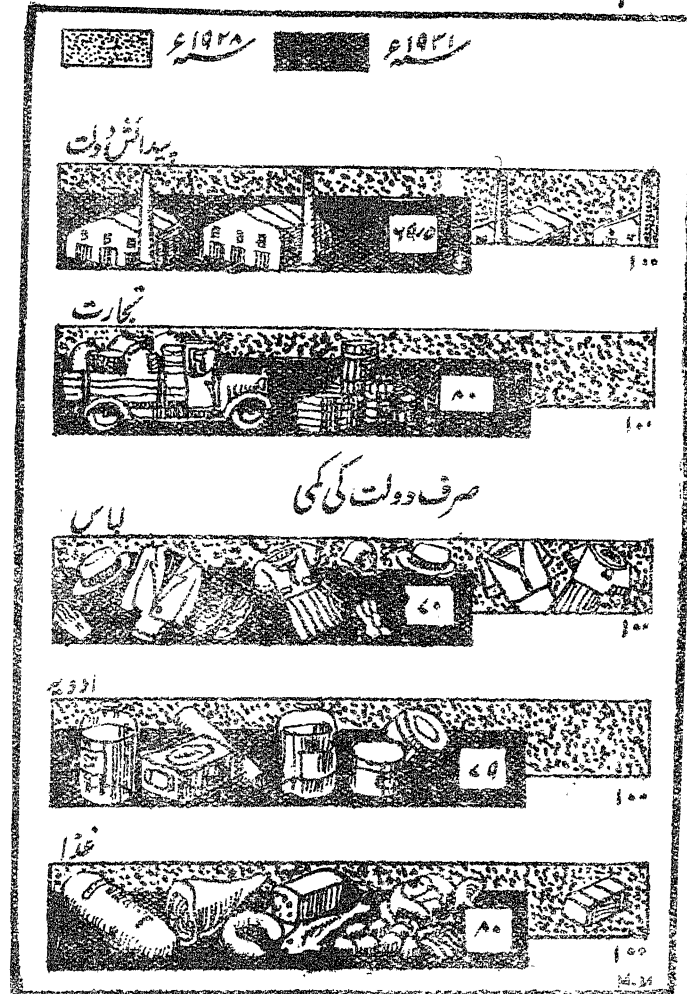
عام کساد بازاری میں جرمنی کے دیوالیہ ہونے کے اندیشے نے اور بھی اضافہ کر دیا۔ اور اگر جمہوریہ امریکہ کے صدر ہوور نے اپنا وہ تاریخی اعلان نہ کر دیا ہوتا کہ ایک سال تک تمام سرکاری بین الاقوامی ادائگیاں ملتوی کر دی جائیں تو جرمنی کے دیوالہ کے ساتھ ساتھ دنیا کی معاشی زندگی کو ناقابل بیان صدمہ پہنچ جاتا۔

اس اعلان کی وجہ سے صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ سال رواں میں مندرجہ ذیل ممالک کو یافتنی رقمیں نہ ملیں گی:۔

۱۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ	۵ کروڑ پونڈ	۲۔ فرانس	ایک کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ
۳۔ برطانیہ	۱ کروڑ پونڈ	۴۔ بلجیم	۳۰ لاکھ پونڈ
۵۔ اٹلی	۲۰ لاکھ پونڈ	۶۔ دیگر ممالک	۵۰ لاکھ پونڈ

کل ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ

اور مندرجہ ذیل ممالک کو دادنی رقمیں نہ ادا کرنی پڑیں گی:۔

۱۔ جرمنی	۸ کروڑ پونڈ	۲۔ دوسرے تاوان ادا کرنیوالے ممالک	۲۰ لاکھ پونڈ
۳۔ برطانوی نوآبادیات	۴۰ لاکھ پونڈ		

کل ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ

... ...

پریسیڈنٹ ہوور کی اس تجویز سے جرمنی کو کم سے کم دم لینے کی مہلت ملی، اگرچہ کوئی ۳۵ لاکھ بیکاروں کی فوج اور سیاست میں انتہا پسند جماعتوں کی قوت میں ترقی مستقبل سے مطمئن ہونے کی امید نہیں دلاتی۔ اسی زمانے میں انگلستان میں نہایت اہم معاشی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں جن سے وہ اب تک دو چار ہے۔ ایک طرف جرمنی کی ناقابل اطمینان معاشی حالت نے دنیا میں جو بے اعتباری پیدا کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ممالک کے لوگوں کا جو روپیہ لندن میں تھا وہ انھوں نے واپس منگانا شروع کیا اور ۱۴ دن کے اندر اندر انگلستان سے کوئی تین کروڑ پونڈ کا سونا باہر چلا گیا۔ اور سونے کی

برآمد کو روکنے کے لئے انگلستان کو فرانس اور امریکہ سے ۵ کروڑ پونڈ کا قرضہ پیرس میں لینا پڑا اور سرکاری بنک کو مزید نوٹ چھاپنے کی اجازت لینی پڑی۔ جرمن انتشار کا یہ اثر انگلستان پر اس وجہ سے اور بھی پڑا کہ انگلستان کی مالی حالت بین الاقوامی حلقوں میں پہلے جیسے اعتماد کے ساتھ نہ دیکھی جاتی تھی۔

انگلستان کے اس سال کے میزانیہ میں کوئی پانچ کروڑ کا خسارہ تھا اور تخمینہ ہے کہ سنہ ۳۲ء کے میزانیہ میں کوئی بارہ کروڑ پونڈ کا خسارہ ہوگا۔ ملک میں بے کاری بڑھ رہی ہے اور کوئی پچیس لاکھ آدمی جو کام کرنا چاہتے ہیں بیکار ہیں جن میں سے ۱۰ لاکھ تقریباً دس سال سے بے کار ہیں! ان بے کاروں کی امداد میں حکومت کو تقریباً ۱۰ کروڑ پونڈ سالانہ صرف کرنا پڑتے ہیں۔ تجارت میں فروغ کی امید بہت کم ہے' اس لئے اجرتیں اور تنخواہیں تمام یوروپین ممالک سے زیادہ ہیں' ٹریڈ یونین اوقات کار میں اضافہ ہونے نہیں دیتے' بے کاروں کے لئے اچھے اچھے معاوضے مقرر ہیں' اُدھر قیمتیں جوں جوں گرتی ہیں' کارخانہ داروں پر سود ٹکس وغیرہ کا دباؤ مفصلہ بالا اصول کی بنا پر بڑھ رہا ہے۔ سنہ ۲۴ء سے سنہ ۳۰ء تک تھوک فروشی کی قیمتیں کوئی ۲۷ فی صدی اور خردہ فروشی میں ۱۳ فی صدی کم ہوئی ہیں لیکن اجرتوں میں مشکل سے دو فی صدی کی کمی ہوئی ہے' جس کا اثر صنعت پر برا پڑ رہا ہے۔ انگلستان کے مصارف پیدائش دولت دوسرے ملکوں سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ دنیا کی تجارت میں انگلستان کا حصہ گھٹ رہا ہے۔ سنہ ۲۴ء میں دنیا کی تمام تجارت کا ۱۲،۹۴ انگلستان کے ہاتھ میں تھا' سنہ ۲۹ء میں ۱۰،۸۶۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں انگلستان کے پاس دوسرے ممالک میں لگانے کے لئے ۱۸۱ ملین پونڈ فاضل تھے۔ سنہ ۲۹ء میں ۱۳۸ ملین اور سنہ ۳۰ء میں صرف ۳۹ ملین۔

غرض دنیا میں انگلستان کی ساکھ پہلی سی نہیں رہی۔ صنعت کو فروغ دینے کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ سیاسی وجوہ نے چین اور ہندوستان کی منڈیوں کو بگاڑ دیا ہے۔ مصارف پیداوار کی زیادتی کے باعث دوسرے حریفوں کا مقابلہ مشکل ہو گیا ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے انگلستان کے ارباب سیاست و معیشت ہر تدبیر کر رہے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ قیمتوں کو بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے نیز اپنے سونے کو روکنے کے لئے انگلستان نے وہ کیا جو

صرف دوران جنگ میں کیا تھا یعنی اپنے زر رائج کو معیار طلا پر مبنی نہ رکھا یعنی حکومت اور سرکاری بنک پر یہ ذمہ داری نہیں رہی کہ وہ سونے اور زر رائج میں کوئی نسبت قائم رکھے، اپنے زر رائج کے اعتبار سے سونے کو ایک مقررہ و متعین قیمت پر بیچے۔ انگلستان نے اگر یہ فیصلہ اپنے میزانیہ کو درست کرنے سے پہلے کر دیا ہوتا تو اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوتا کہ انگریزی سکہ کی قیمت بہت گر جاتی۔ لیکن انھوں نے پہلے ایک متحدہ قومی حکومت بنا کر اور اس کے ہاتھوں اپنا میزانیہ درست کرا کر اپنی ساکھ کو درست کیا اور اس کے بعد یہ اعلان کیا۔ اس سے خراب نتائج رونما نہیں ہوئے۔ لیکن آئندہ سال اور اس کے بعد مالی حالت کو درست رکھنے کا مسئلہ اب بھی سخت تشویش کا باعث ہے اور اس کی اصلاح کی تدابیر پر سیاسی جماعتوں میں سخت اختلاف ہے جس کا حال آئندہ پرچے میں برطانوی انتخابات پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا جائے گا۔

(ب) عالم اسلامی

کابل میں تبلیغ عیسائیت وسط ایشیا میں غالباً افغانستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کسی زمانے میں بھی تبلیغ عیسائیت کی اجازت نہیں دی گئی۔ ۸۰-۱۸۷۸ء میں جب لارڈ رابرٹس اور سر ڈونلڈ اسٹیورٹ نے قندھار پر حملہ کیا ہے تو بے شک آرک بشپ ایلین اور فادر ہنگران کے ساتھ تھے لیکن ان لوگوں کا تعلق محض انگریزی فوج سے تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی پادری کا گزر اس سرزمین میں ہوا ہو۔ موجودہ زمانے میں یہ فخر صرف ایک امریکن پادری ریورنڈ جارج جے بلاٹر کو حاصل ہوا ہے جو ایک پیر ہفتاد سالہ ہیں مگر باوجود اس کے تبلیغ عیسائیت کا شوق اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ پادری صاحب جب اتنے بڑے سفر کا عزم کر چکے تو انھیں پاسپورٹ لینے کا خیال آیا لیکن اس کے لئے انھیں مسلسل اٹھارہ مہینے دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ بالآخر ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو شکاگو کا یہ پرجوش مبلغ جس نے سفیر افغانستان متعینہ روما کے سامنے اپنے آپ کو ایک دینی راہنما کی بجائے دو چار کتابوں کا مصنف ظاہر کیا تھا کابل پہنچا، مگر آتے ہی بیمار ہو گیا اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو بادل ناخواستہ اسے واپس جانا پڑا۔

تھوڑے دنوں کے بعد جب پادری صاحب کی صحت بحال ہوگئی تو انھوں نے اعلیحضرت شہریار غازی اور وزیر خارجہ حکومت افغانستان کے نام ایک خط لکھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ انھیں دوبارہ کابل آنے کی اجازت دی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جو کیتھولک عیسائی کسی نہ کسی وجہ سے افغانستان میں مقیم ہیں ان کی روحانی ذمہ داریوں کے لئے ان کا وجود بے حد ضروری ہے۔ اپنے خط میں انھوں نے حکومت کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ عیسائیت کی حمایت میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالیں گے نہ کسی معاملے میں دخل دیں گے خواہ اس کا تعلق سیاست داخلی سے ہو یا خارجی سے بلکہ ایک اچھے اور نیک شہری کی طرح قانون کا پورا پورا احترام کریں گے۔ بایں ہمہ انھیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور "کیتھولک لیڈر" کو جو اس خبر کا راوی ہے حکومت افغانستان کی بے رخی سے شکوہ ہے کہ اس نے پادری صاحب موصوف کی معروضات پر غور کرنا تو درکنار ان کے مراسلے کی رسید تک نہ بھیجی۔ یہ امر کہ مسیحی مبلغین ہمیشہ مغربی شہنشاہیت کا آلہ کار رہے ہیں صحیح نہ ہو تب بھی محض ان پیچیدگیوں کو دیکھتے ہوئے جو گزشتہ دو ڈیڑھ صدی میں ان بزرگوں کے طفیل مشرقی سیاسیات میں رونما ہوتی رہی ہیں حکومت افغانستان کا یہ فیصلہ نہایت مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ ایک فتنے کو چھیڑنے کی بجائے اس سے پہلو بچانا ہی بہتر ہے۔

مسلمانان ہند چینی میں مسیحی ریشہ دوانیاں مسلمانان ہند کے لئے ڈاکٹر زویمر کا وجود محتاج تعارف نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کس طرح حکومت مصر کے زیر سایہ اپنے تبلیغی پرچے کے ذریعے عالم اسلام پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی عنایت فرماتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں "مسلم ورلڈ" نے اپنی عنان توجہ اسلامیان ہند چینی کی طرف موڑی ہے جہاں "شام" نامی ایک قبیلہ ملک کے اس حصے میں جس پر فرانس کی حکومت ہے آباد ہے۔ ہند چینی میں اس قبیلے کے علاوہ اور بھی مسلمان ہیں۔ "مسلم ورلڈ" کے نزدیک ان لوگوں کو اسلام سے منحرف کر دینا کچھ بہت زیادہ مشکل نہیں۔ اول تو قبیلہ شام کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی وہ لوگ جو انام میں بستے ہیں اور وہ جو کمبوڈیا میں آباد ہیں۔ پھر بتایا گیا ہے کہ کمبوڈیا کے شام اہل ملایا سے ربط و ضبط کی وجہ سے اگرچہ کسی قدر پکے مسلمان ہیں لیکن ان

کے مقابلے میں ان کے اتامی بھائی بندمذہب میں بالکل کچے ہیں۔ "یہ لوگ شعائر اسلامی کے بالکل پابند نہیں۔ ان کے رسم ورواج مشرکانہ ہیں۔ انھیں اسلامی تعلیمات کا مطلق علم نہیں۔ چند مولوی ہیں جو خود بھی دین سے بے بہرہ کاہنوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں البتہ گاہے گاہے اگر کسی حاجی کا ادھر گزر ہو جائے تو اس سے ایک مذہبی روح پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اس حصۂ ملک کے تمام جاہل، غیر متمدن اور پست ہیں، رہنے کے لئے مکان تک نہیں بناتے لہذا لوگوں کے حج کو آنے جانے کے امکانات شاذ ہیں۔ حج ہی وہ سب سے بڑا ذریعہ ہے جس سے اسلام میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور چونکہ اس کا امکان نہیں اس لئے یہیں سے تبلیغ عیسائیت کی ابتدا ہونی چاہئے تاکہ سب سے پہلے ان کچے مسلمانوں کو دین سے منحرف کر دیا جائے۔" کچے اور پکے مسلمانوں کا محافظ تو خیر اللہ میاں کے سوا اور کون ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے عیسائی مبلغین ان غیر متمدن لوگوں کی بجائے اپنے متمدن بھائیوں کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے۔ اول تو کلیسا نے ایک خود ساختہ تاریخ، غلط منطق، بے معنی روایات، خیالی حکمت اور من گھڑت نفسیات کی بنا پر ایک ایسی دینیات تیار کی جس نے انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اب یہ لوگ عیسائیت کو مغربی تمدن اور مغربی ڈپلومیسی کا ایک ناگزیر جز سمجھ کر تبلیغ و دعوت کے لئے وہ ذرائع اختیار کر رہے ہیں جن سے تبدیل مذہب تو ممکن نہیں البتہ الحاد و بے دینی ضرور پھیل سکتی ہے۔ معلوم نہیں اس فریب نفس کا ان حضرات کو خود بھی علم ہے یا نہیں۔

ایران و روس کے نوسالہ تجارتی تعلقات اس سال فروری کے آخر میں مجلس نے ایک قانون کے ذریعے ایران کی کل خارجی تجارت کو حکومت کا اجارہ قرار دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اہل ایران شورائیہ روس کی تجارتی دستبرد سے محفوظ رہیں۔ یہ صورت حالات کیوں پیش آئی اس کی اجمالی تاریخ یہ ہے۔

شمالی ایران کی تجارت تمامتر روس کے زیر اثر ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شمالی ایران کا سامان تجارت صرف روس ہی کے راستے باہر جا سکتا ہے۔ ایران کی شمالی سرحد کا طول تقریباً ۱۵۰۰

میل ہے جس کا ایک حصہ تو گویا وسطی سطح مرتفع کا وہ شمالی خطہ ہے جس کی بلندی تین ہزار سے پانچ ہزار
فٹ تک ہے اور جہاں زراعت کے مواقع نہایت کم ہیں۔ اس علاقے کے سامان برآمد میں زیادہ تر
قالین، کمبل، کپاس اور خشک پھل شامل ہیں۔ البتہ شمالی سرحد کا دوسرا حصہ جو گیلان اور مازندران
کے صوبوں پر مشتمل ہے اور جس کی جغرافی حیثیت ایک تنگ مگر نہایت سرسبز اور شاداب ساحلی
میدان کی سی ہے جو کوہستان البرز اور بحیرۂ خزر کے درمیان واقع ہے تجارتی اعتبار سے نہایت
اہم ہے۔ یہاں سے چاول، مچھلی، تازہ اور خشک پھل اور ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی مصنوعات
باہر بھیجی جاتی ہیں۔ ہونے کو تو یہاں لکڑی بھی کثرت سے پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ دامن کوہسار
ہر جگہ نباتات سے مالامال ہے لیکن چونکہ روس کو اس کی ضرورت نہیں اس لئے ایران ابھی تک
اپنے جنگلات کے قیمتی ذخیرے سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ غالباً صرف اس ایک بات سے یہ امر
بآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ کس طرح روس کی جغرافی حیثیت ایران کی تجارت میں حائل ہو رہی ہے۔

ایرانی مصنوعات کا زائد حصہ صرف روس کے بازاروں میں بک سکتا ہے اور اس کی بڑی
وجہ یہ ہے کہ وسائل نقل وحمل کی قلت کی وجہ سے دوسرے ممالک کو چیزیں بھیجنے میں مصارف کی
تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس سے ایرانی تجارت کو بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔
۲۹-۱۹۲۸ء کے درمیان ایران کے سامان برآمد کی قیمت ننانوے لاکھ پونڈ سے زیادہ تھی جس
میں سے چونتیس لاکھ پونڈ سے زیادہ کا سامان صرف روس نے خریدا حالانکہ اس میں تیل کی وہ
مقدار بھی شامل ہے جسے اینگلو پرشین آئل کمپنی نے باہر بھیجا تھا۔ مزید برآں بحر خزر کی دخانی کشتیوں
کا انتظام بھی روس ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لہذا ایران کے لئے شمالی تجارت کا مسئلہ نہایت اہم
ہو گیا ہے۔ ایران کے نقرئی سکے کی قیمت گر چکی ہے اور حکومت اس فکر میں ہے کہ ملک میں طلائی
معیار قائم ہو جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایران کی تجارت برآمد میں اضافہ
نہ ہو جائے کیونکہ اس سے مبادلے کو تقویت پہنچے گی۔

اپریل ۱۹۲۵ء میں اس ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہوئی جسے "ماورائے ایران" کے نام سے

موسوم کیا گیا ہے اور جو بحر خزر کے جنوب مشرقی گوشے سے شروع ہو کر خلیج فارس کے دہانے پر کہیں ختم ہو جائیگی۔ اس ریلوے کی تعمیر سے بھی حکومت کا مقصد یہی تھا کہ تجارت برآمد کے لیئے روس کے علاوہ دوسرے بازاروں کی طرف توجہ کی جائے لیکن چونکہ یہ ریلوے لائن اس آمدنی سے تعمیر ہوگی جو حکومت ایران کو ہر سال مالگذاری سے حاصل ہوتی ہے لہذا ابھی اس کی تعمیر کو ایک مدت چاہیئے۔

ایران اور روس کے سیاسی اور تجارتی تعلقات کا باقاعدہ آغاز ۲۶ فروری ۱۹۲۱ء سے ہوتا ہے جب عہد نامۂ ماسکو کی روسے اعلان کیا گیا تھا کہ حکومت روس ان تمام قرضوں سے دست بردار ہوتی ہے جو زار کی طرف سے حکومت ایران کو دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ چند اور مراعات کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا اور اہل ایران کا خیال تھا کہ دونوں ہمسایہ حکومتیں تجارت و ترقی کی راہ میں ایک دوسرے کی معین و مددگار ثابت ہوں گی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ سب سے پہلے شمالی سرحد کے محصول چنگی کا شاخسانہ پیدا ہوا جس کے متعلق حکومت روس کا اصرار تھا کہ اس کی شرح نہایت کم رہنی چاہیئے۔ پھر یہ قضیہ پیش آیا کہ بحر خزر کی شکارگاہوں کا جہاں سے مچھلیاں بہم پہنچتی ہیں انتظام کون کرے۔ ہنوز یہ معاملہ طے نہ ہوا تھا کہ ۱۹۲۵ء میں ایران میں غیر معمولی قحط پڑا اور حکومت مجبور ہو گئی کہ جہاں کہیں سے ممکن ہو سکے غلہ خریدے۔ اس سے شمالی تجارت کے لیئے جو ناگوار نتائج مترتب ہوئے ان کے جواب میں روس نے پٹرول کی قیمت بڑھادی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی تیل کی پیداوار میں اضافہ کردے۔

اسی زمانے میں شورائیہ روس کو اس امر کا اندازہ ہوا کہ ایشیائی سرحدوں کی تجارت میں ۳۰ لاکھ ۱/۲ ۵ لاکھ روبل کا نقصان ہوا ہے۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیئے حکومت روس نے مختلف ذرائع اختیار کیئے۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایرانی روسی بینک نے ایرانی تجار کا روپیہ دینے سے انکار کردیا اور یکم فروری ۱۹۲۶ء کو کپاس کے سوا تمام ایرانی درآمد پر بحری محصول عائد کر دیا جس سے ایرانی تجار کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

چونکہ ان واقعات کا اثر ایران کی اقتصادی حالت پر اچھا نہیں پڑ رہا تھا لہذا ۲۷ جولائی

جولائی ۱۹۲۶ء کو حکومت ایران نے ہز ہائینس مرزا ابوالحسن خاں تیمور تاش کو ماسکو میں سفیر خاص بنا کر بھیجا اور دونوں سلطنتوں کے درمیان مصالحت کی گفت و شنید شروع ہو گئی۔

ان مصالحانہ کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ بحر خزر کی شکار گاہوں کو طہران کی ایک مشترکہ مجلس کے زیر انتظام کر دیا گیا جس کے تین رکن ایرانی تھے اور تین روسی لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت روس نے اس مجلس کے احکام کی ہمیشہ خلاف ورزی کی ہے ثانیاً دونوں حکومتوں نے طے کیا کہ وہ دو سال کے لئے ایک عارضی تجارتی معاہدہ قائم کریں جسے ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مجلس نے منظور کیا۔ اس معاہدے کی رو سے قرار پایا کہ مملکت روس میں ایرانی درآمد کی مقدار ۵۰ ملین روبل سے زیادہ نہ ہو جس میں سے ۲۰ ملین روبل سامان خوراک اور باقی تیس ملین دوسری مصنوعات پر صرف کیا جائے - ایرانی تجار کو اجازت دی گئی کہ وہ اس مقدار سے نصف مال بہم پہنچائیں - باقی مال کی خرید روسی کارندوں کے سپرد ہوئی - یہ بھی طے پایا کہ ایرانی مصنوعات کے مبادلے میں حکومت روس ایرانی تجار کو ۹۰ فی صدی قیمت کے روسی مصنوعات اور ۱۰ فی صدی زر نقد ادا کرے گی جس کی شرح ایرانی روسی بینک مقرر کرے گا - علاوہ ازیں تمام مصنوعات کی (سوائے تیل اور دو ایک چیزوں کے) قیمت حکومت روس ہی نے متعین کی۔ اسی اثنا میں تمام قوموں نے ایران کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ اسے محصولات تجارت کے معاملے میں پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن چونکہ محصولات کی شرح نہایت کم رکھی گئی تھی لہٰذا اس کا فائدہ بھی زیادہ تر روس ہی کو پہنچا۔

تھوڑے ہی دنوں میں یہ بات آشکارا ہو گئی کہ یہ عارضی تجارتی معاہدہ ایران کے حق میں نہایت نقصان رساں ثابت ہوگا - کچھ اس وجہ سے کہ روس کا تمام سرمایہ حکومت کے ہاتھ میں ہے اور کچھ اس لئے کہ شرح مبادلہ کا تعین سویٹ بینک کے ہاتھ میں تھا لہٰذا روسی تجارتی کمپنیوں نے تمام ملک میں روسی مصنوعات کو پھیلا دیا یہاں تک کہ ان چیزوں کی تجارت بھی جو بآسانی ایران میں بک سکتی ہیں (مثلاً شکر، سوتی کپڑا وغیرہ) روسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور روسی حکومت نے ایرانی بازاروں کو اپنا فاضل اور ردی مال نکالنے کا ذریعہ بنا لیا۔ گویا بجائے اس کے کہ اس معاہدے کی رو سے دونوں قوموں کی تجارت مساوی درجہ اختیار کرتی مملکت روس نے صرف ۱۹۲۹ء میں ایران کی نسبت ۲۵ لاکھ پونڈ زیادہ کا مال بھیجا۔

اس کے ساتھ ہی سوویٹ حکومت نے ایران کے شاہی بینک سے اسٹرلنگ خریدنا شروع کردیا لیکن چونکہ قران کی قیمت گر رہی تھی لہذا مجلس نے ۲۵ فروری ۱۹۳۰ء کو یہ طے کیا کہ آئندہ تمام مبادلہ حکومت کے ہاتھ میں رہے گا۔

اب صاف ظاہر تھا کہ ایران و روس کے تجارتی تعلقات کوئی خوشگوار صورت اختیار نہیں کرسکتے۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں عارضی معاہدے کی میعاد ختم ہوگئی جس پر تمام ایرانی تجار روس سے خارج البلد کر دیے گئے۔ اس کے جواب میں ۱۰ جون ۱۹۳۰ء کو ایرانی مجلس نے ایک نیا قانون منظور کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ایران تمام قوموں سے ساویانہ تجارتی تعلقات قائم کرے۔ ایرانی حکام چاہتے تھے کہ اس قانون کی آڑ میں تمام روسی تجار کو دولت ایران سے خارج کردیا جائے لیکن حکومت روس نے یہ عذر پیش کیا کہ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی رو سے ایران کو اس کا حق نہیں پہنچتا لہذا حکومت کو خاموشی کے ساتھ معاہدے کی یہ تعبیر تسلیم کرنا پڑی۔ بالآخر ۲۶ فروری ۱۹۳۱ء کو اور پھر ۱۱ مارچ ۱۹۳۱ء کو ایک ضمنی قانون کے ذریعے مجلس نے یہ طے کیا کہ آئندہ تمام خارجی تجارت کو حکومت کا اجارہ قرار دیا جائے۔ اب تمام درآمد و برآمد حکومت کے قبضے میں ہے جس کی مقدار اور شرح قیمت کا تعین حکومت ہی کی مرضی سے ہوگا۔

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ کیا دولت ایران اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتی ہے کہ وہ روس کے معاشی تفوق سے آزاد ہو جائے۔ معلوم نہیں آگے چل کر واقعات کیا شکل اختیار کرتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ حکومت کی اجارہ داری کی وجہ سے بیرونی تجار کو کافی دقتیں برداشت کرنا پڑیں گی۔

مسلمانان چین | جاؤسن صاحب ایڈیٹر یواسیہ ہوا میگزین مسجد جامع تنگ ترنے پائی لاؤ، پیپانگ چین سے مدیر رسالہ اسلامک ریویو کو لکھتے ہیں:-

"چین اسلام کا بہت بڑا مرکز ہے۔ آپ کو ہر جگہ مسلمان اور مسجدیں نظر آئیں گی۔ اسلام کا تعلق چین سے بہت پرانا ہے۔"

"تقریباً سبھی چینی مسلمان مرفہ الحال ہیں۔ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کو مدارس میں تعلیم دلواتے ہیں، کثرت سے اسلامی ابتدائی مکاتب قائم کیے گئے ہیں۔ ماہوار جرائد کی تعداد

میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ تیس برس سے مسلمانان چین خاص طور سے اس
بات کے آرزومند ہیں کہ ان کے ملک میں اسلام کو فروغ ہو۔ اس غرض سے ایک انجمن
بھی قائم کر دی گئی ہے جس کا نام "چنگ تا اسلامک نارمل اسکول" ہے۔ یہی مسلمانان
چین شمالی کی مرکزی جمعیۃ ہے۔ اس انجمن کے صدر ماسنگ تنگ صاحب ہیں جن کی
عمر ابھی صرف تیس برس کی ہے مگر وہ اپنا بیشتر وقت اور روپیہ تبلیغ اسلام ہی میں
صرف کرتے ہیں۔ ہمارے میگزین کو بھی ان سے کافی امداد مل رہی ہے۔ شنگھائی اور
وان ہسین میں بھی اس قسم کی متعدد انجمنیں قائم ہیں"۔

ہنگری میں شعائر اسلامی کا احیا "۲۵۰ برس کے سکوت کے بعد بوداد دارالسلطنت
ہنگری میں جو ۱۵۰ برس تک اسلام کا مرکز حکومت رہا ہے مؤذن کی صدائیں پھر بلند
ہونگی۔ ۱۹۱۶ء کے ایک قانون کے مطابق جس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی کا پورا
پورا حق دیا گیا تھا گور بابا میں شعائر اسلامی ادا کئے گئے۔ جس پہاڑی پر یہ مزار بنا ہے
وہ ابھی تک "کوہ گل" کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں سال بھر گلاب کی بہار رہتی ہے
جس کی بیلیں ایک چاردیواری کے اندر جس کے کناروں پر ترکی طرز تعمیر کے چار
مینار قائم ہیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اس موقع پر حجاز، عراق، قفقاز، مصر اور البانیہ
کے مندوب بھی موجود تھے"۔

یہ الفاظ ہیں جن میں ہندوستان کے انگریزی اخباروں نے ہنگری میں شعائر اسلامی کے از سر نو احیا کی
خبر دی ہے۔ گور بابا کا اشارہ جناب گل بابا کے مزار کی طرف ہے جو ۱۵۴۱ء میں حصار بودا کے دوران میں
سلیمان ثانی کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے (۲۹ ربیع الثانی ۹۴۸ھ ہجریہ مقدسہ)۔ گل بابا کا تعلق
سلسلہ بکتاشیہ سے تھا اور جیسا کہ اوپر تذکرہ آچکا ہے ان کا مزار اب تک بوداپسٹ میں موجود ہے۔ یہ ایک
ہشت پہلو عمارت ہے جس کے گنبد میں چوبی سفالے اور سیسے کے پترے استعمال کئے گئے ہیں۔ گنبد کی چوٹی پر
ایک لالٹین لگا دی گئی ہے اور مزار کی دیواروں پر ہر طرف بیلیں چڑھی ہیں۔

تنقید و تبصرہ

کتب:-

کلیات عزیز | مجموعہ کلام خواجہ عزیز مرحوم لکھنوی معہ مقدمہ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر یار جنگ و تبصرہ ڈاکٹر سر محمد اقبال پی۔ایچ۔ڈی۔ تقطیع ۲۰×۲۶ ضخامت ۵۱۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ مجلد ے، غیر مجلد ہ۔ ملنے کا پتہ منیجر صاحب نامی پریس لکھنؤ۔

خواجہ عزیز متوفی ۱۹۱۵ء فارسی شاعری کے آخری استاد تھے جن کے اوپر ہندوستان میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ کیونکہ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس ملک سے فارسی زبان اٹھ گئی ورنہ یہاں کے اہل سخن بیشتر اسی زبان میں اپنے کمال اور جوہر کو دکھاتے تھے۔ اب نہ کہنے والے رہے اور نہ سمجھنے والے الا ماشاء اللہ۔

خواجہ صاحب کا مجموعۂ کلام ان کے فرزند اور خلف الصدق خواجہ وصی الدین ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے کوشش کے ساتھ فراہم کرکے ترتیب دیا اور شائع کیا۔ درحقیقت انھوں نے نہ صرف اپنے مرحوم باپ کا بلکہ دنیائے ادب کا حق ادا کیا جس پر وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

خواجہ صاحب مرحوم کی استادی مسلم ہے۔ ان کا کلام اساتذۂ قدیم کے کلام سے ٹکر کھاتا ہے بلکہ اس کا رنگ بھی وہی ہے۔ زبان میں کامل پختگی اور صفائی ہے۔ بیان کا انداز سنجیدہ اور ہموار ہے کہیں اپنے درجہ سے گرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور قصیدے بھی مثنویاں بھی ہیں اور قطعے بھی اور ہر صنف سخن میں ان کی قادر الکلامی نمایاں ہے۔ ان کی ایک نعتیہ غزل کا یہ شعر نہایت مقبول ہوا

دہد حق عشق احمد بندگان چیدۂ خود را — بجاصاں شاہی بخشد مے نوشیدۂ خود را

شیخ علی حزیں کا ایک مشہور مقطع ہے

حزیں از پائے رہ پیمائے بسے سرگشتگی دیدم — سر شوریدہ بر بالین آسایش رسید ایں جا

اس پر خواجہ صاحب کی بھی غزل ہے اور اس کا مقطع بھی خوب ہے

جہاں شہرت مالامال از ہر جنس دہر کالا — عزیزا رمی توانی یوسفے باید خرید ایں جا

ایک شعر میں خواب زندگی کی تمثیل بیان کرتے ہیں

شبستانیست گیتی کاندرو خوابیدہ گویا — ہمہ شب تا سحر خواب پریشاں دیدہ گویا

انسانی فطرت کی واماندگی پر روتے ہیں

زیں چہ خیزد کہ نقاب از رخ او بردارند — چشم من بست خود آں پردہ کہ نتواں برخاست

دہن و میان کی نبود بے نمود کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں

در حسن او دہان و میاں ایں دو چیز نیست — دیں حسن دیگرست کہ ہم ہست و نیز نیست

غالب اور نظیری کی اس بحر اور قافیہ میں غزلیں دیکھئے۔ خواجہ صاحب کا یہ شعر انکے کسی شعر سے فروتر نہ ہوگا

شب تار عاشقاں را نبود بشمع حاجت — کہ کنند خانہ روشن بہ جگر گداز کردن

کہیں کہیں لفظی رعایت بھی ہے مگر دلکش انداز میں

غیر از الم نخواند عزیز آیتے بعشق — زیں مصحف انتخاب الم ساخت

ہست نازم نہ بنیازیکہ زہند و صنماں — ہر کہ میکرد رم از سایہ من ۔ رام افتاد

زحالِ عاشقانت چشم پوشی خوش نمی آید — وگرنہ چشم بد دور انچہ پوشی خوشنما باشد

قصائد بڑے بڑے ہیں اور استادوں کے قصیدوں کے دوش بدوش۔ شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ والیہ بھوپال کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ اس میں بھوپال شہر کی تعریف میں لکھتے ہیں

بھوپال تال جامع ہر ناز و نعمت است — بھوپال جنت است اگر۔ تال کوثر است

ایک قصیدہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہے جو قاآنی کے قصیدے کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ شعرا کی مذہبی نوک جھونک بھی دلچسپ ہوتی ہے۔ قاآنی نے اپنا قصیدہ ان اشعار سے شروع کیا ہے

رسم عاشق نیست با یکدل دو دلبر داشتن — یا ز جاناں یا ز جاں بایست دل برداشتن

یا اسیرِ حکم جاناں باش یا در بندِ جاں — زشت باشد نو عروسے را دو شوہر داشتن

ان شعروں میں جو کنایہ ہے اسکی تصریح کرکے میں اسکی لطافت کو خاک میں ملانا نہیں چاہتا۔ خواجہ صاحب اسکے جواب میں لکھتے ہیں

نوعروساں را بیک آئینہ باشد کار و بس　　　مرد را زیباست چار آئینہ در بر داشتن

خواجہ صاحب کے اس قصیدے کا مطلع بھی خوب ہے

کار ہر کس نیست بار عالمے بر داشتن　　　دردِ سر بسیار دارد بر بسر افسر داشتن

مثنویاں چار ہیں۔ ان میں سے بڑی مثنوی داستان روم و روس غازی عثمان پاشا شیر پلونا کی لڑائی کے متعلق بطرز سکندر نامہ لکھی ہے اور بہت کچھ اس کا انداز نبا ہا ہے۔

نظامی نے سکندر نامہ میں بادشاہ وقت کی مدح اس طرح شروع کی ہے

عَلَم بر کش اے آفتاب بلند　　　خراماں شو اے ابر مشکیں پرند

بنال اے دلِ رعد چوں کوسِ شاہ　　　بخند اے لب برق چوں صبح گاہ

بیار اے ہوا قطرۂ ناب را　　　بگیر اے صدف در کن ایں آب را

بیا اے در از قعر دریائے خویش　　　بتاجِ سر شاہ کن جائے خویش

شاعر کی نگاہ میں زمین و آسمان کی تمام حرکت اپنے ممدوح کے لئے نظر آتی ہے۔ اسلئے اسکے مداح ہونے کی حیثیت سے تحکمانہ لہجے میں خطاب کرتا ہے کہ اے آفتاب اپنی کرن ڈال، اے ابر چل، اے رعد گرج، اے بجلی چمک، اے ہوا پانی برسا، اے سیپ قطرہ کو موتی بنا، اے موتی سمندر سے باہر نکل اور تاج شاہی میں آکر جگہ لے۔

خواجہ صاحب اسی نہج پر ملکہ وکٹوریہ کی مدح شروع کرتے ہیں

بیا اے فلک تازہ کن خاک را　　　برآر اے زمیں بر فلک تاک را

بدہ اے نو شاخ را توشۂ　　　بہر اے خوشہ برکش زہر گوشۂ

بگیر اے کدیور ازاں خوشہ آب　　　بتاب آفتاب آب راکن شراب

برآ اے شراب از تہ خم بجام　　　کہ باشد بکام شہنشہ مدام

حقیقت یہ ہے کہ وہ اس دور آخر میں اساتذۂ سلف کی یادگار تھے جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے۔

عزیزے ہر چہ بگوید بگوش ہوش شنو　　　کہ یادگار سخن پروران اسلافست

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ ہم حسب وعدہ اس مہینے میں ۹۶ صفحے کا پرچہ ٹھیک وقت پر شائع کر رہے ہیں۔ انشاءاللہ آیندہ بھی یہ پابندی جاری رہے گی۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس نمبر میں "دنیا کی رفتار" کے عنوان سے عالم اسلامی اور دوسرے بیرونی ممالک کے اہم واقعات پر مختصر تبصرے بھی کیے گئے ہیں۔ اگلے نمبر سے ان کے علاوہ ہندوستان کے متعلق بھی اسی قسم کا تبصرہ شائع ہوا کرے گا۔ یہ مضامین ایسے حضرات سے لکھوائے جاتے ہیں جو سیاسیات اور عمرانیات سے ذوق صحیح رکھتے ہیں اور ہندوستان اور بیرون ہند کے بہترین روزناموں اور مجلّوں کا دقت نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم شذرات کے صفحوں میں اب صرف جامعہ ملیہ اور دوسرے علمی، تعلیمی اور اصلاحی اداروں اور تحریکوں پر نظر رکھیں گے۔ امید ہے کہ اس تقسیم عمل سے ہمیں اپنے اس مقصد میں زیادہ کامیابی ہوگی کہ قارئین کرام کے سامنے مفید علمی اور ادبی، تاریخی اور اصلاحی مضامین پیش کرنے کے علاوہ انھیں دنیا کے اہم واقعات کو غور و تنقید کی نظر سے دیکھنے کی دعوت بھی دیں۔ نظم اور افسانے کے حصے میں بھی ہم زیادہ لطف اور تنوع پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تنقید کتب کے متعلق یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر فن کی کتابوں پر ان حضرات سے تبصرہ کرایا جائے جو اس کے ماہر یا مبصر ہیں۔ اس غرض سے کچھ کتابیں دہلی کے باہر بھیجنی پڑتی ہیں اور خط و کتابت میں دیر لگتی ہے مگر "دیر آید درست آید" کی امید پر ہم اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ جو حضرات ہمیں ریویو کے لیے کتابیں بھیجتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ اگر ریویو شائع ہونے میں تعویق ہو تو ہمیں معذور سمجھیں۔

رسالے کے لیے بلند پایہ علمی مضامین حاصل ہونے کی ایک نئی صورت نکلی ہے۔ اردو اکادمی یہ انتظام کر رہی ہے کہ ہندوستان کے ان ارباب علم سے جو اردو لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں ہر سال سات آٹھ خطبے اپنے ماہوار جلسوں میں پڑھوائے۔ اُمید ہے کہ آیندہ مہینے سے یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جلسوں میں پڑھے جانے کے بعد یہ خطبے دو تین قسطوں میں رسالہ جامعہ میں شائع ہوا کریں گے۔ اس طرح ہر نمبر کے لیے دو ایک محققانہ مضامین ہمیشہ مہیا رہا کریں گے۔

ان اصلاحوں کے بعد انشاء اللہ رسالے کی قدر اہل نظر کی آنکھوں میں بڑھ جائے گی لیکن رسالے کا اس حالت پر قائم رہنا اور مزید ترقی کرنا اس پر موقوف ہے کہ اس کی اشاعت بڑھے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہم اردو اکادمی کے ایک رکن انتظامی کو مختلف مقامات پر دورہ کرنے کے لئے روانہ کرنے والے ہیں کہ رسالے کے نئے خریدار اور اکادمی کے نئے ممبر بنائیں۔ رسالے کے پرانے خریداروں سے خصوصاً اکادمی کے پرانے ممبروں سے درخواست ہے کہ ہمارے نمائندے کو اس کام میں جتنی مدد دے سکتے ہوں اس میں دریغ نہ کریں۔ اس نوازش سے نہ صرف اردو اکادمی بلکہ جامعہ ملیہ بھی زیر بار احسان ہوگی۔

ہم نے گذشتہ نمبر میں افسانہ نویسی کے مقابلے کا جو اعلان کیا تھا اس کی طرف ہم اہل قلم کو پھر توجہ دلاتے ہیں۔ انعام خصوصاً اتنی کم رقم کا انعام، کوئی ایسی چیز نہیں جس کے لئے عمدہ لکھنے والے زحمت تحریر گوارا کریں لیکن ان کی قلمی امداد سے اردو ادب کی جو خدمت ہوگی وہ خود بڑا بیش بہا انعام ہے۔

اردو اکادمی کی طرف سے جو مشاعرہ یوم تاسیس کے موقع پر منعقد ہونے والا ہے اس کا وقت ۲۹ اکتوبر ۹ بجے تا ۱۲ بجے شب مقرر کیا گیا ہے۔ لاہور سے حضرت حفیظ جالندھری، کانپور سے حضرت حسرت، الہ آباد سے حضرت اصغر گونڈوی، لکھنؤ سے حضرت صفی، حضرت ثاقب اور حضرت ظریف تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت فانی اور حضرت مانی کو بھی دعوت دی گئی ہے اور امید ہے کہ وہ قبول فرمائیں گے۔ دہلی کے چند کہنہ مشق شعرا بھی مدعو کئے گئے ہیں۔

انشاء اللہ ہم آیندہ نمبر میں یوم تاسیس کی خصوصاً مشاعرے کی مفصل روداد شائع کریں گے۔

امیر نے یہ سب سن کر وزراء سے کہا کہ میں تو اس کو قتل کر چکا۔ پھر اس کے حکم سے ابو الصباح کا سر نکالا گیا اور منادی نے چلا کر اس کے لشکر والوں سے کہا کہ "ابو الصباح قتل کر دیا گیا۔ جو جانا چاہے امن و آزادی کے ساتھ اپنے اپنے شہر میں چلا جائے۔" یہ سن کر لوگ منتشر ہو گئے اور کوئی فساد نہ ہوا۔

فاطمی کی بغاوت | اس کے بعد فاطمی نے سرکشی کی اور چار سال تک مسلسل امیر سے لڑتا رہا۔ فاطمی کا نام شقین بن عبد الواحد المکناسی ہے اور اس کی ماں کا نام فاطمہ۔ فاطمی بجدانی قبیلے کا تھا جو کتابت یعنی خوشنویسی میں مشہور ہے۔ اس نے اپنے فاطمی ہونے کا دعویٰ کیا اور اچانک سالم ابوزعنل عامل ماردہ پر ایک رات حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا اور قوریہ کے اطراف پر غلبہ کر کے چاروں طرف لوٹ مار مچا دی اور اس پر امیر خود روانہ ہوا۔ اُسے غزوات الدور کہتے ہیں۔ فاطمی امیر کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور جنگلوں کی طرف بھاگ گیا۔ امیر نے شہر میں داخل ہو کر باغیوں کا تمام سامان تباہ و برباد کر ڈالا اور جن لوگوں پر کچھ نہ کچھ جرم ثابت تھا ان میں کسی کو بغیر سزا دیے نہ چھوڑا۔ امیر نے یہ سب کارروائی لوگوں کو عبرت دلانے کیلئے کی۔

حیوہ ابن ملاس کا فتنہ | اس اثناء میں امیر کے پاس بدر کا خط قرطبہ سے آیا، جہاں وہ امیر کا قائم مقام تھا، اس خط میں لکھا تھا کہ "حیوہ ابن ملاس نے اشبیلیہ میں حمص والوں کے ساتھ مل کر سر اُٹھایا ہے۔ یہ حیوہ حضرمی قبیلہ کا ہے اور اس کی اعانت میں اس کے ساتھ عبد الغافر یحصبی بھی ہے۔"

جس وقت امیر کو یہ خط ملا، امیر کے ساتھ اشبیلیہ کے لشکر میں ملب کلبی ابن شخناش اور اس کا بیٹا بھی تھے۔ یہ خط پڑھ کر امیر سارہ میں جا اترے اور اشبیلیہ کے لوگوں میں سے تیس شخص گرفتار کئے، (ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں) اور ان کو قید رکھنے کا حکم دیا۔ یہ سب قرطبہ بھیج دئے گئے۔ پھر امیر دشمنوں کی طرف بڑھے اور وہ بھی پیشقدمی کرتے ہوئے میسر تک آپہنچے۔ انھوں نے اپنی حفاظت کے لئے خندق کھود لئے تھے۔ جب امیر ان کے مقابل پہنچے تو جنگ چھڑ گئی اور ایک مدت تک جاری رہی۔ ان لوگوں کے ساتھ مغربی بربری بھی تھے۔ امیر نے ان بربریوں سے خط و کتابت کرنے کے لئے بنی میمون کو ہدایت کی اور یہ بھی سمجھا دیا کہ بربریوں کو امیر کی نیک خیالی کا یقین دلا دیں۔ اس کے بعد امیر نے ایک ہوشیاری یہ کی کہ دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لئے اپنے غلاموں اور جدید اسیران جنگ

کو بیچنا شروع کر دیا۔

یہ تدبیر کامیاب رہی، لوگ خوف زدہ ہو کر امیر کی طرف متوجہ ہونے لگے اور ان کے دیوان خانے میں ایک جماعت اظہار اطاعت کے لئے حاضر ہوگئی۔ اس جماعت کے سامنے ہی امیر نے اپنی فوج کو احکام جنگ سنائے۔

جن بربریوں سے بنی میمون خط و کتابت کر رہے تھے انھوں نے وعدہ کیا کہ جب خندق اور حصار بے کار ہو جائیں گے اور جنگ نہایت زور پر ہوگی اس وقت ہم اپنے گروہ کے ساتھ شکست کھا جائینگے مگر شرط یہ ہے کہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز عین گرمی جنگ میں بربریوں نے اپنے وعدہ کا ایفا کیا اور امیر کے مخالفوں کو شکست فاش ہوئی۔ فوج غنیم کا کوئی بربری قتل سے باقی بچا نہ کوئی عرب، سب بری طرح مارے گئے۔ علاء کے ہمراہیوں میں جتنے قتل ہوئے تھے اس سے زیادہ حبشی اس جنگ میں قتل ہوئے۔ حیوۃ بھی قتل ہوگیا، عبدالغافر سمندر کے راستے سے فرار ہو کر مشرق جا پہونچا۔ اس کے بعد امیر نے بدر کو لکھا کہ "جو تیس آدمی تمہارے پاس قید ہیں انھیں قتل کر دیا جائے۔" اس حکم کی تعمیل ہوئی۔

اسی زمانے میں امیر نے بزیع الحارث ابن بزیع القاتل کو خریدا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ جب امیر نے اس کی شجاعت کے بعض واقعات خود ملاحظہ کئے تو اس سے دریافت کیا "تم غلام ہو یا آزاد؟" اور اس نے جواب میں اپنے آپ کو غلام بیان کیا تو امیر نے اسے خرید کر حبشیوں کا چودھری بنا دیا۔ لیکن اس زمانے کی چودھرات کو اس زمانے[1] کی چودھرات پر قیاس نہ کرنا چاہیئے بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ حبشیوں کی ایک علیحدہ فوج مقرر کر کے بزیع کو اس کا افسر بنا دیا تھا۔ ایسی ہی چودھرات امیر الحکم نے بھی جاری کر رکھی تھی۔ پہلے صرف دو گروہ ہوا کرتے تھے سوار یا پیدل اور شتر سوار عبدالحمید ابن غانم کے ماتحت تھے جو پیدل فوج کا افسر تھا۔ پیدل اور سوار کی کوئی امتیازی وردی نہ تھی جیسی اب ہے۔

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے زمانے ہی میں چودھرات کا مفہوم تبدیل ہو چکا تھا۔

اسی سال امیر پھر فاطمی کے تعاقب میں چلا مگر فاطمی جنگلوں میں بہت دور بھاگ کر قصر ابیض سے آگے بڑھ چکا تھا اس لئے اسے واپس آنا پڑا۔

یحییٰ ابن یزید و عبیداللہ ابن ابان کی بغاوت

پھر یحییٰ ابن یزید ابن ہشام جس کو الیزیدی بھی کہتے ہیں اور عبیداللہ ابن ابان ابن معاویہ بن ہشام ابن عبدالملک باغی ہو گئے اور ابن دیوان الحیشانی و ابن یزید ابن یحییٰ التجی اور ابن ابی غریب نے ان کی اعانت کی۔ جب یہ لوگ متفق ہو کر امیر کے خلاف کھڑے ہوئے تو عبیداللہ کا ایک غلام رات کو فصیل سے لٹک کر شہر میں اتر آیا۔ یہ غلام سلمان تھا تھا اور بدر سے ملنے کے لئے قصر کے ارادہ سے نکلا تھا۔ جب بدر سے ملاقات ہوئی تو اس نے اس بغاوت کا حال کہدیا۔ اس وقت امیر وادی شوش میں تفریح و شکار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ امیر کو وہیں یہ حالات معلوم ہوئے اور بدر نے بھی ڈاک کے ذریعے سے اطلاع دی۔ اس بنا پر امیر نے فوراً اساعہ کو بلایا جو سواروں کا افسر تھا اور اسے حکم دیا کہ تم جتنے آدمی میسر آسکیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور عبیداللہ ابن ابان کو گرفتار کرو۔ عبدالحمید بن غانم پیدل فوج کے افسر کو بلا کر یحییٰ ابن یزید کی گرفتاری کا حکم دیا۔ ان دونوں افسروں نے اپنی اپنی جگہ پہنچ کر حکم کے مطابق ان لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اس اثناء میں امیر رصافہ پہونچ گئے اور عبداللہ و یحییٰ وغیرہ کو قید رکھنے کا حکم دے کر باقی لوگوں کے لئے فوج روانہ کی۔ جب سب گرفتار ہو گئے تو امیر کے حکم سے سب قتل کر دئے گئے اور ان کی لاشیں رصافہ سے قلعہ قرطبہ تک گھسیٹی گئیں۔

عبدالرحمن ابن حبیب کی شورش اور انجام

پھر عبدالرحمن بن حبیب فہری جو سقلابی کے نام سے بھی مشہور ہے امیر سے تدمیر میں ایک سال تک لڑتا رہا۔ سقلابی نے سلیمان اعرابی کلبی سے جو ان دنوں برشلونہ میں تھا، اعانت کے لئے مراسلت کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ سقلابی نے خفا ہو کر خود سلیمان سے لڑائی چھیڑ دی مگر سلیمان نے اس کو شکست دے دی اور سقلابی تدمیر کو واپس ہو گیا۔ یہ موقع دیکھ کر امیر سقلابی کی طرف بڑھا اور تدمیر کو تباہ و برباد کر دیا۔

ابھی اس مہم کا مختتم فیصلہ نہ ہوا تھا کہ برانس کا ایک شخص محسان[۱] نامی اریط والوں میں سے سقلابی کے

---

[۱] محسان:۔ یہ نام اصل کتاب میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔

پاس آیا اور اس کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے اتنی خیر خواہی ظاہر کی کہ سقلابی کو اس پر پورا اعتماد ہو گیا اور سقلابی کے دل میں اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا۔ ایک دن محان نے دھوکا دے کر اس کو قتل کر ڈالا اور سقلابی کے سواروں کو اپنے ساتھ لے کر امیر کے پاس جا پہونچا۔

فاطمی کا تعاقب | اس کے بعد امیر نے تمام اور ابو عثمان کو ایک لشکر دیکر فاطمی کی مہم پر بھیجا جو ان دنوں ایک قلعے میں تھا۔ ان دونوں نے وجیہہ غسانی کو سفیر بنا کر فاطمی کے پاس بھیجا۔ وجیہہ ابو عثمان کا بھانجا تھا۔ فاطمی نے وجیہہ کو بہکا کر اپنی طرف کرنا چاہا۔ وجیہہ اس کے کہنے میں آکر وہیں ٹھہر گیا اور پھر تمام اور ابو عثمان اپنے لشکر کے ساتھ فاطمی کی طرف بڑھے۔ فاطمی بھی میدان میں اترا اور دونوں لشکروں میں خوب جنگ ہوئی۔ مگر فتح فاطمی کو ہوئی۔ امیر کا لشکر پسپا ہوا اور فاطمی شنتبریہ کی طرف بڑھا اور ایک موضع میں جس کو قریۃ العیون کہتے ہیں جا اترا۔ یہاں ابو معن داؤد ابن ہلال اور کنانہ بن سعید الاسود نے دھوکا دے کر فاطمی کو قتل کر ڈالا۔ وجیہہ غسانی بھاگ کر ساحل البیرہ میں پناہ گزین ہوا۔ اس کے لئے امیر نے شہید و عبدوس ابن ابی عثمان کو مقرر کیا جو عین عید کے دن اس کے پاس پہونچے اور فریب دے کر یہ ظاہر کیا کہ ہم دونوں تمہارے پاس پناہ لینے آئے ہیں اور ایک موقع پر دھوکے میں حملہ کر کے وجیہہ کو قتل کر ڈالا۔

جس وقت امیر نے شہید و عبدوس کو وجیہہ کی طرف روانہ کیا تھا اسی وقت بدر کو ابراہیم ابن شجرہ بربنی مروانی کی طرف بھیجا تھا اور جس دن شہید و عبدوس نے وجیہہ کو پہونچ کر قتل کیا عین اسی دن بدر بھی ابراہیم کے پاس پہونچا۔ چونکہ ابراہیم ایک بہادر شخص تھا اس لئے مقابلہ کے وقت دونوں میں سخت جنگ ہوئی اور بڑی دشواری کے بعد بدر اسے قتل کر سکا۔

سلمی کی بغاوت | اس کے بعد سلمی نے امیر پر حملہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ امیر کے یہاں سلمی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ایک رات کو سلمی نشے میں بیہوش ہو کر شہر کی طرف چلا۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ اُس نے چاہا کہ باب القنطرہ یعنی پل والے دروازے کو کھولے مگر چوکیدار مانع آئے۔ یہ دیکھ کر اُس نے چوکیداروں پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ اس کی خبر العبدی کو ہو گئی۔ العبدی نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ رات امن و سکون سے گزر جانے دی۔ جب سلمی کا نشہ اترا اور اس نے اپنی حرکت پر غور کیا تو امیر

کے خوف سے مشرق کی طرف بھاگا اور ایک قلعے میں حفاظت کی غرض سے پناہ لی۔ امیر نے اُس کے پیچھے حبیب بن عبد الملک قرشی کو روانہ کیا۔ حبیب نے اسے مقابلے کے لئے بلایا۔ سلمی نے نکل کر سر میدان مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ شخصی تھا اور اس میں سلمی کا حریف مغیث کا ایک غلام تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر پوری قوت سے حملہ کیا اور دونوں ایک دوسرے کے حملے سے ختم ہو گئے۔

رماحس والی الجزیرہ کی سرکشی | اس کے بعد رماحس بن عبد العزیز کنانی والی الجزیرہ نے بغاوت کی۔ اس نے دوشنبہ کے روز لشکر تیار کیا اور جمعہ کے دن امیر کو خبر ملی۔ شنبے کے روز امیر اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ رماحس کو خبر تک نہ ہوئی اور فسخ بیعت سے دس روز کے اندر اندر یعنی بدھ کے دن امیر کا لشکر آگیا۔ اس وقت رماحس حمام میں ہڑتال لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ دفعتہً اطلاع ہوئی تو ہڑتال پونچھ کر اپنے اہل و عیال کے ہمراہ جہاز میں سوار ہو کر فرار ہوا اور ابو جعفر منصور عباسی خلیفہ کے پاس پہونچا۔

سلیمان اعرابی کی بغاوت | اب سلیمان اعرابی نے سرقسطہ پر حملہ کیا۔ اس حملے میں اس کے ساتھ حسین ابن یحییٰ انصاری بھی تھے جو حضرت سعد بن عبادہ صحابی کی اولاد سے ہیں۔ امیر نے ثعلبہ ابن عبد کو معہ لشکر سلیمان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ ثعلبہ اہل شہر سے مقابلہ کرتا رہا جو سلیمان کے طرفدار ہو گئے تھے۔ چند روز کی جنگ کے بعد سلیمان نے لشکر سے آرام کی مہلت مانگی۔ لوگوں نے اس سے یہ خیال کیا کہ لڑائی بند ہو گئی اور شہر کے دروازے بند کر کے آرام سے بیٹھ رہے۔ اب سلیمان اعرابی نے خفیہ طور پر اپنا سوار لشکر تیار کر کے ثعلبہ ابن عبد پر ایک دم حملہ کر دیا اور ثعلبہ کو اس کے ڈیرے ہی میں جا لیا اور گرفتار کر کے قید کر دیا۔ ثعلبہ کے لشکر کو شکست ہوئی اور سلیمان نے ثعلبہ کو شاہ قارلہ کے پاس بھیج دیا۔

شاہ قارلہ کا حملہ | ثعلبہ جب بحالت قید شاہ قارلہ کے یہاں پہونچا تو قارلہ نے اپنے خیال میں اس بغاوت کے واقعے کو امیر کے ضعف پر محمول کیا اور اپنے دل میں فتح سرقسطہ کی امید باندھ کر حملے کی نیت سے سرقسطہ کی سمت بڑھا اور وہاں پہنچ کر جنگ شروع کر دی۔ لیکن اہل شہر نے اس کے خلاف سختی سے مدافعت کی اور اسے اتنا عاجز کر دیا کہ وہ سرقسطہ چھوڑ کر اپنی جگہ واپس آنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے بعد امیر خود سرقسطہ کی جانب جنگ کے ارادے سے روانہ ہوا۔ جب وہ فج ابی طویل

سے آگے بڑھا تو اثنائے راہ میں حفص بن میمون اور غالب ابن تمام کے درمیان مفاخرت پر جھگڑا ہو گیا۔ حفص نے جان بوجھ کر اہل عرب پر اپنی فضیلت کا ادعا کیا جسے غالب ابن تمام برداشت نہ کر سکا اور اُس نے حفص کو تلوار سے قتل کر دیا۔ امیر نے ان کے جھگڑے پر کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی اور سفر جاری رکھا۔ جب شنتنبہ پر پہنچے تو امیر نے چھتیس آدمی گرفتار کئے۔ ان میں ایک ہلال بھی تھا جس کا لڑکا داؤد جو فاطمی کے قتل میں شریک تھا مر چکا تھا۔ یہ سب قیدی قرطبہ بھیج دئے گئے اور وہاں کسی گھر میں قید کر دئے گئے۔ اس وقت سے وہ گھر قید خانے کے نام سے مشہور رہے۔ پھر امیر آگے بڑھے۔ امیر کے سرقسطہ پہنچنے سے پہلے حسین بن یحییٰ انصاری، سلیمان اعرابی کو جمعے کے دن کہ مسجد جامع میں قتل کرا چکا تھا۔ اب جو امیر سرقسطہ پہنچے تو ان کا مقابل صرف حسین ہی تھا۔

سلمان اعرابی کا بیٹا عیسوں اربونہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ جب اسے امیر کے سرقسطہ آنے کی خبر ملی تو وہ بھی سرقسطہ کی طرف بڑھا اور دریا کے اس پار ٹھہر گیا۔ ایک دن عیسوں نے دیکھا کہ جس شخص نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا وہ شہر سے نکل کر وادی کے کنارے کنارے جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے فوراً اپنا گھوڑا امیز کیا اور پاس پہنچ کر اپنے باپ کے قاتل کو مار ڈالا اور اپنے گروہ میں آکر شامل ہو گیا۔ اس جگہ کو اب تک مخاضۃ العیسوں کہتے ہیں۔ امیر نے یہ واقعہ سن کر خواہش کی کہ عیسوں ہمارے لشکر میں شامل ہو جائے چنانچہ عیسوں نے امیر کی خواہش کا احترام کیا اور سرقسطہ میں امیر کی طرف سے ان کے دشمنوں سے لڑتا رہا۔ جب اہل شہر محاصرے سے تنگ آ گئے تو حسین نے مجبور ہو کر امیر سے صلح کی خواہش کی اور اپنے بیٹے کو بطور یرغمال پیش کیا جس کا نام سعید تھا اور وہ بڑا دلاور جوان تھا۔ امیر نے اس کی استدعا قبول کی اور واپس ہو گیا۔ لیکن سعید امیر کے لشکر میں ایک روز سے زیادہ نہیں رہا اور حیلہ کر کے شہر بلیارش میں اپنے دوستوں کے پاس پہنچ گیا۔

یہاں سے آگے بڑھ کر امیر نبلونہ اور قلبیرہ پہنچے اور بشکنس کی طرف واپس ہو کر ملک شرناطیس میں داخل ہوئے وہاں سے ابن بلسکوط کے پاس آئے اور اس کے لڑکے کو بطور یرغمال لیا اور اُن کو جزیہ دینے پر مجبور کر کے صلح کر لی۔ ہنوز امیر کو عیسوں کی طرف سے اطمینان نہ تھا اس لئے امیر نے

اسے قید کرا دیا۔

حفص کے بھائی کا واقعہ | حفص ابن میمون کے بھائی وھب اللہ نے اپنے بھائی کے واقعہ قتل پر کہا تھا کہ اگر قریش اس حادثے پر ہماری مدد کے لئے جوش میں نہ آئے تو قسم ہے خدا کی ستر ہزار تلواریں ہماری امداد کے لئے اُٹھیں گی۔ یہ بات امیر کو کھٹک رہی تھی۔ ایک موقعہ پر امیر نے وھب اللہ کو بھی قید کر دیا۔ جب امیر قرطبہ واپس ہوئے تو ایک دن رصافہ میں بالاخانے پر بیٹھے بیٹھے وہب اللہ کو بلا کر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد عیسوں کو بلوایا۔ عیسوں نے لوگوں سے کہا کہ میں امیر کے مفید مطلب ایک مشورہ پیش کرنا چاہتا ہوں اس لئے مجھے امیر کے حضور میں لے چلو۔ جواب ملا کہ امیر کے پاس کوئی نہیں پہنچ سکتا تمہیں جو کچھ کہنا ہو یہیں کہہ لو۔ تب اس نے اپنے پاس کی ایک چھری سے جو اس نے امیر کے قتل کے لئے چھپا رکھی تھی اس آدمی پر حملہ کر دیا جس سے یہ گفتگو ہو رہی تھی اور زخمی کر ڈالا۔ وہ آدمی زخمی ہو کر مر گیا۔ اس جسارت سے عیسوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور اُسے کچھ مددگاروں کے ملنے کی بھی امید بندھ گئی۔ وہ اسی دھیان میں تھا کہ یوسف داروغہ حمام خانہ جس کے پاس جلانے کی لکڑی تھی آپہنچا اور اُس نے وہی لکڑی عیسوں کے سر پر مار کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس واقعے کے بعد امیر کے حکم سے رصافہ سے قرطبہ تک عیسوں اور وھب کی لاشیں گھسیٹی گئیں اور پھر ان لاشوں کو قصر شاہی کے نیچے سولیوں پر چڑھا دیا گیا۔

سعید ابن حسین جو پہلے امیر کے ساتھ تھا اس سے علیحدہ ہونے کے بعد پھر لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس لئے امیر کو جنگ کے لئے پھر سرقسطہ جانا پڑا۔ وہاں پہنچ کر امیر نے شہر کے چاروں طرف چھتیس منجنیقیں نصب کر دیں۔ اہل شہر اس محاصرے سے سخت تنگ ہوئے اور انھوں نے حسین کو پکڑ کر امیر کے حوالے کر دیا۔ امیر نے حسین اور یہاں کے ایک باشندے رزق کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا۔ رزق کے ہاتھ پانوں کٹوا دئے۔ اسی میں اس کی جان گئی۔

مغیرہ ابن ولید کی شورش | بعد ازاں امیر پھر قرطبہ واپس ہوا اور رصافہ میں مقیم ہوا۔ اب امیر کے بھانجے مغیرہ ابن ولید نے امیر پر حملے کا ارادہ کیا اور ہذیل ابن صمیل ابن حاتم نے اس کی اعانت کی۔ علا ابن عبدالحمید القشیری نے امیر کو اس کی خبر دی۔ امیر نے فوراً مغیرہ اور ہذیل کے پاس اپنے آدمی بھیج کر حالات کی

تحقیق کی۔ ان لوگوں نے اپنی خطا کا اقرار کیا اور امیر نے انھیں قتل کرا دیا۔

ابوالاسود محمد ابن یوسف کی بغاوت اور امیر کی وفات

ابوالاسود محمد ابن یوسف نے اہل مشرق کی امداد سے امیر کے خلاف بغاوت کی اور شہر قسطلونہ پر جا پہنچا۔ امیر بھی اُس کے مقابلے کے لیے بڑھے۔ یہ جنگ چند روز تک ہوتی رہی نتیجے میں محمد ابن یوسف کو شکست فاش ہوئی اور اس کی جماعت پراگندہ ہو گئی۔ محمد ابن یوسف کے چار ہزار آدمی اس جنگ میں کام آئے۔ محمد قوریہ کی طرف چلا گیا۔ امیر نے اسی سال اس کا تعاقب کیا مگر وہ نہیں ملا اور جنگلوں میں روپوش ہو گیا۔ آخر امیر اُس کے اہل و عیال اور بہت سے آدمیوں کو قتل و اسیر کر کے شہروں کو تباہ کرتے ہوئے قرطبہ واپس آئے۔ یہ ان کی آخری جنگ تھی۔ اس کے بعد امیر نے تینتیس سال تین ماہ حکومت کر کے انتقال کیا۔ خدا ان پر رحم فرمائے۔

امیر کے بعض اور حالات

ایک مرتبہ قریش نے امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں ایک وفد بھیجا جس نے اپنے عطیے میں ان وظائف کے اضافے کی درخواست کی تھی جو قریش کو ملا کرتے تھے اور ارکان وفد کے نزدیک کم تھے۔ وفد نے امیر کے ساتھ اپنی قرابت بطور حجت پیش کی تھی۔ اس کے جواب میں امیر نے حسب ذیل اشعار لکھے:۔

شتان من قام ذا امتعاض (۱) منتضی الشفرتین نصلا

فجاب قفراً و شق بحراً (۲) مسامیاً لجۃً و محلا

فبز ملکاً و شاد عزاً (۳) و منبراً للخطاب فصلا

و جند الجند حین اودی (۴) و مصرا لمصرین اخلا

ترجمہ:۔

(۱) اور لوگوں میں اس شخص میں فرق ہے، جو جوش و غضب کے عالم میں دو دھاری تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

(۲) میدانوں اور پانی کی گہرائیوں کا مقابلہ کر کے ریگستان طے کیے اور سمندروں کو عبور کیا۔

(۳) ملک کی آبرو بڑھائی اور اس کی حفاظت کی اور فصل خطاب کے لئے منبر پر چڑھا۔

(۴) اس نے ایسے وقت لشکر جمع کیے جب وہ تباہ ہو چکا تھا اور گڑے ہوئے شہروں کو اس وقت بنایا جبکہ وہ ان سے دلکش ہو گیا تھا۔

ثم دعا اھلہ جمیعاً (۱) حیث اتوا ان ھلم اھلا

فجاء ھذا طریر جوع (۲) شرید سیف ابید قتلا

فنال امنا و نال شبعاً (۳) و نال مالاً و نال اھلا

الم یکن حق ذا علے ذا (۴) اعظم من منعم و مولا

ایک دفعہ امیر سرحد کے قریب کسی لڑائی میں مصروف تھے۔ اس کے لشکر کے اطراف میں کچھ کلنگ اور قازیں آگئیں۔ ایک شخص نے جو امیر کے شوق شکار سے واقف تھا خبر دی اور امیر کو شکار کے لیے آمادہ کرنا چاہا۔ امیر نے کچھ دیر تامل کیا اور پھر یہ شعر پڑھے :۔

دعنی صید وقع الغرانق (۵) فان ھمی فی اصطیاد المارق

فی نفق او کان فی حالق (۶) اذا التقت ھواجر الطرائق

کان لفاعی ظل ھند خافق (۷) غنیت عن روض و قصر شاھق

فقل لمن نام علے النمارق (۸) ان العلا شدت بھم طارق

ترجمہ :۔

(۱) پھر اس نے اپنے تمام خاندان کو مختلف مقامات سے بلایا۔

(۲) اس حالت میں یہ بھوک کا مارا ہوا، تلوار اور قتل سے ڈرا ہوا شخص یہاں آیا۔

(۳) اور اس نے سیر ہو کر امن اور دولت و خاندان سب کو پالیا۔

(۴) کیا ایسے شخص کا حق خاندان پر ایک منعم و آقا سے زیادہ نہ ہوگا۔

(۵) مجھے جانے دو، اور قازوں کا ذکر چھوڑ دو، کیونکہ میری ہمت سرکشوں کے شکار میں مصروف ہے۔

(۶) یہ شکار کمیں گاہوں میں ہو یا سرنگوں اور بلند پہاڑوں میں۔ جس وقت راستوں اور میدانوں کے سراب موجزن ہوں۔

(۷) لہراتے ہوئے جھنڈے کا سایہ میری چادر ہوتا ہے۔ میں باغوں اور بلند محلوں سے بے پروا ہو گیا اور مجھے ریگستانوں کے ہوتے ہوئے سراپردوں میں رہنے کی ضرورت نہ رہی۔

(۸) قالینوں پر سونے والوں سے کہدے کہ عزت و سربلندی تو بڑی مصیبتوں اور بلند ارادوں سے وابستہ ہے۔

فارکب الیہا ثبج المصائق (۱) اولا فانت ارذل الخلائق

ایک روز خلیفہ عباسی ابو جعفر منصور نے اپنے مصاحبوں سے پوچھا کہ قریش کا شہباز کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ "امیر المومنین" یعنی آپ ہیں کہ تمام ملک پر آپ نے قبضہ کرلیا، فسادات کا سدباب ہوگیا اور اب ملک میں امن و امان ہے۔ کہا کہ "نہیں، تم نے کچھ ٹھیک جواب نہیں دیا" پھر لوگوں نے کہا کہ "معاویہ"۔ کہا "نہیں"۔ لوگوں نے کہا "عبد الملک ابن مروان"۔ کہا "نہیں"۔ آخر لوگوں نے خود ابو جعفر سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے، تو ابو جعفر نے کہا کہ وہ عبد الرحمٰن ابن معاویہ ہے جو اپنی چالاکی سے بھالوں اور تلواروں سے نجات پاکر تنہا جنگل اور سمندر عبور کرتا ہوا ایک اجنبی ملک میں پہنچا، شہر آباد کئے، لشکر جمع کئے اور سلطنت جو کہ اس کے خاندان سے بالکل جاتی رہی تھی پھر قائم کرلی۔ معاویہ ابن ابی سفیان اپنی حسن تدبیر اور ارادہ کی مضبوطی سے اس گھوڑے پر سوار ہوا جسے عمر و عثمان نے تیار کیا تھا اور معاویہ کے لئے آسانیاں بہم پہنچادی تھیں۔ عبد الملک ابن مروان اپنی سابقہ بیعت کی وجہ سے کامیاب ہوا اور بیں اپنے قبیلہ اور اپنے طرفداروں کی بدولت فائز المرام ہوا۔ عبد الرحمٰن ابن معاویہ تنہا تھا صرف اس کی رائے اس کی مؤید اور اس کا ارادہ اس کا ساتھی تھا۔

جب امیر نے سرقسطہ پر حملہ کیا تو ابن اعرابی مدافعت کے لئے نکلا اور دونوں میں سخت جنگ ہوئی جس میں آخر کار امیر غالب ہوئے۔ اس موقع پر امیر اپنے لشکروں کی دیکھ بھال خود کرتے اور ہر چھوٹی بڑی بات کی خبر رکھتے تھے۔

ایک روز امیر نے ایک سوار کو اپنے گھوڑے سے اترتے دیکھا جو بظاہر اپنے کام سے فارغ معلوم ہوتا تھا اور یہ شعر پڑھ رہا تھا:۔

لم یطیقوا ان ینزلوا ونزلنا   واخو الحرب من اطاق النزولا

(ہم میدان میں اتر آئے مگر ان میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ جنگجو تو وہی ہے جو میدان میں آسکتا ہو۔)

---

(۱) اس نے تنگیوں اور دشواریوں کا بے خطر مقابلہ کر، ورنہ تو ذلیل ترین خلائق میں شمار ہوگا۔

امیر نے اپنے خادم سے کہا کہ جاؤ اور اس شخص کا حال معلوم کرو۔ اگر شرفا سے ہو تو ایک ہزار دینار اور معمولی آدمی ہو تو پانسو دینار اس کو دیدو۔ جب خادم اس کے پاس پہنچا تو وہ قعقع ابن زنیم رمیّہ کا عرب تھا۔ خادم نے ایک ہزار اشرفیاں اس کو دے دیں۔ پھر امیر نے اس شخص کو اردن کے لشکر کا قاضی بنا دیا۔ جب اس کی مالی حالت درست ہوگئی تو اس نے امیر سے بغاوت کی لیکن امیر نے اس پر غالب ہو کر معاف کر دیا تاکہ پہلا احسان ضائع نہ ہو اور اسے پھر قاضی مقرر کر دیا۔

امیر ہشام ابن عبدالرحمٰن الداخل

ہشام ابن عبدالرحمٰن نہایت فاضل، فیاض اور کریم النفس امیر تھا۔ رعیت کے ساتھ اس کا سلوک اچھا تھا۔ ملک کی حدود اس کی بدولت نہایت مضبوط تھیں۔ اس کے عہد کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ کفار میں سے کسی شخص نے وصیت کی تھی کہ مسلمانوں کے ملک میں جو چند غلام ہیں ان کو خواہ مال کے ذریعے سے یا کسی اور طریقے سے رہائی دلائی جائے۔ بے حد کوشش کی گئی کہ یہ وصیت پوری ہو جائے مگر سرحدوں کے سخت انتظام و نگرانی اور مسلمانوں کی قوت اور مشرکین کے ضعف کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی۔

ہشام کا دستور تھا کہ جب اس کے لشکر کا کوئی سپاہی چھاؤنی یا سرحد پر جاتا تو وہ اس سپاہی کی جگہ اس کے بیٹے کا نام دفتر حساب میں درج کرا دیتا اور وہی تنخواہ اس کے بیٹے کو ملنے لگتی تھی ہشام کی یہ تعریف حضرت مالک ابن انس رحمۃ اللہ علیہ کو مدینے میں معلوم ہوئی تو انھوں نے آرزو کی کہ "اللہ تعالیٰ اس کو حج کی توفیق دے"۔

یہ روایت فقیہہ ابن ابی ہند کی ہے جو حضرت مالک سے ملے تھے اور ان کے شاگرد بھی تھے۔ انہوں نے حضرت مالک سے حدیث کی سند لی تھی اور ان سے روایت کرتے تھے۔

ہشام کی سخاوت و ایثار ہشام کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ حواریوں میں سے ایک شخص نے اس سے ایک مالدار آدمی کے مرنے کا ذکر کر کے کہا کہ وہ بہت مقروض تھا۔ اور اس کی جائداد غیر منقولہ نہایت اچھی

اور زرخیز ہے۔ ایسی باتیں کرکے امیر کو اس جائداد کی خریداری پر بہت راغب کیا اور کہا کہ وہ جائداد عنقریب اس قرضے کے بارمیں فروخت ہو جائے گی۔ امیر نے کہا کہ "میں یہ تو چاہتا ہوں کہ اگر میں خرید سکوں تو اس کی جائداد خرید لوں لیکن یہ مجھے زیادہ پسند ہے کہ اس جائداد کو اپنے قبضے میں رکھنے کے بجائے بار قرض سے سبکدوش کرکے اس کے ورثار کو دیدوں۔" چنانچہ امیر نے اس جائداد کو خرید کر زر ثمن سے قرضہ ادا کرایا اور جائداد اس کے ورثار کے پاس رہنے دی۔

مخفی فیاضیاں اور تعمیر مساجد کی کوشش

ہشام کا معمول تھا کہ وہ اشرفیوں کے توڑے بار کرا کے اکثر تاریک اور برساتی راتوں میں مساجد میں بھیجا کرتا تھا تاکہ وہاں تقسیم کردی جائیں۔ اس طرز عمل سے اس کا مدعا یہ تھا کہ مسجدیں آباد رہیں۔

استبداد حکام کا انسداد، مظلوموں کی دادرسی

ہشام نہایت سخت گیر بادشاہ تھا۔ وہ اپنے عمّال کی استبدادیت کا دل سے دشمن تھا اور ان کی خدمات کی کوتاہی پر سخت گرفت کرتا تھا۔ ایک دفعہ ہشام کہیں جا رہا تھا کہ اس کے جلوس میں ایک شخص آگیا جس پر اس کے کسی والی نے ظلم کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہشام تک پہنچ کر والی کی شکایت کرے۔ مگر جلوس میں اس والی کا ایک دوست بھی تھا اُس نے اس مظلوم شخص کو اپنی عبا میں چھپا لیا اور تسلی دیکر اس کا جو کچھ نقصان ہوا تھا اس کی تلافی اپنے پاس سے کردی، ہشام تک شکایت نہ پہنچنے دی اور والی کو لکھ دیا کہ "اس شخص کو دل جوئی و نرمی سے راضی کرلو۔" مگر یہ بات چھپ نہ سکی اور ہشام کو اطلاع ہوگئی۔ ہشام کو یہ امر بہت گراں گزرا کہ وہ مظلوم مجھ تک نہ پہنچنے پایا۔ پھر جب اس سے یہ کہا گیا کہ اس کے نقصان کی تلافی کردی گئی ہے تو اس نے یہ جواب دیا کہ "مظلوم کا انصاف اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اس کا حق ادا نہ ہو جائے۔" پھر مظلوم کو تلاش کرا کے بلایا اور کہا کہ "حدود اللہ کے سوا جو کچھ تجھے نقصان پہنچا ہے اس کو حلف سے بیان کر۔" وہ شخص قسمیہ بیان کرتا جاتا تھا اور امیر کی طرف سے اس کا معاوضہ ہوتا جاتا تھا۔

حکومت سے پہلے کا ایک واقعہ

ہشام کی اس سختی کا یہ اثر ہوا کہ عمال کوڑے اور تلوار سے زیادہ

ہشام سے ڈرنے لگے۔ اس طرح ایک قصہ اس کے فرمانروا ہونے سے پہلے کا یہ ہے کہ وہ ایک دن دوپہر
کے وقت اپنے بالاخانے میں بیٹھا ہوا کھڑکی سے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس نے بنی کنانہ کے
ایک شخص کو آتے ہوئے دیکھا جو جیان کے لوگوں سے تھا اور ہشام ہی کا پروردہ تھا۔ اس شخص کا
بھائی ابوایوب ضلع جیان کا والی تھا۔ ہشام نے اُسے گرمی کے زمانے میں دھوپ میں آتے ہوئے
دیکھا تو اپنے خدمت گار کو بلا کر حکم دیا کہ حاجب سے کہدو کہ "جب یہ شخص آئے تو فوراً لے کر ہمارے
پاس حاضر ہو، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ابوایوب نے تکلیف دی ہے جو ایسے وقت میرے
پاس آرہا ہے۔" کنانی جب آیا تو فوراً ہشام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت ہشام کے پاس
اس کی ایک لونڈی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ کنانی آیا تو لونڈی کو پردے میں کر دیا گیا اور ہشام نے کنانی
سے پوچھا "کیا حال ہے؟ میں سمجھتا ہوں کوئی اہم خبر ہے جس سے پریشان ہو کر یہاں آیا ہے۔"
کنانی نے کہا "جی ہاں - ایک کنانی نے کسی شخص کو غلطی سے قتل کر دیا۔ مقتول کی دیت تمام
کنبے پر عائد کی گئی لیکن مجھ پر یہ ظلم ہوا کہ جس قدر عائد ہونا چاہئے تھی اس سے زائد میرے ذمے لگائی
گئی ہے۔ چونکہ ابوایوب جانتا ہے کہ مجھے آپ کے حضور میں کتنی خصوصیت ہے اس لئے وہ میری فکر
میں ہے۔ مجبور ہو کر آپ کے پاس پناہ لینے آیا ہوں۔ ہشام نے کہا کہ مطمئن رہ - ہشام تیری اور تیری
ساری قوم کی طرف سے دیت ادا کر دے گا۔ پھر پردے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنی کنیز کا ایک
زیور اتار کر اس کنانی کو دیدیا جس کی قیمت تین ہزار دینار تھی اور اس سے کہا کہ اس کو فروخت کر کے
رقم دیت ادا کر۔ اگر کچھ باقی بچ جائے تو اپنے کام میں لا۔ کنانی نے کہا کہ "میں حصول مال کے لئے
نہیں آیا ہوں، نہ مجھے اس کی حاجت ہوئی ہے۔ میں تو اس ظلم کے خلاف صرف آپ سے مدد مانگنے
آیا ہوں جو مجھ پر روا رکھا گیا ہے اور یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے میں میرے ساتھ عنایت و
توجہ سے پیش آئیں۔" ہشام نے کہا اس کی کیا صورت ہوگی۔ اس نے کہا صرف یہ کہ آپ امیر سے
ابوایوب والی کو لکھوا دیں کہ اس معاملے میں فلاں کنانی سے جتنی دیت ناواجب وصول کی جارہی ہے،
نہ وصول کی جائے بلکہ جتنی تمام قبیلے والوں سے لی گئی ہے اتنی ہی ازروئے انصاف اس سے بھی

بھی لی جائے۔" ہشام نے کہا اچھا تو اس زیور کو اپنے ہی پاس رہنے دے۔ میں ابھی انتظام کئے دیتا ہوں اور اسی وقت سوار ہو کر اپنے باپ امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں گیا جو اس وقت رصافہ میں تھا۔ عبدالرحمٰن کو اطلاع ہوئی تو اس نے کہا کوئی ایسی ہی غیر معمولی بات ہوئی ہے جو اس وقت آیا ہے۔ پھر ہشام کو بلایا تو وہ سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ عبدالرحمٰن نے کہا بیٹھو۔ ہشام نے جواب دیا کہ "اللہ امیر کے اقبال میں برکت دے۔ جو رنج و اذیت مجھے پہنچی ہے اس کے ہوتے ہوئے کیسے بیٹھوں۔ پھر امیر سے سب قصہ بیان کر کے استدعا کی کہ میری آرزو پوری کی جائے۔ امیر نے کہا "بیٹھو، تمہاری آرزو پوری کی جائے گی اور جو مانگتے ہو ملے گا۔" پھر ہشام سے پوچھا کہ ابو ایوب کے بارے میں کیا چاہتے ہو۔ کہا یہی کہ اس کو لکھ دیا جائے کہ اپنے بھائی سے ہاتھ روک لے اور اس سے نا واجب مطالبہ نہ وصول کرے۔ امیر نے کہا اگر کوئی صورت اس سے بہتر ہو تو کیسا ہے۔ جب تمہاری عنایت اس کنانی پر اتنی ہے تو بیت المال سے کیوں نہ دیت ادا کرا دی جائے، اور تمام بنی کنان سے اس کا بار اُٹھا لیا جائے۔ ہشام نے اسے منظور کر لیا اور امیر کا بہت شکریہ ادا کیا۔ امیر نے بیت المال سے ادائے دیت کا حکم دے کر ابو ایوب کو لکھ دیا کہ اب کنانی اور اس کے خاندان سے کوئی تعرض نہ کرے۔

اس انتظام کے بعد جب وہ کنانی ہشام سے رخصت ہونے آیا تو ہشام سے کہا کہ "میرے آقا! مجھے اپنی آرزو سے زیادہ کامیابی ہوئی اور میرے خیال سے زیادہ حضور نے مجھے مدد دی۔ اب اللہ نے مجھے اس زیور کی طرف سے بھی مستغنی کر دیا ہے، یہ حاضر ہے کیونکہ میں اس چیز کو لے کر بنی کنانہ کے لئے بابرکت نہیں ہو سکتا جو ایک جاریہ سے چھینی گئی ہو اور اس طرح اس کے حق میں نحس ثابت ہو۔ ہشام نے جواب دیا کہ اے کنانی جو چیز میں دے چکا ہوں واپس نہیں لے سکتا اسے تو ہی لے لے۔ اللہ تعالیٰ جاریہ کو اس سے بہتر دے گا۔

امیر الحکم بن ہشام رحمۃ اللہ

اخلاق و عادات | امیر الحکم بن ہشام بڑا بہادر و محتاط اور فہمند بادشاہ تھا۔ اس نے تمام فتنوں کو فرو کر کے

شجر نفاق کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکا اور آس پاس کے کفار کو ذلیل کیا۔ اس میں یہ وصف بہت نمایاں تھا کہ اپنی اس شجاعت و عزت نفس کے باوجود نہایت درجہ متواضع تھا مگر اس کی یہ تواضع بھی نااہلوں کے لئے نہ تھی بلکہ جن لوگوں کو اہل سمجھتا تھا ان کے ساتھ مخصوص تھی۔ وہ ہمیشہ انصاف کے آگے گردن جھکا دیا کرتا تھا خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس خصوص میں وہ اتنا سخت تھا کہ وہ اپنی اولاد اور مقربین کی ناانصافی کو بھی ذرا نہ پسند کرتا تھا۔ وہ اپنے حکام میں پاک بازی اور نیک سیرتی کے اوصاف دیکھنے کا آرزومند تھا۔ اس کے فیصلے ہمیشہ عدل و انصاف کے موافق ہوا کرتے تھے اس کے عہد میں جو بزرگ قضا کے عہدے پر مامور تھے انھوں نے اپنے زہد و ورع اور کمال قابلیت سے الحکم کو رعایا کی طرف سے معاملات و قضایا میں بہت مطمئن کر رکھا تھا۔ ذیل میں وہ واقعہ درج کیا جاتا ہے جس سے الحکم کے دل پر ان قاضی صاحب کی دیانت و قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔

قاضی کا بے لوث انصاف، الحکم کی حق پسندی

ضلع جیان کے رہنے والے ایک شخص کی ایک کنیز کسی حاکم نے غصب کر لی تھی۔ جب وہ حاکم معزول ہوا تو اس نے یہ تدبیر کی کہ اس کنیز کو الحکم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ادھر مستغیث نے قاضی صاحب کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ قاضی صاحب نے گواہ طلب کئے اور شناخت کے لئے اس کنیز کو بھی امیر سے طلب کیا اور امیر کے پاس صاف لفظوں میں کہلا بھیجا کہ انصاف و قانون کی نظر میں عام و خاص، امیر و غریب، راعی و رعایا، سب برابر ہیں۔ اگر امیر کو کنیز بھیجنا منظور نہیں ہے تو قاضی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گا۔ امیر کو چاہئے کہ ان دونوں صورتوں میں سے ایک کو پسند کر لیں۔ امیر الحکم نے کہا کہ اس کے علاوہ ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مستغیث جس قدر قیمت طلب کرے اسے ادا کر دی جائے۔ قاضی نے کہا ایک تو گواہوں کو جو اس قدر دور دراز ملک سے شہادت دینے آئے ہیں تکلیف ہوگی دوسری قباحت یہ ہے کہ جب تک مستغیث کنیز پر قبضہ نہ پالے۔ بیع کامل نہیں ہو سکتی۔ لہذا امیر کو اس باب میں ان دو باتوں کے سوا کوئی اختیار نہیں ہے کہ قاضی کا استعفیٰ منظور کرے یا لونڈی کو عدالت میں بھیجے۔

امیر نے جب اس معاملے میں قاضی صاحب کو بہت مستقل پایا تو کنیز کو عدالت میں بھیجنا گوارا کر لیا

اگرچہ یہ اسے بہت ہی شاق گزرا کیونکہ وہ اس کنیز پر فریفتہ تھا۔ غرض گواہوں نے بعد شناخت گواہی دی کہ یہ کنیز مستغیث ہی کی ہے۔ قاضی نے مستغیث کے حق میں فیصلہ صادر کیا اور ہدایت کی کہ مستغیث لونڈی کو اگر فروخت کرنا چاہے تو اپنے شہر میں لے جا کر فروخت کرے تاکہ رعایا کو حقوق طلبی میں کافی قوت حاصل ہو اور وہ بے خوف و خطر امیر و غریب کے مقابلے میں انصاف کی طالب ہوسکے۔

جب ان قاضی صاحب کا انتقال ہوا تو الحکم کو سخت ملال ہوا اور وہ بہت پریشان ہوگیا۔ الحکم کی ایک کنیز نے اس موقع کی ایک عجیب حکایت بیان کی جو یہاں درج کی جاتی ہے۔

قاضی کے انتخاب کے لئے الحکم کا اضطراب

جس رات الحکم کو قاضی صاحب کے انتقال کا علم ہوا اس رات کو یہی کنیز جو اس واقعے کی راوی ہے امیر کے پاس سو رہی تھی۔ درمیان شب میں جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے الحکم کو اس کے بستر پر نہیں پایا۔ تلاش کیا تو قصر کے ایک حصے میں الحکم نماز میں مصروف نظر آیا۔ یہ انتظار میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ہنوز وہ سجدے ہی میں تھا کہ یہ وہیں پڑ کے سو گئی پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو الحکم کو بدستور سجدے میں پایا۔ کچھ دیر انتظار کر کے پھر سو گئی۔ صبح کے وقت الحکم نے خود اسے اٹھایا تو اس کنیز نے پوچھا کہ "اس قلق و اضطراب کی کیا وجہ تھی جو آپ رات بستر سے علیحدہ رہے۔" الحکم نے کہا مجھ پر سخت مصیبت پڑی ہے۔ قاضی صاحب جن کو میں نے رعایا کے معاملات و انصاف پر مقرر کیا تھا انتقال کر گئے ہیں۔ مجھے ان کی قابلیت، دیانتداری اور زہد پر پورا بھروسہ تھا اور انھوں نے مجھے رعایا کی طرف سے بڑی حد تک مطمئن کر رکھا تھا۔ اب مجھے خوف ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ مجھے ان کا سا جانشین نہ ملے اس لئے خدائے تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا کہ وہ مجھے قاضی صاحب مرحوم کے سے جامع اوصاف قاضی کے مقرر کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ وہ میری طرف سے قاضی ہو کر مجھے مطمئن کر سکے اور منصفانہ فیصلے کرتا رہے۔

عہدۂ قضا پر محمد ابن بشیر کا تقرر

جب صبح ہوئی تو الحکم نے وزرا کو طلب کیا اور انتخاب قاضی کے لئے مشورہ کیا۔ مالک ابن عبداللہ قرشی نے محمد ابن بشیر کی رائے دی جو باجہ میں مالک کے کاتب رہ چکے تھے اور کہا کہ مجھے ان کی قابلیت اور زہد پر پورا اعتماد ہے۔ امیر کے دل میں بھی یہ بات

صحت کی تیر بہدف گولیاں

OKASA

جرمنی کی جادو اثر طبی ایجاد

کون ہے جس نے بجدیہ کی شہرہ آفاق، ہر پروفیسران ورناف اور اسٹنکاہ کی حیرت انگیز تدابیر جراحی کا حال نہ سنا ہو۔ صرف بعض غدودوں کے بدل دینے سے بوڑھے سے بوڑھا آدمی تندرست جوان بنجاتا ہے) ان تدابیر پر دنیا ہنوز انگشت بدنداں تھی کہ جرمنی کے نامور ماہر طبیعات ڈاکٹر لاہوسین (ایم۔ڈی) پروفیسر برلن یونیورسٹی نے اپنی اس دوا کے انکشاف سے ہل چل پیدا کر دی ہے جو کثیر المصارف عمل جراحی کے عذاب اور خطرہ میں ڈالے بغیر از سر نو صحت کو بحال کر دیتی ہے۔

اس عظیم الشان انکشاف پر اوکاسا کمپنی (برلین) کو بین الاقوامی نمائش پیرس اور اطالوی نمائش (فلورنس) میں گرینڈ پرکس طلائی تمغے اور مشہور و معروف "کراس آف آنر" بطور سند ملی ہیں ان کی نقلیں ہمارے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔ جھریاں اور سپید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اضمحلال چڑچڑاپن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں

اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے، اس سے پہلے کہ بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے۔ یہ دوا ہر دوا فروش کے یہاں سے مل سکتی ہے۔ ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں۔

Sole Agency Okasa co; Ltd; (Berlin)
22, Apollo street, P. O. Box No. 396,
Bombay.

مولنا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۷	بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۱ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا)

تفسیر کا دورِ اول

اس سے قبل ہم بیان کر آئے ہیں کہ صدرِ اسلام میں نشر و اشاعت اور وسعت عمل کے لحاظ سے مذہبی سرگرمیاں سب سے بڑھی ہوئی تھیں اور اس عہد میں زیادہ تر علمائے دین ہی کا دور دورہ رہا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں پر مذہب کا نفوذ حد کمال تک پہنچ گیا تھا اور مذہب ہی اُن کو امت کا شیرازہ بند اور قومی عظمت و رفعت کا سرچشمہ دکھائی دیتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام کا وجود مسعود عرب میں جلوہ گر نہ ہوتا تو اہل عرب بدستور قبیلوں اور گروہوں میں بٹے رہتے اور ہر ایک قبیلہ دوسرے کے خلاف نبرد آزمائی کرتا ہوتا اور نیز حدود ملک سے باہر نکلنے کی بجائے اہل عرب اپنے خیموں میں مگن رہتے اور کشور کشائی اور جہانگیری کہیں خواب میں بھی نظر نہ آتی طبعی امر تھا کہ اہل عرب اسلام کو اپنی دنیا کی بہبودی اور آخرت کی سعادت سمجھتے، اُن کے علاوہ اور قوموں نے بھی اس دعوت حق کو لبیک کہا اور نہایت اخلاص کے ساتھ جوق در جوق اس میں داخل ہوئے۔ ان کے دلوں میں بھی عربوں کی طرح اسلام کی صداقت اور حقانیت جاگزیں تھی اور عقیدت اور شوق میں یہ نومسلم سابقین اولین سے کسی طرح پیچھے نہ تھے، چنانچہ ان فاتحین اور مفتوحین نے جو ایک ہی دین کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے قرآن کی طرف توجہ کی اور رسول اللہ صلعم کے اقوال کو سننے اور جمع کرنے لگے، اس طرح سے قرآن و حدیث کا سلسلہ شروع ہوا۔ آگے چل کر جب دولت اسلامیہ وسیع ہوئی اور نئے نئے حوادث سے مسلمانوں کا سابقہ ہوا تو قرآن و حدیث سے استنباط مسائل کی طرح پڑی۔ اس عہد میں دنیوی علوم اور فلسفہ کا بازار بالعموم

---

(۱) رسالہ جامعہ بابت ماہ جولائی و اگست "پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی مراکز"

سرور رہا۔ اور ان دونوں میں سے اگر کسی شق کو کچھ فروغ حاصل بھی ہوا تو دینی رنگ میں رنگنے اور مذہب کی آڑ لینے کے بعد۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز طب کی ایک کتاب کی اشاعت کے لئے کئی دن تک استخارہ کرتے رہے اور اسی طرح غزوات، اسلامی فتوحات، باہمی خانہ جنگیوں اور معرکہ ہائے قتال کی روایتیں حدیث کی شکل میں معرض وجود میں آئیں۔ اس سے قبل مذہبی تحریکات "علمی مراکز" کے تحت میں مجملاً بیان کر دی گئی ہیں۔ آئندہ صفحات میں اُن کی تفصیل کی کوشش کی جائیگی۔

اس دور میں مذہبی تحریکات کا دار ومدار ان تین اہم امور پر تھا۔ قرآن اور اس کی تفسیر، حدیث اور اس کی تالیف و تربیت اور نئے حوادث کی بنا پر مسائل کا استنباط جسے ہم شریعہ کے نام سے بیان کریں گے۔

قرآن اور اُس کی ترتیب | قرآن مجید تقریباً بیس سال کے عرصے میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں آنحضرت صلعم پر نازل ہوا۔ اس تمام مدت میں حوادث اور احوال کے مطابق آیات کا نزول ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے انتقال فرمایا اور اُس وقت تک قرآن ایک مصحف میں جمع نہ ہوا تھا۔ وہ محفوظ تو تھا لیکن کاتبین وحی کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے متفرق کتبوں اور حفاظ کے سینوں میں۔ حضرت ابو بکر کے عہد میں پہلی دفعہ قرآن کو جمع کیا گیا لیکن ایک مصحف میں نہیں بلکہ متفرق کتبوں کو یکجا کر دیا گیا اور جو کچھ حفاظ کو یاد تھا وہ سپرد رقم کر لیا۔ یہ ذخیرہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس رکھا گیا۔ قرآن کی کتابت و تدوین حضرت زید بن ثابت کی زیر نگرانی سرانجام ہوئی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو یہ صحیفے ملے۔ اور اُن سے ام المومنین حضرت حفصہؓ کی طرف منتقل ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں مذکورہ صحائف کو حضرت حفصہؓ سے لے کر حضرت زیدؓ بن ثابت عبداللہؓ بن زبیر سعید بن عاص کے سپرد کیا تاکہ اُن کو ایک مصحف میں جمع کر دیا ئے۔ پھر اس جمع شدہ مصحف کے متعدد نسخے نقل کرا کر مختلف شہروں میں بھیجے اور اس رسمی مصحف کے خلاف جو کچھ ہاتھ لگا وہ نذر آتش کر دیا گیا۔ اس بیان کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم نے صرف ضروری واقعات بیان کر دئے ہیں۔

قرآن اہل عرب کی زبان اور اُن کے اسلوب کلام اور محاورہ کے مطابق نازل ہوا۔ اس

کے الفاظ عربی ہیں۔ سوائے قلیل التعداد الفاظ کے جو معرب ہیں اور دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں، لیکن اہل عرب نے ان اجنبی الفاظ کو اپنا لیا تھا اور اُس پر اپنے قواعد اور لسانی قوانین جاری کرئے تھے۔ قرآن کا اسلوب بیان اہل عرب کے اسلوب کے مطابق ہو۔ اُس کی طرح اس میں بھی مجاز کنایہ اور حقیقت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور چاہئے بھی یہ تھا کیونکہ اس کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے۔ اس لئے اُن کی زبان میں ہونا لازمی امر تھا۔ " وما ارسلنا من رسل الا بلسان قومہ لیبین لہم "

اس کے باوجود تمام کے تمام صحابہ قرآن کا ہر ایک حصہ سننے کے ساتھ ہی اس کے تمام مطالب سے بہرہ ور نہیں ہو جاتے تھے اور ہمیں ابن خلدون کے اس قول کا آخری حصہ تسلیم کرنے میں تامل ہو کہ " قرآن اہل عرب کی زبان اور اُن کے اسلوب بیان کے مطابق نازل ہوا۔ اور وہ تمام کے تمام اس کو سمجھتے اور اسکے مفردات اور ترکیبوں کے معانی کو جانتے تھے "۔ ہمارے خیال میں قرآن کے عربی زبان کے نازل ہونے سے یہ شرط لازم نہیں آتی کہ تمام اہل عرب اس کے مفردات اور ترکیبوں پر حاوی ہوئے۔ اس کی دلیل خود ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہو۔ کسی زبان میں ایک کتاب کا ہونا اس امر کا مترادف نہیں ہوتا کہ تمام اہل زبان اس کو سمجھتے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں کتنی کتابیں ہیں جو خود انگریز اور فرانسیسی نہیں سمجھتے۔ واقعہ یہ ہو کہ ایک کتاب کے سمجھنے کے لئے صرف زبان کی ضرورت نہیں بلکہ کتاب کے معیار کے مطابق استعداد عقلی ہونا ضروری ہے۔ یہی حال قرآن کے بارے میں اہل عرب کا تھا، وہ تمام کے تمام پوری کتاب سمجھنے پر قادر نہ تھے۔ ہر ایک اپنی استعداد اور ذہانت کے مطابق اس علم لدنی سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ بلکہ ہماری رائے میں اہل عرب کا ہر ایک فرد قرآن کے تمام الفاظ کے معانی سے بھی سے بھی آگاہ نہ تھا جیسا کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قوم کا ہر ایک فرد اُس قوم کی زبان کے تمام الفاظ پر عبور رکھتا ہے۔ مزید ثبوت کے لئے حضرت انس بن مالک کی روایت ملاحظہ ہو۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے " وفاکہۃ وابا "، میں " ابّا " کے معنی پوچھے؟ حضرت عمر نے فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے تکلف اور تعمق سے منع فرمایا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ

سے ایک اور روایت ہو کہ آپ نے منبر سے یہ آیت پڑھی " او یاخذہم علی تخوف " اور تخوف کے معنی دریافت فرمائے۔ بنی ہذیل میں سے ایک شخص نے کہا کہ تخوف ہمارے ہاں نقص کو کہتے ہیں پھر یہ شعر پڑھا۔

تخوف الرحل منہا تامکا قردا　　کما تخوف عود النبعۃ السفن

حضرت عمر کی علم دین میں منزلت دیکھئے اور پھر اس روایت کو ملاحظہ کیجئے، جب ان کا یہ حال ہو تو دوسرے صحابہ کا کیا ذکر۔ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد آیات کے صرف اجمالی معنوں پہ اکتفا کرتی تھی، مثلاً اللہ تعالی کے اس قول " وفاکہۃ وابا " میں وہ اس کی عنایتوں کا شمار مراد لیتے تھے۔ اور الفاظ کی تحقیق اور معانی کی تفصیل اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ قرآن میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن کو سمجھنے کے لئے زبان اور اس کے اسالیب کا جاننا کافی نہیں مثلاً (والعادیات ضبحا) (والذاریات ذروا) اور (والفجر ولیال عشر) میں دس راتوں سے کیا مراد ہو۔ نیز قرآن مجید میں تورات اور انجیل کے واقعات کے متعلق بکثرت اشارات پائے جاتے ہیں، جن کے سمجھنے کے لئے صرف زبان کی معرفت کسی طرح کافی نہیں۔ خدائے تعالے فرماتا ہے۔

" وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری۔ جس میں سے بعض آیتیں صاف و صریح ہیں وہی اصل کتاب ہیں۔ اور دوسری مبہم، تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو قرآن کی ان مبہم آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فساد پیدا کریں اور ان کے اصل مطلب کی ٹوہ لگائیں۔ حالانکہ اللہ تعالی کے سوا ان کی اصل حقیقت کسی کو معلوم نہیں الخ . . . (سورۂ آل عمران)

حقیقت الامر یہ ہو کہ فہم قرآن اور معرفت معانی قرآن میں تمام صحابہ کرام کے ایک سے نہ تھے، بلکہ استعداد کے اعتبار سے ان کے مختلف مدارج تھے۔

---

(۱) یہ دونوں روایتیں کتاب الموافقات جزو ۲ صفحہ ۵۷ و ۵۸ مطبوعہ مصر میں ہیں۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں تمام قرآن حفظ کرنے کا رواج جیسا کہ بعد میں عام ہوا نہیں تھا۔ صحابہ ایک سورۃ یا چند آیتیں حفظ کرتے اور اُس کے مطالب سمجھتے، جب اُس میں کما حقہ درک حاصل ہو جاتا تو آگے بڑھتے۔ اس طرح سے جملہ صحابہ پر حفظ قرآن تقسیم ہو جاتا تھا۔ ابو عبد الرحمٰن السلمی کا بیان ہے کہ عثمان بن عفان اور عبد اللہ بن مسعود وغیرہم ایسے قرآن پڑھنے والے بزرگوں نے ہم سے ذکر کیا کہ وہ آنحضرت سے دس آیات پڑھتے اور جب تک علم و عمل کے لحاظ سے اُن پر عبور نہ کر لیتے کبھی آگے نہ بڑھتے، انسؓ[1] کہتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا۔ اُس کی قدر منزلت ہماری نظروں میں بہت بڑھ جاتی۔ عبد اللہ بن عمرؓ[2] نے سورۃ بقرہ کے حفظ کرنے پر آٹھ سال لگائے۔ ایک آیت یاد کرتے اور اُس کے معانی اور مطالب سمجھتے پھر کہیں آگے بڑھتے۔

تفسیر کی ضرورت کیوں پیش آئی قرآن میں کثیر التعداد آیتیں صاف و صریح ہیں۔ جن کا مطلب واضح ہے۔ ان میں دین کے اصول اور اُس کے احکام بیان کئے گئے ہیں، خاص طور پر مکی سورتوں میں سورہ انعام ملاحظہ کیجئے۔ اس قسم کی سورتوں کا سمجھنا عوام الناس اہل عرب کے لئے چنداں دشوار نہیں تھا۔ ان کے علاوہ قرآن میں مبہم آیتیں بھی ہیں، جن کا سمجھنا مشکل ہے اور صرف مخصوص اہل علم ہی اُن کے کنہ تک پہنچ سکتے۔

صحابہ کرام بالعموم قرآن کے سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے کیونکہ وہ اُن کی زبان میں اترا۔ اور نیز وہ اُن حوادث اور احوال کے عینی شاہد تھے جن کے بارے میں آیات اُترتی تھیں۔

اس کے باوجود بھی فہم قرآن کے متعلق اُن میں اپنی اپنی استعداد کے اعتبار سے مختلف مدارج تھے۔ مزید تفصیل یہ ہے۔

---

(۱) مسند امام احمد۔ } (۲) الاتقان جزو ۲ صفحہ ۲۰۸

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام صحابہ کی زبان عربی تھی لیکن زباندانی میں ایک دوسرے میں تفاوت ضرور تھا، اُن میں سے بعض ادب جاہلی سے زیادہ بہرہ ور تھے اور غیر مانوس اور مشکل الفاظ سمجھتے تھے اور اس سے وہ فہم قرآن میں مدد لیتے۔ اور بعض اس میدان میں اُن سے پیچھے تھے۔

۲۔ بعض صحابہ کو آنحضرت سے زیادہ شرف صحبت ملا اور وہ آپؐ کی حضوری اور رفاقت میں اوروں سے زیادہ عرصے تک رہے اور اس سے وہ آیات کے شان نزول سے زیادہ واقف ہوئے اور دوسرے ان نعمتوں سے محروم رہے۔ آیات کے مطالب سمجھنے کے لئے شان نزول سے غیر معمولی مدد ملتی ہے اور اُس کے نہ جاننے سے لغزشوں کا احتمال رہتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے قدامہ بن مظعون کو بحرین کا عامل مقرر کیا، بعدازیں جارودؓ نے شکایت کی کہ قدامہ نے شراب پی اور انھیں شبہہ بھی ہوا، آپ نے اس پر گواہ طلب کیا۔ جارود نے ابوہریرہؓ کا نام لیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ قدامہ! میں تمھیں کوڑے لگاؤں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر میں نے شراب پی ہی ہے جیسا کہ یہ لوگ بیان کرتے ہیں تو تمھیں کوڑے لگانے کا کوئی حق نہیں، حضرت عمرؓ کے سوال کرنے پر قدامہ نے یہ آیت پڑھی۔

"اُن لوگوں پر جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے جو کچھ انھوں نے کھایا اس پر کوئی گناہ نہیں جب کہ وہ اللہ سے ڈرے اور ایمان لائے اور نیک کام کئے اور بار دیگر وہ ڈرے اور ایمان لائے اور پھر ڈرے اور اچھے کام کئے" اور میں تو اُن لوگوں میں سے ہوں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور نیز میں آنحضرت کے ساتھ بدر۔ احد۔ خندق اور دوسرے معرکوں میں شریک ہوا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تم میں سے کوئی اس کا جواب دیتا ہے؟ اس پر ابن عباس نے فرمایا کہ یہ آیات گذشتہ را صلوٰۃ اور آئندہ را احتیاط کا حکم رکھتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ شراب، جوئے اور دوسرے منکرات کو حرام قرار دے دیا ہے۔ حضرت عمر نے اس کی تصدیق کی۔ ایک اور روایت ہے کہ ایک آدمی ابن مسعود کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے مسجد میں ایک آدمی کو دیکھا جو قرآن کی تفسیر اپنی

رائے سے کر رہا تھا۔ وہ اس آیت کریمہ کے متعلق کہتا ہے "یوم تاتی السماء بدخان مبین"، کہ قیامت کے دن آدمیوں پر دھواں چھا جائے گا اور اُن کے دم گھٹنے لگیں گے اور اُن کو زکام سا لاحق ہو جائے گا" یہ سُن کر ابن مسعود نے کہا کہ جو جانتا ہو وہ کہے، اور جو نہ جانے۔ وہ اللہ پر چھوڑ دے۔ مذکورہ آیت کا یہ مطلب ہے کہ قریش نے آنحضرت کی نافرمانی کی آپ نے بددعا کی چنانچہ اُن پر حضرت یوسف کا سا قحط نازل ہوا اور اُن کو اتنا دبایا کہ وہ ہڈیاں تک کھا گئے۔ اُن کی مصیبت کے مارے یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب اُن میں سے کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تو اپنے اور آسمان کے درمیان دھواں[1] پاتا۔

۳۔ اہل عرب کے اقوال و افعال کے مختلف طریقوں سے بہرہ ور ہونے میں بھی صحابہ میں درجے تھے۔ بعض جو ایام جاہلیت کی رسوات حج سے واقف تھے حج کی آیات کو دوسروں سے جو ان سے ناواقف تھے زیادہ سمجھتے۔ علیٰ ہذا القیاس اُن آیات کو جن میں عربوں کے معبودان باطل اور ان کے طریقۂ عبادت کی مذمت کی گئی ہے، پورے طور پر سمجھنے کے لئے جاہلی رسوات کا علم ضروری تھا۔

۴۔ اسی طرح جزیرۂ عرب میں بسنے والے یہود و نصاریٰ کے افعال و حرکات کے جو وہ نزول قرآن کے زمانے میں کرتے تھے، جاننے اور نہ جاننے کا اثر فہم قرآن پر پڑتا تھا۔ قرآن میں اُن کی طرف اشارات کئے گئے ہیں اور نیز اُن کی مذمت اور تردید کی گئی ہے۔ ان تمام وجوہ کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فہم قرآن کے متعلق صحابہ کے مختلف مراتب تھے اور بعد کی نسل یعنی تابعین میں اُن سے زیادہ اختلاف مراتب وجود میں آیا۔

تفسیر کے ماخذ | تفسیر کی ایک شق تفسیر بالمنقول ہے، جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ آیات کی تفسیر یا تشریح جو آنحضرتؐ نے فرمائی۔ مثلاً الصلوٰۃ الوسطیٰ سے صلوٰۃ عصر

---

(۱) الموافقات جزو ۳

مراد لی۔ اسی طرح حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ نے رسول اللہ سے یوم الحج الاکبر کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ قربانی کا دن، اسی قسم کی بیشتر روایتیں آپ سے مروی ہیں۔ حدیث کی چھ صحیح کتابوں کے علاوہ قصہ گوؤں نے اس قبیل کی تفسیر اور بہت گڑھ ڈالی علما رحدیث نے ان روایات کی کافی چھان بین کی اور صحیح وضعیف کو پرکھا۔ غضب تو یہ ہے کہ بیک وقت ایک آیت کی دو تفسیریں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں، آنحضرت سے مروی ہیں۔ اس قسم کی کثیر التعداد مثالیں ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم انھیں بیان نہیں کرتے بعض علمار نے تفسیر کے اس باب کا بالکل انکار کر دیا ہے۔ یعنی وہ اس قبیل کی روایتوں کی صحت تسلیم نہیں کرتے۔ امام احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ تین چیزیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں، تفسیر جنگوں اور غزووں کی روایتیں۔ اس تفسیر کی عدم صحت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مفسرین نے ان روایات پر اعتماد نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ اگر ان کے نزدیک یہ تفسیر قابل اعتماد ہوتی تو وہ کبھی اس سے بے التفاتی نہ برتتے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس منقول تفسیر کا ذخیرہ بڑھتا چلا گیا۔ آنحضرت کے بعد صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی اسی زمرہ میں داخل ہو گئے چنانچہ عہد اول کی تفسیریں تمام کی تمام انھیں اقوال پر مشتمل ہیں۔

۲۔ تفسیر کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ اجتہاد ہے، یا اسے دوسرے لفظوں میں رائے کہہ لیجئے۔ مفسر عربی زبان اس کے اسالیب بیان۔ ادب جاہلی وغیرہ سے معرفت تامہ رکھنے کے علاوہ شان نزول سے بھی واقف ہو۔ ان سب لوازم کے بعد وہ آیات پر غور کرتا اور اپنی رائے سے ان کی تفسیر کرتا ہے۔ صحابہ کا ایک گروہ اس قسم کی تفسیر کرتا تھا چنانچہ ابن عباس اور ابن مسعود سے اس

---

(۱) الاتقان جزو ۲۔ امام موصوف کے شاگردوں کا خیال ہے کہ اس قول سے مراد یہ ہے کہ اس قبیل کی روایتوں کا غالب حصہ صحت اسناد سے خالی ہے۔

قبیل کی بہت سی روایتیں مروی ہیں۔

تفسیر کے سلسلے میں صحابہ اور تابعین کی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک جماعت قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے دینے سے مطلقاً گریز کرتی۔ سعید بن المسیب سے قرآن کے بارے میں کچھ پوچھا جاتا تو آپ فرماتے کہ قرآن میں میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ ابن سیرین نے عبیدہ سے اس قسم کی ایک اور روایت کی ہے۔ دوسری جماعت اجتہاد کو جائز رکھتی اور اس کے عدم اظہار کو علمی بخل سے تعبیر کرتی۔ اس جماعت میں ابن عباس۔ ابن مسعود اور عکرمہ خاص طور پر معروف ہیں۔ یہ لوگ پوری استعداد اور قابلیت بہم کئے بغیر تفسیر کی کوشش کرنے والے کو برا سمجھتے اور اس طرح اپنے اعتقاد اور رائے کے مطابق آیات کو توڑنے موڑنے کو ناجائز ٹھیراتے۔ اُن کے نزدیک عقیدہ قرآن کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ قران عقیدے کے تابع ہو۔

اسی اجتہاد کا نتیجہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور آیات کے متعلق صحابہ اور تابعین میں اختلاف رونما ہوا۔ ابن جریر طبری کی تفسیر ان اختلافات کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔

۳۔ مذکورہ ماخذوں کے علاوہ تفسیر کا ایک اور ماخذ ہے جس سے مفسرین نے کافی سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ طبعی بات ہے کہ بعض افراد کا رجحان تفصیل کی طرف ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کی آیت سن کر اس کے متعلقات کے متعلق سوالات پیدا کر دیے۔ اصحاب کہف کے کتے کا قصہ سن کر اس کا رنگ دریافت کیا اور جب یہ پڑھا "فقلنا اضربوہ ببعضہا" تو بعض کا مفہوم پوچھنے لگے۔ حضرت نوحؑ کا بیان سنا تو اُن کی کشتی کے قد و قامت و جسامت کے سوالات جڑ دیے۔ حضرت یوسفؑ کی خواب کے سلسلے میں ستاروں کے نام پوچھے۔ الغرض ہر واقعے کی ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اُن کی اس خواہش کی کمی توراۃ اور اس کے حواشی سے پوری ہوتی تھی، اور نیز یہود میں سے بہت سے افراد زمرۂ اسلام میں داخل ہوگئے تھے، اُن کے ذریعے سے اس قسم کی روایتیں بہ کثرت تفسیر قرآن میں جمع ہوگئیں۔

ان سے آیات کی تشریح کی جاتی تھی جلیل القدر صحابہ مثلاً ابن عباس وغیرہ نے ان روایات کے لینے کو ناپسند فرمایا، خود آنحضرت سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ " اہل کتاب کی باتوں کی نہ تو تصدیق کرو اور نہ انھیں جھٹلاؤ " لیکن جمہور اسلام نے اس کے خلاف کیا، انھوں نے یہودی روایات کو سچا سمجھا اور اپنی کتابوں میں نقل کیا۔ اگر اس کی مزید تصدیق درکار ہے تو تفسیر طبری ملاحظہ کیجئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن عباس کعب الاحبار کی صحبت میں بیٹھتے تھے اور اس سے روایات لیتے تھے۔ اس بارے میں ابن خلدون کی رائے قابل توجہ ہے وہ مقدمہ تاریخ میں لکھتا ہے کہ " اہل عرب (قبل از بعثت) علم و ادب سے کورے تھے۔ اور وحشت و جہل کا اُن پر تسلط تھا۔ جب تقاضائے بشریت نے اُن کے دلوں میں ابتدائے آفرینش کے اسرار اور زمین و آسمان اور موجودات کی تخلیق کے اسباب معلوم کرنے کا شوق پیدا کیا تو وہ طبعاً اہل کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ لوگ زیادہ تر یہودی تھے اور باقی نصاری اور یہ یہود عربوں ہی کی طرح بادیہ نشین تھے ان کی علمی حیثیت عامۃ الناس اہل کتاب سے زیادہ نہ تھی اور ان کی اکثریت بنی حمیر پر مشتمل تھی، جب اسلام لائے تو وہ چیزیں جو احکام شرعیہ کے مخالف نہ تھیں ان کے ہاں محفوظ رہیں۔ اور یہ زیادہ تر ابتدائے آفرینش تاریخ اور جنگوں کی روایتیں اور یہودی داستانیں تھیں۔ چنانچہ یہودی ادب کا یہ سرمایہ کعب الاحبار۔ وہب بن منبہ اور عبد اللہ بن سلام وغیرہ کی وساطت سے تفسیر میں داخل ہو گیا۔ چونکہ ان روایتوں کا اسلام کے اصولوں اور احکام دینی سے کچھ تعلق نہ تھا اس لئے مفسرین نے ان کے متعلق تساہل برتا اور کتابوں میں نقل کرتے گئے۔"[1]

دورِ صحابہ صحابہ کرام کی ایک قلیل التعداد جماعت تفسیر بالرائے میں مشہور ہوئی۔ ان میں سے روایت کی کثرت کے اعتبار سے حضرت علیؓ۔ ابن عباس۔ عبد اللہ بن مسعود اور ابی بن کعب اول درجے پر ہیں۔ ان کے بعد زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری اور عبد اللہ بن زبیر آتے ہیں۔

المقدمہ صفحہ ۳۶۷

اس جگہ ہم صرف اول الذکر چار بزرگوں کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف بلادِ اسلامیہ میں تفسیر کی نشو و نما میں ان ہی پر زیادہ انحصار رہا۔ تفسیر میں ان کا تبحر اور مرتبہ کمال نتیجہ تھا۔ ان کی زباندانی، آنحضرت سے طویل صحبت اور معارف اور آداب عرب سے آگاہی کا یہ لوگ قرآن کی تفسیر میں اجتہاد اور رائے کو مکروہ نہ سمجھتے تھے۔ ان میں سے ابن عباس کو آنحضرت کی طویل صحبت نصیب نہ ہوئی لیکن خلفاء راشدین اور معزز صحابہ کی رفاقت اور ہم نشینی نے اس کمی کی تلافی کردی۔ یہ زیادہ تر صحابہ سے روایات بیان کرتے تھے۔ روایت کی کثرت کے اعتبار سے ابن عباسؓ سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اُن کے بعد ابن مسعودؓ، علیؓ اور ابیؓ ہیں۔ یہ ترتیب کثرت روایت کے اعتبار سے ہے نہ کہ صحت کے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ سے اوروں سے کہیں زیادہ موضوع روایتیں منسوب کی گئیں۔ اس کے کئی ایک سبب ہیں۔ اہم ترین سبب یہ ہے کہ یہ ہر دو بزرگ خاندان نبوت میں سے تھے۔ ان کی طرف موضوع روایات کو منسوب کرنے سے اوروں سے زیادہ ساکھ اور اعتماد پیدا ہوجاتا تھا۔ بعض لوگوں نے حضرت علی کے علمی فضل و کمال کو اپنے زعم میں اور بلند کرنے کے لئے آپ سے موضوع روایات منسوب کردیں۔ اسی طرح خلفائے عباسیہ سے تقرب چاہنے والوں نے اُن کے مورث اعلیٰ یعنی ابن عباس سے بکثرت روایتیں بیان کرنی شروع کیں ہم حضرت علی کے تبحر کے متعلق ابن ابی حمزہ کا بیان پیش کئے دیتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو ام القرآن (سورہ فاتحہ) کی تفسیر سے ستر اونٹ لاددوں۔ ابوطفیل سے مروی ہے کہ میں نے حضرت علی کو خطبہ دیتے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ مجھ سے سوال کرو۔ خدا کی قسم کچھ بھی پوچھو۔ میں اُس کا جواب دوں گا۔ کتاب اللہ کے متعلق سوال کرو۔ خدا کی قسم کوئی آیت ایسی نہیں کہ میں نہ جانوں وہ رات میں اتری یا دن میں۔ میدان میں یا پہاڑ میں۔ ان دو روایتوں سے ان لوگوں کے رویے کا اندازہ ہوجائے گا۔

اب ابنؓ عباس کو لیجئے۔ ان سے اس کثرت سے روایتیں مروی ہیں کہ شمار نہیں

قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں جس میں اُن کے ایک یا ایک سے زیادہ اقوال نہ ہوں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اُن سے روایت کرنے والوں کا بھی کوئی حساب نہیں۔ بعد میں ارباب نقد و تحقیق نے روایات کے ان سلسلوں کی چھان بین کی بعض کو انھوں نے معتبر مانا اور دوسروں کو تسلیم نہیں کیا۔ ان میں سے معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کا سلسلہ روایت سب سے معتبر ہے اور امام بخاری نے اس پر اعتماد کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور سلسلے ہیں جو صحت کے درجے سے گرے ہوئے ہیں۔ اُن کو بغرض اختصار حذف کئے دیتے ہیں۔

ابن عبد الحکیم[1] کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کو کہتے سنا کہ تفسیر میں ابن عباس سے سو سے زیادہ روایتیں ثابت نہیں۔ اگر اس قول کو صحیح تسلیم کریں تو پھر ان موضوع روایتوں کی قلعی کھل جاتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ روایات گھڑنے والوں نے کس جرأت سے کام لیا۔ اس قسم کی روایتوں کی مزید تحقیق کے لئے ابن جریر کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ بعض دفعہ ایک آیت کی تفسیر دو طریقوں سے ابن عباس سے مروی ہے۔ اور ہر ایک دوسرے سے متضاد۔ مثال کے طور پر (فخذ اربعۃ من الطیر) لیجئے۔ دو روایتیں ہیں اور دونوں ایک دوسری کی مخالف۔ اور کوئی وجہ تطبیق ممکن نظر نہیں آتی۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ موضوع تفسیر علمی فائدے سے خالی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت صرف تک بندی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اکثر اوقات یہ غور و فکر اور علمی اجتہاد کا نتیجہ ہوا کرتی تھی۔ ہاں حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت بیکار محض ہے۔

گذشتہ بیانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ابن عباسؓ اور دوسرے بزرگوں سے متعلق جو کچھ مروی ہے اُس کے تین ماخذ ہیں۔

۱۔ آنحضرت سے منقول روایتیں اور نیز وہ واقعات جو صحابہ کے سامنے پیش آئے

---

(۱) الاتقان جزو ۲ صفحہ ۲۲۵

اور اُن کے متعلق آیات نازل ہوئیں۔

۲۔ صحابہ کا اجتہاد جو ادب جاہلی، اہل عرب کے عادات اور رسوم اور زبان دانی پر مبنی تھا۔

۳۔ اسرائیلیات یعنی یہود کا ادبی اور تاریخی ذخیرہ۔

دور تابعین | صحابہ کرام کے بعد تابعین کا دور آیا۔ ان میں سے بعض بزرگوں نے اُن صحابہ مفسرین سے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے روایات لیں۔ چنانچہ ابن عباس رضؓ سے سب سے زیادہ مجاہد، عطا بن ابی رباح، عکرمہ مولی ابن عباس اور سعید بن جبیر نے روایت کی ہے۔ یہ چاروں حضرات مکہ میں ان سے مستفید ہوئے، اور نیز چاروں کے چاروں موالی تھے۔ روایت کی کثرت اور قلت کے اعتبار سے ان کے مختلف درجے ہیں۔ اسی طرح انکی ثقاہت کے بھی علما نے مراتب قائم کئے ہیں۔ اول الذکر نے اپنے استاد سے سب سے زیادہ کم روایت کی ہے لیکن اعتماد اور ثقاہت میں سب بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی لئے امام شافعیؒ، امام بخاریؒ اور دوسرے اہل علم نے ان کی تفسیر کو معتبر تسلیم کیا ہے۔ البتہ بعض علما نے پھر بھی ان سے اعراض برتا ہے۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ "اعمش سے پوچھا گیا کہ مجاہد کی تفسیر سے کیوں پہلوتہی کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اہل کتاب سے پوچھا کرتے تھے"۔ لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے کسی نے بھی مجاہد کے عدم ثقہ ہونے پر طعن نہیں کیا، یہی حال عطاؒ اور سعیدؒ کا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کا بھی پایہ روایت معتبر اور مسلم ہے۔ البتہ عکرمہؒ کے متعلق علما میں اختلاف ہے بعض ان کو ثقہ مانتے ہیں اور بعض نے ان کی روایتیں قبول نہیں کیں۔ امام بخاری ان کے ثقہ ہونے کے قائل تھے اور ان سے روایت بھی کی ہے۔ یہ ابن عباسؓ کے مولی تھے اور اصلی وطن مغرب یعنی بلاد مراکش تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انھیں علم میں بڑی جرأت ہے اور اُن کا خیال ہے کہ وہ قرآن کی ہر چیز سے واقف ہیں۔ سعید بن المسیب سے ایک شخص نے ایک آیت کے معنی دریافت کئے آپ نے کہا کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ جاؤ اُس سے پوچھو جس کو زعم ہے کہ قرآن کی کوئی چیز

اُس سے مخفی نہیں۔ یعنی عکرمہ۔[1]

عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں سے عراق میں مسروق بن اجداع مشہور ہوئے یہ عربی النسل تھے اور بڑے پرہیزگار، خداپرست اور ثقہ تھے۔ کوفہ میں سکونت تھی۔ مشکل اور عمیق مسائل میں قاضی شریح ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بصرہ میں قتادہ ابن دعامہ مشہور تھے۔ یہ نابینا تھے، عربی، تاریخ جاہلیت اور عربوں کے عادات و رسومات میں کمال مہارت کیوجہ سے تفسیر میں ان کو بڑی مدد ملی۔ ان کا ثقہ ہونا مسلم ہے۔ البتہ قضا، و قدر کے مسائل میں زیادہ الجھنے کی وجہ سے بعض علمار نے ان کی روایتوں سے اعراض برتا۔

اسرائیلیات | اس عہد یعنی عہد تابعین میں اسرائیلیات اور نصرانیات سے تفسیر کی ضخامت بہت بڑھ گئی اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ یہود و نصاری بکثرت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور دوسرے ان ہردو قوموں کے متعلق قرآن میں جو واقعات بیان کئے گئے تھے اُن کی مزید تفصیل معلوم کرنے کا شوق عام ہوگیا۔ اس صنف روایت کا بطل (ہیرو) وہب بن منبہ ہے۔ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ یہودیمن میں سے تھا۔ بعد میں اسلام لایا۔ یہودی روایات اور قصوں کو جانچے پرکھے بغیر نقل کردیتا تھا اور اُن کو علمی سانچے میں ڈھالنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ مسلمانوں نے اس کی روایات نقل کرنے میں ضروری احتیاط نہ برتی اور بقول ابن خلدون، چونکہ ان اسرائیلیات کو احکام دین اور اصول اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے مفسرین نے ان روایات کو نقل کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا مثال کے طور پر طبری لیجئے، آپ نے ابن جریج سے بہت سی روایتیں لی ہیں۔ اور پھر اس کے متعلق علمائے اسلام کے بیانات ملاحظہ فرمائیے۔ امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں اس کو رومی النسل بتاتے ہیں اور اسلام لانے سے قبل وہ نصرانی تھا۔ علمار کے بیان کے بموجب وہ موضوع حدیثیں گھڑتا تھا اور تقریباً نوے عورتوں سے بطریق متعہ نکاح کیا اور کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اسلام میں اس نے کتاب تالیف کی[2] تقریباً ۸۰ ہجری میں پیدا ہوا اور ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) تفسیر ابن جریر جزو اول (۲) ابن خلکان

صحابہ اور تابعین کے بعد علما رنے فن تفسیر میں کتابیں تالیف کرنی شروع کیں۔ ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ رائج تھا اور وہ یہ کہ آیت کے بعد اس کے متعلق صحابہ اور تابعین کے اقوال سند کے ساتھ نقل کر دیتے۔ ان میں سے سفیان بن عینیہ۔ وکیع بن الجراح اور عبد الرزاق وغیرہ مشہور ہوئے لیکن ان کی تالیفات ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ البتہ ان کے بعد آنے والے طبقے میں سے ابن جریر طبری سب سے زیادہ معروف ہیں۔

تفسیر کی تاریخی حیثیت | واقعہ یہ ہے کہ ہر عہد کی تفسیر اس عہد کی علمی سرگرمیوں سے متاثر ہوتی رہی اور (ابن عباس سے لے کر شیخ عبدہٗ تک) ہر عہد کے افکار و آرار، علمی نظریوں اور مذہبی خیالات کا پرتو اس میں نمایاں ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی عہد کی لکھی ہوئی تمام تفاسیر کو سامنے رکھیں تو اس عہد کی علمی سرگرمیوں، اور خیالات اور آرار کی رَو کا پتہ چل جاتا ہے۔

صحابہ اور تابعین اولین کے ہاں تفسیر کرتے وقت الفاظ کی تشریح پر اکتفا کیا جاتا تھا اور اس لغوی تشریح میں بھی اختصار مدنظر رکھا جاتا۔ مثلاً (غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ) غیر متعرض لمعصیۃ۔ اور اگر کہیں رسوم جاہلیت کا ذکر ہوتا تو اس کا بیان کر دیتے۔ اور اگر زیادہ دور گئے تو شان نزول بیان کر دی ان کے بعد آنے والوں نے اسرائیلیات اور نصرانیات کی بھرمار کرنی شروع کر دی۔ اس عہد کی تفسیروں میں تو نہ کہیں فقہی مسائل کے استنباط کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ کسی خاص مذہبی نقطۂ نظر کی مدافعت مقصود رکھی گئی۔ اس کے بعد قضار و قدر کی ہوا چلی، چنانچہ اس عہد کی تفاسیر ان خیالات سے پر ہیں، اور ہر ایک مفسر تفسیر کرتے وقت جبر و اختیار کی بحثیں ضرور چھیڑتا ہے۔ پھر فقہی سرگرمیوں کا زمانہ آیا اور علمار تفسیر نے آیات سے مسائل استنباط کرنا شروع کئے۔ اس کے بعد علم نحو اور علم معانی و بیان نے زور پکڑا اور آخر میں علم اخلاق نے اس کی جگہ لی۔

مصر کا مشہور ترین ادیب

جرجی زیدان

الہلال (مصر) کی بیس سالہ مدت حیات میں جرجی زیدان نے انشاپردازی کی ہر صنف میں خامہ فرسائی کی ہے۔ یعنی ادبی و سیاسی، تاریخی و معاشی مقالات سپرد قلم کئے ہیں جن کو اس کی وفات کے بعد ایک مجموعہ کی صورت میں طبع کرا دیا گیا ہے۔ ابتدا میں جرجی زیدان کی مختصر تاریخ حیات بھی زینت مجموعہ ہے جس کا اکثر حصہ صاحب مجموعہ کے روزنامچہ سے لیا گیا ہے۔

میں قارئین جامعہ کے سامنے اس کا ترجمہ صرف اس مقصد سے پیش کر رہا ہوں کہ علم کو شغف رکھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ علم کو ظاہری ثروت و وجاہت سے عام طور پر کس قدر بعد رہا ہے لیکن صدہا تکالیف و مصائب کے باوجود علمی کاوشیں برابر جاری رہیں۔ ظاہری موانعات جسم سے گزر کر قلب پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ یہ کشمکش عبرت ہے اُن لوگوں کے لئے جو علمی ذوق رکھنے کے باوجود کشمکش حیات سے خائف ہو کر اپنے مقصد عزیز سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

جرجی زیدان کی زندگی بھی مجموعہ ہے عجیب و غریب حالات کا کہ اس بیچارے نے نکبت و افلاس اور ہر قسم کے موانعات کے باوجود علم و ادب کی کس قدر عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔

خاندانی حالات | جرجی زیدان نے اپنے روزنامچہ میں اپنے خاندانی حالات کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے جس قدر کہ اپنے باپ سے سنا۔ اس کے باپ نے ان حالات کو اس طور پر بیان کیا، کہ

"میرے باپ کا نام زیدان مطر یا زیدان یوسف مطر تھا۔ امیر مصطفیٰ ارسلان کی والدہ کے پاس بطور خدمتگار کے رہتا تھا۔ امیر کی والدہ جبوس گزشتہ صدی کے اوائل میں عین عنوب (مصر کے قریب ایک جگہ) اور اس کے ملحقات پر وکیل کی حیثیت سے حکومت کرتی تھی۔

جس وقت ابراہیم پاشا نے سوریا پر حملہ کیا اور عکہ کو فتح کر لیا تو اس کا ارادہ ہوا کہ پہاڑی علاقوں پر بھی دھاوا بولا جائے۔ جبوس منجملہ ان لوگوں کے تھی جو ابراہیم پاشا کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اس نے زیدان سے ہمراہ چلنے کی خواہش کی مگر اس نے انکار کیا۔ اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ آخر کار ابراہیم کو فتح حاصل ہوگی پھر اپنے اہل وعیال کو بے یار ومددگار کس طرح چھوڑ سکتا تھا اور بھگدڑ میں ساتھ لیجانا بھی مشکل تھا۔ جبوس نے حد سے زیادہ مجبور کیا، مگر وہ اپنی انھیں مجبوریوں کی بنا پر ساتھ نہ دے سکا۔ وہ اپنے دل میں اس کی طرف سے کسی قدر خلش لئے ہوئے روانہ ہوگئی۔

۱۸۳۲ء میں ابراہیم پاشا نے امیر بشیر کی امداد سے علاقہ (جبل) پر قبضہ کیا۔ جبوس اس وقت تک روپوش رہی، جبتک کہ ابراہیم پاشا کی حکومت پر زوال نہ آیا۔ عین عنوب پہنچتے ہی اس نے زیدان سے اپنے سابقہ بغض کا بدلا اس طور پر لیا کہ اس کی ساری جائداد ضبط کر لی۔ اس کو طرح طرح سے ذلیل کیا۔ یہ بدسلوکی زیدان کے لئے بڑی مصیبت تھی جس نے اس کی صحت پر نمایاں اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ اس غم نے اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

زیدان نے اپنے پیچھے ایک بیوی، دو لڑکیاں اور دو لڑکے چھوڑے جن میں سب سے بڑا یہی (جرجی زیدان کا باپ) تھا۔ اس کی عمر اس وقت دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ گویا تمام خانگی ذمہ داریوں کا بار اسی کے سر پر تھا۔

چونکہ اب اس کی ماں عین عنوب میں کسی طرح نہ رہ سکتی تھی۔ اس لئے بچوں سمیت بیروت چلی گئی۔ گو کہ گھر کے تمام لوگوں کی توقعات اس کے ساتھ وابستہ تھیں مگر بیروت کی یہ حالت تھی کہ آبادی بہت معمولی۔ روزگار بالکل ندارد۔ صرف چند کام تھے۔ تجارت اور حکومت

فوجی اور دیوانی ملازمتیں۔

اس کے خاندان کے مورث اعلیٰ کی صحیح تاریخ غیر محفوظ ہے۔ اس کی وجہ خود جرجی زیدان نے یہ بیان کی ہے کہ "میرے باپ نے اپنے آبائی گھر کو بہت ہی کشمکش کی حالت میں چھوڑا۔ نیز یہ کہ اس میں اس وقت اتنی سمجھ نہیں تھی اور بیروت میں بھی اس نے ایک ان پڑھ غریب کی طرح تربیت پائی۔ اسی کے ساتھ گھر کی فکریں۔ خاندان کے متعلق تحقیق ہوتی تو کہاں سے"

"جب میں جوان ہوا اور مجھے اپنے خاندان کے متعلق تفتیش کا خیال پیدا ہوا تو میں نے عین عنوب کے ایک شخص کو جو خاندان مطر اور اس کی اصلیت سے واقف تھا دریافت حال کے لئے لکھا تو وہاں سے ایک شخص کی زبانی مجھ تک یہ جواب پہنچا کہ آل مطر کے چند افراد یہاں غربت و پریشانی کے عالم میں آئے۔ ان کی اصلیت کا کچھ پتہ نہیں۔ البتہ ان میں سے ایک شخص نے جس کا نام زیدان تھا۔ حبوس کے خدام میں داخل ہونے کے لئے پیش قدمی کی۔"

"ایک دوسرے شخص نے بھی مجھے بتایا کہ تمھارا خاندان چند پشتوں سے عین عنوب میں آکر رہا تھا غرضیکہ میرے خاندانی حالات کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کا اصلی وطن حوران ہے لیکن جس طرح کہ فرقہ ارثوذکسیہ کے خاندانوں میں سے کسی نے فقر و فاقہ سے تنگ آکر شوف میں سکونت اختیار کی۔ کسی نے جنوبی لبنان روم میں، اسی طرح ہمارے بڑوں نے عین عنوب میں"

جرجی زیدان کی پیدائش و تربیت | ۱۴ دسمبر ۱۸۶۱ء کو بیروت میں پیدا۔ ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں پائی۔ ناساعد حالات کی وجہ سے بچپن ہی میں اسکول کو خیرباد کہنا پڑا۔ باپ کے ساتھ وہ بھی محنت و مزدوری کرنے لگا۔ حالانکہ ابھی اس کی عمر پورے بارہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی مگر چونکہ علم و ادب کی طرف اس کا طبعی میلان تھا، اس لئے جب کبھی ایسا موقع ملتا کہ کوئی کتاب ہاتھ لگ جاتی یا کسی اہل علم سے ملاقات ہوجاتی تو اس سے ضرور فائدہ اٹھاتا۔ اسے فوٹوگرافی اور مصوری سے بھی دلچسپی تھی، اسی لئے اس کی پڑھی ہوئی تمام کتابوں میں کوئی نہ کوئی تصویر

بٹی ہوئی ملتی ہے۔ غرضکہ فرصت کے اوقات کو اسی قسم کے کاموں پر صرف کرتا تھا تاکہ عمر بے کار نہ ضائع ہو۔

مدرسہ شبینہ میں اس نے انگریزی زبان صرف پانچ ماہ میں حاصل کی، حالانکہ دن بھر اور شب کے ابتدائی حصہ میں بھی پیٹ کے دھندے میں لگا رہتا تھا۔ اس کی تعلیم اکثر رات کے آخری حصوں ہی میں ہوئی۔ تھکنے کے نام سے واقف نہ تھا، کام سے بالکل نہ گھبراتا بلکہ بعض وقت مسلسل چوبیس گھنٹے کام ہی کرتا رہتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ایک ادبی جماعت کا جس کا نام شمس البر تھا رکن ہوگیا۔ اس جماعت کے اکثر ارکان امریکن کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ یہ شمولیت اس کے رجحانات کی ترقی کا باعث ہوئی، ارکان جماعت اس کی صحبت سے خوش تھے، اس کی گفتگو سے دلچسپی لیتے تھے۔ اسی لئے اکثر کالج کے جلسوں میں بھی مدعو کرتے تھے تاکہ دلچسپ تقریروں اور مباحث سے لطف اندوز ہوں، لیکن جب کبھی وہ جلسے میں آیا تو تقریروں کو سن کر غمگین واپس ہوا۔ اعلیٰ تعلیم سے محرومی کے باعث غیرت و شرم کا ایک دریا اس کے سینے میں موجزن ہوتا تھا۔

۱۸۰۱ء میں اس نے یہ بالکل طے کر لیا کہ سب کام چھوڑ کر طلب علم میں مصروف ہوجائے اسے معلوم ہوا کہ طب بہترین علم ہے، کیونکہ اس سے انسان میں علمیت بھی پیدا ہوجاتی ہے اور کسب معاش کا ایک ذریعہ بھی ہاتھ آجاتا ہے۔ اپنے بعض احباب سے مشورہ کیا۔ انھوں نے اس دشوار گزار راستے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس لئے کہ اس میں بڑا وقت صرف ہوتا تھا۔ کم سے کم دو سال سائنس پر صرف کرنا پڑتے، اس کے بعد چار سال طب پر۔ لیکن یہ بات اس کے ارادے کو پست نہ کر سکی۔ اس نے سائنس اپنے ایک دوست سے تقریباً ڈھائی مہینے میں پڑھ ڈالی۔ چونکہ اسکول کھلنے کا وقت آچکا تھا۔ امتحان داخلے میں بیٹھا اور پاس ہوگیا، پہلے ہی سال سے انتہائی محنت و کوشش تعلیم پر صرف کی سالانہ امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کئے اگرچہ اب بھی فکر معاش سے اسے چھٹکارا نہیں تھا، کچھ نہ کچھ کام اپنے اخراجات کے لئے کرنا

ہی پڑتا تھا۔غرض کہ اس کی اس امتیازی کامیابی پر اس کے تمام ساتھی اس سے کسی قسم کا کینہ رکھنے کی بجائے بے انتہا خوش تھے۔ اس کو کوشش اور ذہانت کے معاملے میں مثال کے طور پر پیش کرتے تھے۔صرف اس لئے کہ وہ لوگ اس کی خوش اخلاقی۔ نرم مزاجی اور اس کے اخلاص سے متأثر تھے۔

دوسرے سال پھر مدرسے میں آیا۔ ابھی تعلیم کو شروع ہوئے دوماہ بھی نہ گذرے تھے کہ جامعہ کے اندرونی معاملات کی وجہ سے ایک زبردست شورش برپا ہوئی جس کے نتیجے میں اچھے اچھے طلبہ کو نکلنا پڑا۔ جرجی زیدان بھی انھیں نکلنے والوں میں تھا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اطبا رشام کی ایک مشہور جماعت کے پاس علوم صیدلیہ (جڑی بوٹی) کو عملی طور پر حاصل کرنے کے لئے پہنچا۔ ان اطبا میں کولونیل مراد بک، حکیم باشی العسکر، ڈاکٹر فانڈیک وغیرہ تھے یہاں رہ کر مندرجہ ذیل علوم میں سند حاصل کی۔

لاطینی زبان، طبعیات، تشریح حیوانات، نباتات، طبقات الارض، کیمیا عضوی و معدنی تحلیل کیمیائی، مواد طبی، اور قرابادین علمی وعملی۔

سفر مصر۔شام۔انگلینڈ | اس کے بعد حوادثات عربیہ کے ختم ہونے پر مصر مدرسہ قصر عینی میں تکملۂ طب کے لئے روانہ ہو گیا لیکن چونکہ طب کی سند حاصل کرنے کے لئے ایک مدت درکار تھی اس لئے اپنی توجہ کو اس نے دوسرے علموں پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں جریدۂ "الزمان" کی ادارت اس کے سپرد ہوئی۔ قاہرہ میں اس وقت یہی ایک روزنامہ تھا۔ ایک سال یا اس سے کچھ ہی زیادہ زمانہ ادارت کو گزرا تھا کہ غردون پاشا کی رہائی کے لئے سوڈان پر حملہ کیا گیا تو یہ بھی الزمان کی ادارت کو چھوڑ کر جنگی وقائع نگار کی حیثیت سے ساتھ ہو لیا۔صرف اس لئے کہ اس ملک کے حالات کا علم حاصل کر سکے۔ تقریباً دس ماہ سوڈان میں گزارے۔ اس اثنا میں بڑے بڑے ہولناک واقعات اس کی نظروں کے سامنے گزر گئے۔ اس سفر میں جو کچھ تکلیف اسے اٹھانا پڑی اس کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنی آنکھوں سے موقع جنگ کو دیکھا کہ توپیں اور بندوقیں ادھر ادھر طرح

رہی ہیں، سیکڑوں اور ہزاروں بے حس وحرکت دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ دس ماہ بعد لشکر کے ساتھ وہ بھی واپس ہوا۔ حسن خدمت کے صلے میں اسے تمغے دیے گئے۔

اس کا شوق علم مرور ایام کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ میدان جنگ سے واپسی پر بہت دنوں مصر میں قیام نہ کیا۔ بلکہ ۱۸۸۵ء میں بیروت پہنچا۔ یہاں آئے ہوئے اسے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ مجلس علوم مشرقیہ نے اسے اس لئے مدعو کیا کہ وہ اس کی مجلس عاملہ کا رکن بن جائے۔ بیروت میں تقریبًا دس ماہ اس کا قیام رہا۔ اس قلیل مدت میں وہ مشرقی لغات کا مطالعہ کرتا رہا۔ عبرانی سُریانی اور بہت سی زبانیں سیکھ لیں۔ اس کے بعد ہی اپنی کتاب الفاظ العربیہ و الفلسفۃ اللغویہ تصنیف کی۔

اسی زمانے میں اس کے ایک دوست نے "البطلین" کے نام سے ایک ناول لکھا جس میں ایک بطل جرجی زیدان کو اور دوسرا جنرل غردون پاشا کو قرار دیا۔ واقعات کے سلسلے میں مؤلف روایت نے آداب زندگی کی حفاظت اور کوشش کے نتائج کو سراہا تھا جو پورے طور پر جرجی زیدان میں پائے جاتے تھے۔

۱۸۸۶ء میں موسم گرما میں لندن پہنچا۔ زمانۂ قیام میں علمی مجلسوں اور آثار قدیمہ کی سیر میں مصروف رہا۔ برٹش میوزیم کی تو اس نے خاص طور پر سیر کی۔ جاڑوں میں مصر لوٹ آیا۔ یہاں پہنچتے ہی رسالہ "المقتطف" کے سارے کاموں کی ذمہ داری اس کے سر ڈال دی گئی ۱۸۸۸ء تک تو یہاں کام کرتا رہا۔ اس کے بعد علٰحدگی اختیار کرکے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گیا۔ اسی زمانے میں "تاریخ مصر الحدیث" دو ضخیم جلدوں میں لکھی۔ اس کی ترتیب میں اسے بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۸۹ء میں فرقہ فریمیشن کے متعلق سب سے پہلی تصنیف اسی نے کی۔ عربی میں اپنے رنگ کی یہ پہلی کتاب تھی۔ اس کے بعد ممالک ایشیا اور قدیم وجدید افریقہ کی مختصر تاریخ مرتب کی۔

۱۸۸۹ء کے آخر میں منتظمین مدرسہ جدیدیہ نے اس کو فرقہ ارثوذکس کی ایک رومی جماعت

کی خاطر اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تاکہ عربی کا درس دے۔ دو سال تک اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔ اس زمانے میں اس نے "الملوک الشارد" مشہور ناول لکھا یہ اس کا سب سے پہلا ناول ہے۔ اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کئی ایڈیشن اس کے شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں اس نے آہستہ آہستہ کچھ پریس کا سامان مہیا کر لیا۔ لہٰذا تدریس سے علیٰحدگی اختیار کر کے تحریری کاموں میں مصروفیت پیدا کر لی ۱۸۹۲ء کے آخر میں "الہلال" نکالا۔ ابتدا میں تمام کاموں کو مثلاً مقالۂ افتتاحیہ مضامین۔ مراسلت اور دوسری اخبار سے متعلق چیزوں کو خود ہی انجام دیتا تھا۔ اگرچہ کام کئی آدمیوں کا تھا۔ لیکن وہ بلاکسی کسل و کبیدگی کے مسلسل کام کئے جاتا تھا، صرف اس لئے کہ دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرے۔ جب "الہلال" کی اشاعت قابل اطمینان ہوگئی تو ادارت کی ذمہ داریاں اپنے بھائی کے سپرد کر دیں۔ دوسرے کاموں کے لئے دو اور ملازم رکھ لئے اور خود ہمہ تن تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گیا۔ الہلال کے اجرا کے بعد اس نے متعدد تصانیف کیں جن کا بیان آگے آتا ہے۔

موسم گرما کی تعطیلات کے زمانے میں اس نے متعدد سفر کئے ہیں، جن میں سے اہم صرف تین سفر ہیں۔ ایک آستانے کا جب کہ وہاں دستوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ دوسرا یورپ کا ۱۹۱۲ء میں تیسرا فلسطین کا ۱۹۱۳ء میں۔

۳۱ اگست ۱۹۱۴ء کو سہ شنبہ کے دن ناگہانی طور پر اسے موت آگئی حالانکہ اسے نہ کسی قسم کی شکایت تھی نہ کسی مرض میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ اس قدر ضرور ہوا کہ کسی وجہ سے وہ بہت زور سے چیخا۔ جس سے اس کے گھر والے گھبرا گئے۔ پھر آن کی آن میں اس کی روح دار فنا کو چھوڑ کر دار بقا کو سدھار گئی۔ زندگی کی آخری ساعت تک بالکل صحیح و سالم رہا۔ مستعدی کے ساتھ اپنے کاموں کو کرتا رہا۔

جرجی زیدان اور اس کے اخلاقیات | چوڑا چکلا ابھرا ہوا بدن، گندمی رنگ، چمکدار آنکھیں جو اس کی صحت اور بشاشت کا اظہار کریں۔ اپنے تمام کاموں میں ثابت قدم، فراخ دل۔ شیریں کلام۔

اپنے سے کم مرتبہ شخص سے گفتگو میں عار نہ کرنے والا۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی ملنے والا، اس کا امتیازی وصف پاس ضمیر و خود داری تھا۔ مطران نے اس کے متعلق بہت ہی دلچسپ جملہ کہا ہے کہ

"میں نے کسی شخص کو سوائے جرجی زیدان کے اجتماع ضدین کا مصداق نہیں دیکھا یعنی کبر اور فروتنی۔"

ہر کام میں تساہل کا خوگر تھا۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کو تو خیال میں بھی نہ لاتا تھا۔ اپنی مخالفتوں کی طرف کبھی توجہ ہی نہ کرتا تھا۔ بعض وقت اس کی تصنیفات پر سخت سے سخت تنقیدیں کی گئیں لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور اگر کبھی دیا بھی تو بہت اختصار کے ساتھ جس سے نفس مسئلہ کی تصحیح مقصود ہوتی۔ الہلال کی بیسویں جلد کے صفحہ ۵۶۲ پر ایک سائل کے جواب میں جس نے لکھا تھا کہ بعض رسائل میں آپ کی تصنیفات پر تنقید کا باعث کیا ہے، لکھا تھا۔

"بغض و تشنیع کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، کیونکہ جس کام کے لئے میں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے، استقلال کے ساتھ اس کو انجام دئے جاؤں گا جس وقت سے میں عملی طور پر دنیا میں داخل ہوا ہوں یہی چیز میرے اطمینان قلب کا باعث ہے۔ مجھے عوام کی خدمت کا سودا ہے میرے دل میں اپنے زمانے کے ادبا اور علماء کی رضاجوئی کے جذبات ہیں۔ خدا کا فضل ہے کہ یہ چیز مجھے حاصل ہے۔"

اسی طرح الہلال کی انیسویں جلد کے صفحہ ۱۱۷ پر "نحن والجامعة المصرية" کے عنوان سے اس خاص ہنگامے کے متعلق تصریحات کی ہیں، جو اس کے جامعہ مصریہ میں استاذ تاریخ اسلام مقرر کرنے پر برپا ہوا تھا۔ اور پھر اسے اس منصب سے علٰحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اس موقع پر اس نے بہت اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر لکھا کہ کس طرح منتظمین جامعہ نے مجھے بلایا اور میں نے کس غرض سے بخوشی اس خدمت کو قبول کیا تھا۔

اغراض سے بالاتر ہو کر بہت خلوص کے ساتھ کاموں کو انجام دیتا تھا۔ اسے ہر وقت حقیقت کی جستجو رہتی تھی اس کا مشہور مقولہ ہے "لا یصح الا الصحیح ولا یبقی الا الانسب" درست ہی صحیح ثابت ہوتا ہے

اور بقا انسب ہی کو ملتی ہے) اخلاص اس کے ہر عمل اور ہر لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

عربی۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ سریانی اور عبرانی زبانیں پورے طور پر جانتا تھا۔ ان کے علاوہ مشرق و غیر مشرق کی بہت سی زبانوں میں اسے شدبد تھی۔ جو کچھ اس نے حاصل کیا اپنی ذاتی کوشش اور راسخ عزم کی وجہ سے۔ اس کی عادت تھی کہ جب کسی علم یا زبان کے حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی تو پھر وہ اسے ہی حاصل کر کے چھوڑتا۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے اسے خیال پیدا ہوا کہ جرمنوں نے آثار و آداب عرب کے متعلق کیا لکھا ہے یہ معلوم کرنے کے لئے اپنے طور پر اس نے جرمنی زبان پڑھنا شروع کر دی اور چند مہینوں میں اُسے یہ زبان اچھی خاصی آگئی۔

مستشرقین یورپ اسے بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بعضوں سے تو وہ مل بھی چکا تھا لیکن خط و کتابت تو تقریباً سب ہی سے تھی۔ مشرق میں بھی اس کی کافی وقعت تھی ہزاروں کی تعداد میں اس کے معتقد ہیں۔ عربی زبان کے جاننے والے عام طور پر اس کی تحریروں کے مشتاق رہا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ "الہلال" اور اس کے ناولوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اُن مواقع سے ہمیشہ کتراتا جن میں اس کی مدح و ستائش کی صورتیں ہوتیں۔ ۱۹۱۳ء میں جب اس نے فلسطین کا سفر کیا تو جہاں جہاں جاتا لوگوں کی خواہش ہوتی کہ اس کی آمد پر جلسہ کیا جائے مگر وہ منظور نہ کرتا۔ البتہ قدس اور نابلس کے لوگوں نے بغیر اس کی اطلاع کے تمام سامان کر لیا اور پھر مجبوراً اسے بھی شریک جلسہ ہونا پڑا۔

بہت سی علمی جماعتوں کا رکن تھا جن میں سے قابل ذکر اٹلی۔ انگلینڈ اور فرانس کی علمی مجلسیں ہیں۔ جنگ سوڈان کے سلسلہ میں جو امتیازی نشانات اسے ملے تھے ان کے علاوہ اور بھی اعزازی تمغے اس کے پاس تھے۔ مثلاً انگریزی تمغہ۔ مصری ستارہ، واقعہ ابی طلیح کے سلسلے میں ایک نفیس چھڑی۔ عربی ادب میں اس کو ایک زبردست ماہر تسلیم کر کے مصری حکومت نے اسے بڑا اعزاز دے رکھا تھا۔ شام کے امریکن کالج نے وفات سے چند دنوں پہلے ایک علمی ڈگری بھی اسے اعزازی طور پر دی تھی۔

اس کی خصوصیات | ایک مرتبہ ایک مستشرق اس سے ملنے آیا۔ جب اسے دیکھا تو دریافت کیا کیا
آپ ہی جرجی زیدان ہیں ؟ اس نے کہا "ہاں" تو اس مستشرق نے کہا کہ آپ کی گوشت و پوست
سے بنی ہوئی شکل آپ کی حقیقی شخصیت سے کس قدر مختلف ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ میں ایک ایسے
شخص سے ملوں گا جو عمر کی انتہائی حد کو پہنچ چکا ہوگا کیونکہ آپ کی تصانیف کو دیکھ کر میں نے آپ کی
عمر کا اندازہ تقریباً اسی سال کیا تھا۔ حقیقتہً یہ اس کی علمی کاوشوں کی ایک پیرائے میں تعریف
تھی۔

الہلال | الہلال اس کے مخفی جذبات کے اظہار کی ایک مشین تھی۔ لیکن ابھی پورے بائیس سال
نہ ہوئے تھے کہ صاحب الہلال چل بسا۔ اطراف عالم میں جہاں بھی عربی پڑھنے والوں کا وجود
تھا وہاں الہلال بھی ضرور پہنچتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں مضامین ہر طبقے کے مذاق کے
مطابق ہوتے تھے۔ حتی الامکان عبارت آسان ہوتی تھی، کوشش کی جاتی تھی کہ اس طور
پر اخبار کو مرتب کیا جائے کہ تفہیم و تفہم میں دقت نہ ہو۔

تصنیفات | مشرق و مغرب میں عام طور پر لوگ اسے ایک زبردست مورخ اور عربی کے ایک
ماہر کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، گو اس نے ان دو کے علاوہ اور بہت سے عنوانوں پر
معرکۃ الآرا مقالات چھوڑے ہیں۔ غرض کہ محدود مواقع کے لحاظ سے اس نے بہت اہم
تصنیفات کی ہیں جن کی عربی زبان کو سخت ضرورت تھی، تاریخ اور لغت میں اس کی مشہور
تصانیف درج ذیل ہیں۔

شمار	نام	کیفیت	اجزا	تعداد طبع
(۱)	تاریخ مصر الحدیث	(جدید مصر کے متعلق)	۲	۲
(۲)	تاریخ التمدن الاسلامی	(تمدن اسلام)	۵	۲
(۳)	تاریخ العرب قبل الاسلام	(عرب قبل اسلام کے حالات)		
(۴)	تراجم مشاہیر الشرق	(انیسویں صدی کے مشہور مشرقی)		۲

(۵) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ (عربی زبان کے جزئیات)
(۶) الفلسفۃ اللغویہ والالفاظ العربیہ (فلسفہ لغت)
(۷) تاریخ الماسونیۃ العام (فرقہ فریمیشن کے متعلق)
(۸) تاریخ اللغۃ العربی (عربی زبان کی تاریخ)
(۹) انساب العرب القدمار (عرب قدیم کا نسب نامہ)
(۱۰) علم الفراستہ الحدیث
(۱۱) طبقات الامم (قوموں کے حالات)
(۱۲) عجائب الخلق

تاریخ التمدن الاسلامی کا ترجمہ پانچ زبانوں میں ہوچکا ہے۔ اردو۔ ترکی۔ انگریزی۔ فرانسیسی اور فارسی۔ الفلسفۃ اللغویہ کا ترجمہ ترکی میں ہوچکا ہے۔

ناول | اس کی خواہش تھی کہ عوام کے دلوں میں تاریخ اور شرقیت کے جذبات کسی طرح پیدا کئے جائیں۔ آخر اس کی سمجھ میں یہ صورت آئی کہ تاریخی واقعات کو مسخ کئے بغیر ناول کی شکل دیدی جائے۔ اس طریقے میں اسے بڑی کامیابی ہوئی یہ ناول کئی کئی مرتبہ چھپے بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ان کے تراجم ہوئے۔

اس نے تاریخی ناولوں کا ایک سلسلہ لکھا ہے جو ظہور اسلام سے شروع ہوتا ہے۔ ہر حصہ میں ایک تاریخی دور کو لیا ہے۔ پھر اس زمانے کے آدمیوں، انکے خصائل اور حالات کو بیان کیا ہے۔ حتی الامکان اصلیت (یہ غالبًا محض دعویٰ ہے) کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں نے بھی تاریخی ناولوں کا سلسلہ لکھا ہے۔ لیکن دونوں میں کافی فرق ہے۔ جرجی زیدان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ بخلاف دوسروں کے وہ تاریخی واقعات کو ناول کی دلچسپی کے لئے درج کرتے تھے۔

تاریخ اسلام کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اٹھارہ ناول اس کے قلم سے نکلے ہیں۔

۱۔ فتاۃ غسان	۲ جز	تین مرتبہ چھپا	۱۰۔ ارمانوستہ المصریہ		تین مرتبہ
۲۔ غادہ کربلا		"	۱۱۔ عذرا قریش		"
۳۔ الحجاج بن یوسف		دو مرتبہ چھپا	۱۲۔ فتح الاندلس		دو مرتبہ
۴۔ شارل وعبدالرحمٰن		"	۱۳۔ ابومسلم الخراسانی		"
۵۔ رمضان		"	۱۴۔ العباسہ اخت الرشید		"
۶۔ الامین والمامون		"	۱۵۔ عروس فرغانہ		"
۷۔ احمد بن طولون		"	۱۶۔ عبدالرحمٰن الناصر		"
۸۔ فتاۃ القیروان			۱۷۔ صلاح الدین ومکائد الحشاشین		
۹۔ شجرۃ الدر			۱۸۔ الانقلاب العثمانی		

ان ناولوں کا مشرق کی بعض مشہور زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور یورپین زبانوں میں بھی۔ جن جن زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں ان کی اجمالی فہرست یہ ہے۔ اردو۔ فارسی۔ دردیگی آذربائیجانی۔ ترکی۔ فرنچ۔ انگریزی۔ روسی اور پرتگیزی۔

چین کا موجودہ نظام تعلیم

قومی تعلیم کے ماتحت چین کے محکمہ تعلیم میں متعدد تبدیلیاں ہوئیں جس وقت قومی حکومت کا پایۂ تخت شہر کنٹن میں تھا تو تعلیمی انتظامات کے لئے ایک کمیٹی یکم مارچ ۱۹۳۱ء میں مرتب ہوئی۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب کہ قومی حکومت کا مرکز نانکینگ میں منتقل ہوا تو ڈاکٹر تسائی یوان پیائی کی زیر اہتمام، ایک داہیو یوان (محکمہ تعلیم اور تحقیقات) قائم کیا گیا، اس داہیو یوان نے یکم جولائی ۱۹۲۷ء سے کمیٹی مذکور کی جگہ لے لی۔ پھر جب حکومت نانکینگ کی مجلس عاملہ نے تعمیری قانون پاس کرا کے اعلان کیا، تو داہیو یوان نے ۸ر دسمبر ۱۹۲۸ء میں موجودہ محکمہ تعلیم کی شکل اختیار کی، تحقیقی کام کے لئے ایک علیحدہ ادارہ جو کہ نیشنل سنٹرل اکاڈمی کے نام سے موسوم ہے، قائم کیا گیا ہے۔

محکمہ تعلیم کے مختلف شعبے حسب ذیل ہیں:

(۱) شعبۂ تعلیم اعلیٰ (۲) شعبہ تعلیم ابتدائی و ثانوی (۳) شعبہ تعلیم معاشرتی (۴) شعبہ تعلیم منگولیا و تبت (۵) تعلیمی مجلس انتظامیہ۔

شعبہ تعلیم اعلیٰ کے فرائض میں سے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے انتظام کرنے کے، ان طلبہ کو جو کہ امتحان میں کامیاب ہوں، خاص ڈگریاں دینا بھی ہے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے شعبے میں ان بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا بھی داخل ہے جو کہ بیرون چین میں مقیم ہیں۔ شعبہ تعلیم معاشرتی کا کام عوام الناس، بالغوں اور شہریوں کو مناسب تعلیم دینا ہے۔ ان کی تعلیم میں "اصول ثلثہ" اور ستور کومنگ تانگ کو ایک اہم جزو سمجھا تا ہے۔ انھیں مدارس، کتب خانوں، عجائب خانوں کے ذریعے تربیت دینا، میدان، پارک، اور عوام مقامات میں ان کے لئے مناسب اور معصوم تفریح کا سامان مہیا کرنا، معاشرتی حالات کی اصلاح کرنا، رسوم و عادات کی درستی کرنا، تعلیمی مراکز قائم

کرنا، عام ادب کی اشاعت کرنا، عوام الناس کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنا یہ سب فرائض اسی شعبے کے ذمے ہیں۔

منگولیا اور تبت کی تعلیم کے شعبے کا یہ فرض ہے کہ ان ملکوں کے تعلیمی حالات کی تحقیق کرے ان کی معاشی اور مالی حالات کی درستی کرے، ان کے باشندوں کی تعلیم کے لئے خاص مدرسین تیار کرے، خاص مدارس کھلوائے، اور ان کی تعلیم کو ہر طرح ترقی دے۔

تعلیمی مجلس کا یہ کام ہے کہ تعلیمی کتابیں لکھوائے اور ترجمہ کرائے، نصاب تیار کرے، درسی کتابوں کا انتخاب کرے۔ لغات وغیرہ مرتب کرائے، علمی اصطلاحوں کا معیار قائم کرے تعلیمی سامان اور اس کے لوازمات مہیا کرے، درسی کتابوں اور نصاب پر نظر ثانی کرے، ان کو چھپوائے، مختلف تعلیمی نمائشوں کے لئے اشیائے نمائش کے اچھے نمونے جمع کرے۔ یہ تو محکمۂ تعلیم کے نظام کا خاکہ ہو گیا۔ اب ہم مختصر طور پر اس کام کا ذکر کرتے ہیں جو اس محکمے کے تحت اب تک ہو چکا ہے۔

۱۔ اعلیٰ تعلیم

سابق وابیویوان نے ۱۹۲۷ء کی تعلیمی رپورٹ شائع کی تھی، جس میں قومی یونیورسٹیوں کے جامع حالات درج کئے گئے تھے۔ موجودہ شعبۂ تعلیم نے بھی اسی قسم کی ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ سوا بیویوان نے جو دستور العمل غیر سرکاری کالجوں، یونیورسٹیوں، ان کی تعلیمی کمیٹیوں اور ٹرسٹیوں کے رجسٹری کرنے کے واسطے شائع کیا تھا اس پر نہایت پابندی اور زور کے ساتھ عمل کیا گیا۔ اس سلسلے میں کئی کالجوں کو تعلیمی ضروریات اور لوازمات مہیا نہ کر سکنے اور مالی حالت مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے بند کر دینا پڑا۔ جہاں تک غیر سرکاری یونیورسٹیوں کی رجسٹری کا تعلق ہے صرف ان کی رجسٹری کی جائے گی جو کہ سابقہ محکمہ تعلیم کی منظوری اور پسندیدگی حاصل کر چکی ہوں اور جن کے قیام کی موجودہ محکمہ تعلیم کو اطلاع دی گئی ہو۔ مالی حیثیت تعلیم کے ضروری اخراجات، اور تعلیمی ضروریات اور لوازمات کا بھی سوال اٹھا تھا ہنگامی یونیورسٹیوں

کو روکنے اور اچھے اور محنتی طلبہ کو اُن کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے محکمہ تعلیم نے یونیورسٹیوں کے نظم ونسق کے متعلق جو دستور اور قاعدہ بنایا ہے اس میں یہ شرط لگا دی ہے کہ یونیورسٹی کا درجہ اسی تعلیم گاہ کو دیا جائے گا، جس کے ماتحت کم سے کم تین ملحقہ کالج ہوں، تین کالجوں میں سے ایک خالص یا مخلوط سائنس کالج ہو، کیونکہ موجودہ محکمہ تعلیم یہ نہیں چاہتا کہ چین میں ناقص اور بے مایہ یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھے۔ اس کی خواہش صرف یہ ہے کہ جو یونیورسٹیاں موجود ہیں ان کی حالت درست، اصلاح اور ترقی یافتہ ہو جائے۔ سرکاری صوبجاتی اور غیر سرکاری یونیورسٹیاں جنہیں محکمہ تعلیم نے باضابطہ تسلیم کرلیا ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سرکاری یا قومی یونیورسٹیاں

نام یونیورسٹی	مقام
۱۔ نیشنل سنٹرل یونیورسٹی	نانکننگ
۲۔ پیکن نیشنل یونیورسٹی	پیپنگ دپیکن
۳۔ نیشنل پیپنگ یونیورسٹی	"
۴۔ نیشنل پیپنگ نارمل یونیورسٹی	"
۵۔ نیشنل ٹشنگ ہوا یونیورسٹی	"
۶۔ نیشنل چیو ٹونگ یونیورسٹی	شنگھائی
۷۔ نیشنل جینان یونیورسٹی	"
۸۔ نیشنل کسی یونیورسٹی	"
۹۔ ٹونگ جی یونیورسٹی	"
۱۰۔ سن یت سین یونیورسٹی	کنٹن
۱۱۔ پیان انجنیرنگ یونیورسٹی	ٹیان ٹسین
۱۲۔ نیشنل چیکائینگ یونیورسٹی	ہانگ چیو

١٣۔ نیشنل وو ہان یونیورسٹی	وو چانگ، ہوپہ
١٤۔ نیشنل ٹسینگ ٹو یونیورسٹی	ٹسینگ ٹو اور سی نان

٢۔ صوبجاتی یونیورسٹیاں

١۔ ہوپہ لا اور کامرس یونیورسٹی	ٹیان ٹسین
٢۔ شمالی شرقی یونیورسٹی	شین یانگ (مکدن)
٣۔ ہاپہ یونیورسٹی	پاؤ ٹینگ (ہاپہ)
٤۔ چینگ ڈو یونیورسٹی	چینگ دو (سیوچوان)
٥۔ سیوچوان یونیورسٹی	" "
٦۔ جینگ نارمال یونیورسٹی	" "
٧۔ ہونان یونیورسٹی	" "
٨۔ شانسی یونیورسٹی	تائی یوان (شانسی)
٩۔ شی آن یونیورسٹی	شی آن (شنسی)
١٠۔ ہان یونیورسٹی	کائی فانگ (ہانان)
١١۔ کوانگ سی یونیورسٹی	کوی لیں (کوانگ سی)
١٢۔ کوی چیو یونیورسٹی	کوی یان (کوی چیو)
١٣۔ آن ہوی یونیورسٹی	آن کینگ (آن ہوی)
١٤۔ کیرین یونیورسٹی	کیرین (کیرین)
١٥۔ لان چیو یونیورسٹی	لان چیو (کانسو)

٣۔ غیر سرکاری یونیورسٹیاں جن کی محکمہ تعلیم سے رجسٹری اور منظوری کرائی گئی۔

١۔ آموی یونیورسٹی	آموی (فوچیانگ)	٢٠ مارچ سنہ ١٩٢٨ء

۲۔ نانکینگ یونیورسٹی	نانکینگ	۲۰ ستمبر ۱۹۲۸ء
۳۔ یوٹاپیہ یونیورسٹی	شانگھائی	″
۴۔ فوڈان یونیورسٹی	″	۵ اکتوبر ۱۹۲۸ء
۵۔ شانگھائی یونیورسٹی	″	۲۰ مارچ ۱۹۲۹ء
۶۔ کوانگ ہوا یونیورسٹی	″	۱۰ مئی ″
۷۔ گریٹ چائنا یونیورسٹی	″	۲۰ ″ ″
۸۔ یان چینگ یونیورسٹی	پیپنگ	۵ جون ″
۹۔ نانکائی یونیورسٹی	تیان سین	″ ″
۱۰۔ سوچیو یونیورسٹی	سوچیو (کیانگ سو)	۲۸ جولائی ″
۱۱۔ چونگ ہوا یونیورسٹی	ووچانگ	۱۷ دسمبر ″
۱۲۔ یونین میڈیکل کالج	پیپنگ	۲۴ مئی ۱۹۳۰ء
۱۴۔ شانگھائی لا کالج	شانگھائی	۶ جون ۱۹۳۱ء

۲۔ فنی تعلیم

واہیویوان کے نقش قدم پر، موجودہ محکمہ تعلیم نے بھی، سارے ملک میں فنی تعلیم کے حالات کی تحقیق کرائی، بڑے غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ وسیع پیمانے پر فنی تعلیم کا انتظام کیا جائے نئے مدارس کھلوا کر جدید علوم سکھلائے جائیں، اور خاص ماہرین کی تربیت کی جائے، چنانچہ اعلیٰ فنی مدارس کے ادارات کو چلانے کے لئے خاص قانون بنایا گیا۔ وہ معیار جس سے اعلیٰ فنی تعلیم کی جانچ کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک قانونی اور طبی پیشوں کا تعلق ہے۔ ان کی اہمیت مد نظر رکھتے ہوئے صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں کو اجازت دی گئی کہ وہ قانونی اور طبی ادارے قائم کر سکتی ہیں۔ وہ قانونی اور طبی مدارس جو ابتک جاری ہیں خواہ وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری ان کو

حکم دیا گیا کہ ۱۹۲۹ء کے تعلیمی سال کے شروع سے نیا طالب علم داخل نہ کریں۔ اُن میں جو طلبہ موجود ہیں، کورس ختم ہونے پر ان کو رخصت کر دیا جائے اور مدارس بند کر دئے جائیں، ان مدارس کے مکانات، ملکیت اور آمدنی کے ذرائع اور وسائل خاص تعلیمی ادارات قائم کرنے کے واسطے وقف کر دئے جائیں گے۔ تدریجاً خاص تعلیمی ادارات قائم کرنے کے واسطے، حکومت کی طرف سے ایک اعلان شائع کیا گیا جس میں ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ مختلف مقامات میں مختلف فنون کے مدارس قائم کئے جائیں گے۔ مثلاً کان کنی، جنگل کی کاشت، کاغذ سازی، جہاز سازی، پارچہ بافی، زمین کی اصلاح، پالتو جانوروں کی افزائش نسل، ہوائی جہاز بنانا، دھاتوں کو صاف کرنا وغیرہ، مقام اور موقع کے لحاظ سے ان سب کاموں کے لئے خاص مدرسے قائم کئے جائیں گے۔

چونکہ اب تک چین میں مختلف کام کے ضروری ماہرین اور خاص فنون کے معلمین کے لئے تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے، اس لئے محکمۂ تعلیم نے ہر صوبہ کو یہ ہدایت کی ہے کہ طلبہ کی ایک خاص تعداد منتخب کر کے، جاپان، یورپ اور امریکہ بھیجا کرے اور اسی پر زور دیا گیا کہ ادبی طلبہ کی بہ نسبت زیادہ تر سائنس اور انجنیری کے طلبہ کو ترجیح دے۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان جو طلبہ غیر ممالک میں گئے ہیں، ۵۰۲۳ سے کچھ اوپر ہیں، اسی کثیر تعداد میں سے صرف ۱۲۲ طلبہ حکومت کے خرچ سے گئے ہیں اور باقی سب اپنے ذاتی اخراجات سے۔ قرب کی وجہ سے جاپان میں ۸۰۰ ا چینی طلبہ ہیں مگر یورپ اور امریکہ میں صرف ۱۲۶ اور ۱۵۸ طلبہ ہیں۔

مئی ۱۹۲۷ء میں تحقیق کا مرکزی ادارہ قائم کرنے کی غرض سے حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی، چھ مہینے کے بعد سابق داہیو یوان کے ماتحت یہ ادارہ قائم ہوا جو کہ چین میں سائنس کا اعلیٰ تحقیقاتی ادارہ سمجھا جاتا ہے، مگر موجودہ محکمۂ تعلیم کے قائم ہوتے ہی یہ ادارہ اس سے علٰحدہ کر دیا گیا جو کہ اکادمی سینیکا کے نام سے موسوم ہے۔ چونکہ یہ مضمون موجودہ تعلیمی نظام کے متعلق ہے، اسی لئے اکادمی سینیکا کے متعلق کچھ لکھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے

لئے جداگانہ مضمون درکار ہے۔

اکادمی سینیکا کے علاوہ چین میں ٹسینگ ہوا یونیورسٹی کا صیغہ تحقیق ہے، جامعہ پیکین کا صیغہ تحقیق ہے، سن یت سین یونیورسٹی (کنٹن) میں ارضیات، حیوانیات، طبیعات، نفسیات، تعلیمات کے شعبے متحدہ اور سادہ زبان بنانے کی کمیٹی، مدرسوں کی تربیت کی کمیٹی، طبی تعلیم کی کمیٹی (یہ صرف تین سال سے قائم ہوئی ہے) موجود ہیں اور ملک میں بہت سے ادارات ہیں جو رفاہ عام کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ سائنس کی تحقیق اور مطالعہ میں حصہ لینے کی غرض سے بہت سے غیر سرکاری ادارات قائم ہوئے ہیں، ان میں سے تقریباً بیس مقامی تعلیمی کونسلوں سے رجسٹری کرا کر مرکزی محکمہ تعلیم سے منظوری حاصل کر چکے ہیں۔

(باقی)

دنیا کی رفتار

برطانیہ کی مالی مشکلات کا اثر ہندوستان پر

ایک عرصے سے بنک انگلستان کے خزانے سے سونا برابر نکل کر امریکہ اور فرانس منتقل ہو رہا تھا اور گزشتہ ستمبر کی ۲۰ تاریخ کو ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ اگر باقی ماندہ ذخیرہ طلا کو محفوظ رکھنے کے لئے فوری تدابیر نہ اختیار کی جاتی تو اندیشہ تھا کہ انگلستان کے ساہوکاری کے اعتبار کو سخت نقصان پہنچے گا، چنانچہ وزارت انگلستان نے پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد ۲۰ ستمبر کی شام کو ایک سرکاری اعلان شائع کر دیا کہ بنک انگلستان آئندہ سے مقررہ نرخ پر سونا فروخت کرنے پر قانوناً مجبور نہیں ہے۔ اس اعلان کے بعد پونڈ اسٹرلنگ یعنی انگلستان کے کاغذی زر کی قیمت میں جو طلائی پونڈ کے برابر تھی ۱۳ فیصدی کا بٹہ لگ گیا۔

برطانوی وزارت کے اس اعلان کی اطلاع غالباً اسی روز رات کو کسی وقت وزیر مالیات ہند کو ہوئی ہوگی، چنانچہ صبح کو وائسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر ایک "آرڈیننس" نافذ کیا کہ حکومت ہند جو کرنسی ایکٹ بابتہ ۱۹۲۷ء کے مطابق روپیہ کے تبادلے میں ایک شلنگ ۶ پنس طلائی ادا کرنے پر قانوناً مجبور تھی اس آرڈیننس کے بعد وہ اس ذمہ داری سے دست بردار ہوتی ہے۔

وائسرائے کا یہ آرڈیننس ادھر ہندوستان میں شائع ہوا۔ ادھر انگلستان میں وزیر ہند نے یہ اعلان کر دیا کہ روپیہ کا تبادلہ بجائے ایک شلنگ ۶ پنس طلائی کے ایک شلنگ ۶ پنس اسٹرلنگ کے ساتھ قانوناً قائم رکھا جائے گا۔ حکومت ہند اور وزیر ہند کے ان متضاد اعلانات نے ایک

عجیب صورت حال پیدا کر دی، چنانچہ حکومت ہند کی ہدایت کے مطابق ہندوستان کے تمام سالکنوں (لفظ)
میں تین دن کی تعطیل کر دی گئی تاکہ اس دوران میں حکومت ہند وزیر ہند سے مشورہ کرکے
اس مسئلے پر کوئی فیصلہ کرے اور سٹہ کرنے والے اس صورت حال سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

حکومت ہند نے ۲۱ ستمبر کو جو قدم اٹھایا تھا اس پر ہندوستان کے تمام کاروباری نیز
دوسرے حلقوں کی طرف سے اظہار اطمینان کیا گیا تھا۔ البتہ یہ شکایت ضرور تھی کہ ایک ایسے اہم
فیصلے کے متعلق حکومت نے اسمبلی سے کوئی مشورہ نہیں کیا حالانکہ اسمبلی کا اجلاس اسی زمانے میں
ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی یہ کارروائی تمام آئین اور دستور کے خلاف تھی۔ پھر بھی جو
تجویز حکومت ہند نے کی تھی اس سے عام طور پر اتفاق رائے کیا گیا تھا۔ لیکن جب وزیر ہند
نے حکومت کے فیصلے کے خلاف لندن میں یہ اعلان کیا کہ روپیہ کا مبادلہ شرح سابق پر پونڈ اسٹرلنگ
کے ساتھ قائم رکھا جائے گا تو اس پر لندن میں گاندھی جی اور دیگر مندوبین گول میز کانفرنس نے
سخت اعتراض کیا اور ہندوستان میں بھی تمام ایوان ہائے تجارت کی طرف سے احتجاج کیا گیا۔
تین دن کی گفت و شنید کے بعد جب حکومت ہند نے وزیر ہند کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا اور
وائسرائے کو پہلا آرڈیننس منسوخ کرکے دوسرا آرڈیننس نافذ کرنا پڑا تو اسمبلی نے بجا طور پر حکومت کی اس
پالیسی کے خلاف احتجاج کیا جو محض انگلستان کے مفاد کی خاطر اختیار کی گئی تھی۔ مسٹر شانمکھم چیٹی کی وہ
قرارداد جس میں انھوں نے حکومت کی اس پالیسی پر اعتراض کیا تھا، کثرت رائے سے منظور ہوئی
اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ تمام منتخب اراکین نے متفقہ طور پر مسٹر چیٹی کی تائید میں رائے دی۔ کسی جمہوری
نظام حکومت میں اس قسم کی قرارداد منظور ہونے کے معنی یہ ہوتے کہ حکومت یا تو مستعفی ہو جاتی
یا پبلک کے نمائندوں کے فیصلے کے مطابق اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتی۔ مگر اس کے جواب میں
وزیر ہند نے دارالعوام میں یہ اعلان کر دیا کہ "فیصلہ ہو چکا ہے اور اس پر نظر ثانی نہیں ہو سکتی۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نئے انتظام کا اثر مجموعی حیثیت سے ہندوستان کی تجارت اور مالیات پر کیا پڑے گا ؟ جہاں تک ہندوستان اور انگلستان کی تجارت اور لین دین کا تعلق ہے جس حساب سے "مطالبات وطن" پہلے ادا کئے جاتے تھے اسی حالت سے اب بھی ادا کئے جائیں گے، البتہ تجارتی مال و اسباب دیگر ممالک کے مقابلے میں انگلستان سے ارزاں دستیاب ہوگا اس لئے کہ طلائی شرح سے پونڈ اسٹرلنگ کی قیمت گھٹ گئی ہے اور چونکہ پونڈ اسٹرلنگ کے حساب سے روپیہ کی قیمت مقرر ہوتی ہے اس لئے روپیہ کی قیمت بھی بہت گھٹ گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ یا جاپان سے جو سامان منگایا جائے گا اس کی قیمت سونے کے سکے میں حسب سابق ہندوستان کو ادا کرنی ہوگی لیکن روپیہ کی شرح مبادلہ چونکہ بحساب ڈالر اور ین (جاپانی طلائی سکہ) گھٹ گئی ہے اس لئے جس چیز کے لئے پہلے ایک روپیہ یعنی ایک شلنگ ۶ پنس طلائی ادا کرنے پڑتے تھے اس چیز کی قیمت اب تقریباً ایک شلنگ ۶ پنس یا ایک روپیہ سے کچھ زائد ادا کرنا پڑے گی قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو اس کی بکری بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے امریکہ جاپان اور دوسرے ممالک کی تجارت برآمد کو جہاں تک ہندوستان، انگلستان اور دیگر نوآبادیات (جہاں اسٹرلنگ رائج ہے) کا تعلق ہے بہت نقصان پہنچے گا اور ہندوستان کی تجارت درآمد میں چونکہ امریکہ جاپان اور انگلستان سبھی شریک ہیں اس لئے اس نئے انتظام کی وجہ سے خود بخود انگریزی مال کو دیگر ممالک کے مقابلے میں ہندوستان کی منڈیوں میں ترجیح اور فروغ حاصل ہو جائے گا۔

ادھر ہندوستان کی تجارت برآمد کو روپیہ کی قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے فائدہ پہنچے گا اور ہماری خام پیداوار امریکہ جاپان اور دوسری منڈیوں میں مقابلۃً سستی پڑے گی اس لئے اس کی مانگ بھی بڑھ جائے گی جس کی وجہ سے ملک کے اندر غلے وغیرہ کی قیمت میں اضافہ ہوگا اور غریب کسان جو ارزانی کی وجہ سے تباہ ہوئے جا رہے تھے ان کی حالت کچھ سنبھل جائیگی۔

لیکن اگر روپیہ کی شرح مبادلہ اسٹرلنگ کے حساب سے نہ مقرر کی جاتی اور اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ سب فائدے بھی ملک کو حاصل ہوتے اور اسی کے ساتھ یہ اطمینان بھی ہوتا

کہ روپیہ کی قیمت اتنی زیادہ نہ گھٹے گی کہ جس سے ملک کے اعتبار کو نقصان پہنچے۔ اس کا اندیشہ قدرتاً اس وقت پیدا ہو رہا ہے جب کہ روپیہ کا مبادلہ ایک ایسے زر کے ساتھ مقرر کر دیا گیا ہے جس کی قیمت کے متعلق بہت کچھ شبہات کاروباری حلقے میں پیدا ہو رہے ہیں، آج سے ۴ سال قبل رائل کرنسی کمیشن کے سامنے جب بعض حلقوں کی طرف سے یہ سفارش کی گئی تھی کہ روپیہ کا تبادلہ قانوناً طلائی زر کی بجائے اسٹرلنگ کے ساتھ مقرر کیا جائے تو اس نے اس کی سخت مخالفت کی تھی اور اپنی رپورٹ کے پیراگراف نمبر ۲۲ و ۲ میں صاف وصریح الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ "بلا شک وشبہ یہ ہندوستان کے لئے نقصان رساں ثابت ہوگا اگر اس کے زر کو کسی ایک ملک کے زر کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے، خواہ وہ زر کتنا ہی مضبوط اور مستحکم طور پر سونے کے ساتھ وابستہ کیوں نہ ہو" پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ رائل کمیشن کے ان الفاظ کو کیوں بلا کسی معقول سبب کے بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

حکومت ہند کا ضمنی میزانیہ

حکومت ہند کا ضمنی میزانیہ ہر سال اسمبلی کے شملہ سشن میں پیش ہوا کرتا ہے، اس سال غیر معمولی مالی دشواریوں کی وجہ سے بہت بڑے خسارہ کا پہلے سے اندیشہ تھا، حکومت ہند نے تخفیف مصارف کے متعلق تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کی مکمل رپورٹ سال رواں کے ختم تک شائع ہونے والی ہے چنانچہ اسمبلی کے غیر سرکاری اراکین نے ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے سفارش کی کہ ضمنی میزانیہ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے تک ملتوی کر دیا جائے تاکہ جہاں تک ہو سکے تخفیف مصارف کے ذریعے سے میزانیہ کا لیکھا جوکھا برابر کیا جائے اور اس زمانے میں جب مالی دشواریاں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں، مزید محصولات کا ناقابل برداشت بوجھ ملک پر نہ ڈالا جائے مگر حکومت ہند نے ۲۹ ستمبر کو ضمنی میزانیہ اسمبلی کے سامنے

پیش کر ہی دیا، البتہ اسمبلی کی منظور شدہ قرار داد کا کچھ لحاظ رکھتے ہوئے مشیر مال صاحب نے یہ اعلان فرما دیا کہ میزانیہ پیش تو کر دیا گیا لیکن اس پر غور کرنے کے لئے ایک مخصوص اجلاس ۲۸ نومبر سے دہلی میں منعقد ہوگا تاکہ یکم دسمبر سے اس میزانیہ پر عملدرآمد ہو سکے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ میزانیہ پیش کرنے اور اس پر غور کرنے میں زیادہ فرق یہاں نہیں ہے۔ اب تک تو ہمیشہ میزانئے جس صورت میں پیش ہوئے اسی صورت میں ان پر عملدرآمد بھی ہوا خواہ اسمبلی نے اس کو منظور کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

میزانیہ پر نظر ڈالنے سے مطلع ہوتا ہے کہ سال رواں میں بجائے ایک لاکھ روپیہ کی بچت کے جیسا کہ گزشتہ سال دکھایا گیا تھا ۱۹ کروڑ پچپن لاکھ روپیہ کا خسارہ ہے اور مشیر مال صاحب کا اندازہ ہے کہ تقریباً ۱۹½ کروڑ روپیہ کا خسارہ آئندہ سال بھی میزانیہ میں ہوگا۔ گویا آئندہ اٹھارہ مہینے کے اندر ۳۹ کروڑ پانچ لاکھ کا خسارہ حکومت ہند کے میزانئے میں ہوگا جس کو کسی نہ کسی طرح سے پورا کر کے دکھلانا چاہئے ورنہ ہندوستان کے نظام زر کو جو دھچکا معیار طلائی کے منسوخ ہو جانے سے لگا ہے وہ اور بھی زیادہ مضرت رساں ثابت ہوگا۔

اس خسارہ کو مشیر مال نے تین طریقوں سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے اول تنخواہوں میں تخفیف، دوسرے فوجی مصارف میں کمی، تیسرے محصولات میں اضافہ۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(الف) تنخواہوں میں تخفیف۔

۱۔ وائسرائے	۲۰ فیصدی
۲۔ مرکزی اگزیکٹو کونسل کے ارکان	۱۵ "
۳۔ تمام دیگر ملازمین جن کی تنخواہیں چالیس روپے سے زیادہ ہوں	۱۰ "

تنخواہوں میں تخفیف سے کل بچت ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوئی۔

(ب) فوجی مصارف میں کمی ۔۔۔ ۴½ کرور

(ج) محصولات میں اضافہ

۱۔ محصول نمک انکم ٹکس، سپر ٹکس	۲۵ نیصدی
۲۔ سال رواں میں انکم ٹکس	۱۲½ "
۳۔ ایک ہزار اور دو ہزار روپیہ کے درمیان آمدنی پر جدید ٹکس	۴ پائی فی روپیہ
۴۔ مال درآمد، مصنوعی ریشم، بجلی کے بلب، کافور	۴۰ نیصدی
۵۔ مصنوعی ریشم کا دھاگہ اور تار	۱۵ "
۶۔ مشینیں اور رنگ	۱۰ "
۷۔ خام روئی	½ آنہ فی پونڈ
۸۔ بوٹ جوتے	۲۰ نیصدی
۹۔ لفافہ	تین پائی فی لفافہ
۱۰۔ کارڈ	" " فی کارڈ

اس تخفیف مصارف اور اضافہ محصولات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے اختتام پر دس کرور ۱۳ لاکھ روپیہ کا نقصان ہوگا لیکن چونکہ یہ تجاویز اٹھارہ مہینے کے لئے پیش کی گئی ہیں، اس لئے ۳۳-۱۹۳۲ء کے اختتام پر ۵ کرور ۴۳ لاکھ روپئے کی بچت کی توقع کی جاتی ہے۔

---

۴ نومبر سے اسمبلی کا مخصوص اجلاس میزانیہ پر غور کرنے اور اس کو منظور کرنے کے لئے دہلی میں شروع ہوا ہے، پہلی مرتبہ غور اور بحث ہو چکی۔ دوسری بار بحث ہو رہی ہے۔ اس کے بعد تیسری بار منظوری کے لئے رائے لی جائے گی اور امید ہے کہ حسب معمول کثرت رائے سے منظور ہو جائے گا اور اگر غیر سرکاری اراکین نے اسی یکجہتی اور اتحاد سے کام کیا جس کی بدولت حکومت کو شملہ میں شکست ہوئی تھی تو پھر وائسرائے کو مجبوراً منظوری دینا پڑے گی، لیکن اس کی نوبت

شاید نہ آئے، پبلک سروس کمیشن کی ممبری اور بعض دیگر اعلیٰ ملازمتیں خالی ہونے والی ہیں اور ہر معاملے پر رائے دیتے وقت اکثر اراکین کو ان امور کا بھی خیال رکھنا ہی پڑتا ہے!

جو تدابیر میزانیہ کو متوازن کرنے کے لئے اختیار کی گئی ہیں ان پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جہاں تک تنخواہوں میں تخفیف کا تعلق ہے ہر چند کہ وائسرائے، ان کے وزراء، اور دیگر ملازمین کا ایثار قابل ستائش ہے لیکن ہندوستان کی رائے عامہ نے چونکہ تنخواہوں کے معاملے میں ایک خاص نقطہ نظر اور ایک معیار قائم کر لیا ہے اس لئے اس تخفیف سے کوئی شخص بھی کسی طرح مطمئن نہیں ہو سکتا۔ توقع تھی کہ لی کمیشن کی مراعات جو قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے جنگ کے بعد کی گئی تھیں ان کو اب ختم کر دیا جائے گا مگر مشیر مال صاحب اپنے بھائی بندوں کے ساتھ اس حد تک زیادتی کرنا انتہائی ناانصافی سمجھتے ہیں، اس لئے ان کو بجنسہٖ قائم رکھا گیا ہے۔

اعلیٰ اور ادنیٰ ملازمتوں کی تنخواہوں میں یکساں طور پر دس فیصدی کی تخفیف سے جو ناانصافی صریحاً ادنیٰ ملازمتوں کے ساتھ کی گئی ہے اس پر کسی تنقید کی ضرورت نہیں ہے جو شخص ہزار روپیہ ماہوار پاتا ہے اس کی تنخواہ میں سو روپیہ کی کمی کوئی بات نہیں لیکن جو غریب پچاس ہی روپیہ پاتا ہے اس کی تنخواہ میں سے پانچ روپیہ کاٹ لینے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اور اس کے بال بچوں کا پیٹ کاٹ گیا۔

مشیر مال نے نہایت شاندار الفاظ میں کمانڈر انچیف اور ان کے اسٹاف کی خدمات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے فوجی مصارف ۴½ کرور روپیہ کی تخفیف منظور کر لی ہے لیکن فوجی مصارف کا معاملہ بھی آج سے نہیں بلکہ کئی سال سے زیر بحث ہے اور قومی نمائندوں کا ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے اگر قومی مصارف میں فوراً بقدر نصف تخفیف نہیں ہو سکتی تو جنگ عظیم سے قبل جو مصارف تھے اس سے کسی طرح زیادہ نہ ہونا چاہئے، یہ خیال روز بروز پختہ ہوتا جاتا ہے کہ

ہندوستان کی حفاظت کے لئے اتنی بڑی فوج کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور موجودہ فوجی مصارف کا بار زیادہ تر برطانیہ عظمیٰ کی سامراجی پالیسی کو تقویت دینے کے لئے ہندوستان کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے، اسی لئے اسمبلی کے تقریباً ہر مقرر نے اس پر زور دیا ہے کہ فوجی مصارف میں ابھی اور زیادہ تخفیف کی جائے اور صرف مصارف میں تخفیف کر کے میزانیہ میں توازن قائم کیا جائے سر عبدالرحیم نے جو تخفیف مصارف کی کمیٹی کے صدر ہیں، ۶ نومبر کو میزانیہ پر تقریر کرتے ہوئے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ صرف تخفیف مصارف سے میزانیہ کو خسارے سے بچایا جا سکتا ہے۔

جدید محصولات کی حد میں جو چیز بدیہی طور پر پبلک کے لئے بے چینی کا باعث ہوگی وہ نمک پر ۲۵ فیصدی کا اضافہ ہے۔ "نمک قانون توڑ دیا" کی آوازیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں اور اگر اس سے پھر سیاسی فائدہ اٹھایا گیا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

تجارت کی اس کساد بازاری میں انکم ٹکس اور سپر ٹکس میں اضافہ اور خصوصاً ایک ہزار سے دو ہزار تک کی آمدنی پر ۴ پائی فی روپیہ کا جدید محصول جو لگایا گیا ہے کہ سونے کا انڈا حاصل کرنے کے لئے بطخ کا پیٹ چاک کر دیا جائے، اشیاء درآمد پر جو ٹکس لگایا گیا ہے اس سے ملک کی درآمد پر اثر پڑے گا اور چونکہ بین الاقوامی تجارت میں درآمد کی قیمت برآمد کی اشیاء سے ادا کی جاتی ہیں اس لئے ملک کی تجارت برآمد پر بھی اس کا مضر اثر پڑے گا۔ لفافہ اور کارڈ کی قیمت میں جو اضافہ کیا گیا ہے وہ اس لئے اور زیادہ قابل اعتراض ہے کہ اس مد سے کوئی معتد بہ رقم حکومت کو حاصل نہ ہوگی اور بہت آسانی کے ساتھ اس کی بجائے کسی دوسرے ذریعے سے اسی قدر رقم حاصل کی جا سکتی تھی مسٹر چٹی اور بی داس نے پٹرولیم ٹکس لگانے کی تجویز کی تھی لیکن معلوم نہیں کیوں اس پر توجہ نہیں کی گئی۔

بہر حال مجموعی حیثیت سے میزانیہ قابل اطمینان نہیں ہے اور اس بل کو ۱۸ مہینے کے لئے نافذ کرنا بھی قرین مصلحت نہیں ہوتا۔ اگر حکومت واقعی تخفیف مصارف کی کمیٹی کی سفارشات پر

ایا نداری سے غور کرنا چاہتی ہے تو اس بل کا نفاذ صرف ۴ ماہ کے لئے ہونا چاہیے تھا اور اس کے بعد اپریل میں حسب معمول پھر تمام صورت حال پر غور کیا جائے ، اور کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں آئندہ سال کا میزانیہ مرتب کیا جائے ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو آئندہ کے سیاسی حالات پر اطمینان نہیں ہے اور اس لئے وہ پیش بندی کے طور پر پہلے سے یہ انتظام کر رہی ہے۔

ہندوستان کی جدید مردم شماری

۱۹ ار ستمبر کے گزٹ آف انڈیا میں ہندوستان کی گزشتہ مردم شماری کے اعداد و شمار نظر ثانی کے بعد شائع ہوئے ہیں ، حکومت ہند کے ایک رزولیوشن میں واضح کیا گیا ہے کہ مذاہب کی رو سے جو اعداد و شمار شائع کئے گئے ہیں وہ تقریباً صحیح ہیں گو وہ احاطہ بمبئی اور برما کے چند حصوں کے متعلق مکمل نہیں ہیں ، بعض صوبجات میں خاص خاص مذاہب کے اعداد و شمار درج کئے گئے ہیں جن صوبجات میں جس مذہب کے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے ان کو چھوٹے مذاہب کے زیر عنوان درج کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی کل آبادی ۳۵ کروڑ ، ۲۹ لاکھ ۸۶ ہزار ۸ سو ۷۶ ہے ، جس میں سے ۱۸ کروڑ ۱۵ لاکھ ۱۲ ہزار ۴۱۷ مرد ہیں اور ۱۷ کروڑ دس لاکھ ۷۴ ہزار عورتیں ، بمقابلہ ۱۹۲۱ء اس مردم شماری میں ۱۰.۶ فیصدی کا ہوا ہے ، مختلف مذاہب کے اعتبار سے آبادی کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں ۔

ہندو	۲۳ کرور ۹۰ لاکھ ۳۰ ہزار ۹ سو ۱۲
مسلمان	۷ کرور ۷۷ لاکھ ۴۳ ہزار ۹ سو ۲۰
سکھ	۴۳ لاکھ ۶ ہزار ۴ سو ۴۲
عیسائی	۵۹ لاکھ ۱۹ ہزار ۷ سو ۹۲

برطانوی ہند کی آبادی

کل آبادی	۲۷ کرور ۱۲ لاکھ ۷۳ ہزار ایک سو ۷
ہندو	۱۷ کرور ۶۹ " ۲۴ " ۴ " ۳۵
مسلمان	۶ " ۷۰ " ۸۵ " ۵ " ۱۰!

صوبہ وار آبادی

صوبہ	کل آبادی	ہندو	مسلمان
۱۔ اجمیر مارواڑ	۵ لاکھ ۶۰ ہزار ۲ سو ۹	۴ لاکھ ۲۳ ہزار ۵ سو ۹	۹۷ ہزار ایک سو ۳۲
۲۔ آسام	۸۶ لاکھ ۲۲ ہزار ۲ سو ۵۱	۴۹ لاکھ ۳۱ ہزار ۷۶۰	۳۷ لاکھ ۵۵ ہزار ۹۱۴
۳۔ بلوچستان	۴ لاکھ ۶۳ ہزار ۵۰۰	۴۱ ہزار ۴۳۲	۴ لاکھ ۵ ہزار ۳۰۹
۴۔ بنگال	۵ کرور ۲۲ ہزار ۵۵۰	۲ کرور ۱۰ لاکھ ۷۳ ہزار ۹۲۱	۲ کرور ۵۷ لاکھ ۳۰ ہزار ۳۲
۵۔ بہار اڑیسہ	۳ کرور ۷ لاکھ ۷۶ ہزار ۵۷۶	۳ کرور ۱۰ لاکھ ۱۰ ہزار ۶۶۰	۴۲ لاکھ ۶۴ ہزار ۷۷۶
۶۔ بمبئی	۲ کرور ۱۸ لاکھ ۵۴ ہزار ۸۴۱	۱ کرور ۶۶ لاکھ ۱۵ ہزار ۸۶۶	۴۴ لاکھ ۵۷ ہزار ۱۳۳
۷۔ برما	۱ کرور ۴۶ لاکھ ۵۴ ہزار ۹۶۹	۵ لاکھ ۷۴ ہزار ۶۵۷	۶ لاکھ ۲ ہزار ۱۴۸
۸۔ صوبہ متوسط و برار	۱ کرور ۵۵ لاکھ ۷ ہزار ۷۲۳	۱ کرور ۳۴ لاکھ ۶۰ ہزار ۱۰۹	۶ لاکھ ۸۲ ہزار ۸۵۴
۹۔ کرگ	۱ لاکھ ۶۳ ہزار ۳۲۷	۱ لاکھ ۴۶ ہزار ۷	۱۳ ہزار ۷۷۷
۱۰۔ دہلی	۶ لاکھ ۳۶ ہزار ۲۴۶	۳ لاکھ ۹۹ ہزار ۸۶۳	۲ لاکھ ۶ ہزار ۹۶۰
۱۱۔ مدراس	۴ کرور ۵۶ لاکھ ۵۷ ہزار ۶۷۰	۴ کرور ۳ لاکھ ۲۹ ہزار ۹۰۰	۳۳ لاکھ ۱۶ ہزار ۸۳
۱۲۔ صوبہ سرحد	۲۴ لاکھ ۲۵ ہزار ۷۶	۱ لاکھ ۴۲ ہزار ۹۷۷	۲۲ لاکھ ۲۷ ہزار ۳۰۳
۱۳۔ پنجاب	۲ کرور ۳۵ لاکھ ۸۰ ہزار ۸۵۲	۶۳ لاکھ ۲۸ ہزار ۵۸۸	۱ کرور ۳۳ لاکھ ۳۲ ہزار ۴۶۰

۱۴۔ صوبہ متحدہ ۴ کرور ۴۸ لاکھ ۸ ہزار ۷۶۳ ۴ کرور ۹ لاکھ ۵ ہزار ۳۲۳ ۵ ۱۷ لاکھ ۱۸ ہزار ۹۳۷

جدید مردم شماری کے اعداد کو دیکھنے اور حساب لگانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ آبادی کے مقابلے میں اس دس سال کے عرصے میں ہندوؤں کی تعداد میں ۱۰ فیصدی کا، مسلمانوں کی تعداد میں ۱۳ر۱ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے سکھوں کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا ہے ۳۳ر۷ فیصدی جینی صرف ۲ فیصدی بڑھے ہیں، بدھ مذہب والوں میں ۸ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے اور پارسیوں میں ۵ فیصدی کا، عیسائی بھی بہت بڑھے ہیں یعنی ۳۲ر۶ فیصدی، یہودی اور پہاڑی قبائل میں ۱۹ فیصدی کمی ہوئی ہے۔

عالم اسلامی

افغانستان کی رفتار ترقی

اعلیحضرت نادر شاہ غازی اور ان کے رفقائے کار افغانستان کی ترقی کے لئے جو سعی بلیغ کر رہے ہیں اس کا اندازہ بآسانی ان اطلاعات سے کیا جاسکتا ہے جو گزشتہ چھ مہینوں میں کابل سے موصول ہوئی ہیں۔

افغانستان کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ وہاں وسائل نقل وحمل تقریباً نادر ہیں، سوائے اس سڑک کے جو پشاور سے کابل گئی ہے۔ ملک کی اور کوئی سڑک اچھی حالت میں نہیں۔ آمد ورفت کی مشکلات کا اثر سفر و سیاحت سے کہیں بڑھ کر انتظامات حکومت، ملک کی معاشی حالت اور اندرونی امن وامان پر پڑا ہے۔ یہی دقتیں ہیں جن کو محسوس کرتے ہوئے اعلیحضرت شاہ غازی کی حکومت نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ افغانستان کے بڑے بڑے شہروں کے درمیان ریل کا سلسلہ قائم کردیا جائے۔ ابھی یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ریلوے کی تعمیر کس طرح عمل میں آئے گی اور اس کا ٹھیکہ کسی خارجی حکومت کو دیا جائے گا یا کمپنی کو مگر قرار داد یہ ہے کہ اول کابل کو قندھار اور پھر قندھار

کو ہرات سے ملحق کر دیا جائے، البتہ جہاں کہیں ریلوے کی تعمیر دشوار یا ناممکن ہو وہاں پکی سڑکیں بنوا دی جائیں گی۔ بعض حصص میں ان سڑکوں کی تعمیر شروع بھی ہو گئی ہے۔ اس ضمن میں ایک دوسری چیز انتظامی ضروریات کے لئے پرواز کا بندوبست کرنا ہے۔ اس وقت تک ترمذ اور کابل کے درمیان سلسلہ پرواز قائم ہے۔ لیکن غالباً اس کا انتظام روس کے ہاتھ میں ہے، حکومت چاہتی ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سلسلہ پرواز کو اپنے زیر نگرانی مزید وسعت دے سکے۔ سلسلہ اطلاع رسانی کو مکمل بنانے کے لئے تمام صوبوں کے مراکز کو تار اور ٹیلیفون سے ملا دیا گیا ہے اور حکومت نے علاوہ بہت سے طلبہ کے دو افغان نوجوانوں کو اسٹاک ہولم بھیجا ہے تاکہ وہاں رہ کر وہ خاص طور سے ٹیلیفون انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کریں۔

گزشتہ انقلاب کے تکلیف دہ واقعات سے سبق اٹھا کر حکومت نے متعدد جنگی اصلاحات بھی جاری کر دی ہیں۔ قدیم نظام کے خلاف اب ہر علاقے اور ہر قبیلے پر یہ ذمہ داری عائد کر دی گئی ہے کہ وہ ملکی سپاہ کے لئے آدمیوں کی ایک خاص تعداد بہم پہنچائے۔ ان کی قواعد و تربیت کے لئے مغربی اصول اور مغربی وردیاں اختیار کر لی گئی ہیں البتہ ٹوپیاں ایک خاص وضع کی ہیں جو جرمنی، فرانسیسی اور روسی فوج کے کاسک سپاہیوں کی ٹوپیوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اس خیال سے کہ افواج کے نظم و نسق میں کوئی نقص پیدا نہ ہو اور شورش پسند قبائل کی سرکشی کا انسداد فوراً ہو جائے ملک کے اہم حصوں میں متعدد چھاؤنیاں تعمیر کی جا رہی ہیں جن کے درمیان تار، ٹیلیفون، ریلوں اور سڑکوں کا سلسلہ قائم کر دیا جائے گا۔

تعلیمی امور میں بھی حکومت کا قدم پیچھے نہیں رہا۔ مدرسہ حربیہ کے علاوہ ملک میں چار کالج اور متعدد مدارس موجود ہیں۔ تعلیم ہر جگہ مفت ہے، اور کوہ دامن میں خصوصیت کے ساتھ نئے مدارس قائم کئے جا رہے ہیں کیونکہ کوہ دامن کے باشندے ابھی تک تعلیم و تربیت میں بہت پیچھے ہیں۔

نظام آب رسانی کو بھی دن بدن وسعت دی جا رہی ہے، کوشش یہ ہے کہ بہت سی غیر مزروعہ زمینوں کو کاشت کے قابل بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں پھلوں کی پیداوار پر خصوصیت کے ساتھ

زور دیا جا رہا ہے۔ کابل میں ایک انجمن تجار بھی قائم کر دی گئی ہے۔ یہ انجمن تجارتی مسائل کے متعلق اپنے اہل ملک کو قیمتی مشورے دیتی رہتی ہے۔ گزشتہ انقلاب کی وجہ سے جو چکیاں اور کارخانے بند ہو گئے تھے اب انھوں نے از سر نو کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ ملک کی درآمد و برآمد بھی اب پہلی حالت پر آگئی ہے اور حکومت کا ارادہ ہے کہ یورپ کے ہر ملک میں افغانستان کا کوئی نہ کوئی ایجنٹ موجود رہے۔

اس کے علاوہ اور بیسیوں چھوٹی چھوٹی اصلاحات نافذ ہو رہی ہیں۔ محکمہ پولیس کا افغان افسر اسکاٹ لینڈ یارڈ کا تربیت یافتہ ہے۔ اسکاؤٹنگ کی تحریک بھی ترقی پر ہے۔ شورائے ملی یعنی مرکزی مجلس وضع قوانین کا اثر اور وقار دن بدن بڑھ رہا ہے۔ اس مجلس کے اراکین صرف وہی لوگ ہیں جو حکومت اور رعایا دونوں میں یکساں اثر اور رسوخ رکھتے۔ جہاں تک ملک کی معاشی اور اقتصادی ترقی کا تعلق ہے یہ خبر مسرت و اطمینان کے ساتھ سنی جائے گی کہ علاقہ کوہ دامن میں معدنیات کا ایک گرانبہا ذخیرہ دریافت ہوا ہے اور حکومت غور کر رہی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے کیا ذرائع اختیار کرے۔

حوادث ترکیہ

جب سے جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا ہے ترکی اور جرمنی کے تجارتی تعلقات بڑھتے جا رہے ہیں۔ ترکی کی درآمد میں ۱/۴ حصہ صرف جرمنی کا ہے اور اگر برآمد کو ایک فرض کر لیا جائے تو اس کا ساتواں حصہ جرمنی کو بھیجا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرق قریبہ میں انگریزی تجارت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ ترکی میں جرمن مصنوعات کے مستقل اضافے کی بڑی وجہ سڑکوں، ریلوں اور پلوں کی تعمیر کا سلسلہ ہے جس میں حکومت انگورہ کو خاص طور سے انہماک ہے۔ البتہ ترکوں کا سب سے بڑا خطرہ روس کی طرف سے ہے۔ روسی ایجنٹ نہایت سرعت کے ساتھ روسی مصنوعات کو ملک میں پھیلا رہے ہیں اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ڈر ہے کہ تمام قوم روسیوں

کے تجارتی شکنجے میں گرفتار نہ ہو جائے۔

مصطفےٰ کمال پاشا کی بدولت بہت سے پیشے مفقود ہو گئے ہیں، اب ترکی میں کہیں بھی مسخروں اور خواجہ سراؤں کی جماعتیں نظر نہیں آتیں جن کا وجود کسی زمانے میں امراء کے لئے ناگزیر تھا۔ تھوڑے سے مسخرے اور خواجہ سرا جو اب باقی ہیں نہایت عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن اس معاشرتی انقلاب کا سب سے اہم نتیجہ وہ تغیرات ہیں جو ترکوں کے جذبات و عقائد میں واقع ہوئے ہیں۔ غازی پاشا نے حکم دیا ہے کہ تمام ابتدائی مدارس میں تاریخ کی تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جائے اور اس کو محض واقعات کی تشریح پر محدود نہ رکھا جائے بلکہ طالب علموں کو یہ بتایا جائے کہ ترکی قوم کی حیثیت دنیا میں کیا ہے۔ اسی جذبات کے ماتحت مصطفےٰ کمال پاشا نے حکم دیا ہے کہ ترکی قوم کی "پہلی صحیح" تاریخ مرتب کی جائے۔ اگر انگریزی اخبارات کی اطلاعات واقعی صحیح ہیں اور ان کا مقصد محض پروپگنڈا نہیں تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ غازی پاشا نے تاریخ کے متعلق جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے سراسر غلط ہے۔ ان کو چاہئے تھا کہ وہ تاریخ عالم کا اندازہ قرآن پاک کی روشنی میں کرتے۔ بہر حال غازی موصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ ترکی قوم ہی تھی جو ہمیشہ انڈو یورپین (ہندی یورپی) تہذیب کے پس پشت کام کرتی رہی ہے۔ بحر روم کے ارد گرد اور مشرق میں وقتاً فوقتاً جن تہذیبوں کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ یہ دراصل اسی تمدنی تحریک کے اثرات تھے جو سب سے پہلے ترکوں میں رونما ہوئی۔

اب ترکوں کی "جدید تاریخ ملی" اس غلط فہمی کا ازالہ کرے گی کہ ترک ایک تورانی النسل قبیلہ ہیں جنھوں نے ازمنہ متوسطہ میں ایشیائے کوچک میں آکر سیاسی قوت حاصل کی اور مشرقی یورپ کو اپنی خوفناک دستبرد سے پامال کر دیا۔ یہ خیال کہ ترک صرف لوٹ مار کرنا جانتے ہیں دراصل اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے جو عربوں نے پھیلائی تھی۔

کمال پاشا کا عقیدہ ہے کہ ترکی قوم کو تاریخ عالم پر ایک نہایت اہم درجہ حاصل ہے۔ تاریخ عالم کے ہر صفحہ پر ترکی قوم کا نقش موجود ہے۔ ترکی قوم کو تمام اقوام کی سیادت کا شرف حاصل ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن کی ابتدا ترکوں ہی سے ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کو بعض ایسے زمانوں سے بھی گزرنا پڑا ہے جو کچھ بہت زیادہ قابل ستائش نہیں ہیں لیکن یہ بہرحال ترکی قوم کی زندگی میں چند ناگوار لمحے تھے، جن کو ختم ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ اب انقلاب انگورہ کے ساتھ جس عہد کا آغاز ہوتا ہے اس کی تابانی اور درخشانی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ کمال پاشا کو یقین ہے کہ ترکی تاریخ کے اثری، لسانی اور عمرانیاتی مطالعے سے ان کے دعووں کی تصدیق ہو جائے گی۔ گویا ماضی کے متعلق اس جدید نقطۂ نظر کو اختیار کر لینے سے اب ترکوں کو بحیثیت ترک اپنے مستقبل کے متعلق کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔

رہا یہ سوال کہ مغربی علما غازی پاشا کے ان خیالات کو کہاں تک تسلیم کر لینے کے لئے تیار ہیں۔ اس کا جواب دینا بہت کچھ پیش از وقت ہے۔ ترکوں کا دعویٰ بہرکیف یہ ہے کہ ان کے قائم کردہ نظرئیے ناقابل تردید ہیں اور باعتبار تمدن ان کا مرتبہ یقیناً یونان سے بلند تر ہے۔ یونانیوں نے صرف اس کام کی تکمیل کی جس کی ابتدا ترکوں نے کی تھی۔

ابراہیم بیگ کی گرفتاری

ہندوستان کا اخبار بین طبقہ ابراہیم بیگ کے نام سے بےخبر نہ ہوگا۔ البتہ بیگ موصوف کی اصل حیثیت سے شاید بہت کم لوگ واقف تھے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلامی اخبارات اپنی اپنی مصلحتوں کے مطابق ابراہیم کو ڈاکو، رہزن، مجاہد اور سپہ سالار کے لقب سے یاد کرتے ہیں حالانکہ ابراہیم بیگ ترکستان کی اس ملی تحریک کا ایک زبردست رہنما تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وسط ایشیا میں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ جنگ عظیم کے دوران میں جب زار کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو وسط ایشیا نے ایک خودمختار سلطنت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ شکل اس لئے کہ جب تک انور پاشا مرحوم ترکستان نہیں آئے ہیں بخارا کی سیاست، اشتراکیت اور سرمایہ داری کی سازشوں کا مرکز

بن رہی تھی۔ افسوس ہے کہ ۱۹۲۲ء میں انور پاشا غازی شہید ہو گئے اور ترکستان کی اسلامی حکومت کا تصور حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔

اس حادثے کے بعد امیر بخارا نے بھاگ کر افغانستان میں پناہ لی اور روسی لشکر تمام علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں امیر بخارا نے ابراہیم بیگ کو عساکر اسلامیہ کا سپہ سالار مقرر کیا اور بیگ موصوف نے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ ترکستان کی تحریک ملی میں کچھ جان پیدا ہو جائے، مگر اب تمام اہم مقامات، راستے اور گزرگاہیں روسیوں کے قبضے میں تھیں اور انھیں جہاں کہیں اس تحریک کے آثار نظر آئے وہیں انتہائی سفاکی سے کام لے کر بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد کر ڈالیں۔ مجبوراً ابراہیم بیگ کو تاجیکستان کے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی اور دریائے آمو (جیحون) کے دونوں کنارے (اگرچہ جنوبی کنارہ افغانستان کی حدود میں شامل ہے) اس کی ترکتاز کا آماجگاہ بن گئے۔ ابراہیم بیگ کی قوت ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک زوروں پر تھی لیکن ۱۹۳۱ء کے موسم گرما سے اس کی طاقت دن بدن کم ہونا شروع ہوئی۔ ۲۲ جون کو روسی سرحد پر عساکر ابراہیمی نے شکست کھائی اور اس کے رفقائے کار علی مردان اور اسحٰق خاں گرفتار ہو گئے۔ ۲۳ جون کو خود ابراہیم بیگ کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور روسی حکام نے اسے تاشقند بھیج دیا۔

بولشویک اخبارات اور بولشویک حکام کا خیال ہے کہ ترکستان کی تحریک ملی ان سرمایہ دارانہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو مغرب میں روس کے خلاف جاری ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ ترکستان کی عام آبادی دل و جان سے اشتراکیت کی حامی ہے۔ مغرب کی سرمایہ دار حکومتوں کے لئے یہ کبھی ممکن نہیں کہ وہ اس سرزمین پر آئندہ اپنے خیالات کی اشاعت کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی اخبارات میں ترکستان کی تحریک ملی کو "باسمچی" تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا یعنی محض لوٹ مار کا سلسلہ جو مغربی سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں یا قدیم ترکستانی مفسدوں کی طرف سے جاری تھا۔

برعکس اس کے مغربی سیاسیات میں ابراہیم بیگ کو ترکستان کے جہاد آزادی کا آخری علمبردار تصور کیا جاتا ہے۔ فرانس کے ایک اخبار نے بیگ موصوف کی گرفتاری پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس بطل عظیم کا نام صفحات تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا" سیاسیین مغرب کا عقیدہ ہے کہ ترکستان کی تحریک ملی کے سامنے ہمیشہ ایک بلند نصب العین رہا ہے جس پر روسیوں نے برابر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ مسلمانان ترکستان کو انھوں نے جس طرح جبر و استبداد کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور ابراہیم بیگ اور اس کے رفقا کو بدنام کرنے میں انھوں نے جن ناپاک ارادوں کا اظہار کیا ہے ان کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جسے جریدہ اصلاح (کابل) نے تاس نیوز ایجنسی سے نقل کیا ہے۔ ابراہیم بیگ کی گرفتاری کی خبر اس روسی ایجنسی نے اس طرح شائع کی ہے کہ

"ازبکستان اور تاجیکستان پر جو باغی جماعتیں افغانستان سے حملہ آور ہو رہی تھیں ان کا قلع قمع ہو گیا ہے"۔

ممالک غیر

برطانوی انتخابات | برطانیہ کے جدید انتخابات ہو گئے۔ کنزرویٹو پارٹی کو توقع سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور لیبر اور لبرل جماعتوں کے ایسے نمائندوں کی تعداد بہت کم منتخب ہوئی جو مسٹر میکڈانلڈ کی قیادت میں ایک متحدہ قومی حکومت کے حامی نہ تھے۔ اس انتخاب میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ برطانوی سیاسی جماعتوں میں خود علیحدہ علیحدہ وہ یکجہتی نہ تھی جو پہلے ان کی خصوصیت رہی ہے۔

کنزرویٹو جماعت کا ایک حصہ تو اپنے باضابطہ قائد مسٹر بالڈون کا ہمنوا ہے جو سب جماعتوں سے سمجھوتے کے قائل اور موجودہ مالی اور سیاسی مشکلات کے زمانے میں سب سے مل جل کر ایک متحدہ قومی حکومت قائم رکھنے کے حامی ہیں لیکن دوسرا حصہ جس میں نیول چیمبرلین، امری اور چرچل کا اثر کارفرما ہے جلد سے جلد خالص کنزرویٹو وزارت کو برسر اقتدار لانے کا خواہاں ہے۔

لبرل جماعت جو پہلے ہی سے بہت کمزور تھی اس مرتبہ کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ سب سے آگے آگے تو سر جان سائمن کا گروہ تھا جس نے "قومی حکومت" کی حمایت کو اپنا اصول بنایا، اس لئے قومی حکومت کی حامی کنزرویٹو جماعت کی مدد انھیں حاصل تھی۔ دوسرا گروہ سر ہربرٹ سیموئل کا تھا جو اس وقت انتخاب کے مخالف تھے لیکن جب عام انتخاب کا فیصلہ ہو ہی گیا تو یہ اپنی وزارت سے دست کش نہ ہوئے۔ کنزرویٹو جماعت ان کی اس لئے سخت مخالف ہے کہ یہ زراعت و صنعت کے لئے تامینی محصول کے حامی نہیں ہیں۔ اُدھر لبرل جماعت کے سربرآوردہ رہنما مسٹر لائڈ جارج اس لئے ان سے خفا ہیں کہ انھوں نے بالآخر جدید انتخاب پر رضامندی کیوں ظاہر کی اور لبرل پارٹی کا جو فنڈ لائڈ جارج کے شخصی قبضے میں ہے اس سے اس جماعت کو کوئی مدد نہیں دی گئی۔ تیسرے گروہ میں لبرل پارٹی کا اکثر و بیشتر حصہ تھا جو قومی حکومت کی مخالفت اور تامین کے مقابلے میں آزاد تجارت کے اصول کی حمایت کر رہا تھا۔ لیکن لائڈ جارج کے پارٹی فنڈ سے یہ بھی محروم رکھا گیا۔ چوتھی جماعت خود لائڈ جارج کے معتقدین خاص کی ہے جو اپنے پرانے مخالفوں یعنی لیبر پارٹی والوں کی طرف مفاہمت و تعاون کا قدم اٹھا رہی ہے۔

لیبر پارٹی میں بڑی جماعت تو ہنڈرسن کے ساتھ تھی۔ اس پر ایک طرف تو قدامت پرستوں کی جانب سے خالص اشتراکی جماعت ہونے کا الزام تھا، دوسری طرف سے خود اس کے انتہا پسند ساتھی اسے سرمایہ داری کا بیجا حامی بتا رہے تھے۔ اس اس انتہا پسند جماعت نے (جو آزاد لیبر پارٹی کے نام سے مشہور ہے) اکثر جگہ خود لیبر کے امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کئے اور اس طرح لیبر کی کامیابی کے امکانات کو جو میکڈانلڈ اسنوڈن وغیرہ جیسے بااثر لوگوں کے نکل جانے سے پہلے ہی سے کم تھے اور بھی کم کر دیا۔ لیبر کا ایک مختصر سا گروہ میکڈانلڈ کے ساتھ تھا۔ انھوں نے اپنے لئے نیشنل لیبر کا نام تجویز کیا۔ لیکن پہلے ہی دن سے اس الزام سے بریت ان کے لئے مشکل رہی کہ ان کا سارا کام اپنے پرانے دشمنوں یعنی کنزرویٹو جماعت کی مالی مدد سے چل رہا ہے۔

لیبر پارٹی میں تفریق اور اشتراک کے امکانات | برطانیہ کی لیبر پارٹی میں پچھلے چند مہینوں میں جو اختلافات رونما ہوئے ان کا سمجھنا انگریزی سیاست کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ لیبر

پارٹی کے قائد اور انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ کو اس زمانے میں اپنی جماعت سے علیحدگی اختیار
کرنی پڑی، ان کا ساتھ وزیر مال مسٹر اسنوڈن اور مسٹر ٹامس نے دیا جو لیبر پارٹی کے بہت با اثر قائد تھے لیکن
ان تین تجربہ کار اور ہر دلعزیز قائدوں کا اثر بھی اپنی طرف لیبر پارٹی کے بہت کم حصہ کو کھینچ سکا اور پارٹی تقریباً
متفقہ طور پر مسٹر ہنڈرسن کے ساتھ رہی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک کی مالی مشکلات کو رفع کرنے کے لئے جو تدابیر نکالی گئی ہیں وہ یہ کہ اجرتیں
کم کی جائیں، سرکاری ملازمتوں میں تنخواہیں گھٹائی جائیں، بے کار مزدوروں کو ریاست کی طرف سے
جو بھتہ دیا جاتا ہے اس میں تخفیف ہو، تعمیرات عامہ اور سڑکوں پر جو خرچ ہوتا ہے اس میں ہاتھ روکا جائے، توازن
تجارتی کو درست کرنے کے لئے یعنی درآمد کو جو نسبتاً بہت بڑھ گئی ہے کم کرنے کے لئے آمدنی محصول
لگائے جائیں۔ مسٹر میکڈانلڈ اور ان کے ساتھی ان تجاویز کے حامی اور مسٹر ہنڈرسن اور ان کے
ہمنوا اس کے مخالف تھے اور لیبر پارٹی نے مسٹر ہنڈرسن کا ساتھ دیا۔

انگلستان کی لیبر پارٹی تقریباً تمام تر وہاں کے ٹریڈ یونین کے ممبروں پر مشتمل ہے۔ کہیں ۱۹۱۸ء
میں جا کر مسٹر ہنڈرسن کی کوشش سے اس میں کسی ٹریڈ یونین سے غیر متعلق آدمی کی شرکت کے
امکانات بڑھے، اسی وجہ سے اس پارٹی میں دماغی کام کرنے والوں کی تعداد دوسری جماعتوں
سے بہت کم ہے۔ ٹریڈ یونین کے ممبروں کے لئے کفایت کی یہ تجویز جس پر ان کے سابقہ قائدین
میکڈانلڈ، اسنوڈن اور ٹامس راضی ہو گئے ہیں ظاہر ہے کہ قابل پذیرائی نہیں ہو سکتی مزدور
یہ کیسے چاہے کہ اس کی اجرت کم ہو، کس طرح مان لے کہ مدتوں کی کوشش سے بیکاری کے بھتے
کی جو صورت پیدا ہوئی ہے اسے ختم کر دیا جائے اور اجتماعی مصارف کی تخفیف کے باعث کام
کے مواقع میں کمی ہو جانے کا خطرہ اوپر سے اپنے سر لیا جائے۔ لیکن مسٹر میکڈانلڈ اور ان کے ساتھیوں نے
اس کی حمایت کیوں کی؟ اس لئے کہ ان کی رائے میں اس مرغی کو مار نہ ڈالنا چاہئے جو سونے کا انڈا
دیتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نظام سرمایہ داری تب ہی قائم رہ سکتا ہے کہ کارخانوں کے مالکوں کو کافی
منافع ملتا رہے۔ اُدھر مسٹر ہنڈرسن کے ساتھی یعنی ٹریڈ یونین کے منظم مزدور صرف یہ دیکھتے ہیں کہ

اس طرزِ عمل سے ان کو فوری نقصان ہوگا اور آئندہ کی امیدیں موجودہ نقصان کے مقابلے میں قابلِ اعتبار نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ابھی تک افرادِ قوم میں آمدنیاں بہت غیر مساوی ہیں اور جب تک امیر و غریب کا یہ بین فرق موجود ہے اجتماعی ضروریات کا بار مالداروں پر ڈالنا اور اس سے غریبوں کو فائدہ پہنچانا چاہئے۔

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ مسٹر ہنڈرسن اور ان کے ساتھی اس بات سے ناواقف ہیں کہ اگر مالکان کارخانہ پر بار برابر بڑھتا گیا تو صنعت کے فوائد ختم ہوجائیں گے اور نظام سرمایہ داری کا خاتمہ ہوجائے گا، ان میں بعض یہی چاہتے ہیں کہ اس نظام کا خاتمہ ہو اور جلد ہو۔ بعض جو ذرا محتاط ہیں کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ صنعتی کارخانوں کے مالکوں ہی پر بار بڑھایا جائے۔ بے گنتی مالدار لوگ ہیں جن کے پاس سرمایہ جمع ہے اور وہ اس کے سود سے چین کرتے ہیں، جب روپیہ کی قیمت بڑھے یعنی چیزیں سستی ہوجائیں اور شرح سود وہی رہے تو گویا ان سود کھانے والوں کی آمدنی بیٹھے بیٹھے بڑھ جاتی ہے۔ ان پر خاص ٹیکس لگانا چاہئے۔

وہ گروہ جو سرمایہ داری کا خاتمہ چاہتا ہے۔ مسٹر میکسٹن کے زیرِ قیادت ہے۔ ان کے ساتھ بہت سے قابل لوگ ہیں لیکن ان کا اثر ابھی بہت کم ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب نظام سرمایہ داری میں اس کی گنجائش نہیں رہی ہے کہ مالکوں کو منافع بھی ہوتا رہے اور مزدوروں کی اجرتیں بھی بڑھتی رہیں۔ مسٹر میکڈانلڈ اور انکے ساتھیوں کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن ایک اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ سرمایہ داری کے نظام کو ختم کردینا چاہئے، اور دوسرا یہ کہ نظام سرمایہ داری پر سے بوجھ ہلکا کرکے اسے چلائے جانا چاہئے۔ لیبر پارٹی کی اکثریت نہ اُن کے پاس ہے نہ اِن کے۔ وہ ابھی نہ انقلاب کی ہمت رکھتی ہے، نہ بوجھ ہلکا کرنے، اجرتیں گھٹانے پر آمادہ ہے۔ لیکن بہر صورت اس اکثریت کو مسٹر میکڈانلڈ اور انکے ساتھیوں کے ساتھ کوئی زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ ٹریڈ یونین کے اراکین اپنی اجرتیں نہیں گھٹنے دیں گے اور اگر معاشی حالات نے جلد سنبھالا نہ لیا جس کی فی الوقت کوئی توقع نہیں ہے تو غالباً چند ہی سال میں یہ اکثریت سرمایہ داری کے اصولاً خلاف ہوکر بالکل اشتراکی پروگرام اختیار کرے گی۔ اس لحاظ سے بہت ممکن ہے کہ مستقبل کا مورخ اس انتخاب کو

انگلستان میں انقلابی اشتراکیت کی ابتداء سے تعبیر کرے۔

منچوریا پچھلے مہینے کے اہم واقعات میں وہ جنگ بھی ہے جو چین اور جاپان کے درمیان منچوریا میں شروع ہوگئی ہے۔ انجمن اقوام اس جھگڑے کو ختم کرنے کی جو کوشش کر رہی ہے اس میں کبھی کامیابی کی امید ہو جاتی ہے کبھی مایوسی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ آخری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ منچوریا میں ایک جمہوریت کے قیام کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ بھی خبر آئی ہے کہ جاپان نے انجمن اقوام کا ایک تحقیقاتی کمیشن قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ لیکن بظاہر اگر یہ جنگی کارروائی ختم بھی ہو گئی تو وہ اسباب آسانی سے نہیں مٹ سکتے جن کا صرف ایک پہلو اس تنازع سے ظاہر ہوتا ہے۔

جاپان منچوریا میں اپنا اقتدار چاہتا ہے اور مختلف معاہدوں کے ذریعے وہاں ایسے حقوق حاصل کر چکا ہے کہ ایک صدی تک کے لئے قانوناً وہاں قدم جمائے رکھنے کا سامان موجود ہے۔ روس بھی بحرالکاہل پر اپنا اثر رکھنے کے لئے اور وہاں کے سب سے قریب کے راستے پر قابض رہنے کے لئے متفکر ہے لیکن جاپان کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ جاپان خود بھی اُس سے چھیڑ کرنا نہیں چاہتا اور سمجھوتے سے اسے خاموش رکھنا چاہتا ہے۔ امریکہ جس کے لئے چین بڑی منڈی ہے، چاہتا ہے کہ چین کا تسلط قائم رہے اور جاپان کو غیر معمولی تفوق حاصل نہ ہونے پائے۔ اُدھر چین دیکھتا ہے کہ اس کے جسم کا ایک عضو ہمیشہ کے لئے جدا کیا جاتا ہے مگر کمزور اور بے بس ہے۔ معاہدوں کا واسطہ دیتا ہے انجمن اقوام سے التجائیں کرتا ہے لیکن کمزور کی التجائیں سیاست میں کب کام دیتی ہیں، البتہ امریکہ، روس وغیرہ کے اغراض اس کے آڑے آئیں تو آئیں، یا پھر خود اس کی طرف سے جاپانی مال کا بائیکاٹ۔ سنہ ۲۸ء میں جاپان کی برآمد کا ۲۴ فیصد سے زیادہ چین جاتا تھا سنہ ۳۱ء میں یہ گھٹ کر ۴ فیصدی رہ گیا تھا۔ اگر اب بائیکاٹ نے سخت صورت اختیار کر لی تو جاپان پر خاصا اثر پڑ سکتا ہے جس کی مالیات کی حالت کچھ بہت اچھی نہیں ہے اور گزشتہ موسم گرما میں میزانیہ حکومت کی ترتیب میں اچھی خاصی دشواری کا سامنا کیا جا چکا ہے۔

منچوریا میں معیشت و سیاست کی ایسی گتھیاں ہیں کہ انکا تفصیل سے بیان کرنا معاملات کی اہمیت سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ اگر ہو سکا تو کسی آئندہ اشاعت میں اس پر جداگانہ مضمون ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

تلافی!

منصور، ایک سرمست شباب نوجوان تھا، رگوں میں جوانی کا خون موجزن، سر میں عشق و ہوس کا سودا، اور دل میں کسی کے چاہنے کی آرزو، پھر طرہ یہ کہ عہدہ قضا پر مامور، نہ فکر امروز نہ غم فردا، مزید اتفاق یہ کہ مکان ہی کے پاس ایک خاندان نے اقامت اختیار کی جس کا ہر فرد "دشمن ایمان و آگہی" اور "رہزن تمکین و ہوش"، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پیکر رعنائی سے آنکھ لڑی جس نے پیام و سلام کی صورت اختیار کی، پیام و سلام، اختلاط و ارتباط میں بدلا، اور اختلاط و ارتباط نے اپنے "نتائج" ظاہر کئے، اور بالآخر عشق و محبت کا یہ المیہ بھی اسی طرح ختم ہو گیا جس طرح آدم و حوا کے فرزند، ہوا و ہوس کے اسٹیج پر اپنے کمالات فن کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔

نوشابہ کامرانی وصل کے بعد اپنے عزلت کدہ میں جب واپس آئی، تو ایک آتش سوزاں تھی جو اس کے دل و جگر کو خاک سیاہ کئے دیتی تھی، اور ایک غم تھا جو اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا، آتش سوزاں تو بہرحال "غم پنہاں" کی صورت اختیار کر سکتی تھی، لیکن اس لذت وصل کی یادگار کو، جو عنقریب پردۂ ظہور پر رونما ہونے والی تھی کیونکر چھپایا جا سکتا تھا؟ "آج" اس "یادگار" کے اثرات و نقوش کو چشم عالم سے پوشیدہ رکھا جا سکتا تھا، لیکن "کل" جب وہ یادگارِ عہد ہوس اس عالم خاکی میں آنے پر مچل رہی ہوگی تو دنیا والوں کی آنکھ کون بند کرے گا؟

یہ تھے وہ خیالات و تاثرات جنھوں نے نوشابہ کی نیند حرام کر دی تھی، افکار و ہموم کی اس تراوش مسلسل نے اس کا سر، رنج بالیں اور اس کا تن بار بستر بنا رکھا تھا، ہوش و حواس اسے جواب دے چکے تھے۔ اب اسے فرار کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہ آتا تھا۔

آخر ایک تیرہ و تار رات میں اس کے ارادے نے عزم کی صورت اختیار کر لی، اس

نے چادر اوڑھی اور اپنے تئیں اس شب بلا کے سپرد کر دیا، اس قطع مسافت کے بعد وہ ایک ویران وسنسان مقام پر پہنچی جہاں اسے ایک کھنڈر مل گیا جس میں وہ ٹھہر گئی، اس کھنڈر میں وہ تن تنہا تھی، نہ کوئی رفیق تھا نہ ہمدم، اگر رفیق تھا تو وہ غم جس نے دل کی دنیا تاراج کر دی تھی، اگر ہمدم تھا تو وہ یادگار عہد نشاط جو عنقریب عالم وجود میں آنیوالی تھی۔ اب کون تھا جو اس کی غمخواری کرتا؟

ہاں نوشابہ کی ماں تھی جو اس کی ذراسی تکلیف پر بیقرار ہوجاتی تھی اس کی پریشانی پر پریشان ہوتی تھی، اس کے رونے پر اس کے آنسو بھی اختیار سے باہر ہوجاتے تھے، لیکن اب تو وہ اس نعمت سے جدائی اختیار کر چکی تھی۔

اس کا باپ تھا، جس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی نوشابہ کو کامیاب وکامراں اور بامراد و شادکام دیکھے لیکن وہ تو اس کے ہاں سے ہجرت کر چکی تھی۔

اس کے نوکر چاکر تھے، کوئی اس کے سرھانے بیٹھ کر کہانی کہتا، کوئی پاؤں دابتا کوئی کچھ کرتا کوئی کچھ کرتا، لیکن اب تو وحشت وتنہائی اس کے جلو میں حاضر تھی۔

وہ اعزاز واکرام کی مالک تھی، جو اس کے لئے سرمایہ تسکین وتسلی تھا، اس کا دل فخر و سرور سے لبریز رہتا اور اس کی گردن رشک وافتخار سے سربلند، لیکن اب تو وہ اس سے بھی محروم ہو چکی تھی۔

اسے آرزو تھی کہ اس کی حیات ازدواجی ایک کامیاب نمونہ ہو، لیکن آہ! کہ دست برد زمانہ سے یہ آرزو بھی ناکامی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

یہ تھے وہ خیالات وافکار جو صبح وشام، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے۔ اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتے، ایک روز جب وہ اپنے مصائب ونوائب کی علت پر غور کر رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ یہ منصور ہی ہے جس نے میری زندگی تباہ کی، اس نے پیمان محبت باندھا ہمیشہ کے لئے تھا لیکن توڑ فوراً دیا، اور آج میں ہوں، اور تنگنائے حیات کے یہ روح فرسا شدائد۔

وہ انھیں خیالات میں مستغرق تھی کہ غم وغصہ سے اس نے اپنے پہلو میں ایک آگ سی

سلگتی محسوس کی، اسے غصہ آرہا تھا کہ منصور جو حقیقتہً اس کا قاتل ہے، کس مزے سے زندگی بسر کر رہا ہے، اسے انسانی سوسائٹی پر غصہ آرہا تھا کہ وہ "قاتل" کا تعاقب کیوں نہیں کرتی، سراغ کیوں نہیں لگاتی اور اسے بستۂ زنجیر و رسن کیوں نہیں کرتی؟

دن گزرتے رہے اور ایک دن وہ وقت آن پہنچا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، یعنی نوشابہ کو دردِ زہ شروع ہوا، اور تھوڑی دیر کے بعد ایک بچی عالم وجود میں آ ہی گئی، اس طرح کہ نوشابہ کے چپ و راست کوئی نہ تھا جو اس کی خبر گیری کرتا جو اس انتہائی کرب و پریشانی کے عالم میں اس کا یار و مددگار بنتا، ہاں ایک بڑھیا تھی جو حق ہمسائگی ادا کرنے کے لئے تھوڑی دیر کو آ گئی تھی اور اس بیچاری سے جو کچھ بن پڑا کیا، لیکن تھوڑی کے بعد وہ بھی چلی گئی، اور اب غریب نوشابہ پر جو گزرتی تھی گذری، جو پیش آنا تھا پیش آیا۔

نوشابہ اپنے اس جدید مہمان سے جو اس کارگاہ عالم میں اسے سب سے زیادہ محبوب تھا، بہت دل تنگ تھی، ایک رات کو وہ بیٹھی ہوئی تھی، بچی اس کی گود میں پڑی سو رہی تھی، اور نوشابہ اپنا سر اپنی ہتھیلی پر ٹیکے ہوئے بیٹھی تھی، اس قفل خاموشی کو اس نے خود توڑا، اور خود بخود کہنے لگی، "کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا۔ کاش میں عالم وجود میں، نہ آئی ہوتی! اگر میں پیدا نہ ہوئی ہوتی تو یہ دکھ کیوں سہتی؟ اس دنیا میں اگر کوئی ایسی ہستی ہے کہ جس کے وجود سے عدم بہتر ہے، تو بلاشبہ وہ میری ہستی ہے، آج سے قبل تک تو میں اپنے ننگ حیات وجود سے دنیا کو پاک کر سکتی تھی، لیکن اب؟ اب میرے لئے کیا چارہ کار رہ ہے؟ کیا میں خودکشی کر لوں؟ لیکن اس بچی کا کیا ہو گا؟ کیا میرے لئے یہ مناسب ہو گا کہ اس معصوم بچی کے لئے میں اپنی ناشاد زندگی گزارتی رہوں؟ لیکن میں اگر زندہ رہنا بھی چاہوں تو موت تو میری تاک میں ہے وہ مجھے کیوں چھوڑنے لگی؟ وہ تو مجھے قبر تک پہنچا کے رہے گی، لیکن میرے بعد اس بچی کا کیا حال ہو گا؟ میرے بعد وہ اپنی کم بخت زندگی کچھ دن گزارے گی، لیکن کس جرم کی پاداش میں وہ یہ مصیبتیں جھیلے گی؟ کس گناہ کی اسے یہ سزا دی جائے گی؟ اس کی خطا سوا اس کے او۔

کیا ہے کہ میں اس کی ماں ہوں؟
اب وہ اپنی بچی کی طرف مخاطب ہوئی اور کہنے لگی،
"میری بچی! کیا تو اس لئے زندہ رہے گی کہ جب میری داستان حسرت سنے تو میرے لیے مغفرت کی دعا کرے؟ اب تو میرے پاس زیور بھی کچھ نہیں رہے جو دو ایک ٹوٹی پھوٹی چیزیں ہیں انھیں بھی آج کل میں بیچ دوں گی، پھر اس کے بعد تیرا کیا حال ہوگا؟ تیری کون خبر لے گا؟

یہ تو ناممکن ہے کہ میں اپنے والد کے پاس واپس جاؤں اور انھیں اپنا قصہ درد سناؤں، وہ تو مجھے رو چکے جس طرح مُردوں کو روتے ہیں۔ میں اسے اچھا سمجھتی ہوں کہ میری موت پر رو یا جائے نہ اس کے کہ میری ناپاک زندگی پر آنسو بہائے جائیں۔
نوشابہ اسی طرح اپنے دل سے اور اپنی بچی سے باتیں کرتی رہی تھوڑی دیر کے بعد اس کا یہ سیلاب غم کم ہوا تو سیل گریہ نے اس کی جگہ لے لی۔ گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے کمزور اور ناتواں لوگوں کے دل کی بھڑاس نکلتی ہے۔ بقول غالب۔

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر!

دن گزرتے رہے اور نوشابہ نے اپنی تمام پونجی بیچ ڈالی۔ اب نہ اس کے تن پر کپڑا تھا نہ ہاتھ میں پیسہ۔ ہاں ایک پھٹی پرانی قمیص، ایک پاجامہ، ایک برقعہ، بس یہی وہ کل کائنات جو نوشابہ اور اس کی کمسن بچی کے دست قدرت میں تھی۔
رات اور زیادہ ایذا رسانیوں کے ساتھ آئی۔ نوشابہ نے برقعہ اوڑھا اور چل کھڑی ہوئی سڑکوں کو طے کرتے کرتے گلیوں میں پہنچی لیکن برابر چلتی رہی۔ اس قطع مسافت سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ غم و آلام سے نجات پائے، لیکن غم تھا کہ اس کا پیچھا کر رہا تھا، اس کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔

اتفاقاً ایک کٹنی کی نظر اس پر پڑ گئی، وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لی اور نوشابہ کے ساتھ ساتھ اس کے کھنڈر میں داخل ہو گئی، دلدہی اور دلداری کے لہجے میں نوشابہ سے اس کا حال پوچھنے لگی، وہ بیچاری غم کی ماری، درد کی ستائی، کسی ہمدرد کو ترس گئی تھی، اس نے اس کٹنی کے لہجے میں رفق و ملائمت کے آثار جو دیکھے تو ابل پڑی اور دل میں جو کچھ تھا سب ہی کچھ کہہ ڈالا، اپنے عہد نشاط کے قصے بھی سنائے اور اپنی داستان غم بھی۔ کٹنی بھانپ گئی کہ اچھا شکار ہاتھ آیا ایک تو یہ لڑکی یوں ہی حسن و جمال، رعنائی و زیبائی میں بے نظیر ہے۔ پھر اگر میں نے اس کی خور و پرداخت کی، کھلایا پلایا اور اچھی طرح سے رکھا تو سونے پر سہاگا ہو جائے گا۔ اور پھر میں اپنی ساری زندگی بڑے مزے میں اس کے ذریعے سے تیر کر دوں گی، آخر باتیں بنا بنا کے اسے بہلا پھسلا کے وہ اپنے گھر لے گئی، یہاں شروع شروع تو نوشابہ کی خوب آؤ بھگت ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کر لیا کہ وہ اس کٹنی کے دام حرص و ہوس میں بے طرح اسیر ہو گئی ہے اور اس بلا سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔

یہاں وہ اپنی پہلی زندگی سے بھی زیادہ نامراد و تباہ حال زندگی بسر کر رہی تھی، اس لئے کہ یہاں کوئی وقت ایسا نہیں تھا جب وہ خون جگر نہ پیتی ہو، یہاں کے حالات نے اس کی نیند اڑا دی تھی، راتوں کے جاگنے سے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا اور وہ بیچاری ان درندہ صفت انسانوں کے اختلاف طبائع اور تنوع اخلاق کو بھی برداشت کرتی تھی جو اس کٹنی کے بلانے سے آتے تھے اور اسے پریشان کیا کرتے تھے، اور جب کوئی چارہ کار نہ دیکھا تو مایوس ہو کر اس نے

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

پر عمل شروع کیا۔

کچھ دن اگر یہ حالت بھی قائم رہتی تو نوشابہ اس پر بھی قانع ہو جاتی لیکن اس پر تو مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، ایک شخص جو اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اپنی ناکامی کے بعد اسے پریشان کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس نے تہمت لگائی کہ نوشابہ نے میرے

درہموں کی تھیلی چرالی ہے، اور صرف تہمت ہی نہیں لگائی، قاضی کے ہاں مقدمہ بھی پیش کردیا اور ان عورتوں کو جو اس کے حسن وجمال اور دیگر محامد و محاسن کی بنا پر خار کھائے بیٹھی تھیں گواہی کے لئے بھی آمادہ کرلیا۔

پیشی کا دن آیا اور نوشابہ عدالت کے کٹہرے میں لاکر کھڑی کردی گئی، اس کی گود میں اس کی بچی تھی جو اپنی عمر کی سات منزلیں طے کرچکی تھی، قاضی آیا اور اس نے مثلیں دیکھ دیکھ کر اپنی رائے اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ نوشابہ کی باری آئی وہ کرسئ عدالت کے پاس لاکر کھڑی کی گئی، اس نے جو قاضی صاحب کو دیکھا تو شدت تحیر سے نقش بہ دیوار بن گئی، اس لئے کہ اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی ہوا و ہوس کی وہ شکار ہوئی تھی جو اس کی ان مصیبتوں کا اصل سبب ہے، جو اس کی ان تباہ حالیوں کی اصل علت ہے، آخر اس سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ یک بیک چیخ اٹھی جس سے عدالت کا کمرہ گونج گیا، اس نے کہا،

"جناب قاضی صاحب! یہ آپ کے شایاں شان نہیں کہ آپ میرے مقدمے میں حکم بنیں، اس لئے کہ ہم دونوں میں سے ہر ایک چور بھی ہے اور خائن بھی، خائن کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ خائن کے محضر سزا پر دستخط کرے، ایک چور کب اس کا مستحق ہے کہ وہ دوسرے چوروں کو سزا دے؟"

نوشابہ کی بے باکانہ گفتگو سے قاضی عدالت اور حاضرین مجلس، سب دنگ رہ گئے، قاضی صاحب اس گستاخی پر بہت برہم ہوئے اور فوراً چپراسی کو حکم دیا کہ وہ اسے کٹہرے سے باہر کردے، لیکن قبل اس کے کہ ایسا ہو نوشابہ نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا، اب جو قاضی صاحب کی نظر پڑی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے، ایک نظر میں انھوں نے سب کچھ بھانپ لیا، گزشتہ عہد کی ہوسناکیوں کا ایک ایک مرقع آنکھوں کے سامنے آگیا، اس صورت حال نے سارے بدن پر لرزش طاری کردی، اور وہ کرسی پر اس طرح ساکت وصامت ہوگئے جس

طرح مردہ بستر مرگ پر، اس موقع سے فائدہ اٹھاکر نوشابہ نے اپنا سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:
"میں نے مال چرایا ہے اور تم نے آبرو پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ آبرو مال سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے لہذا تم مجھ سے کہیں زیادہ مجرم ہو، جو مال چرائے، وہ اپنے جرم کی تلافی مال واپس کرکے یا کسی اور دوسرے طریقے سے کرسکتا ہے، لیکن جس عورت کی آبرو پر ڈاکہ ڈالا گیا ہو بتاؤ اس کی تلافی کیونکر ممکن ہے؟ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ آبرو جا کے واپس نہیں آتی؟ اگر تم نے میری متاع آبرو تاراج نہ کی ہوتی تو آج میں ان حالوں کو نہ پہنچتی، اٹھو، اپنی کرسی کسی دوسرے کیلئے چھوڑ دو اور آؤ، میرے پاس کھڑے ہو جاؤ، تاکہ کوئی قاضی عادل ہم دونوں کا محاکمہ کرے، کہ جرم ایک ہی ہے جس کا مجرم یقیناً صرف تو ہے، اور میں ناحق اس میں شامل کی گئی ہوں۔
ہاں شریعت جانتی ہے کہ ہم دونوں کا جرم مشترک ہے، پھر بھی میں اس کٹہرے میں پابجولاں کھڑی کی گئی ہوں، اور تم عدالت کی کرسی پر متمکن ہو؟ کیا شریعت (نعوذ باللہ) ظالم ہے، کیا وہ عدل و انصاف کے صفات سے معریٰ ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میں "یہاں" کیوں ہوں؟ اور تم "وہاں" کیوں ہو؟
جب میں یہاں داخل ہوئی ہوں تو میں نے تمھیں اس حال میں دیکھا کہ حاجب تمھارے آگے آگے منادی کر رہا ہے کہ قاضی صاحب جمیع القاب بنہضت فرمائے عدالت ہوا چاہتے ہیں لوگ تمھارے خیر مقدم کے لئے اٹھ رہے ہیں، غرض ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے کہ قاضی صاحب آرہے ہیں، قاضی صاحب آرہے ہیں؛ اور اپنے کو اس حال میں پایا کہ آنکھیں آنسوؤں کے قطرے گرا رہی ہوں دل ہے کہ سوز غم سے جلا جارہا ہے، تو میں نے اپنے دل میں کہا، یاللعجب، القاب و خطابات کا کتنا غلط استعمال ہو رہا ہے؟ اور یہ عالم کتنی بڑی گمراہی میں مبتلا ہے؟ کتنی بڑی جہالت اس پر طاری ہے؟
وہ لوگ کیسے ہیں جو تمھارے علم و فضل پر شہادت دیتے ہیں؟ تمھارے اخلاق و آداب کی تعریف میں رطب اللساں ہیں؟ وہ لوگ کتنے احمق ہیں جنھوں نے تمھیں اس منصب بلند پر سرفراز

کیا ہے۔ تمہارے ہاتھ میں قانون دے رکھا ہے اور تمہارے سامنے سپاہیوں کا یہ دستہ متعین کر دیا ہے کہ جو تمہارے احکام بجا لائیں، تمہارے فرامین نافذ کریں اور تمہاری خواہشات پوری کریں۔

تمہارے اور تمہارے ہم مشرب لوگوں کے لباس فاخرہ کے اندر بھی ویسا ہی خبیث دل ہے جیسا میرے ان چیتھڑوں کے اندر ہے۔ ہم میں جو جرائم پیشہ کہلاتے ہیں، اور تم میں جو بلند سے بلند مناصب پر فائز ہو، کوئی فرق نہیں، سوا القاب و خطابات کے، وضع و لباس کے۔ اس کے باوجود یہ ستم ظریفی دیکھو کہ تم قاضی ہو، اور میں، مجرم۔

میں یہاں اس لئے لائی گئی ہوں تاکہ حضور قاضی صاحب، مجھے سزائے زندان کا حکم دیں، لیکن میں حضور قاضی صاحب سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اس سے قبل جو جور و ستم مجھ پر ہو چکے ہیں کیا وہ ابھی تشنۂ تکمیل ہیں؟ جو مزید الطاف و عنایت کی ضرورت ہے

تمہاری بزم نشاط پر میری بیکسی کی یاد سے کبھی اداسی نہیں چھاتی؟ کیا تمہارے سینے میں پتھر کا دل ہے جو کسی طرح میرے لئے پسیجتا ہی نہیں؟ اگر تمہارے تعلقات کا نتیجہ زیر آمد ہو چکا ہوتا تو میں کب کی اپنی جان، جان آفریں کو سپرد کر چکی ہوتی، لیکن اس بچی کو دیکھو یہ میرے تمہارے درمیان ایک وسیلہ ہے جو ابھی تک باقی ہے۔

منصور نے یہ سب سن کر اپنا سر اٹھایا، اپنی بچی کی طرف پیار و محبت کی نظر سے دیکھا اور اپنے دل میں طے کر لیا کہ وہ مظلوم نوشابہ کے ساتھ انصاف کرے گا، لیکن اس وقت اس نے اپنا فیصلہ یہ سنایا کہ یہ عورت پاگل ہو گئی ہے، پہلے اس کا مداوا ہونا چاہئے، پھر مقدمہ دیکھا جائے گا۔ لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔

عدالت برخاست ہوئی وہ اپنی کرسی سے اٹھا لیکن اس حال میں کہ نہ وہ دل کا مالک تھا نہ دماغ کا۔ چند دنوں تک وہ اپنے فرائض منصبی انجام دیتا رہا پھر اس نے بعذر علالت اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔

استعفیٰ دینے کے بعد اسے اپنی نوشابہ کی جستجو ہوئی، آخر اس نے اسے پالیا اور اسے لے کر ایک دوسرے شہر میں چلا گیا، جہاں کوئی بھی ان دونوں سے واقف نہ تھا، وہاں اس نے باقاعدہ نوشابہ سے نکاح کر لیا۔

منصور، اب "پاپ کی بستی" سے "پریم کی نگری" میں آگیا تھا، یہاں اس کی اور نوشابہ کی زندگی بڑے سکھ سے بسر ہو رہی تھی، نوشابہ کو اس کا "پیتم" بڑے دُکھ سہنے کے بعد ملا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، منصور جب پریم کی بانسری بجاتا، تو سارا سنسار مست ہو جاتا، کوئل جب پکارتی "پی کہاں"، تو نوشابہ مسکرا کے بول اٹھتی "پی یہاں"۔

منصور کے طرز عمل نے پچھلی تمام باتوں کا کفارہ کر دیا تھا، وہ گزرا ہوا زمانہ انھیں بھولے سے بھی نہ یاد آتا۔ (ترجمہ از، النظرات، للنفلوطی)

تنقید و تبصرہ

کتب:

ارتقار ۔ مشاہدات سائنس ۔ تاریخ امریکہ ۔ گلدستہ نعت فضیلت مکہ ۔ دنیا کی حور ۔ اساس منطق

ارتقار | مصنفہ مشتاق احمد وجدی صاحب۔

یہ ایک مختصر ۱۰۵ صفحے کی کتاب انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہے اور مسلم یونیورسٹی پریس میں چھپی ہے۔ مجلد۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۸ ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ۔ غلطیوں سے پاک ہے۔ قیمت ۱۲ ہے۔

کتاب کی زبان بہت صاف اور پیچیدہ ترکیبوں سے پاک ہے۔ علمی کتابوں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ زبان سہل اور سلیس ہو۔ مگر پھر بھی چند غیر مانوس الفاظ آگئے ہیں جو تشریح کے محتاج ہیں۔ مثلاً اپچ مایہ، منقلب پتھر، باردی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کن علمی اصطلاحوں کے تراجم ہیں۔ ایسی کتابوں میں ہمیشہ ایک فرہنگ ہونی چاہئے جس میں انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ اور بعض حالتوں میں تشریح ہوا کرے تو مناسب ہو۔

فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ مگر کتاب میں کوئی باب نہیں ہے، بسم اللہ جو شروع کی ہے تو تتمہ پر جاکر دم لیا ہے اور ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئے۔ اگر مختلف ابواب میں یہ کتاب تقسیم ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ باوجود ان باتوں کے اس کتاب کی معنوی خوبیوں میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ کتاب کے باوجود اتنے اختصار کے

مسئلہ ارتقا پر نہایت عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ جو ایک انجان آدمی کے سمجھانے کے لئے بھی کافی ہو۔ عوام اس مسئلے کا لب لباب یہ سمجھتے ہیں کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔ یہ غلط فہمی ہندوستان ہی تک محدود نہیں بلکہ یورپ میں بھی ہے اور عوام کیا خواص بھی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ کتاب کے پڑھنے سے ثابت ہوتا ہو کہ جب یہ نظریہ الفرڈ ولیس اور چارلس ڈارون نے اول اول پیش کیا تو خود یورپ میں اس کی سخت مخالفت ہوئی اور اب بھی ہے اور ایسے ایسے سائنسداں جیسے کہ لارڈ کیلوں اس کے مخالف ہو گئے اور ایسے فلسفی اور مدبر اور ادیب جیسے رسکن۔ گلیڈسٹون۔ ڈسرائیلی سالسبری اور نیومن اور کارلائل اس کے خلاف رائے زنی کرتے تھے۔ حالانکہ ان میں سے بعض سائنس کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ اگر ہمارے اکبر مرحوم نے اس کا مذاق اڑایا تو کوئی نئی بات نہیں کی۔

کتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ تھیلز اور انا کسمنڈر قدیم یونانی حکما اس کی ابتدائی اصول بتا چکے ہیں۔ مولانا روم اپنی مثنوی میں بار ہا اشارہ فرماتے ہیں۔ خود قرآن شریف بھی انسان کو خاک کا تپلا قرار دیتا ہے مگر جس بات کا سہرا ڈارون اور ولیس کے سر بندھا ہے وہ یہ ہو کہ انھوں نے ارتقار کو سائنس کے قالب میں ڈھال کر اس کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اور اسے فلسفے کی حد سے نکال کر سائنس کی ترازو میں تولا ہے۔ فاضل مصنف نے یونانی اور ہندی فلسفے کا بھی ابتدا میں حوالہ دیا ہے۔

کتاب اگرچہ بہت صاف زبان میں ہے مگر پھر بھی بعض جگہ مثالوں کی کمی ہے خصوصاً جہاں مدارج حیات کا ذکر ہے۔ ایسے نظریے میں مثالیں کم ہوں یا واضح نہ ہوں تو اسے صرف اہل فن ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ایک خاص کمی یہ بھی ہے کہ اس میں تصویریں نہیں ہیں۔ ارتقار کے مختلف مدارج کے لئے سمجھانے کے لئے ان کا ہونا ضروری تھا، مگر غالباً فاضل مصنف اردو دنیا کی چیرہ دستیوں سے خوب واقف ہیں یا کہ یہ آدمی کو نہ معلوم کیا بنا دیتے۔ اور شاید خود مسئلہ ارتقا میں ان کی بدولت انقلاب پیدا ہو جاتا اور ڈارون کی روح کاتب کو دعائیں دیتی۔

کتاب کے آخر میں ایک تمہ ہے جس میں مسئلہ ارتقا کے اخلاقی اور مذہبی پہلو سے بحث کی ہے۔ اسپنسر کا ہر چیز میں ارتقا کا جلوہ دیکھنا دراصل مسئلہ ارتقا کی ہمہ گیری کی دلیل ہے۔ باوجودیکہ وہ خود ارتقائے حیاتی سے ناواقف تھا۔ یہ بحث دلچسپ ہے۔ اور برگساں کا فلسفہ اس فلسفہ کو روحانی سانچے میں ڈھالتا ہے مگر اس سلسلے میں ہم کو مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ جب ایک عالم دوسرے علم پر خامہ فرسائی کرتا ہے تو اور زیادہ دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ جو اعتراض فاضل مصنف نے اور خود ہم نے لارڈ کیلون (طبیعی) اور گلیڈسٹون وغیرہ پر کئے ہیں وہ اپنا میدان چھوڑ کر کیوں دوسرے خار دار جنگل میں پھنستے ہیں اور اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں اسی طرح فاضل مصنف اگر تمہ نہ لکھتے تو فلسفے کے اور مذہب اور اخلاق کی پیچیدگیوں میں نہ الجھتے جن کو وہ بہ خوبی نہ سلجھا سکے - اس کا ثبوت اُن کے آخری فقرے سے ملتا ہے لکھتے ہیں -

" . . . . . یہ نیا مذہب نماز، روزہ اور گنڈے تعویذ کی توہم پرستیاں بھلا کر ہمیں رنج و غم، جہالت اور توہم پرستی سے جنگ کرنے اور دنیا میں مسرت اور شادمانی کا دور لانے کی کوشش میں مصروف رکھے گا " گنڈے تعویذ کہیں مذہب میں داخل نہیں ہیں۔ نماز روزہ عبادات ہیں جسے ہر مذہب نے کسی نہ کسی صورت میں سکھایا ہے اور یہ بھی عبادت کی ارتقائی صورتیں ہیں -

بہرحال کتاب بحالت مجموعی نہایت دلچسپ ہے اور اس قابل ہے کہ جو شخص مسئلہ ارتقا سے واقف ہونا چاہئے وہ اسے ضرور پڑھے - (م - ع - ح)

مشاہدات سائنس | مصنفہ محمد عمر صاحب حسنی سی - ای وغیرہ انجنیر جوناگڈھ - حجم ۲۲۴ صفحے قیمت ۴/ع

ناظرین جامعہ کے لئے سید محمد عمر حسنی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ اکثر

سائنس کے مباحث اور صنعت جدیدہ کے کرشموں کو اردو داں پبلک کے سامنے اپنے مضامین کے ذریعے پیش کرتے رہتے ہیں۔ مشاہدات سائنس آپ کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو نقیب جامعہ اور سائنس میں ایک ایک کرکے چھپ چکے ہیں مگر اس وقت کتابی صورت میں یکجا شائع کئے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر ان مضامین کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ محمد عمر صاحب نے سائنس کے مسائل اور صنعت کی جدید ایجادوں کو عام فہم زبان میں اور دلچسپ طریقے پر بیان کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے، کیوں نہ ہو آپ کی ذات خود مجموعہ کمالات ہے۔ یہی نہیں کہ آپ جاپان اور جرمنی کے سند یافتہ اور تجربہ کار انجنیر ہیں بلکہ اٹاوہ مسلم ہائی اسکول میں آپ کچھ دنوں معلم بھی رہ چکے ہیں اور پھر اخبار الہلال کے ادارہ میں مولنٰنا ابوالکلام کے ساتھ مضمون نگاری بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ سب باتیں تعارف سے معلوم ہو سکتی ہیں جو کتاب کے شروع میں جناب اختر جوناگڈھی نے لکھا ہے۔ مندرجہ بالا تعارف کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشاہدات سائنس لکھنے کا حق محمد عمر صاحب کو ہی حاصل ہے۔ جہاں علمی اعتبار سے آپ نے بہترین تعلیم گاہوں میں سائنس اور انجنیری سیکھی ہے وہاں ملک کے بہترین ادارے میں مضمون نگاری کی مشق کی ہے اور پھر معلمی کے سلسلے میں آپ نے یہ بھی سیکھا ہے کہ ایک مشکل مضمون کو بچوں اور ناواقفوں کے لئے کیونکر آسان بنایا جاسکتا ہے۔

البتہ کہیں کہیں لکھنے کی رو میں محمد عمر صاحب کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں جن کی صحت پر اعتراض کیا جاسکتا ہے مثلاً "تحت الثرٰی کی سیر" میں آپ فرماتے ہیں:-

"وہاں زیادہ تر کاربانک ایسڈ گیس ہوتی ہے جو حیات حیوانی کے لئے سب سے زیادہ مضرشے ہے"، اگر یہ واقعی درست ہے تو سوڈا واٹر کی بوتلوں پر جن میں یہی کاربانک ایسڈ گیس بند ہوتی ہے۔ سرخ روشنائی کے ساتھ موٹے قلم سے "زہر" لکھنے کی ضرورت ہوتی۔ اسی طرح مندرجہ ذیل عبارت غلط فہمی میں ڈالنے والی ہے اور اصلیت کو ٹھیک طور پر ظاہر نہیں کرتی

"لوہے کو جب تپایا جاتا ہے اور سرخ ہو جاتا ہے تو ہوا جس میں آکسیجن کا حصہ زیادہ شامل ہوتا ہے سرخ لوہے سے رگڑ کھاتے ہی جل جاتی ہے اور ایک ہلکی سی پپڑی جم جاتی ہے یہ حقیقت میں لوہے کا جزو نہیں ہوتی بلکہ جلی ہوئی ہوا کی پپڑی ہوتی ہے۔" اس پپڑی کو محض جلی ہوئی ہوا کہنا غلط ہے یہ پپڑی دھات اور ہوا کے حصوں کی کیمیائی ترکیب سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ پپڑی لوہے کا جزو نہ ہو مگر لوہا اس کا جزو ہوتا ہے، یہ لکھنا کہ "جب حرارت کو ہم تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو وہ غائب ہونے اور کام نہ کرنے کی کوشش کرتی ہے" حرارت کو ایک کام چور اور سست نوکر خیال کرنا ہے۔ یہ تصور غلط ہے اور یہ تشبیہ علمی نقطۂ نظر کے منافی ہے۔

بعض مقالات پر مضامین کے حصے عام فہم نہیں رہے۔ شاید انھی مقالات کی طرف اشارہ کر کے جناب اختر جوناگڑھی نے تعارف میں لکھا ہے "کہیں کہیں دقت مضمون کی وجہ سے اظہار خیال میں الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔" مگر حقیقت یہ ہے کہ اکثر مقامات اظہار خیال میں اتنا الجھاؤ نہیں جتنا پڑھنے والے کی سائنس سے عدم واقفیت کی بنا پر معلوم ہوتا ہے۔ خرابی یہ ہے کہ بہت سے مقامات تشریح کے محتاج رہ جاتے ہیں۔ جو لوگ سائنس سے پہلے سے واقف ہیں اور ان تشریحات کے نہ ہونے پر بھی مصنف کے مطلب کو سمجھ جاتے ہیں مگر جن کے لئے یہ کتاب خصوصیت سے لکھی گئی ہے وہ ان مقالات پر الجھ کر رہ جاتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ "برف سازی" کے آخری حصہ کو زیادہ واضح کر دیا جائے اور ان مسائل کی بھی تشریح کر دی جائے جس سے مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ کتاب میں اگر تصاویر زیادہ ہوتیں تو اس کا سمجھنا اور بھی آسان ہو جاتا۔ کہیں کہیں بعض نامانوس ترکیبیں بھی کتاب میں نظر آتی ہیں "ناقابل حس حصہ"، "حس آمیز تجربہ"، "متحرک فشارہ" ایسی ہی ترکیبیں ہیں جو غیر ضروری ہیں اور خواہ مخواہ مضمون کو مشکل بناتی ہیں۔

بعض مضامین کو محمد عمر صاحب نے بڑی احتیاط اور محنت سے لکھا ہے جیسے "روشنی کی رفتار"، "توانائی اور برق"۔ یوں بھی مشاہدات سائنس دلچسپ معلومات کا خزانہ ہے مگر ان

مضامین نے اس کی قدر و منزلت کو اور بلند کر دیا ہے۔

ہندوستان میں اس کا عام رونا ہے کہ کتاب کتنی ہی احتیاط سے چھپوائی جائے۔ اس میں کتابت کی غلطیاں ضرور رہ جاتی ہیں۔ اس نقص سے "مشاہدات سائنس" بھی پاک نہیں۔ بعض مقامات پر کاتب نے اپنی سمجھ کے مطابق الفاظ کو ایسا مسخ کر دیا ہے کہ مطلب سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ "روشنی کی رفتار" ایک نہایت دلچسپ مضمون ہے مگر اس میں لفظ 'خلا' کو کاتب نے کہیں "خار" اور کہیں "خلو" لکھ دیا ہے۔ موقع ایسا ہے کہ خلا کی جگہ 'خار' پڑھنے سے مطلب بالکل الٹا ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب ہائی اسکول کی لائبریریوں میں ایک مفید اضافہ ہوگی۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

(ت - ح)

تاریخ امریکہ | مصنفہ محمد یحییٰ صاحب تنہا، تقطیع ۲۶×۲۰، حجم ۲۰۷ صفحے۔ مقام اشاعت:۔ دارالاشاعت غازی آباد۔ قیمت عہ

محمد یحییٰ صاحب تنہا کا تاریخی ذوق اس محنت سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے رابن سن کی "تاریخ مغربی یورپ" کے ترجمے پر صرف کی اور تاریخ امریکہ اسی شوق اور محنت کی ایک اور دلیل ہے۔ اس کتاب کے ضروری اور مفید ہونے میں کوئی شک نہیں، اگرچہ ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ "ہمارے ملک ہندوستان کو امریکہ کی تاریخ سے گہرا تعلق ہے"؛ محض اس وجہ سے کہ "بالواسطہ ہمارا ملک ہی امریکہ کی دریافت کا باعث ہوا"۔ تواریخ کا ذخیرہ بہت کم ہے اور تنہا صاحب نے امریکہ کی تاریخ لکھ کر اُردو ادب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ دوسرے ملکوں کے متعلق معلومات یوں بھی اُردو دانوں میں بہت کم ہے، خصوصاً امریکہ کی طرف سے جو بے پروائی برتی جاتی ہے وہ ان بی۔ اے ڈاکسن صاحب کے خیالات سے ظاہر ہوتی ہے جن کا ذکر مصنف نے دیباچے میں کیا ہے۔ اس لحاظ سے "تاریخ امریکہ" اردو خواں طبقے کی نظروں میں ایک نعمت ہونا چاہیے۔

کتاب کا حجم زیادہ نہیں مگر اس میں مصنف نے شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظموں کی تاریخ بیان کی ہے۔ بہتر ہوتا اگر موضوع صرف ریاستہائے متحدہ تک محدود رکھا جاتا، اور ان کی تاریخ کچھ زیادہ تفصیل سے دی جاتی، امریکہ کی تاریخ سے ہندوستانی سبق ضرور حاصل کر سکتے ہیں مگر "تاریخ امریکہ" میں جو مضامین کی تقسیم کی گئی ہے وہ مصنف کے مقصد اور ناظرین کی خواہشوں کو پورا نہیں ہونے دیتی۔ مصنف نے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ "پہلے دو باب کسی قدر تفصیل کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں، لیکن یہ دیکھ کر کہ تفصیل لازماً کتاب کو ضخیم بنا دے گی، دیگر ابواب کو جہاں تک ممکن ہو سکا مختصر کر دیا گیا ہے تاکہ کتاب کی ضخامت تین سو صفحات سے زیادہ نہ ہونے پائے۔" اس منطق کو سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ لائق مصنف نے کولمبس کا ذکر پچاس صفحوں میں کیا ہے، اور ابراہم لنکن کا جس کی شخصیت کی عظمت کا ساری دنیا میں چرچا ہے، ڈیڑھ صفحے سے کم میں۔ کولمبس کی ہمت اور حوصلے کی مصنف کے دل میں خواہ کتنی ہی قدر ہو، لنکن کے مقابلے میں اسے اتنی اہمیت دینا صریحی زیادتی ہے جس کے عذر میں اختصار کی خواہش یا ضرورت نہیں پیش کی جا سکتی۔ اگر اختصار کی ضرورت ایسی ہی شدید تھی تو کولمبس اور امریکہ کے دریافت کرنے والوں کا ذکر آسانی سے ڈیڑھ صفحے میں کیا جا سکتا تھا۔

تقسیم مضامین کے علاوہ وہ حصے جہاں مصنف نے واقعات نہیں بیان کئے ہیں بلکہ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے بہت کمزور ہیں۔ مثلاً باب سوم میں جہاں "ہندوستانیوں" اور یورپ کے ان مہاجروں کا مقابلہ کیا گیا ہے جو امریکہ میں جا کر آباد ہوئے۔ بعض باتیں ہیں جن کا تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، ہمیں فن حرب کے کسی ایسے انقلاب کا علم نہیں جو "ہندوستانیوں" کے ذریعے سے پیدا ہوا، نہ کوئی ایسی "جنگی چالوں" کی خبر ہے جو "ہندوستانیوں" نے اہل امریکہ اور یورپ کو سکھائی ہوں۔ یہ بھی کہنا کہ "ریاستہائے متحدہ کی آزادی بھی زیادہ تر "ہندوستانیوں" کی بدولت حاصل ہوئی ہے، کیونکہ "ہندوستانیوں" نے یورپ والوں کو بھونڈے طریقے سے آزادی کی قدر و قیمت اور ضرورت و آرزو سکھائی، انفرادی ضرورت اور سربلندی بھی

سکھائی اور آخر کار فنون حرب سے واقف کیا،، صریحًا غلط ہے۔ جو لوگ یورپ چھوڑ کر ریاستہائے متحدہ میں آباد ہوئے انھوں نے اپنا وطن آزادی کی خاطر چھوڑا تھا، انفرادیت کے پہلے سے معتقد تھے اور اکثر فنون حرب سے واقف بھی تھے۔

بعض بعض الفاظ کے ترجے میں بھی ہمارے خیال میں مصنف نے صحیح انتخاب نہیں کیا ہے۔ امریکہ کے دیسی باشندوں کو یورپ والوں نے ابتدا میں غلطی سے "انڈین" (Indian) کہنا شروع کیا، لیکن اس کی کیا ضرورت تھی کہ تاریخ امریکہ کے لائق مصنف بھی وہی غلطی کریں۔ ان لوگوں کو "انڈین"، یا "دیسی امرکی،، کہنا ہمارے خیال میں بہت زیادہ مناسب ہوتا، اسی طرح مشہور واقعے Boston Tea - Party کو مصنف نے "بوسٹن میں چائے کی جماعت" کے تحت میں بیان کیا ہے۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ انگریزی میں Tea-party "چائے کی دعوت" کو کہتے ہیں۔

امید ہے کہ اس قسم کی خامیاں آئندہ اشاعت میں درست کر دی جائیں گی۔

(م۔م)

گلدستہ نعت | مرتبہ سید اشفاق حسین صاحب و شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی ضخامت ۱۶ صفحے۔ ملنے کا پتہ:۔ سید اشفاق حسین صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول ضلع رہتک

اس رسالے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند نعتیہ نظمیں جمع کر دی گئی ہیں اور عاشقان رسول کی خدمت میں مفت نذر کیا جاتا ہے۔ میلاد کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے اچھی چیز ہے

فضیلت مکہ | از جناب مولانا خلیل احمد صاحب (جامعی)، نائب صدر جمعیت شبان المسلمین حجم ۳۲ صفحے تقطیع چھوٹی۔ قیمت ۱ر ملنے کا پتہ: منظور حسین سکرٹری جمعیۃ شبان المسلمین بتوسط فریدی دواخانہ فریزیہ اسٹریٹ رنگون۔

یہ حضرت شیخ حسن بصری رضؒ کے ایک رسالہ کا ترجمہ ہے اس میں مکہ کی فضیلت پر قرآن کی آتیں اور ہر قسم کی حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔

دنیا کی حور | از حضرت کوثر چاندپوری ضخامت ۵۰ صفحے۔ تقطیع خورد۔ کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ:۔ حضرت کوثر چاندپوری، گورنمنٹ بھوپال۔

یہ ازدواجی زندگی سے متعلق ایک اصلاحی افسانہ ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ میاں بیوی کی باہمی محبت، خلوص، شرافت، نیکدلی، محنت دیانتداری اور خوش سلیقگی کی بدولت انھیں دنیا میں کیسی شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ فسانہ خاصا ہے۔ مگر بعض موقعوں پر غیر ضروری تمہیدوں سے پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔

اساس منطق | از جناب سید عبدالقدوس صاحب بہاری، مدرس مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد قیمت ۶؍ ملنے کا پتہ۔ سید رکن الدین عالم مدرسہ عالیہ مصباح العلوم الہ آباد

قدیم منطق پر اردو میں مولوی رکن الدین صاحب دانا اور دوسرے حضرات نے بھی رسالے لکھے ہیں لیکن یہ کتاب مجموعی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہے۔ بہتر ہوتا اگر جناب مولف اسے اور زیادہ سہل اور آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کرتے۔ بہرحال عربی مدارس کے طلبہ کے لئے یہ کتاب مفید ہوگی۔

کلامِ ثاقب

یہ غزل اور قطعات حضرت میرزا ثاقب مدظلہ العالی نے مشاعرۂ یوم تاسیس میں پڑھے تھے
ممدوح کی اجازت سے شکریے کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ زخم کے پردے میں غم کے گھر بنے — کل جو روزن دل میں تھے وہ آج بڑھ کر در بنے
جاں بری ہو عشق سے ممکن موافق ہو جو دل — ہاں مگر آپس میں جھگڑا ہو تو پھر کیونکر بنے
ظالموں کے ہاتھ اپنی ہی تواضع سے اُٹھے — کیوں سرِ تسلیم خم ہو کس لئے خنجر بنے
تنکے ممکن ہیں مگر ڈرتا ہوں لے برقِ فلک — تو نہ برہم ہو تو میرا بھی چمن میں گھر بنے
غیر کے اسباب زینت اپنی جانکاہی سے ہیں — لاکھ آنسو ابر کے ٹپکیں تو اک گوہر بنے
مجھ پہ جو گزری گل صد برگ نے سب کہہ دیا — ایک دل کی داستاں اتنی کہ سو دفتر بنے

ہے بلائے ناگہاں ثاقب شبِ غم دیکھئے
کیا مصیبت جان پر ہو کیا مرے دل پر بنے

ہر ایک بات میں جب مشقِ لن ترانی تھی — ہمارے بیچ میں مفسد شبِ جوانی تھی
بڑھائی جس نے تری نیند مجھ کو تڑپا کر — وہ میری عمرِ گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

کہاں ہے آئینہ جو صورتِ صفا دیکھوں — ہر ایک دل میں غبار آ گیا تو کیا دیکھوں
ستارے گن کے بھی اب رات کٹ نہیں سکتی — یہ دل کہاں جو کسی کو ترے سوا دیکھوں

جہاں میں قلب ذلت کش کی بھی اک شان ہوتی ہے
جفاؤں کے سبب کہتی ہے دنیا سنگدل اُن کو

شب فرقت بس اک میرے ہی گھر مہمان ہوتی ہے
ترس کھائیں وہ کیوں کیا عاشقوں کے جان ہوتی ہے

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہ الفت سے

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

فکرِ آسانی برائے امرِ مشکل چاہیے
ظلم کے اظہار میں کرتے ہیں کوشش اہلِ دہر

غم کی پنہانی تو آساں ہے مگر دل چاہیے
آگ شمعوں میں لگا دینے کو محفل چاہیے

شذرات

اب کی کئی سال کے بعد جامعہ ملیہ کا یوم تاسیس منایا گیا، اس کے سلسلے میں ۲۸ راکتوبر کو اسکول اور کالج کے طلبہ نے مل کر پروفیسر محمد مجیب صاحب کا ڈراما کھیتی اسٹیج پر دکھایا جس طرح یہ ڈراما ادبی خوبیوں کے علاوہ درد ملت کے جذبے سے معمور ہے اسی طرح اس کا تماشا فنی دلکشی کے ساتھ ساتھ کیف اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ دیکھنے والوں میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ دہلی کے معززین اور باہر کے محترم مہمان بھی تھے۔ اتفاق سے اسی روز دہلی میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا۔ اُس کے کل ارکان اور دوسرے رہبران قوم جو اس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے ڈاکٹر انصاری صاحب کی دعوت پر ڈراما دیکھنے کے لئے چلے آئے تھے۔ تماشائیوں کا ایسا مجمع بہت کم تماشوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس سارے مجمعے پر اول سے آخر تک وجد کا عالم طاری تھا اور یہ بجائے خود دیکھنے کی چیز تھے۔ ہم محمد مجیب صاحب کو دلی مبارکباد دیتے ہیں کیونکہ یہ پُر اثر نظارہ انھیں کی بدولت دیکھنے میں آیا۔ انھیں کا ڈراما تھا اور انھیں نے طلبہ کو مہینوں محنت کرکے اس کے دکھانے کے لئے تیار کیا تھا۔ یہ عطائی تماشاگر بھی اپنے ادب آموز کی طرح تعریف اور داد کے مستحق ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو واقعی کمال کر دیا۔ ہمیں امید ہے کہ ہر سال یوم تاسیس کے موقع پر اس طرح کا ڈراما دکھایا جائے گا جو عبرت اور ذوق دونوں کا سامان رکھتا ہو۔

---

۲۹ راکتوبر کو ۸ بجے شب سے یوم تاسیس کا جلسہ امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مدظلہ العالی کی صدارت میں شروع ہوا۔ پہلے جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جامعہ کے پچھلے چار برس کی کارگزاری مختصر طور پر بیان کی جس سے معلوم ہوا کہ یہ تعلیمگاہ زمانے کی طرح آہستہ آہستہ غیر محسوس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ آپ نے جامعہ کے کل شعبوں کی اجمالی رپورٹ

ثانی۔ ابتدائی تعلیم کے شعبے کا ذکر جناب موصوف نے کسی قدر تفصیل سے فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے:
پچھلے پانچ سال کے تجربے سے جامعہ کے منتظمین نے یہ سبق سیکھا ہے کہ ملت اسلامی کی اصلاح و ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز چھوٹے بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام کرنا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قومی تعلیم کی نئی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ اسی خیال سے جامعہ سب سے پہلے ابتدائی کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تجویز یہ ہوئی کہ پہلے ایک مثالی مدرسہ قائم کیا جائے جس میں جدید ترین طریقے سے تعلیم دی جائے اور اسی کے ساتھ بچوں کی جسمانی اور روحانی تربیت کا خیال رکھا جائے اور آگے چل کر اس مدرسے کے نمونے پر ہر شہر اور گاؤں میں مدرسے قائم کرائے جائیں، چنانچہ دو سال ہوئے چار ابتدائی درجے الگ کر کے ایک جداگانہ مدرسہ بنایا گیا اور اس کی نگرانی ایک نوجوان معلم کے سپرد کی گئی جنھوں نے موگا میں "منصوبی" طریقۂ تعلیم سیکھا ہے اور اس میں امتیازی کامیابی حاصل کی ہے۔ جامعہ کے مدرسے میں اب یہی طریقہ رائج ہے۔ اس کے اصل اصول یہ تین چیزیں ہیں۔

(۱) تعلیم میں ترکیبی عنصر تحلیلی عنصر پر غالب رہے۔

(۲) فاعلی پہلو انفعالی پہلو پر غالب رہے۔

(۳) تعلیم کا محرک شوق ہو خوف نہ ہو

ان اصولوں پر عمل اس طرح ہوتا ہے کہ بچوں کو کسی دلچسپ کام کا شوق دلاتے ہیں مثلاً کوئی چھوٹا سا سفر اور اس میں لڑکوں کو جو انہماک اور جوش ہوتا ہے اس سے کام لے کر انھیں اسی کے سلسلے میں لکھنا پڑھنا، نقشہ کشی، حساب، جغرافیہ، تاریخ، معلومات عامہ وغیرہ سکھاتے ہیں۔ چونکہ کام کے بچوں کے شوق کا ہوتا ہے اس لئے اس کی خاطر وہ ہنستے کھیلتے ان چیزوں کو سیکھ لیتے ہیں جو عموماً مکتبوں میں مار مار کے سکھائی جاتی ہیں۔ اس طرح کے مقصد کو "منصوبہ" اور اس طرز تعلیم کو "منصوبی" کہہ سکتے ہیں۔ جامعہ کے ابتدائی مدرسے نے اس طرز تعلیم سے دو ہی سال میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور حافظ فیاض احمد صاحب کی حوصلہ مندی اور کوشش کی

بدولت اس کی ایک شاندار عمارت بھی بن گئی ہے۔ جامعہ کے قصرِ تعلیم کی بنیاد کے استوار ہو جانے کے بعد انشاء اللہ اس پر ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، فنی تعلیم اور علمی تحقیق کی منزلیں اُسی شان سے قائم ہو سکیں گی جو اربابِ جامعہ کے پیش نظر ہے۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر کے بعد ایک چھوٹے سے بچے نے ابتدائی مدرسے کی مفصل رپورٹ پڑھ کر سنائی اور پھر ہنگری کے ممتاز مستشرق پروفیسر جولیس گرمانس نے جو شانتی نکیتن میں اسلامیات کے استاد ہیں، محاسنِ اسلام پر تقریر کی اور اپنے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کیا۔ حاضرین نے نعرہ ہائے تکبیر کے غلغلے بلند کر کے پروفیسر صاحب کو مبارکباد دی۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر انصاری صاحب نے جامعہ کی گزشتہ اور موجودہ زندگی پر مختصر سا تبصرہ فرمایا اور پروفیسر جولیس گرمانس کا بڑی گرمجوشی سے اسلامی برادری میں استقبال کیا۔ اب جلسہ ختم ہو گیا اور لوگ ان تحفوں کی نمائش دیکھنے کے لئے منتشر ہو گئے جو جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ نے شیخ الجامعہ صاحب کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر جامع مسجد دہلی کا چوبی نمونہ تھا جو شعبۂ نجاری کے طلبہ نے بڑی نفاست سے تیار کیا تھا۔

---

۹ بجے شب سے وہ مشاعرہ شروع ہوا جس کا ہم پچھلے پرچے میں اعلان کر چکے ہیں۔ باہر کے شعرا میں سے حضرت ثاقب لکھنوی، حضرت مانی جائسی، حضرت حسرت موہانی، حضرت حفیظ جالندھری اور حضرت اصغر گونڈوی تشریف لائے تھے مولانا صفی، مولانا ظریف لکھنوی اور حضرت فانی علالت کی وجہ سے نہیں پہنچ سکے۔ دہلی کے لوگوں میں سے حضرت ساحر، ڈاکٹر سعید صاحب، اکبر حیدری صاحب اور عشرت رحمانی صاحب موجود تھے۔ پہلے مقامی حضرات نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ ڈاکٹر سعید صاحب کی ایک نظم "نوادر ہیں" کے پہلے حصے کو اربابِ نظر نے بہت پسند کیا اور حضرات کے کمالِ سخنوری کی بھی عام طور سے داد دی گئی۔ باہر کے حضرات میں سے پہلے حضرت حفیظ نے مولانا محمد علی صاحب مرحوم کا مرثیہ پڑھ کر محفلِ مشاعرہ کو مجلسِ ماتم بنا دیا۔

آپ نے اپنا مستغرق کلام بھی سنایا اور مشاعرے کے ختم ہونے کے بعد اپنی معرکے کی تصنیف شہنامۂ اسلام کا ایک ٹکڑا اپنے خاص انداز میں پڑھ کر قلب کو گرما دیا اور روح کو تڑپا دیا۔ حضرت مانی، حضرت حسرت اور حضرت ثاقب نے اپنی منتخب غزلیں سنا کر ساری محفل کو لطف زبان، حسن بیان اور کیف معنی کی شراب ناب میں سرشار کر دیا۔ حضرت اصغر اپنا کلام خود نہیں پڑھ سکے۔ دوسرے حضرات کے پڑھنے سے "تصنیف را مصنف" کا لطف نہیں آیا پھر بھی حسن کلام کی تاثیر نے پڑھنے والوں کی زبان میں بھی اثر پیدا کر دیا۔ آخر میں حضرت یاس ٹونکی میر مشاعرہ نے دیر تک سامعین کو اپنی منتخب غزلیں اور نظمیں سنا کر محظوظ فرمایا۔ ایک بجے کے بعد مشاعرہ ختم ہوا اور لوگ کچھ کیف سخن اور کچھ نیند میں مخمور اپنے اپنے گھر گئے ہم تمام شعرائے کرام کے خصوصاً بیرونی حضرات کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ وہ بڑی زحمت اٹھا کر ہمارے مشاعرے میں تشریف لائے۔ خدا ان کو اس فیاضی کا اجر دے۔

جم گئی اور اس نے محمد ابن بشیر ہی کو قاضی صاحب مرحوم کا جانشین مقرر کیا۔

محمد ابن بشیر کی بعض خصوصیات | محمد ابن بشیر اپنی قابلیت اور اتقا و انصاف میں سابق قاضی سے بھی سبقت لے گئے۔ لیکن جس طرح پہلے وہ نفیس و باریک اور رنگین کپڑے پہنا کرتے تھے حالت قضا میں بھی پہنتے رہے۔ ان کی عادت مانگ نکالنے کی تھی وہ اب بھی رہی۔ ان کا دستور تھا کہ گھر سے گلابی رنگ کی ازار پہنے، بالوں میں مانگ نکالے ہوئے مسجد میں آتے اور اسی وضع میں عدل و انصاف کے ساتھ تمام معاملات کا تصفیہ کرتے تھے۔ اس سے قطع نظر زہد و ورع میں بہت کم لوگ ان کے ہمپایہ تھے۔

قاضی محمد ابن بشیر کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ | ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص کہیں باہر سے قاضی صاحب کو تلاش کرتا ہوا جامع مسجد میں آیا۔ قاضی صاحب اسی ہیئت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس شخص نے چند لوگوں کے ایک حلقے میں آکر قاضی صاحب کو دریافت کیا لوگوں نے اس جلسے کی طرف اشارہ کر دیا جس میں قاضی صاحب بیٹھے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھے وہ اس جلسے میں گیا اور واپس آکر انھیں لوگوں سے کہنے لگا "خدا تم لوگوں پر رحم کرے، میں نے تو تم کو بھلا آدمی جانکر تم سے دریافت کیا تھا۔ تم مجھ سے مذاق کرتے ہو اور ایک غنڈے کو قاضی بتا کر دھوکا دیتے ہو" ان لوگوں نے جواب دیا "خدا کی قسم ہم تمھیں دھوکا نہیں دیتے قاضی وہی ہیں اور تم کو جن خوبیوں کی تلاش ہے وہ سب انھیں میں ملیں گی" وہ شخص پھر قاضی کے پاس گیا تو انھوں نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور اس کے معاملات میں گفتگو کی وہ بہت مسرور ہوا اور ان میں اپنی امید سے زیادہ نیکی، پارسائی زہد اور قابلیت دیکھ کر خوش خوش واپس ہوا۔ پھر ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا "میں نے قاضی صاحب میں اپنے گمان سے زیادہ اوصاف پائے"

قاضی محمد ابن بشیر کی دیانت | عباس ابن عبداللہ ابن مروان القرشی امیر کے خاص درباریوں میں تھا۔ جو تقرب و خصوصیت اس کو حاصل تھی، کسی دوسرے کو میسر نہ تھی۔ ایک شخص نے

اس کے خلاف ایک جائداد غیر منقولہ کا مقدمہ قاضی محمد ابن بشیر کے اجلاس میں دائر کیا۔ عباس قرشی کو معلوم ہو گیا کہ قاضی صاحب کا فیصلہ کیا ہو گا۔ وہ الحکم کے پاس آیا اور اس نے الحکم سے قاضی صاحب کی شکایت کی اور انھیں کچھ برا بھلا کہہ کر قاضی صاحب کے اجلاس سے انتقال مقدمہ کی درخواست کی۔ اس سلسلے میں اس کے علاوہ قاضی صاحب کی اور بھی بہت سی شکایتیں کیں۔ الحکم نے سب کے جواب میں کہا کہ "اگر تو سچا ہے تو قاضی صاحب کے گھر جا کر ان سے مل اگر وہ تجھے تنہا اپنے پاس آنے دیں تو بیشک ہم تجھے سچا جانیں گے اور انھیں موقوف کر دیں گے"

قرشی حسب قرار داد قاضی صاحب کے گھر گیا۔ امیر نے چند جاسوس مقرر کر دئے کہ وہ خبر لائیں کہ قاضی صاحب نے قرشی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ قرشی اس شان کے ساتھ قاضی صاحب کے گھر گیا تھا کہ اس کے ہمراہیوں کی کثرت سے لوگوں کو راستہ چلنا دشوار تھا۔ قرشی نے قاضی صاحب کے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا ایک بڑھیا باہر نکلی، قرشی نے اپنا نام بتا کر اندر آنے کی اجازت چاہی قاضی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے بڑھیا کو گھڑ کا اور کہا کہ اس سے کہہ دو کہ اگر کوئی حاجت ہے تو مسجد میں جہاں اہل مقدمہ بیٹھے ہوئے ہیں ان میں بیٹھو اور میرے باہر آنے کا انتظار کرو۔ تمھارے اندر آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ قرشی نے بہت عجز و الحاح کی ساتھ اندر آنے کے لئے اصرار کیا۔ مگر قاضی صاحب کے یہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ جاسوسوں نے الحکم کو اس کی اطلاع کی۔ وہ اس بات سے بہت خوش ہوا۔

ایک عورت کی فریاد اور الحکم کی بروقت امداد

لجدانیہ کی طرف کا ایک شخص کسی وفد میں شریک ہو کر آیا۔ امیر نے اس سے سرحد کے حالات دریافت کئے اس نے دشمن کی ایک جنگ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ میں نے ایک عورت کو چلاتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ الحکم کی دہائی دے کر یہ کہہ رہی ہے کہ "اے الحکم ہماری فریاد کو پہنچ تو بیشک ہم سے غافل ہو گیا اور ہم کو دشمنوں کی لوٹ مار کے لئے چھوڑ گیا ہے" یہ واقعہ سنتے ہی الحکم غصہ میں بھر گیا اور اسی وقت تیار ہو کر مع لشکر کے روانہ ہو گیا اور اسی سرحد پر آیا اور دشمن پر حملہ کر کے

خدا کی مدد سے کامیاب ہوا۔ اس جنگ میں بہت سا مال غنیمت، قیدی، اور قلعے اور فوجی چوکیاں اس کے قبضے میں آئیں۔ پھر الحکم نے اس شخص سے اس عورت کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے وہ جگہ بتائی۔ وہاں آکر اس عورت سے ملا اور چند قیدی اس کی ملک میں دیئے اور اس سے کہا کہ اپنے اہل کے معاوضے میں ان سے فدیہ لے، پھر وہیں اس کے سامنے باقی قیدیوں کی گردنیں مار دیں اور اس سے کہا "کیوں الحکم تیری فریاد کو پہنچا یا غافل رہا۔" عورت نے کہا "بے شک فریاد کو پہنچا۔ اس نے ہماری مدد کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی۔ خدائے تعالیٰ ہمیشہ اس کا یونہی معاون رہے۔"

محاصرہ جیان ایک بار الحکم حائر میں اپنے خاصہ کے گھوڑوں پر چوگان کھیل رہا تھا۔ اتنے میں خبر آئی کہ جابر ابن لبید نے جیان کا محاصرہ کر لیا ہے۔

الحکم کی فوج کا نظم الحکم کے پاس دو ہزار سوار ایسے رہتے تھے جن کی چھاؤنی زیر قصر نہر کے کنارے بنائی گئی تھی۔ یہ چھاؤنی دو حصوں میں تقسیم تھی اور ہر ایک میں ایک ایک ہزار سوار تھے اور ان پر دس دس رسالدار مقرر تھے جن کی نگرانی میں سو سو سوار ہوتے تھے۔ ان کے گھوڑوں کے دانے پانی وغیرہ کا انتظام انھیں رسالداروں کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ یہ لوگ اس طرح تیار رہتے تھے کہ ضرورت کے وقت فوراً کمربستہ ہوسکیں۔ کسی مہم پر ان کی تیاری میں اس سے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی جتنی ایک گھوڑے اور ایک سوار کی تیاری میں ہوتی ہے۔

جیان کی مہم پر حیرت انگیز تدبر کا اظہار جیان کے محاصرے کی خبر سن کر الحکم نے ایک رسالدار کو بلا کر اس کے کان میں آہستہ سے کہا کہ فوراً جیان کی طرف ابن لبید کی مہم پر روانہ ہوجا اور کسی کو اطلاع نہ ہونے دو یہ کہہ کر بدستور کھیل میں مصروف ہوگیا۔ ایک گھنٹے کے بعد دوسرے رسالدار کو بلایا اور اس سے بھی یہی ہدایت کی اور کھیلنے لگا۔ غرض اسی طرح اس نے دس رسالداروں کو ایک ایک گھنٹے کے فاصلے سے روانہ کردیا اور ایک کو دوسرے کی حالت نہ معلوم ہوسکی۔

دوسرے روز یہ سب رسالدار اس ترتیب کے ساتھ جیان میں ابن لبید کے سامنے پہنچ

رہے اور ان کی آمد سے رات تک فوج کا ایک تانتا لگا رہا۔ جب دشمن نے فوج کی یہ کثرت دیکھی تو اپنی تباہی کا یقین کر کے خیال کیا کہ سارا ملک میرے خلاف امنڈ آیا ہے اور ہیبت کے مارے بھاگ کھڑا ہوا۔ امیر کے سواروں نے دشمن کا مال و اسباب خوب لوٹا اور تیسرے ہی روز دشمن کے سرداروں کے سر لئے ہوئے مظفر و منصور واپس ہوئے۔ الحکم اس وقت حائر ہی میں اپنے خدام کے ہمراہ مقیم تھا اور کسی کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ اب الحکم نے اس واقعے سے خود لوگوں کو مطلع کیا۔

الحکم کا زبردست استقلال | ایک حکایت الحکم کے متعلق یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ربض والوں نے اس کے خلاف بغاوت کی اور حلف بیعت توڑ ڈالا۔ یہ لوگ اس کے لشکر کی جان تھے۔ جب ان سے مقابلہ ہوا تو الحکم نے نہایت درجہ صبر و استقلال سے کام لیا۔ ایک دن جب لڑائی پوری شدت کے ساتھ ہو رہی تھی، اس نے عطر و مشک منگا کر اپنے سر اور مانگ میں خوب لگایا۔ اس کے ایک خادم نے دریافت کیا کہ "آقائے ولی نعمت آج خوشبو کے استعمال اور زینت کا کیا موقع ہے"۔ الحکم نے پہلے اس کو جھڑک دیا پھر کہا "آج میں نے عہد کیا ہے کہ یا دشمن پر فتح حاصل کر دوں گا یا مارا جاؤں گا۔ اس لئے میرا منشا ہے کہ لوگ اس خوشبو کے اثر سے الحکم کے سر کو دوسرے سروں میں پہچان سکیں"۔

بربریوں کی بغاوت کا قابل ذکر انسداد | ایک بار ماردہ کے عامل نے الحکم کو لکھا کہ یہاں کے بربری رعایا پر تاخت و تاراج کر رہے ہیں ہمیں بھی لڑائی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ حکم کے لشکر کا ایک رسالدار بیان کرتا ہے کہ اس موقع پر الحکم نے مجھے طلب کیا اس وقت تک مجھے عامل کی کسی تحریر کی کوئی اطلاع نہ تھی نہ کہیں جنگ و فساد کا خیال تھا کیونکہ اس وقت ملک میں بظاہر امن تھا۔ میں حاضر ہوا تو الحکم محلسرا کے کسی صحن میں بیٹھے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ کیا تمھارے ہمراہی سب تیار ہیں" میں نے کہا " خدا حضور کے دولت و اقبال میں ترقی دے سب تیار ہیں"۔ فرمایا کہ جاؤ اس کا سر لے آؤ۔ ورنہ اس کی جگہ تمھارا سر قلم ہوگا۔ حتی الامکان آتی تخت جنگ

کرنا جتنی تم سے ممکن ہو۔ میں یہ حکم سن کر واپس ہونے لگا تو پھر مجھے بلایا اور کہا کہ میں یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ میں الحکم کی اس تاکید پر بہت متعجب تھا اور جو حکم ہوا تھا اس سے خوف زدہ بھی تھا۔ وہاں سے نکل کر فوراً روانہ ہوگیا۔ میں نے دشمن کو نہایت محفوظ پایا اور اس جنگ کو اپنے قیاس سے زیادہ اہم سمجھا۔ مگر جب جنگ کی حالت میں گھبرا کر خیال کرتا کہ مع لشکر کے پسپا ہوجاؤں تو مجھے الحکم کے یہ الفاظ "ورنہ پھر تمہارا سر اس کی جگہ قلم ہوگا" یاد آجاتے اور میں پھر جی توڑ کر لڑنے لگتا۔ غرض میں نے نہایت بے جگری سے جنگ کی آخر کو اللہ نے مجھے نصرت عطا کی اور چوتھے دن میں دشمن کا سر لئے ہوئے الحکم کے حضور میں پہنچا۔ میں نے ان کو اسی جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا جس جگہ سے میں ان سے رخصت ہوا تھا۔ الحکم کے خدام نے مجھ سے کہا کہ سوائے نماز و وضو وغیرہ ضروریات کے امیر اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔

واقعہ بعض کے بعد جو شعر الحکم نے کہے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

رایت صدوع الارض بالسیف راقعا	(۱)	وقدماً لاءمت الشعب مذ کنت یافعا
فسائل ثغوری ہل بہا الیوم ثغرۃ	(۲)	ابادرہا مستنضی السیف دارعا
وشافہ مع الارض الفضاء جماجما	(۳)	کاقحاف شریان الہبید لوامعا
تنبک انی لم اکن فی قراعہم	(۴)	بوان وقدماً کنت بالسیف قارعا

(۱) میں نے زمین کے شگافوں میں تلوار سے پیوند لگا دیا (فسادات کی اصلاح کر دی) میں تو لڑکپن ہی سے ایسی اصلاح میں مشغول ہوں۔

(۲) میری سرحد والوں سے پوچھو کہ ان کے یہاں کوئی خلل ہے جس کے انتظام کے لئے میں زرہ لگاؤں اور تلوار سوت کر سبقت کروں؟ (یعنی نہیں ہے)

(۳) میدان جنگ کی وسیع زمین پر دیکھو کھوپریاں ایسی چمکتی ملیں گی جیسے حنظل کے شکستہ پھل۔

(۴) یہ کھوپریاں تمہیں آگاہ کر دیں گی کہ میں نے ان کے اعلان جنگ پر سستی نہیں کی میں ہمیشہ سے ایسی بات کا جواب تلوار سے دیتا ہوں۔

وانی اذا حادوا واجزاعا من الردی (۵) فلم اک ذا حید من الموت جازعا
حمیت ذماری فانتھبت ذمارھم (۶) ومن لا یحامی ظل خزیان ضارعا
ولما تساقینا سجال حروبنا (۷) سقیتھم سما من الموت ناقعا
وھل زدت ان وفیتھم صاع قرضھم (۸) فوافوا منایا قدرت ومصارعا
فھاک بلادی اننی قد ترکتھا (۹) مھادا ولم اترک علیھا منازعا

عثمان ابن المثنیٰ ادیب کہتا ہے کہ عباس ابن ناصح امیر عبد الرحمٰن (*) کے زمانۂ حکومت میں قرطبہ آئے اور انھوں نے مجھ سے الحکم کے یہ شعر جو ربض کی شورش کے بعد الحکم نے کہے تھے سنے جب میں اس شعر پر پہنچا ؎

وھل زدت ان وفیتھم صاع قرضھم فوافوا منایا قدرت ومصارعا

تو مجھ سے کہا "اگر الحکم اہل ربض کا دشمن ہی رہتا تو اس کے لئے یہ شعر ایک معقول عذر تھا۔

---

(۵) اس میں شک نہیں کہ وہ ہلاکت سے گھبرا کر میدان سے ہٹ گئے، مگر میں نے موت کے خوف سے منہ نہیں موڑا۔

(۶) میں نے عزت نفس کی حفاظت کی، ان کی آبرو لے لی، جو اپنی آبرو نہیں بچاتا وہ ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔

(۷) جب ہم نے ایک دوسرے سے جنگ کی تو تم نے ہمیں موت کا زہر خالص پلایا اور ہمیں تباہ کرنے میں کمی نہ کی۔

(۸) اس لئے اگر میں نے بدلے کے طور پر ان کا قرض ادا کر دیا جیسا انھوں نے کیا تھا اس کا بدلا لے لیا اور اس کے نتیجے میں انھیں موت اور شکست نصیب ہوئی تو اس میں میری کیا زیادتی ہے۔

(۹) ذرا میرے ان شہروں کو تو آ کر دیکھ جنھیں میں نے فرش کی طرح صاف کر رکھا ہے اور انھیں ہر مفسد سے پاک کر دیا ہے۔

(*) یہاں عبد الرحمٰن سے مراد عبد الرحمٰن ابن الحکم ہے۔

لونڈیوں سے عشق | الحکم کے پاس پانچ لونڈیاں تھیں جن کا عشق اس پر غالب آگیا تھا۔ ان لونڈیوں نے اس پر اتنا قابو پالیا تھا کہ الحکم دوسری بیویوں اور عورتوں سے تقریباً بے تعلق سا ہو گیا تھا۔ ایک دن الحکم نے دوسری عورتوں کے پاس جانا چاہا تو یہ لونڈیاں غصہ ہو گئیں اور سب نے جمع ہو کر اسے دوسری جگہ جانے سے روک دیا۔ پھر جب وہ خفا ہو کر امیر کے پاس سے جانے لگیں تو امیر نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ان کی رضاجوئی کے لئے حسب ذیل اشعار کہے، جن سے اس کا رنگ تغزل نمایاں ہے۔

قضب من البان ماست فوق کثبان (۱) ولین عنی وقد ازمعن ہجرانی

ناشدتہن بحقی فاعتزمن علی (۲) العصیان لما خلا منہن عصیانی

ملکننی ملکا ذلت عزائمہ (۳) للحب ذل اسیر موثق عانی

من لی بمغتصبات الروح من بدنی (۴) یغصبننی فی الہوی عزی وسلطانی

انھیں کنیزوں کے متعلق الحکم کے یہ اشعار بھی ہیں۔

ظل من فرط حبہ مملوکا (۵) ولقد کان قبل ذاک ملیکا

---

(۱) درخت بان کی شاخوں کی طرح نازک اور لچیلی نازنینوں نے جانے کے ارادے سے مجھ سے پیٹھ پھیری اور جدائی کا عزم کر لیا۔

(۲) انھوں نے میری نافرمانی کی تو میں نے ان کو اپنا حق جتا کر بلایا مگر ان کا ارادہ نافرمانی مضبوط تھا۔

(۳) وہ مجھ ایسے بادشاہ کی مالک بن بیٹھی ہیں جس کے حوصلے محبت سے ایسے پست ہو گئے ہیں جیسے کسی قید میں جکڑے ہوئے قیدی کے ہو جاتے ہیں۔

(۴) ایسی دلرباؤں سے مجھے کون بچا سکتا ہے جو میرے بدن سے روح کو زبردستی چھینے لیتی ہیں اور عشق کے زور سے میری عزت و سلطنت کو غصب کر رہی ہیں۔

(۵) وہ شخص فرط محبت سے غلام بن گیا جو حقیقت میں اس سے پہلے بادشاہ تھا۔

ان بکا او شکا الہوی زید ظلما (۶) وبعاداً او دنے احماماً وشیکا
ترکتہ جآذر القصر صبا (۷) مستہاماً علی الصعید تریکا
یجعل الخد واضعاً فوق ترب (۸) للذی یجعل الحریر اریکا
ہکذا یحسن التذلل للحر (۹) راذا کان فی الہوی مملوکا

امیر عبدالرحمٰن ابن الحکم

اخلاق وفضائل امیر عبدالرحمٰن ابن الحکم نہایت بردبار، فیاض، ادیب، فقیہہ، حافظ قرآن اور محدث تھا۔ ایک روز اس کے مصاحبوں میں سے کسی نے عبدالرحمٰن سے حدیث وسیر میں مناظرہ کیا تو اس نے کہا "سنو مجھے یہ سب واقعات حفظ ہیں" اور یہ کہہ کر واقعات سنا دیے۔ اس کی فیاضی کے متعلق ایک بات یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایسا کوئی شخص نہ ملا جس نے عبدالرحمٰن سے کوئی بڑی یا چھوٹی چیز مانگی ہو اور اسے نہ ملی ہو۔ عبدالرحمٰن کو سلطنت ایسے عالم میں ملی تھی کہ ملک میں کافی انتظام تھا۔ جملہ بغاوتیں فرو ہو چکی تھیں اور اس کے لئے حصول لذات اور خواہشات پورا کرنے کے سوا کوئی کام نہ رہا تھا، اس کی حالت بالکل اس جنتی کی سی تھی جس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے۔

ایک خادم کی خیانت اور عبدالرحمٰن کی چشم پوشی ایک روز بہت سا مال اور روپیوں اور اشرفیوں کے توڑے عبدالرحمٰن کے سامنے پیش ہوئے۔ خدام ان توڑوں کو پیش کرتے جاتے تھے، وہ

---

(۶) اب وہ اگر روتا ہے یا محبت کی شکایت کرتا ہے تو اس پر اور ظلم کیا جاتا ہے اور وہ موت سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔

(۷) اس کو قصر کی نازنینوں نے اپنا ہدف بنا کر زمین پر بے قابو کر کے چھوڑ دیا ہے (جاذر = گاو دشتی کے بچے)

(۸) اب اس شخص کے رخسارے زمین پر ہیں جن کا تکیہ ریشم سے بنایا جاتا تھا۔

(۹) آزاد جب محبت کا بندہ ہو جائے تو اس کے لئے ایسی ہی مسکنت زیبا ہے۔

ملاحظہ کرتا جاتا تھا۔ جب تمام حاضرین اور خدام چلے گئے، توڑے اور مال وہیں پڑا رہا۔ صرف ایک خادم رہ گیا تو اس وقت عبدالرحمٰن کو کچھ غنودگی سی آگئی اور ذرا آنکھ جھپک گئی، خادم نے اسے سوتا خیال کر کے ایک توڑا اٹھایا اور اپنی آستین میں چھپا لیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ اس حرکت کو دیکھ رہا تھا اتنے میں دوسرے خادم بھی آگئے۔ امیر نے حکم دیا کہ یہ سب مال شمار کر کے خزانے میں داخل کر دیا جائے۔ جب توڑے شمار کئے گئے تو کم معلوم ہوئے اور خدام آپس میں ایک دوسرے پر الزام رکھنے لگے۔ عبدالرحمٰن نے کہا "اس بات کو جانے دو جس نے لیا ہے اور جس نے دیکھا ہے دونوں اس کو ظاہر نہیں کریں گے اور دیکھنے والے کی شان اس کی مقتضی نہیں کہ اس کا انکشاف کرے"۔ پھر حکم دیا کہ جتنا مال موجود ہے داخل کر لیا جائے۔

کنیز کا دروازہ اشرفیوں سے چن دیا

ایک بار عبدالرحمٰن کی ایک کنیز اس سے ناراض ہو گئی، عبدالرحمٰن نے اس کے پاس آدمی بھیجا مگر اس نے دروازہ بند کر لیا اور آدمی کو نہیں آنے دیا۔ عبدالرحمٰن نے حکم دیا کہ اس کے دروازے پر توڑے اس طرح چن دو کہ دروازہ ڈھک جائے۔ جب اس کنیز نے دروازہ کھولا تو یہ توڑے اس پر گر گئے۔ کنیز نے رکھنے کے لئے شمار کئے تو تقریباً بیس ہزار اشرفیاں نکلیں۔

کنیز کے لئے قیمتی ہار کی خریداری اور وزیر کے اعتراض کا جواب

ایک بار عبدالرحمٰن نے اپنی کنیز کے لئے دس ہزار اشرفی کا ایک ہار خریدنے کا حکم دیا۔ ایک وزیر کو جو اس وقت دربار میں موجود تھا یہ بات گراں گزری، امیر نے کہا "تجھ پر افسوس ہے کمبخت! اللہ تعالیٰ نے جواہرات تو اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ ایسے حسین چہرے ان سے مزین کئے جائیں اور ان سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور حاصل ہو۔ دنیا میں جواہرات کا مصرف اس سے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حسینوں کے جسم پر آراستہ ہو کر اپنی اور ان کی بہار میں اضافہ کریں، اور ہم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں"۔ یہ کہہ کر امیر ابن شمر

ہار پر ابن شمر کی شاعری

درباری شاعر کی طرف مخاطب ہوا، اور کہا "تم کو اس موقع کا کوئی شعر یاد ہے؟" اس نے اقرار کیا اور امیر کی فرمائش پر بسر و چشم کہہ کر حسب ذیل اشعار سنائے۔

أتقرن حصباء الیواقیت والدر (۱) الی من تعالی عن سنا الشمس والبدر
الی من برت قدما ید الله خلقة (۲) ولم یک شئ غیرہ ابداً یبری
فاکرم بہ من صنعة الله جوہرا (۳) تضارل عنہ جوہر البر والبحر
لخلق الرحمن مافی سمائہ (۴) ومافوق ارضیہ ولکن فی الامر

امیر عبد الرحمن ابن الحکم نے اس کے جواب میں یہ اشعار کہے :-

قریضک یا ابن الشمر عفی علی الشعر (۵) وجل عن الاوہام والفہم والفکر
اذا شافہتہ الاذن ادی بسحرہ (۶) الی القلب ابداعاً تجل عن البحر
وہل برأ الرحمن من کل ما برا (۷) اقر لعین من منعمة بکر
تری الورد فوق الیاسمین نجدہا (۸) کما فوق الروض المنور بالزہر

---

(۱) کیا تو یاقوت اور موتیوں کے دانوں کو ایسی ہستی کے برابر کئے دیتا ہے جو آب و تاب اور مرتبہ میں چودھویں کے چاند اور سورج سے بالاتر ہے۔

(۲) یہ وہ ہستی ہے جسے خود اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے حالانکہ اس سے پہلے کسی کو یہ عزت نہ ملی تھی۔

(۳) اس طرح یہ ہستی ایک نہایت نفیس خدا ساز جوہر ہے جس کے مقابلے میں بحر و بر کے جوہر ماند ہو گئے۔

(۴) زمین و آسمان پر جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ سب کچھ خدا نے اسی کے لئے پیدا کیا اور اسے با اختیار بنایا ہے۔

(۱) اے ابن شمر تیرے شعر نے تمام اشعار کو پست کر دیا اور وہم و فہم و فکر کے احاطہ سے باہر ہو گیا۔

(۲) جب تیرے شعر کو کان سن لیتے ہیں تو وہ اپنے سحر کے اثر سے قلب تک نئی نئی باتیں پہنچا دیتا ہے اس لئے وہ رتبے میں دریا سے بھی زیادہ ہے۔

(۳) کیا اللہ نے تمام مخلوقات میں اس کے سوا بھی کوئی ایسی اچھوتی نعمت پیدا کی ہے جو آنکھوں کے لئے ٹھنڈک ہو

(۴) اس کے رخساروں کی وجہ سے تو گلاب کو یاسمین پر فوقیت دے گا۔ جیسے پھول والے باغوں کو پھولوں کی وجہ سے فوقیت ہوتی ہے۔

فلوانني ملكت قلبي وناظري (۵) نظمتهما منها على الجيد والنحر

پھر امیر نے حکم دیا کہ ابن شمر کو پانچسو دینار کا ایک توڑا انعام میں دیا جائے جب اس کا خادم ان توڑوں کو لے کر چلا گیا اور امیر کی نظر سے اوجھل ہو گیا تو امیر نے ابن شمر سے دریافت کیا "رات کو چاند کہاں رہا" اس نے کہا "حضور کے پہلو میں"

امیر سات سال تک اہل ماردہ سے لڑتا رہا۔ اسی مدت میں اہل لشکر اور محصورین سب تھک کر پریشان ہو گئے۔ ایک دن امیر لشکر کی طرف دیکھ رہا تھا، یکایک اس نے دیکھا کہ اس کا لشکر شہر کی دیواروں پر چڑھ رہا ہے اور اہل شہر پر غالب ہو چلا ہے۔ اہل شہر کمزور ہوتے جاتے ہیں اور ان میں مدافعت کی طاقت کم ہو چلی ہے۔ پھر اس نے عورتوں اور بچوں کی چیخ سنی۔ یہ سن کر امیر نے حکم دیا کہ جنگ موقوف کر دی جائے۔ پھر اپنے وزیروں اور فوجی افسروں کو طلب کر کے کہا "تم کو معلوم ہے کہ میں ان فسادات پر کس قدر دشواریوں اور جانی و مالی نقصانوں کے بعد قابو پا سکا ہوں، لیکن میں نے اہل شہر سے محض خدا کے خوف سے درگزر کی اور خدا کے لئے ان سب کو چھوڑ دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ لڑکے اور عورتیں بے قصور قتل و غارت کی نذر ہوں گے اور مجھے یہ بات بالکل ناپسند تھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری اس عنایت و شفقت لوزمین کامیابی کے وقت درگزر کرنے اور انتقام نہ لینے کا ان لوگوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کی تو ان کے لئے بہتر ہوگا ورنہ خدا نے جس طرح اس وقت ہماری مدد کی اور ہمیں غالب کیا پھر ان پر غلبہ دے گا اور انھیں ذلیل و تباہ و برباد کر دے گا۔

اس تقریر کے بعد وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ دشمنوں کے آدمی اظہار اطاعت کے لئے اس کے سامنے آ گئے اور اس کے شاہانہ مراحم سے مستفید ہوئے۔

---

(۵) اگر مجھے اپنے قلب و نگاہ پر قدرت ہوتی تو میں ان دونوں کو پرو کر اس کے سینے اور گردن کا ہار بنا دیتا۔

عبدالرحمٰن کے بعض خدام میں سے کسی نے اس کے نام ایک عریضہ لکھا جس میں اس سے ایسی ملازمت کی استدعا کی تھی جو اس کے شایاں نہ تھی۔ اس عریضہ پر امیر نے اس مضمون کی عبارت اپنے قلم سے لکھی، "جو شخص حصول مطلب کا طریقہ نہیں جانتا اس کے حق میں محرومی زیادہ بہتر ہے"

عبداللہ ابن قرلمان ابن بدر اس کا خاص خادم تھا، عبداللہ ایک دن اپنی جاگیر کی طرف گیا ہوا تھا، یہاں امیر کے پاس مجلس عیش و نشاط گرم تھی، کیونکہ اس روز امیر نے فصد لی تھی، جب لوگ مجلس سے واپس ہوتے تھے تو ہر شخص کو حسب حیثیت دو سو اشرفیوں سے پانسو تک نقد انعام دیا جاتا تھا۔ عبداللہ ابن قرلمان کو بھی یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بھی آیا تاکہ اور لوگوں کی طرح اپنا حق انعام حاصل کرے۔ اس موقع پر عبداللہ نے حسب ذیل اشعار لکھے۔

یا ملکا حل ذری المجد (۱) وعم بالانعام والرفد
طوبیٰ لمن اسمعته دعوة (۲) فی یوم اجماعک للفصد
فظل ذاک الیوم من قصفه (۳) مستوطنا فی جنة الخلد
وقد عدانی ان اری حاضرا (۴) جدی یحظ الوری یکدی
فانتعش العثرة من عاثر (۵) عدی علیه انحس القرد

---

(۱) اے بادشاہ عزت و سربلندی کی چوٹیاں تیرا مقام ہیں اور تو نے عطا اور بخشش کو عام کر دیا ہے۔

(۲) ایسے لوگوں کے لیے مژدہ ہے جنہیں تو نے اپنی فصد کے دن دعوت دی۔

(۳) اور یہ دن اپنی شگفتگی (اور آپ کی توجہات سے) جنت خلد کا ایک دن بن گیا جس میں ہر قسم کی نعمتیں اور راحتیں مہیا ہیں)

(۴) میرے منحوس نصیب نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے کہ جب مخلوق آپ کے کرم سے حصہ پاتی ہے مجھے حاضر ہونے نہیں دیتا۔

(۵) تو ایسے لغزش کرنے والے کی لغزش سے درگذر کر جس پر منحوس ترین بندر یعنی بخت سیاہ نے زیادتی کر رکھی ہے۔

وامنن باصفادسی عطائم یزل (۶) یشمل اہل القرب والبعد

امیر نے اس کے اشعار کے نیچے یہ لکھ دیا۔

من آثر التضجع فلیرض بحظہ من النوم۔ یعنی جو سویا سو اس نے کھویا۔

اس پر عبداللہ نے پھر حسب ذیل اشعار لکھے۔

لالمت ان کنت یا مولائی محروما (۷) ولا طعمت علی ما نلتہ نوما

اسئی لحرمان یوم لا اعتیاض بہ (۸) لو انّ من جنۃ الفردوس لی یوماً

ورویتی منک وجہا ما اکتحلت بہ (۹) الا تعرفت صنعا منہ محتوما

فکیف امنع ورداً منک آملہ (۱۰) صدیان حام رجائی فوقہ حاما

اب امیر نے عبداللہ کے لئے صلہ کا حکم دے دیا اور اس کے شعروں کے نیچے یہ اشعار لکھدیے۔

لا غرو ان کنت ممنوعاً ومحروماً (۱۱) اذ کنت آثرت ہونا یورث النوما

---

(۶) مجھے ایسی بخشش سے سعید کر کے احسان فرما جس نے ہر قریب وبعید کو مستفید کیا ہے۔

(۷) اے آقا اگر میں محروم ہوں تو خدا کرے کبھی نہ سوؤں اور خواب کا ذائقہ ہی نہ چکھوں کیونکہ خواب نے میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔

(۸) میں تو اس دن کی محرومی پر افسوس کرتا ہوں جس کا کوئی بدلہ نہیں ہو سکتا۔ اب اگر جنت کا دن بھی ملے تو کیا ہے۔

(۹) ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ میں نے اپنی آنکھوں میں تیری دید کا سرمہ لگایا ہو اور تیرے احسانات سے روشناس نہ ہوا ہوں۔ یعنی جب حضور میں آیا ہمیشہ انعام واکرام پایا)

(۱۰) پھر میں آپ کے چشمۂ فیض پر آنے سے کیسے رد کیا جاتا ہوں۔ حالانکہ میں تشنگی میں اس کا امیدوار بن کر آیا ہوں اور میری امید اس کے گرد چکر لگا رہی ہے۔

(۱۱) جب تو نے ایسی دوستی کو پسند کیا جس کا نتیجہ نیند ہے تو تیری محرومی جائے تعجب نہیں۔

ولم ینل امرؤ من حظوہ اسلاً (۲) حتی یشد علی الاجھاد حیسزوما
فہاک من سیبنا ماکنت تاملہ (۳) ازحمت فوق رجا الورد تحویما

امیر محمد ابن عبدالرحمن

عام اخلاق و فضائل

محمد ابن عبدالرحمن حلیم، نیک نفس، عفو پیشہ، فیاض اور اخلاق مجسم امیر تھا۔ فن حساب میں ماہر تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ امیر محمد اپنے خدام وعمال کا حساب نہایت صحت کے ساتھ خود جانچا کرتا تھا۔ اور اگر ان سے کوئی ذرا دبی غلطی یا لغزش ہو جاتی تو اس پر بھی اصلاح و تنبیہ کرتا تھا۔ اس کی متانت و سنجیدگی اور اعتدال طبیعت پر جن واقعات سے روشنی پڑتی ہے ان میں کا ایک واقعہ یہ ہے۔

حسن سیاست واستقلال مزاجی کی ایک عمدہ مثال

ہاشم ابن عبدالعزیز نے امیر کے ایک خادم کے خلاف سازش کی اور بہت سے لوگوں کو اس میں شریک کر لیا۔ صرف اپنی ذات کو اس معاملے سے بالکل علٰحدہ رکھا تاکہ امیر اس بارے میں ہاشم ہی سے مشورہ کرے۔ چند روز کے بعد امیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور دوران گفتگو میں اس خادم کا ذکر اس طریقے سے چھیڑا کہ اس کی نسبت امیر کا خیال ظاہر ہو سکے، لیکن خلاف امید اسے اپنی کامیابی میں دیر ہوئی۔ اور امیر کا کوئی خیال معلوم نہ ہو سکا۔ پھر اور لوگوں نے اس خادم کے متعلق امیر سے گفتگو کی اور اب خود ہاشم نے بھی اثنائے گفتگو میں اپنی رائے پر اتنا اصرار کیا کہ اس خادم کے نہ صرف معزولی بلکہ خون تک کے جواز کی تحریک کر دی۔ لیکن امیر محمد نے اس کے جواب میں صرف ہاشم کو بلا کر ایک خط دکھایا

---

(۲) کوئی شخص احسان کو فقط امید کے ذریعے سے حاصل نہیں کر سکتا جب تک سعی و کوشش کے لئے اپنا سینہ مضبوط نہ کر لے۔

(۳) سو تو ہمارے انعام و صلہ جسکی تجھے امید تھی اور جسکے لئے تو نے اُمید کے گھاٹ پر چکر لگایا۔

اور پوچھا کہ کیا یہ تمھارا خط ہے، ہاشم نے اقرار کیا اور اس کے وجوہ بیان کئے امیر نے کہا مجھ
اس خادم کے خلاف بے حد شکایتیں پہنچی ہیں۔ تیری کیا رائے ہے۔ ہاشم نے کہا سزا اور جلاوطنی۔
اس پر امیر نے حکم دیا کہ اچھا ٹھیر و اور وہ کاغذوں کا پلندہ رکھا ہے اٹھالاؤ۔ ہاشم پلندہ اٹھالایا!
اس میں غالباً سو خط بندھے ہوئے تھے۔ امیر نے حکم دیا کہ ان کو پڑھو۔ ہاشم نے ان خطوں کو
ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کیا۔ ہر خط کا مضمون اس نتیجہ پر پہنچتا تھا کہ ہاشم واجب القتل ہے۔
خطوں کو پڑھتے وقت ہاشم کا ہاتھ کانپ رہا تھا، اس کی پیشانی عرق آلود تھی، منہ سے جھاگ
آرہے تھے۔ جب وہ ایک خط پڑھ چکتا تو دوسرا پڑھنا شروع کر دیتا۔ اس حالت میں جب وہ سب
خط پڑھ چکا تو امیر نے دریافت کیا کہ تمھارے پاس بھی کچھ عذرات ہیں۔ ہاشم نے قسمیں کھانا شروع
کیں اور کہا کہ میرے حاسدوں نے آپ کی توجہ اور نیک خیالی دیکھ کر مجھے تباہ کرنے
کے لئے یہ کارروائیاں کی ہیں، حضور اگر اس کی تحقیقات فرمائیں اور حق و باطل ظاہر ہونے تک
مجھ سے درگزر کریں تو بہتر ہے اس لئے کہ جو کام آپ کر گزریں گے اس پر ندامت بے سود ہوگی۔
اور جو نہیں کیا ہے اس کے کرنے کی قدرت ہر وقت حاصل ہے، پھر حضور والا کی سنجیدگی متانت
اور بتدریج فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی صفت میرے معاملے میں بھی بروئے کار آنا چاہئے، کیونکہ
یہ صفات تو حضور کے اخلاق میں خصوصیت سے نمایاں ہیں۔

امیر نے کہا ''اے ہاشم اکثر جلدبازی کا نتیجہ ندامت ہوتا ہے اور تو جانتا ہے کہ جلدباز
نہیں ہوں ورنہ تو ہی پہلا شخص تھا کہ جو اب تک قتل ہو چکا ہوتا۔ ہم نے ان امور کی بہت کچھ جانچ
کرلی ہے۔ اور ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں سے بہت سی باتیں غلط اور بے بنیاد بہتان ہیں
جو تیرے خلاف باندھے گئے ہیں۔ اگر ہم ان بہتانوں کو ان کے لکھنے والے کے پاس واپس
کر دیتے اور انھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ ہم ایسے معاملات پر کوئی توجہ نہیں کرتے تو وہ ہماری خیرخواہی
اور خبررسانی سے دل شکستہ ہو جاتے۔ ہم نے ان معاملات کو اپنے دل میں رکھ کر ان کی بابت
پورا علم حاصل کرنے کے بعد سچ جھوٹ کی حقیقت معلوم کر لی اور خوب سمجھ لیا ہے کہ راست و

دروغ میں کیا فرق ہے۔ اب تجھے بھی لازم ہے کہ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ آنے دے تاکہ ان
واقعات کی اطلاع دینے والوں کو یہ حال معلوم نہ ہو، اگر تو نے لوگوں کو اطلاع کر دی اور اس
گفتگو کا ایک لفظ بھی ظاہر ہوگیا تو ایسی سخت پاداش اٹھانا پڑے گی کہ تیرے بعد شاید کوئی بھی
ایسے جرم کی جرأت نہ کرے گا۔ میں اس وقت تیرے حق میں کسی کی سفارش قبول کروں گا نہ تیری
کسی خیر خواہی کا لحاظ کروں گا۔ اب جو طریقہ تو مناسب سمجھے وہ اختیار کرے۔"

ہاشم کے ایک حریف ولید ابن عبدالرحمٰن کی سیر چشمی، پسماندگان ہاشم کے ساتھ سلوک

جب ہاشم مقام کرکر میں قتل ہوگیا اور اس کی اطلاع امیر
کو پہنچی تو لوگ اس کے خصائل پر تبصرہ کرنے لگے۔ امیر
محمد نے کہا "ہاشم میں عجلت اور غصہ بہت تھا اور دانشمندی کی کمی تھی۔ یہ حالت اس کی ہمیشہ رہی"
اس مجلس میں وزرا کے ساتھ ولید ابن عبدالرحمٰن ابن غانم بھی موجود تھا جس کے اور ہاشم کے
درمیان پہلے سے کچھ رنج تھا۔ اس نے خلاف توقع ہاشم کی برائی میں کچھ حصہ نہ لیا بلکہ تردید کرتے
ہوئے کہا "ہاشم تقدیر سے مجبور ہوگیا ورنہ اس نے پوری پوری کوشش اور دانشمندی سے
امیر کی خیر خواہی کی اور یہ مشیت ایزدی ہے کہ اسے اور اس کے ہمراہیوں کو ناکامی ہوئی لیکن
اس نے اپنی جان قربان کر دی۔" امیر ولید کی گفتگو سے بہت خوش ہوا اور اس کے دل میں جو
خیال ہاشم کے خلاف قائم کرایا گیا تھا نکل گیا۔ پھر امیر نے وہ تمام کام جو ہاشم کے متعلق تھے ولید
کے سپرد کیے جانے کا حکم دیا لیکن ولید نے عرض کی کہ خدائے تعالیٰ امیر پر اپنا فضل و کرم رکھے
اور اقبال و دولت میں دن دونی ترقی دے۔ ہاشم امیر کا غلام تھا اور دشمن کے حق میں تیروں
میں کا ایک تیر اور تلواروں میں کی ایک تلوار تھا۔ وہ امیر کی خدمت گزاری میں یہاں تک مصروف
رہا کہ امیر پر قربان ہوگیا اور امیر کی رضامندی حاصل کی۔ اس لئے امیر کو بھی چاہئے کہ ہاشم کے
بعد اس کی اولاد کے ساتھ بھی ایسی ہی بھلائی کریں اور اس کا متعلقہ کام اس کی اولاد ہی کے
سپرد فرمائیں۔" امیر نے کہا "واللہ تو نے نہایت شریفانہ بات کہی اور ہمیں بھی بھلائی کی طرف
متوجہ کیا، تو ہمیشہ سے نیک خیال اور اچھا آدمی ہے۔ بہترین آدمی ہمارے لئے وہ ہے

(باقی)

بقائے صحت کی
نوایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کیجا رہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے ناآشنا تھے۔ آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جاکر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشئی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں، پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں۔ آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشئی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اسکو لیجانیکی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گنٹھیا، ورم۔ درد، پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بےمثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے۔ جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشئی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۸ دہلی

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ سے شائع کیا)

الاعتصام بالحدیث والسنہ

جامعہ ستمبر ۱۳۱ء میں ایک مضمون مولنا اسلم صاحب جیراجپوری کا "منکرین حدیث" کے زیر عنوان نظر سے گزرا۔ مولنا کی تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ "حدیث و سنت دلیل شرعی اور حجت دینی نہیں ہوسکتی"۔ جامعہ کے ایک ندوی طالب العلم نے اس مضمون کا جواب بھی دیا ہے۔

میرے حلقہ احباب میں اس موضوع سے کافی دلچسپی لی گئی اور مجھے اظہار خیال کے لئے مجبور کیا گیا۔ لہذا میری اس تحریر کا مقصود معارضہ یا محاکمہ نہیں محض امتثال امر ہے۔

عام طور پر مسلمانان عالم کے لئے دلائل شرعی قرآن وحدیث، اجماع و قیاس ہیں ان ادلہ شرعیہ سے جو قول بھی باہر ہو، مردود ہے، ہرگز مقبول نہیں ہوسکتا، قرآن تو خیر متفق علیہ ہے اب رہی حدیث، تو یہی مابہ النزاع ہے لیکن پھر بھی اثبات مدعا کے لئے اس موقع پر حدیث سے استدلال یقیناً قابل تسلیم ہے کیونکہ منکرین حدیث، حدیث کو دینی تاریخ قرار دیتے ہیں، جس سے عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ میں قرآن پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، پس جس طرح دینی تاریخ سے عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ میں قرآن اور آیات پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم کی جاسکتی ہے، اسی طرح اطاعت رسول کے متعلق جو نص صریح وارد ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کی تفسیر اور تعمیل عہد رسالت میں کیونکر کی گئی۔ اس معاملے میں حدیث سے استدلال بالکل درست اور منکرین حدیث کے لئے ناگزیر طور پر قابل قبول ہے۔

پھر حدیث کے بعد اجماع امت کا نمبر آتا ہے، جس سے منکرین حدیث کو مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، کیونکہ خود قرآن مجید سے اجماع امت کے حجت شرعی ہونے پر دلائل قطعی قائم ہوسکتے ہیں۔

وَمَن يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى جو شخص ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسول کی مخالفت

وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَہَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِیْرًا
(النساء ۵/۱۴)

کرے اور مومنین کی راہ کے سوا دوسرے راستے کی پیروی کرے، ہم اس کو اُسی طرف متوجہ کر دیں گے جدھر وہ متوجہ ہوا اور اس کو ہم جہنم میں ڈال دیں گے، جو کہ بہت بری جگہ ہے

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا
(آل عمران ۴)

اے مسلمانو! خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لو، اور آپس میں تفرقہ اور پھوٹ نہ ڈالو، اور اللہ تعالیٰ نے تم پر جو نعمتیں نازل فرمائی ہیں اُن کو یاد کرو۔ کہ تم لوگ (اسلام کے پہلے) ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی (ایک توحید، ایک پیغمبر، ایک قرآن، ایک دین ہر امر میں متفق کر دیا) پھر اس طرح متفق کہ گویا تم لوگ بھائی بھائی ہو گئے۔

واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین
(انفال ۱۰/۲)

اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور آپس میں نہ جھگڑا کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے، اور تمہاری قوت اور دولت جاتی رہے گی۔ اور صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان آیتوں سے اتفاق و اجتماع کا وجوب اور اختلاف و افتراق کی حرمت، اجماع امت کا دلیل شرعی ہونا عیاں طور پر ثابت ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النساء ۵/۸)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور صاحب امر کی

"اولوالامر" کے معنی کی تنقیح اور تعیین میں اختلاف ہے۔

قال فی معالم التنزیل اختلفوا فی اولی الامر قال ابن عباس وجابر رضی اللہ عنہما ہم الفقہا

معالم التنزیل میں ہے کہ لوگوں نے اولوالامر کے معنی میں اختلاف کیا ہے، ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اولوالامر

والعلماء الذین یعلموا الناس معالم دینہم وہو	مراد علما اور فقہا ہیں جو لوگوں کو دین کی باتیں سکھاتے ہیں
قول الحسن والضحاک ومجاہد	اور یہی قول حسن اور ضحاک اور مجاہد کا ہے۔
وقال فی مدارک التنزیل ای الولاۃ والعلماء	اور مدارک التنزیل میں ہے کہ حکام اور علماء مراد ہیں کیونکہ
لان امرہم ینفذ علی الولاۃ	علماء کا حکم حکام پر نازل ہوتا ہے۔

اس آیت شریفہ سے بھی امام فخر الدین رازیؒ نے اجماع امت کا حجت دینی و دلیل شرعی ہونا ثابت کیا ہے، حیث قال فی تفسیر ہذہ الآیۃ

وجب ان یکون المراد بقولہ واولی الامر اہل	واجب ہے کہ خداوند تعالی کے قول "واولی الامر" سے
الحل والعقد من الامۃ، وذلک یوجب القطع	مراد اس امت کے ارباب حل وعقد ہوں، اور یہ قطعی
بان اجماع الامۃ حجۃ	طور پر اجماع امت کے حجت شرعی ہونے کو واجب کرتا ہے

اب اجماع کے حجت ہونے پر کچھ احادیث ملاحظہ ہوں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یجمع امتی	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کبھی ضلالت
او قال امۃ محمد علی ضلالۃ و ید اللہ علی الجماعۃ	اور گمراہی پر اجماع نہیں کرے گی اور اللہ کی مدد جماعت
ومن شذ شذ فی النار۔ رواہ الترمذی	کے ساتھ ہے اور جو شخص جماعت سے کنارہ کرے گا وہ جہنم
	میں بھی اکیلا جائے گا۔
وقال صلی اللہ علیہ وسلم اتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ	نیز آپ نے فرمایا کہ تم لوگ بڑی جماعت کی اتباع کرو کیونکہ جو شخص جماعت
شذ فی النار رواہ ابن ماجہ وقال فی المرقاۃ السواد	سے علیحدہ ہوگا جہنم میں بھی تنہا جائے گا اور مرقاۃ میں ہے کہ سواد اعظم
الاعظم یعبر بہ عن جماعۃ الکثیرۃ والمراد ما علیہ اکثر المومنین	سے مراد وہ امر ہے جس پر اکثر مسلمانوں کا اتفاق ہو

پھر عقلاً و عرفاً بھی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب امور دنیاوی میں بھی کثرت آرا بالاتفاق مسلّم اور لائق عمل ہے۔ تو امور دینی میں اس کا لحاظ موجب فلاح کیونکر نہ ہوگا؟

ادلہ شرعیہ میں سب سے آخری درجہ قیاس کا ہے، اگر قرآن یا حدیث یا اجماع امت سے کوئی بات ثابت نہ ہو تو پھر قیاس ہے۔

اب سب سے پہلے اس دعوے کو قرآن سے جانچ کر دیکھنا چاہئے کہ کہاں تک یہ دعویٰ مبنی بر صداقت ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
(آل عمران ۳۱)

اے میرے حبیب! آپ مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو۔ خدا خود تمھیں محبوب بنالے گا، اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

منکرین حدیث اس آیت کریمہ کی ایک دور راز کار تاویل کرتے ہیں کہ خود چونکہ رسول کو اتباع قرآن کا حکم ہے (اِتَّبِعْ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ) اس لئے فاتبعونی سے مراد اتباع قرآن ہے۔ حالانکہ اس آیت صریحہ کے لئے کسی تاویل کی قطعاً گنجائش نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ اس آیت میں خطاب مومنین سے ہے، جو یقیناً احکام قرآنی سے منحرف نہ ہوں گے۔ قرآن کو منزل من اللہ اور واجب الاطاعت جانتے ہوں گے اور اس پر عمل پیرا ہوں گے لیکن باوجود اس کے حکم دیا جاتا ہے کہ نہیں، آپ ان سے فرمادیں کہ اُن کا ایمان، اُن کا عمل بالقرآن، ان کی خدا سے محبت کوئی چیز قابل قبول نہیں جب تک کہ وہ آپ کی اطاعت نہ کریں، آپ سے محبت نہ کریں، گویا ؎

نئے انداز سے ہم عشق کا اظہار کرتے ہیں
جو تم کو پیار کرتا ہے ہم اس کو پیار کرتے ہیں

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا
(الحشر ۷)

رسول جو کچھ تم کو دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو۔

حدیث وسنت کے حجت دینی ہونے پر یہ آیت کریمہ کس قدر صاف اور عیاں اور دلیل روشن ہے، لیکن منکرین حدیث کتنی "یادر ہوا" تاویلیں کرتے ہیں کہ یہ چونکہ مال فیئ کی تقسیم کے متعلق ہے اس لئے اس کو حدیث وسنت سے کوئی واسطہ نہیں۔

یاللعجب، دعوے عمل بالقرآن اور یہ بے خبری، کہ "العبرۃ لعموم اللفظ لالخصوص المحل"،

اگر اسی طرح ہر جگہ عمومیت لفظ کا خیال نہ کیا جائے اور خصوصیت محل کا اعتبار کیا جائے تو پھر بہت سے احکام قرآنی خصوصیت محل کی وجہ سے بیکار ہو جائیں گے۔

"مدعیان عمل بالقرآن" اپنے مخالفین سے کلام مجید سے ثبوت طلب کرتے ہیں اور آیات قرآنی کی تشریح قرآن ہی سے چاہتے ہیں لیکن خود اس آیت کی تشریح اور تحقیق میں روایت سے کام لے رہے ہیں اور روایت وحدیث سے استدلال ہے، لہذا منکرین حدیث کو اپنے مخالفین کی تشریح آیات قرآنی میں استدلال بالحدیث سے ہرگز اعراض مناسب نہیں۔

اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ (النساء ۵۹)	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور صاحب امر کی جو تم میں سے ہوں، اگر کسی معاملے میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو

اب رہا یہ امر کہ "اولی الامر منکم" صاحب امر کی اطاعت بھی تو اسی طرح ثابت ہے، پھر حدیث کی طرح اُن کا مجموعۂ اقوال و افعال بھی ہونا چاہئے۔"

میں کہتا ہوں کہ ہاں، اگر اولوالامر سے مراد علما اور فقہا ہوں، جب بھی اطاعت واجب ہے۔ فَاسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ، اور اگر حکام یا بادشاہان مراد ہوں جب بھی اطاعت واجب، عَلَيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا، لیکن بہر تقدیر ان کی اطاعت حدود شریعت تک ہے۔ اگر حکام یا بادشاہان، علما یا فقہا کوئی حکم خلاف شریعت دیں تو ہرگز واجب الاطاعت نہیں اور حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ برخلاف رسول کے کہ رسول کا کوئی حکم خلاف شریعت نہیں ہو سکتا کیونکہ حکم رسول تو عین شریعت ہے، پس معلوم ہوا کہ حکام یا بادشاہان، علما یا فقہا کی اطاعت کا حکم محض بربنائے مصالح ہے۔ اور اصل میں اطاعت شریعت کے حکم کی ہے، پھر اُن کے مجموعۂ اقوال و افعال کی کیا ضرورت ہے؟

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" اطاعت خدا پھر اطاعت رسول، سب کے بعد بغیر ذکر لفظ "اطیعوا" عطف کے ذریعے سے اطاعت الوالامر کا حکم صاف ظاہر کر رہا ہے،

کہ درحقیقت خدا اور رسول کی اطاعت فرض ہے، اور "اولی الامر" کی تاکید "اطیعوا" سے کیے بغیر اطاعت الوالامر کا حکم بربنائے مصالح ہے اور عین اطاعت شریعت کا حکم، کیونکہ پھر فوراً ہی ارشاد ہوتا ہے کہ۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ

کہ اگر تم آپس میں جھگڑ بیٹھو، تو اُس کو خدا اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یہ نہیں کہ "فردوہ الی اللہ والرسول والی اولی الامر منکم"

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (انفال ۹)

اے مومنو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

۵ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (آل عمران ۴)

خدا اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

۶ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا

جو خدا اور رسول کا فرماں بردار ہوا اُس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی

منکرین حدیث سے سوال ہے کہ اگر "اطیعو الرسول" سے اطاعت قرآن ہی مراد ہے کیونکہ دوسری چیز نہیں، تو پھر "اطیعوا اللہ" کے بعد "اطیعوالرسول" کہنا تحصیل حاصل ہے، "اطیعوا اللہ" ہی سے اطاعت رسول، اطاعت قرآن و شریعت ظاہر ہے، پھر "اطیعوالرسول" کی کیا ضرورت تھی؟

درحقیقت "اطیعواالرسول" سے مراد اطاعت قرآن ہو ہی نہیں سکتی، یہ محض "کھینچ تان" ہے کیونکہ جہاں جہاں خداوند تعالیٰ نے اطاعت قرآن کا حکم دیا ہے وہاں دوسرا طرز بیان اختیار فرمایا ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

فَمَنِ اتَّبَعَ ھُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (طٰہٰ ۱۶)

جس نے میری ہدایت (کتاب) کی پیروی کی وہ گمراہ نہ ہوگا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (اعراف ۱)

اس کی پیروی کرو، جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے آتارا گیا ہے، اور خدا کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کی اتباع نہ کرو

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (المائدہ ۳)

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے، اور ایک کتاب واضح کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتاتا ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور ان کی راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیرا (احزاب ۲)

بیشک تم لوگوں کے لئے رسول اللہ صلعم کی ذات اقدس میں (پیروی اور اتباع کے لئے) بہترین نمونہ ہے، جو شخص خوف خدا و یوم آخرت دل میں رکھتا ہے اور خدا کا بکثرت ذکر کرتا ہے۔

منکرین حدیث اس برہان قاطع کے بعد صرف یہیں تک سر تسلیم خم کرتے ہیں کہ "حدود قرآنی تک (حدیث وسنت سے) رسول اللہ کے عمل بالقرآن کا نمونہ قابل تسلیم ہے" لیکن رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات اقدس کا عمل اگرچہ انسانیت اور زندگی کے ہر شعبے کے متعلق بہترین نمونہ ہونا قابل تسلیم ہے اور لائق اتباع نہیں، بریں عقل ودانش بباید گریست۔ محض ہوائے نفسانی اور آزادی کے لئے بہترین نمونے کو چھوڑ دینا کونسی عقل سے جائز ہے؟

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (بیشک رسول صلعم کی ذات اقدس میں تمہارے لئے اتباع اور پیروی کا بہترین نمونہ ہے) بالکل عام ہے، اس کو حدود قرآنی تک محدود کر دینا آپ نے قرآن کے متعلق اپنے عمل سے جو نمونہ قائم کر دیا ہے۔ وہی اس آیت سے مقصود ہے، کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

۸ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (سورۂ بقرہ)

اور (جدھر آپ نماز پڑھتے تھے) اُسے ہم نے اس لئے قبلہ بنایا تاکہ جانچیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون پھر جاتا ہے۔

یعنی بیت المقدس کو اس لئے قبلہ بنا دیا گیا تھا تاکہ مسلمانوں کا امتحان ہو کہ اپنا آبائی قبلہ یعنی کعبہ چھوڑ کر رسول کے حکم سے بیت المقدس کو قبلہ بناتے ہیں یا نہیں، اگر اطاعت رسول ضروری نہیں تو پھر اس امتحان کی کیا ضرورت تھی۔

۹ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (سورہ انفال)

اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور آپس میں جھگڑ کرو، ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری قوت جاتی رہیگی اور صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تیرہ سو برس قبل خداوند علام الغیوب نے اپنی رحمت کاملہ سے خاصۃً منکرین حدیث ہی کی ہدایت کے لئے یہ آیت نازل فرمائی تھی اور اتمام حجت کر دیا تھا تاکہ پھر کسی تاویل اور عذر کا موقع باقی نہ رہے کہ اطاعت رسول تمام عالم اسلام کا ایک متفق علیہ فیصلہ ہے اس میں جھگڑا پیدا کر کے اپنی قوت کو ضائع نہ کرو، ورنہ

۱۰ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ (سورہ نساء)

جو شخص (تمام عالم اسلامی کے ایک متفق علیہ فیصلے کو ٹھکرا کر) (اس مذکورہ آیت) ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسول کے برخلاف کرے اور (اتباع ہوائے نفسانی میں) جمیع مومنین کی متفق علیہ راہ کے سوا کوئی دوسری راہ اختیار کرے، تو جدھر وہ متوجہ ہوا (یعنی جو راہ جدید اس نے اختیار کی) اُسی راہ کی طرف ہم اُسے متوجہ کر دیں گے، اور جہنم میں ڈال دیں گے۔

کیا منکرین حدیث تیرہ سو برس قبل کے "فیصلہ آسمانی" پر بھی سر تسلیم خم نہ کریں گے، اور اس

وعید شدید کے باوجود اجماع امت کی مخالفت کرتے ہوئے، حدیث وسنت کو حجت دینی اور دلیل شرعی نہ مانیں گے۔ اور حدیث وسنت کو ناقابل عمل ہی سمجھیں گے؟

۱۱؎ یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا (سورہ نساء پ۵)	اس دن (روز قیامت) کفار اور جن لوگوں نے رسول کی نافرمانی کی، یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہم زمین میں ملا دئے جائیں، لیکن خدا سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

کیا منکرین حدیث یہاں بھی وہی تاویل کریں گے کہ "آم سے مراد املی" یعنی رسول کی نافرمانی سے مراد قرآن کی نافرمانی ہے! اگر ایسا ہے تو پھر "کفروا" بیکار ہو جاتا ہے، کیونکہ قرآن کی نافرمانی کرنے والا تو کافر ہی ہوگا، پھر "کفروا" کی ضرورت؟

خواہ مخواہ تاویل کرنا اور بات ہے، ورنہ درحقیقت اس آیت میں دو قسم کے نافرمانوں کا ذکر ہے، ایک خدا کا نافرمان، یعنی منکر قرآن و رسول، جسے "کفروا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے رسول کا نافرمان یعنی منکرین حدیث واہل بدعت وغیرہ۔

۱۲؎ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا	جس شخص نے خدا کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گیا۔

جس نے خدا کی نافرمانی کی، یعنی منکر قرآن و رسول ہوا تو کھلم کھلا کافر ہو گیا، اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کھلی گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے اور جس نے صرف رسول کی نافرمانی کی اس کا دین ناقص رہا، اس کا ایمان مکمل نہ ہوا اور وہ مورد عتاب خداوندی ہوا اور واضح ہے کہ یہ بھی کھلی گمراہی ہے۔

۱۳؎ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا۔ (سورہ نساء پ۵)	اور جس نے اطاعت کی اللہ کی اور رسول کی تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ حضرات بہترین رفیق ہیں۔

تعجب ہر کہ منکرین حدیث کیوں ہوائے نفسانی کے پیچھے، صریح الفاظ کی تاویل فرماکر حدیث وسنت سے اعراض کرتے ہیں، اور اس نعمت عظمیٰ سے محرومی کو پسند فرماتے ہیں؟

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا﴾	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے، اور اگر وہ لوگ جبکہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تو آپ کے پاس آتے اور خدا سے استغفار کرتے اور اُن کے لئے رسول بھی استغفار کرتے تو بیشک وہ خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

صاف ظاہر ہے کہ بلا واسطہ جناب رسالت بارگاہ خداوندی میں گزر نہیں، رسول واجب الاطاعت ہیں، قبول توبہ میں توسط پیغمبر کی ضرورت ہو۔ اس کے بعد ہی پھر ارشاد ہوتا ہے اور اس حکم کی مزید تشریح ہو جاتی ہے، کہ

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (سورہ نساء ع۹)	قسم ہے آپ کے رب کی، یہ لوگ ایمان والے نہوں گے جب تک کہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حکم نہ بنائیں، پھر اپنے دلوں میں آپ کے فیصلے سے کسی قسم کی کدورت نہ پائیں، اور آپ کے حکم کو پوری طرح رضا ورغبت مان لیں

درمنثور میں ہر کہ ایک پانی کی نالی تھی، جس سے حضرت زبیر اور ایک انصاری اپنے اپنے کھیت سینچتے تھے، انصاری نے کہا تم پانی کھول دو کہ ہمارے درختوں میں بھی آئے، حضرت زبیر نے انکار کیا، حضور میں قضیہ پیش ہوا، آپ نے فرمایا، زبیر پہلے تم اپنے درخت سینچ لو، پھر پانی کھول دو، انصاری خفا ہو کر بولا، یہ رعایت اس لئے ہے کہ زبیر آپ کے قرابت مند ہیں، حضور کے روئے مبارک کا رنگ غصے سے بدل گیا اور کہا، اے زبیر پانی روک لو، یہاں تک کہ دیواروں سے بہہ کر نکلے، اُسی وقت یہ آیت اتری کہ، فلا وربک الخ

ظاہر ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ وحی خفی یا اجتہاد کی بنا پر تھا، کیونکہ قرآن میں اس قسم کے قضیئے کے

لئے کوئی نص صریح نہیں، لیکن انصاری کے اعراض پر آپ کا غضب اور پھر نزول آیت اور اتباع حکم رسول کی تاکید شدید سے حدیث و سنت کا اتباع واجب قطعی ہو جاتا ہے۔

اس روایت سے قطع نظر بھی آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے یہی معنی، یہی مفہوم اور یہی حکم ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا دار و مدار ہی اس پر ہے کہ اپنے ہر جھگڑوں میں رسولؐ کو حکم بنایا جائے اور پھر آپ کے فیصلے کو برضا و رغبت قبول کر لیا جائے اور اب جب کہ رسولؐ ہم لوگوں میں موجود نہیں اس حکم کے تعمیل کی سوائے اس کے اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ حدیث و سنت سے ہر قضیے کا فیصلہ ہو اور حدیث و سنت کے فیصلے کو بطیب خاطر قبول کیا جائے۔

اتباع حدیث و سنت کے لئے یہ آیت دلیل محکم اور آفتاب روشن ہے اور کسی تاویل کی محتمل نہیں ہو سکتی، یوں تو اور بھی بے شمار دلائل ہیں، لیکن سب سے قطع نظر آخر میں ایک اور صرف ایک دلیل۔

۱۶۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (سورہ نساء ع ۱۱)	جس نے رسول کی اطاعت کی بیشک اس نے خدا کی اطاعت کی

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اطاعت رسول میں خدا کی اطاعت داخل ہے، لیکن یہ کہیں نہیں فرمایا کہ من یطع اللہ فقد اطاع الرسول جس نے خدا کی اطاعت کی، اس نے رسول کی بھی اطاعت کی۔ پس معلوم ہوا کہ رسول کی اطاعت کافی ہے۔ اور صرف خدا کی اطاعت کافی نہیں، خواہ اس وجہ سے کہ اللہ کی اطاعت کا ایک جزو یعنی اطاعت رسول ترک ہوا، یا یہ کہ بدوا سطہ اطاعت و عبادت مقبول نہیں، کیونکہ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاہدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کی طرف (رسائی حاصل کرنے کے لئے) وسیلے کی تلاش کرو، اور اس کی راہ میں تم جہاد کرو، تاکہ فلاح پاؤ۔

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ

قرآن سے اس مضمون کی خوب اچھی طرح تشریح ہو چکی، کہ اطاعت رسول فرض، حدیث و سنت دلیل شرعی، حجت دینی اور واجب الاتباع ہے، اب اس کی مزید تائید کے لئے حدیث و سنت کو بھی دیکھ لینا چاہئے کہ حضور نے ان آیات قرآنی کی کیا تشریح فرمائی، کیا معنی سمجھائے اور صحابہ کا طرز عمل حدیث و سنت کے متعلق کیا رہا؟

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل امتی یدخلون الجنۃ الا من ابیٰ قیل ومن ابیٰ؟ قال من اطاعنی دخل الجنۃ ومن عصانی فقد ابیٰ

(رواہ البخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری کل امت جنت میں داخل ہو گی، مگر جس شخص نے انکار کیا، لوگوں نے عرض کیا حضور کی امت میں ایسا کون شخص ہے جو حضور سے (حضور کی شریعت سے، قرآن سے) مجال انکار رکھتا ہو ارشاد ہوا جس نے میری اطاعت کی جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی، اُس نے (گویا) (قرآن و شریعت سے) انکار کیا۔

اصح الکتب بعد کتاب اللہ (بخاری شریف) کی یہ حدیث کتنے پر زور طریقے پر "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کی ترجمانی کر رہی ہے کہ "اطیعوا الرسول" سے مراد اطاعت قرآن نہیں، بلکہ اطاعت رسول اور اتباع حدیث و سنت ہے۔

عن انس بن مالکؓ قال جاء ثلثۃ رھط الیٰ ازواج النبی صلعم۔ یسالون عن عبادات النبی صلعم، فلما اخبروا بہا، تقالوہا، فقالوا این نحن من النبی صلعم وقد غفر اللہ لہ من ذنبہ ما تقدم وما تاخر۔ فقال احدہم اما انا فاصلی اللیل ابدا وقال الآخر انا اصوم ابداً ولا افطر وقال الآخر

تین جماعتیں ازواج مطہرات کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق سوال کرنے آئیں اور جب اُن کو اس کی خبر دی گئی تو انھوں نے عبادت رسول صلعم کو نہایت قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ کہاں ہم لوگ اور کہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ کے تو کل اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دئے گئے ہیں، پھر اُن میں سے ایک

انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبی صلعم فقال انتم الذین قلتم کذا وکذا، انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ، لکنی انا اصوم وافطر واصلی وارقد، واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔

(رواہ البخاری والمسلم)

نے کہا کہ میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا ہوں دوسرے نے کہا میں تو ہمیشہ روزہ رکھتا ہوں اور کبھی افطار نہیں کرتا، تیسرے نے کہا میں عورتوں سے کنارہ کرتا ہوں اور کبھی شادی نہ کروں گا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمانے لگے۔ تم لوگوں میں اس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی؟ میں تم لوگوں کو خدا کا خوف دلاتا ہوں اور خدا سے ڈراتا ہوں، مجھے دیکھو کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

صحیحین کی اس روایت صحیحہ سے ظاہر ہے کہ آپ نے اتباع سنت کی کس قدر تاکید شدید فرمائی ہے اور گویا ہر شعبہ زندگی کے لئے اپنے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنانے کی ہدایت فرمائی "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کی تشریح بھی اس حدیث سے اچھی طرح ہو گئی، کہ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کو صرف حدود قرآنی تک محدود کر کے لائق عمل سمجھنا ہرگز درست نہیں۔

عن ابی رافع رض قال قال رسول اللہ صلعم لاالفین احدکم متکئا علی اریکتہ یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ اونہیت عنہ فیقول لاادری ماوجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ

(رواہ احمد وابوداؤد)

ابی رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگوں میں سے میں کسی کو بھی ایسا نہ پاؤں کہ وہ متکبرانہ انداز سے، اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا ہو اور جب اس کے پاس میرا کوئی حکم پہنچے، جس کے متعلق میں نے حکم دیا ہو یا منع کیا ہو، پس وہ میرے حکم کو سن کر کہے کہ میں نہیں جانتا، جو کچھ میں نے کتاب اللہ میں پایا اس کی اطاعت کی۔

اس حدیث سے "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" کے معنی واضح اور متعین ہو گئے کہ اگرچہ

تم کتاب اللہ پر عمل کرو، اگر میری سنت سے اعراض کروگے تو ہرگز قابل قبول نہیں
اس حدیث کے بعد ہر مسلمان کو منکرین حدیث کے فتنے سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے،
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سو برس قبل پیشینگوئی فرما کر بچنے کی تاکید فرمائی ہے اور حدیث
ذیل پر عمل کرنا چاہیے کہ

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مأۃ شہید (رواہ البیہقی)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری سنت پر عمل کیا، فساد امت یعنی غلبہ بدعت اور جہل کے وقت اُس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

عن مالک بن انس مرسلا، قال قال رسول اللہ صلعم ترکت فیکم امرین، لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ (رواہ فی الموطا)

مالک ابن انس سے مرسلا روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم لوگ اُن پر عمل کرتے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے، اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت۔

عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلعم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد قال بسنۃ رسول اللہ صلعم، قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ صلعم قال اجتہد برائی ولا آلو، قال فضرب رسول اللہ صلعم علی صدرہ، وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ (رواہ الترمذی، وابوداود، والدارمی)

معاذ ابن جبل کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلعم نے مجھے والی یمن بنا کر بھیجا تو مجھ سے سوال کیا کہ اگر کوئی جھگڑا تمھارے آگے پیش ہوگا تو کس طرح فیصلہ کروگے میں نے عرض کیا کہ کتاب اللہ سے۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ ہو، میں نے کہا سنت رسول سے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی نہ پاؤ، میں نے عرض کیا تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، پس رسول اللہ صلعم نے خوش ہو کر میرے سینے پر مارا اور کہا، خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے رسول کو اُس چیز کی توفیق بخشی جس سے اس کا رسول خوش ہوتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حدیث وسنت محض دینی تاریخ کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ حجت دینی اور دلیل شرعی ہے، ورنہ حضور نے اظہار رضامندی کیوں فرمایا؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے "اطیعوا الرسول" کی تشریح کے بعد صحابہؓ کے طرز عمل کو دیکھنے سے اور بھی اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ ہرگز صحابۂ کرام اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین، صرف تمسک بالکتاب کو کافی نہیں سمجھتے تھے اور حدیث وسنت پر عمل ضروری اور لازمی سمجھتے تھے، جب کسی نے کوئی حدیث پیش کی، شہادت یا حلف سے اس کی توثیق فرماکر ضرور قبول کرلیتے تھے، البتہ خلفائے راشدین قبول روایت میں بہت احتیاط سے کام لیتے۔ اور قلت روایت اور کثرت طرق کے زبردست حامی تھے، اور خلیفۂ وقت کے لئے عوام کی افراط وتفریط کی روک تھام کے لئے یہ احتیاط بہت ضروری اور لازمی اور حق بجانب تھی۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ صحابہ یا خلفائے راشدین نے باوجود شہادت وتوثیق کسی حدیث سے اعراض فرمایا ہو۔

اکثر جلیل القدر صحابہ کے لئے تو حدیث وسنت سے زیادہ محبوب کوئی دوسرا شغل ہی نہ تھا اور عمر کی عمر اسی مبارک اور محبوب ترین شغل میں بسر کردی۔

قرآن وحدیث کے بعد اجماع امت کو دیکھتا ہوں تو منکرین حدیث کے دعوے کے ازسرتاپا غلط ہونے پر اور بھی مہر توثیق ثبت ہو جاتی ہے اور اس دعوے کی صحت کا ایک سکنڈ کے لئے امکان بھی باقی نہیں رہتا، مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک حدیث وسنت کے واجب الاتباع اور حجت دینی ہونے میں آج تک کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا، اگر گنتی کے چند اہل قرآن کی مخالفت کو ثبوت میں پیش کیا جائے تو وہ کسی طرح قابل وقعت نہیں ہو سکتی۔

منکرین حدیث اجماع امت سے استدلال پر کس قدر پریشان ہوتے ہیں اور لاجواب ہوکر کس طرح پیچھا چھڑاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"تمھارے نزدیک چار دلیلیں ہیں، کتاب وسنت، اجماع وقیاس، اور اسی ترتیب سے ان کے مدارج بھی ہیں، کیا تم حدیث کو جو بلند تر حجت ہے۔ اجماع سے جو فرو تر حجت ہے ثابت کرنا چاہتے ہو، اگر ایسا ہے تو تمھارا مشعل تاریک ہے۔"

ہمارا مشعل تاریک نہیں، منکرین حدیث کی عقل تاریک ہے، ہم اگر صرف اجماع امت سے حدیث وسنت کے حجت شرعی ہونے پر دلیل قائم کرتے تو خیر، کیونکہ ہم تو قرآن سے استدلال کرتے ہیں اور منکرین حدیث کے ابطال دعوے کے لئے ایک دو نہیں متعدد اور بیسیوں نص صریح پیش کرتے ہیں، پھر حدیث اور تعامل صحابہ سے اس کی تشریح اور تائید کرتے ہیں، پھر مزید تائید اور غایت توثیق کے لئے اجماع امت سے ثبوت پیش کرتے ہیں، لیکن مخالفین حدیث کے پاس مجرد دعویٰ اور محض تاویل کے سوا اور کیا ہے؟

اور بالفرض اگر ہم اپنے مخالفین کے قصور فہم، قلت بصارت اور فقدان بینائی کی وجہ سے اپنے مشعل کو چراغ کی روشنی میں دکھلاتے ہیں، جس کے بعد ہمارا مخالف سر تسلیم خم کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو اس سے ہمارا مشعل تاریک کیونکر ثابت ہوا؟

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اسی طرح منکرین حدیث کا یہ عذر لنگ بھی لائق اعتنا نہیں "کہ اجماع سارے عالم کے لئے ایک ہنگامی چیز ہے۔ یہ مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اس کو دینی حجت اور دائمی حق بنا رکھا ہے"، کیونکہ اس کے متعلق کافی گفتگو ہو چکی ہے اور اجماع حجت شرعی ہونے پر کلام الہی سے ثبوت اور احادیث سے اُس کی تشریح اور تائید بھی ہو چکی۔

قرآن وحدیث اور اجماع امت کے بعد اب صرف قیاس باقی رہتا ہے جس کی مطلقاً ضرورت ہی نہیں کیونکہ قیاس قرآن وحدیث اور اجماع کے بعد ایک بیکار چیز ہے لیکن پھر بھی قیاس کا جب فیصلہ ہوگا تو یہی ہوگا کہ جو حکم صریح قرآن میں موجود ہے اور جس کی تشریح اور تائید احادیث

اور تعامل صحابہ سے ہو، جس پر اجماع امت ہو، اُس کی محض تاویل ہی تاویل روگردانی کے مترادف ہے۔

اب ہر شخص آسانی کے ساتھ یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ جس دعوی کی تغلیط پر قرآن و حدیث ناطق ہو، جس دعوے کی تکذیب اجماع امت اور قیاس سے ہوتی ہے۔ وہ دعویٰ کسی طرح بھی قابل قبول ہو سکتا ہے؟ اور منکرین حدیث کی چند صاف صاف اور کھلی کھلی آیات قرآنی کی الٹی سیدھی تاویل کسی طرح بھی نیک نیتی پر محمول ہوسکتی ہے؟

ابلغکم رسٰلت ربی وانالکم ناصح امین

وما علینا الا البلاغ

چین کا موجودہ نظام تعلیم

(بہ سلسلہ گزشتہ)

۳- ثانوی تعلیم

جب ۱۹۲۲ء میں نیشنل ایسوسی ایشن کی طرف سے تعلیم کو ترقی دینے کے لئے اسکول نظام کی تجویز پیش ہوئی جسے پیکن کی سابق حکومت کے محکمہ تعلیم نے منظور کیا تو اس پر عمل کرنے کی کوشش شروع ہوئی اس نظام کے مطابق ثانوی تعلیم، سینیر مڈل اور جونیر مڈل اسکولوں میں تقسیم کی گئی اور ہر ایک کی مدت تعلیمی تین تین سال قرار دی گئی۔ موجودہ محکمہ تعلیم نے ثانوی تعلیم کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ سابق محکمہ تعلیم کے رویے سے کسی قدر مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موجودہ محکمہ تعلیم نے مڈل اسکولوں کی تعداد بڑھا دی اور تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے ان کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

اس کے متعلق موجودہ محکمہ تعلیم نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ یہ ہے کہ ضروری اور اہم نصاب تعلیم کا معیار متعین کرنے کے لئے ایک خاص کمیٹی مقرر کی، ابتدائی اسکولوں، جونیر مڈل اسکولوں اور سینیر مڈل اسکولوں کے شعبہ تیاری (۱) کے معیار کے مطابق "اصول ثلثہ" اور "قومی زبان" ان کے نصاب میں داخل کی گئی۔ بالفاظ دیگر "اصول ثلثہ" اور "قومی زبان" کی تعلیم کا سلسلہ ابتدائی سے لے کر سینیر مڈل اسکول کے شعبہ تیاری تک جاری ہے۔ جونیر مڈل اسکول کے پہلے دو سال میں کسی فن خاص کی تعلیم نہیں ہوتی، اس میں زیادہ تر معلومات عامہ پر زور دیا جاتا ہے تاکہ تعلیم کی بنیاد مضبوط ہو اور طلبہ سینیر مڈل اسکول میں شریک ہو کر مزید تعلیم حاصل کر سکیں۔ طلبہ کے انفرادی میلان

(۱) سینیر مڈل اسکول کا ایک شعبہ ہے جس میں طلبہ کالج میں شریک کرانے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔

ان کے خاص ذوق اور فطری لیاقت معلوم کرنے کے لئے تجربی نصاب کا انتظام کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ دستکاری، صنعت وحرفت بھی سکھائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جونیر مڈل اسکولوں میں بہت سے ایسے طلبہ ہوں گے جن کو اس سے فارغ ہو کر ذہنی کمزوری یا مالی دقتوں کے سبب سے مزید تعلیم کا موقع نہیں ملے گا، اگر ان کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہوگا تو جونیر مڈل اسکولوں سے نکل کر دستکاری کے سہارے ان کی زندگی ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔

جونیر مڈل اسکولوں کے نصاب کی بنیادی اصول میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے

(الف) جونیر مڈل اسکول کا عام نصاب ایسا ہونا چاہئے کہ ایک طرف مضمون کی تکرار نہ ہو، اور دوسری طرف وہ اسکول اور کالج کی تعلیم کے درمیان واسطے کا کام دے

(ب) اس کے نصاب میں آرٹ اور سائنس کو نہ داخل کرنا چاہئے، بلکہ پورا غور کرنے کے بعد ایک وسیع اور جامع پروگرام تیار کرنا چاہئے۔

(ج) ریاضی، غیر وطنی زبان اور اسی درجہ کا اور کوئی مضمون، طلبہ کو اتنا سکھانا چاہئے کہ وہ اعلیٰ تعلیم میں شریک ہوسکیں تمام اسکولوں کو اس نئے معیار پر تجربہ کرنے کی ہدایت کی گئی اور ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے نتائج سے محکمہ تعلیم کو مطلع کریں۔ رپورٹوں کے مطابق اگر ضرورت ہوگی تو نصاب میں کچھ ترمیم کردی جائے گی۔ پیشہ وری کی لیاقت کو نشوونما دینا اور طلبہ کے ایجادی مادے کو بڑھانا اور انھیں کام کے آدمی بنانا چین کی موجودہ تعلیم کی دو اہم غرض وغایت ہیں، چنانچہ دستکاری نصاب تعلیم میں شامل کردی گئی ہے اور ابتدائی اور جونیر مڈل اسکولوں میں اس کو لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔ پہلے تو دستکاری کی تربیت صرف درسی کمرے میں ہوتی تھی مگر اب اس کا تعلق مقامی دستکاری کے مرکزوں کے ساتھ کردیا گیا ہے اور اس میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ مقامی ضروریات اور لوازمات کے مطابق طلبہ کوئی صنعت سیکھیں۔ چنانچہ اسکولوں کے شعبۂ دستکاری نے مقامی کارخانوں سے تعلقات قائم کرلئے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کو عملی تجربات میں بڑی سہولت ہوگی اور وہ جونیر مڈل اسکولوں سے نکل کر آسانی کے ساتھ کسی کارخانے میں کام کرسکتے ہیں۔

دیہاتی تعلیم کی اہمیت مدنظر رکھتے ہوئے محکمہ تعلیم نے کثرت سے دیہاتی نارمل اسکول کو کھولنے کا ارادہ کیا ہے اور اس کے متعلق تیزی کے ساتھ قدم اٹھا رہا ہے چونکہ دیہاتی اسکولوں کی غرض وغایت کسانوں اور دیہاتیوں کو نفع وفائدہ پہنچانا ہے، اس لئے ان کے اسکول ایسے مقامات پر قائم کئے گئے ہیں جہاں کسان اور دیہاتی آسانی کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ان میں بالکل جدید طریقے پر زرعی تعلیم دی جاتی ہے، ان کے طلبہ اسکولوں سے فارغ ہو کر کسانوں اور دیہاتیوں کے معلمین اور مدرسین بن جاتے ہیں۔ ان کے نصاب میں عملی تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور طلبہ پر ایسی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں کہ وہ خود بخود آنے والی نسلوں کے قابل معلم اور باپ بن جائیں۔

انھیں بیس سال کے اندر ابتدائی اسکولوں کے کام کو چلانے اور لازمی تعلیم پر کاربند ہونے کے لئے کم سے کم چودہ ہزار معلمین درکار ہیں، کیونکہ محکمہ تعلیم نے ایک اسکیم تیار کی ہے کہ پانچ سال کے اندر ایک ہزار پانسو صوبجاتی اور مقامی نارمل اسکول قائم کر دئے جائیں گے۔ اب ابتدائی تعلیم میں اچھی خاصی ترقی ہو گئی ہے پہلے تو صوبہ کیانگ سو کی سب سے اچھی تعلیم مانی جاتی تھی کیونکہ اس میں یورپ اور امریکہ کا تعلیمی طریقہ نافذ کیا گیا تھا، مگر ادھر دو سال کے اندر قومی حکومت کی کوشش سے یورپ اور امریکہ کا طرز تعلیم چین کے ہر گوشے میں عام ہو گیا ہے چینی طلبہ جو کہ یورپ اور امریکہ سے تعلیم پاکر واپس آئے ہیں وہ جدید تعلیمی طرز کے مطابق اپنے بھائیوں اور بہنوں کی تربیت میں نہایت شوق اور خلوص کے ساتھ دلچسپی لے رہے ہیں آج کل چین کے ابتدائی اسکولوں میں ساز وسامان کا کافی اضافہ ہوا ہے۔ مقامی تعلیم کے اخراجات سال بہ سال بڑھتے جا رہے ہیں اور طلبہ کی جسمانی تربیت پر کافی توجہ کی جاتی ہے۔ معلموں کی تنخواہ بڑھا دی گئی ہے ــــ مگر ابھی بہت سے تعلیمی اصلاح کے کام کرنے باقی ہیں۔

اسکولوں کے لئے درسی اور مطالعے کی کتابوں کی تیاری میں بھی بہت کچھ ترقیاں نظر آتی ہیں، بچوں کی کتابیں لکھوانے، رسم الخط کو آسان کرنے اور بچوں کے لئے صحیح تلفظ

کے قواعد تیار کرانے میں محکمہ تعلیم نے کم کوشش نہیں کی ہے۔

یہ سب کام ملکی زبان میں ہو رہا ہے، غیر ملکی زبان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کوششوں کی غرض یہ ہے کہ چینی زبان کے سکھانے میں جو مشکلات ہیں، ان کو کم کر دیا جائے۔

ان کاموں کے ساتھ ہی ساتھ لازمی تعلیم کا سوال آتا ہے۔ سابق واہیو یوان نے ہر صوبہ میونسپلٹی اور شہر کو حکم دیا تھا کہ جہالت دور کرنے کی غرض سے لازمی تعلیم کی ایک خاص کمیٹی بنائی جائے، یہ توقع کی جاتی ہے کہ بیس سال کی مدت میں چار کروڑ لڑکے کم سے کم چار سال کی تعلیم پا سکتے ہیں۔ اس کے اخراجات کے لئے ۰۰۰،۱۱۲۷۱ ڈالر کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ جب اخراجات کی کمی محسوس ہوگی۔ اس وقت اس کے پورے کرنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ باکسر کے معاملے کا جرمانہ جو دول یورپ نے چین کو واپس کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ زیادہ تر تعلیمی کاموں میں صرف کر دیا جائے۔

سابق حکومت پیکن کے محکمہ تعلیم نے تعلیمی نظام اور اس کے بنیادی اصول پر مطلقاً توجہ نہیں کی تھی، مگر اب موجودہ محکمہ تعلیم اس کام میں حتی الامکان جدوجہد کر رہا ہے۔ اکثر ملحقہ تربیت گاہوں اور ابتدائی اسکولوں میں کنڈر گارٹن رائج کیا گیا ہے۔ ہر نارمل اسکول اور یونیورسٹی میں ایک ایسا خاص شعبہ کھولا گیا ہے، جہاں کنڈر گارٹن کے معلمین کی تربیت کی جاتی ہے اور کنڈر گارٹن کے نصاب کا بھی خاص معیار مقرر کیا گیا ہے۔

چین کے موجودہ اسکول کا نظام اس نقشے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

۱۔ ابتدائی تعلیم سے انتہائی تعلیم تک کل سترہ سال کا عرصہ لگتا ہے یعنی یہ تعلیم چھ برس کی عمر سے تیئیس برس کی عمر تک دی جاتی ہے۔

۲۔ اس میں چھ سال ابتدائی تعلیم میں، ۶ سال ثانوی تعلیم میں اور ۵ سال اعلیٰ تعلیم میں صرف ہوتے ہیں۔

۳۔ بعض طلبہ عام ثانوی تعلیم کے بجائے نارمل اسکول میں معلمی کی تعلیم پاتے ہیں یا کوئی حرفہ سیکھتے ہیں۔

۴۔ بعض یونیورسٹی کی عام تعلیم کے بجائے کسی فن کی تعلیم پاتے ہیں۔
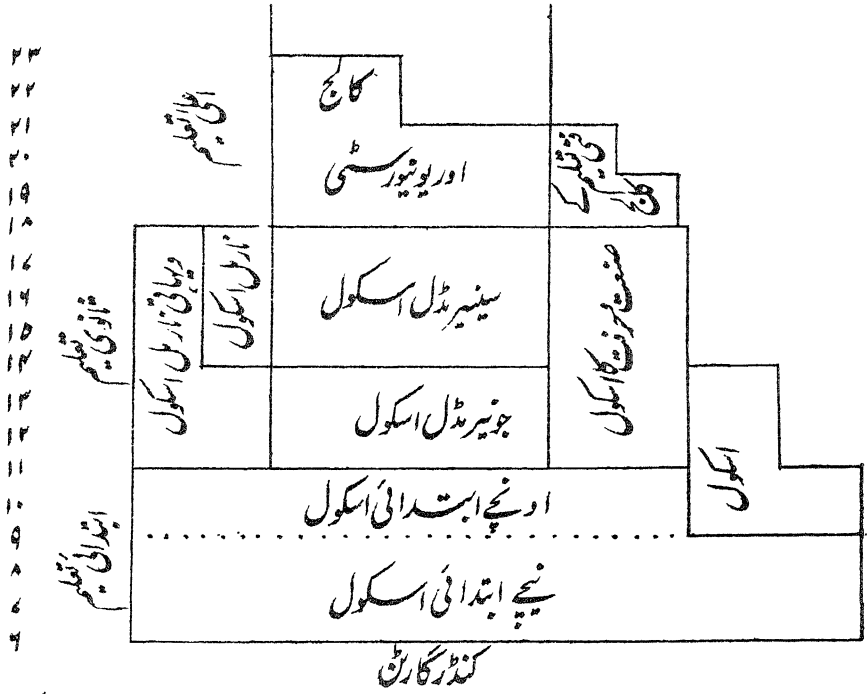
تمام چینی اسکول جو غیر ممالک میں قائم کئے گئے ہیں، ان کو موجودہ محکمہ تعلیم سے الحاق کرانیکی ہدایت کی گئی ہے، بیرونی چین کا ذہنی معیار بلند کرنے کے لئے بیرونی چینی تعلیم کی کمیٹی کے نام سے ایک مجلس محکمہ تعلیم میں قائم کی گئی ہے۔

تعلیم بالغان کے میدان میں محکمہ تعلیم نے ملک کے ہر اسکول کو یہ ہدایت دی ہے کہ عام تعلیم کا انتظام کرے، تعلیمی سہولت کے لئے شام کا وقت اور تعطیل کا دن انتخاب کیا گیا ہے۔ جب عوام کو اپنے کاموں سے فرصت ملتی ہے، معلموں اور طلبہ دونوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جاہل عوام کی تعلیم کے لئے اپنے اسکول میں ایک زائد جماعت یا ملحقہ اسکول کھولیں۔ ان کو یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ وقتاً فوقتاً عام لکچر دیں، معاشرتی اور تعلیمی نمائش کریں۔ متحرک تعلیمی تصویریں عوام کو دکھلائیں، قومی گیت اور گانے ان کو سنائیں اور اس طرح اپنے اسکول کو معاشرتی تحریک و اصلاح کا مرکز بنائیں۔ عام کتب خانے کے متعلق قواعد بنائے گئے قدیم یادگاروں کو محفوظ کرنے کے لئے دو کمیٹیاں مرتب کی گئی، ایک کمیٹی کے ذمہ یہ کام ہے کہ پیپنگ (پیکن) کے شاہی محل کی حفاظت کرے، اور

دوسری کا فرض یہ ہو کہ لوجیہ میں خاندان ٹانگ کی سنگ تراشی اور نقاشی کو محفوظ رکھے۔

سابق داہیو یوان نے ہانگ چیو میں ایک آرٹ کالج اور شنگھائی میں ایک موسیقی کالج قائم کیا تھا، آرٹ کو اہمیت دینے کی غرض سے ۱۹۲۹ء کے موسم گرما میں تام شنگھائی میں اور ۱۹۳۰ء کے موسم سرما میں ہانگ چیو میں آرٹ کی نمائش کی گئی۔

۴۔ مانگولی اور تبتی تعلیم

مانگولی اور تبتی لوگ اب تک گلہ بانی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک تعلیم محض چند گیتوں اور پرانے اور وہ بھی صدیوں پرانے قصوں کو یاد کرانا ہے۔ قصوں میں اکثر جن اور پری کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ لاماؤں کے معتقد ہیں، شریف طبقے کے لڑکوں کو صرف چند مذہبی کتابیں یاد کرا دیتے ہیں۔ ان کے حالات دیکھ کر موجودہ محکمہ تعلیم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شہر نانکنگ میں مانگولی اور تبتی لوگوں کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو اپنے آپ کو مانگولیہ اور تبت کی خدمت کے واسطے پیش کرتے ہیں، فوراً ایک خاص مڈل اسکول قائم کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ نیشنل سنٹرل یونیورسٹی کو ہدایت کی گئی کہ وہ مانگولی اور تبتی طلبہ کے لئے ایک خاص کلاس کھول دیں۔ اس کے علاوہ دوسری یونیورسٹیاں بھی بڑے شوق سے ان کے طلبہ کو داخل کرتی ہیں، مستحق اور لائق مانگولی اور تبتی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے غیر ممالک بھیجنے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

کل مانگولی اور تبتی طلبہ کی تعداد کی تحقیق کی جاتی ہے اور ان کی آئندہ تعلیم کے لئے یہ تجویز کی گئی ہے کہ پیپنگ، شین یان، ٹائی یوان اور پائی لا میں جو مانگولی اور تبتی مدارس موجود ہیں، ان کو دوبارہ منظم کیا جائے، مانگولی اور تبتی گیتوں اور اصطلاحوں کو جمع کیا جائے خاص درسی کتابیں اور ریڈریں تیار کی جائیں۔ ان کے اسکولوں کے نصاب تعلیم ایک خاص معیار پر لائے جائیں، اور ان کے مڈل اور ہائی اسکولوں میں چینی زبان کا درس دیا جائے۔

درسی کتابوں پر تحقیق اور نظر ثانی کرنے اور اصطلاحوں کا معیار بنانے کا کام، سابق واہیویوان کے صیغۂ عمرانی نے شروع کیا تھا۔ چنانچہ ۱۲۰ درسی اور فنی کتابیں تحقیق کر کے پسند کی گئیں۔ ۲۴ کتابیں ممنوع قرار دی گئیں اور ۳۲ کتابیں نظر ثانی کے لئے پھر صیغۂ عمرانی کے پاس بھیج دی گئیں۔ ۲۹۳ کتابیں بغیر تحقیق کے چھوڑ دی گئیں۔ جہاں تک مقامی بولی کا تعلق ہے، ۳۲۷۵ عام فقرے انتخاب کر کے پسند کئے گئے۔ موجودہ محکمہ تعلیم کے قائم ہوتے ہی صیغۂ عمرانی کے بجائے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس نئے محکمہ کے ماتحت پھر ۳۰ درس اور مطالعے کی کتابوں کی رجسٹری کرائی گئی۔ ۵۴ کتابیں مسترد اور ممنوع قرار دی گئیں، ۱۰ غیر مطبوعہ کو چھپوانے کی اجازت دی گئی، ۱۳۰ نظر ثانی کے لئے پھر محکمہ تعلیم کے پاس بھیجی گئیں۔ اور ۱۲۰ زیر تحقیق و انتخاب ہیں۔

اس کے علاوہ طب اور ریاضی کی اصطلاحوں کا معیار بنایا گیا جسمانی تربیت کی اصطلاحوں پر تبصرہ کیا گیا تعلیمی، طبعی، فلسفی، سیاسی، زرعی، عملی (انجنیرنگ) اصطلاحوں کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اور انکا معیار بنایا جا رہا ہے۔

۵۔ قومی تعلیم کی کانفرنس

۱۵ مئی ۱۹۲۸ء کو واہیویوان کے اہتمام میں ڈاکٹر تسائی یوان پائی کے زیر صدارت قومی تعلیم کی کانفرنس کا پہلا اجلاس بمقام نانکنگ منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں ۷۸ تعلیمی نمائندے شریک تھے۔ ان میں مختلف صوبوں کے تعلیمی کمشنر یونیورسٹیوں کے چانسلر، واہیویوان کے ۱۸ ماہرین اور قوم پرور جماعت اور حکومت کے نمائندے بھی شامل تھے۔

اس اجلاس نے یہ طے کیا کہ قومی تعلیم کا مقصد اصول ثلثہ کے مطابق ہونا چاہئے، اس تعلیمی پالیسی پر عمل کرنے کے لئے اجلاس کے ختم ہونے پر یہ اعلان شائع کیا گیا۔

۱۔ قومیت کو ترقی دینے کے لئے تعلیم کے ذریعے سے نوجوانوں کے دماغ میں قومی روح پھونکی جائے، قدیم قومی روایات زندہ کی جائیں، اخلاقی ذہنی اور جسمانی تربیت کا عام معیار

بلند کیا جائے، جدید علوم کی اشاعت کی جائے، فنون لطیفہ کا ذوق پیدا کیا جائے۔

۲۔ سچی جمہوریت حاصل کرنے کے لئے تعلیم کے ذریعے سے لوگوں کو فرماں برداری اور قانون کی پابندی جیسی خصلتوں کی ہدایت کی جائے، انتظام کا مادہ ملکی خدمت کی روح اور اتحاد عمل کی عادتیں پیدا کی جائیں، سیاسی معلومات کی اشاعت کی جائے اور عوام کو تعلیمی آزادی اور مساوات کا مطلب سمجھایا جائے۔

۳۔ معاشرت میں توازن وتناسب قائم کرنے اور اجتماعی عدل و انصاف پر عمل کرنے کے لئے تعلیم کے ذریعے سے لوگوں میں امداد باہمی کا دستور مروج کیا جائے اور ان کے اختراعی مادے کو بڑھا دیا جائے۔ روزمرہ کی عام معلومات سے ان کو آگاہ کیا جائے اور عوام کو ان منافع ومفاد کی اہمیت بتائی جائے جو معاشی ہم آہنگی اور استقلال سے تعلق رکھتی ہیں۔

موجودہ اسکول کا نظام دوبارہ منظم کیا گیا ہے اور اس میں خفیف اور معمولی تبدیلیاں ہوتی رہیں، مگر مجموعی طور پر وہی رہا جو کہ ۱۹۳۲ء میں پیکن کی حکومت نے بنایا تھا۔

اس زمانے میں چین کے اندر ایک اہم اور قابل توجہ تعلیمی مسئلہ درپیش ہے۔ وہ یہ کہ طلبہ کی تحریک بہت زور پر ہے، ہر روز اور ہر وقت اسی سوال پر بحث ومباحثہ ہوتا رہتا ہے متفقہ رائے یہ ہے کہ اس تحریک کو منظم کر دیا جائے اور حکومت سے یہ تسلیم کرایا جائے کہ یہ طلبہ کی ایک مستقل جمعیت ہے۔ اس کے تمام عمل اور تحریکیں خالص ذہنی، اخلاقی اور اصلاحی ہیں اس کے متعلق ایک مسودہ قومی حکومت کے پاس بھیج دیا گیا ہے کہ اس پر غور کر کے منظوری دے۔

ثانوی جماعتوں میں فوجی تربیت کا مسئلہ بھی زیر بحث ہے۔ اس کے متعلق ایک مفصل اسکیم محکمہ فوج کی طرف سے کی گئی۔ اس اسکیم کا مقصد واحد یہ ہے کہ طلبہ میں پابندی برداشت اور انضباط کی عادتیں پیدا کی جائیں۔ ۱۹۲۰ء کی تعلیمی کانفرنس میں اس کے متعلق ایک تجویز بھی پاس ہوئی ہے۔

قومی تعلیمی اجلاس کے بعد ۱۵ را پریل ۱۹۳۰ء میں ثانوی تعلیمی کانفرنس نانکین میں

منعقد ہوئی۔ اس میں ۱۰۲ نمائندے شریک تھے، دو ہفتہ تک ثانوی تعلیم کے مسائل پر غور کرتے رہے، دس اہم تجاویز پاس کی گئیں۔

۱۔ لازمی تعلیم :۔ بیس سال کے اندر اٹھائیس کروڑ ڈالر خرچ سے دس لاکھ ابتدائی اسکولوں کے معلمین تیار ہو کر چار کروڑ بچوں کو پڑھائیں اور ان کی تعلیمی بنیاد مضبوط کر دیں۔

۲۔ تعلیم بالغان :۔ ایک لاکھ پینتیس ہزار معلمین تیار کئے جائیں ایک لاکھ بارہ ہزار مدارس کھولے جائیں اور چھ سال کے اندر اٹھائیس کروڑ چونتیس لاکھ ڈالر کا فنڈ جمع کرکے ان جاہل عوام کے ضروری لکھنے پڑھنے کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جن کی عمر ۱۶ اور ۶۰ کے درمیان ہے۔

۳۔ اسکولوں کے تمام درجوں میں جو معلمین درکار ہیں، ان کو پانچ سال کے اندر تیار کیا جائے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم کے سامان اور تعلیمی ضروریات میں اضافہ کیا جائے۔

۵۔ ثانوی تعلیم کی توسیع :۔ آنے والے بیس سال کے اندر ہر ایک سال میں پچاس پچاس جونیر مڈل اسکولوں کا اضافہ کیا جائے۔

۶۔ اعلیٰ تعلیم کو ترقی دینا اور انگریزوں کے "ٹیوٹر سسٹم" کو بتدریج رائج کرنا۔

۷۔ عمرانی تعلیم :۔ کتب خانے، عجائب خانے، آرٹ کے ادارات، ورزشی میدان اور ملحقہ اسکولوں میں تمام درجے کھلوانا۔

۸۔ بیرونی چینی باشندوں کی تعلیم کا انتظام کرنا :۔ (الف) محکمہ تعلیم میں، بیرونی چینی تعلیم کا صیغہ قائم کرنا۔ غیر ممالک کے ہر بڑے شہر میں جہاں کثرت سے چینی باشندے سکونت پذیر ہیں، ایک تعلیمی کمشنر مقرر کرنا، اور ان کا مرکز دار السلطنت نانکینگ میں بنانا۔ (ب) مالگذاری سے پانچ لاکھ ڈالر کی رقم منظور کرانا اور بیرونی چینی تعلیم کے لئے ایک کروڑ ڈالر کا فنڈ جمع کرنا۔

۹۔ منگولی اور تبتی تعلیم :۔ منگولیا اور تبت میں ابتدائی اسکول قائم کرنا۔ دو سال کے اندر مقام نانکینگ اور کنکٹینگ میں منگولی اور تبتی اسکول کھولنا اور ان کے طلبہ کو غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے بھیجنا۔

۱۰۔ تعلیمی فنڈ:۔ پہلے سال میں قومی تعلیم کے اخراجات شاید چھ کرور۔ ڈالر سے کچھ زیادہ ہوں گے لیکن بارھویں سال میں تعلیمی اخراجات پچاس کرور ڈالر سے بڑھ جائیں گے۔ اتنی بڑی رقم کے وصول کرنے کے ذرائع پر بھی بہت کافی غور کیا گیا اور مرکزی اور مقامی امداد کی تدبیریں سوچی گئیں۔

٦۔ مطبوعات

۱۔ واہیو یوان کے ماہواری بلیٹن (صرف ۹ شائع ہوئے)
۲۔ محکمہ تعلیم کے ماہواری بلیٹن۔
۳۔ پہلی قومی تعلیمی کانفرنس کی رپورٹ۔
۴۔ قومی یونیورسٹیاں اور ان کے حالات کی تحقیقی رپورٹ ۱۹۲۷ء
۵۔ کنڈرگارٹن کا معیاری نصاب
۶۔ جونیر مڈل اسکولوں کا معیاری نصاب۔
۷۔ سینیر مڈل اسکولوں کا معیاری نصاب (دو حصے)
۸۔ چینی تعلیم کی غایت اور اس کا پروگرام۔
۹۔ محکمہ تعلیم کے تعلیمی قوانین اور دستور العمل۔

ادبیات ایران در دورۂ جدید

ہم پروفیسر محمد حبیب صاحب کے دل سے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں یہ مضمون جو دورِ
ایران کی مہم سے مالِ غنیمت کے طور پر لائے ہیں، اشاعت کے لئے عطا کیا۔ پروفیسر صاحب
مضمون نگار کا تعارف ان الفاظ میں کرتے ہیں " آغا سعید نفیسی صاحب، طہران کے
مدرسۂ عالی میں فارسی کے پروفیسر ہیں یہ ایران کے ممتاز اربابِ علم و فضل میں سے ہیں
مجھے طہران کے قیام میں بارہا ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں ان کی وسعت
قلب اور وسعت نظر کا قائل ہوگیا۔ یہ اور ایرانیوں کی طرح نہیں جو ہندوستان کی فارسی
ادب کی خدمات کو قابلِ التفات نہیں سمجھتے بلکہ انھوں نے ہندوستانیوں کی فارسی
تصانیف کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور خسرو سے لے کر غالب تک جتنے مستند فارسی شاعر
ہمارے یہاں گزرے ہیں ان سب کے کلام پر انھیں عبور حاصل ہے۔ بڑی خوشی
ہوتی ہے جب ایک دور دراز ملک میں کوئی نقاد مل جاتا ہے جو ضیاء الدین برنی کے
اسلوب بیان کی خوبیوں کو سمجھتا ہے اور ابوالفضل کے اسلوب کی خامیوں کے باوجود
اس کے فضل و کمال کا قائل ہے۔ آغا نفیسی نے ایران کی تاریخ اور ادب پر متعدد کتابیں
لکھی ہیں جن میں سے ایک جید تصنیف رودکی کی شاعری پر تین جلدوں میں ہے
اور ایران میں اس قدر مقبول ہے کہ کسی تعلیم یافتہ شخص کا کتب خانہ اس سے خالی نہیں
یہ مختصر مضمون فارسی ادب کی نشو و نما کے متعلق آغا نفیسی نے میری درخواست پر لکھا
ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ مسلم یونیورسٹی جرنل میں شائع کیا جائے "

دورۂ جدید ادبیات ایران، تقریباً از اوائل قرن چہاردہم ہجری آغاز می کند، و اینک نزدیک
پنجاہ سال از آن گزشتہ است۔ نزدیکی ایران با روپا، روابط دائمی کہ در میان ایران و ممالک اروپا

پدیدار شد، نهضتے در ادبیات ایران بوجود آورد، که دنباله، آں بایں ایام پیوسته است، و هنوز در
راه تکامل و ترقیست۔ پس از برقراری سلطنت مغول در ایران، و پس از آنکه دشمنی در میان مسلمانان
و عیسویان که در جنگهائے صلیبی بمنتهائے شدت رسیده بود، از میان رفت، و بصلح و آراشتی بدل
شد۔ و بیشتر بواسطه، آنکه، پادشاهان مغول ایران صلح جو و معتقد بآزادی مذاهب بودند، مسافرین
و تجار اروپائی مخصوصاً از زمان سلطنت الجائیتو سلطان محمد خربنده، بایران و ممالک شرق آمدند، و
راه تجارت آسیا باز شد، و چوں صفویه بپادشاهی ایران رسیدند، و رقابت بسیار شدیدی در میان
دربار ایران و دولت عثمانی بار شد۔ چوں همواره در میان دولت عثمانی و دول اروپا مخاصمات بود
و دولت ایران در صدد برآمد، که ازیں دشمنی ها بهره مند شود، بهمیں جهت طرح دوستی با دول اروپا انداخت
و گاهی پادشاهان اروپا را بجنگ با عثمانیان تحریک می کرد۔ و در ضمن چوں تجارت ایران در
زمان صفویه ترقی بسیار کرده بود، روابط سیاسی و تجارتی در میان ایران و اروپا بمنتهائے کمال
رسید۔ پس از آنکه انگلیس هندوستان را متصرف شد، ایران در نظر انگلستان حائز اهمیت گشت
و در ضمن دول اروپا که، در آسیا با انگلستان رقابت می کردند، ایران را یکے از عوامل مهم
پیش رفت مقاصد خود مردند۔ و در اوائل قرن دوازدهم هجری دربار ایران واقعاً عرصه کشمکش
منافع دول اروپا بود۔ و دریں ضمن روسیه نیز آغاز کرد که با یالات شمال غربی ایران دست اندازی
کند و دولت ایران برائے رهائی از خطر روسیه، گاهے بدولت فرانسه و گاهے بدولت انگلیس
متوسل می شد۔ و در ضمن در صدد برآمد که بوسیله علوم و تمدن جدید خود را نیرومند کند، و از خطر روسیه
رهائی یابد، بهمیں جهت در زمان فتح علی شاه و بیشتر بکوشش عباس مرزا نایب السلطنت قدمی چند
بسوئے تمدن اروپائی از قبیل جلب صاحب منصبان نظامی از فرانسه و انگلستان و اطبا و صنعتگران
و معلمین برآمدند و بعضے صنائع جدید را مانند ساختن اسلحه و مطبع و غیره اخذ کردند۔ و در ضمن چند نفر
چوں ایرانی را برائے تحصیل با انگلستان فرستادند، و زبانهائے اروپائی مخصوصاً زبان فرانسه در ایران رواج گرفت۔
چندے نگذشت که ایرانیان با ادبیات اروپائی پے بردند و بلا فاصله بترجمه کردن از زبانهائے

اروپا مخصوصاً زبان فرانسه، آغاز نهادند۔ و از زمان محمد شاه ادبیات اروپا در ایران معروف شد۔ ولی اوج این نهضت در زمان ناصرالدین شاه و در اواخر قرن سیزدهم هجری بود که در ایران مدارس جدید بسبک اروپائی افتتاح کردند و معلمین بسیار برائے تدریس در آں مدارس اجیر کردند و عدهٔ کثیر جوانان ایرانی را برائے اخذ علوم جدید باروپا فرستادند۔ و بتالیفات در سبک اروپائی آغاز کردند۔ از طرف دیگر در زمان سلطنت طولانی ناصرالدین شاه، چوں آرامش و صلح در ایران برقرار بود، ادبیات فارسی که، در دورهٔ انقلاب و اغتشاش تنزل کرده بود، دوباره پیش رفت کرد و شعرا و نویسندگان بسیار پدیدار شدند۔ بزرگان شعرائے ایں عصر مانند قاآنی و محمود خاں ملک الشعرا و روش اصفهانی و فتح الله خاں شیبانی، تجددی در شعر فارسی پیش آوردند، و سبک اسلوب شعرائے قرن پنجم و ششم را دوباره در ایران زنده کردند، در نثر فارسی اصلاحات بسیار پیش آمد و در نتیجهٔ وقوف از ادبیات اروپا اذهان نویسندگان بزرگ متوجه آں شد که، نثر را از استعارات و کنایات و تشبیهات و صنائع لفظی و معنوی و تعقیدات و تکرارهائے مخل، پاک کنند و بیشتر و به بلاغت و ایجاز و اختصار بکوشند بهمیں جهت نثر فارسی در نتیجه، مساعی نویسندگان معروف آں دوره مانند محمد حسن خاں اعتماد السلطنت و حسن علی خاں امیر نظام، و حاج میرزا علی خاں امین الدوله در راه سادگی و ایجاز وارد شد۔ اعتماد السلطنت مدتهائے مدید چند روزنامه در طهران انتشار داد، و سبک اسلوب روزنامه نویسی را در زبان فارسی ایجاد کرد۔ از طرف دیگر جمعے از ایرانیان که در ممالک اسلامی مجاور اروپا زندگی کردند و بحکومت آزادی خواه و مشروطه اروپا پے بردند در مصر و قفقاز و عثمانی نهضتے تولید کردند، و بنای تبلیغات را۔ بر ضد حکومت استبدادی ایران گذاشتند و جرائد و رسائل و کتب دریں باب نشر دادند۔ و در تمام آں نشریات بزبان فارسی بسیار ساده چیز می نوشتند و یک سلسله آثار معتبر مانند روزنامه اختر در مصر و روزنامه ثریا در استانبول و آثار میرزا ملکم خاں و سید جمال الدین اسدآبادی و کتاب سفرنامه ابراهیم بیگ تالیف حاج زین العابدین مراغه ای و رسائل میرزا یوسف خاں مستشار الدوله و تالیفات میرزا عبدالرحیم طالبوف و آثار میرزا آقا خاں کرمانی در خارج ایران

منتشر شد و توجه طبقهٔ تحصیل کردهٔ ایران را جلب کرد. از طرف دیگر در داخلهٔ ایران بنا بر توجهی که عامهٔ
مردم بخواندن آثار ادبیات اروپائیان داده بودند، جمعی از مترجمین قابل مانند محمد طاهر میرزا و
دکتر محمد خان کرمانشاهی، و میرزا محمد حسین فروغی و محمد حسن خان اعتماد السلطنت، ترجمه بعضی از
داستانها و روایات اروپائی آغاز کردند ذوق داستان سرائی نیز در ایران ریشه گرفت. هم چنین
نمایش و تمثیل در ایران شروع شد. و محمد حسن خان اعتماد السلطنت بعضی از تمثیلات زبان فرانسه را
بفارسی ترجمه کرد و در طهران آنرا نمائش داد. و مخصوصاً ترجمهٔ تمثیلات میرزا فتح علی اخوند نویسندهٔ
معروف قفقازی، که بتوسط میرزا جعفر قراجه داغی از ترکی بفارسی ترجمه شد، توجه عموم ایرانیان را
جلب کرد. موضوع ترجمه از زبانهای اروپائی بدرجه ای در ایران رواج یافت که در بار
طهران ادارهٔ مخصوصی باسم دار الترجمه سلطنتی تاسیس کردند و از زبانهای فرانسه و انگلیسی و روسی
و المانی و حتی عربی و ترکی وارد و کتب و رسائل و مقالات و جرائد را بفارسی ترجمه می کردند، و در
وزارت مخصوصی باسم وزارت انطباعات تاسیس کردند و دار الطباعهٔ دولتی دائماً مشغول طبع و
نشر کتب و جرائد بود و مخصوصاً مجلدات نامهٔ دانشوران، که تراجم احوال بزرگان مشرق زمین
بود و در هشت جلد بتوسط یک عده از معاریف دانشمندان آن عصر مانند شمس العلماء عبد الرب
ابادی و میرزا عبد الوهاب قزوینی و میرزا ابو الفضل ساوجی تالیف شده، و مجلدات بسیار از کتب
تاریخ و جغرافیا تالیف اعتماد السلطنت در آن دوره بطبع رسیده است. از طرف دیگر رضا قلی خان
هدایت امیر الشعراء به تحقیقات و تالیفات ادبی در تراجم احوال شعرای ایران و تالیف کتب ادب
و لغت و تاریخ مشغول بود و بعضی از وزرا مانند علی قلی میرزا اعتضاد السلطنت وزیر علوم آن زمان تمام
اوقات خود را در ترویج ادبیات می گذراندند. در سلطنت یازده ساله مظفر الدین شاه دنبالهٔ این نهضت
کشیده شد و مخصوصاً تشویقات بسیار. حاج میرزا علی خان امین الدوله صدر اعظم باعث شد که
عده مدارس جدیده در ایران چندین برابر گشت. و در این دوره موارد معلمین اروپائی برای علوم
جدید در طهران بوده اند و روزنامهٔ تربیت که بتوسط میرزا محمد حسین فروغی اصفهانی ذکاء الملک

انتشار می یافت یکے از بهترین یادگارهائے آں عصر است. از ۱۳۲۴ بعد که آغاز مشروطیت ایران
بواسطۂ آزادی کامل که بجراید و مطبوعات ایران داده شد این نهضت ادبی جنبۂ وطنی بسیار
قوی بخود گرفت و احساسات وطن پرستی در نظم و نثر فارسی وارد شد و شعرا نیز به سرودن مضامین
ادبی پرداختند از آں جمله میرزا صادق خاں ادیب الممالک و ملک الشعراء بهار و سید
اشرف الدین مدیر روزنامۂ نسیم شمال و عارف قزوینی که در موسیقی جدید ایران و تصنیف هائے
وطنی شرف دارد، ورجز و. آزادی خواهان آں زمان آثار عمده از خود گذاشته اند. درین دوره
عده جراید آزادی خواه در طهران و سایر شهرهائے ایران بسیار بود و جرائد معروف مانند صور اسرافیل
و حبل المتین یادگار آں عصر است. در میان روزنامه نویسان میرزا علی اکبر خاں دهخدا رفیع
ترین مقام دارد و قسمت هائے مضحک و هزل آمیز او که بعنوان "چرند و پرند" در صور اسرافیل
منتشر می شد، و مقالات سیاسی و وطنی او در منتهائے خوبیست در اشعار احساساتی شعرائے بزرگ
ایں عصر مانند شعرائے دورۂ ناصرالدین شاه همواره در احیائے سبک شعرائے قرن پنجم
و ششم ایران کوشیده اند و معاریف ایشاں سید احمد ادیب پیشاوری و میرزا عبدالجواد ادیب
نیشاپوری و شوریدۂ شیرازی بوده اند، ازیں میاں حفظ ایرج میرزا جلال الممالک بزبان امروز
ایران سخن گفته است. نویسندگان بزرگ ایں عصر سید ضیاء الدین طباطبائی در روزنامہ رعد و میرزا
علی خاں دشتی در روزنامۂ شفق سرخ از حیث روزنامه نویسان و میر محمد خاں حجازی و سید محمد علی خاں
جمال زاده از حیث نویسندگان داستانها و روایات و میرزا یوسف خاں اعتصامی و میرزا نصرالله
خاں فلسفی و میرزا محمد علی خاں فروغی از حیث مترجمین بشمار می آیند. شعبه دیگری که در ادبیات
جدید ایران بمنتهائے کمال خود رسیده تحقیقات تاریخی و ادبی باسلوب جدید است که می تواں گفت
ذوق ایرانی دریں قسمت از ادبیات بیش از هر فن دیگر ترقی کرده و امروز در ایران تحقیقات
ادبی و تاریخی باوج کمال خود رسیده است و ازیں حیث ایران با تمام ممالک متمدن امروز برابری
می کند و حتی بر تمام ملل شرق برتری دارد و محققین درجه اول مانند میرزا خاں قزوینی و میرزا

عباس خاں اقبال و رشید یاسمی در ایران ہستند کہ در نوع خود فریدند و تاکنوں در ایران از حیث وقت و در مآخذ و توضیح مطالب نظیر نداشتہ اند۔

غزل

از حضرت اصغر گونڈوی

(یہ غزل حضرت اصغر نے ہمارے یہاں یوم تاسیس کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔)

پردۂ فطرت میں میرے اک نوائے راز ہے
ذرہ ذرہ اس جہاں کا گوش بر آواز ہے

خستگی اک مصلحت افتادگی اک راز ہے
خاک کی جبریل سے بڑھ کر کہیں پرواز ہے

وہ سراپا حسن ہے یا نغمہ بے ساز ہے
چشم حسرت ہے کہ اک فریاد بے آواز ہے

ہے خرد کی عشق کی دونوں کی ہستی پر نظر
یہ شہید نغمہ ہے وہ مبتلائے ساز ہے

ایک ذوقِ دیدِ پیہم، اک تماشائے دوام
اب نہ کچھ انجام ہے میرا نہ کچھ آغاز ہے

تو بہت سمجھا تو کہہ گذرا فریب رنگ و بو
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہوا
یہ غنیمت ہے در میخانہ اب تک باز ہے

بندشوں سے اور بھی ذوق رہائی بڑھ گیا
اب قفس بھی ہم اسیروں کو پر پرواز ہے

کیف و مستی کی حقیقت ایک مینائے تہی
نغمہ بھی اُس بزم میں ٹوٹا ہوا اک ساز ہے

عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرز دید
میری آنکھیں بند ہیں اور چشم انجم باز ہے

سُننے والا گوش بلبل کے سوا کوئی نہیں
ریشہ ریشہ ان گلوں کا اک صدائے راز ہے

کیا تماشا ہے کہ سب ہیں اور پھر کوئی نہیں
اُس کی بزم ناز بھی خلوت سرائے راز ہے

ختم کر اصغر یہ آشفتہ نوائی ختم کر
کون سنتا ہے اسے یہ دور کی آواز ہے

دنیا کی رفتار

ہندوستان

اسمبلی کی کامیابی | اسمبلی کا خاص اجلاس جو ۹ نومبر دہلی میں منعقد ہوا تھا اس لحاظ سے بہت کامیاب رہا کہ منتخب شدہ نمائندوں نے میزانیہ کے مسئلہ پر اپنی آزادی رائے کا ثبوت دیا، حکومت کی یہ کوشش تھی کہ میزانیہ کا مسودہ قانون جس صورت میں پیش کیا گیا تھا بلا کسی ترمیم یا تبدیلی کے سولہ ماہ کے لئے منظور ہو جائے، اسمبلی کے منتخب ارکین نے پوری ردوقدح کے بعد مجوزہ میزانیہ میں کئی ترمیمات کیں اور میزانیہ کو سولہ ماہ کے لئے منظور کرنے سے بھی انکار کیا۔ جب اصل مسودہ قانون کے منظور ہونے کی کوئی صورت حکومت نظر نہ آئی تو بالآخر ہز اکسلنسی وائسرائے نے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو دعوت مشاورت دی اور اپنے تمام اثرات سے کام لیا، بہت کچھ سمجھایا بجھایا مگر یہ بھی بے اثر ثابت ہوا، بالآخر ہندوستان کے مفاد کے لئے، وائسرائے کو اختیارات خصوصی استعمال کرنا پڑے، اصل مسودہ قانون کی تصدیق کردی گئی اور اس کا عملدرآمد یکم دسمبر سے شروع ہوگیا۔

لیکن یہ کوئی غیر متوقع کارروائی نہ تھی! جس وقت یہ میزانیہ پیش ہوا تھا اس وقت یہ معلوم تھا کہ دسمبر کی پہلی تاریخ سے اس کا نفاذ ہو جائے گا خواہ اسمبلی اس کو منظور کرے یا خود وائسرائے کو اس کی "تصدیق" کا "ناگوار" فرض انجام دینا پڑے۔ البتہ موجودہ اسمبلی سے اس کی توقع نہ تھی کہ وہ گورنمنٹ کے مجوزہ میزانیہ کی مخالفت شدت سے کر سکے گی پھر خاص طور پر قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مجوزہ میزانیہ جن لوگوں کی کوشش سے اسمبلی سے

نامنظور کیا ان میں زیادہ تر وہی وفاداران حکومت ہیں جو بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور ان کے ناموں کے ساتھ بڑے بڑے خطابات لگائے جاتے ہیں۔ سوراج پارٹی کے ہنگامہ پرور اراکین میں سے اب ایک دو بھی بمشکل اسمبلی کی پچھلی کرسیوں پر نظر آتے ہیں۔ نیشنلسٹ پارٹی کی نمایاں شخصیتیں بھی اب نہیں رہیں لیکن اس کے باوجود میزانیہ کے ایسے مسئلے پر حکومت کو شکست کھانا پڑی، اس سے البتہ ہوا کا رخ معلوم ہوتا ہے۔

منتخب اراکین اسمبلی کی متفقہ رائے معلوم ہو جانے کے بعد حکومت نے جو کارروائی کی ہے اس سے اُن تحفظات کے متعلق جو آئندہ دستور اساسی کے لئے تجویز کئے گئے ہیں قوم کے شکوک و شبہات اور زیادہ قوی ہو جائیں گے۔ ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کا مسودہ قانون جب مرتب کیا جا رہا تھا تو والسرائے کے اختیارات خصوصی کی تمام دفعات محض تحفظات ہی کی مد میں رکھی گئی تھیں، لیکن ان اختیارات کا استعمال برابر جس طرح کیا گیا وہ دنیا کو معلوم ہے، برطانوی وزارت کے پے در پے اعلانات کے بعد نیک نیتی کا ثبوت دینے کا یہ گرانقدر موقعہ حکومت کو ملا تھا، اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا، میزانیہ کے معاملے میں قوم کے "وفادار" نمائندوں کی متفقہ رائے کو ہرگز اس طرح نہ ٹھکرایا جاتا۔

بنگال آرڈیننس | یہ اس سال کا گیارھواں آرڈیننس ہے جو گورنر جنرل و وائسرائے ہند نے نافذ کیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ صوبہ بنگال میں انقلاب پسند جماعت کی تشدد آمیز کارروائیوں کو روکا جائے، متذکرہ بالا آرڈیننس کی کل دفعات کا یہاں نقل کرنا بے کار ہے لیکن اس کا ایک مجمل خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آرڈیننس کے ماتحت مخصوص عدالتہائے فوجداری قائم کی جائیں گی اور ان کو سرسری طور پر انفصال مقدمہ کا اختیار حاصل ہوگا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو حق ہوگا کہ وہ جس فوجداری مقدمہ

کو چاہے عدالت خاص کے سپرد کرے۔ اقدام قتل کی سزا بھی وہی قرار دی گئی ہے جو قتل کے لیے ہے یعنی پھانسی یا عبور دریائے شور۔ لوکل گورنمنٹ جب چاہے کسی کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد کو سرکاری کاموں کے لئے جبراً لے سکتی ہے اور خالی کرا سکتی ہے۔ پولیس کو وسیع اختیارات حاصل ہوں گے کہ جس مرد عورت، بوڑھے بچے کو جہاں چاہے محض شبہہ کی بنا پر روک لے یا گرفتار کرلے، تمام سرکاری ملازمین اور اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ، زمیندار یا اور کسی شخص کی خدمات کی اگر ضرورت سمجھی جائے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جس وقت چاہے ان کو طلب کر سکتا ہے۔ مختلف قسم کی سواریوں کی آمد و رفت پر قیود و پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں، یا اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چاہے تو کسی سواری کو سرکار میں داخل کرنے کا حکم دے سکتا ہے کسی سرکاری عمارت میں یا کسی ریلوے عمارت یا کسی اور عمارت میں کسی شخص کے داخلے کی ممانعت کی جاسکتی ہے۔ خانہ تلاشیوں کے لئے اور زیادہ وسیع اختیارات پولیس کو دیئے گئے ہیں۔ مختلف قسم کے اسلحہ کے لائسنس کی ضبطی اور ان کی خرید و فروخت روکنے کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مزید اختیارات حاصل ہوں گے۔ لوکل گورنمنٹ کسی گاؤں یا کسی اور حلقے کے باشندوں پر مجموعی حیثیت سے جرمانہ کر سکتی ہے جس کی تحصیل وصول لگان یا مالگذاری کی طرح ہوگی۔ عدالت خاص کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہ ہوگی۔

یہ اور اسی قسم اور دفعات جدید آرڈیننس میں شامل ہیں، صوبہ بنگال میں عملاً قانون فوجداری اور قانون شہادت دونوں کو بالکل منسوخ کر دیا گیا ہے۔ ہر قسم کی شخصی آزادی سلب ہوگئی ہے شخصی جائداد اور شخصی دولت کی بھی کوئی حیثیت قانون کی نظر میں نہیں

حکومت کی یہ سراسیمگی اور دہشت کہاں تک حق بجانب ہے؟ اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ جدید آرڈیننس کلکتہ کی یورپین آبادی کے اختلاج قلب کو دور کرنے کے لئے ایک نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔ ورنہ کیا موجودہ قانون انقلاب پسندوں کی

سازشی کارروائیوں کو روکنے کے لئے کافی نہ تھا۔

تشدد آمیز کارروائیاں چاہے وہ حصول آزادی کے لئے کیوں نہ کی گئی ہوں مگر ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت نے آج تک اس کی حمایت نہیں کی اور نہ ان جانبازوں کے ساتھ کوئی ہمدردی ظاہر کی جو سولی پر لٹکائے گئے اور گولیوں کا نشانہ بنے۔ بلکہ ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت نے ان کارروائیوں کی ہمیشہ مذمت کی اور حصول آزادی کی راہ میں اس کو ایک رکاوٹ قرار دیا۔ یہی ایک معاملہ ایسا ہے کہ جس میں کانگرس نے حکومت کے ساتھ تعاون کیا اور اخلاقی امداد بھی کی۔ لیکن اس کے باوجود اگر آج ملک میں ہر طرف سے اس آرڈیننس کی مخالفت کی جارہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محض سازشیوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے ایک پورے صوبے پر ناقابل برداشت مصیبت نازل کی گئی ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن پس جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہاں اندیشہ ہے کہ گھن کی وجہ سے گیہوں پس جائینگے بہرحال انقلاب پسند جماعت یہی چاہتی تھی اور اس کا مقصد پورا ہوگیا۔ سازشیں ہمیشہ ناامیدی، بے چینی اور دہشت وسراسیمگی کی فضا میں پرورش پاتی ہیں۔ یہ فضا بنگال میں خود حکومت نے پیدا کردی۔

ہندوستان میں فوجی تعلیم کا انتظام | گول میز کانفرنس کی سب کمیٹی نمبر ۰ متعلق حفاظت۔ نے ماہران کی ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس میں سر سوامی [illegible] میجر جنرل راجواڑی، سر عبدالرحیم اور ڈاکٹر مونجے وغیرہ شامل تھے، کمانڈر انچیف اس کمیٹی کے صدر تھے۔ کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ ہندوستان کی افواج کو جلد از جلد مکمل طور پر ہندوستانی افسروں کے ماتحت لانے کے لئے انگلستان کے فوجی کالج سینڈہرسٹ کے نمونے پر ہندوستان میں ایک فوجی کالج کے قیام کی اسکیم تیار کرے۔ کمیٹی نے متعدد اجلاس ہندوستان میں منعقد کئے۔ ابتدا ہی میں کمانڈر انچیف اور دیگر غیر سرکاری ارکان

کمیٹی میں اس بات پر اختلاف ہوگیا کہ کمیٹی صرف کالج کے لئے ایک اسکیم تیار کرے یا ہندوستانی افواج کو جلد از جلد "ہندوستانی" بنانے کے متعلق بھی اپنی رائے ظاہر کرے، اس اختلاف کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں تھیں بالآخر اس بات پر سمجھوتہ ہوا کہ جو اراکین آخر الذکر مسئلہ پر اظہار رائے کرنا چاہتے ہیں ان کی رائیں اصل رپورٹ میں داخل نہ کی جائیں بلکہ بطور ضمیمہ کے رپورٹ کے ساتھ شامل کر دی جائیں۔ چنانچہ کمیٹی کی اصل رپورٹ کل ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ باقی ۷۰ صفحات میں غیر سرکاری اراکین کے اختلافی نوٹ ہیں جس سے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ سر سوامی آئر، اور سر عبدالرحیم کے ایسے قانون داں ارکان کی یہ رائے ہے کہ کمانڈر انچیف نے سب کمیٹی کی قرارداد کی غلط تاویل کر کے کمیٹی کے اختیارات کو بالکل محدود کر دیا۔ اور یہ ایسا بنیادی اختلاف تھا جس کی وجہ سے مذکورہ کمیٹی کی سفارشات کی وہ اہمیت نہیں باقی رہتی جو دوسری صورت میں ہونا چاہیے تھی۔

جہاں تک کالج کی اسکیم کا تعلق ہے کمیٹی نے تقریباً متفقہ طور پر سفارش کی ہے کہ ۱۹۳۲ء کے آخر تک ستارہ یا مئو یا ڈیرہ دون میں ایک کالج سینڈہرسٹ کے نمونہ پر قائم کیا جائے۔ اکثریت ڈیرہ دون کے حق میں ہے، طلبہ کی کل تعداد ۸۰ ہو، اس میں سے ۲۰ طلبہ دیسی ریاستوں سے لئے جائیں، تیس فوجی ملازمین میں سے اور بقیہ تیس طلبہ کے لئے مقابلہ کا امتحان ہو اور اعلیٰ کامیابی کے اعتبار سے بالترتیب ۲۴ طلبہ اس میں سے داخل کئے جائیں باقی ۶ امیدواروں کو کمانڈر انچیف کامیاب طلبہ کی فہرست میں سے خود بلا شرکت غیرے منتخب کیا کریں، لیکن حتی الوسع ترجیح ان امیدواروں کو دی جائے جو ٹیوریل یا آگزیلری (Auxiliary) فوج میں کام کر چکے ہوں۔ مقابلہ کا امتحان پبلک سروس کمیشن کی نگرانی میں ہو، داخلہ کے پہلے سال کے ختم پر ایک امتحان کالج میں لیا جائے اور جو طلبہ فوجی تعلیم کے لئے موزوں ثابت ہوں اور اگر اس راہ کو اپنے لئے پسند بھی کریں تو ان کے والدین یا سرپرستوں سے ایک عہدنامہ لکھایا جائے کہ بعد پانچ سال تک ان کا لڑکا فوج میں خدمت کرے گا۔ طلبہ کو نجی طور پر ملازم رکھنے کی اجازت

نہ ہو، مدت تعلیم تین سال ہو اور تین سال کے کل مصارف ۴ ہزار ۲ سو روپیہ سے زیادہ نہ ہوں
ڈاکٹر مونجے کو اس سے شدید اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں پچیتر روپیہ ماہوار سے کسی صورت میں
زیادہ نہ ہونے چاہئیں۔ جن طلبہ کے باپ دادا فوج میں ملازم ہیں یا رہ چکے ہیں۔ ان کی فیسوں
میں رعائت کی جائے۔ دیسی ریاستوں کے امیدواروں کے لئے بھی امتحان داخلہ ہو اور معیار
قابلیت وہی ہو جو برطانوی ہند کے امیدواروں کے لئے مقرر کیا جائے۔

ہوائی فوج کے لئے جب تک افسروں کی اتنی بڑی تعداد کی ضرورت نہ ہو کہ ان کے لئے
ایک نئے مدرسے کے مصارف برداشت کرنا ضروری ہو جائے اس وقت تک ہندوستانی
امیدواروں کو کرانوال میں دو سال کی تعلیم کے لئے انگلستان ہی بھیجا جائے۔

توپ خانہ، سگنل اور انجنیری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی ہندوستان میں انتظام کیا جائے
تمام نوجوان ہندوستانی افسروں کو ہندوستانی سپاہ کی کمان دینے سے قبل کم از کم ایک سال
تک برطانوی فوج میں کام کرنے کا موقعہ دینا چاہیئے۔

قضیہ کشمیر | کشمیر کے معاملے نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی ہے کہ تمام ملک کی توجہ کا مرکز
بن گیا ہے، ایک عرصے سے رعایا کی شکایات حکومت کشمیر کے خلاف روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔
جب داد فریاد سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بالآخر رعایا پُرامن مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ حکومت اس
قسم کی گستاخی کو کب برداشت کر سکتی تھی، لاٹھیاں چلیں، گولیاں چلیں، جنازے نکلے، ہڑتالیں
ہوئیں اور ریاست کے اندر اور باہر آس پاس کے علاقوں میں ایک آگ لگ گئی، پھر حکومت
کو ہوش آیا اور اس آگ کو بجھانے کے لئے تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا، معافیاں دی گئیں، حقوق
اور مراعات کا اعلان کیا گیا۔ مگر اب تیر ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔
۲۵ ہزار سے زیادہ گرفتاریاں اس وقت تک عمل میں آچکی ہیں، اور سول نافرمانی برابر جاری ہے۔
طرفہ تماشا یہ ہوا کہ حکومت ہند نے بھی ریاست کشمیر کی ہمدردی میں ایک آرڈیننس نافذ کر دیا جس

سے برطانوی ہند میں کشمیریوں کے ساتھ ہمدردی کی تحریک بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اب تک جتنی گرفتاریاں ہوئی ہیں اس میں زیادہ تر اہل پنجاب ہیں لیکن اب پنجاب اور کشمیر کے رشتے سے دہلی اور صوبہ متحدہ میں بھی تحریک کشمیر کے ساتھ قومی ہمدردی پیدا ہو رہی ہے بلکہ دہلی سے دو جتھے اب تک جا چکے ہیں اور معلوم ہوا ہے کہ پانچ سو سے زیادہ رضاکار اور جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

ہمارے خیال میں اگر حکومت بجائے کشمیر آرڈیننس نافذ کرنے کے وزراء کشمیر کو مشورہ دیتی کہ وہ بھی ایک گول میز کانفرنس کے ذریعے سے حقوق رعایا کا اہم مسئلہ طے کرنے کی کوشش کرے تو بہت بہتر نتائج نکلتے، ورنہ بے اطمینانی اور بے اعتمادی کی فضا پیدا ہو جانے کے بعد سائمن کمیشن سے کیا نتیجہ نکلا تھا جو اب کشمیر میں گلانس کمیشن اور مڈلٹن کمیٹی سے نکلے گا۔

برطانوی ہند کی عام بیداری کا اثر ناممکن تھا کہ پردیس کے علاقوں پر نہ پڑے جہاں رعایا کی حالت برطانوی ہند سے بھی زیادہ زبوں اور ابتر ہے، چنانچہ کشمیر کے نوجوانوں نے بھی آخر مجبور ہو کر اپنے قومی وجود کو باعزت طریقے پر قائم رکھنے کے لئے پُر امن جدوجہد شروع کی۔ اس جدوجہد میں انڈین نیشنل کانگریس کے اصول جنگ پیش نظر رکھے گئے اور طریق کار بھی وہی رکھا گیا جو گذشتہ سال کانگریس کے تجربہ عمل کامیاب ثابت ہوا تھا۔ جب ایک طرف کامیاب تجربے کے نمونے پر دوسرا تجربہ شروع کیا جا رہا تھا تو دوسری طرف اگر تدبر اور دانشمندی سے کام لیا جاتا تو ہرگز موجودہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔

مجلس احرار پنجاب نے اپنے پڑوسیوں کی ہمدردی میں جو شاندار خدمت کی وہ حیرت انگیز ہے۔ ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت جس میں ہندوستان بھر کے ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے پچیس ہزار سے زیادہ رضاکار میدان جنگ میں کام نہ آئے۔ گذشتہ تحریک سول نافرمانی میں

بھی اتنی بڑی تعداد کسی ایک صوبے سے جیل خانے نہیں گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں صرف ڈیڑھ مہینے سوا مہینے کے اندر صرف ایک صوبہ نے جو ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا وہ ستیاگرہ کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک کے سلسلے میں اہل کشمیر اور ان کے ہمدردوں کو ابھی کیا کیا مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن غور طلب چیز یہ ہے کہ حکومت کشمیر اس تحریک کو دبا سکتی ہے؟ بظاہر اس کی کوئی توقع نہیں معلوم ہوتی۔ بالآخر وہی ہوگا جو گذشتہ سال تحریک سول نافرمانی کا نتیجہ ہوا تھا۔ بلکہ بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت کشمیر اور حکومت دونوں کی طرف سے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی شروع ہوگئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تدبر اور دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ جلد سے جلد کشمیری رعایا کے حقیقی نمائندوں اور جماعت احرار پنجاب سے گفتگو کر کے معاملے کو ختم کر دیا جائے۔ جہاں تک حکومت کے وقار اور رعب کا سوال ہے وہ تو خود حکومت کی ناعاقبت اندیشی سے خاک میں مل گیا، اب بھی اگر اس سے تعویق کی گئی تو پھر ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے اور ریاست کشمیر کی رعایا کے جائز حقوق اور مطالبات اصول حق و انصاف کے مطابق طے کرائے۔

ممالک غیر

دنیا میں سونے کی تقسیم | ایک گذشتہ اشاعت میں دنیا میں معاشی انتشار کے وجوہ بیان کرتے ہوئے سونے کی غیر مساوی تقسیم کا ذکر آیا تھا۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ، فرانس، انگلستان اور جرمنی میں فی کس کتنا سونا ہے اور اس میں مختلف زمانوں میں کیا تغیر ہوا۔
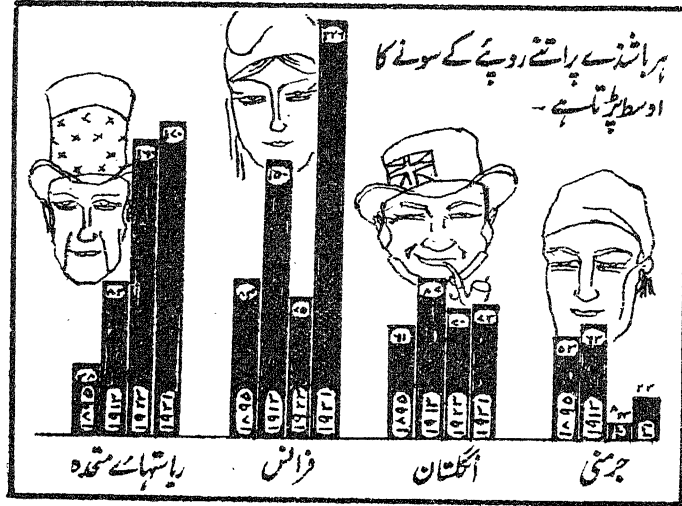
مسئلہ منچوریا قضیہ منچوریا کے متعلق روز طرح طرح کی خبریں آرہی ہیں، کبھی جمہوریت کے قیام کی توقع ہوتی ہے، کبھی انجمن اقوام کی مداخلت سے معاملہ روبراہ آتا نظر آتا ہے، پھر مایوسی ہوجاتی ہے، کبھی جاپان دبتا ہے، کبھی اڑتا ہے، امریکہ اپنی دلچسپی اور تعلق خاطر کا طرح طرح اظہار کرتا اور جاپان پر دباؤ ڈالتا ہے۔ ان خبروں کو سمجھنے میں غالباً ذیل کی سطور سے مدد ملے گی۔

منچوریا کے معاملے سے دراصل چار قوموں کا گہرا تعلق ہے: چین، جاپان، روس اور امریکہ۔ منچو حکمراں خاندان کی ابتداء سے برابر منچوریا چین کا سیاسی جزو رہا ہے، لیکن گذشتہ صدی کے اواخر تک چینی لوگ منچوریا کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتے تھے۔ البتہ پچھلے ۳۰ برس میں کوئی ڈھائی کروڑ چینی اس ملک میں جاکر آباد ہوگئے ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے جب سے چان سولین نے ملک میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی حکومت کی طرف سے بھی اس ملک کے لئے بہت کچھ کیا گیا ہے۔ باوجود جاپان کی مخالفت کے چین نے وہاں ریل بھی بنائی ہے اور اس کا یہ مقصد ظاہر ہے کہ شمال سے جنوب تک ایک چینی ریل بنالے جو خود اپنے بندر گاہ پر آکر ختم ہو۔ ظاہر ہے کہ چین اپنے کو منچوریا کا اصلی مالک اور اسے ترقی دے کر متمتع ہونے کا پہلا حقدار جانتا ہے۔

اُدھر جاپان اس علاقے میں خاص حیثیت کا طالب ہو، جاپان سمجھتا ہے کہ اس نے اس سرزمین پر اپنی تجارتی حوصلہ مندی ہی سے نہیں بلکہ خون بہا کر معاہدوں کے ذریعے اس مطالبے کا حق حاصل کیا ہے۔ ان معاہدوں کا اجمالی ذکر درج ذیل ہے:۔

۱۸۹۵ء میں جب جاپان نے چین پر فتح حاصل کی تو پورٹ آرتھر اور دائرن پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن روس کی مخالفت نے اسے اس انعام سے محروم رکھا۔ ستم بالائے ستم چین نے الٹے روس کو منچوریا میں بہت سے حقوق دے دئے۔ جاپان نے آٹھ سال بعد اس کا بدلہ لیا۔ روس کو شکست دینے کے بعد معاہدہ پورٹس متھ کی روسے پورٹ آرتھر اور دائرن بھی جاپان کو ملے اور وہ تمام حقوق و مراعات بھی جو ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کے معاہدے کی روسے روس کو ۲۵ برس کے لئے ملے تھے۔ اس کے علاوہ جاپان نے روس سے وہ ریل بھی حاصل کر لی جو جنوبی منچوری ریل کے نام سے مشہور رہے۔

روس اور جاپان میں معاملات کے اس طرح طے پاجانے کے بعد جاپان اور چین میں ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کو معاہدہ ہوا۔ اس میں چین نے مذکورہ بالا روسی جاپانی قراردادوں کو تسلیم کیا، اور جاپان کو یہ حق بھی دیا گیا کہ ریل کی حفاظت کے لئے فی کیلومیٹر ۱۵ آدمی کے حساب سے سپاہی رکھ سکے۔ اس معاہدے کے ساتھ ساتھ ایک خفیہ قرارداد بھی ہوئی جس کی ذمہ کی روسے چین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جنوبی منچوری ریلوے کو از روئے معاہدہ وقت مقررہ پر واپس پانے سے پہلے اس کے متوازی کوئی دوسری پٹری ڈالے یا ریل کی ایسی شاخیں کھولے جس سے جنوبی منچوری ریل کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو۔ جو حقوق روس اور جاپان کو ان معاہدوں سے حاصل ہوئے تھے وہ مدت معاہدہ ختم ہونے پر کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں جاپان نے جو ۲۱ مطالبات چین سے کئے اور اکثر بہ جبر منوائے ان میں ان معاہدوں کی مدت کو بھی بہت بڑھوا لیا گیا۔ اب جاپان کے پاس کوان ٹنگ علاقہ کا ٹھیکہ ۱۹۹۷ء تک کے لئے ہے، اور جنوبی منچوری ریل پر مراعات کی مدت ۲۰۰۲ء میں بیا

ختم ہوئی ہے۔ ۲۶ سال کے بعد اس ریل کو واپس لے لینے کا جو حق چین کو حاصل تھا وہ ختم کر دیا گیا ہے۔ ادھر جاپان کے حقوق بڑھ گئے ہیں۔ اسے جنوبی منچوریا میں زمین پٹہ پر دینے کا حق ہے، تجارت، صنعت، زراعت کے کاموں کے لئے مستقل عمارتیں بنانے کا حق ہے! جاپانیوں کو یہاں مستقل بود و باش کا حق ہے۔ بعض علاقوں میں کان کنی کا حق بھی انھیں ہی حاصل ہے۔ تمام دیوانی و فوجداری مقدمات میں جاپانی قنصل کو سماعت کے وقت موجودگی کا حق ہے۔ چین اگر جنوبی منچوریا میں کوئی پولیس کا قانون نافذ کرنا چاہے یا ٹکس کے متعلق کوئی قانون جس کا اثر جاپانی باشندوں پر پڑ سکتا ہو تو اس کا نفاذ بلا جاپانی قنصل کی منظوری کے نہیں ہو سکتا۔

اگر چین کوئی ریل بنائے اور خالص چینی سرمائے سے نہیں بلکہ پردیسی سرمائے سے بھی کام لینا پڑے تو پہلے جاپان کو حق ہے کہ قرض دے! اور یہی حال ہر اس قرض کا ہے جو منچوریا کے محاصل کی ضمانت پر چین لینا چاہے۔ کچھ ان معاہدوں نے جاپان کو ایک غیر معمولی حیثیت دیدی ہے، کچھ اس بات نے کہ منچوریا میں جاپانی خون بہہ چکا ہے وہاں کی فوج کا اس زمین کے ساتھ خاص تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اور اگرچہ جاپانی مدبروں کی یہ خواہش کہ ان کے ملک کی آبادی میں ہر سال جو ۹ لاکھ آدمیوں کا اضافہ ہو رہا ہے اس کا ایک معتد بہ حصہ منچوریا میں جا بسے آب و ہوا کے اختلاف کے باعث پوری نہ ہو سکی لیکن پھر بھی کوئی ۲ لاکھ جاپانی تاجر، انجنیر، یا ملازم کی حیثیت سے وہاں آباد ہیں۔ ان کے علاوہ ۸ لاکھ کوریا والے جو جاپانی رعایا ہیں یہاں آبسے ہیں جاپان کوئی دو ارب ین سے زیادہ اس ملک میں لگا چکا ہے۔ پھر جنوبی منچوریا میں کوئلہ، تیل، دھاتوں اور دوسری اجناس خام کی پیداوار بکثرت ہوتی اور ہو سکتی ہے جو جاپان جیسے صنعتی ملک کے لیے بڑی نعمت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب معاہدوں کی رو سے جاپان کو یہاں تفوق حاصل ہو، اور اس ملک کی اہمیت جاپان کے لیے اس قدر ہو تو وہ اس پر اپنی گرفت سخت کرنے کے لئے کیا کچھ نہ کرے گا۔

روس چاہتا ہے کہ بحر الکاہل تک چھوٹے سے چھوٹا راستہ اس کے قبضہ میں رہے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ چینی مشرقی ریلوے بالکل اس کے اثر سے نکل جائے۔ جاپانی چاہتے

ہیں کہ اس ریلوے کا سارا کام جنوبی منچوری ریلوے کی طرف منتقل ہو جائے۔ تاریخی
وجوہ سے بھی جاپان اور روس میں رقابت موجود ہے لیکن روس اس وقت جارحانہ رویہ نہیں
لے سکتا۔ جاپان نے اپنی حیثیت اتنی مضبوط کر لی ہے کہ روس آسانی سے مقابلے کا خیال نہیں
کرے گا۔ اس لئے غالباً اس ہنگامے میں صرف درپردہ چین کا ساتھ دے رہا ہے۔ اُدھر جاپان
بھی روس سے بگاڑنا نہیں چاہتا۔ اس کی نظر آج کے کمزور روس پر نہیں بلکہ ۲۰۔۲۵ سال بعد
کے مضبوط روس پر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر روس کو منچوری لوٹ میں سے تھوڑا سا حصہ دے دیا
جائے اور بحرالکاہل پہنچنے کے لئے راستہ سے تو وہ مطمئن رہے گا۔ جاپان اسے یہ اطمینان دینا
چاہتا ہے اور ساتھ ہی اپنی قوت بڑھا کر روسی مخالفت کے امکان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

امریکہ نے کوئی پون صدی سے چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے ہیں۔ کچھ تو اس
کا اثر ہے کہ امریکہ منچوریا کے معاملے میں چین کی طرف سے بولتا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے امریکہ
جانتا ہے کہ منچوریا کے مستقبل پر مشرق بعید اور بحرالکاہل کے مسائل کا انحصار ہے۔ اگر جاپان
نے یہاں اقتدار بڑھا لیا تو بحرالکاہل میں توازن قوت پر بہت اثر پڑے گا۔ منچوریا خود امریکی
مصنوعات کے لئے بڑی منڈی بھی ہے اور اس کے امکانات بہت وسیع ہیں۔ لہٰذا روسی
جاپانی جنگ کے بعد سے برابر امریکہ یہی چاہتا ہے کہ منچوریا میں سیاسی حالات متغیر نہ ہوں۔ چین کا
سیاسی تفوق باقی رہے اور تجارت، کان کنی وغیرہ کے لئے سب کو یکساں آزادی حاصل ہو۔
چنانچہ واشنگٹن کانفرنس میں جو نو دول شریک تھیں ان سے استقلال چین کے اصول کو منوالیا
گیا۔ جاپان کا یہ خیال کہ منچوریا میں اس کے مقابلے میں دوسری دول کو کچھ دخل نہ ہو۔ امریکہ
نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ جنگ عمومی کے بعد جب سائبیریا میں چکوسلاوی جنگی قیدیوں کو چھڑانے
کے نام سے مشترکہ یورش کی گئی تھی تو اس کے بعد امریکہ ہی نے جاپان کو شمالی منچوریا، مشرقی سائبیریا
اور ولاڈی وسٹاک سے فوجیں ہٹانے پر مجبور کیا تھا۔ اور ان امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا جو
جاپان نے اس مہم سے باندھ رکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت امریکہ کو اس مسئلے میں دلچسپی

لینے سے جاپانیوں کو بڑی تکلیف ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ امریکہ اس معاملے میں بولے۔ ریاست میں کمزور فریق کی حیثیت مردہ لاش کی سی ہوتی ہے جس پر ہر طرف سے گدھ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ چین پر بھی جاپان، روس، امریکہ اور پوشیدہ طور پر اور بہتوں کی نظر بھی گدھ کی سی نظر ہے، اس وقت جاپان کا رویہ سب سے زیادہ جارحانہ ہے۔ اور ہر چند کہ چینی قومی حکومت کا صدر خود اپنی افواج کی قیادت کے لئے نکل کھڑا ہوا ہے[ملہ] لیکن فوجی معرکے میں کامیابی کی امید چین کے لئے بہت کم ہے۔ دوسرے غرضمندوں کے اثر سے ممکن ہے جاپان کے منصوبے پورے نہ ہونے پائیں۔ البتہ چین کے پاس بائیکاٹ کا حربہ ضرور ہے اور وہ اسے استعمال کر رہا ہے۔ چین جاپانی مال کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اس لئے مجبوراً ہیں سامراجی حوصلہ مندی کا خمیازہ جاپانی معیشت کو اٹھانا ہوگا جو اس وقت کچھ بہت مضبوط حالت میں نہیں ہے۔

ملہ اس نوٹ کے جانے کے بعد اطلاع آئی کہ صدر مستعفی ہوگیا!

عالم اسلامی

۱۔ شؤون مصر | گذشتہ انتخابات کے موقعہ پر جب انگلستان کی قدامت پسند جماعت نے "قومی حکومت" کے پردے میں پارلیمنٹ پر غلبہ حاصل کیا ہے تو خیال تھا کہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر مصر و برطانیہ کے تعلقات پر ضرور پڑے گا۔ مصر کے سیاسی حلقوں میں اس کا خاص طور سے چرچا تھا اگرچہ جریدہ اسٹیٹسمین کے نامہ نگار کی رائے میں یہ سب کچھ مصریوں کو اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ حکومت برطانیہ کے پیش نظر شب و روز اگر کوئی معاملہ رہتا ہے تو وہ مصر کا ہے بہر حال دولت برطانیہ کو اصرار ہے کہ وہ مصر کے اندرونی معاملات سے مطلق تعرض کرنا نہیں چاہتی اور آج سے چند برس قبل اس نے مصری حکومت کے متعلق جو غیر جانبدارانہ طرز عمل اختیار کیا تھا اس پر بدستور قائم ہے۔ بظاہر حالات یہ سب کچھ صحیح ہے۔ لیکن مصر کا اندرونی اضطراب دراصل اس بے اطمینانی کا نتیجہ ہے جو ابتدا ہی سے مصری برطانوی معاہدے

کی بدولت ہوگئی تھی اور جس کی موجودگی میں اہل مصر کبھی بھی وہ درجہ آزادی حاصل نہیں کرسکتے جس کے وہ آرزومند ہیں۔ اس وقت حالات یہ ہیں کہ صدقی پاشا برسرحکومت ہیں اور ان کی جماعت تمام آزادانہ سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہے۔ حال ہی میں وفد مصر کی انتہاپسند جماعت نے تحریک استقلال اور سید عمر مختار مجاہد طرابلس کی شہادت کے متعلق دو جلسوں کا اعلان کیا تو حکومت مصر نے ان کو اس غدر کی بنا پر روک دیا کہ اس سے امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ البتہ زاغلول پاشا مرحوم کے مزار پر جو اجتماع ہوتا ہے۔ اس سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ بایں ہمہ انگریزی اخبارات کو شکوہ ہے کہ اس موقعہ پر نحاس پاشا نے جو تقریر کی اس کا لب ولہجہ نہایت سخت تھا اور زعمائے وفد کی زبان و قلم سے دولت برطانیہ کے خلاف جو پروپیگنڈا جاری ہے وہ بالکل نامناسب ہے۔ ادھر جماعت وفد اور لبرل پارٹی جس کے لیڈر محمد پاشا محمود ہیں دونوں کی یہ خواہش ہے کہ مصری برطانوی معاہدے پر نظرثانی کی جائے۔ لیکن ہنوز اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مصر کی داخلی مشکلات میں اس وقت سب سے پیچیدہ مسئلہ "معیار طلا" کا ہے۔ مصری پونڈ انگریزی پونڈ سے "وابستہ" ہے لہٰذا مصر و انگلستان کے لین دین میں "معیار طلا" کے ترک کے باوجود کوئی فرق نہیں آیا لیکن انگلستان سے باہر دوسرے ممالک میں مصری پونڈ کی قیمت گھٹ گئی ہے۔ اس سے ایک زبردست دقت کا سامنا ہو رہا ہے۔ علاوہ مصر کے اس قرضے کے جو اسے ممالک غیر کو ادا کرنا ہے۔ حکومت مصر کے غیر مصری ملازمین جن کا قیام اب یورپ کے کسی ملک میں ہے۔ شکایت کر رہے ہیں کہ چونکہ ان کی پنشن کی رقم مصری سکے میں دی جاتی ہے لہٰذا انھیں ۲۰ فیصدی کا خسارہ رہتا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ اس معاملے کو "مخلوط عدالت" کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن جب سے یہ مخلوط عدالتیں قائم ہوئی ہیں مستند ان کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ جس قوم کا معاملہ اس قسم کی کسی عدالت کے سامنے پیش ہو اس قوم

کے نمائندے جج اس میں شریک نہیں ہوسکیں گے اور چونکہ یہ معاملہ ایسا ہے جس کا تعلق سبھی اقوام سے ہے لہٰذا اگر اس معاملے کو "مخلوط عدالتوں" میں پیش کیا گیا تو کوئی یورپین جج اس میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ بالفاظ دیگر یہ معاملہ صرف مصری ججوں کے سامنے پیش ہوگا۔ مگر دقت یہ ہے کہ قانوناً اس قسم کی کوئی عدالت جس میں مصری ججوں کی اکثریت ہو قائم ہی نہیں ہوسکتی۔ گویا یہ معاملہ کسی طرح بھی عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صورت حالات جس قدر پر لطف ہے اس کا اندازہ قارئین کرام بخوبی کر سکتے ہیں۔

سیاسیات سے باہر جس معاملے کو خصوصیت کے ساتھ اہمیت دی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک نوجوان مصری طبیب ڈاکٹر سرور نے جو جامعہ مصریہ کے شعبۂ طب میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ ایک خاص انجکشن کے ذریعے "سرطان" کا علاج کر سکتے ہیں۔ اس مخصوص مرض کے اسباب اور طریق علاج کے متعلق انھوں نے اپنے خیالات کو قلمبند کر لیا ہے اور اب مغربی اطبا بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کا مطالعہ کر رہے ہیں کیونکہ مرض سرطان کو یورپ میں لاعلاج تصور کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں عربی طب کے حامی ڈاکٹر سرور کے "اکتشاف" کو کس نظر سے دیکھیں اس لیے کہ سرطان کے علاج سے ان کا دماغ بھی عاری نہیں البتہ طب جدید و قدیم کے حامیوں کو ڈاکٹر سرور کے خیالات اور طریق علاج سے ضرور واقفیت پیدا کرنی چاہیے۔

۲۔ اتحاد عراق و شام | کچھ عرصے سے یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ عراق و شام میں ایک متحدہ حکومت قائم کر دی جائے اور یہ اس لیے کہ برطانیہ اور فرانس دونوں حکومتوں نے جمعیت اقوام سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ عراق و شام کے حدود کا مسئلہ طے کر دے۔ عراق و شام کی متحدہ حکومت کے لیے امیر فیصل کا نام لیا جا رہا ہے۔ امت عربیہ کے اتحاد کے لیے جتنی بھی کوششیں کی جائیں مبارک ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تجویز کے پیچھے کون سا جذبہ کام کر رہا ہے اور وہ کہاں تک واقعی اتحاد عرب کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں اگر سیاسیات عالم کا ایک اجمالی خلاصہ پیش کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

اس وقت جمہوریہ شام فرانسیسی انتداب کے ماتحت ہے اور اس میں اسکندرون کی خودمختار سنجک، جمہوریہ لبنان، جبل دروز اور عطاقیہ کی ریاست جو اس سے قبل "علوی ریاست" کے نام سے مشہور تھی شامل ہیں۔

جمہوریہ لبنان کا دستور مکمل ہے اور اس پر مدت سے عملدرآمد ہو رہا ہے لیکن جمہوریہ شام کا دستور جس کا اعلان ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا ابھی تک عمل میں نہیں آیا لہذا ان دونوں جمہوریتوں میں سے اگر کسی کو سب سے پہلے "ریاست" کا درجہ ملا تو وہ اول الذکر جمہوریہ ہو گی۔ فرانسیسی انتداب سے اس کا تعلق براہ راست ہے اور یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ لبنان کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل ہے اس سلسلے میں یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ جمہوریہ لبنان کی حدود از سر نو متعین کر دی جائیں۔ حالت یہ ہے کہ اس وقت طرابلس الشام، سدون اور بعلبیک کے اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ اضلاع جن کو ۱۹۲۰ء میں جمہوریہ لبنان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ جمہوریہ شام کو واپس کر دئے جائیں یا نہیں۔ ممکن ہے فرانسیسی حکومت کی یہ کارروائی مسلمانان شام کی تالیف قلوب میں مفید ثابت ہو۔ عیسائی بہر حال اس تجویز کے مخالف ہیں بلکہ ان کی رائے تو یہ ہے کہ بیروت کو جسے ایک طرح سے لبنان کا مرکز حکومت سمجھنا چاہئے کسی طرح بھی واپس نہیں کیا جا سکتا۔

سیاسیات شام کی اس اجمالی کیفیت کے بعد اب اتحاد عراق و شام کے امکان پر پھر غور کرنا چاہئے۔ احرار شام کے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ وہ اصولاً ملوکیت کی حمایت کریں اس لئے کہ وہ ابتدا ہی سے جمہوری اصول حکومت کو اپنا عقیدہ قرار دے چکے ہیں۔ بایں ہمہ اگر شام کا تاج کسی عرب پادشاہ کو پیش کیا جائے تو اس کی کامیابی یقینی ہے اس صورت میں احرار بھی اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ شامیوں کی یہ دیرینہ آرزو ہے کہ وہ دمشق میں از سر نو اپنی کھوئی ہوئی پادشاہت کو زندہ کریں۔ خیال یہ ہو کہ جونہی عراق پر برطانیہ کا زمانۂ انتداب ختم ہو جائے امیر فیصل کو دعوت دی جائے کہ وہ شام کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں

سے لیں۔ امیر فیصل کو بھی دراصل شام ہی کی حکمرانی کی آرزو تھی اور بقول شامی وطنیین کے وہ
اول اول شام کا نجات دہندہ بن کر ہی اس سرزمین میں آئے تھے (اس امر کی ذمہ داری
کہ واقعی اہل شام امیر فیصل کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں انگریزی ذرائع اطلاعات پر ہے)
البتہ یہ مسئلہ کہ اس صورت میں عراق کے تاج و تخت کا وارث کون ہوگا کوئی ایسا دقت طلب
نہیں۔ قرارداد یہ ہے کہ امیر علی (حجاز کا خانماں برباد امیر) جو امیر فیصل کے بھائی بھی ہیں
اور ان کی جگہ اکثر وکیل حکومت کے فرائض بھی انجام دیتے رہتے ہیں، اپنے بھائی کے جائز
وارث بن سکیں گے۔

یہ تمام تجاویز اور قراردادیں بہرحال ابھی لوگوں کے ذہن میں ہیں جمہوریہ لبنان کو اس وقت
سب سے بڑی فکر اپنے اخراجات کم کرنے کی ہے اور فرانسیسی ہائی کمشنر نے ایک اعلان کے ذریعے
شام کی عارضی حکومت کے صدر کو معزول کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ انتخابات کا
زمانہ قریب آ رہا ہے اور حکومت یہ چاہتی ہے کہ ان میں انتہائی غیر جانبداری سے کام لے۔ ممکن
ہے وطن پسندان شام اب انتخابات کا مقاطعہ نہ کریں۔

۴۔ سیاسیات عرب | حکومت نجد و حجاز کی مالی حالت کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں۔ سلطان ابن سعود بیشتر
کا سارا ذخیرہ کام میں لا چکے ہیں۔ ولندیزی بینک سے قرضہ لینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس
میں ناکامی ہوئی اس لئے کہ حکومت نے جو ضمانتیں پیش کی ہیں ان سے بینک کا اطمینان نہیں
ہوا۔ اب سلطان اس کوشش میں ہیں کہ قاہرہ کے اس شامی حلقے سے جس نے کچھ مدت
ہوئی حکومت حجاز کے ساتھ ایک تجارتی بینک قائم کیا تھا مگر سلطان نے اس کی اجازت نہیں دی تھی
حجاز و نجد کی مالی کمزوری کا ایک بہت بڑا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ حجاج کی تعداد میں امتیاز نمایاں
بہت کم رہ گئی ہے۔ محمل مصری کا قضیہ ابھی تک طے نہیں ہوا۔ انگریزی اخبارات یہ ظاہر کر رہے
ہیں کہ سلطان ابن سعود کی مالی دقتوں سے حکومت روس خصوصیت کے ساتھ فائدہ حاصل کرنے کی
کوشش میں ہے۔ جدہ میں جو روسی ایجنٹ مقیم ہے اس کے ذریعے بہت سا تجارتی لین دین

ہو رہا ہے اگرچہ روس کو اس کا خیال نہیں کہ اس میں فائدہ ہوگا یا نقصان۔ اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ حجاز میں بالشویک دعوت پھیلانے کا موقع مل جائے۔

بہرکیف یہ امر یقینی ہے کہ اتحاد عرب کے دشمن ہر معمولی سی بات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ ایام میں حکومت نجد و یمن کی باہمی کشاکش کو خاص طور سے اہمیت دی جا رہی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ دشمنان اسلام کی مساعی کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ یمن و نجد کے باہمی اتحاد اور دوستی کی ایک نئی صورت نکل آئی ہے جس کے لئے سلطان ابن سعود یقیناً مستحق صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے جبل عارے دست برداری کا اعلان کر کے نفاق و شقاق کے ایک بہت بڑے سبب کا خاتمہ کر دیا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہر درد مند مسلمان جلالۃ الملک کے اس جذبہ ایثار کی تعریف کرے گا۔

۴۔ انگورہ کے خارجی تعلقات | جنگ عظیم کے بعد اول اول اسلامی ممالک میں جو تحریک رونما ہوئی وہ نسلی عصبیت اور وطنی جذبے کا نتیجہ تھی۔ اس کی وجہ کچھ تو وہ خیالات تھے جو مغربی اثر کی بدولت عرصے سے دنیائے اسلام میں سرایت کر رہے تھے لیکن حقیقی وجہ جو ان جذبات کا محرک ہوئی در اصل عالم اسلام کا وہ فرسودہ نظام سیاست ہے جس کو ہماری شریعت مقدسہ کی اصلی روح سے مطلق تعلق نہ تھا۔ قاعدہ ہے کہ ایسے موقعوں پر جب جذبات میں ہیجانی کیفیت رونما ہو نوجوان طبقہ اپنے خیالات و آرا کو غور و فکر سے قائم کرنے کے بجائے ہمیشہ عجلت سے کام لیتا ہے۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہوئی اور بعض ممالک مثلاً ہندوستان و مصر میں اب تک ہے۔ ہماری اس کوتہ اندیشی نے ہمیں صرف اس عظیم الشان سعادت ہی سے محروم نہیں رکھا کہ ہم اپنے دین مقدس کی تعلیمات کی غرض و غایت کا صحیح اندازہ کرتے بلکہ اس نے دشمنان اسلام کو بھی ہمارے خلاف ایک موثر حربہ بہم پہنچا دیا ہے۔ اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ کس طرح اسلام کی عمرانی روح اور اس کے نظام تمدن سے عدم واقفیت کی بدولت ہم نے اپنی انفرادی اور اجتماعی سیرت کی تشکیل نو میں ناقابل معافی غلطیاں کی ہیں۔ بہرکیف ہماری ان غلط کاریوں کا ایک روشن

پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ آئندہ دول اسلامی موجودہ اصول حکومت اور وطنیت و قومیت کے متعلق جو بھی روش اختیار کریں۔ اس تحریک نے تمام اقوام اسلام کے اندر آزادی اور جمہوریت کی تڑپ پیدا کردی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی وطنیت کا دارومدار کسی جغرافی اساس کو بنائے ملت قرار دینے پر نہیں تھا بلکہ اس کی غایت صرف یہ ہے کہ ہر اسلامی جماعت اپنے لئے ایک آزاد فضا پیدا کرے۔ چنانچہ جن جن مسلمان قوموں کو اس نعمت سے بہرہ مل چکا ہے اب ان کی نگاہیں اتحاد اسلامی کے اسی بلند پایہ اور پاکیزہ مقصد کی طرف اٹھ رہی ہے جس کو ہم اپنی کجروی یا ہمارے دوست نما دشمن بغض و تعصب کی بدولت مذہبی جنون سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں حکومت انگورہ کے خارجی تعلقات خاص طور سے غور طلب ہیں۔ عالم اسلامی میں ترکوں ہی نے سب سے پہلے اسلام کی بجائے وطن کو بنائے ملت قرار دیا اور سیاسیین مغرب کی تقلید میں یہ اعلان کیا کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ حکومت انگورہ کو اگرچہ ابھی تک اپنی اس "روشن خیالی" پر ناز ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ صرف ترک ہی نہیں بلکہ تمام مشرق کی نجات جدید تمدن کے اکتساب پر ہے لیکن ترکی ذہن کے اندر ہی اندر جو تحریکات موجزن ہیں ان کا غالباً انھیں خود بھی اندازہ نہیں۔ ترک کہتے ہیں اور بڑے اصرار کے ساتھ کہتے ہیں کہ سیاسیات کی دنیا میں کسی مذہبی تعصب سے کام لینا ایک جرم ہے۔ ان کی رائے ہے کہ ترکوں کے مقاصد صرف ان کے آبائی وطن تک محدود ہیں۔ بایں ہمہ وہ تمام عالم اسلامی سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ ایک حد تک انھیں اس کی بھی آرزو ہے کہ دنیائے اسلام میں ترکوں کو پھر وہی قدر و منزلت حاصل ہو جائے جس کا دولت عثمانیہ کو ادعا تھا۔ ترک کہتے ہیں کہ بیشک سیاسیات اور مذہب الگ الگ چیزیں ہیں لیکن ہم مسلمان ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ممالک اسلامیہ کی حالت سے بے خبر رہیں۔ ضرور ہے کہ ہم اپنے اسلامی رشتہ اخوت سے فائدہ اٹھائیں۔ اتحاد اسلامی کے اس جدید احساس کا اظہار اول اول ترکوں کی ان کوششوں سے ہو رہا ہے جو وہ مصر و ترکی کی باہمی مودت و محبت کے لئے کر رہے ہیں۔ عام ترکوں کو

چھوڑ کر خود مسلمانوں میں وطنیت اور دنیوی سیاست "کے بانی یعنی غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی یہ خواہش ہے کہ مصر و ترکی کے اتحاد و ارتباط کو جس طرح بھی ممکن ہو مستحکم بنایا جائے۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا جب امیر فیصل کا شوق سیاحت انھیں قسطنطنیہ لے آیا تھا لیکن اس کا مطلب بھی دراصل یہی تھا کہ دو اسلامی سلطنتیں جو ایک دوسری کی ہمسایہ بھی ہیں، ایک دوسرے کی طرف دست اتحاد بڑھائیں۔ ہندوستان کا فاصلہ ترکی سے کچھ کم نہیں بایں ہمہ ترکی اخبارات ہمیشہ مسلمانان ہند کی حمایت کرتے ہیں اور صاف صاف لکھتے رہتے ہیں کہ ہماری یہی آرزو ہے کہ "ہمارے بھائی" انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کے استبداد و تظلم سے محفوظ رہیں۔

ان حالات سے قطع نظر کرتے ہوئے ترکی کی سیاست خارجیہ کا ایک اور پہلو خاص طور سے امید افزا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ عالم اسلامی میں جمہوریہ انگورہ ہی ایک ایسی ریاست ہے جسے صحیح معنوں میں آزاد و خود مختار رکھا جا سکتا ہے اور جس نے واقعی معاصر حکومتوں میں اپنی ہیبت اور وقار قائم کر لیا ہے۔ اس وقت جمعیۃ الاقوام کی خواہش یہ ہے کہ ترک اس میں شریک ہو جائیں برعکس اس کے روسی یہ چاہتے ہیں کہ حکومت انگورہ اس سے محترز رہے۔ روسی حکومت نے بار بار اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ ترکوں کے اندرونی نظم و نسق میں مطلقاً مداخلت نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ روس اور انگورہ کے اتحاد سے مشرق قریب کا امن قائم رہے۔ حال ہی میں مسٹر لٹوی نوف جنھیں ماسکو کا سفیر خارجیہ تصور کرنا چاہیے انگورہ آئے تاکہ حکومت کو گذشتہ مواعید کا خاص طور سے یقین دلائیں۔ ادھر مجلس اقوام کی یہ کوشش ہے کہ ترک اس میں شامل ہو جائیں اور لیگ کے کارندے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ترکوں کا فائدہ بھی دراصل اسی میں ہے۔ بہر حال ترک اپنی مرضی کے مالک ہیں اور وہ اپنے نفع و نقصان کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ حکومت انگورہ کا طرز عمل وہی ہوگا جس سے اس کو قوت و احتشام حاصل ہو۔

د۔ قبرص | قبرص جس پر ابتدائے اسلام ہی میں خلفا کی سیادت قائم ہو گئی تھی جو حروب صلیبیہ کے دوران میں مسیحی جماعتوں کے قبضے میں آیا اور جسے بالآخر دولت عثمانیہ نے از سر نو

فتح کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے برطانیہ کے زیر اقتدار ہے۔ یہ دراصل اس خدمت کا صلہ تھا جو جنگ کریمیا میں حکومت برطانیہ و فرانس نے خلیفۃ المسلمین کی امداد کے لئے انجام دی تھی۔ اس زمانے سے مسلمانان قبرص کو جن کی تعداد غالباً پندرہ ہزار سے زاید نہیں مخصوص مراعات حاصل تھیں لیکن باب عالی کی سیاسی قوت کے انحطاط کے ساتھ رفتہ رفتہ قبرص کی حالت میں بھی تغیر پیدا ہوتا گیا۔ جنگ عظیم کے بعد جب اتحادیوں کی خفیہ کوششوں کی بدولت یونانیوں نے دولت بازنطینی کے احیا کے خواب دیکھنا شروع کئے ہیں تو قبرص میں بھی ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی جو اتحاد یونان کی حامی ہے۔ دو ڈھائی ہفتے ہوئے جب اس جماعت نے جس کو "انوسس" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ دولت برطانیہ کی جنگی قوت کا مقابلہ کرنا کچھ آسان نہ تھا۔ مالٹا، مصر اور سویز سے فوراً ہر طرح کی امداد پہنچائی گئی اور تھوڑے ہی عرصے میں شورش و بے چینی کا خاتمہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت اب اس مسئلے پر خاص طور سے غور کر رہی ہے کہ آئندہ قبرص میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے لیکن اس امر کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ مسلمانوں کا وہ شرذمۂ قلیل جو اس جزیرے میں مقیم ہے کس حال میں ہے اور ان کی قسمت کا فیصلہ کیا ہو گا۔

۹۔ مسئلہ عدن | جب سے حکومت ہند نے اپنا مالی خسارہ پورا کرنے کے لئے تخفیف کا حربہ اختیار کیا ہے ہمارے سامنے کوئی نہ کوئی جدید تجویز یا نیا مسئلہ آتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں عدن کے متعلق بھی یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومت بمبئی پر اس کے اخراجات کا بار نہایت تکلیف دہ صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ قیاس یہ تھا کہ شاید عدن کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے۔ دو تین مہینوں کی خاموشی کے بعد اب پھر عدن کا نام لوگوں کی زبان پر ہے۔ حال ہی میں حکومت ہند سے متعدد سفارتوں میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ عدن کا تعلق بمبئی سے قائم رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندی تاجروں کو عدن سے جو گہرا تعلق ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ حکومت ہند کوئی ایسی کارروائی نہ کرے جو اُن کے مفاد کے منافی ہو۔ ابھی کہا نہیں جا سکتا گو ظاہر نہیں ہو سکا کہ حکومت اس معاملے میں کیا روش اختیار کرنے والی ہے لیکن عدن کے حالات یقیناً

ایک ایسی صورت اختیار کر چکے ہیں جن کا جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی فیصلہ ہونا ضروری ہے۔

عدن اور ہندوستان کے باہمی تعلق کی تاریخ مختصراً یہ ہے کہ ۱۸۳۹ء میں اس مقام پر انگریزوں نے قبضہ کیا اور اس کا انتظام حکومت بمبئی کے ذمے کر دیا گیا۔ لیکن عدن کی جغرافی اہمیت نے تھوڑے ہی دنوں میں برطانوی ریزیڈنٹ کو مجبور کر دیا کہ وہ ماوراے عدن کے عربی قبائل اور مکلہ شحر اور سقوطرہ سے دوستانہ تعلقات قائم کرے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دولت عثمانیہ کو جزیرۃ العرب کی سیادت کا دعویٰ تھا، لہذا یہ ایک قدرتی امر تھا کہ عدن کی بدولت حکومت برطانیہ اور باب عالی کے سیاسی تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو۔ ابتدا شروع میں یہ مسئلہ مابہ النزاع رہا۔ بالآخر ایک مدت کی گفت و شنید کے بعد یہ طے ہوا کہ ایک متفقہ کمیشن قائم کیا جائے۔ ۱۹۰۴-۵ء میں عدن کی حدود متعین ہوئیں اور قرار پایا کہ حکام عدن علاقہ عدن کے باہر ترکی معاملات میں مطلق دخل نہ دیں۔ اسی طرح باب عالی نے بھی وعدہ کیا کہ علاقہ عدن کے اندرا ے عربی قبائل سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور ترکی افواج عدن پر حملہ آور ہوئیں۔ یہ دیکھ کر کہ حکومت ہند شاید عدن کی حفاظت کا کافی انتظام نہ کر سکے وار آفس نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا (۱۹۱۷ء) اس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ عدن کے سیاسی معاملات بھی براہ راست حکومت انگلستان کے زیر نگرانی رہیں گے۔ یہ صورت حالات اگرچہ عارضی تھی لیکن جنگ کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی کہ عدن کا تعلق براہ راست حکومت انگلستان کے ساتھ قائم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حکومت ہند کو اس تجویز کے قبول کرنے میں تامل تھا۔ کچھ دنوں تک معاملہ یونہیں چلتا رہا آخر ۱۹۲۷ء میں یہ طے پایا کہ ۱۹۱۷ء کے انتظامات کو برقرار رکھا جائے۔ گویا اب حکومت عدن کی کیفیت یہ ہے کہ (۱) وہ معاملات جن کا تعلق ہندوستان کے مفاد سے ہے حکومت ہند کے ہاتھ میں ہیں۔ (۲) علاقہ عدن کا انتظام ریزیڈنٹ کے ذمے ہے۔ وہ عدن کا حاکم بھی ہے اور فوج کا سپہ سالار بھی۔ (۳) فضائی افواج اور جنگی نظم و نسق نظارت حربیہ اور وار آفس سے متعلق ہیں۔ گویا حکومت ہند حکومت بمبئی اور حکومت انگلستان سب عدن کے نظم و نسق میں شریک ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد مسئلہ عدن کی موجودہ حیثیت پر آئندہ نمبر میں قلم اٹھائیں گے۔

اندھیری رات

ایک متوسط جسامت کا مچھر اُڑتے اُڑتے مسٹر بدرالزماں ایم۔اے، ال ال۔بی وکیل ہائی کورٹ کی ناک کے پاس پہنچا، کچھ دیر بھنبھنایا، ان کی مونچھوں پہ بیٹھا، آخر کو ان کی ناک کے اندر داخل ہوگیا، جو خراٹوں کی وجہ سے کبھی پھولتی اور کبھی پچکتی تھی۔ اب خدا معلوم یہ مچھر اس تاریخی مچھر کی نسل سے تھا جس نے نمرود کی ناک پر دھاوا کیا تھا یا آج کل کے من چلوں کی طرح نئی تحقیق اور تلاش کا شوق اسے اس وادیٔ تیرہ و تار کے اندر لے گیا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وکیل صاحب کی ناک نے اس "مداخلت بیجا بخانہ" کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ وکیل صاحب چھینکے اور اس زور سے چھینکے کہ پلنگ کی چولیں ہل گئیں۔ پلنگ کے پاس میز پر جو گلاس رکھا تھا اس کو لرزش ہوئی، اور چھوٹی بچی چونک کر رونے لگی۔ وکیل صاحب کی بیوی نے سوتے سوتے ایک ہاتھ بڑھا کر بچی کو تھپ تھپایا، ایک خاص آواز میں اللہ اللہ کہا اور پھر کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔ وکیل صاحب تو خیر اپنا قانونی فرض پورا کرنے کے بعد پھر کسی موٹے موکل کے پھنسنے کے خواب دیکھنے لگے، لیکن ان کی بیوی کی نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ ہزار کوشش کرتی ہیں لیکن آنکھ نہیں لگتی، خدا معلوم چھینک کی آواز کا ان کے قلب و دماغ پر کیا اثر ہوا تھا کہ اب سونا ناممکن ہوگیا، کمرے میں اندھیرا تھا، لیکن وہ اٹھیں، اسی طرح ٹٹولتی ہوئی پاندان کی طرف پہنچیں، ڈلی، تمباکو کھائی، کتھا چونا چاٹا، اور چونے کی چمچی کتھے میں اور کتھے کی چونے میں ڈال کر پاندان بند کر دیا۔ اب کیا کریں، کھڑکی کے پاس پہنچیں، اسے کھولا اور باہر کی طرف دیکھنے لگیں۔

سردیوں کا زمانہ تھا اور راتیں اندھیری تھیں، آسمان پر تارے اپنی پوری بہار دکھلا رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نامعلوم سرزمین میں ہزاروں روشنیاں جھلک رہی ہیں۔ ساری دنیا محو خواب تھی حتیٰ کہ چوکیدار بھی جسے سوتوں کی نیند خراب کرنے کے معاوضے

میں سرکار کی طرف سے آٹھ روپئے ماہوار دیے جاتے ہیں، چپ چاپ تھا۔ درخت بھی کسی گہرے سوچ میں چپ کھڑے تھے۔

قدرت کی اس مہرِ سکوت کو خود وکیل صاحب کی بیوی نے توڑا۔ کھڑکی کے باہر برداشت صحن دیکھتے دیکھتے انھوں نے دفعتاً ایک چیخ ماری، درختوں کے سایہ کے اندر سے انھیں کوئی شکل مکان کی طرف آتی ہوئی نظر آئی پہلے تو سمجھیں کہ کوئی گائے یا بھینس احاطہ میں آگئی ہے لیکن اچھی طرح آنکھیں ملنے کے بعد غور سے دیکھا تو اس کے آدمی ہونے کے متعلق کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ اب انھیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یہ کالی شکل آہستہ آہستہ باورچی خانے کی کھڑکی کی طرف بڑھی اور اندر کود گئی۔ ان کے منہ سے فوراً نکل گیا "ارے چور"، اور چہرے پر مردنی چھا گئی۔ بنگلہ شہر سے دور تھا، چوری کی واردات بھی ہو رہی تھیں۔ اب ان کے تخیل نے چشم زدن میں تمام ہونے والے واقعات ان کے ذہن کے سامنے پیش کر دئے۔ برتنوں کی چوری، اس کے بعد چور کا ان کے کمرے کی طرف آنا، وکیل صاحب سے لڑائی، وکیل صاحب کا کلہاڑے سے زخمی ہونا غرض کہ پوری واردات کی تفصیل ان کی آنکھوں کے سامنے آگئی اور ان کے بدن میں رعشہ پڑ گیا۔

انھوں نے وکیل صاحب کو زور سے ہلایا، "سنتے ہو، اے جی، اٹھو۔ ارے خدا کے لئے جاگو۔ آگ لگ جائے ایسی نیند کو۔ اے میں کیا کہہ رہی ہوں منھی کے ابا"

"اوں ... ہوں ... ہوں"، وکیل صاحب نے کروٹ لی، انگڑائی لی، چار مرتبہ منہ چلایا، اور پھر غافل ہو گئے۔

"ارے خدا کے لئے جاگو۔ باورچی خانے میں چور گھسا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے پاس ہی کپڑوں کا کمرا ہے، سارا اثاثہ وہیں۔ ہائے اللہ۔ ایسی نگوڑی نیند پر خدا کی سنوار"، وکیل صاحب نے پھر انگڑائی لی، دونوں مٹھیاں بند کر کے آنکھیں ملیں اور فرمایا "کیا ... کیا بات ... ہے"، ان کی بیوی کو غصہ آیا "تو صاحب اب نہیں سبق

پڑھا جائے۔ ارے میں کہتی ہوں باورچی خانے میں چور گھسا ہے، چور نصیبن وہیں سوتی ہے ہولوں کے مارے مرجائے گی، پاس ہی کمرے میں زیور کا صندوقچہ رکھا ہے، خدا کے لئے اٹھو جاؤ ۔"

وکیل صاحب نے اسی طرح بھاری آواز میں جواب دیا "تم بھی بڑی وہمی ہو، سو وہمی ہوگئے تم خود ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور یہ ہمیں وہمی بنا رہے ہیں، میری بلا سے وہ خدا کرے سارا گھر لوٹ لے جائے، لو اور سنو "

وکیل صاحب آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھے، بڑی زور سے کئی جمائیاں لیں، ہاتھ بڑھا کر سرہانے سے عینک کا ڈبہ نکالا، کھول کے عینک لگائی اور پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے،

"راتوں کو نیند بھی کم بخت حرام ہوگئی ہے، واہی تباہی باتوں کے لئے سوتے سے جگا کر بٹھا دیا" ان کی بیوی نے انھیں ایک مرتبہ پھر خطرے کا احساس دلایا۔

"تمھارے سر کی قسم میں نے اپنی آنکھوں سے کسی کو باورچی خانے کی کھڑکی سے کود تے دیکھا ہے "

وکیل صاحب نے چاہا مذاق میں بات اڑا دیں "ارے تو اس میں ایسی کونسی قیامت آگئی۔ باورچی ہوگا نصیبن سے ملنے آیا ہوگا" اب تو ان کی بیوی کو ضبط کی تاب بالکل نہ رہی بہت غصے سے بولیں۔

"یہ کیا۔ کیا کہا تم نے، بس ہوش کی باتیں کرو" وکیل صاحب نے پھر جماہی لیتے ہوئے کہا "میں کہہ رہا ہوں باورچی ہوگا" اب بیگم صاحب کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہوا

"آگ لگے اس باورچی کو۔ موا خدائی خوار، میں اپنے گھر میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتی۔ تم ابھی جا کر اس موے کو اس گھر سے نکال باہر کرو۔ جب میری آنکھ بند ہو جائے تو خوب دل کھول کر اپنے گھر میں ایسی باتیں کرانا لیکن میرے جیتے جی تو یہ نہیں ہو سکتا" یہ کہہ چکیں تو اپنے مرنے کے بعد کی حالت کا خیال کر کے رقت طاری ہوگئی۔ ڈبڈبا سی آنکھوں

کو پونچھا۔

وکیل صاحب اب مجبور ہوگئے تھے، کئی مرتبہ زور سے لاحول پڑھی، اپنی سلیپر پہنی اور اندھیرے میں اپنی رضائی ڈھونڈنے لگے۔ رضائی نہیں ملی، ٹٹولتے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچے، امامی چھوکرے کو جگاکر پوچھا "ابے میری رضائی کہاں ہے؟" اس نے کہا "سرکار بیگم صاحب اسے اوڑھ کر باورچی خانے کی طرف گئی تھیں وہیں ہوگی"۔ لڑکے پر خفا ہوئے کہ "کم بخت چیزیں اٹھاکر بھی نہیں رکھتا۔ اب میں سردی میں مروں"۔ بہرحال کانپتے اور تھرتھراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف گئے وہاں بھی اندھیرا تھا۔ وکیل صاحب نے کئی مرتبہ آواز دی "نصیبن او نصیبن" جواب نہ ملا "ارے کیوں مکاری کر رہی ہے، جیسے سو ہی تو رہی ہے، ارے تیرے کمرے میں ابھی کون آیا تھا"

نصیبن چونکیں، کن منائیں "جی حضور۔۔۔۔ کیا ۔۔۔ کم ۔۔۔ کمرے میں کون"

وکیل صاحب قانونی آدمی تھے، کئی بے قصوروں سے اپنی جرح کے زور سے قصور قبلوا چکے تھے اور پھر اس معاملے میں تو بیوی کی چشم دید شہادت موجود تھی کہنے لگے "ارے بس اب یہ اڑن گھائیاں تو رہنے دے، میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتا لیکن اس باورچی کم بخت کو ابھی یہاں سے نکال باہر کرو، اور خبردار جو وہ آئندہ کبھی رات کو اس کمرے میں آیا، تو اس کی اور تیری دونوں کی خیر نہیں"۔ اب نصیبن ذرا چیخ کر بولیں "حضور بھلا یہ کہتے کیا ہیں۔ وہ موا نگوڑا باورچی آگ لگے اس کے منہ کو میرے کمرے میں کیوں آنے لگا۔ واہ میاں واہ۔ غریبوں کی بھی آخر آبرو ہوتی ہے۔ ایسے ہر منہ تہمت نہیں لگا دیتے"۔ یہ کہتے کہتے اس پر رقت طاری ہوگئی۔ دو چار سسکیاں بھریں۔ زور سے ناک صاف کی۔

وکیل صاحب نے اطمینان سے کہا خیر جو ہوا سو ہوا لیکن اس باورچی کو ابھی فوراً اس گھر سے نکال دے، سمجھی کہ نہیں، نصیبن نے پھر اپنی قسمت کا گلہ شروع کیا "چار روپے کی نوکری سارے گھر کا کام۔ اس پر رات کی نیند حرام ہوگئی اور تہمت الگ لگے۔ ایسی بے عزتی کی باتیں

تو سرکار ہم نے آج تک نہیں سنیں۔ ہم کل ہی بیگم صاحب سے کہہ کر چلے جائیں گے۔ یہی ہوگا نا کہ چھوٹی بٹیا دیکھنے کو نہ ملیں گی، کبھی کبھی چھٹے چھ ماہے انھیں ایک نظر دیکھ لیں گے۔ اوں۔ اوں" (سسکیاں)۔

اب وکیل صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے "ارے مجھے ان باتوں سے کیا مطلب مجھ تو تیری بیگم صاحب نے بھیجا تھا۔ تیری کھڑکی سے باورچی چھوڑ شیطان کو دے تو مجھے کیا، غرض کہ اپنا فرض پورا کر کے وکیل صاحب چلے، اپنی رضائی یاد آئی، کہنے لگے "ارے ہاں وہ میری رضائی کہاں ہے" نصیبن بولیں، وہ سیدھے ہاتھ کی طرف کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہے۔"

وکیل صاحب نے اندھیرے میں ٹٹولا، رضائی لی اور چلتے ہوئے۔

اب اس عرصے میں وکیل صاحب کی بیوی پر جو گزری اس کا حال خدا جانتا ہے یا ان کا دل، پہلے تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہیں۔ تین منٹ ہوئے، چار ہوئے، پانچ ہوئے" اب ان کو گئے ہوئے دس منٹ تو ہو گئے ہیں، خدا معلوم کیا کر رہے ہیں، اگر باورچی ہی تھا تو کوئی ایسے ڈر کی بات نہیں ہے، لیکن اگر کہیں "شیطان کے کان بہرے" چور ہوا، تو، "اس خیال کے آتے ہی پریشانی بڑھ گئی۔ ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا " الہی ان کی جان کی خیر، یہ کمبخت چور ڈاکو چاقو چھری لے کر چوری کرنے نکلتے ہیں، مجھ کمبخت نے آخر انھیں کیوں بھیج دیا۔ یا بڑے پیر تمہارا ہی آسرا ہے۔ اگر ان کے دشمنوں پر آنچ آئی تو میں تو کہیں کی نہ رہی، اور پھر بچے "، اس خیال کے ساتھ پھر رقت طاری ہوئی، لیکن ضبط کیا، بچی سے چمٹ کر لیٹ گئیں اور وہیں سے زور سے پکارا "ننھی کے ابا، کہاں ہو"

عین اسی وقت وکیل صاحب کمرے میں داخل ہوئے کہنے لگے "ارے کیوں پریشان ہو رہی ہو، سارا محلہ جاگ اٹھے گا، یہ کیا کھڑا ہوا ہوں، تمھارے پلنگ کے پاس"، پلنگ پر بیٹھ گئے "تم بھی عجیب وہمی ہو۔ اس کمرے میں سوائے نصیبن کے کانی چڑیا تک نہیں ہے"

بھئی کل حکیم صاحب کو بلا کر کوئی مقوی قلب و دماغ نسخہ تمھارے لئے لکھوالیں گے، کیا پریشان کیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

بیوی چپکی سنتی رہیں، اپنی غلطی پر نادم تھیں، تھوڑی دیر بعد بولیں "یہ پیاز کی بو کہاں سے آرہی ہے، دماغ پھٹا پڑتا ہے۔" وکیل صاحب نے سونگھا تو واقعی بو تھی، کہنے لگے "ہاں ہے تو۔ یہ کہاں سے آرہی ہے" پھر فرمایا "اب نیند تو آنے سے رہی، میں لالٹین جلائے لیتا ہوں، مقدمے کے کچھ کاغذات ہی دیکھ ڈالوں" یہ کہہ کر پھر اپنی رضائی اوڑھے ہوئے اٹھے، دوسرے کمرے میں جاکر لالٹین جلائی اور لے کر اپنی بیوی کے پاس آئے، ذرا دور اور آگے بڑھے تھے کہ بیوی نے پھر زور سے ایک چیخ ماری "ارے اللہ یہ کیا" وکیل صاحب نے گھوم کر دیکھا تو ان کی بیوی کی آنکھیں ان کی رضائی پر جمی ہوئی تھیں اور ان کا منہ کھلا ہوا تھا، پوری طاقت سے چیخ کر بولیں۔

"یہ باورچی خانے میں اپنی رضائی اتارنے کی تمھیں کیا ضرورت ہوئی تھی، بولو جواب دو" وکیل صاحب سمجھے نہیں، پوچھا "کیوں یہ کیا بات" بیوی خفا ہو کر بولیں "بات وات تو میں جانتی نہیں لیکن ذرا اپنی قطع تو دیکھو کیا اچھے معلوم ہوتے ہو، دو دو بچوں کے باپ اور یہ حرکتیں"

اب جو وکیل صاحب نے اپنے اوپر نظر ڈالی تو سکتہ سا ہو گیا، دیکھا کہ نصیبن کی رضائی لپیٹے ہوئے ہیں، سٹ پٹا گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ نصیبن کی رضائی ان کے پاس کہاں سے آگئی بیوی کو دیکھا تو ماتھا پکڑے ہوئے چپ بیٹھی ہیں۔

اب وکیل صاحب لاکھ لاکھ سمجھاتے ہیں کہ وہاں اپنی رضائی اوڑھ کر نہیں گئے تھے، اندھیرے میں دھوکا ہوا غلطی سے نصیبن کی رضائی کھونٹی سے اتار لی، لیکن ان کی بیوی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یقین نہ آیا۔

"ارے میں خوب سمجھتی ہوں، یہی تو میں کہہ رہی تھی کہ اتنی دیر کہاں لگی، خدا۔ یہ دن دیکھنے کے لئے زندہ نہ رکھتا تو اچھا ہوتا۔ اور کیا صاحب، ابھی کیا ہے۔"

ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پورے دو دن تک وکیل صاحب کی بیوی نے ان سے بات نہ کی، آخر کو جب انھیں یاد آیا کہ وہ خود ان کی رضائی باورچی خانے میں چھوڑ آئی تھیں تو اطمینان ہوا، اس کے بعد سے وکیل صاحب نے عہد کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی بغیر روشنی کے کمرے سے باہر قدم نہ نکالوں گا، چنانچہ اب وہ عینک کے ڈبے کے ساتھ ایک چھوڑ دو دو دیا سلائی کی ڈبیاں بھی سرہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ (ماخوذ از چیخوف)

نوٹ: (اس قصے کے تمام افراد صرف افسانہ نگار کے تخیل کی پیداوار ہیں اس لئے اگر غلطی سے یہ "پر بیتی" کسی کے لئے "آپ بیتی" ہو جائے تو اس کا قصور نہیں ہے)

تنقید و تبصرہ

کتب :

دیوان یقین ۔ تفویض The Great Prophet محمد بیرم خاں ترکمان

دیوان یقین | مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب ۔ متن ۱۴۲ صفحے ۔ مقدمہ ۹۶ صفحے ۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی نفیس ۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

قیمت مجلد عہ، بلا جلد عمر

انجمن ترقی اردو نے اردو شاعری کے بہت سے بیش بہا خزانے جو خاک گمنامی میں دفن ہو چکے تھے کھود کھود کر نکالے ہیں ۔ ان میں سے ایک دیوان یقین بھی ہے ۔ یقین کی شاعری کے متعلق مرتب دیوان کے غلو اور لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے اغراق سے تو ہمیں اتفاق نہیں مگر اس میں شبہہ نہیں کہ بہت ستھرا، پاکیزہ کلام ہے اور پھر رعنائی اور شوخی سونے پر سہاگہ ہو گئی ہے ۔ کچھ تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے والوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر شخص جو شعر کا سچا ذوق رکھتا ہے اس کی قدر کرے گا ۔

فاضل مرتب نے کتاب کی تصحیح میں تحقیق و تلاش کا حق ادا کر دیا ہے اور مقدمہ بھی بڑے سلیقے سے لکھا ہے ۔ پہلے یقین کے خاندان کے اور خود اُن کی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں پھر تلمذ کا عنوان قرار دے کر ایک محققانہ اور دلچسپ بحث ان الزامات کی تردید میں کی ہے کہ یقین کا دیوان مرزا مظہر جان جاناں کا کہا ہوا ہے یا یقین نے اپنے ہمعصر شعراء سے سرقہ کیا ہے اس کے بعد یقین کے کلام کے متعلق چند شعرائے اردو کی رائیں نقل کی ہیں ۔ جن میں لچھمی نرائن شفیق کی رائے سب سے پرزور اور سب سے کم قابل قبول ہے ۔ اس سلسلے میں مرتب

نے شاہ حاتم، میر تقی، سودا، درد، تاباں کی ایک ایک غزل اور یقین کی ہم ردیف و ہم قافیہ غزلوں کے ساتھ ساتھ نقل کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان سب حضرات نے شگفتہ بحریں اور دلپذیر قافیے اور ردیفیں اختیار کرنے میں یقین کا تتبع کیا ہے۔ خود مرتب نے یقین کے کلام کی خصوصیات پر گہری نظر ڈالی ہے اور ان کے وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں جن کا مضمون فارسی اور اردو کے مشہور شعرا کے اشعار سے لڑتا ہے۔ یہ مقابلہ بعض مقامات پر بہت دلچسپ ہے۔ آخر میں فاضل مرتب نے چند الجھے ہوئے اشعار کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے نزدیک دو شعروں کے معنی انھوں نے صحیح نہیں سمجھے ہیں۔

اصول عشق پہ تولیں تو زمزمہ اس کا نہیں درست کہ جو بلبل شکستہ بال نہیں

اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں: "اس شعر میں بڑی بڑی تعقید ہے۔ اس کو اگر اس طرح نثر کیا جائے تو معنی صاف ہو جاتے ہیں جو بلبل شکستہ بال نہیں اس کا زمزمہ اگر اصول عشق پر تولیں تو درست نہ ہوگا) یعنی ایسے بلبل کے زمزمے میں مزا ہے جو شکستہ دل اور زخم خوردہ ہوا اور اسی کا زمزمہ عشق کی میزان میں پورا اتر سکتا ہے۔" ہمارا خیال یہ ہے کہ شعر میں تعقید نہیں ہر الفاظ میں جو ترتیب رکھی گئی ہے وہی مناسب ہے مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ بلبل بظاہر شکستہ بال نہیں اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا دل چوٹ سے خالی ہے ذرا اس کے آہنگ فریاد کو قانون محبت کے اصول پر جانچو تو پتہ چلے کہ یہ آواز کسی ٹوٹے ہوئے دل کی ہے۔

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے بندگی کی جس نے خو کی وہ خدائی کیا کرے

اس کے متعلق فرماتے ہیں" اس شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ صرف اس لئے لکھ دیا ہے کہ فطرت انسانی کے ایک مسئلے کو اس میں بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ اگر کوئی فاتح قوم مفتوح ہو جائے اور ایک عرصہ تک اس غلامی میں بسر کرے تو اس کے اخلاق ایسے خراب، اس کے خیالات ایسے پست (ہو جاتے ہیں) اور ہمت ایسی جواب دے جاتی ہے کہ پھر مدتوں تک اس میں حکومت کرنے کی قوت نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کاروں کو عہدیدار بنانے اور

ہندوالوں کو سوراج دینے میں تامل کیا جا رہا ہے" گویا شعر کا خلاصہ یہ ٹھہرا کہ عاشق با نیاز اگر معشوق بننا چاہے تو اس سے یہ بات بنے نہیں سکتی۔ ہمارے خیال میں مطلب بالکل اس کے برعکس ہے۔ یعنی معشوق کے دل میں اگر نیاز عشق پیدا ہو جائے تو ناز دلربائی کی شان قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ سلطنت برطانیہ نے گول میز کانفرنس منعقد کر کے ہندوستان کے نمائندوں پر ڈورے ڈالنا چاہتی ہے گویا اس نے انداز معشوقانہ کو چھوڑ کر رسم عاشقی اختیار کی ہے اب اس کی حکومت کا طنطنہ کیا خاک قائم رہے گا۔

مرتب نے مقدمے میں اشعار کے انتخاب سے پہلو تہی کی ہے۔ ہم بھی اس ذمہ داری کو اپنے سر لینا نہیں چاہتے مگر نمونہ کلام کے طور پر چند شعر نقل کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ تسخیریں آئینے کو آتی ہیں
دل سے نہ ہوا جو کام آئینے سے کیا ہوگا

باغ کے کوچے سے دیوانے نکل سکتے ہیں کب
رنگ گل کی موج سے زنجیر کرتی ہے بہار

باغباں و رنہ بند کر کے د گر
ہم کہاں تو کہاں بہار کہاں

ہائے میرا ہاتھ مت پکڑو کہ جب گل کی طرح
چاک ہی کرنے میں سب میرے گریباں کی پھبن

کرتا ہے کوئی یار و اس وقت میں تدبیریں
مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو
کیا عیش کر رہا ہے ظالم دو دانہ بن میں

خوباں یقیں کو معذور اب تو رکھو کہ اس کے
لو ہو نہیں جگر میں آنسو نہیں نین میں

خوش آئی ہے مجھے یہ بات اک مجنوں عریاں کی   کیا کیجے کہاں تک چاک گذرے ہم گریباں سے

تری آنکھیں سبھی سے آشنا ہیں اور کسی سے نہیں   ہوئے جاتے ہیں ہم دیوانے اس نا آشنائی کے

نہ رکھ اے ابر تو سر پر ہمارے بار منت کا   وہ بادل اور ہے جو آگ کو دل کی بجھا جائے

تفویض | یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں ایک خواب افسانہ کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ مصنفہ مرزا عظیم بیگ چغتائی وکیل چیف کورٹ مارواڑ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد حجم پانچ جزو۔ قیمت فی نسخہ ۵ر۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب رسالہ ساقی کھاری باؤلی۔ دہلی۔

مرزا صاحب نے اس رسالے میں ان مظلوم اور بیکس مسلمان عورتوں کی داستان سنائی ہے جو ظالم شوہروں کے بس میں پڑ کر مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور مروجہ اسلامی قانون کی رو سے کوئی صورت چھٹکارے کی ان کو نہیں ملتی جس کی وجہ سے بعض حالتوں میں فسخ نکاح کے لئے بادل ناخواستہ مجبوراً ان کو دوسرا مذہب اختیار کرنا پڑتا ہے۔

چغتائی صاحب نے اس کو ایسے دلکش پیرائے سے بیان کیا ہے کہ وہ خود خواب میں لڑکی بن گئے ہیں جس کے اوپر وہ تمام حالات گذرے جو بے بس لڑکیوں پر نالائق شوہروں کے ہاتھوں سے گذرتے ہیں۔ پھر انھوں نے اپنی قانونی واقفیت سے مدد لے کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور اپنے ظالم شوہر "محلہ کے مولوی صاحب" کے پنجہ سے رہائی حاصل کی۔

اس میں شک نہیں کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ حقیقت ہے اور آئے دن اس قسم کی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں کہ بعض بعض مسلمان عورتیں مجبور ہو کر اپنی جان چھڑانے کے لئے عیسائی ہو جاتی ہیں اگرچہ ان کا دل کسی طرح اسلام چھوڑنے کو نہیں چاہتا۔ اس لئے اس ناگوار صورت حال کا علاج انھوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ مسلمانوں میں تفویض کو عام کیا جائے۔ یعنی

شادی کے وقت حق طلاق شوہروں کی طرف سے عورتوں کو دے دیا جائے تاکہ جس وقت اس قسم کی تکلیف دہ صورتیں پیدا ہوں وہ اس حق سے کام لے کر اپنی گلو خلاصی کر سکیں۔ یہ حق تفویض قانون فقہ کے مطابق خاص خاص شرائط کے ساتھ سپرد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس رسالہ کے آخر میں ایسی دستاویزوں کے کئی نمونے اور مسودے بھی لکھ دیے ہیں جو نکاح کے وقت کام میں لائے جا سکتے ہیں۔

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ علاج آسان نہیں اس لئے کہ شوہروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ حق طلاق عورتوں کے سپرد کر کے اپنے ہاتھ کٹا لیں کہ وہ خفیف سے تنازع کی صورت میں بھی اگر چاہیں تو چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ علمار سے تحریک کی جائے کہ ان حالات کو دیکھ کر مروجہ دستور میں فقہ اسلامی کی رو سے ایسا طریقہ نکالیں کہ بلا تبدیل مذہب ایسی عورتوں کو رہائی مل سکے کیونکہ خلع بھی فقہ کی رو سے عورتوں کے اختیار کی چیز نہیں۔ غالباً جمعیتہ العلمار پر سب سے زیادہ حق عائد ہوتا ہے کہ اس معاملے کی طرف توجہ کرے۔ علمار سے ناامید ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں جب کہ ان کا فریضہ یہی ہے کہ وہ مشکل مسائل کی گتھیوں کو سلجھا کر صحیح راستہ پیدا کریں۔

آغاز رسالہ میں انھوں خود ہی تسلیم کیا ہے کہ اللہ اور رسول کی تعلیم اس سے بری ہے اور یہ صرف فقہا کی فہم کے نتائج ہیں۔ صغر سنی کی شادی بھی جو غیر فطری اور محل اعتراض ہے اور جس کو ہندوستان سے سال گذشتہ سارد ا ایکٹ نے بند کیا ہے اس سے بھی انھوں نے قرآن کریم کے دامن کو پاک تسلیم کیا ہے۔

چغتائی صاحب کا یہ رسالہ نہ صرف ادبی اور ظرافت بلکہ اصلاح معاشرت کے لحاظ سے بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

(پیغمبر اعظم) موئلفہ ایف، کے خاں درانی۔ چھوٹی تقطیع

صفحہ ۱۲۶ لکھائی، چھپائی اچھی، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور کے پتہ پر ڈیڑھ روپے میں مل سکتی ہے۔

یہ سیرۃ رسول جیسا کہ انتساب سے معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے رضیہ سلطان اور محمد اکرم کے لئے جو غالباً مولف کی کوئی عزیز یا شاگرد ہوں، لکھی گئی تھی، مگر بعد میں اس کو کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کی گئی، زبان نہایت آسان اور سہل ہے۔ انگریزی مدرسوں کے ساتویں آٹھویں جماعت کے بچے نہایت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، ابواب کی ترتیب، واقعات کا انتخاب مولف کے حسن تالیف پر دال ہے۔ نیز سیرۃ رسول سے متعلق ضروری چیزیں ان چند صفحات میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور صاحب مولف قابل مبارکباد ہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ چند چھوٹی چھوٹی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً صفحہ ۲۶ میں لکھا ہے کہ "زمانۂ جاہلیت میں کعبے کے اندر ایک بت تھا جس کا نام ہبل تھا اور اس کے علاوہ دو بت اور تھے جو شہر مکہ میں تھے" یہ صحیح نہیں ہے۔ ہر مستند سیرۃ کی کتابوں میں کعبے کے اندر ۳۶۰ بت لکھا گیا ہے، اسی طرح سے صفحہ ۲۷ میں لکھا ہے کہ کعبہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس نے بنیاد ڈالی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اس کی مرمت کرنے والے تھے یہ واقعہ بھی خود قرآن کی شہادت سے غلط ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا بانی قرار دیا گیا ہے۔ تیسری چیز صفحہ ۲ میں لکھی گئی ہے کہ آنحضرت صلعم نے وہ چیزیں لوگوں کو بتائیں کہ جس کا علم اس سے پہلے کسی کو نہ تھا۔ یہ قدرے مبالغہ ہے۔ آنحضرت خاتم الانبیاء کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے تھے اور وہ ادیان جس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیغمبر موسیٰ اور علیہ السلام لائے آپ نے اس کی تکمیل اور تصدیق کی۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے آپ نے بھی لوگوں کو وہی بتایا جس کو آپ کے پیشروؤں نے اپنے اپنے موقعہ پر ظاہر کیا، ہاں البتہ آپ میں اور گذشتہ انبیاء کی تعلیمات میں یہ ضرور فرق ہے کہ آپ سے پہلے نبیوں کے زمانے میں احکامات وقتی اور مخصوص جماعت کے لئے تھے لیکن

آپ پر جو احکامات نازل ہوئے وہ دائمی اٹل اور ہر جماعت کے لئے یکساں ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے آپ کی شریعت آخری شریعت ہی لیکن بہرحال ۱۶۶ صفحے کی کتاب میں یہ غلطیاں خوبیوں کے مقابلے میں حقیر ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ سیرۃ ۱۴-۱۵ سال کے ہندستانی بچوں کی استعداد کے عین مطابق ہے۔ میں خصوصیت کے ساتھ ان عمر کے بچوں سے اس کے مطالعے کی سفارش کرتا ہوں اور بڑوں کے لئے بھی اس کا پڑھنا غیر مفید نہ ہوگا۔ آخر میں جناب درّانی صاحب کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کہ سیرۃ کی کتابوں کی اشاعت ہر زبان ہر عمر اور ہر ملک میں حد درجہ ضروری ہے۔ صاحب موصوف نے کچھ تو کیا۔ خدا انھیں اس کا اجر دے۔ (ع۔ ج)

محمد بیرم خاں ترکمان | از جناب کوثر چاندپوری۔ جیبی تقطیع ضخامت ۱۴۸ صفحات۔ قیمت عہ مع محصول ڈاک۔ جناب مصنف سے بیگم گنج بھوپال کے پتے پر مل سکتی ہی۔

اس کتاب میں مغلیہ سلطنت کے مشہور سپہ سالار بیرم خاں کے حالات ہیں۔ پہلے یہ مضمون رسالہ مخزن میں شائع ہوا تھا، اسی کو پھیلا کر کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے مقدور بھر کافی تحقیق اور تلاش وجستجو سے کام لیا ہی اور بیرم خاں کے تمام اوصاف کو اجاگر اور اس پر جو الزامات قائم کئے گئے ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہی مگر بعض مقامات پر مصنف نے بیجا طرفداری سے کام لیا ہی۔ خصوصاً بیرم کی تمرد اور سرکشی کے معاملے میں بیرم کو بےقصور ثابت کرنے کی کوشش کی اور سارا الزام اس کے مخالفین پر لگایا ہے مگر اس سلسلے میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ تاریخ کے طالب علم کے لئے تشفی بخش نہیں۔ بیرم کی شاعری کے معاملے میں بھی غیر ضروری حسن ظن سے کام لیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے کتاب کا طرز تحریر بھی سوانح نگاری کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہیں بحیثیت مجموعی کتاب مطالعے کے قابل ہے۔

(م۔ ح۔ ح)

شذرات

اردو اکادمی کے لکچروں کا سلسلہ جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، جنوری سنہ ۳۲ء سے شروع ہو جائے گا۔ پہلا لکچر جناب سید وہاج الدین صاحب بی اے، بی ٹی پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد کا نفسیات مذہب پر ہوگا۔ جلسہ ۷ رجنوری سنہ ۳۲ء کو ۶ بجے شام کے وقت جامعہ ملیہ کے تعلیمی مرکز نمبر ۱ واقع قرولباغ دہلی میں منعقد ہوگا اور اس کی صدارت جناب خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے، ایم اے ڈی پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی فرمائیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اکادمی کے ارکان اور دوسرے علم دوست حضرات جلسے میں شریک ہو کر ہمیں سرفرازی بخشیں گے۔ باہر سے جو حضرات شرکت کے لئے تشریف لانا چاہیں وہ اپنی آمد کی اطلاع ناظم اکادمی کو ۵ رجنوری سے پہلے کر دیں تاکہ ان کے استقبال اور مہمانداری کا انتظام کیا جا سکے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد ۲۱ ردسمبر سنہ ۱۹۳۱ء کو منعقد ہوا۔ اس مرتبہ خطبہ پڑھنے کے لئے خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر تعلیمات حکومت بنگال تشریف لائے تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں ابتدا سے یہ رسم قائم ہو گئی ہے کہ تقسیم اسناد کے موقعے پر حکومت کے کسی اعلیٰ یا اوسط درجے کے عہدہ دار سے خطبہ پڑھوایا جاتا ہے۔ موجودہ وائس چانسلر کے آنے کے بعد خدا خدا کر کے یہ آن ٹوٹی اور سید سلطان احمد صاحب اس خدمت کے لئے مدعو کئے گئے۔ اب پھر ارکان حکومت کی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ گو وزرا کی حیثیت عام عہدہ داروں سے کسی قدر الگ ہے اور اصولاً ان کا شمار ملک کے رہنماؤں میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ جب تک ذمہ دار حکومت نہ ہو عملی طور پر وزیر اور مستقل ملازم سرکار برابر ہیں۔ ہمارا موجودہ سیاسی نظام اس کا مصداق ہے غم صیاد و فکر

باغباں ہے۔ دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے اور ظاہر ہے اس میں صیاد کوئی ہو مگر باغباں وزیر ہے۔

ہمیں خواجہ ناظم الدین صاحب کے انتخاب پر شخصی حیثیت سے اعتراض نہیں لیکن بجائے خود یہ بات پسندیدہ نہیں کہ ملکی تعلیم کی رہنمائی میں ان لوگوں سے مدد لی جائے جو ہر مسئلے کو حکومت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ حکومت چاہے وہ اچھی سے اچھی کیوں نہ ہو، اپنے مقاصد کے لحاظ سے اس پر مجبور ہے کہ ملک کا موجودہ نظم برقرار رکھنے کے لئے اور سب مصلحتوں کو قربان کر دے۔ تعلیم خصوصاً اعلیٰ تعلیم کا نصب العین یہ ہے کہ حال پر تنقید کی نگاہ ڈالے اور استقبال کو اصلاح و ترقی کی راہ پر لگائے۔ حکومت کے خمیر میں جمود ہے، تعلیم کی فطرت میں حرکت ہے۔ اس لئے تعلیم میں حکومت سے ہدایت چاہنا گویا زنجیر کو راحلۂ سفر بنانا ہے۔

یہ اعتراض تو معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر ہے۔ علمی مقاصد کے لحاظ سے یہ اور بھی نازیبا ہے کہ ارباب علم کے ہوتے ہوئے اہم علمی اور تعلیمی جلسوں میں ارباب جاہ و حکومت سے خطبے پڑھوائے جائیں۔ یونیورسٹی کا اصل مقصد اعلیٰ تعلیم اور علمی تحقیق ہے۔ جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبے کی اصل غرض یہ ہے کہ ان نوجوانوں کو جو یونیورسٹی میں تحصیل علم کی پہلی منزل طے کرکے زندگی کے بڑے مدرسے میں داخل ہو رہے ہیں کسی عالم متبحر، کسی عارف زندگی کے بیش بہا خیالات، سننے کا موقع ملے جس سے انھیں بصیرت و ہدایت حاصل ہو اور ان کے دلوں میں ذوق و شوق پیدا ہو۔ ایسے موقعے پر خطبہ پڑھنے کا اہل وہ شخص ہے جو علمی دنیا میں بلند مرتبہ رکھتا ہو جس نے علم کی حقیقت کو اور علم اور زندگی کے تعلق کو خود بھی سمجھا ہو اور دوسروں کو بھی سمجھا سکے جو یونیورسٹی کے اساتذہ کو تعلیم اور تحقیق کی نئی راہ دکھائے اور طلبہ کو تحصیل اور تعلیم کا حقیقی مقصد سمجھائے۔ ممکن ہے کبھی وہ زمانہ آئے جب حکومت کے ارکان میں ایسے لوگ موجود ہوں۔ ابھی تو وہ دن

بہت دور ہے۔

خواجہ ناظم الدین کا خطبہ اس معیار کے لحاظ سے جو آج کل مجالس علمیہ کے خطبوں کا ہو گیا ہے غنیمت ہے۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے ابتدا میں طریق انتخاب وغیرہ کے سیاسی مسائل چھیڑ دیے ان کا کیا موقع تھا۔ ان مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے۔ اس خطبے میں یہ چیز بالکل بے محل تھی۔ ایک طرف تو یہ حضرات تعلیم کو سیاست سے الگ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور دوسری طرف موقعے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تعلیمی جلسوں میں اپنے یا اپنے سرپرستوں کے سیاسی خیالات کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ لائق مقرر کو کم سے کم یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ مسلم یونیورسٹی دو ایک سال سے ایک چھوٹے سے حلقے کے اقتدار سے نکل کر ساری ملت اسلامی سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے سب سے اہم جلسے میں بے ضرورت ایسے مسائل پر بحث کرنا جنھوں نے مسلمانوں میں شدید خانہ جنگی برپا کر رکھی ہے کہاں تک مناسب ہے۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ایسے جلسوں میں حکومت کے ارکان کو ذمہ داری کی تقریریں کرنے کے لئے ہرگز نہیں بلانا چاہیے۔ یہ بیچارے مجبور ہیں۔ بعض باتیں ان کا تکیہ کلام اور تکیہ خیال بن گئی ہیں۔ ان کے بغیر نہ وہ گفتگو کر سکتے ہیں نہ کچھ سوچ سکتے ہیں۔

تقریر کے دوسرے حصے میں لائق مقرر نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں بے روزگاری کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اکیلے بنگال میں ہر سال یونیورسٹی سے دو تین ہزار گریجویٹ نکلتے ہیں جن میں صرف دو تین سو کو نوکری ملتی ہے۔ باقی لوگ چونکہ اور کسی کام کے نہیں ہوتے اس لئے بے روزگاری کی مصیبتیں سہتے ہیں اور جب انھیں معاشرتی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ملتی وہ اس کی تخریب کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس کا

سبب فاضل مقرر نے یہ قرار دیا کہ ہر طالب علم اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خواہ مخواہ کالج میں تعلیم پاتا ہے، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم کی قابلیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ موصوف نے اس کا علاج وہی تجویز کیا ہے جو سیڈلر کمیشن کی رائے تھی کہ اسکول یا انٹرمیڈیٹ کالج کی تعلیم کے بعد اکثر طلبہ صنعت اور پیشے کی تعلیم پائیں اور یونیورسٹی میں صرف وہ لوگ داخل ہوں جو اعلیٰ ذہنی قابلیت رکھتے ہوں۔ اس تجویز سے ہمیں حرف بحرف اتفاق ہے لیکن یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ صنعت اور پیشوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہوگا اور دوسرا یہ کہ تعلیم پاکر بھی ملک کی موجودہ اقتصادی حالت میں ان لوگوں کے لئے کہاں تک گنجائش نکلے گی اور اس اقتصادی حالت کے بہتر ہونے کی کیا صورت ہے۔ پہلے سوال کا جواب موصوف نے دیا ہے، دوسرا یا تو ان کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا یا اس کا کوئی جواب جو خطرے سے خالی ہو نہیں سوجھا۔

تیسرے حصے میں لائق مقرر نے اس بات پر بحث کی ہے کہ صنعتی تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا نظام کیا ہونا چاہئے۔ موصوف نے فرمایا کہ اس قسم کی تعلیم دینا یونیورسٹی کا کام نہیں کیونکہ وہ خالص علمی درسگاہ ہے۔ اس مقصد کے لئے علیٰحدہ ایک یا ایک سے زیادہ مرکزی تعلیمگاہیں ہونی چاہئیں۔ جن میں صوبوں کی حکومت طلبہ کو وظائف دے کر تعلیم دلائے۔ اصولاً موصوف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے لیکن عملی ضرورتوں کے لحاظ سے افراد اور قومیں اصول سے انحراف کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ تعجب ہے کہ موصوف نے باوجود اس تجربے کے جو انھیں حاصل ہوا ہوگا ایسی بات کہی جو فی الحال بالکل ناقابل عمل ہے۔ ملک کی مالی حالت یہ ہے کہ یونیورسٹیاں سرمائے کی کمی سے نالاں ہیں۔ ایسی صورت میں صنعتی تعلیم اور پیشے کی تعلیم کے اعلیٰ ادارے قائم کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا اور جب یونیورسٹیاں عام ذہنی پستی کی بدولت اعلیٰ نصب العین سے اتنی دور ہیں کہ انھوں نے طلبہ کو سرکاری ملازمت کے لئے تیار کرنا اپنا مقصد قرار دے لیا ہے تو ان کے اندر دوسرے پیشوں کی تعلیم کا انتظام کرنے میں آخر

کون سی قباحت ہے۔ پھر ایک پہلو یہ بھی قابل غور ہے کہ صنعتی درسگاہیں اگر یونیورسٹیوں سے علحدہ ہوں تو اندیشہ ہے ان کے طلبہ کا علمی اور ذہنی معیار اور بھی پست ہو جائے گا۔ اس کا تجربہ جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک کو ہو رہا ہے اس لئے یہ اگر مالی پہلو سے قابل عمل بھی ہو تو بھی اس پر عمل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

آخر میں موصوف نے طلبہ کو بہت سی بزرگانہ نصیحتیں فرمائیں جس کے مفید ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً قومی خدمت اور ایثار کی تلقین جو آپ نے فرمائی ہر طرح قابل قدر ہے۔ اگر اسی کے ساتھ آپ خدمت اور ایثار کی کوئی عملی راہ بھی دکھاتے تو طلبہ کی سچی رہنمائی کا فرض پوری طرح انجام پاتا۔

جو مشورے کے وقت خیر خواہ ہو اور جب ہم کوئی بات بھول جائیں یا کسی معاملے میں غافل ہوں تو ہمیں یاد دلا کر ہوشیار کر دے اور مصلحت کے کاموں پر ہمیں آمادہ کرتا رہے۔ ہمیں تمہارا مشورہ بہت پسند آیا۔ بہتر ہے ہاشم کے بیٹے کو اس کی جگہ مقرر کرو اور اپنے الطاف و عنایات سے اسے خوش کرتے رہو۔

ادب کی سرپرستی و قدر شناسی | امیر محمد خود ادیب تھا اور اہل ادب کا قدر شناس بھی تھا۔ اس کے ایک خادم نے اس کی اس رغبت سے فائدہ اٹھا کر ایک جگہ کے لئے اپنی درخواست ملازمت پیش کی اور چند مرتبہ اس کے حضور میں چکنی چپڑی باتیں بنائیں۔ امیر نے درخواست کے جواب میں لکھا کہ تم کو اس جگہ کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ تمہاری کارگزاری ایسی نہیں جس کا صلہ ایسی خدمت سے دیا جائے۔ مگر چونکہ تم نے اس درخواست کو اچھے الفاظ اور دلکش عبارت سے زینت دی ہے اس لئے صرف یہی ایک وجہ معلوم ہوتی ہے کہ میں تمہاری طرف متوجہ ہوں۔ اگر یہ تحریر تم نے لکھی ہے تو نہایت اچھی ہے اور اگر کسی اور شخص سے لکھوائی ہے تو تمہارا حسن انتخاب قابل داد ہے اور ان دونوں صورتوں میں تم ہماری نظروں میں مستحق انعام ہو۔ لہٰذا ہم تمہیں اس خدمت پر مقرر کر کے امید کرتے ہیں کہ تم اس کام کو بھی ایسی ہی اچھی طرح انجام دیتے رہو گے اور اپنی تحریر کو بھی سنوارتے رہو گے اور ہماری خوش خیالی کو جو تمہاری نسبت پیدا ہو گئی ہے، قائم رکھو گے اور کسی شخص کو ایسا موقع نہ دو گے کہ وہ تمہاری شکایت کرے۔ جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا لحاظ کرو گے تو بڑی باتوں کا خیال خود بخود رہنے لگے گا جو ابتدا میں خوش اسلوبی سے کام کرتا ہے اس کا انجام بھی اچھا ہوتا ہے اور لوگ غیبت میں بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔

ابوالیسر ریاضی کی چالاکی اور امیر کا تدبر و سلوک | ابوالیسر شاعر جو الریاضی کے نام سے مشہور ہے مشرق میں بے روزگاری سے پریشان ہو کر مغرب میں اندلس آیا اور ایک جعلی خط ابن شیخ شامی کی جانب سے تیار کیا اور شہر والوں کی طرف سے ایک محضر نامہ ترتیب دیا۔ اس میں دربار خلافت تک رسائی کے لئے جو باتیں ضروری تھیں وہ سب درج کیں۔ اس کے بعد جب امیر محمد کی

خدمت میں حاضر ہوا اور یہ کاغذات پیش کئے تو امیر سمجھ گیا کہ یہ کاغذات جعلی ہیں اور الریاضی ایک چلتا ہوا چالاک، کھانے کمانے والا آدمی ہے۔ تاہم اس نے حکم دیا کہ الریاضی کو مہمان رکھا جائے۔
الریاضی ایک مدت تک شاہی مہمان رہا۔ اس کے بعد اس نے واپسی وطن کی اجازت چاہی امیر نے ہاشم کو جو اس وقت زندہ تھا بلا کر کہا کہ یہ شخص بھی عجیب ہے یہاں حصول معیشت کے لئے آیا تھا جو اس کو حاصل ہے۔ اگرچہ فریب سے ہی۔ ہم اس کے پاس والے خط کے جعلی ہونے نہ ہونے کا ثبوت طلب کرتے یا جواب دے دیتے تو بنی ہاشم ہم پر مضحکہ اڑاتے اور ہم اس کو جھٹلا دیتے تو یہ بات ہماری دنائت وبخل پر محمول کی جاتی اور ہم بدنام ہو جاتے۔ باوجود ان حالات کے اگر یہ خط ہمارے پاس وہیں سے بھیج دیا جاتا تو بھی یہ شخص مستحق اکرام تھا چہ جائیکہ اس قدر دور کی مسافت طے کر کے آیا ہے ہمارے خیال میں تو یہی مناسب ہے اس کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اچھی طرح سے رخصت کیا جائے۔ چنانچہ پانسو دینار دے کر رخصت کر دیا جائے اور خط حوالے کیا جس میں سوائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے کچھ نہ لکھا تھا۔

محمد ابن ولید فقیہہ نے ہم سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب الریاضی قرطبہ سے مشرق جانے کے لئے روانہ ہوا تو اسی وقت ہم بھی مشرق کے سمت چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ہمارا اس کا ساتھ ہو گیا۔ الریاضی نہایت اچھا ادیب اور قادر الکلام شخص تھا۔ جب ہماری اس کی خوب ملاقات ہو گئی اور مدت تک ہم اور وہ جنگلوں میں ساتھ رہے تو اس نے اپنے حالات ہمیں بتا کر امیر کا خط ہمارے سامنے ہی کھولا جس میں صرف بسم اللہ لکھی ہوئی تھی اور کچھ نہ تھا۔ اس وقت الریاضی کو امیر کی دانائی پر سخت تعجب ہو رہا تھا۔ اور وہ یہ کہتا تھا کہ "میں امیر کو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ نہ وہ دھوکا کھاتے ہیں نہ بدنام ہوتے ہیں۔"

مصر میں الریاضی کی گرفتاری ابن ملانے کے بیانات کا ایک ٹکڑا

جب الریاضی مصر پہنچا تو وہاں کے گورنر نے اس کی اطلاع پا کر الریاضی کو قید کر دیا۔ محمد ابن ولید کہتے ہیں کہ جب ہمیں یہ معلوم ہوا تو ہم اس کی ہمدردی اور دوستی کے سبب سے اندلس کے تین اور باشندوں کے ساتھ بعد

نماز جمعہ اس سے ملنے قید خانے گئے اور دریافت کرتے کرتے قید خانے کے دروازے تک جا پہنچے ۔ ہم نے الریاضی سے خواہش کی کہ وہ ہمیں اندر بلا کر ہم سے ملاقات کرے۔ الریاضی نے جواب دیا کہ تم بھی میرے ساتھ قید خانے میں رہنا چاہتے ہو ۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیوں اس نے کہا کہ جو شخص قید خانے میں داخل ہو جاتا ہے وہ بلا حکم سلطانی رہا نہیں ہو سکتا ۔ ہم سمجھے کہ وہ ہم سے مذاق کر رہا ہے۔ ہمیں اس کے قید ہونے کا بہت ملال تھا ۔ جب ہم وہاں سے واپس ہونے لگے تو ہمیں پہرے والے نے قید خانے میں ڈھکیل دیا اور گویا ہم بھی قید ہو گئے۔ اب ہم سخت مصیبت میں تھے نہ ہمیں کوئی جانتا تھا نہ ہم کسی کو جانتے تھے ۔ ہم قید میں تھے کہ ہماری اطلاع المزنی فقیہہ کو ہوئی اور انھیں معلوم ہو گیا کہ ہم صرف طالب علم ہیں اور ہماری نیت بخیر ہے تو انھوں نے مصر کے گورنر سے ہمارے متعلق عرض و معروض کی اور ان کی سفارش اور خدا کے رحم و مہربانی سے ہمیں اس بلا سے نجات ملی ۔

ولید ابن عبد الرحمٰن وزیر کیسے ہوا | ایک موقع پر ولید[۱] ابن عبد الرحمٰن ابن غانم نے ایک عرضیہ امیر محمد کی خدمت میں پیش کیا جس میں محمد کے احسانات کا ذکر کر کے امیر کا شکریہ ادا کیا تھا اور امیر کے لئے ترقی دولت و اقبال کی دعا اور اپنے اس عجز کا اظہار رتھا کہ حقیقت میں قول و فعل سے ان نعمتوں کا حق ادا نہیں ہو سکتا جو مجھ پر مبذول ہوئی ہیں آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں مرتے دم تک ان نعمتوں کا ممنون اور امیر کا خیر خواہ رہوں گا ۔

جواب میں امیر نے لکھا کہ خدائے تعالیٰ کی ایک صفت شاکر بھی ہے ۔ وہ شکر گزاروں کو پسند کرتا ہے ۔ تو نے ہمیں پکارا ہم نے سنا ۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے ۔ پھر کچھ مدت کے بعد اسے اپنا وزیر بنا دیا ۔

تاریخ سلطنت و انتقال | امیر محمد جمعرات کے روز تیسری ربیع الآخر ۲۳۸ھ کو امیر ہوا اور چونتیس

---

(۱) یہ ولید ابن عبد الرحمٰن وہی ہیں جن کا ذکر ہاشم کے سلسلے میں ہو چکا ہے یہاں انکے وزارت پر مقرر ہونے کا ذکر کیا ہے۔

سال بادشاہ رہ کر جمعہ کے دن آغاز ماہ ربیع الاول ۲۷۳ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کی عمر ۶۵ سال ہوئی۔

امیر المنذر ابن محمد

المنذر ضلع ریہ میں امیر محمد کے حکم سے لڑ رہا تھا۔ وہیں اس کو اپنے باپ کی وفات کا علم ہوا یہ سنتے ہی وہ دو منزلہ سہ منزلہ کوچ کرتا ہوا اتوار کے دن تیسری ربیع الاول کو قرطبہ پہنچ گیا اس نے اپنے باپ کے جنازے کی نماز وزرا کے ہمراہ ادا کی۔(۱) ہاشم اپنے آقا کے رنج سے بیتاب ہو رہا تھا اور ابونواس کے یہ شعر پڑھتا جاتا تھا

اغزی یا محمد عنک نفسی معاذ اللہ والایدی الجسام

(اے محمد میں اپنے نفس سے تیری تعریف کرتا ہوں خدا کی پناہ وہ احسانات جو تو نے کئے ہیں کیا بھولے جا سکتے ہیں)

فہلا مات قوم لم یموتوا ودوفع عنک لی کاس الحمام

(وہ قوم جو زندہ ہے کیوں نہ مر گئی اور بجائے تیرے مجھے کیوں نہ موت آ گئی)

جب منذر نے یہ اشعار سنے تو وہ سمجھا کہ مجھ پر طعن کیا جا رہا ہے اس بنا پر المنذر نے ہاشم کو نیدکر کے قتل کرا دیا۔

المنذر دو ہی سال امیر رہا۔ اور اس قلیل مدت میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس میں اس کی قابلیت نمایاں ہوتی اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ وہ صاحب عزم تھا جس کے آثار اس میں پائے جاتے تھے۔ وہ بنشتر میں محاصرہ کئے ہوئے مقیم تھا کہ ۱۷ صفر ۲۷۵ھ کو پیام مرگ آ پہنچا۔ وفات کے وقت اس کی عمر چھیالیس سال تھی۔

---

(۱) غالباً یہ ہاشم کوئی دوسرا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے پیشتر امیر محمد کے عہد میں ایک ہاشم کے قتل کا ذکر آ چکا ہے۔ (مترجم)

امیر عبداللہ ابن محمد

تخت نشینی اور فتنوں کا ہجوم | المنذر کے بعد سنیچر کے دن اس کا بھائی عبداللہ امیر ہوا۔ بلشتر میں جو لوگ محاصرہ کئے ہوئے پڑے تھے اب طول محاصرہ سے پریشان ہو چکے تھے۔ جب انھیں المنذر کی وفات کا علم ہوا تو اضلاع کے لشکر اور قبائل کے سب وفود منتشر ہونے لگے اور چاروں طرف سے لشکروں کی واپسی شروع ہو گئی۔ عبداللہ نے ان کو روکنے اور سب کو اپنی اپنی جگہ قائم رہنے کا حکم دیا لیکن اب کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اب پھر لشکروں کو ان کی جگہ پر قائم رکھ سکتا۔ آخر عبداللہ بھی خائف ہوا کہ وہ تنہا دشمن کا مقابلہ کیونکر کرے گا اور یہ سوچ کر وہ بھی واپس ہو گیا۔ منذر مرحوم کی نعش بھی وہاں دفن نہ ہونے دی۔ بلکہ اپنے ساتھ لے گیا اور قرطبہ میں لاکر اپنے بزرگوں کے پاس قصر میں دفن کیا۔

ملک کی عام حالت اور امیر کے انتظامات | اب ملک کی حالت نہایت خراب ہو گئی تھی۔ ہر صوبہ بغاوتوں اور سازشوں کا گھر بنا ہوا تھا۔ امیر کے جنرل اس کی امداد سے قاصر ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں امیر نے تقویٰ اور پرہیزگاری پر سختی سے عمل کیا اور مسلمانوں کے اموال کی کافی حفاظت و نگرانی کی۔ جہاں تک ممکن ہوتا کوئی صرف بیجا نہ ہونے دیتا۔

اس زمانے میں بغاوتوں اور حملوں کی وجہ سے ملک کی آمدنی بہت کم ہو گئی تھی اور لشکروں کے انتظام کی ضرورت بمقابلہ سابق اب زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ امیر عبداللہ نے اہل لشکر کی تنخواہوں میں اس آمدنی کی کمی کے باوجود اضافہ کیا اور دوسرے طبقات کے ملازموں کی تنخواہیں کم کیں۔ تاہم فسادات نے ملک میں مضبوطی سے جڑ پکڑ لی اور ابن حفصون کا واقعہ تو نہایت اہم ہو گیا تھا جو عموماً بہت مشہور ہے۔ یہاں تک کہ اس نے قلعہ بلائی پر قبضہ کر لیا۔ جو قرطبہ سے صرف ایک منزل کے فاصلے پر ہے۔

ابن حفصون کے سوار ساکی درازدستیاں | ابن حفصون کے سوار اطراف میں پھیل گئے تھے اور اس کے

لشکر صبح و شام امیر کے خلاف حملے کیا کرتے تھے۔ ان حملوں نے یہاں تک ترقی کی کہ شقندہ اور فج المائدہ تک ان کی زد پہنچنے لگی۔ کسی شخص کو مدافعت کی طاقت نہ رہی بلکہ یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جس زمانے میں ابن حفصون اور اس کا لشکر قرطبہ کے نواح میں فج المطل پر خیمہ زن تھا اس کے ساتھیوں میں سے ایک بہادر سوار نے حملہ کیا اور پل تک زبردستی گھستا ہوا چلا آیا اور باب القنطرہ والے مجسمے تک پہنچ کر اس مجسمے کو نیزہ مارا اور پھر واپس ہو کر اپنے ہمراہیوں میں صحیح و سالم پہنچ گیا۔

ابوالعباس احمد کی سپہ سالاری اور بغاوتوں کا انسداد

یہ مصیبت پچیس سال تک رہی لیکن امیر عبداللہ کے آخر زمانہ حکومت میں ابوالعباس احمد ابن محمد بن ابی عبدہ کی سپہ سالاری کی وجہ سے ملکی معاملات کی اصلاح ہونے لگی۔ ابوالعباس نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دئے اور باغیوں نے نہ صرف بدلہ لیا بلکہ بطور سزا ان کے ساتھ کچھ زیادتی بھی کی اور ملک سے فساد رفع کر کے امن و امان قائم کر دیا۔ ابن حفصون کو قلعہ بلائی سے باہر نکالا اور بعض مشرقی ممالک سے خراج وصول کیا اور بہت سے ملکوں سے اسی خراج پر جو پہلے سے مقرر تھا اور بعض سے ان امرا کی بحالی پر جو وہاں پہلے سے مامور تھے صلح کر لی۔

امیر کی ادبی قابلیت

امیر عبداللہ کی توقیعات یعنی وہ تحریریں جو بادشاہ اپنے قلم سے آپ لکھتا ہے نہایت ہی بلیغ تھیں۔ اس کے اشعار میں تشبیب اور زہد کا رنگ غالب تھا۔ اس کی سی فصاحت و بلاغت کی مثال نہ سابقہ امیروں میں ملتی ہو نہ آئندہ امید ہے کہ ملے۔

ایک بار عبداللہ نے اپنے جنرل احمد بن محمد کو عید کے دن لکھا: "اما بعد! خدا پر بھروسہ کرنا اپنا لازمی فرض سمجھو اپنے تمام کاموں میں اسی پر اعتماد کرو خواہ تم اپنی سرحدوں کی حفاظت پر ہو کیونکہ اللہ پر بھروسہ کرنا تمام مشکلات کی کنجی ہے اور تمہاری خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کا وسیلہ ہے۔ اپنی عیدوں اور خوشی کے دنوں میں بھی حفاظت کا فرض پورا پورا ادا کرو۔ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہی ارحم الراحمین ہے۔"

ایک دفعہ عبداللہ نے اپنے بعض عمال کو ایک خط لکھوایا: "اما بعد اگر تمہاری توجہ ان

مہات کی طرف جن پر ہم نے تم کو مقرر کیا ہے ۔ فضول خط وکتابت کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی تو ہم تمھیں بہترین آدمی دقیقہ رس، مدبر اور دور اندیش کارگزار خیال کرتے۔ خط وکتابت میں بے ضرورت وقت ضائع نہ کرو اور اپنے فکر و قوت کو پوری توجہ کے ساتھ اہم معاملات میں غور کرنے پر صرف کرو۔ اگر خدا نے چاہا تو یہی امور تمھاری بھلائی کا سبب ہو جائیں گے۔

امیر کی شاعری | امیر کی شاعری کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے۔ تشبیب میں۔

في شلة يخلع العذار (۱) على شان كحيل

خالطه ازورار البهار (۲) كانما وجنتاه ورد

يدير طرفا به احورار (۳) قضيب بان اذا تثنى

ما اطرد الليل والنهار (۴) فصفو ودى عليه وقف

زہد وتقوے کے موضوع پر اس کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

حتى م يلهيك الامل (۵) يامن يراوغه الاجل

وكانه بك قد نزل (۶) حتى م لا تخشى الردى

فلا نجات لمن غفل (۷) اغفلت عن طلب النجا

---

(۱) میری تباہی ایک آہوش، سرمگیں چشم (محبوب) کی بدولت ہے جسے دیکھ کر لوگ از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔

(۲) اس کے رخسار گویا گلاب کے پھول ہیں جن میں نور اور بہار مخلوط ہے۔

(۳) وہ (محبوب) جب جھکتا ہے تو نزاکت اور لچک میں درخت بان کی شاخ معلوم ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں گردش کرنے لگتی ہیں۔

(۴) جب تک لیل ونہار کا سلسلہ باقی ہے میری پرخلوص محبت اس کے لئے وقف ہے۔

(۵) اے وہ شخص کہ موت نے تجھے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ امید تجھے کب تک غفلت میں ڈالے رکھے گی۔

(۶) تو کب تک ہلاکت سے خائف نہ ہو گا حالانکہ (۱) قریب ہے گویا تجھ پر نازل ہو رہا ہے۔

(۷) کیا تو طلب نجات سے غافل ہو گیا ہے حالانکہ جو غافل رہے اسے کہیں نجات نہیں

هیہات یشغلک المنی (۸) ولما یدوم بک الشغل
فکان یومک لم یکن (۹) وکان نعیک لم یزل

عبدالرحمٰن الناصر بن محمد بن عبداللہ

اندلس میں امارت کے بجائے خلافت کا اعلان اور فسادات ملک پر قابو

امیر عبداللہ کے بعد عبدالرحمٰن بن محمد ابن عبداللہ تخت نشین ہوا اور اس نے بجائے امارت کے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ اس وقت تمام اندلس پر فتنہ وفساد کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہر طرف علی الاعلان حکومت کی مخالفت ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالرحمٰن الناصر بھی ایسے نیک شگون کے ساتھ تخت پر بیٹھا تھا کہ جو شخص بھی اس سے مقابلہ کرتا وہ قتل یا ذلیل یا قید ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس کے قبضے سے نکلے ہوئے شہر یکے بعد دیگرے دوبارہ فتح ہونے لگے۔ حکومت کی سخت گیری سے باغیوں اور سرکش مفسدوں کا سدباب ہو گیا۔ خلیفہ نے انھیں ذلیل کر کے ان کے قلعوں کو منہدم کرا دیا۔ ان پر سخت سے سخت تاوان عائد کئے اور نہایت اچھے طور پر ان کے عامل ایسے ظالم وجابر مقرر کئے کہ سب کی اصلاح ہو گئی۔ اس کے ساتھ پے درپے دوسری اصلاحات بھی ہوتی رہیں۔ شہر کے شہر مطیع ہوتے گئے۔ ابن حفصون اپنی ہی موت اپنے قلعے میں مر گیا۔ اور اس کا لڑکا سلیمان حکومت کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد اس کے تمام اہل و عیال قلعے سے نکل کر خلیفہ کے مطیع ہو کر اس کے لشکر میں شامل ہو گئے

بشتر پر قبضہ اور ایک مضبوط قلعے کی تعمیر

پھر خلیفہ نے بلشتر پر قبضہ کیا اور وہاں ایک مضبوط قلعہ تیار کرا کے

---

(۸) افسوس تجھکو تمناؤں نے مشغول کر لیا ہے۔ گویہ ظاہر ہے کہ تیری یہ مشغولیت ہمیشہ نہیں رہے گی۔
(۹) تو تو یہ سمجھ کر کہ تیرا آج کا دن جیسے کبھی نہ تھا اور موت کی آواز تجھے ہمیشہ سے آ رہی ہے۔

اس کے اطراف کے سب چھوٹے چھوٹے قلعے گرا دئے۔ اس نے یہ قلعہ اس ضرورت سے بنوایا
تھا کہ ضرورت کے وقت وہ اور اس کی اولاد اس میں پناہ لے سکے۔ اس زمانے میں یہ بات
عام طور سے مشہور تھے کہ اندلس آج کل فتنہ و فساد کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور باغی لوگ اہل ملک کو
نکال کر شہروں کو تباہ و برباد کرتے اور مردوں کو قتل کر ڈالتے ہیں اور عورتوں اور بچوں کو
لونڈی غلام بنا لیتے ہیں۔ ان سے وہی لوگ محفوظ رہ سکتے ہیں جو قلعوں اور مضبوط فصیل والے
شہروں یا جزیروں میں پناہ لیں اور یہ بھی مشہور تھا کہ اب یہ فساد اس طرح جڑ پکڑ گیا ہے کہ اب اس کے
اصلاح پذیر ہونے کی کوئی امید نہیں۔

فتوحات کی وسعت اور عروج و اقبالمندی کا دور خلیفہ عبدالرحمٰن پچاس سال تک اسی عزت و احترام
اور سطوت و شان سے حکومت کرتا رہا۔ اس کی فتوحات شرق سے غرب تک وسیع ہوتی رہیں
اور وہ برابر اپنے دشمنوں کی سرکوبی اور ان کے قلعوں کے انہدام میں مصروف رہا اور اللہ تعالیٰ
کی مدد ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ اس نے بڑے بڑے شہر اور مضبوط قلعے متواتر فتح کئے حتیٰ کہ سمندر
کے پار بھی اس کی نصرت کا سکہ بیٹھ گیا۔ سبتہ اور طنجہ وغیرہ بھی فتح ہو گئے اور اس نے اپنے جنرل
مقرر کر کے اپنی فوج سے ان کی حفاظت کی۔

ان فتوحات کے سلسلے میں خلیفہ نے اپنی بہت سی فوج جہازوں کے ذریعے سے اطراف
بربر میں پھیلا دی اور انھیں لوگوں نے جو پہلے اس کے خلاف تھے اب مطیع ہو کر اس کی اعانت
کی۔ اور تمام ملک بربر اس کے زیر نگیں ہو گیا۔ وہاں کے بادشاہ و فرمانروا یا تو مطیع ہو گئے یا تباہ
و برباد ہو کر ذلت و نامرادی کے ساتھ مر گئے۔ غرض ایک وقت وہ آیا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن کے
سپاہیوں اور لشکریوں میں انھیں لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جو پہلے اس کے مقابلے میں
آکر سر میدان اس سے لڑ چکے تھے اور آج اس کی رضا جوئی و اطاعت کو اپنی تمام ضرورتوں اور
خواہشوں پر مقدم رکھتے تھے۔ تائید الٰہی سے تمام مغرب عبدالرحمٰن الناصر کی زیر نگیں ہو گیا۔ اگر اللہ
کی مدد کچھ روز اور اس کے ساتھ رہتی تو یقین تھا کہ مشرق میں بھی اس کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو جاتا

لیکن اللہ اس کو معاف کرے آخر میں وہ نفسانی خواہشوں کا غلام ہو گیا اور ان فتوحات کی کثرت نے اسے مغرور بنا دیا اور اب وہ بڑے بڑے عہدوں پر نااہل اور ذلیل لوگوں کو مقرر کرنے لگا جس سے اور معززین ناراض رہنے لگے۔ چنانچہ نجدۃ الحیری اور اس کے ساتھی جو کمینہ اور ذلیل لوگ تھے اس زمانے میں غیر معمولی عزت پاکر لشکر کے حکومت پر مامور ہوئے۔ بڑے بڑے شرفاء اور ذی عزت لوگ اس کی ماتحت کئے گئے اور انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ نجدہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہوں۔

نجدہ الحیری کی سیادت سے فوج کا انحراف اور عین جنگ میں شکست کی سازش

نجدہ الحیری چھچھورا، کم ظرف، اور کوتاہ عقل آدمی تھا تمام امرا و اہل دربار نے متفق ہوکر یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ جو جنگ عنقریب ہونے والی ہے اس میں نجدہ کو تنہا چھوڑ کر سب کو بھاگ جانا چاہئے۔ چنانچہ جنگ الخندق میں جو ۳۲۷ھ میں ہوئی عین گرمی جنگ میں اس قرارداد پر عمل کیا گیا اور نتیجے میں عبدالرحمٰن الناصر کی فوج کو اتنی سخت شکست ہوئی جس کی تلافی نہ ہوسکی اور ایک مدت تک دشمن عبدالرحمٰن کے سپاہیوں کے تعاقب میں لگے رہے اور انھیں مارنے پکڑنے اور قید کرنے میں مصروف رہے یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک یہ سپاہی اپنے اپنے شہروں، چھاؤنیوں اور جھنڈوں کے نیچے پہنچ کر جمع نہ ہو گئے۔

اس کے بعد سے پھر عبدالرحمٰن بنفس نفیس کسی جنگ میں شریک نہیں ہوا اور عیش پرستی پر ایسا مائل ہوا کہ اس کی انتہا کردی اور اتنی بے اعتدالیاں کیں کہ نہ اس سے پہلے کسی مسلمان بادشاہ نے کی تھیں نہ آئندہ توقع ہے۔

خلیفہ کے باکمال کارپرداز

عبدالرحمٰن کے حالات و اخبار اس کثرت سے ہیں کہ بیان سے باہر ہیں اس کو ایسے ایسے چیدہ اور کارگزار آدمی میسر ہوئے تھے کہ شاذ ہی کسی بادشاہ کو میسر ہوا کرتے ہوں۔ مثلاً موسیٰ ابن حدیر حاجب، عبدالحمید بن بسیل، عبدالملک بن جہور، اسمٰعیل ابن بدر، ابن ابی عیسیٰ قاضی، منذر بن سعید جو علم و ادب اور خطابت میں وحید عصر تھا، اور عیسیٰ بن فطیس کاتب۔

عیسیٰ ابن فطیس کو فن بلاغت و انشا میں ان سب پر خصوصیت سے ترجیح حاصل تھی مگر باوجود اس فضل و کمال کے جب وہ اپنے معاصروں کو خط لکھتا تو ان لوگوں کے اوصاف بیان کرنے سے قاصر رہتا اور ان کے کمال کے آگے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا۔

عیسیٰ ابن فطیس کی کتابت کا ایک نمونہ | جس زمانے میں احمد بن اسحاق قرشی سرقسطہ میں محمد ابن ہاشم تجیبی سے مصروف جنگ تھا۔ اس زمانے میں عبدالرحمٰن الناصر نے جو خطوط احمد ابن اسحاق کو بھیجے تھے ان میں سے ایک خط کا ترجمہ جس میں کاتب نے اپنی انشا پردازی کا کمال ظاہر کیا ہے۔ حسب ذیل ہے۔

"پہلے ہم تیری تعریف کرتے تھے تاکہ تیری اصلاح ہو جائے۔ لیکن افسوس تیری اصلیت تجھ پر غالب آکر رہی۔ اب فقر ہی سے تیری اصلاح ہو گی کیونکہ مال و دولت سے تو تیری سرکشی ترقی پر ہے۔ تو دولت کی قدر نہیں کرتا کیونکہ تو اس کا عادی نہیں تھا۔ شاید تو بھول گیا کہ تیرا باپ ابن حجاج کے سواروں میں تھا اور اس کی نظروں میں نہایت درجہ ذلیل۔ اور تو اس وقت اشبیلیہ میں گدھوں کی دلالی کرتا تھا۔ جب تو ہمارے پاس آیا تو ہم نے تجھے پناہ دی۔ تیری مدد کی اور عزت بڑھائی۔ یہاں تک کہ تو مالدار ہو گیا اور ہم نے تیرے باپ کو وزیر بنا کر تجھے فوج کا جنرل بنایا اور سب سے اہم اور اعتماد کی خدمت یعنی حدود ملک کی نگرانی تیرے سپرد کی لیکن افسوس تو نے اس کے عوض ہمارے احکام کی توہین کی اور ہم سے بے پروائی برتی اب باوجود مذکورہ احسانات کے تو خلافت کا بھی مدعی معلوم ہوتا ہے۔ آخر یہ جرأت تجھے کس حسب و نسب پر ہے۔ تیری ہی جیسی خصلت والوں کے لئے کہنے والوں نے کہا ہے۔

انتم خُشارُ الخشار (۱) ولیس خز کنخیش

ان کنتم من قریش (۲) تزوجوا فی قریش

---

(۱) تم بچے کھچے بیچ میل لوگوں کی نسل ہو ہمارے برابر کیسے ہو سکتے ہو جیسے ٹاٹ ریشم کی طرح نہیں ہوتا۔

(۲) اگر تم قریش کے خاندان سے ہو تو قریش میں شادی کرو۔

اوکنتم قبط مصرِ (۱) فذالتعاظمی لایش

کیا تیری ماں حمدونہ ساحرہ نہ تھی اور تیسرا باپ جذامی نہ تھا اور کیا تیرا دادا حوثرہ ابن عباس کا دربان نہ تھا۔ جو اس کی ڈیوڑھی میں بیٹھا رسیاں بٹا کرتا اور چٹائیاں بنا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر اور ان لوگوں پر جنھوں نے تجھے ہمارے یہاں مقرر کرایا ہے لعنت کرے اے نامرد، اے جذامی، اے حرامی، بچۂ سگ، ذلت کے ساتھ فوراً ہمارے حضور میں حاضر ہو۔"

عبدالملک ابن جہور کی شاعری کے نمونے | اپنی کمسنی میں عبدالملک ابن جہور نے استیجہ سے عبدالرحمن الناصر کی خدمت میں جو قصیدہ نذر گزرانا تھا اس کا عنوان یہ تھا۔

لابی المُطرِّف سیدی من عبدہ المتعبد

اور عنوان کے ذیل میں یہ اشعار تھے۔

وامت لک النعماء ان (۲) رغمت انوف الحسد

ووقتک نفسی کل مح (۳) ذور یروح ویغتدی

وعلوت حتی الایقا (۴) ل لقدرک العالی ازدد

انی کتبت وحر شو (۵) قی یستیح تجلدی

ودموع عینی تنہمی (۶) فتحیل ماکتبت یدی

---

(۱) مگر جب تم قبطوں سے ہو تو یہ فخر و غرور کس بنا پر؟

(۲) تجھے عیش دائمی نصیب ہو اگرچہ بات حاسدوں کے کتنی ہی خلاف گزرے

(۳) ترے عہد میں بھی یہ دہشت و خوف ہر صبح و شام میرے لئے موجود ہے؟

(۴) حالانکہ تیرا پایہ اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ اس کے لئے مزید بلندی کی دعا سعی حاصل ہے۔

(۵) میں ایسی حالت میں یہ نظم لکھ رہا ہوں کہ میرا صبر و استقلال شوق کی گرمی سے پگھلا جاتا ہے۔

(۶) میرے آنسو بہہ بہہ کر میرے نوشتے کو مٹائے دے رہے ہیں۔

تتغـــربی وتوحشی (۱) وتفـــردی وتوحدی

من ذاق طعم البین ذا (۲) ق الموت غیر مصرد

ورای المنیة جهرةً (۳) فی مصدراو مورد

اتذکرالانس الذی (۴) ولیٰ وطیب المشهد

وکریم بشرک لی ووجه (۵) ک حین یشرق فی الندی

فاعی من الحسرات آل (۶) واناً لطیل تبلدی

فاسلم وعش وابلغ مدا (۷) ک ودع حسودک یکمدُ

فارحمه ان بلت العلا (۸) وجری بجدٍ انکد

ثم السلام علیک من (۹) نی دائماً یاسیدی

عبدالملک ابن جہور کی نیچرل شاعری | عبدالملک کے ذیل کے دو شعر جو اس نے نرگس کی تعریف میں

---

(۱) میری یہ حالت غریب الوطنی، وحشت اور تنہائی کی بدولت ہے۔

(۲) جس شخص نے جدائی کا مزہ چکھا وہ کچھ نہ کچھ موت کی تکلیف ضرور اٹھایا گیا۔

(۳) اور ہر حرکت وسکون کی حالت میں اسے موت کا چہرہ علانیہ نظر آیا۔

(۴) کیا وہ پر لطف اگلی صحبتیں اور محبت آپ کو یاد آتی ہے۔

(۵) اور آپ کو میری طرف اپنا وہ التفات یاد ہے جب آپ کا بشاش چہرہ مجلس احباب میں چمکتا تھا۔

(۶) اس نوع کی حسرتیں انواع واقسام کے ساتھ میری یاد میں اتنی محفوظ ہیں کہ ان کی حفاظت کرتے کرتے میرا حافظہ کند ہوا جاتا ہے۔

(۷) خدا کرے آپ عیش وآرام سے رہیں، اپنی تمناؤں میں کامیاب ہوں اور آپ کے حاسد جلتے رہیں۔

(۸) جب آپ بلندی وعلو مرتبت حاصل کر چکے ہیں تو اس پر رحم کیجئے جس کی تقدیر برگشتہ اور تدبیر بیکار ہو رہی ہے۔

(۹) اے میرے سردار وآقا! اب میں پھر دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ سلامت رہیں۔

کہے تھے، اس کے تمام اشعار سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔

قد بعثنا الیک بالنرجس الہ (۱) غض حکی الون عاشق معمود

فیہ ریح الحبیب عند البلاقی (۲) واصفرار المحب عند الصدود

بیوی کے متعلق عبدالملک کی ہجو عبدالملک اپنی بیوی کے اخلاق سے بہت ناراض رہتا تھا۔ آخر کو تنگ آکر اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس بیوی کے متعلق جو اشعار کہے ہیں وہ یہ ہیں۔

من ذا یفک اساریہ (۳) ویحل عقد عقالیہ

من ذا یخلص من ہوی (۴) من حینہ فی الہاویہ

انی بلیت بشر من (۵) تحت السمار العالیہ

انی دہیت بحیتہ (۶) قطعت حراک لسانیہ

لوکنت تبصرہا سال (۷) ت اللہ منہا العافیہ

ما ابصرتہا مقلتی (۹) مذا بصرتہا راضنیہ

---

(۱) ہم نے تمہارے پاس نرگس کا تازہ پھول بھیجا جس کا رنگ دلشکستہ عاشق کے رنگ کی طرح ہے۔

(۲) اس میں ایسی خوشبو ہے جیسی ملاقات کے وقت محبوب کے پاس سے آتی ہے اور ایسی زردی ہے جیسی محبوب کی روگردانی کے وقت عاشق کے چہرہ پر نظر آتی ہے۔

(۳) کون ہے جو میری بیڑیاں کاٹ دے اور میرے پاؤں کے بند کھول دے۔

(۴) ایسے شخص کو کون رہائی دلاتا ہے جو تباہ ہو کر دوزخ میں جا پڑا ہے۔

(۵) میرا سابقہ ایسی بدترین مخلوق سے پڑا ہے جو سب سے بدتر ہے۔

(۶) مجھے ایسی ناگن نے ڈسا ہے کہ میری زبان کی حرکت تک بند ہو گئی ہے۔

(۷) اگر تو اسے دیکھ لے تو اللہ سے عافیت کا طالب ہو۔ (۸) جب سے اسے خوش دیکھا تو میری آنکھوں نے آرام کی صورت نہیں دیکھی۔ (۹) سالہا سال گزرتے جا رہے ہیں مگر اس کی زندگی دراز ہوتی جا رہی ہے۔

تمضی السنون و تنقضی (۱) وحیاتها متمادیہ

ولها اہیل منتن (۲) عورالوجوہ سواسیہ

لولا الحیاۃ بصقت فی (۳) تلک الوجوہ البالیہ

یا یوم معرفتی بہم (۴) یا زانی ابن الزانیہ

انثبتنی وعمرتنی (۵) وقعدت عنی ناحیہ

ماکان ہذا منک فی الہ (۶) ودّ القدیم جزائیہ

اسماعیل ابن بدر کاتب کی شاعری | اسماعیل ابن بدر نے جو قصیدہ عبدالرحمٰن الناصر کی مدح میں لکھا تھا۔ وہ درج ذیل ہے۔

عذمت البین ارق طرف عینی (۷) وفرق بین من اہوی و بینی

لقد نام القعید قریر عین (۸) عن یہوی و بتّ سخین عین

اذا وجہ الصباح بدا تہادت (۹) رکا مبتلاین بعد این

---

(۱) سالہا سال گزرے جا رہے ہیں مگر اس کی زندگی دراز ہوتی جا رہی ہے۔

(۲) اس کے رشتہ دار گندے۔ بدبودار اور سب کے سب معیوب چہرے کے ہیں۔

(۳) اگر حیا مانع نہ ہوتی تو میں ان بوسیدہ جھری پڑے ہوئے چہروں پر تھوک دیتا۔

(۴) اس دن پر سخت افسوس ہے جب ان سے میری شناسائی ہوئی، افسوس اے زانیہ کے بچے!

(۵) تو چمٹ گیا اور مجھے آفت میں مبتلا کرکے آرام سے بیٹھ رہا۔

(۶) تیری طرف سے قدیم محبت و دوستی کا بدلہ مجھے یہ نہ ملنا چاہئے تھا جو ملا۔

(۷) میں فراق کو کوستا ہوں جس نے میری نیند اڑا دی اور محبوب کے اور میرے درمیان جدائی ڈال دی۔

(۸) محبوب کا ہمنشیں جو اسے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرلیتا ہے، سو گیا ہے اور میں اپنی گرم اور پرسوز آنکھوں کے ساتھ بیدار ہوں۔

(۹) جس وقت صبح ہوتی ہے تو ہماری سواریاں متواتر تکان کی وجہ سے ایک دوسرے پر گر پڑتی ہیں (یعنی اتنی تکلیفوں کے ساتھ سفر کرتے آرہے ہیں)

فقلبی نازح عنی غریب (۱) وجسمی دو نہ فی غربتین

اجوب القفر بعد القفر ابغی (۲) بذاک رضی امام المشرقین

ومن لایبتغی دعتہ الی ان (۳) یکون خلیفۃً بالمشرقین

لقد حلت حمیا الراح عندی (۴) وطابت بعد فتحک معقلین

وآذن کل ہم بالفراج (۵) وان یقضی غریمک کل دین

وہذا البحر یذکر منک عہداً (۶) سقی مغناہ نوّا المرزمین

تحن الیک منہ طامیات (۷) من الامواج ملأا الخافقین

لئن جاشت غواربہا بمار (۸) اجاج لایسوغ لواردین

فانت البحر عذباً مستہلا (۹) علینا بالنضار وباللجین

---

(۱) میرا دل مجھ سے جدا ہو کر غربت میں پڑا ہوا ہے (آپ کے پاس ہے) اور جسم اس سے علحدہ ہے اور دو شخصوں کے فراق میں مبتلا ہے دل کے اور آپ کے۔

(۲) میں بیابان پر بیابان طے کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس طرح امام مشرقین کی خوشنودی حاصل کروں

(۳) اور میں وہ ہوں کہ جب تک خلیفہ مشرق و مغرب کا خلیفہ نہ ہو جائے اس سے کچھ نہیں چاہتا۔

(۴) آپ کے دو قلعے فتح کر لینے کے بعد سے مجھ پر شراب ناب حلال ہو گئی ہے (ورنہ پہلے حرام تھی۔

(۵) تمام رنج و غم دور ہو جانے کا اعلان ہو گیا ہے اور اس کا بھی کہ تیرے قرضخواہ کو کل قرضہ ادا کر دیا جائے گا۔

(۶) اس دریا کو تیرا اترنا یاد ہے جب کہ اس کی قیامگاہ زمین کے تاروں کی بارش سے سیراب ہو گئی تھی

(۷) اس کی موجیں جو زمانے کو گھیرے ہوئے ہیں تیری مشتاق ہو ہو کر اٹھ رہی ہیں۔

(۸) اگر اس دریا کی لہروں سے ایسا پانی جوش زن ہو جو پینے والوں کے لئے خوشگوار نہ ہو تو مضائقہ نہیں

(۹) کیونکہ تو ایسا شیریں دریا ہو کہ ہم پر سونا چاندی کثرت سے برسا رہا ہے۔

نعش فی غبطۃ وسرورلک (۱) تدوم لہ دوام الفرقدین

شعر نمبر لقد حلت حمیا الراح وغیرہ (آؤن کل ہم) والے شعروں کی تشریح یہ ہو کہ جب خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے دوسری چڑھائی کی تو اس نے قسم کھائی کہ جب تک یہ قلعہ فتح نہ کرلونگا کوئی خوشی نہ کروں گا۔ اس کی یہ قسم پوری ہوئی اور بجائے ایک قلعے کے خلیفہ نے ابن حفصون کے دو قلعے فتح کئے۔ ان شعروں میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

خلیفہ کی قدر دانی اور اس قدردانی کا شکریہ | امیرالمومنین الناصر اسمٰعیل ابن بدر کے اس قصیدے سے بہت خوش ہوا اور اس نے کانچ کے ایک ٹکڑے پر اس کے لئے ایک مختصر سا محبت نامہ لکھوایا اسمٰعیل نے شکرئے کے طور پر حسب ذیل اشعار پیش کئے۔

قدکنت اوجبت فی الزجاج (۲) للراس منّی بلا اختلاج

کبیرۃً اترعت رحیقًا (۳) صرفًا ابت ذلۃ المزاج

فلم ازل بعد ذار جائ (۴) لہا فہل یا دین لراج

یامالکا رایہ ضیاء (۵) فی کل خطب الم داجی

کانما الفجر من سناہ (۶) فی غسق اللیل ذو ابتلاج

---

(۱) تو ملک کے لئے رشک و مسرت کا باعث بن کر ہمیشہ خوش رہے اور تارا ہائے فرقدین کے دوام تک قائم

(۲ و ۳) آپ نے میرے لئے بے تامل ایسی نفیس اور پاکیزہ شراب (محبت) شیشے میں بھردی جس کا کسی چیز سے مخلوط ہونا اس کے لئے ننگ ہو۔

(۴) میں اس شراب (محبت) کا ہمیشہ سے امیدوار رہا اور تلاش میں رہا کہ کہیں کوئی شخص ایسے امیدوار کو پناہ دے (آپ نے یہ امید پوری کردی۔

(۵ و ۶) اے آقا! آپ کی رائے ہر تاریک رات یا برے وقت، آنے والی مصیبت میں ایسی روشنی ہو جیسے صبح صادق رات کی تاریکی میں نمودار ہوتی ہے۔

بحرٌ من الجود فاض عذباً (۱) طمّ علی الابحر الاجاج

من لی بیوم بہ قراع (۲) لیس اخو کربہ بناج

بکل بیضاء من راہا (۳) یحسبہا مشعلۃ السراج

لاتنس مولاک فی وغاہ (۴) واذکرہ فی حومۃ الہیاج

امیر المومنین الناصر کا منظوم جواب عبدالرحمن الناصر نے اسمٰعیل کے شکریہ کے جواب میں یہ شعر لکھے۔

کیف وانی لمن یناجی (۵) من لوعۃ الشوق ما اناجی

ایطمع ان یستریح وقتاً (۶) او یقتل الراح بالمزاج

لوحمل الصخر بعض شجوی (۷) عاد الی رقۃ الزجاج

کنت کما قد علمت الہو (۸) اذا انا مما شکوت ناج

فصرت للبین فی علاج (۹) طم واربی علی العلاج

الورد مما یزید حزنی وبعث السوسن اہتیاجی

---

(۱) آپ فیاضی کا ایک دریائے شیریں ہیں جو روانی و جوش میں پرشور دریاؤں سے بھی سبقت لے گیا۔

(۲ و ۳) جس دن شمشیر و خنجر سے سابقہ پڑتا ہو، جسے دیکھنے والے چراغ کا شعلہ سمجھتے ہیں اور اس کی تکلیف سے نجات دینے والا کوئی نہیں ملتا اس دن سوا تیرے میرا کون ہو گا۔

(۴) اے آقا تو اپنے غلام کو لڑائی کے موقع پر نہ بھولنا اور میدان جنگ میں ضرور یاد کرنا۔

(۵) جو شخص میری طرح آتش شوق سے پناہ کا طالب ہو اسے کہاں نجات مل سکتی ہے۔

(۶) کیا وہ اس طمع میں ہے کہ کسی وقت آرام کر سکے یا شراب ممزوج پی سکے۔

(۷) اگر میرا بار الم پتھر پر پڑ جائے تو وہ بھی شیشے کی طرح نازک و رقیق بن جائے۔

(۸) تجھے معلوم ہے کہ جب مجھے سوز دروں سے نجات ملنے والی تھی تو میں غفلت میں پڑ گیا تھا۔

(۹) پھر میں جدائی کا علاج کرنے لگا جو علاج کی حد سے تجاوز ہے۔

(۱۰) اور یہ حال ہو گیا کہ گلاب کے پھول سے میرا غم اور بڑھ گیا اور سوسن کے نظارے سے شوق میں اور ہیجان پیدا ہو گیا۔

اری لیالئی بعد حسن (۱) اشبح من اوجه سماج
لا ترج مما اردت شیئاً (۲) او یوذن الهمّ بالفراج

الناصر کی مدح میں اسمٰعیل ابن بدر کا ایک قصیدہ اور بھی قابل دید ہے، جس کے اشعار یہ ہیں۔

لطفت انا مله بعقرب صدغه (۳) عمداً لیلدغ فی فواد العاشق
وکان شاربه ہلال طالع (۴) قد خطه بالمسک احذق حاذق
وکانما بجبینه شمس الضحیٰ (۵) قد قنعت بظلام لیل غاسق
وکان وجنته ازاهر روضة (۶) یبائی بها السوسان فوق شقائق
فاذا تلفت قلت صورة دمیة (۷) واذا تبسم قلت خطفة بارق
یا غایة الحسن الذی هو غایتی (۸) کیف احتیالی فی فوادٍ خافق
حکم الاله بما تراه فما اری (۹) من حیلةٍ فی دفع حکم الخالق

---

(۱) اب میں اچھی خاصی راتوں کو زشت دکمروہ چہروں سے زیادہ بدنما پاتا ہوں۔

(۲) تو نے جس بات کا ارادہ کیا ہے اس کی امید نہ کر نہ یہ خیال کر کہ غم دور ہو جائے گا۔

(۳) محبوب کی انگلیوں نے ازراہ لطف عقرب گیسو کو اشارہ کیا کہ عاشق کے دل میں کاٹ لے۔

(۴) اس کی مونچھیں گویا ہلال طالع ہیں جن پر کسی نہایت ماہر صناع نے مشک سے خط کھینچ دیا ہے

(۵) اور اس کی پیشانی میں گویا آفتاب درخشاں ہے جو اندھیری راتوں کی تاریکی پر چھا گیا ہے۔

(۶) اس کے رخسار گویا کسی باغ کے پھول ہیں جن کی بدولت گل سوسن کو گل لالہ پر فخر ہے۔

(۷) جس وقت وہ مڑتا ہے تو ایک تراشیدہ منقش پتلی کی طرح معلوم ہوتا ہے اور جب مسکراتا ہے تو بجلی سی گر پڑتی ہے

(۸) اے حسن مطلق کی انتہا! (کہ میرا مقصود وہی ہے) تو ہی بتا دے کہ میں اپنے تڑپتے ہوئے دل کو کیونکر سنبھالوں۔

(۹) جو کچھ تو دیکھتا ہے اس کا حکم خدا کی طرف سے ہو چکا ہے اور خدا کا حکم ٹلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

قل للخلیفہ من امیہ والذی (۱) مادون فیض نوالہ من عائق

انسیت من منصور ہا رشید ہا (۲) وفضحت من مہدیہا والواثق

وحکیت عن عبدالملیک وہدیہ (۳) سیما الخلیفۃ والامام الباسق

ااُضیع بعد مواثقٍ لک جمۃً (۴) فیما مضی اکد تہا بمواثق

اس کتاب میں اندلس کی فتوحات اور وہاں کے امرا کے حالات میں جو کچھ جمع کیا گیا تھا اس کا بیان ختم ہوگیا۔ الحمد للہ حق حمدہ والصلوٰۃ علی سیدنا محمد نبیہ وعبدہ

---

(۱) بنی امیہ کے خلیفہ یا اس شخص سے کہدے جس کے فیض کرم کا روکنے والا کوئی نہیں۔

(۲) کہ آپ نے خلفا میں منصور وہارون رشید کو بھلا دیا۔ اور مہدی وواثق کی شہرت کو پست کر دیا۔

(۳) ایک عالی رتبہ امام وخلیفہ کی طرح آپ نے عبدالملک اور ان کی عادتوں کی یاد تازہ کردی۔

(۴) کیا میں آپ کے مضبوط اور باوثوق وعدوں کے بعد بھی تباہ ومحروم کر دیا جاؤں گا۔

فعش فی غبطۃ وسرور ملک (۱) تدوم لہ دوام الفرقدین

شعر نمبر لقد حلت حمیا الراح وغیرہ دآذن کل ہم والے شعروں کی تشریح یہ ہے کہ جب خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے دوسری چڑھائی کی تو اس نے قسم کھائی کہ جب تک یہ قلعہ فتح نہ کرلونگا کوئی خوشی نہ کروں گا۔ اس کی یہ قسم پوری ہوئی اور بجائے ایک قلعے کے خلیفہ نے ابن حفصون کے دو قلعے فتح کئے۔ ان شعروں میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

خلیفہ کی قدر دانی اور اس قدر دانی کا شکریہ | امیر المومنین الناصر اسماعیل ابن بدر کے اس قصیدے سے بہت خوش ہوا اور اس نے کانچ کے ایک ٹکڑے پر اس کے لئے ایک مختصر سا محبت نامہ لکھوایا۔ اسماعیل نے شکرئے کے طور پر حسب ذیل اشعار پیش کئے۔

قد کنت اوجبت فی الزجاج (۲) للراس منی بلا اختلاج

کبیرۃ اترعت رحیقاً (۳) صرفاً ابت ذلۃ المزاج

فلم ازل بعد ذا رجا ء (۴) لہا فہل یا دین لراج

یا مالکا رایہ ضیاء (۵) فی کل خطب الم داج

کانما الفجر من سناہ (۶) فی غسق اللیل ذو ابتلاج

---

(۱) تو ملک کے لئے رشک و مسرت کا باعث بن کر ہمیشہ خوش رہے اور تارہائے فرقدین کے دوام تک قائم

(۲ و ۳) آپ نے میرے لئے بے تامل ایسی نفیس اور پاکیزہ شراب (محبت) شیشے میں بھر دی جس کا کسی چیز سے مخلوط ہونا اس کے لئے ننگ ہے۔

(۴) میں اس شراب (محبت) کا ہمیشہ سے امیدوار رہا اور تلاش میں رہا کہ کہیں کوئی شخص ایسے امیدوار کو پناہ دے۔ آپ نے یہ امید پوری کر دی۔

(۵ و ۶) اے آقا! آپ کی رائے ہر تاریک رات یا برے وقت، آنے والی مصیبت میں ایسی روشنی ہے جیسے صبح صادق رات کی تاریکی میں نمودار ہوتی ہے۔

بحرٌ من الجود فاضَ عذباً (۱) طمَّ على الابحر الاجاج
من لی بیوم بہ قراع (۲) لیس اخو کربہ بناج
بکل بیضاء من راہا (۳) یحسبہا شعلۃ السراج
لا تنس مولاک فی وغاہ (۴) واذکرہ فی حومۃ الہیاج

امیر المومنین الناصر کا منظوم جواب | عبدالرحمٰن الناصر نے اسمٰعیل کے شکریے جواب میں یہ شعر لکھے۔

کیف وانی لمن یناجی (۵) من لوعۃ الشوق ما اناجی
ایطمع ان یستریح وقتاً (۶) او یقتل الراح بالمزاج
لو حمل الصخر بعض شجوی (۷) عاد الی رقۃ الزجاج
کنت کما قد علمت الہو (۸) اذا انا ما شکوت ناج
فصرتُ للبین فی علاج (۹) طم واربیٰ علی العلاج
الوردُ مما یزید حزنی وبعث السوسن اہتیاجی

---

(۱) آپ فیاضی کا ایک دریائے شیریں ہیں جو روانی وجوش میں پرشور دریاؤں سے بھی سبقت لے گیا۔
(۲ و ۳) جس دن شمشیر وخنجر سے سابقہ پڑتا ہو جسے دیکھنے والے چراغ کا شعلہ سمجھتے ہیں اور اس کی تکلیف سے نجات دینے والا کوئی نہیں ملتا اس دن سوا تیرے میرا کون ہو گا۔
(۴) اے آقا تو اپنے غلام کو لڑائی کے موقع پر نہ بھولنا اور میدان جنگ میں ضرور یاد کرنا۔
(۵) جو شخص میری طرح آتش شوق سے پناہ کا طالب ہو اسے کہاں نجات مل سکتی ہے۔
(۶) کیا وہ اس طمع میں ہو کہ کسی وقت آرام کر سکے یا شراب ممزوج پی سکے۔
(۷) اگر میرا بار الم پتھر پر پڑ جائے تو وہ بھی شیشے کی طرح نازک ورقیق بن جائے۔
(۸) تجھے معلوم ہو کہ جب مجھے سوز دروں سے نجات ملنے والی تھی تو میں غفلت میں پڑ گیا تھا۔
(۹) [illegible] جدائی کا علاج کرنے لگا جو علاج کی حد سے تجاوز ہے۔
(۱۰) [illegible] حاں ہو گیا کہ گلاب کے پھول سے میرا غم اور بڑھ گیا اور سوسن کے نظارے سے شوق میں اور ہیجان پیدا ہو گیا۔

ازری لیالی بعد حسن (۱) اقبح من اوجہ سماج

لا ترج ما اردت شیئًا (۲) او یوذن الہمّ بالفراج

الناصر کی مدح میں اسمعیل ابن بدر کا ایک قصیدہ اور بھی قابل دید ہے، جس کے اشعار یہ ہیں۔

لطفت انا ملہ بعقرب صدغہ (۳) عمدًا لیلدغ فی فواد العاشق

وکان شاربہ ہلال طالع (۴) قد خطہ بالمسک اخذق حاذق

وکانما بجبینہ شمس الضحیٰ (۵) قد قنعت بظلام لیل غاسق

وکان وجنتہ ازاہر روضۃ (۶) یبائی بہا السوسان فوق شقائق

فاذا تلفت قلت صورۃ دمیۃ (۷) واذا تبسم قلت خطفۃ بارق

یا غایۃ الحسن الذی ہو غایتی (۸) کیف احتیالی فی فواد خافق

حکم الالہ بما تراہ فما ارے (۹) من حیلۃ فی دفع حکم الخالق

---

(۱) اب میں اچھی خاصی راتوں کو زشت و مکروہ چہروں سے زیادہ بدنما پاتا ہوں۔

(۲) تو نے جس بات کا ارادہ کیا ہے اس کی امید نہ کر نہ یہ خیال کر کہ غم دور ہو جائے گا۔

(۳) محبوب کی انگلیوں نے ازراہ لطف عقرب گیسو کو اشارہ کیا کہ عاشق کے دل میں کاٹ لے۔

(۴) اس کی مونچھیں گویا ہلال طالع ہیں جن پر کسی نہایت ماہر صناع نے مشک سے خط کھینچ دیا ہے۔

(۵) اور اس کی پیشانی میں گویا آفتاب درخشاں ہے جو اندھیری راتوں کی تاریکی پر چھا گیا ہے۔

(۶) اس کے رخسار گویا کسی باغ کے پھول ہیں جن کی بدولت گل سوسن کو گل لالہ پر فخر ہے۔

(۷) جس وقت وہ مڑتا ہے تو ایک تراشیدہ منقش پتلی کی طرح معلوم ہوتا ہے اور جب مسکراتا ہے تو بجلی سی گر پڑتی ہے۔

(۸) اے حسن مطلق کی انتہا! (کہ میرا مقصود وہی ہے) تو ہی بتا دے کہ میں اپنے تڑپتے ہوئے دل کو کیونکر تھاموں۔

(۹) جو کچھ تو دیکھتا ہے اس کا حکم خدا کی طرف سے ہو چکا ہے اور خدا کا حکم ٹلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

قل للخلیفہ من امیہ والذی (۱) مادون فیض نوالہ من عائق
انسیت من منصورہا ورشیدہا (۲) وفضحت من مہدیہا والواثق
وحکیت عن عبدالملیک وہدیہ (۳) سیما الخلیفۃ والامام الباسق
اأضیع بعد مواثقٍ لک جمۃ (۴) فیما مضی اکدتہا بمواثق

اس کتاب میں اندلس کی فتوحات اور وہاں کے امرا کے حالات میں جو کچھ جمع کیا گیا تھا اس کا بیان ختم ہوگیا۔ الحمد للہ حق حمدہ والصلوٰۃ علی سیدنا محمد نبیہ وعبدہ

---

(۱) بنی امیہ کے خلیفہ یا اس شخص سے کہدے جس کے فیض کرم کا روکنے والا کوئی نہیں۔
(۲) کہ آپ نے خلفا میں منصور و ہارون رشید کو بھلا دیا۔ اور مہدی و واثق کی شہرت کو پست کر دیا۔
(۳) ایک عالی رتبہ امام و خلیفہ کی طرح آپ نے عبدالملک اور ان کی عادتوں کی یاد تازہ کر دی۔
(۴) کیا میں آپ کے مضبوط اور باوثوق وعدوں کے بعد بھی تباہ و محروم کر دیا جاؤں گا۔